ماہنامہ

فکر و نظر

علمی و دینی مجلہ

شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ □ جولائی ۱۹۸۰ء

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی ○ اسلام آباد

(پاکستان)

نگراں

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا

مدیر

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی

محمد شرف الدین سکریٹری ... تحقیقات اسلامی ... اسلام

سکولوں، کالجوں اور لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

ماهنامه **فکر و نظر** اسلام آباد

شمارہ ۔ ۱	شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ ۔ جولائی ۱۹۸۰ء	جلد ۔ ۱۸

فہرست

مجلس ادارت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

نفاق ایک بیماری ہے۔ یہ بیماری جسمانی نہیں اخلاقی اور روحانی ہے۔ بعض جسمانی بیماریاں بھی ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی تشخیص محض علامات سے ہی کی جاسکتی ہے۔ یہی حال اخلاقی اور روحانی عوارض کا ہے۔ کسی کا دل چیر کر بھی اگر ان بیماریوں کا حال معلوم کرنا چاہیں تو معلوم نہیں کر سکتے۔ کسی کی پیشانی پر لکھا نہیں ہوتا کہ یہ شخص نفاق میں مبتلا ہے۔ لیکن علامتوں کو دیکھ کر ظن و تخمین سے نہیں حتم ولیقین کے ساتھ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اس شخص کو نفاق کی بیماری لاحق ہے۔ نفاق ایک خطرناک بیماری ہے۔ یہ بیماری مہلک بھی ہوتی ہے اور مزمن بھی۔ اس کا مزمن اور مہلک ہونا اتنا خطرناک نہیں جتنا کہ اس کا موذی اور متعدی ہونا خطرناک ہے۔ اس بیماری میں مبتلا انسان اپنی ذات سے زیادہ معاشرے کے لئے خطرہ کا باعث ہوتا ہے۔ اور اگر یہ بیماری کسی معاشرے کو لگ جائے تو اسے گھن کی طرح کھا جائے اور دیمک کی طرح چاٹ جائے۔ اسی لئے ایسے افراد و اشخاص کو پہچاننے کے لئے کچھ علامتیں بتادی گئی ہیں۔ اور یہ علامتیں اتنی واضح ہیں کہ ان کو پرکھنے کے لئے کسی خاص صلاحیت یا مہارت کی ضرورت نہیں۔ جسمانی امراض کی تشخیص کے لئے پھر بھی حذاقت بلکہ خصوصی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اس اخلاقی بیماری کا پتا لگانے کے لئے چند ایسی معمولی باتیں کافی ہیں جو پانی اور ہوا کی طرح عام ہیں اور ہر کوئی روزمرہ زندگی میں ان کا تجربہ کرسکتا ہے۔ اگر شرط کوئی ہے تو احساس وشعور کی۔ اور احساس وشعور ظاہر ہے انسان کے اپنے فکر وعمل اور سیرت و کردار سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک شخص اگر خود اس مرض کا شکار ہے تو اس کے اندر یہ احساس وشعور کہاں سے پیدا ہو گا اور وہ ان علامات کا ادراک کیونکر کرسکے گا۔

اسلام اور مسلمانوں کو پوری تاریخ میں سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے یہی اہل نفاق ہیں۔ ان کی

ریشہ دوانیوں، دسیسہ کاریوں اور فتنہ سامانیوں سے کتنی ہی جیتی ہوئی بازیاں ہر گئی ہیں۔ ان کے فتنوں سے الامان والحفیظ! عہد نبوت میں بھی جس گروہ سے مسلمانوں کو، اسلام کو، سب سے زیادہ خطرہ تھا وہ انہی منافقین کا گروہ تھا۔ قرآن مجید نے اس گروہ کے خال و خط انتہائی جلی حرفوں میں نمایاں کئے ہیں۔ اور ساتھ ہی ان کے گھناؤنے کردار کی شناعت کو واضح کرنے کے لئے ان کے آخری انجام سے بھی آگاہ کیا ہے۔ فرمایا "ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار" ۔ بے شک منافق جہنم کی سب سے نچلی تہ میں ہوں گے۔ ابولہب اور ابوجہل کے طبقے سے تعلق رکھنے والوں کے لئے فقط اتنا ہی کہا گیا کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ جبکہ عبداللہ ابن ابی کے گروہ کے لئے زیادہ سخت الفاظ میں وعیدیں ہیں۔ حالانکہ یہ گروہ اپنے ظاہری طور طریقوں میں اس دور کے مسلمانوں سے پیچھے نہیں آگے رہتا تھا۔ وہ خیر القرون کا دور تھا۔ رسالتماب بہ نفس نفیس مسلمانوں میں موجود تھے۔ وحی کا سلسلہ جاری تھا۔ اس لئے اس فرقے کے اٹھائے ہوئے فتنوں کا سد باب آسانی سے ہو سکتا تھا۔ پھر بھی اس کی خطرناکی اس درجہ سنگین تھی کہ مسلمانوں کو بار بار ان خطرات سے خبردار کیا جاتا رہا جو ان کے ہاتھوں درپیش تھے۔ یہ اس لئے تاکہ مسلمانوں میں کفار و مشرکین کے ساتھ اس خطرناک گروہ یعنی منافقین کے خلاف بھی ایک جداگانہ گروہ ہونے کا احساسِ تشخص اور شعورِ امتیاز، نہ صرف ابھرے، بلکہ مستحکم ہو کر اتنا قوی ہو جائے، کہ مسلمان ان کی ظاہری ہم آہنگیوں سے دھوکا کھا کر ان کو اپنے اندر ضم نہ ہونے دیں اور یہ مار آستین ان کی صفوں میں داخل ہو کر ان کی بیخ کنی کی تدبیریں نہ کرنے پائیں، اور جب کبھی وہ اس کی کوشش کریں کہ مسلمانوں میں گھس کر گھل مل جائیں تو مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر انہیں قبول نہ کرے رد کر دے۔ جب تک ملت اسلامیہ میں یہ اجتماعی شعور بیدار رہا منافقین اپنی کوشش میں کم ہی کامیاب ہو سکے۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ جوں جوں مسلمانوں کی یہ حس کمزور ہوتی گئی منافقین کی دخل اندازی بڑھتی گئی۔ پھر تو انہوں نے حصارِ ملت میں اتنے رخنے ڈالے کہ مسلمانوں کو اکثر اپنے بقا و تحفظ کی جنگ لڑنی پڑی، آگے بڑھنے اور دنیا پر چھا جانے کا عمل یکقلم موقوف ہو گیا۔

مسلمان اور نفاق یہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اس لئے یہ کہنا کہ مسلمانوں میں نفاق در آیا اور وہ کمزور ہو گئے ایک غلط تعبیر ہوگی۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی وہ اجتماعی حس کمزور ہو گئی یا مر گئی جو منافقین کو چھانٹ چھانٹ کر ان سے الگ کرتی رہتی، جس سے ان کا سونا پہلے کی طرح کھرا رہتا اور

اس میں کھوٹ کی آمیزش نہ ہونے پاتی۔

اس سوال کا جواب ہنوز باقی ہے کہ کسی فرد یا گروہ کے بارے میں یہ کیونکر معلوم کیا جائے کہ اس میں نفاق کے جراثیم ہیں۔ وہ علامات کیا ہیں جن سے نفاق کی بیماری کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔ بات لمبی ہو گئی۔ اس سوال کا جواب، جو حاصل گفتگو ہے، قرآن کی آیات کے علاوہ ایک مختصر حدیث میں بھی موجود ہے، جو پرکھنے کے لئے سونار کی کسوٹی کی طرح بے خطا ہے۔ فرمایا: آیۃ المنافق ثلاث اذا حدث کذب و اذا وعد اخلف و اذا اؤتمن خان۔ یعنی منافق کی نشانی تین ہے۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اسے امین بنایا جائے تو امانت میں خیانت کرے۔

یہ صحیحین کی متفق علیہ روایت ہے۔

کتنی معمولی اور عامۃ الورود باتیں ہیں جنہیں بطور علامت بیان کیا گیا ہے۔ ہر کسی کو روزمرہ معمولات کی زندگی میں اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کا واسطہ پڑتا ہے۔ اس واسطے میں ایسے مواقع آتے ہیں جن میں ان باتوں کا بلا کسی اہتمام کے بآسانی تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ باتیں بظاہر تین معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی اصل پر غور کیا جائے تو یہ ایک ہیں اور باہم لازم و ملزوم ہیں۔ ان کا منبع ایک ہے۔ یہ ایک ہی خصلت کے تین مختلف مظاہر ہیں۔ اگر کسی شخص میں ان میں سے ایک علامت پائی جائے تو لازم ہے کہ دوسری باتیں بھی پائی جائیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں اس کا علم اور تجربہ نہ ہو۔ یا اس کا موقع پیش نہ آیا ہو۔ حق ناحق، حرام حلال اور جائز ناجائز کی تمیز کے بغیر، جو محض ایمان و اسلام کی دین ہے، خودغرضی اور مفاد پرستی کا نخچیر ہو کر انسان اس خصلت کا اسیر ہوتا ہے۔ دجل و فریب، کذب و افتراء، خیانت و خداعی، وعدہ خلافی و عہد شکنی، عیّاری مکاری، کتمان حق اور شہادت زور جیسے قبائح انسان اسی وقت اختیار کرتا ہے جب بلا امتیاز جلب منفعت اس کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ افراد ہی نہیں جماعتیں، ادارے، تنظیمیں اور وقت کی بڑی بڑی حکومتیں بھی انہی دواعی نفس کا شکار ہو کر نفاق کے مرض میں مبتلا ہوتی ہیں اور منافقانہ کارروائیاں کرتی ہیں۔ حدیث شریف میں بتائی گئی کسوٹی پر پرکھ کر ہم ان کے بارے میں بھی اسی طرح رائے قائم کر سکتے ہیں جس طرح افراد و اشخاص کے بارے میں کر سکتے ہیں۔

اس حدیث کی افادیت کے دو پہلو ہیں۔ جو لوگ خود مرض نفاق میں مبتلا ہوں وہ اس حدیث کی روشنی

میں اپنا جائزہ لے کر اپنی اصلاح کر سکتے ہیں۔ اور جو لوگ خود مبتلا نہیں ہیں بلکہ راست باز، دیانت دار اور صادق الوعد مسلمان ہیں وہ اس حدیث کے آئینے میں منافقین کو پہچان کر ان کے فتنوں سے بچ سکتے ہیں۔ حدیث کے دو نکتے بالکل واضح ہیں۔ البتہ تیسرا نکتہ قدرے تشریح طلب ہے۔ امانت میں خیانت کا عام تصور بڑا محدود سا ہے۔ عوام ہی نہیں خواص بھی اس کے محتویات کا ادراک کم ہی رکھتے ہیں۔ عام طور سے امانت میں خیانت کو روپے پیسے تک محدود سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ حدیث کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ آپ کسی پر اعتماد کریں اور وہ آپ کے اعتماد کو دھوکا دے، یہ بھی امانت میں خیانت ہے۔ آپ کسی کو راز کی بات بتائیں اور وہ افشائے راز کرے یہ بھی امانت میں خیانت ہے۔ کسی کو کوئی عہدہ، منصب یا ذمہ داری تفویض کی جائے اور وہ اس کے معمولی تقاضے پورا نہ کرے یہ بھی امانت میں خیانت ہے۔ آپ کسی سے مشورہ طلب کریں اور وہ آپ کو مخلصانہ مشورہ دینے کے بجائے اپنی ذاتی اغراض و مصالح کے زیر اثر آپ کو غلط مشورہ دے یہ بھی امانت میں خیانت ہے، "المستشار مؤتمن" میں جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

نفاق یا منافق کی بات آتی ہے تو سمجھا یہ جاتا ہے کہ اس کا تعلق تاریخ کے اس دور سے ہے جب چودہ سو سال پہلے اسلام آیا اور روئے زمین پر حق و باطل کی معرکہ آرائی ہوئی، لوگ تین گروہوں میں بٹ گئے، مسلمان، کافر اور منافق۔ نفاق اور منافق محض اسلامی تاریخ کا ایک باب ہے۔ اور اب اس گروہ کا وجود قصۂ ماضی بن چکا ہے۔ یہ سوچ اور انداز فکر سرتاسر غلط فہمی اور کج اندیشی پر مبنی ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی

حق و باطل کی جنگ اور کفر و اسلام کی آویزش اس دنیا میں جب تک ہے منافقین کا گروہ بھی رہے گا۔ مسلمان کہلانے والے اپنی خیر و سلامتی چاہتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ قرآنی آیات اور احادیث نبوی کی روشنی میں اس گروہ کو پہچانیں اور ان کے شر سے محفوظ رہنے کی احتیاطی تدابیر کریں۔ اگر ہم صرف مذکورۃ الصدر حدیث کا چراغ لے کر ہی اٹھ کھڑے ہوں تو ہمیں ان چہروں کو پہچاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوگی جو نقاب اوڑھ کر ہمارے اندر جگہ جگہ موجود اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ نفاق کا کاروبار شرق تا غرب جس طرح پھیلا ہوا ہے اس

نے ایک بھیانک صورت اختیار کر لی ہے۔ اور اس کے کڑوے کسیلے پھل کھانے پر آج ہر وہ شخص مجبور ہے جو خود اس گھناؤنے کاروبار میں شریک نہیں ہے۔

بعض روایتوں میں "وان صام وصلّی وزعم انہ مسلم" کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ یہ الفاظ حدیث میں مذکور نہ بھی ہوں تو ان کا مفہوم حدیث میں معہود ہے۔ اگر کوئی شخص روزہ نماز جیسے ظاہری اعمال ادا کرتا ہے اور اپنی جگہ اس زعم میں بھی مبتلا ہے کہ وہ مسلمان ہے لیکن حدیث میں مذکور نفاق کی علامتیں اس کے اندر موجود ہیں تو نماز روزہ کے باوجود اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے اور اس سے حذر لازم ہے۔

فکر و نظر اپنی عمر کے سترہ سال پورے کر چکا۔ اس کی اٹھارہویں جلد کا یہ پہلا شمارہ ہے۔ خود احتسابی وہی اچھی ہے جو روزانہ بلکہ شبانہ روز کی جائے۔ اور ہم اس طرف سے غافل نہیں۔ اپنے طور پر ہم یہ کام کرتے رہتے ہیں۔ رسم دنیا ہے کہ رشتہ عمر میں سال کے بعد نئی گرہ لگتی ہے اور سالگرہ مناتے ہیں جس میں دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں۔ فکر و نظر کی سالگرہ قارئین کے ساتھ ہم پہلے بھی مناتے رہے ہیں۔ اور اس کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ پچھلے ایک سال کی باتوں کا خود ناقدانہ جائزہ لیں اور قارئین کی ضیافت طبع کا سامان کریں۔ سو آج پیچھے مڑ کر پچھلے سال کی کارگزاری کو دیکھتے ہیں تو بلا تامل اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ سال خود ہماری نظر میں اچھا نہیں رہا۔ خاص کر باقاعدگی اور پابندی وقت کے لحاظ سے حالت دل خوش کن نہیں رہی۔ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر تاخیر سے اشاعت رفتہ رفتہ رسالے کی روایت بن گئی اور یہ روایت کچھ اس طرح چمٹی کہ چھوڑنے کا نام نہیں لیتی۔ تمام جتن کے باوجود ہم اس روایت سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہوا ہے کہ پہلے مہینوں کا حساب تھا تو اب دنوں کی بات ہے۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ فکر و نظر ٹھیک ٹھیک بالکل وقت پر شائع ہوا کرے۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اس مہینے کا پرچہ قارئین کے ہاتھوں میں ہو۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

دوسری بات جس میں خود ہمیں کمی اور کوتاہی کا احساس ہے وہ کتابت و طباعت کا موجودہ معیار ہے۔ کانٹے کے حروف میں عمدہ اور نفیس طباعت فکر و نظر کا طرۂ امتیاز تصور کی جاتی تھی مگر اب وہ بھی طاق نسیاں ہو گئی۔ اس ذیل میں بھی کوششیں جاری ہیں۔ امید ہے کہ جلدی حالات رو براہ ہو جائیں گے اور رسالہ صوری محاسن سے آراستہ پھر اسی آب و تاب سے شائع ہوا کرے گا۔

معنوی اعتبار سے رسالے کے معیار کو بلند کرنے کی ضرورت کا احساس لیئے میں نے پاکستان سے ہندوستان تک کی خاک چھان ماری ۔ زوال علم وعرفاں کے ہاتھوں ایسا قحط الرجال ہے کہ کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔ اچھے معیاری مضامین لکھنے والوں کا فقدان ہے ۔ ہمارے لئے دہری مشکل یہ ہے کہ ہمیں خاص طرز کے مضامین درکار ہیں جو علمی اعتبار سے بھی بلند ہوں اور فنی اعتبار سے بھی کمتر یا فروتر نہ ہوں ۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ۔ بہر حال اس ضمن میں بھی ہماری کوششیں جاری ہیں ۔ السعی منا والاتمام من اللہ ۔

ماہِ صیام کی آمد آمد ہے ۔ مرحبا صد مرحبا ماہِ صیام ! مومنوں کو مبارک مہینے کی آمد مبارک ہو ۔ یہ مہینہ نزول قرآن کا مہینہ ہے ، نمازِ تراویح اور تلاوتِ قرآن کا مہینہ ہے ، صدقات و خیرات کا مہینہ ، مکارمِ اخلاق اور حسنات کا مہینہ ، رب جلیل کی طرف سے بندوں کے لئے فیوض و برکات کا مہینہ ۔ مومنو ! اٹھو اس کے استقبال میں دیدہ و دل فرش راہ کرو ، چشم ما روشن دل ما شاد کہو ۔ اور اس کے فیوض و برکات سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤ ۔ اہلاً و سہلاً ماہ مبارک !

اے آمدنت باعث آبادی ما

(مدیر)

ابو جعفر محمد بن جریر الطبری

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی

ابو جعفر محمد بن جریر الطبری صوبہ طبرستان کے پایۂ تخت آمل میں ۲۲۴ھ کے آخری یا ۲۲۵ھ کے ابتدائی ایام میں پیدا ہوئے[1]۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی۔ والد بزرگوار بہت مالدار تھے۔ اس سے انہوں نے فائدہ اٹھایا اور بہت سے اسلامی ممالک کے علمی مراکز کا دورہ کیا۔ "الرے" اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں کی سیر کی اور پھر بغداد واپس آئے۔ یہاں آنے کا مقصد یہ تھا کہ احمد بن حنبل کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کریں۔ لیکن وہ ان کے آنے سے قبل ہی وفات پا گئے اور انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ یہاں سے وہ بصرہ اور کوفہ چلے گئے جہاں کچھ مدت قیام کرنے کے بعد پھر بغداد واپس آ گئے۔ بغداد میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد وہ مصر روانہ ہوئے اور راستے میں دمشق اور دوسرے بڑے شہروں میں علم حدیث کے حصول کے لئے کچھ مدت ٹھہرے[2]۔

ابن عساکر کے نزدیک وہ ۸۷۶ء/ ۸۷۷ء میں مصر میں مقیم تھے۔ جبکہ یاقوت کی رائے میں وہ پہلی مرتبہ ۸۶۷ء میں مصر گئے۔ اور اس کے بعد ملک شام میں ۸۶۹/ ۸۷۰ء میں وارد ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق وہ ۸۷۱/ ۸۷۲ء میں بغداد میں تھے۔ جبکہ وہ ایک متبحر عالم حدیث ہونے کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکے تھے[3]۔

مصر سے وہ دوبارہ بغداد آئے اور طبرستان کے دو سفروں کے علاوہ انہوں نے باقیماندہ ساری زندگی بغداد میں گذاری۔ ابو جعفر نے زندگی کے آغاز میں احادیث کی جمع و تدوین کی طرف خصوصی توجہ دی[4]۔ ان کی زندگی کا مقصد اعلیٰ علم حاصل کرنا اور علم سکھانا تھا۔ اور ان کی پوری زندگی اسی مقصد کے حصول میں گذری۔ انہوں نے دنیاوی جاہ و جلال کو ہیچ سمجھا۔ تاریخ و فقہ کے علاوہ ان کو شعر و شاعری اور ادب میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ریاضی اور طب میں بھی ان کو دسترس تھی[5]۔

مصر سے واپسی پر دس سال تک وہ فقہ شافعی کے مقلد رہے۔ لیکن بعد میں وہ مجتہد مطلق بنے۔[الف] اور اپنا ایک الگ مذہب قائم کیا جو ان کے والد جریر کے نام سے "جریریہ" مشہور ہوگیا۔ لیکن یہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا اور بعض دوسرے مذاہب کی طرح ختم ہوگیا۔[۹]

امام طبری کو امام شافعی کے ساتھ زیادہ اختلاف فروعات میں تھا۔ اصول میں ان کو ان سے زیادہ اختلاف نہ تھا۔ البتہ احمد بن حنبل کے ساتھ ان کا اختلاف اصولی تھا۔ وہ امام احمد بن حنبل کو محدث تو تسلیم کرتے تھے لیکن مجتہد نہیں مانتے تھے۔ حنبلی مسلک کے لوگ چونکہ بغداد میں زیادہ تھے اس لئے طبری کے ساتھ ان کی مخالفت بڑھ گئی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہجوم نے ان کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور وہ کئی دن تک اپنے گھر میں محصور رہے۔ یہ اختلاف یہاں تک بڑھ گیا کہ ان پر کفر کا فتویٰ لگا یا گیا۔[۷]

(الف) مجتہد ہر اس عالم کو کہتے ہیں جس میں مندرجہ ذیل صفات موجود ہوں : خوف خدا رکھتا ہو۔ قرآن پر عبور حاصل ہو۔ علوم قرآن سے واقف ہو۔ سنت اور احادیث کے بارے میں واقفیت تامہ رکھتا ہو۔ فقہاء کے فیصلوں کے بارے میں علم رکھتا ہو۔ عربی ادب میں ماہر ہو وغیرہ وغیرہ۔

ایسا عالم جب کسی مسئلے کا حل اصول اربعہ ۔ قرآن ۔ سنت ۔ اجماع صحابہ اور قیاس میں نہیں پاتا تو اس کا حل اپنی ذاتی رائے اور اجتہاد سے کرتا ہے۔ مجتہدین کی چار قسمیں ہیں : (۱) مجتہد مطلق یا مجتہد فی الشرع : یعنی وہ مجتہد جو براہ راست قرآن پاک اور احادیث نبوی سے مسائل کا استنباط کرتا ہو اور کسی دوسرے شخص کی اندھا دھند تقلید نہ کرتا ہو۔ اس کے علاوہ وہ کسی مذھب کا بانی ہو۔ مثلاً امام ابو حنیفہ، امام شافعی، احمد بن حنبل، امام مالک، امام اوزاعی اور ابو جعفر الطبری۔ (۲) مجتہد فی المذاہب : جو مسائل کا حل وضع شدہ قوانین کے تحت کر سکتا ہو اور ائمہ اربعہ میں سے کسی کا مقلد ہو۔ جیسے امام یوسف، امام محمد وغیرہ۔ (۳) مجتہد فی المسائل : جو اصولی اور فروعی دونوں مسائل میں امام کا مقلد ہو اور جن مسائل کے حل کے لئے امام کی طرف سے واضح ہدایات موجود نہ ہوں ان کا حل وہ اپنی رائے سے کر سکتا ہو۔ جیسے طحاوی، ابو بکر الجصاص وغیرہ۔ (۴) صاحب التخریج۔ جو فروعی مسائل کا استنباط بھی خود نہ کر سکتا ہو۔ صرف اپنے امام کے کسی فیصلے کو دوسرے پر ترجیح دے سکتا ہو۔ تفصیل شہرستانی کی الملل والنحل میں ملاحظہ ہو۔

ابن جریر نے بہت سے علماء سے تعلیم حاصل کی۔ مثلاً فقہ کی تعلیم داؤد نامی عالم سے حاصل کی۔ شافعی فقہ کی تعلیم ربیع بن سلیمان سے مصر میں اور حسن بن محمد الزعفرانی سے بغداد میں حاصل کی۔ فقہ مالکی کی تعلیم یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ سے اور فقہ اہل العراق کی تعلیم "الرے" میں ابومقاتل نامی عالم سے حاصل کی (۸)۔ الغرض مصر، شام، عراق، کوفہ بصرہ اور الرے میں جید علماء سے پڑھا۔ ان کے علاوہ ان کے اساتذہ میں چند مشہور علماء یہ ہیں: محمد بن عبدالملک ابن ابی الشوارب، اسحاق بن ابی اسرائیل، محمد بن حمید الرازی، عمرو بن علی اور محمد بن بشار (۹)۔ آپ سے حدیث کی روایت قاضی احمد بن کامل، محمد بن عبداللہ الشافعی اور مخلد بن جعفر نے کی۔

ایک حدیث کی روایت ان سے اس طرح کی گئی ہے: اخبرنی ابوطالب محمد بن الحسین بن احمد بن عبداللہ بن بکیر، قال نا مخلد بن جعفر قالا: نبانا ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری، قال حدثنی عبیداللہ بن عبدالکریم الرازی قال نا ثابت بن محمد قال نا سفیان الثوری عن حبیب بن ابی ثابت عن طاؤس عن ابن عباس قال: مر النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی رجل مکشوفۃ فخذہ، فقال لہ: غط فخذک، فان فخذ الرجل من العورۃ۔

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ایک آدمی کے پاس سے گزرے جس کی ران ننگی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو دیکھ کر فرمایا: اپنی ران چھپاؤ اس لئے کہ مرد کی ران شرم گاہ میں داخل ہے (اس لئے اس کا چھپانا فرض ہے)۔

ابن جریر سے اس حدیث کی روایت ایک دوسرے طریقہ سے بھی ہوئی ہے جس میں بعض لوگوں نے سفیان الثوری کی حدیث کو غریب گردانا ہے اور اس کی روایت مخلد اور ابوجعفر بن ابی طالب نے ابن جریر الطبری سے کی ہے (۱۰)۔

ابن جریر الطبری متعدد مشہور کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کی ہر کتاب اپنے میدان میں ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ ذیل میں ان کی چند مطبوعہ کتابوں کے بارے میں چند تعارفی کلمات سپرد قلم کئے جاتے ہیں تاکہ قارئین کرام الطبری کی علمی حیثیت کے بارے میں صحیح اندازہ لگا سکیں (۱۱)۔

۱۔ تفسیر ابن جریر

یہ کتاب تفسیر بالماثور کا ایک قابل اعتماد مجموعہ سمجھی جاتی ہے۔ ماثور کے ساتھ ساتھ مصنف نے عقلی دلائل سے بھی کام لیا ہے۔ اور جگہ جگہ اپنی رائے کا اظہار بڑے مناسب اور غیر مبہم انداز میں کیا ہے۔ تفسیر ابن جریر کی ضخامت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ اپنے دوستوں سے سوال کیا: "کیا آپ خوش ہیں کہ میں قرآن

کی تفسیر کروں"؟ ۔ انہوں نے پوچھا ۔ "اس کا حجم کتنا ہوگا"؟ ابن جریر نے جواب دیا" تیس ہزار ورق" ۔ انہوں نے کہا : "اس کے ختم ہونے سے پہلے ہماری عمریں ختم ہو جائیں گی"۔ اس کو سن کر ابن جریر نے اس کو تین ہزار ورق تک کم کر دیا۔(۱۲)

ویسے تفسیر ابن جریر تیس جلدوں میں ہے ۔ یہ طویل عرصے تک نظروں سے اوجھل رہی۔ کتابوں میں اس کا ذکر ملتا تھا۔ آخرکار اس کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں مصر سے پانچ ہزار دو سو صفحات پر مشتمل یہ تفسیر شائع ہوئی۔ علم تفسیر میں یہ انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے ۔

بعض علماء کی رائیں

سمعانی نامی ایک عالم رقمطراز ہے : ان محمد بن جریر مکث اربعین سنۃ یکتب فی کل یوم منہا اربعین ورقۃ ۔ یعنی ابن جریر چالیس سال تک یومیہ ۴۰ صفحے لکھا کرتے تھے۔(۱۳)

ابو حامد احمد بن ابی طاہر الفقیہ الاسفرائنی لکھتے ہیں :

لو سافر رجل الی الصین حتی یحصل لہ کتاب تفسیر ابن جریر لم یکن ذالک کثیراً۔ یعنی اگر ایک آدمی چین تک سفر کرے اور اس کو تفسیر ابن جریر کا ایک نسخہ ہاتھ آجائے تو یہ سفر اس کے لئے زیادہ نہیں ہے۔(۱۴)

حافظ ابن تیمیہ اپنی کتاب "اصول التفسیر" میں ابن جریر کے بارے میں لکھتے ہیں : واما التفاسیر التی سألت عنہا، فاصحہا تفسیر محمد بن جریر الطبری، فانہ یذکر مقالات السلف بالاسانید الثابتۃ ولیس فیہ بدعۃ . ولا ینقل من المتہمین کمقاتل بن بکیر والکلبی ۔ یعنی جن تفاسیر کے بارے میں، میں نے پوچھا تو ان میں سب سے زیادہ صحیح محمد بن جریر الطبری کی تفسیر ہے ۔ اس لئے کہ وہ سلف صالحین کے اقوال ثابت شدہ اسناد کے ساتھ نقل کرتے ہیں ۔ اور ناقابل اعتماد اشخاص کی روایات نقل کرنے سے اجتناب کرتے ہیں جیسے مقاتل بن بکیر اور کلبی۔(۱۵)

کہتے ہیں کہ ابو بکر بن بالویہ نے ابن جریر سے ان کی تفسیر املاءً لکھی ۔ ابو بکر محمد بن اسحاق المعروف بہ "ابن خزیمہ" نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے کس سن میں یہ تفسیر املاءً لکھی ۔ اس نے جواب دیا کہ سن ۸۳ تا سن ۹۰ یعنی سات سال کے عرصے میں ۔ کہتے ہیں کہ ابو بکر نے مجھ سے مطالعہ کے لئے لیا اور چند سال کے بعد واپس کر دیا اور کہا: "میں نے اس کو اول سے آخر تک پڑھا ۔ اور مجھے سطح زمین پر ابن جریر سے زیادہ عالم دوسرا کوئی نظر نہیں آیا۔"(۱۶)

مشہور مستشرق گولڈ زیہر لکھتا ہے: "تفسیر ابن جریر، جامع البیان، کے مؤلف محمد بن جریر الطبری ہیں جو کہ وہ عالم اسلام کے بلند پایہ علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ اس لئے یورپی علماء نے ان کے علم کی بلندی کا بہت صحیح اندازہ لگایا ہے۔"[۱۷]

ایک دوسرا یورپی مفکر نولڈیکے لکھتا ہے: "اگر تفسیر ابن جریر ہاتھ لگے تو اس کے ذریعہ بعد میں لکھی ہوئی دوسری تمام تفسیروں سے انسان بے نیاز ہو جاتا ہے۔"[۱۸]

ابن جریر کا طریق تفسیر:

ابن جریر نے تفسیر میں ایک خاص طریقۂ کار اپنایا ہے۔ ابتدا میں وہ ایک آیت کی تاویل کرتے ہیں۔ پھر اس کے بارے میں احادیث رسول پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اقوال صحابہ اور تابعین کو بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان احادیث اور اقوال کی سند بیان کرتے ہیں۔ پھر آیت مذکورہ کے بارے میں دوسرے مفسرین کی آراء نقل کرتے ہیں۔ اور پھر حسب ضرورت اس آیت کے اعراب اور صرفی اور نحوی اصول پر غور و خوض کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان بیان کردہ اقوال کی چھان بین کرتے ہیں اور ضعیف اور قوی اقوال کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ اور انجام کار ایسے مفسرین پر شدید حملے کرتے ہیں جو فہم قرآن میں سلف صالحین کی روایات کی طرف رجوع کئے بغیر اپنی رائے پر اکتفا کرتے ہیں۔[۱۹]

ابن جریر مروجہ علم کلام سے بے خبر نہیں تھے۔ ان کی تفسیر میں اس کے شواہد موجود ہیں۔ وہ کسی مخصوص اسلامی مکتب فکر یا فقہی مذہب کے جامد پیروکار نہ تھے۔ سلف صالحین کے یقیناً پیروکار تھے اور انہیں سلفی مکتب فکر کا ایک آزاد خیال امام تصور کیا جاتا ہے۔ مسئلہ جبر و اختیار میں وہ اختیار کے قائل ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے ان کی تفسیر پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں معتزلہ کے افکار پائے جاتے ہیں۔[۲۰]

۲۰۔ تاریخ طبری:

تاریخ طبری تفسیر طبری کی طرح اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کے مآخذ مختلف ہیں۔ ادبی مآخذ اور مصادر میں ابو مخنف کی ایک تصنیف، عمرو بن شبہ کی کتاب اخبار اہل بصرہ (حدیث کی ایک کتاب جس میں سے زیاد بن ایوب انہیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے) نصر بن مزاحم کی تاریخ اور محمد بن اسحاق کی سیرت اور اس موضوع پر الواقدی، ابن سعد، اور ہشام الکلبی کی تصانیف وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ساسانیوں کی تاریخ کے لئے ابن جریر نے فارسی کی ایک تصنیف

"تاریخ الملوک" کا عربی ترجمہ استعمال کیا۔[۲۱]

تاریخ ابن جریر کی ضخامت کے بارے میں ان کا اپنا بیان کافی وشافی ہے۔ کہتے ہیں کہ ابن جریر نے اپنے دوستوں سے تاریخ عالم لکھنے کے بارے میں ذکر کیا۔ انہوں نے پوچھا: "اس کی ضخامت کتنی ہوگی"؟ ابن جریر نے جواب دیا۔ "اس کی ضخامت تفسیر جیسی ہوگی"۔ انہوں نے کہا کہ اس کے ختم ہونے سے پہلے ان کی عمریں ختم ہو جائیں گی"۔ ابن جریر نے کہا "لوگوں کی ہمتیں کم ہوگئیں۔"

جہاں تک کتاب کے مواد اور ترتیب کا تعلق ہے تو کتاب کی ابتدا میں ایک تمہید ہے۔ اس کے بعد کتاب میں بطریقوں، انبیاء، اور قدیم ترین زمانے کے حکمرانوں کی تاریخ ہے۔ پھر ساسانیوں کے عہد کے واقعات ہیں۔ پھر عہد نبوی اور عہد خلفائے راشدین کے حالات۔ اس کے بعد بنو امیہ اور آخر میں بنو عباس کا عہد آتا ہے۔ کتاب جولائی ۹۱۵ء تک کے واقعات کو محیط ہے۔[۲۲]

ابن جریر کے بعد اس کی کتاب کو دوسرے مورخین نے جاری رکھا۔ مثلاً الطبری کے شاگرد رشید ابو محمد الفرغانی کی گمشدہ کتاب صلۃ التاریخ، یا المذیل، ابوالحسن محمد الہمدانی کی تصنیف جس میں ۱۰۹۴ء تک کے واقعات درج ہیں اور جس کی پہلی جلد جو ۹۰۸/۹۰۰ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے، محفوظ رہ سکی ہے۔

ان کے بعد ابن مسکویہ نے اپنی کتاب تجارب الامم اور ابن الاثیر نے تاریخ الکامل میں الطبری کے مواد سے استفادہ کیا اور اس کے بعد کے زمانے کے حالات لکھے۔ گویا انہوں نے ۱۲۲۵ء تک کے واقعات لکھے۔[۲۳]

اس کے علاوہ علامہ طبری کی تاریخ کی بنیاد زیادہ تر روایات پر رکھی گئی ہے۔ نزاعی اور اختلافی امور میں انہوں نے ایک غیر جانبدار کا رویہ اختیار کیا ہے اور تمام روایات کو جوں کا توں درج کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ تحقیق کے طالب علم روایات کا درجہ خود روایات کی اسناد سے معلوم کر سکتے ہیں۔

اس طریقے کا فائدہ یہ ہے کہ قاری خود بخود ضعیف اور قوی روایات میں فرق کرنے کی کوشش کرتا ہے اور روایات میں سوچنے اور غور و فکر کرنے کا ایک بڑا میدان اس کو مل جاتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ قاری روایات کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں اور معتبر اور غیر معتبر روایات کے بارے میں اپنا ذاتی فیصلہ کر سکتے ہیں۔

روایات کی تدوین میں وہ اسناد کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ مثلاً ان کے نزدیک وہی راوی قابل اعتبار ہے جو

زیر تحریر واقعہ میں خود شریک رہا ہو۔ یا اس کے بارے میں صحیح علم رکھتا ہو۔ یا ایک جماعت نے اس واقعہ کی تصدیق کی ہو۔ حالات بیان کرنے میں وہ زمانی ترتیب کا خیال رکھتے ہیں۔ اور سنین کی پابندی کرتے ہیں۔[۲۴]

علامہ طبری کی تاریخ اس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ عہد اسلامی کی بعض نادر و نایاب عبارتوں کے اقتباسات اس کتاب کی بدولت محفوظ رہ گئے ہیں۔ جب کہ اصلی مواد دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ مثلاً کعب الاحبار، وھب بن منبہ، عبداللہ بن سلام، قتادہ، مجاہد، عبداللہ بن عباس اور ابو مخنف وغیرہ کے اقوال کے بہترین اقتباسات اس تاریخ میں محفوظ ہیں۔ دوسری تاریخوں میں یہ خصوصیت نہیں ہے۔ گویا کہ تاریخ طبری عہد اسلامی کے ابتدائی حالات اور اہم تاریخی واقعات کا بیش بہا مجموعہ ہے۔

علامہ طبری نے ایک ہی واقعہ کے متعلق ساری روایات ایک ہی جگہ اکٹھی کی ہیں اور ان روایات میں عینی شاہد کی روایت کو ترجیح دی ہے۔[۲۵]

۳۔ اختلاف الفقہاء:

ابن جریر الطبری پہلے شخص ہیں جنہوں نے اختلاف الفقہاء پر قلم اٹھایا ہے۔ اس کتاب کو فریڈرک کرن نامی مستشرق نے ایڈٹ کیا ہے۔ اس میں تابعین اور ان کے بعد کے فقہاء کی آراء پائی جاتی ہیں۔ اس کی اہمیت اس لحاظ سے بھی مسلم ہے کہ ان فقہاء میں سے کسی کی آراء کا کوئی الگ مجموعہ موجود نہیں ہے۔ چونکہ اس میں مختلف موضوعات پر ان کی آراء کو جمع کر دیا گیا ہے اس لئے یہ ایک قابل قدر علمی سرمایا ہے۔[۲۶] ابن جریر قرآن کی قرأت بھی بہت اچھی کرتے تھے۔ خصوصاً سورۂ رحمٰن کی تلاوت جب فرماتے تھے تو لوگ پروانہ وار ان کے گرد جمع ہوتے تھے۔ اس فن میں انہوں نے کتابیں بھی لکھیں۔

محمد ابن جریر اگرچہ دولت مند باپ کے بیٹے تھے لیکن ان پر ہر قسم کے حالات آئے، اچھے بھی اور برے بھی مگر ہر حالت میں وہ اعتدال پر قائم رہے۔ کہتے ہیں کہ مصر میں محمد بن جریر، محمد اسحاق بن خزیمہ، محمد بن نصر المروزی، اور محمد بن ہارون جمع ہو گئے۔ ان کے پاس خرچ کے لئے کچھ نہیں تھا۔ اور بھوک کی وجہ سے ان کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ آخر کار وہ اس بات پر متفق ہو گئے کہ قرعہ میں جس شخص کا نام نکل آئے وہ اپنے ساتھیوں کے لئے کھانا مانگ کر لائے گا۔ قرعہ میں محمد بن اسحاق بن خزیمہ کا نام نکل آیا۔ انہیں اپنے ساتھیوں کے لئے کھانے کا انتظام کرنا تھا۔ لیکن

چونکہ مستغنی المزاج تھے اس لئے انہوں نے اپنے ساتھیوں سے وضو کرنے اور نماز پڑھنے کی مہلت مانگی۔ وہ نماز میں مشغول ہو گئے۔ اس دوران مصر کے والی کی طرف سے ایک ایلچی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھولا تو ایک آدمی سواری سے اُترا اور محمد بن نصر المروزی کے بارے میں دریافت کیا۔ ساتھیوں نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ ایلچی نے پچاس دینار کی ایک تھیلی ان کے حوالہ کر دی۔ پھر پوچھا: محمد بن جریر کون ہے؟ بتانے پر ایلچی نے ان کو بھی پچاس دینار کی ایک تھیلی پیش کر دی۔ اسی طرح باقیماندہ ساتھیوں، محمد بن ہارون اور محمد اسحاق کو بھی پچاس پچاس دینار کی تھیلیاں پیش کر دیں۔ آخر میں ایلچی نے کہا کہ والی مصر نے خواب میں دیکھا تھا کہ محامد (محمد کی جمع جن سے مراد مذکورہ چار محمد ہیں) بھوکے ہیں۔ اس لئے انہوں نے آپ کی مدد کرنا اپنا فریضہ سمجھا۔ ایلچی نے مزید بتایا کہ جب بھی ان کو ضرورت پڑے وہ والی مصر کو اطلاع دے کر اپنی ضرورت حسب منشا پوری کر سکتے ہیں۔(۲۶)

ابن جریر بڑے مستغنی المزاج اور سخی آدمی تھے۔ اس سلسلے میں آپ کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

اذا اعسرت لم یعلم رفیقی ۔۔۔ و استغنی فیستغنی صدیقی

ترجمہ: جب میں تنگدست ہو جاتا ہوں تو میرے ساتھی کو اس کی خبر نہیں ہوتی اور جب میں مالدار ہوتا ہوں، تو میرا دوست بھی مالدار ہو جاتا ہے۔ یعنی میں اپنے مال میں اپنے دوست کو شریک کرتا ہوں۔

حیائی حافظ لی ماء وجھی ۔۔۔ و رفقی فی مطالبتی رفیقی

ترجمہ: میری حیا مجھے سوال کرنے سے روکتی ہے اور جب میں کسی چیز کا مطالبہ کرتا ہوں تو بڑی نرمی سے کرتا ہوں۔

ولو انی سمحت ببذل وجھی ۔۔۔ لکنت الی الغنیٰ سھل الطریق

ترجمہ: اگر میں بے حیا ہو کر کچھ مانگتا تو مالدار بننے کے لئے یہ طریقہ میرے لئے بڑا آسان تھا لیکن میں اس طریقے سے تونگر بننا پسند نہیں کرتا۔(۲۸)

ابن جریر الطبری کے ہاں دو چیزیں بہت ناپسندیدہ تھیں۔ ایک دولت پر اترانا۔ اور دوسری فقر کی ذلت میں مبتلا ہو جانا۔ آپ لکھتے ہیں۔

خلقان لا ارضیٰ طریقھما ۔۔۔ بطر الغنی و مذلۃ الفقر

ترجمہ : میں دو خصلتوں کو پسند نہیں کرتا۔ دولت پر اترانا اور فقر کی ذلت میں مبتلا ہو جانا۔[۲۹]

ابن جریر کا قد لمبا تھا۔ رنگ گندم گوں اور بال کالے تھے۔ آنکھیں موٹی تھیں۔ اور جسم نحیف تھا۔ بڑے فصیح اللسان تھے۔ ان کے پاس جانے کے لئے ان سے اجازت مانگنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ بڑے ملنسار تھے۔ آپ ۲۶ رشوال ۳۱۰ ھ کو ہفتے کی شام بغداد میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ اور اتوار کی صبح کو اپنے گھر میں دفنائے گئے۔ وفات کے بعد آپ کی قبر پر کئی مہینے تک نمازہ جنازہ پڑھی جاتی رہی۔ آپ کے بارے میں بہت سارے مرثیے لکھے گئے۔ اور شعراء نے اپنی اپنی بساط کے مطابق ان کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔[۳۰]

حواشی و حوالہ جات

۱۔ خطیب بغدادی۔ تاریخ بغداد، بارہویں جلد، زیر عنوان الطبری الخوانساری، روضات الجنات، دوسرا ایڈیشن، ص ۷،۳-

نوٹ: الطبری کی نسبت صوبہ طبرستان کی طرف ہے۔ اس نسبت کے مقابلے میں ایک ملتی جلتی دوسری نسبت الطبرانی بھی ہے۔ یہ نسبت طبریۃ الشام کی طرف ہے جو بحیرۂ طبریہ کے مغربی جانب ایک شہر کا نام ہے۔

سمعانی نے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ یہ لفظ تبرستان ہے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگ کلہاڑیوں سے لڑا کرتے تھے۔ تبر عربی میں کلہاڑی کو کہتے ہیں۔ تبر پشتو میں بھی کلہاڑی کو کہتے ہیں۔

سمعانی کی کتاب "کتاب الانساب" میں ابن جریر کی تاریخ پیدائش مبہم اور غلط ہے۔ غالباً یہ طباعت کی غلطی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ مذکورہ کتاب زیر عنوان "الطبری"

ابو جعفر الطبری کا نام مختلف کتابوں میں کچھ اس طرح دیا گیا ہے: محمد بن جریر بن یزید بن کثیر، محمد بن جریر بن یزید بن خالد، محمد بن جریر بن غالب الطبری، ایک دوسرا نام محمد بن جریر بن رستم الطبری۔ لیکن آخری نام کو چھوڑ کر باقی سارے ناموں کو درست تصور کیا جا سکتا ہے۔ آخری نام کے "الطبری" شیعہ مذہب کے پیرو ہیں۔ اور کتاب الایضاح اور کتاب المسترشد انہی کی تصانیف ہیں۔ کتاب المسترشد کو بعض لوگوں نے غلطی سے ابو جعفر الطبری کی طرف منسوب کیا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ روضات الجنات

۲ - دائرۂ معارفِ اسلامیہ، بارہویں جلد، زیرِ عنوان الطبری

۳- ایضاً نیز ملاحظہ ہو تاریخ طبری کے اُردو ترجمے کا مقدمہ -

۴ - ایضاً طبرستان کا دوسرا سفر ۹۰۲ء اور ۹۰۳ میں پیش آیا -

۵ - تاریخ طبری کے اُردو ترجمے کا مقدمہ - نیز تاریخ بغداد -

۶ - ابوالیقظان عطیۃ الجبوری - دراسات فی التفاسیر و رجالہ، قاہرہ، ۹۴ -

۷ - ایضاً - نیز تاریخ طبری کے اردو ترجمے کا مقدمہ -

۸ - ابن ندیم - الفہرست، ۱ : ۲۳۴ -

۹ - ایضاً - نیز تاریخ بغداد ، ۲ : ۱۶۲ - ۱۶۰

۱۰ - تاریخ بغداد ، ۲ : ۱۶۲ - ۱۶۰

۱۱ - تغری بردی ۔ النجوم الزاھرہ ، ۳ : ۲۰۵ -

۱۲- دراسات فی التفاسیر و رجالہ، ۹۴ ف ف - ایضاً دائرہ معارف اسلامیہ، بارہویں جلد، الطبری -

۱۳- تاریخ بغداد ، ۲ : ۱۶۲ - ۱۶۰ -

۱۴ - ایضاً - نیز السمعانی، کتاب الانساب ، زیرِ عنوان الطبری -

۱۵ - تاریخ بغداد ، ۲ : ۱۶۲ - ۱۶۰ -

۱۶ - ایضاً

۱۷ - دراسات فی التفاسیر و رجالہ ، ۹۴ ف ف -

۱۸ - ایضاً

۱۹ - ایضاً

۲۰ - ایضاً -

۲۱ - دائرہ معارف اسلامیہ ، بارہویں جلد ، زیرِ عنوان "الطبری"

۲۲ - ایضاً

۲۳- ایضاً

۲۴- ایضاً۔ نیز تاریخ طبری کے اُردو ترجمے کا مقدمہ۔

۲۵- ایضاً

۲۶- ایضاً

نوٹ۔ ابن جریر کی طرف کئی کتابیں منسوب ہیں مثلاً کتاب الآداب الحمیدہ، کتاب مذہب الآثار، کتاب اللطیف کتاب البسیط، کتاب الشروط، کتاب المحاضر والسجلات، کتاب الوصایا، کتاب ادب القاضی، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب تہذیب الآثار وغیرہ ذالک، راقم الحروف نے تبصرہ صرف ان کتابوں پر کیا ہے جو طبع ہو چکی ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فہرست ابن ندیم۔

ابوجعفر الطبری کے زمانے میں ان کے ہم عصر مصر کے مشہور عالم ابوجعفر الطحاوی (م ۳۲۱ ھ) نے بھی اختلاف الفقہاء کے موضوع پر کتاب لکھی ہے جو استنبول میں موجود ہے اور ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ البتہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور حنفی عالم ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصاص (م ۳۷۰ ھ) نے اس کی تلخیص کی ہے جو ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ اس کے محقق ڈاکٹر صغیر حسن معصومی، سابق ڈائریکٹر ادارہ ہذا تھے۔

۲۷- تاریخ بغداد، ۲ : ۱۶۲ — ۱۶۰۔

۲۸- ایضاً۔ نیز ابن خلکان، وفیات الاعیان، بیروت، ۱۹۷۷ء، چوتھی جلد۔

۲۹- ایضاً

۳۰- ایضاً

نوٹ۔ تغری بردی نے اس کی جائے وفات خراسان لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔

ابن خلکان نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ اس نے مصر میں قرافۃ الصغریٰ کے نزدیک سفح المقطم میں ایک قبر دیکھی جس کے سرہانے کتبے پر لکھا ہوا تھا۔ ہذا قبر ابن جریر الطبری (یہ ابن جریر الطبری کی قبر ہے۔)

اس نے یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ لوگ بھی اس قبر کو صاحب التاریخ یعنی ابن جریر کی قبر تصور کرتے ہیں لیکن ابن خلکان اس قول کی صحت سے انکار کرتے ہیں۔

مزید برآں ۔ ابن خلکان نے مشہور شاعر ابو بکر الخوارزمی کو ابن جریر الطبری کا بھانجا لکھا ہے۔ لیکن الخوانساری اس کو درست تسلیم نہیں کرتے ۔ ان کے خیال میں ابو بکر الخوارزمی شیعۃ المسلک ہیں۔ اور ان کو ابن جریر کا بھانجا لکھ کر بعض لوگوں نے ابن جریر کو بھی شیعۃ المسلک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔

دوسری طرف سمعانی ابو بکر الخوارزمی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے والد طبرستان کے تھے اور والدہ طبریۃ الشام کی، اس لئے اس کی طبری کی نسبت سے کسی نے طبرستان مراد لیا ہے اور کسی نے طبریہ ۔

اس کے علاوہ الخوانساری نے طبری کی تاریخ وفات ۲ شوال لکھی جو درست نہیں ۔

BIBLIOGRAPHY

(۱) Abū Ja'far
Muḥammad Ibn Jarīr al-Ṭabarī
(i) *jāmi' al-Bayān*
(ii) *Tā'rīkh al-'Umam*, Urdu translation
(iii) *Ikhtilāf al-Fuqahā'*, Edited by Kern

(ii) Abu al-Yaqẓah 'Aṭiyyah
Dirāsāt Fī-al-Tafāsīr wa Rijālehī
Ahmad Mohd al-Haufi, al-Tabari, Cairo, 1970

(iii) *Dā'irah Ma'ārif-i-Islāmiyyah*
Vol. 12, al-Ṭabarī.

(iv) Al-Dhahabi, *Tadhkirat-al-Ḥuffāẓ*
2 : 251—255

(v) *Encyclopaedia of Islam*, al-Ṭabarī

(vi) Ibn al-Jawzī, *al-Muntaẓam*, 224 A.H.

(vii) Ibn al-Jazarī, *Ṭabaqāt al-Qurrā'*,
2 : 106, 108.

(viii) Kaḥḥālah 'Umar Riḍā,
Mu'jam al-Mu'allifīn
al-Ṭabari

(ix) Ibn Kathir,
al-Bidāyah wa-al-Nihāyah
224/225 A.H.

(x) Ibn Khallikan,
Wafayāt al-A'yān
224/225 A.H.

(xi) Khaṭīb Baghdādi.
Ta'rīkh-i-Baghdād
2 : 162—170

(xii) Al-Khwānsārī,
Rawḍāt al-Jannāt
2nd Ed. p. 673

(xiii) Al-Mubarrid,
al-Kāmil, 8 : 42

(xiv) Ibn al-Nadim,
al-Fihrist, 1 : 234

(xv) Al-Nawawi,
Tahdhīb al-Asmā' wa-al-Lughāt
1 : 178

(xvi) Saeedullah Qāḍi,
Principles of Muslim Jurisprudence of Abu Bakr al-Jaṣṣāṣ,
Ph.D. Thesis submitted to Peshawar University in 1976

(xvii) Al-Suyūṭī, Jalalud Din,
Ṭabaqāt al-Mufassirīn, 30, 31

(xviii) Taghrī Bardī, Jamalud Din,
Al-Najūm al-Zāhirah, 3 : 205

(xix) Tāshkubrizāda,
Mftāḥ al-Sa'ādah, 1 : 205, 206, 415

(xx) Yāfi'ī
Mir'āt al-Janān, 2 : 261

(xxi) Yāqūt
Mu'jam al-'Udabā'

(xxii) Al-Sam'ānī, Kitāb al-Ansāb.

(xxiii) Rashid Ahmad Jalundhri. *'Ilm al-Tafsīr wa-al-Mufassirīn*

لسان العصر اکبر اور جدید ذہن

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو لسان العصر نے رحلت فرمائی۔ اگلے روز "زمیندار" میں خبر پڑھ کر اقبال نے اکبر کے فرزند عشرت حسین کے نام تعزیتی تار بھیجا: "دلی ہمدردی قبول فرمائیے۔ ہندوستان ایک عظیم ہستی سے محروم ہو گیا۔"[۱] اس کے ساتھ ہی تعزیتی خط میں تفصیل سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا: "اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بڑی بخیل ہے۔ زمانہ سینکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے تب جا کے ایک اکبر اسے ہاتھ آتا ہے۔ کاش اس انسان کا معنوی فیض اس بدقسمت ملک اور اس کی بدقسمت قوم کے لئے کچھ عرصہ اور جاری رہتا۔"[۲]

اکبر کی جدائی پر اقبال بہت افسردہ و دل گرفتہ ہوئے۔ یہ کیفیت ان پر کئی روز تک طاری رہی۔ وہ اکبر کا مرثیہ لکھ کر ان کی حیات کو حق و صداقت کے لئے روشن دلیل قرار دیتے ہیں۔[۳]

بہ بت خانۂ دور حاضر خلیلے

۱۶ ستمبر کو مولانا گرامی کے نام ایک خط میں اپنے قلبی تاثرات کا اظہار کرتے ہیں: "اکبر مرحوم بے نظیر آدمی تھے۔ وہ اپنے رنگ کے پہلے اور آخری شاعر تھے۔ مگر شاعری کو چھوڑ کر ان کا پایہ روحانیت میں کم بلند نہ تھا..... مسلمانان ہند کو اپنے اس نقصان کا شاید پورا پورا احساس نہیں!"[۴]

افراد کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں فانی ہوتے ہیں، قومیں باقی رہتی ہیں۔ اکبر کی رحلت کے سترہ سال بعد اقبال بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن ملت اسلامیہ کے احیاء کے لئے جو تاریخی کردار ان ہستیوں نے انجام

دیا، اس سے انکار ممکن نہیں۔ اور یہ کہنا بھی بعید از حقیقت نہیں کہ مرنے کے بعد بھی ان ہستیوں کا معنوی فیض جاری ہے۔ کیونکہ اپنے فکروفن سے جو تہذیبی جنگ انہوں نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں لڑی اس کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ بلکہ حصول آزادی کے بعد اس کی شدت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اس لئے موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے اکبر اور اقبال کا پیغام ازبس تازہ بھی ہے اور از حد ضروری بھی! اکبر نے ساری عمر الحاد اور بے دینی کے خلاف جہاد کیا اور مغربی تہذیب سے، جس کے جلو میں الحاد و بے دینی کا سیلاب آیا، جنگ جاری رکھی۔ یہ وقتی جنگ نہیں تھی، ایک طویل محاذ آرائی تھی، جس کے نتائج مہینوں اور برسوں میں نہیں بلکہ قرنوں اور صدیوں میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ اکبر کے بعد اقبال نے بھی یہ جنگ اپنے ہتھیاروں (فکروفن) سے جاری رکھی۔ اکبر اپنے دور کے حالات کے مطابق مدافعانہ جنگ لڑتے رہے۔ اقبال نے جارحانہ انداز میں دور حاضر کی تہذیب جدید کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ ہماری موجودہ نسلیں ابھی جنگ کی حالت میں ہیں، اور آنے والی نسلوں کو بھی یہ جنگ لڑنا ہوگی۔ اب شکست خوردہ حریف مدافعت پہ اُتر آیا ہے۔ مغربی تہذیب اپنے الم ناک انجام سے دوچار ہونے والی ہے! صرف ایٹمی چھتر اس کو اس کے بھیانک انجام سے بچائے ہوئے ہے!

ایک زمانہ تھا جب ترقی پسند دانشوروں نے اکبر کو رجعت پسند اور قدامت پرست قرار دینا اپنا معمول بنا رکھا تھا۔ یہی صورت اقبال کے بارے میں بھی پیش آئی۔ لیکن یہاں مقابلہ ذرا سخت تھا، اس لئے دانشوروں نے کئی پینترے بدلے اور اب تک بدل رہے ہیں۔ چونکہ مسئلہ حق و صداقت کی تلاش کا نہیں بلکہ اپنے اپنے عقیدوں کی محکمی و استواری کا ہے، اس لئے دانشوروں کی یہ نکتہ چینی اکثر اعتراض برائے اعتراض یا سیاق و سباق سے الگ کر کے اکبر و اقبال کے افکار کا حلیہ بگاڑنے تک محدود رہی۔

اکبر کو "ترقی پسند" دانشوروں کی اس تنقیدی یلغار کا پورا پورا احساس تھا۔ اس لئے شیریں لبوں کی ترقی پسندانہ گالیوں کا جواب ان کے پاس ایک ہی تھا:

خدا کی پاکی پکارتا ہوں   ہوا کرے ناخوشی بتوں کو

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مشن کو اکبر نے اپنی حیات مستعار کے آخری لمحوں تک جاری رکھا۔ ان کو رضائے الٰہی کی تمنا تھی اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی آرزو، دانشوروں کی داد و ستائش سے وہ ہمیشہ بے نیاز رہے:

گو اپنے ساتھ آپ کا ٹہرا نہ لے گیا   اکبر مگر خدا کی گواہی تو دے گیا

کلام اکبر کا مطالعہ کیا جائے تو گذشتہ اور موجودہ صدی کی کشمکش کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں۔ اس زمانے کا شاید ہی کوئی واقعہ یا مسئلہ ایسا ہوگا جو لسان العصر اکبر کی نظر سے اوجھل رہا ہو۔ ان کے نکتہ رس ذہن نے ظریفانہ انداز میں یا سنجیدہ پیرائے میں ہر اس بات کا نوٹس لیا جو قومی زندگی یا تہذیب و معاشرت پر اثر انداز ہونے والی تھی۔ ان میں بعض وقتی اور ہنگامی باتیں بھی ہیں اور ایسی باتیں بھی جو ملک اور قوم کی تقدیر اور تاریخ بنا رہی تھیں۔ نکتہ چینوں کو اکبر کے مل پائپ کے پانی اور ٹائپ کے حروف سے لے کر پیرس سوپ، ڈاسن کے بوٹ، سولا ہیٹ، جاکٹ و پتلون، مس کے لونڈر اور بیگم کے عطرِ حنا تک بے شمار چھوٹی چھوٹی چیزوں کا آتا پتا مل جائے گا اور وہ اپنی تخلیقی تنقید کے شوقِ فضول کی تسکین کے لئے اکبر پر جو تہمتیں چاہیں لگا سکتے ہیں۔ لیکن بنظر انصاف دیکھا جائے تو کلام اکبر کا یہ حصہ جو آج سطحی اور فروعی باتوں کا آئینہ دار نظر آتا ہے دلچسپ ہونے کے باوجود مقدار میں بہت تھوڑا ہے۔ اکبر کی ظرافت کو بھی یار لوگوں نے بہت اچھالا، اور اس میں شک نہیں کہ اکبر کا ظریفانہ اسلوب ان سے مختص ہے۔ لیکن ایک تو یہ ظرافت ان کے آنسوؤں کی پردہ دار ہے، دوسرے یہ ظریفانہ کلام بھی ان کے مجموعۂ کلام میں مقدار کے اعتبار سے بہت زیادہ نہیں۔ اکبر کا سنجیدہ، عارفانہ کلام جس میں حکمت و دانش کے بیشمار موتی بکھرے ہوئے ہیں، کیفیت و کمیت کے اعتبار سے بہت زیادہ ہے لیکن اس پر ہمارے دانش مندوں نے بہت کم توجہ فرمائی ہے۔ عرصہ ہوا، اکبر کی سنجیدہ شاعری پر ایک مضمون علی گڑھ میگزین کے اکبر نمبر میں میری نظر سے گذرا تھا۔ ورنہ عام نقادوں نے اس حقیقت کا احساس ہی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر کو سمجھنے میں بہت کوتاہی ہوئی ہے۔

کلام اکبر کے کئی اہم اور مستقل پہلو ہیں جن پر غور کیا جائے تو ان پر طویل مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہم

اس وقت تین اہم "رجحانات" پر جو ذہن جدید کو متاثر کرنے والے ہیں، نہایت اختصار سے گفتگو کریں گے۔ یہ رجحانات سیاسی، تعلیمی اور تہذیبی مسائل کے بارے میں ہیں۔

سیاسی حالات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عوامل بدلتے رہتے ہیں لیکن تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کو یہ ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں نظر آئیں گے۔ اسی لئے اقبال نے تاریخ کو قومی حافظے سے تشبیہ دی ہے[۵]۔ اگر اس حافظے سے ماضی کے واقعات کا ریکارڈ محو کر دیا جائے تو حال بے معنی ہو جائے گا اور مستقبل کے بارے میں کوئی صورت سوچی بھی نہ جا سکے گی۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی سے لے کر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے یوم آزادی تک ہماری پچھلی اور موجودہ نسلوں کو بے شمار مرحلوں سے گذرنا پڑا۔ ان میں تین مراحل بڑے واضح ہیں۔ پہلا مرحلہ ۱۸۵۷ء کے بعد نصف صدی تک پھیلا ہوا ہے جس میں شکست خوردگی اور احساس کمتری کا رجحان غالب رہا۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز سے سیاسی بے چینی اور بے اطمینانی کا لاوا پکنے لگا اور محکومی کا احساس شدت سے قلب و ذہن کو متاثر کرنے لگا۔ یہ رجحان پہلی جنگ عظیم تک نتیجہ خیز مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ اور پھر تیسرا رجحان تحریک خلافت اور ترک موالات کی گرمی ہنگامہ کی صورت میں نمودار ہوا جس نے برطانوی استعمار کی بنیادوں کو ہلا دیا اور اسے مجبور کر دیا کہ وہ اصلاحات کی رفتار کو تیز کرے اور جلد از جلد یہاں سے رخصت ہو جائے۔ دوسری جنگ عالمگیر نے اس رجحان کو اس کے منطقی انجام سے قریب تر کر دیا۔ نتیجتہً برصغیر کو آزادی ملی اور بھارت اور پاکستان دو آزاد ملک معرض وجود میں آئے۔

لسان العصر اکبر کو اس تاریخی عمل میں جس دور سے سابقہ پڑا، وہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی شکست خوردگی کے احساس سے لے کر تحریک خلافت اور ترک موالات تک کا زمانہ ہے۔ جنگ آزادی کا ہنگامہ برپا ہوا تو اکبر گیارہ بارہ سال کے تھے۔ تحریک خلافت عروج پر تھی جب انہوں نے رحلت فرمائی۔ پہلے دو مرحلوں کے نشانات کلام اکبر میں بڑے واضح ہیں اور آخری مرحلے کے بارے میں حکیمانہ اشارات ملتے ہیں۔ بیسویں صدی کے شروع میں تو اکبر کے ہم نوا، رازداں اور بھی پیدا ہو چکے تھے۔ اقبال، ظفر علی خاں، محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام

آزاد، حسرت موہانی، جن کی للکار و پکار نے حوصلوں میں جولانی پیدا کر دی تھی۔ لیکن انیسویں صدی کے شکست خوردہ ماحول میں اکبر کو یہ جنگ تنہا لڑنی پڑی:

ہے اکبر بے کس ایک طرف اور ساری خدائی ایک طرف!

اکبر نے برطانوی استعمار کے خلاف محکوم اور لاچار قوم کی یہ جنگ شعری فنون کے ایسے ہتھیاروں سے لڑی جو ان کے اپنے تیار کیے ہوئے تھے۔ سرد موسم کی پر غبار ہواؤں میں شاہدِ معنی نے ظرافت کا لحاف اوڑھ کر وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو اس زمانے میں کسی حریت پسند کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا:

پالسی ان کی ہے قائم ہماری دل لگی

صاحب کی استعماری پالیسی اور اس کے بارے میں اکبر کی یہ دل لگی ہماری تاریخی جدوجہد کا بڑا صبر آزما مرحلہ تھا جس کی اہمیت کا اعتراف ابھی تک نہیں کیا جا سکا۔ اکبر کے سیاسی افکار کا جائزہ لیں تو یہ منظر نگاہوں کے سامنے آئے گا کہ جب برصغیر میں سیاسی عمل مفقود تھا، ملک میں صرف ایک طاقت نظر آتی تھی اور وہ برطانوی شہنشاہیت تھی، خاص و عام سب اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے، اکبر بھی اس ہجوم میں شامل ہو کر ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی مقطعے میں آ کر یہ سخن گسترانہ بات بھی کہہ جاتے ہیں:

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر تو حرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے!

محکوموں کی بے حسی پر عبرت کا یہ تازیانہ برسانا اور حاکموں کی فرعونیت پر طنز کا یہ تیر چلانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اکبر کا یہ شعر تو اکثر زبان پر آ جاتا ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

صنعت تلمیح کے پردے میں استعماری نظام تعلیم پر اس سے بہتر تنقید اور کیا ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر نے اپنی نظموں اور غزلوں میں جا بجا بڑے بلیغ انداز میں اس دور کے سیاسی ماحول کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ظرافت، شوخی اور تغزل کے دلفریب پردوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو ہمیں اکبر کی ذات میں ایک جری سیاسی مفکر چھپا ہوا نظر آئے گا۔ تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ ایک غزل کے ان دو شعروں کو لیجیے اور

غور فرمائیے کہ کس طرح اکبر اپنے عہد کے سیاسی حالات کو ان شعروں میں سمو گئے ہیں۔ پہلا شعر ہے۔

بار احساں جسے کہتے ہیں وہ ہے کوہ جفا　　　کاش نادم ہوں یہ احسان جتانے والے

WHITE MAN'S BURDEN کی تاریخی اصطلاح کو پیش نظر رکھ کر اس شعر کو دوبارہ پڑھیئے۔ استعماری عمل اور اکبر کے فکری ردعمل کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جائے گا۔

دوسرا شعر ہے:

گائیں سبزہ پا گئیں کر کے کلیل　　　اونٹ کانٹوں پر لپکتے ہی رہے

اکبر کی شعری علامات میں گائے ہندو قوم اور اس کی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے اور اونٹ مسلم قوم کی۔ اب اس شعر کو ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات کے آئینے میں دیکھیے جب ہندو قوم برطانوی حکومت سے تعاون کر کے سرخرو ہو رہی تھی اور مسلمان نشانۂ عتاب و انتقام بنے ہوئے تھے۔

ایک شعر اور ملاحظہ کیجئے، تحریک خلافت اور ترک موالات کے زمانے کا ہے، وضاحت کی ضرورت نہیں:

گاندھی سے کیوں ہو وحشت باطن کی مسٹری ہے　　　شوکت سے کیوں نہ کھٹکیں ان کی تو ہسٹری ہے

اکبر کا سیاسی تفکر اور کردار ان چند مثالوں سے بخوبی واضح ہو گیا ہو گا۔ اکبر کی شاعری کا یہ پہلو جدید ذہن کے لئے بڑا سبق آموز ہو سکتا ہے۔ زمانۂ محکومی میں استعمار کا رنگ روپ کیا تھا۔ ہندو مسلم تعلقات کس نہج پر جا رہے تھے، اور مستقبل قریب میں اس کے کیا نتائج نکلنے والے تھے، یہ باتیں ہمیں کلام اکبر میں ملیں گی۔ اکبر کے بہت سے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ کچھ باتیں وقتی حالات کے ساتھ رفت گزشت ہو گئیں۔ بہر کیف خود شناسی کے نقطۂ نظر سے یہ موضوع پرانا ہونے کے باوجود نیا ہے۔

اب میں دوسرے رجحان یعنی مغربی تعلیم کے نازک مسئلے کی طرف آتا ہوں۔

جدید تعلیم کا مسئلہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں ایک اہم بلکہ بنیادی اور اختلافی مسئلے کے طور پر ہماری قومی زندگی کو متاثر کر چکا ہے۔ جدید تعلیم سے مراد اگر محض مغربی علوم کی تحصیل ہوتی، تو شاید کوئی بھی صحیح الخیال انسان اس کی مخالفت نہ کرتا، اور اس کی افادیت کو شک کی نظروں سے نہ دیکھتا۔ لیکن اصل مسئلہ تو اس غرض و غایت کا تھا جو

نئی تعلیم کے جاری کرنے میں کارفرما تھی۔ اور یہ غایت بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ برصغیر کے پہلے تعلیمی کمیشن کے چیئرمین لارڈ میکالے نے اپنی تعلیمی روداد میں جدید تعلیم کے استعماری مقصد کو نمایاں طور پر بیان کر دیا تھا۔ "ہمیں اس وقت لازماً ایک ایسا طبقہ بنانا چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو، اور یہ طبقہ ایسا ہونا چاہیئے جو رنگ اور خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق اور رائے، اخلاق اور ذہن کے اعتبار سے انگریز ہو۔" (۶)

میکالے کے بیان کردہ اس مقصد کو سامنے رکھیئے اور جدید مغربی تعلیم پر لسان العصر کی تنقید کو دیکھئے، تو اس بارے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہے گا۔ اکبر مغربی علوم کے مخالف نہیں تھے۔ وہ تو اس استعماری سرکاری تعلیم کے مخالف تھے جس کا مقصد قوم کے نونہالوں کو ذہنی اصطباغ دینا تھا:

صیاد ہنر دکھلائے اگر تعلیم سے سب کچھ ممکن ہے　　بلبل کے لئے کیا مشکل ہے اُلّو بھی بنے اور خوش بھی رہے

یہ وہ نازک مسئلہ تھا جس پر اکبر بقول اقبال "مغربی تعلیم کے بارے میں سرسید احمد خاں کے ساتھ مدۃ العمر لڑتا جھگڑتا گیا۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے قدامت انتساب شیخ کا خوف کچھ بے بنیاد نہ تھا۔" (۷)

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے　　دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

مسیحی پادری تو ہماری قوم کے بچوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن استعماری تعلیم نے انہیں ذہنی اصطباغ دے کر اپنے حسب و نسب سے بیگانہ بنا دیا:

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا　　شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ　　کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا!

جدید تعلیم کے نام پر علوم سے زیادہ مغربی کلچر کی نقالی اور انگریزی زبان سے زیادہ انگریزیت کی طرف میلان بڑھا۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ بلکہ آزادی سے قبل سیاسی تحریکوں کی بدولت جو تھوڑا بہت حجاب تھا یا قومی شعور ابھرا تھا۔ وہ بھی آزادی کے بعد ختم ہوتا نظر آتا ہے۔ اور مغربی کلچر اور انگریزیت کا شوق ایک خاص طبقے میں جنون کی حد تک بڑھ گیا ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔ کہیں یہ طبقہ وہی تو نہیں جس کا تخیل میکالے کے ذہن میں پیدا

ہوا تھا؟

آزادی کے بعد تعلیمی جہت کو درست کرنے اور اسے قومی مقاصد سے ہم آہنگ بنانے کے لئے کئی تعلیمی کمیشن بٹھائے گئے۔ لیکن ہر کمیشن کاغذی کارروائیاں کر کے رخصت ہو گیا۔ میکالے کا نظریۂ تعلیم آج بھی اسی طرح کامیاب ہے، بلکہ پہلے سے زیادہ کامیاب۔ اب ہر کوئی انگریز سے زیادہ انگریزی کا دلدادہ، انگریزی سے زیادہ انگریزیت کا شیدائی ہے۔ اندریں حالات، اکبر کے تعلیمی افکار آج بھی ہمارے لئے ایک لمحہ فکریہ مہیا کرتے ہیں۔ انھوں نے مغربی علوم کی مخالفت نہیں کی۔ البتہ قومی تعلیم کے لئے ایک غایت کی نشاندہی ضروری کر دی ہے:

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو   جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
لیکن یہ سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد   اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اکبر کے نزدیک علم کی منتہائے مقصود تو یہ ہے:

علم وہ خوب ہے جو حسن عمل تک پہنچے   ذوق وہ خوب کہ جو راز ازل تک پہنچے

تعلیمی مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے اکبر نے کچھ ترجیحات بھی قائم کی ہیں۔ قومی تشخص کے نقطۂ نظر سے انہوں نے دینی اور اخلاقی پہلوؤں پر خاص زور دیا ہے۔ مادی نقطۂ نظر سے تجرباتی سائنس اور صنعتی تعلیم کو اولین حیثیت دی ہے۔ پھر ادب اور آرٹ کے مضامین آجاتے ہیں۔ فلسفہ چونکہ ذہنوں میں تشکیک پیدا کرتا ہے، اس لئے فلسفے سے خود دلچسپی رکھنے کے باوجود اکبر نے فلسفے کی تعلیم سے عام طور پر بچنے کی تلقین کی ہے:

فلسفے میں کیا دھرا ہے گھر کا ہو یا لندنی   سعی کا موقع ملے تو آرٹ یا سائنس سیکھ
عزم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے   لطف کیا ہے لدلیے موٹر پہ زر کے زور سے

جدید تعلیم پر اکبر کی تنقید اور پھر مثبت انداز میں ان کی تلقین کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں اور یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اکبر کا نظریہ تعلیم گذشتہ دور ہی میں نہیں، آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے۔

اب میں تیسرے رجحان یعنی تہذیبی پہلو کی طرف آتا ہوں۔

سیاسی محکومی اور اس کے بعد استعماری تعلیم کی بدولت ذہنی محکومی کا کڑوا پھل جدید تہذیب و معاشرت کی

صورت میں ظاہر ہوا۔ اکبر اور اقبال دونوں کو اپنے اپنے زمانے میں اس محاذ پر سخت معرکہ آرائی کرنی پڑی۔ سرسید احمد خاں نے "تہذیب الاخلاق" جاری کر کے اپنی "وحشی" قوم کے سامنے یہ نصب العین رکھا کہ وہ کامل درجے کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرے[۹]۔ کامل درجے کی تہذیب کا یہ تصور انہوں نے مغرب سے لیا تھا۔ "تمام خوبیاں دینی اور دنیوی جو انسان میں ہونی چاہئیں وہ خدا تعالیٰ نے یورپ کو اور اس میں بالتخصیص انگلینڈ کو مرحمت فرمائی ہیں۔"[۹]

سرسید احمد خاں بڑے ہی مخلص تھے اور بقول حالی "قوم کے سچے بہی خواہ تھے"[۱۰]۔ وہ اسلامی درد سے بھی بہرہ ور تھے۔ یہ سب باتیں بجا، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا یہ اقدام یا تجربہ نہایت خطرناک عواقب کا پیش خیمہ تھا۔

بقول اکبر: "سر میں مقاصد سید کے قرآں زیر پا میخانہ تھا!"

احساس شکست میں مبتلا محکوم قوم کو یہ مشورہ دینا دو احوال سے خالی نہ تھا۔ یا تو وہ انگریزوں کی طرح "سراپا مہذب" بن جائے اور یا پھر جو کچھ اس کے پاس ہے اس سے بھی ہاتھ دھو کر نہ ادھر کی رہے نہ ادھر کی:

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کر لی نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی

اکبر کے لئے یہ ساری صورت حال بڑی الم انگیز تھی۔ ان کے نزدیک یہ وقت نئے تجربات کے لئے موزوں نہیں تھا:

"کہ فرط ضعف نہیں وقت آپریشن کا"

اکبر کے انتباہ کی پرواہ نہ کی گئی۔ تجربے ہوتے رہے۔ نئی نئی آنچیں لگتی رہیں اور ان میں بے کس قوم پگھلتی رہی۔ نہ مشرقی رہی، نہ مغربی بنی۔ عجیب و غریب سانچے میں ڈھلتی رہی۔ اور اکبر بھی اپنے عجز و انکسار کے باوجود ساری عمر یہ تہذیبی جنگ لڑتے رہے۔ ناکامیوں اور مایوسیوں کے باوجود انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ مغربی تہذیب اپنے ساتھ الحاد، بے یقینی، نفس پروری، بے اخلاقی، بے راہ روی کا سیلاب لا رہی تھی۔ اکبر سیاسی محکومی کا کڑوا گھونٹ ظرافت کی حلاوت کے ساتھ حلق سے نیچے اتار سکتے تھے۔ ایک طالب صادق کی طرح مغربی علوم کو بھی خوش آمدید کہہ سکتے تھے۔ لیکن یہ تہذیبی مرحلہ ان کے لئے، ان کی قوم و ملت کے لئے سخت آزمائش کا تھا۔ یہاں سپر اندازی کا مطلب قوم کی مکمل

شکست اور ہمیشہ کی ذلت و رسوائی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا:

ہرگز نہیں ہم کو سلطنت کا افسوس　　ہے ابتریٔ معاشرت کا افسوس
انگریزوں پہ ہے بہت کم الزام اس کا　　ہے اپنے ہی مَیلِ معصیت کا افسوس!

کیونکہ "طالب حق کو فلک نے ان کا طالب کر دیا" تھا۔ اکبر کا غیر متزلزل عقیدہ تھا کہ آقا و مولائے یثرب کی متعین کردہ راہ سے ہٹ کر ہماری تہذیب و معاشرت کا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ حجازی تہذیب، باخدا تہذیب ہے اور اسلامی معاشرت حیادار معاشرت ہے۔ اس کی عبادات، اس کے معاملات، اس کی تفریحات، اس کا لباس، اس کی خوراک، اس کی رہائش، اس کے اسلوب حیات کے جملہ مظاہر عقیدۂ توحید و رسالت سے پھوٹتے ہیں موسمی اور مقامی تنوعات کے باوصف یہ تہذیب اپنے ہی محور یعنی دین حق کے گرد گھومتی ہے۔ دین سے بیگانہ ہو کر مسلمان کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ اس لئے اکبر ایسی مفاہمت کے قائل نہ تھے جس میں دین کو ہاتھ سے دینا پڑے"[۱۱] مصلحین قوم اور اکبر میں نزاع کا باعث درحقیقت اکبر کا یہی بے لچک رویہ تھا جو انہوں نے دین کے دفاع کے لئے ساری عمر اختیار کئے رکھا:

دل ہی دیتا تھا یہ، وہ دین بھی کرتے تھے طلب　　یہی باعث ہے کہ اکبر کی بتوں سے نہ بنی!

ہم یہ نہیں کہتے کہ سر سید احمد خاں کو اس تجربے کی ہلاکت آفرینی کا احساس نہیں تھا۔ یہ تو ماننا پڑتا ہے کہ وہ ایک جری مصلح تھے، اور ان کی "ڈسپاٹک" طبیعت میں انتہا پسندی موجود تھی"[۱۲] اس معاملے میں سر سید کے رفقاء نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی سمیع اللہ خاں، حالی، شبلی، نذیر احمد کے خیالات ان سے بہت مختلف اور اکبر کے بہت قریب تھے۔ خود سر سید کو بھی آخری زمانے میں اپنے تجربے کی ناکامی کا احساس ہو گیا۔[۱۳] کیونکہ نئی نسل جس رنگ میں سامنے آئی اس کا تو وہ تصور بھی نہ کرتے تھے:

نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے　　نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یاران خود آرا

تہذیبی جنگ کا یہ سلسلہ اکبر اور سر سید کے دور سے گزر کر کئی مرحلے طے کر چکا ہے۔ سیاسی تحریکوں نے بھی اس کا رخ بدلا۔ اقبال نے بھی تہذیب حاضر کے خلاف اعلان جنگ کر کے اس کے دباؤ کو بڑی حد تک کم کیا۔ لیکن کچھ ایسے

حقائق بھی سامنے آتے ہیں جو مسلمانوں کے مزاج کے حوالے سے ذرا غور طلب ہیں۔ ایک کھٹک قلب و ذہن میں اکثر محسوس ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو غیروں سے زیادہ اپنوں سے کیوں نقصان پہنچتا ہے؟ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک موقع پر اینٹی گاڈ سوسائٹی بنی[۱۴]۔ یہ شرف بھی ایک مسلم یونیورسٹی ہی کو حاصل ہوا تھا۔ کسی دوسری یونیورسٹی کو یہ اعزاز نہ مل سکا۔ پھر ملحد اساتذہ کی کمین گاہیں بھی مختلف محمڈن اینگلو اورینٹل یا اسلامیہ کالجوں میں ہی موجود رہیں۔ کسی دیانند اینگلو ویدک کالج، کسی سناتن دھرم کالج، کسی خالصہ یا مشن کالج کو یہ توفیق کبھی نصیب نہ ہو سکی!

وہ تو گرجا پر رُکا اور یہ گیا کعبے کو پھاند!

کوئی تحقیق کرنا چاہے تو یہ موضوع عبرت آموز ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی ہے کہ جو تعلیمی ادارے غریب مسلمانوں کے چندے سے بنے، ان میں اسلام کے خلاف یہ مورچے کیونکر قائم ہوئے؟ وجہ یہ ہے کہ مسلمان جب تک اپنے عقیدے اور ایمان پر قائم رہتا ہے، وہ فاسق و فاجر بھی ہو، پھر بھی اس میں قومی غیرت و حمیت باقی رہتی ہے۔ عقیدے سے منحرف ہو کر وہ اللہ و رسول ہی کا باغی نہیں ہوتا بے غیرت بھی ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ دورِ حاضر کی اس تہذیبی جنگ یا معرکہ روح و بدن کے سلسلے میں اکبر کا جدید ذہن سے کیا تعلق ہے؟

یہ امر اب کوئی راز نہیں رہا کہ تہذیب مغربی نزع کی حالت میں ہے۔ بھاپ سے گزر کر ایٹمی توانائی تک رسائی حاصل کر لینے اور چاند تک پہنچ جانے کے باوجود اہل مغرب کو دھرتی پر سیدھے سبھاؤ چلنا نہیں آیا۔ مشرق کا انسان تو ان کے ہاتھوں دکھی تھا ہی، اب خود ان کا گھر بھی دکھوں کی آگ سے جل رہا ہے۔ بدن پھنک رہا ہے، روح تڑپ رہی ہے۔ اکبر نے شاید اسی وقت کی پیش گوئی کی تھی:

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

آخر یہ ہزاروں، لاکھوں ہپی کس خوشی میں در بدر مارے مارے پھر رہے ہیں؟ یہ اجتماعی خودکشیاں کیوں ہو رہی ہیں! حقیقت میں یہ اس مادر پدر آزاد تہذیب کے مایوس العلاج مریض ہیں جنہیں "کھاؤ پیو اور عیش کرو" کا سبق دیا گیا تھا۔ اب یہ اس عیش مسلسل سے اکتا گئے ہیں۔ ان کی حیوانی خواہشات کی تسکین نہ خمر و خنزیر سے ہو رہی ہے، نہ چرس و افیون سے۔ اس تہذیب کا بھیانک انجام اب کوئی دور نہیں۔ لیکن حیرت تو اس بات پر ہے کہ ہمارے

کھاتے پیتے خوشحال گھرانوں کے چشم و چراغ ابھی تک اس لب گور تہذیب کے صیدِ زبوں بنے اپنی نیا و عاقبت خراب کر رہے ہیں!

دوسری طرف عالم اسلام کا ایک بڑا حصہ سیاسی محکومی کی زنجیریں توڑ کر حریت فکر و عمل کا متلاشی ہے۔ مسلم نوجوان اس کا ہراول ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا انقلاب ہے جس کے جلو میں پندرھویں صدی ہجری کا آفتاب عالمتاب اگلے سال طلوع ہو رہا ہے! اسلامی دنیا کی پسپائی کا زمانہ ختم ہوا۔ اب اس کی کارفرمائی کا دور شروع ہو رہا ہے۔ اس عالم میں اکبر اور اقبال اسلامی دنیا کے بہت بڑے فکری رہنما ثابت ہو سکتے ہیں۔ اقبال کے سامنے اس عصر نو کی سحر بے حجاب تھی[۱۱]۔ اکبر شب رفتہ کے مسافر تھے۔ لیکن اس مرد حق آگاہ نے کفر و الحاد کی اس شب تار میں بھی حجازی تہذیب کے چراغ کو اپنے آنسوؤں سے روشن رکھا اور اعلائے کلمۃ الحق سے کبھی منہ نہ موڑا!

وجد میں آئے حیرتوں میں رہے　　　عجز کے ساتھ لب کشائی کی
بندگی کا صلہ ملے نہ ملے　　　داد دے دی مگر خدائی کی

حواشی

۱-۲ - حیات اکبر، تالیف عشرت حسین: تسوید ملا واحدی

۳ - پیام مشرق، طبع اول۔

۴ - مکاتیب اقبال بنام گرامی، ص ۱۷۷۔

۵ - رموز بے خودی۔

۶ MACAULAY, T. B. MINUTES ON EDUCATION IN INDIA 1862 - P 115 -

۷ - "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" مشمولہ مقالات اقبال، ص ۱۳۲۔

۸ - تمہید پرچہ "تہذیب الاخلاق"

۹ - مسافران لندن، ص ۱۸۵۔

۱۰ - حیات جاوید (دیباچہ)

۱۱ - یہی بات اقبال نے بڈھے بلوچ کی زبانی ارشاد فرمائی ہے:

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا!

(ارمغان حجاز)

۱۲۔ مولانا حالی نے سرسید کے اس رجحان کا ذکر "حیات جاوید" میں کیا ہے ص ۲۲۲۔

۱۳۔ سرسید نے اپنے مکاتیب میں اور ان کے رفقانے اپنی تحریروں میں اس احساس کا اظہار کیا ہے۔

۱۴۔ بحوالہ "مکتوبات اقبال" بنام سید نذیر نیازی، ص ۲۰۰ تا ۲۰۴

۱۵۔ مسجد قرطبہ کے آخری بند کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

آب روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

عالمِ نَو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب!

(بال جبریل، ص ۱۳۶)

باقیات فراہی

مولانا فراہی کا ایک نادر غیر مطبوعہ خط

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی

مولانا فراہی کی حیات و خدمات پر ایک تحقیقی مقالہ مرتب کرنے کا منصوبہ مجھے ادارے کی طرف سے تفویض ہوا تو علمی حلقوں میں اس کا خیر مقدم کیا گیا مگر مجھے روز اول سے یک گونہ تامل اور قدرے تردد سا رہا اس لئے کہ راستے کی مشکلات اور عملی دشواریوں کا مجھے شروع ہی میں اندازہ ہو گیا تھا۔ پاکستان میں مواد کی نایابی اور ہندوستان کے سفر میں حائل پابندیوں کے پیش نظر اس منصوبے پر کوئی ڈھنگ کا کام کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آتا تھا۔ پھر بھی میں نے اس کام کا بیڑا اٹھانے کی جرأت کی۔ ابھی یہ کہنا تو مشکل ہے کہ میں اپنے نقشے اور معیار کے مطابق اس منصوبے کی تکمیل میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ بہر حال میری اس جرأت رندانہ کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میں نے بہت سی ایسی چیزیں تلاش کر ڈالیں جن کا سراغ لگانا آسان نہ تھا۔ گذشتہ دو برسوں میں میں نے ہندوستان کے دو سفر کئے۔ ہندوستان میں نقل و حرکت کی پابندیوں کے باوجود میں نے تلاش و جستجو میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ جوئندہ یابندہ۔ من جد وجد۔ اس جستجو میں بہت کچھ ہاتھ آیا۔ بعض ایسی دستاویزوں تک رسائی ہوئی جن کے ملنے کی بظاہر کوئی توقع نہ تھی۔ فالحمد للہ علی ذالک۔ ان میں سے بعض چیزیں جو زیادہ نادر اور اہم ہیں اور جن کے ضیاع کا اندیشہ ہے سوچا بلا تاخیر ان کو فکر و نظر کے صفحات میں محفوظ کر دیا جائے۔ مقالے کی ترتیب و اشاعت کے انتظار میں ان کو روکے رکھنا غیر ضروری ہی نہیں نقصان دہ نظر آیا۔

باقیات فراہی کی تلاش میں مجھے سب سے زیادہ ناکامی ان کے خطوط کے حصول میں ہوئی۔ سوانح حیات اور علمی خدمات کی ترتیب میں خطوط کو جو اہمیت حاصل ہے اس کے پیش نظر میں نے نہایت سرگرمی سے ان کی تلاش کی مگر افسوس کہ مجھے آخر تک کوئی قابل ذکر کامیابی نہیں ہوئی۔ اکا دکا خطوط کا مل جانا خوشی کی بات سہی اس سے مقصد حل نہیں ہوتا۔

یہ خیال کہ مولانا نے خطوط لکھے ہی کم ہوں گے درست معلوم نہیں ہوتا۔ فراہی کے نام شبلی کے خطوط چھپ چکے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے شبلی کے نام فراہی کے خطوط کی اہمیت کا باعتبار کیف و کم بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ فراہی نے کثرت سے خطوط لکھے، مفصل اور طویل خطوط لکھے، ان میں کتنے ہی اہم علمی مسائل پر گفتگو اور بحث تھی۔ کاش مولانا فراہی کے امینوں اور جانشینوں نے بروقت اس طرف توجہ کی ہوتی۔ خدا ہی جانے یہ علمی سرمایہ ناقدری زمانہ کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لئے تلف ہو گیا یا کہیں دفن کسی کوھکن کی آمد کا منتظر ہے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

ہندوستان کے سفر میں جو خطوط ہاتھ لگے ان میں سے ایک خط سر دست بصورت عکس قارئین کی نذر ہے۔ یہ خط علمی اعتبار سے کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں پھر بھی اس سے فراہی کی شخصیت اور کردار کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ مولانا کی شخصیت پر دین اور دینی تعلیمات کا جو اثر تھا اس کا پرتو اس خط کی ہر ہر سطر سے نمایاں ہے اس خط کے لئے میں مدرستہ الاصلاح سرائے میر کے نائب ناظم احمد محمود صاحب کا شکر گزار ہوں۔ یہ خط اس وقت انہی کی ملکیت ہے۔ احمد محمود صاحب مدرستہ الاصلاح میں میرے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق   او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

زمانۂ طالب علمی سے میرے اور ان کے درمیان ایک طرح کا خصوصی ربط و تعلق ہے۔ نہیں معلوم انہوں نے اس دیرینہ تعلق کا پاس کیا یا ان کی شرافت نفس نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنی متاع عزیز یوں ایک پردیسی کے حوالہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے جس طرح اس خط کو حرز جاں بنا کر رکھ رکھا تھا واقعہ یہ کہ اسے میرے حوالہ کر کے انہوں نے بڑے ایثار کا ثبوت دیا۔ انہوں نے اس شرط پر پاکستان لانے کی اجازت بھی دے دی کہ میں کام لینے کے بعد اصل بحفاظت انہیں واپس کر دوں گا۔ انہوں نے مجھ پر اعتماد کیا اور میں نے ان کے اعتماد کو مجروح نہیں کیا۔

ہر چند کہ اس خط کی استنادی حیثیت مسلم تھی پھر بھی میں نے احمد محمود صاحب سے سوالات کر کے اس کی پوری تاریخ معلوم کی۔ احمد محمود صاحب خود اصلاحی ہیں اور آج کل اس مدرسہ کے نائب ناظم ہیں، مولانا فراہی عین حیات جس کے ناظم رہے، اس لئے فراہی کے ساتھ ان کی نسبت اور فراہی کے خط کے ساتھ ان کی دلچسپی کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔ رہا یہ سوال کہ یہ خط ان تک کیسے پہنچا۔ تو انہیں یہ خط اپنے سسرالی عزیزوں سے ملا۔ یہ خط حکیم یوسف صاحب کے خاندان میں تھا۔ جن کی نواسی احمد محمود صاحب سے منسوب ہیں۔ حکیم صاحب شبلی

بھی ہم وطن اور قرابت دار تھے۔ شبلی اور فراہی کے خاندانوں میں کئی پشتوں سے دو طرفہ تعلقات اور رشتہ داریوں کا سلسلہ ہے۔ حکیم یوسف فراہی کے شاگرد بھی تھے۔ فراہی کی ایک پوتی حکیم یوسف کے ایک لڑکے سے بیاہی گئی۔ وغیر ذالک۔

یہ خط مولانا نے ۱۹۰۴ء میں کراچی سے اپنے صاحبزادے محمد سجاد صاحب کو لکھا۔ سجاد صاحب ابھی حیات ہیں۔ گو ان کی عمر اسی (۸۰) سے متجاوز ہو چکی ہے عمر کے لحاظ سے ان کی صحت اچھی ہے۔ یہ خط میرے ہاتھ آیا تو میں نے ان کے گاؤں جاکر انہیں دکھایا۔ انہوں نے تصدیق کی کہ خط ان کے والد ہی کا ہے اور انہی کے نام ہے انہوں نے مجھے ایک تحریر بھی لکھ کر دی جو کاغذات میں کہیں گم ہو گئی اور تلاش کے باوجود نہیں ملی۔ خط کے کاغذ، روشنائی، مضمون اور تحریر، ہر بات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ خط انہی کے ہاتھ کا ہے۔ خط کی تحریر بڑی پاکیزہ یکساں اور پختہ ہے۔ مولانا کے مسودوں کی تحریر کا انداز بھی تقریباً یہی ہے۔ پنسل سے لکھے ہوئے مسودوں کی اصل دائرہ حمیدیہ میں محفوظ ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ صفحات کے صفحات اسی طرح خوبصورت اور خوشخط انداز پہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ سطریں ایسی سیدھی اور برابر ہوتی ہیں جیسے کہ سانچے میں ڈھلی ہوں۔ یہ خط وفات سے ۲۵ سال پہلے کا ہے اس لئے اس میں قلمی مسودات کی نسبت صوری نظم و انضباط کم ہے۔

خط کی تاریخ اور ظاہری پہلوؤں کے بعد خط کے متن اور معنوی پہلوؤں پر نظر ڈالیں تو اس میں کئی باتیں توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتی ہیں۔ القاب میں نور چشمی، نور نظر، قرۃ العین، لخت جگر، برخوردار وغیرہ کی بجائے سیدھے سادے طریقے پر "عزیزمن" سے خط کا آغاز کرتے ہیں۔ معاشرتی طور پر دستور سا بن گیا ہے کہ خط میں چھوٹوں کو سلام کی بجائے دعائیہ کلمات سے یاد کرتے ہیں۔ مثلاً طول عمرہ۔ خوش رہو وغیرہ۔ لیکن مولانا ایک بچے کو بھی مسنون طریقے پر "السلام علیکم" لکھتے ہیں۔ معروف اور مروج طریقوں سے ہٹ کر وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جس میں ارشاد رسول "افشوا السلام" کی تعمیل اور اتباع سنت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کے بعد خط کے متن پر نظر کریں تو اول تا آخر ایک ایسے مسلمان باپ کی تصویر سامنے آتی ہے جو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت، اصلاحی خطوط پر کرنے کے لئے فکرمند بلکہ کوشاں نظر آتا ہے۔ ہزاروں میل دور رہ کر بھی انہیں نہ صرف بچوں کی تعلیم کا خیال ہے بلکہ صحیح دینی تربیت کا بھی۔ چہ صفحہ لکھنے کی عام باتوں سے لے کر نماز تک کے لئے تاکیدی تلقین ہے۔ دیندار

مسلمان گھرانوں میں بچے کو سات سال کی عمر سے نماز کی تاکید شروع ہو جاتی ہے۔ بلکہ ضرورت پڑنے پر بچے کو بدنی سزا بھی دیتے ہیں۔ یہ خط جس وقت لکھا گیا سجاد صاحب کی عمر سات سال ہو چکی تھی۔ ۱۸۹۰ء ان کا سن پیدائش ہے۔ بات کہنے کے انداز کو دیکھیں تو "خاطبوا الناس علی قدر عقولہم" کے پُر حکمت اسلوب کی جھلکیاں بھی اس خط میں صاف نظر آئیں گی۔ زبان اور مطالب دونوں پہلوؤں سے اس کا لحاظ ان کے مدنظر ہے۔ وہ ہفت سالہ بچے سے اس کی سطح پر اتر کر بات کرتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اسی میں اسے اس کی سطح سے اوپر اٹھانے کے اہتمام کا مشاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس عمل میں حزم و احتیاط کے وہ تمام نکتے ان کے پیش نظر رہتے ہیں جو کسی نرم و نازک شے کو برتنے میں ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

مولانا شاعر بھی تھے۔ شاعری میں انہوں نے زیادہ تر صنف قصیدہ کو ہی برتا ہے۔ قصیدے میں ایک چیز "گریز" ہوتی ہے۔ مطلع کے بعد تشبیب سے گذر کر جب شاعر مدح پر آتا ہے تو تشبیب اور مدح کو ملانے والی بیچ کی کڑی "گریز" کہلاتی ہے۔ گریز شاعر کے لئے ایک دشوار گذار گھاٹی ہوتی ہے۔ اور اس گھاٹی کو عبور کرنے میں اس کی فنی مہارت کا امتحان ہوتا ہے۔ مولانا نے اس خط میں ایک جگہ بڑی خوبی سے نہیں معلوم شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر، صنف قصیدہ والے گریز کا استعمال کیا ہے۔ "جس قدر تم کو مجھ سے ملنے کا شوق ہے اسی قدر یا اس سے زیادہ مجھ کو تم سے ملنے کا شوق ہے"۔ ایک انسان سے ایک انسان کے ملنے کا شوق یا علاقہ تضائف رکھنے والے باپ بیٹے کا ایک دوسرے سے ملنے کا شوق ایک معمولی بات سے زیادہ نہیں۔ اس سے فائدہ اٹھا کر مولانا نے کس طرح خدا اور بندے کی ملاقات کا مضمون پیدا کیا ہے اہل نظر اور اصحاب ذوق ہی اس کی داد دے سکتے ہیں۔ "جو بندہ خدا سے ملنے کا شوق رکھتا ہے اس سے زیادہ خدا اس سے ملنے کا شوق رکھتا ہے"۔

مولانا کے حالات زندگی میں یا ان کی تحریروں میں تصوف کا ذکر نہیں ملتا اور یہ پتا نہیں چلتا کہ تصوف کے بارے میں ان کا نظری یا عملی رویہ کیا تھا۔ بہرحال اسلام سے الگ اسلامی تصوف یا روحانیت نام کی کوئی چیز اگر خارج میں اپنا وجود رکھتی ہے تو ایک صحیح الفکر مسلمان کے نقطہ نظر سے اس کا اطلاق جس بات پر ہو سکتا ہے اس کا عکس اس خط میں دیکھا جا سکتا ہے۔ باپ بیٹے کے شوق ملاقات کے ذکر سے خدا اور بندے کی ملاقات اور دو طرفہ تعلق کی بات پیدا کر کے نماز کی طرف توجہ اور نماز کے متعلق سلسلہ تلقین کا موقع نکالنا کسی ایسے دل دماغ ہی

کا کام ہو سکتا ہے جس میں دین کے سوا کسی اور چیز کے لئے جگہ نہ ہو۔

تصنیف و تالیف میں مولانا نے عربی کو ذریعہ اظہار خیال بنایا ہے۔ فارسی میں بھی بعض چیزیں مل جاتی ہیں۔ لیکن اُردو اس لحاظ سے محرومی کا شکار رہی۔ مگر جہاں تک خطوط کا تعلق ہے بالعموم وہ اردو ہی میں لکھتے تھے۔ ان کے اردو خطوط مل جائیں تو زبان و ادب کے اعتبار سے ان کا مطالعہ تاریخ ادب اُردو، بالخصوص اُردو مکتوب نگاری کی ایک کڑی کی حیثیت سے یقیناً دلچسپ اور مفید ہوگا۔ زیر بحث خط ایک کمسن بچے کے نام ہے پھر بھی اُردو زبان وادب کے پارکھ زبان و بیان کے لحاظ سے اس خط کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مولانا کی زبان، اسلوب بیان اور طرز تحریر پر تفصیل سے پھر کبھی لکھا جائے گا۔ بالفعل اس طرف اشارہ ہی کیا جا سکتا ہے۔

اس خط میں ایک اور بات قابل توجہ مولانا کی طرز املا ہے۔ خاص کر وہ مقامات جہاں موجودہ طرز املا سے انحراف ہے۔ ہائے ہوز مخلوط و غیر مخلوط لکھنے میں انہوں نے کسی ایک قاعدے کی پابندی نہیں کی ہے۔ ایک طرف وہ تمہارا، بھیجنے، مجھ، تھی، لکھنا، پڑھنا، ڈیڑھ، بھی، رکھنا چھپ، سکھلانا، دیکھنا جیسے الفاظ میں ہائے مخلوطی (دوچشمی) نہیں لکھتے تو دوسری طرف نہایت جیسے الفاظ میں دوچشمی لکھتے ہیں۔ جبکہ ہوئی، ہی، ہاں چاہیئے، مہینے، یہاں، یہی، ظاہر، رہیں، ہیں میں انہوں نے دوچشمی نہیں لکھی ہے۔

ایک اور فرق یائے معروف اور یائے مجہول کے استعمال میں نظر آتا ہے۔ اس خط میں "ہے" یائے معروف کے ساتھ بھی ہے اور یائے مجہول کے ساتھ بھی۔

یائے معروف و یائے مجہول میں وہ دو نقطے لگاتے ہیں۔ مثلاً سیے، مرجایے ہی (ہے) دیے، ڈالیے۔ اس کو اوس یعنی واو کے ساتھ لکھا ہے۔

کہیں کہیں دو لفظوں کو ملا کر لکھا ہے مثلاً تمنے (تم نے) مجھکو (مجھ کو) بگڑنیکا (بگڑنے کا) تمکو (تم کو) مجھسے (مجھ سے) اسیقدر (اوسی قدر) چھپکر (چھپ کر) وغیرہ

خط کا متن

۱۷ اکتوبر ۱۹۰۴ء۔

عزیز من سجاد سلمہ

السلام علیکم۔ تمہارا خط ملا۔ نہایت خوشی ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم لوگوں کو صحت بخشی۔ اب کی بار تم نے خط بھیجنے میں دیر کی۔ مجھ کو امید تھی کہ تم جلد جلد خط لکھا کرو گے۔

کاپی پر لکھنا ضرور ہے۔ بگڑنے کا مضائقہ نہیں۔ ہاں پڑھنے اور لکھنے میں برابر محنت کرنی چاہیئے۔ بلکہ لکھنے میں زیادہ۔

تمہارے لئے چاقو میں نے قصداً نہیں بھیجا۔ مگر آؤں گا تو لیتا آؤں گا۔

ڈیڑھ مہینے کے بعد یہاں تعطیل ہوگی۔

جس قدر تم کو مجھ سے ملنے کا شوق ہے اسی قدر یا اس سے زیادہ مجھ کو تم سے ملنے کا شوق ہے۔ اور یہی حال خدا کا بھی ہے۔ جو بندہ خدا سے ملنے کا شوق رکھتا ہے اس سے زیادہ خدا اس سے ملنے کا شوق رکھتا ہے۔ نماز میں خدا بندے سے چھپ کر ملتا ہے۔ اگر وہ ظاہر ہو تو اس کی روشنی سے بندہ مر جائے۔ اس لئے ظاہر نہیں ہوتا۔ مگر اس کے پاس ضرور آتا ہے۔ اور جو خوب دل لگا کر نماز پڑھتا ہے تو خدا کی خوشبو اس کو معلوم پڑتی ہے۔ اب تم کو چاہیئے اپنا بدن اور کپڑا صاف رکھو اور نماز پڑھو۔ مولوی صاحب سے عرض کرو کہ تم کو نماز سکھلا دیں اور ہمیشہ یاد دلاتے اور نصیحت کرتے رہیں۔ میں بہت خوش ہوں گا جب سنوں گا کہ تم باقاعدہ نماز پڑھنے لگے۔ میں یہی دعا کرتا ہوں کہ خدا تم کو نیکی کا شوق دے۔ اور نماز کی محبت دل میں ڈالے۔ کیونکہ نماز سے تمام نیکیاں پیدا ہوتی ہیں۔

زیادہ دعا

حمیدالدین

دیکھو خط جلد لکھنا۔

اصل خط کا عکس

82289 7.4.52 ۱۰ اپریل ۵۲ء

عزیزمن سجاد

السلام علیکم۔ تمہارا خط ملا۔ نہایت
خوشی ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم لوگوں کو
صحت بخشی۔ ابھی تمنے خط بھیجنے میں
دیر کی۔ مجھکو امید ہے کہ تم جلد جلد خط
لکھا کرو گے۔

ہاں پر لکھنا ضرور ہے۔ بگڑنیکا مضائقہ نہیں
ان پڑھیں اور لکھنے میں برابر محنت کرتی
جاویں۔ بلکہ لکھنے میں زیادہ۔

تمہارے لئے جاتو ہیں قصداً نہیں بھیجا۔ تم
آؤ شاید تو لیتا آؤنگا۔

ڈیڑھ مہینے کے بعد یہاں تعطیل ہوگی۔

جس قدر تمکو مجھسے ملنے کا شوق ہے اسقدر
بلکہ اوس سے زیادہ مجھکو تمسے ملنے کا شوق ہے

اور یہی حال خدا کا بھی ہے: جو بندہ خدا سے
ملنے کا شوق رکھتا ہے اوس سے زیادہ
خدا اوس سے ملنے کا شوق رکھتا ہے۔ نماز میں
خدا بندہ سے چھپکر ملتا ہے اگر وہ ظاہر ہو تو
اوسکی روشنی سے بندہ مرجائے۔ اسلئے ظاہر
نہیں ہوتا مگر اوسکے پاس ضرور آتا ہے اور
جو خوب دل لگا کر نماز پڑھتا ہے تو خدا کی خوشبو

اور سنکر معلوم ہوا ہے۔ اب تمکو چاہئے

اپنا بدن اور کپڑا صاف رکھو اور نماز پڑھو

مولوی صاحب سے عرض کرو کہ تمکو نماز سکھلا دیں

اور ہمیشہ یاد دلاتے اور نصیحت کرتے رہیں۔

میں بہت خوش ہونگا جب سنونگا کہ تم باقاعدہ

نماز پڑھنے لگے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں

کہ خدا تعالیٰ نیکی کا شوق دے۔ اور نماز کی محبت

دل میں ڈالے۔ کیونکہ نماز سے تمام نیکیاں

پیدا ہوتی ہیں۔ زیادہ دعا۔

حمید الدین

دیکھو خط جلد لکھنا۔

قرآن میں ناسخ و منسوخ کا مسئلہ

خلیل الرحمٰن

ماہنامہ "فکر و نظر" بابت ماہ نومبر۔دسمبر ۱۹۶۹ء میں "اسلام کا نظام حکومت و طریق انتخاب اولی الامر" کے عنوان سے جناب حافظ محمد لطیف کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں حافظ صاحب ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں :۔

"یہ امر بھی تسلیم شدہ ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں میں عمل نسخ تسلیم کیا جاتا ہے اور یہ عمل ایک نص سے دوسری نص میں ترمیم و اضافہ شمار ہوتا ہے"۔

اپنے اس نقطہ نظر کی تائید میں انہوں نے قرآن کریم کی درج ذیل آیت پیش کی ہے : "ما ننسخ من ایۃ او ننسھا نأت بخیر منھا او مثلھا الم تعلم ان اللہ علی کل شئ قدیر"۔

اور اس میں آیت سے قرآن کریم کی آیت مراد لیا ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ "ہم (قرآن کی) جو آیت منسوخ کرتے ہیں یا اسے فراموش کر دیتے ہیں اس کی جگہ اس سے بہتر یا اسی کی طرح کی آیت لاتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر ایک چیز پر قادر ہے"۔

مجھے صاحب مقالہ کے "قرآن کریم میں ناسخ و منسوخ" کے نقطہ نظر سے اختلاف ہے اور اس کے متعلق میں قرآن کریم ہی کی روشنی میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ آیت مذکورہ میں جو لفظ "آیۃ" آیا ہے، سارے قرآن کریم کو پڑھنے کے بعد بھی کہیں سے یہ مستنبط نہیں ہوتا کہ اس سے مراد قرآن کریم کی کسی آیت کی تنسیخ ہے۔ قرآن کی کسی آیت کا مفہوم متعین کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھا جائے۔ اس سے پہلے کی آیت کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ :۔

"اہل کتاب میں سے جو کافر ہیں پسند نہیں کرتے اور نہ ہی مشرک کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی (خیر) اتاری جائے اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے"۔

اہل کتاب میں یہود یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ توریت ہی آخری کتاب اور شریعت ہے اس لئے اس کے بعد کوئی اور کتاب نازل ہونے والی نہیں۔ اور نصاریٰ کا یہ دعویٰ تھا کہ انجیل ہی آخری کتاب ہے اس کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ کوئی کتاب اور شریعت نازل ہوگی۔ اس لئے جب آنحضرت صلعم مبعوث ہوئے اور آپ پر بذریعہ وحی قرآن کریم کا نزول شروع ہوا تو اہل کتاب نے اس کا انکار کیا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر کوئی اور کتاب نازل ہوگی تو ضرور ہے کہ اس سے قبل کی نازل شدہ کتابوں کی تعلیم کو منسوخ یا ترمیم شدہ قرار دیا جائے گا۔ یہ بات انہیں پسند نہ تھی۔ اسی لئے انہوں نے یہ کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحی نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) یہ شخص اپنی طرف سے گھڑ گھڑ کر آیات پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ ان کے اس باطل خیال کی تردید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم جو احکام یا پیغام منسوخ کرتے یا انہیں فراموش کر دیتے ہیں ان سے بہتر یا ان کے مثل لانے پر قادر ہیں۔ یعنی قرآنی تعلیمات بحیثیت مجموعی توریت اور انجیل کی تعلیمات سے بہتر ہیں اور کچھ ان کے مثل ہیں۔ چونکہ سابقہ تعلیمات "مختص القوم" اور "مختص الزمان" تھیں جبکہ قرآنی تعلیمات رہتی دنیا تک ساری نسل انسانی کے لئے ہیں، اس لئے ضروری تھا کہ ان میں ترمیم و تنسیخ ہوتی۔ اس لئے یہ ارشاد قرآن کی کسی آیت کی تنسیخ کے متعلق نہیں ہے بلکہ سابقہ کتب مقدسہ کی تنسیخ کے متعلق ہے۔

۲۔ قرآن کریم کی دوسری آیت جو ناسخ و منسوخ فی القرآن کے نظریے کو غلط ٹھہراتی ہے سورۂ النحل کی آیت مندرجہ ذیل ہے :-

"واذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ واللہ اعلم بما ینزل قالوا انما انت مفتر بل اکثرھم لا یعلمون۔" (النحل - ۱۰۱)

اگر قرآن کریم کی کسی آیت کی جگہ بدل کر دوسری آیت نازل کی جاتی اور بعد میں نازل ہونے والی آیت پہلی آیت کو منسوخ کر دیتی تو مخالفین کو اس پر اعتراض کی کیا ضرورت تھی جیسا کہ لفظ "قالوا" سے ان کا اعتراض ظاہر ہوتا ہے۔ وہ نہ تو پہلی آیت کو ماننے والے تھے نہ دوسری کو۔ اسی طرح کافروں کو یہ کہنے کی بھی حاجت نہیں تھی کہ "انت مفتر"۔ "تو افترا کرنے والا ہے"۔ قرآن کریم میں جو احکامات بذریعہ وحی نازل ہو رہے تھے وہ مسلمانوں کے لئے تھے نہ کہ انکار کرنے والوں کے لئے۔ دراصل بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے نزول کے ساتھ سابقہ شرائع یا تو منسوخ ہو گئیں یا ان میں ترمیم ہو گئی۔ اس لئے کافروں کو اعتراض ہوا اور انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ "انما انت مفتر" یہ تیری اپنی گھڑی ہوئی باتیں ہیں اور خدا کی طرف سے تجھ پر نازل نہیں ہوئیں اور ہماری شرائع باقاعدہ موجود اور بدستور قابل عمل ہیں۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی کوئی

آیت منسوخ نہیں اور آیات کو آپس میں تطبیق نہ دے سکنے کی وجہ سے یہ غلط نظریہ راہ پا گیا ہے۔

۳۔ تمام مسلمانوں کا یہ ایمان ہے کہ اس وقت ان کے ہاتھوں میں جو قرآن ہے یہ وہی قرآن ہے جو آنحضرت صلعم پر آپ کی ۲۳ سالہ مکی اور مدنی زندگی کے دوران نازل ہوا۔ اب اگر اسی قرآن میں وہ آیات بھی موجود ہیں جو منسوخ ہو چکی ہیں اور جن کی تعداد میں بھی شدید اختلاف ہے اور وہ بھی ہیں جو ان کی ناسخ ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک حکم نازل کیا کہ اس پر عمل کرو اور پھر اس کو منسوخ کر کے دوسرا حکم نازل کیا کہ اب اس پر عمل کرو، اور یہ دونوں قسم کے احکام اب بھی قرآن میں موجود ہیں۔ یعنی العیاذ باللہ قرآن میں اختلاف، تضاد اور تناقض پایا جاتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ :۔

افلا یتدبرون القرآن ؕ ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً ۰

ترجمہ" کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں کثرت سے اختلاف پاتے"۔ قرآن میں تدبر نہ کرنے کی وجہ سے ہی یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں ناسخ اور منسوخ آیات پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ عدم تدبر کی بنا پر ہی آیات میں تطبیق نہیں دی جا سکی ورنہ یہ مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ قرآن کریم میں ناسخ اور منسوخ کو مان لیا جائے تو پھر اسے "من عند غیر اللہ" ماننا ہوگا اور معترضین کا یہ اعتراض تسلیم کرنا پڑے گا کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلعم آیات اپنی طرف سے بنا کر پیش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ اور مخالفین اسلام کا یہ کہنا بھی درست ماننا پڑے گا کہ :۔

" اور ہم جانتے ہیں کہ وہ (کافر) کہتے ہیں کہ اسے تو ایک انسان سکھاتا ہے۔ (لیکن) اس کی زبان جس کی طرف یہ (سکھانے کی) نسبت کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ کھلی عربی زبان ہے"۔ (النحل ۱۰۳) خدا تو حکیم، علیم اور خبیر ہے۔ اس کے کلام میں تناقض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۴۔ اگر قرآن کریم میں ناسخ و منسوخ کو مان لیا جائے تو نہ قرآن کریم مکمل اور پر حکمت کلام باقی رہتا ہے اور نہ دین اسلام جو اس پر مبنی ہے۔ لیکن اس کے برعکس قرآن کریم فرماتا ہے :۔

"وتمت کلمت ربک صدقاً وعدلاً لا مبدل لکلمتہ وھو السمیع العلیم"۔

ترجمہ : اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ کمال کو پہنچ گئی۔ کوئی اس کی باتوں کو بدلنے والا نہیں

ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی باتوں کو دوسرا کوئی نہیں بدل سکتا انہیں خود اللہ تعالےٰ ہی بدل سکتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی کچھ باتیں بدلیں یعنی قرآن کی آیات منسوخ کیں اور ان کی جگہ دوسری آیات نازل فرمائیں تو ان کا علم آنحضرت صلعم کو لازماً ہونا چاہیئے تھا اور آپ اپنی امت تک یہ باتیں پہنچاتے لیکن ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت نہیں کہ آپ نے اپنے قول یا فعل سے یہ بتایا ہو کہ فلاں آیت منسوخ ہوگئی ہے اور اس کی جگہ مجھ پر فلاں آیت اتری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ منسوخ شدہ آیات کو قرآن کریم میں درج کرنے یا حفاظت کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ اس سے امت میں اختلاف پیدا ہوتا۔ مختلف گروہ اپنے مختلف عمل کے لئے قرآن سے سند لاتے اور "امة واحدة" کا تصور جو قرآن نے پیش کیا ہے ختم ہو جاتا۔ یہ مسئلہ بعد میں آنے والے ان لوگوں کا ہے جو قرآن کی آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ تطبیق دینے میں ناکام رہے۔ ناسخ و منسوخ آیات کی تعداد میں ان کے درمیان اختلاف سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اور ہمارے لئے یہ مناسب نہیں کہ ہم قرآن کے مقابلے میں ان کے استنباط کو ترجیح دیں بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ ہمارے پاس آنحضرت صلعم کی جن پر قرآن نازل ہوا کوئی سند نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ آیات کی تنسیخ سے مراد گذشتہ شرائع یعنی توریت اور انجیل کی تعلیمات میں تنسیخ اور ردو بدل ہے نہ کہ قرآن کی آیات میں۔

اگر اس مسئلہ پر کوئی صاحب روشنی ڈالیں اور میری غلط فہمی کو دور کریں تو میں ممنون ہوں گا۔ لیکن جو کچھ کہا جائے اس کے لئے دلائل پیش کئے جائیں۔ اور یہ بھی بتایا جائے کہ فلاں فلاں آیات منسوخ ہیں اور ان کی جگہ یہ یہ آیات نازل ہوئی ہیں اور اس کا مقصد یہ تھا۔

مولانائے روم کے مکاتیب

ڈاکٹر محمد ریاض

مولانا جلال الدین محمد رومی (۶۰۴ھ - ۶۷۲ھ) کی تین تصانیف ہمارے ہاں متداول ہیں: مثنوی، دیوان کبیر (دیوان شمس تبریزی) اور "فیہ ما فیہ"۔ چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا کہ ان کی دو دیگر تصانیف ترکی میں شائع ہوئی تھیں: "مجالس سبعہ" (سات مجالس یا مواعظ) اور "مکتوبات" جن کی کل تعداد ۱۴۵ ہے[1]۔ یہ دونوں کتابیں ایران میں دوبارہ بھی شائع ہوئیں[2]۔ مگر ہمارے ہاں تصانیف رومی سے غیر معمولی دلچسپی کے باوجود ان کے بارے میں لوگ کم جانتے ہیں۔ اس وقت مکتوبات رومی کا ایک تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ "مجالس سبعہ" پر گفتگو پھر کبھی کی جائے گی انشاءاللہ۔

رومی، بلخ میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں انہوں نے ایران اور عرب ممالک کا سفر کیا اور آخر ترکی کے شہر قونیہ کو انہوں نے اپنا مستقر بنا لیا۔ وہ مدرس اور متکلم تھے مگر کوئی ۳۸ برس کی عمر میں شمس تبریزی کی ملاقات نے ان کی کایا پلٹ دی۔ شمس تبریزی اپنی زندگی کے آخری تین سال (۶۴۲ - ۶۴۵ھ) رومی کے ساتھ رہے۔ ان کی صحبت نے رومی کو ایک روشن ضمیر صوفی بنا دیا۔ اس کے بعد بھی رومی اگرچہ صحو و ہوش کے حامل رہے، اور کسب معاش کی خاطر فتوے لکھا کرتے تھے، مگر جذب و مستی ان کی زندگی کا لازمی جزو بن گیا تھا۔ "مجالس سبعہ" کے بعض حصوں کو چھوڑ کر رومی کی جملہ تصانیف ۶۴۵ھ کے بعد ہی لکھی گئی ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب رومی ایک محترم مرشد تھے۔ سلاجقہ روم، ان کے وزراء اور امراء، علماء اور قضاۃ، نیز قونیہ اور اطراف روم کے عمائد و مشاہیر سب ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ رومی کے ارادت مندوں کی تعداد کئی ہزار رہی ہے۔ اس لئے ان کے خطوط اور رقعات کی تعداد قیاساً زیادہ ہونی چاہیے تھی، مگر مطبوعہ کتب خانوں میں محفوظ خطوط کی کل تعداد ۱۴۵ ہی ہے۔ جبکہ ان کے سوانح نگاروں نے چند ہی خط نقل کئے تھے۔ بیسویں صدی عیسوی میں رومی کے سوانح یا افکار پر جو کتابیں

لکھی گئیں، استاد بدیع الزمان فروزانفر (م ۱۹۷۰ء) کی سوانحی کتاب کے سوا کسی کتاب میں "مجالس سبعہ" یا "مکتوبات" کا ذکر نہیں ملتا۔

مکتوبات کے موضوعات میں وہ تنوع اور رنگا رنگی نہیں ہے جو رومی کی دیگر کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ بیشتر خطوط وزراء اور امراء کے نام سفارشی یا تعارفی رقعے ہیں۔ کچھ خط قضاۃ، علماء، احباب، رشتہ داروں یا مریدوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ ان میں بھی زیادہ تر سفارش، تعارف، خانگی باتیں یا نصیحتیں ہیں۔ علم و عرفان کی باتیں خال خال نظر آتی ہیں۔ خطوط ضخامت کے اعتبار سے البتہ مختلف ہیں۔ کوئی خط آدھے صفحے کا ہے تو کوئی چار یا پانچ صفحے کا۔ رومی ایک نکتہ آفریں شاعر اور مصنف تھے۔ انہوں نے خطوط میں بھی بات سے بات پیدا کی ہے۔ ہر خط کا آغاز "اللہ مفتح الابواب" کے کلمات سے کیا ہے۔ چند خطوط کے سوا باقی خطوط میں مکتوب الیہم کے نام متن کے ساتھ درج کئے ہیں۔ ان کے مکتوب الیہم میں قابل ذکر یہ ہیں۔ فرزندان رومی، سلطان ولد، علاؤ الدین اور امیر عالم ظفر الدین (چلپی عالم)۔ زوجہ سلطان ولد (فاطمہ خاتون)۔ امیر امین الدین میکائیل۔ امیر تاج الدین معتز۔ امیر جلال الدین قراطای، شیخ صلاح الدین زرکوب۔ سیف الدین امیر۔ سید شرف الدین سمرقندی (رومی کے خسر) شیخ صلاح الدین ملطی۔ ظہیر الدین امیر۔ قاضی عز الدین۔ امیر مجد الدین۔ امیر نجم الدین سپہ سالار۔ شیخ کریم الدین محمود۔ جلال الدین رومی (امیر قونیہ)۔ امیر نور الدین۔ امیر کمال الدین قونوی اور امیر معین الدین پروانہ۔ ان میں سے اکثر نام کئی کئی خط ہیں آخر الذکر امیر پروانہ کے نام ۳۰ خط لکھے گئے ہیں۔ امیر پروانہ سلاجقۂ روم کا ایک نامور امیر رہا ہے۔ (م ۶۷۵ھ) اس کی سخاوت، بخشش اور لیاقت کی بڑی شہرت تھی۔ دوسرے امراء، اعیان و شیوخ کے حالات تاریخ ابن بی بی مناقب العارفین اور مسامرۃ الاخبار میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ باقی مکتوب الیہم ان کے مرید اور رشتہ دار ہیں۔

رومی کے ۴ مکتوب (۱۳، ۱۴، ۴۰، اور ۶۴) عربی میں ہیں اور باقی فارسی میں۔ قرآن مجید کی آیات، احادیث، عربی امثال و حکم اور عربی و فارسی اشعار تقریباً ہر خط میں ملتے ہیں۔ دیگر تصانیف کی طرح مکتوبات میں رومی نے حکایات اور تمثیلات سے کام لیا ہے۔ رومی کا زمانہ چنگیز اور ہلاکو کی سفاکیوں کا زمانہ تھا۔ منگولوں کی غارت گری نے لوگوں کو ذہنی اور روحانی پریشانیوں کے علاوہ، معاشرتی مشکلات میں بھی مبتلا کر رکھا تھا۔

طوائف الملوکی اور بدامنی کا دور دورہ تھا۔ بے روزگاری عام تھی اور لوگ اپنے معمولی حقوق سے بھی محروم تھے۔ ذرا ذرا سی افواہیں سن کر سلاطین، وزراء اور امراء لوگوں کو جیلوں میں ڈال دیتے تھے۔ مکاتیب رومی کو اس وقت کے حالات کے پس منظر میں دیکھنا چاہیئے۔ انہوں نے ستم رسیدہ اور پریشان حال خلق خدا کی مدد کے لئے سلاطین اور اعیان و اکابر سے اپیلیں کی ہیں۔ ان خطوط میں رومی کا انداز بیان جرأتمندانہ ہے۔ وہ اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے مدد مانگتے ہیں۔ وہ آیات و اخبار، تمثیلات اور حکم کے ذریعے مکتوب الیہم کو دوسروں کی مدد کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔ ان میں کئی قسم کی مدد کی درخواستیں ہیں۔ وہ مغضوب و مقہور اور ملازمت سے برخاست شدہ ملازمین کی صفائی پیش کرتے ہیں۔ قضاۃ اور وکلاء کو لکھتے ہیں کہ فلاں یتیم کو اس کا حق دلوائیں اور اس کی موروثی املاک بحال کروائیں۔ وہ پریشان حال لوگوں کی مالی مدد کی درخواست کرتے ہیں۔ بے روزگاروں کو روزگار دلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لوگوں کے تنازعات اور مناقشات رفع کرواتے ہیں۔ نوجوانوں کو آمادہ کرتے ہیں کہ وہ ازدواجی زندگی گذاریں۔ ان کو روزگار دلواتے ہیں۔ خانقاہوں اور مساجد میں اہل علم، شیوخ، ائمہ اور اساتذہ کی تقرری کی سفارش کرتے ہیں۔ لوگوں کو تجارتی سہولتیں دلواتے ہیں تاکہ مالی پریشانیوں سے انہیں نجات ملے۔ اس طرح وہ لوگوں کی دنیا سنوار کر انہیں عقبیٰ کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان مکتوبات میں رومی کی شخصیت ایک عالم باعمل کی نظر آتی ہے۔

رومی کے فرزند اکبر سلطان ولد (۶۲۳ - ۷۱۲ھ) کی شادی ان کے دوست شیخ صلاح الدین زرکوب کی بیٹی فاطمہ خاتون کے ساتھ ہوئی۔ کئی سال تک ان کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور مخالفوں نے فاطمہ خاتون کے چال چلن کے بارے میں بھی سلطان ولد کو بدگمان کر دیا۔ نتیجتہً ان دونوں کے درمیان سخت ناچاقی ہوگئی۔ اور اگر رومی صلح صفائی نہ کراتے تو شاید دونوں میں دائمی علیحدگی ہو جاتی۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت رومی قونیہ سے باہر تھے یا ان کا بیٹا اور بہو کہیں اور رہتے تھے کہ انہیں خطوط لکھنے کی ضرورت پڑی۔ ان دونوں کے نام دو خط "مکتوبات رومی" کے اس مجموعے کی اشاعت سے قبل بھی معلوم تھے۔ شمس الدین افلاکی نے انہیں "مناقب العارفین" میں نقل کیا تھا اور استاد فروزانفر نے بھی اپنی سوانحی کتاب میں ان کے اقتباس دیئے ہیں۔ ذیل میں سلطان ولد اور فاطمہ خاتون کے نام خطوط کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) "اللہ مفتح الابواب اپنے شاہزادے اور دل و دیدہ کی روشنی کو اس بیٹی کے حقوق یاد دلاتا ہوں "جو وکفلہا زکریا" (آیہ ۳۷ سورہ ۳) کے مطابق اس کے حبالۂ نکاح میں دی گئی ہے۔ وہ ایک بڑے امتحان کی خاطر تمہارے حوالے کی گئی ہے۔ توقع ہے کہ تم اختلافات کے بہانوں کی آگ پہ پانی ڈالوگے، تعلقات منقطع کرنے کے لئے ایک لمحے کی خاطر بھی کوئی غلط اقدام نہ کروگے اور فرائض ازدواجی کے ادا کرنے کے ضمن میں مزید ایسی کوئی حرکت نہ کروگے جس سے تمہاری زوجہ کو رنج ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں بے وفا اور نا جوانمرد کہے۔ تمہیں صبر و حوصلے سے محروم جانے یا تمہارے حسب و نسب کے خلاف زبان کھولے۔ کم عمری کا کیا شکوہ ؟

بچۂ بط اگرچہ دینہ بود آب دریاش تا بسینہ بود

بزرگوں کی اولاد کے بارے میں، جو "الحقنا بھم ذریتھم" (۵۲ : ۲۱) کے مصداق ہیں، گواہی اور شہادت طلب کرنا ایک خوفناک کام ہے۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے کہ اپنے باپ دادا، اپنے خاندان اور خود اپنی نیک نامی کی خاطر اپنی زوجہ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اس کے خاندان والوں کا احترام کرو۔ معاشرت میں ہر دن کو شادی کا پہلا دن اور ہر رات کو شب زفاف جانو اور اپنی زوجہ کے دل کو شکار کرنے کی کوشش کرو۔ یہ نہ سوچو کہ نکاح کے بعد زوجہ اب میری شکار ہے اور اس کا دل موہ لینے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ظاہر بینوں اور منافقوں کی روش ہے کہ "یعلمون ظاہراً من الحیوۃ الدنیا" (۳۰ : ۷)۔ زوجہ کو صید و شکار قرار دینا کم عقلی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے اسے شوہر کے تصرف میں دے رکھا ہے۔ لیکن شوہر کے زوجہ پر تصرف سے ہزار ہا گنا زیادہ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوقات پر تصرف ہے۔ مگر وہ اپنی محترم مخلوق کا اتنا احترام کرتا ہے کہ "والطور"، "والتین" اور "الزیتون" وغیرہ میں ان جمادات اور نباتات کی قسم کھاتا ہے جن سے خاص انسانوں کا ربط رہا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک بار نبی اکرمؐ نے حضرت علی سے پوچھا: "اگر میرے اجزائے جگر کو تم زمین پر دیکھو تو کیا کرو؟" اس سوال پر حضرت علیؓ سہم گئے، زبان سے کچھ نہ بولے مگر اشارہ سے کہا کہ "انہیں چشم و دل کی متاع بناؤں گا۔" نبی اکرمؐ نے فرمایا: "یاد رکھو فاطمہ اور اس کی اولاد میرے جگر گوشے ہیں جو تم زمین پر دیکھتے ہو۔" تم بھی سوچو کہ فاطمہ خاتون کون ہے اور اس ایک کی دل آزاری دوسرے ہزار انسانوں کی دل آزاری سے زیادہ تباہی کا باعث ہو سکتی ہے۔

برخاستن از جان و جہاں مشکل نیست　　مشکل ز سر کوی تو برخاستن است
من خود دانم کز تو خطای ناید　　لیکن دل عاشقاں بداندیش بود

اس خط کو محفوظ رکھو مگر کسی سے اس کا ذکر مت کرو۔ والسلامؒ۔

(۲) اللہ مفتح الابواب۔ شعر:

روحی بروحک ممزوج و متصل　　فکل حادثۃ توذیک، توذینی(۴)

اللہ تعالیٰ گواہ ہے، اور اسی ذات لایزال کی قسم کھاتا ہوں کہ جس معاملے میں بیٹی تمہیں دکھ ہوا، اس کا دو چند دکھ مجھے ہوا۔ تمہارا رنج والم میرا ذاتی رنج والم ہے۔ اور تمہاری تشویش میری تشویش ہے۔ تمہارے والد سلطان المشائخ انوار حقائق اور مشائخ مشرق کے سلطان (قدس اللہ روحہ) کے مجھ پر مربیانہ اور استادانہ حقوق ہیں اور کسی شکر و سپاس اور خدمت کو ان حقوق کا بدل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کے احسانات کا بدلہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے خزانے سے دے گا۔ بیٹی سے التماس یہ ہے کہ مجھ سے کوئی بات چھپائے نہیں اور فوراً اطلاع دے دیا کرے۔ یہ بات میرے لئے باعث سپاس ہو گی اور میں اس عزیز بیٹی کی ہر مشکل دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ بہاء الدین (سلطان ولد) اگر تمہارے آزار کے درپے یوں ہی رہا تو میں اس سے برگشتہ خاطر رہوں گا، اس کے دعا و سلام کا جواب نہ دوں گا اور وصیت کر دوں گا کہ میرے جنازے پر بھی نہ آئے۔ تمہیں آزار دینے والے ہر شخص کے ساتھ میرا رویہ اسی طرح سخت ہو گا۔ بیٹی غم نہ کرو۔ قرآن دیکھو کہ خدا اور اس کے کئی بندے تمہارے حامی و ناصر بنے ہوئے ہیں۔ ایک دو کے دشمن ہو جانے سے تمہارا کچھ نہ بگڑے گا۔ کتا سمندر کے پانی کو جوٹھا نہیں کر سکتا اور مکھی کے بیٹھنے سے نیشکر کے خرمن کا کچھ نہیں بگڑتا۔ میں مطمئن ہوں کہ تمہیں بدنام کرنے والے لاکھ قسمیں کھائیں، وہ ظالم اور مفسد ہی ہیں۔ جو تمہارا ہوا خواہ اور ہمدرد نہ ہو، میں اسے مظلوم کیسے مان لوں؟ وہ سامنے گریہ و زاری کریں گے اور تمہیں صاحب زادی کہیں گے۔ مگر پیٹھ پیچھے برائی سے باز نہ آئیں گے۔ آخر یہ منافق تم پر ظلم کر کے مظلومیت و مسکنت کا لبادہ کیوں اوڑھ رہے ہیں؟ میں ان سے بات کرنا نہیں چاہتا۔ کبھی مجھے ملیں تو ان کے ساتھ ہنسی مذاق سے دھوکا نہ کھاؤ، وہ زہر خند ہوتا ہے۔ میرا دل ان سے اس وقت راضی ہو گا جب وہ اپنے کئے پر واقعی نادم ہوں گے، مکر و فریب کی روش ترک کر دیں گے، نیک کام کرنا شروع کر دیں گے اور

اپنے آپ کو مردانِ حق کی خاک پا کے برابر بھی اہمیت نہ دیں گے۔ میرا یہ پختہ خیال ہے کہ منافقانہ روش سے نباہ نہ کیا جائے اور میں انشاء اللہ اسی خیال پر دنیا سے کوچ کروں گا۔ میری بیٹی، مجھ سے کوئی بات صیغۂ راز میں نہ رکھو اور ہر ایک کے سلوک سے مجھے آگاہ کرتی رہو تاکہ میں بھی حتی الامکان تمہاری مدد کر سکوں۔ تم دنیا میں سلطان المشائخ کی نشانی اور ایک طرح کا امن و سلامتی کا نقش ہو۔ تمہارے خوش رہنے سے سلطان المشائخ کی روح خوش رہے گی۔ بیٹی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو اور تمہارے فرزندوں کو (اللہ انہیں جلد لائے گا) غم اور پریشان حالی سے محفوظ رکھے۔ (۰) آمین یارب العالمین۔"

رومی کے اکثر خط "آمین یارب العالمین" کے کلمات پر ختم ہوتے ہیں۔ سلطان ولد اور اس کی زوجہ فاطمہ خاتون بنت شیخ صلاح الدین زرکوب کے نام رومی کے خطوط کا ترجمہ نقل ہوا۔ رومی کی مداخلت سے میاں بیوی میں صلح ہوگئی اور رومی کی دعا کے مطابق ۷۰۰ھ میں ان کے ہاں ایک بیٹا بھی پیدا ہوا۔ اس کا نام فریدون تھا (جلال الدین عارف چلپی فریدون ۷۰۰ - ۷۱۹ھ)۔ دیوان کبیر میں رومی کی ایک غزل "فریدون" کی ردیف کے ساتھ ملتی ہے اور وہ اسی موقع پر لکھی گئی تھی۔ رومی کی وفات کے بعد سلطان ولد کے ہاں تین بیٹے اور ایک بیٹی تولد ہوئی تھی۔ شمس الدین احمد افلاکی جس نے ۷۱۸ھ میں "مناقب العارفین" نام کی کتاب دو جلدوں میں لکھی، سلطان ولد کے بیٹے فریدون کا مرید تھا۔ اس کتاب کو فریدون ہی نے لکھوایا تھا۔

حکایت اور تمثیل کے ذریعے بات سمجھانا رومی کا معمول رہا ہے۔ مگر کبھی کبھی انہوں نے بیانیہ انداز میں بھی درسہائے حکمت دیئے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ "مکتوبات رومی" پر ایک نظر ڈالیں اور ایسے بعض نکات کو یہاں بصورت ترجمہ درج کرتے جائیں۔ ان اقتباسات کے ذریعے خطوط کے محتویات کے بارے میں اندازہ کر لینا مشکل نہ ہوگا۔ قوسین میں متن کی رو سے خط کا نمبر شمار دے دیا جائے گا۔

"تقدیر کے ہاتھوں دوستوں اور محبوں کی ملاقات اور جدائی کا حال سمندر کے مدوجزر کی لہروں کا سا ہے۔ یہ امواج متحرک اور جدا ہیں، مگر ایک دوسرے کی جلیس اور دمساز بھی ہیں۔ گو کوئی اوپر اٹھتی اور کوئی نیچے بیٹھتی نظر آتی ہے مگر سمندر کے ایک خاص عمل کی تکمیل ان کی کشاکش سے ہوتی ہے۔ میدان جنگ میں جنگ آزماؤں اور صف آراؤں کی کروفر اور بھاگ دوڑ کا بھی یہی حال ہے۔ ایک حملہ کر رہا ہے، دوسرا جنگی چال میں فرار اختیار کر

۔۔ ہے ۔لیکن فتح و نصرت کے لئے دونوں کے کام کی یکساں اہمیت ہے ۔ اس لئے میدان کارزار کا کروفر ایک دوسرے کا مخالف ہے نہ سمندر کا مدوجزر ۔

سرفروشاں یکے بادیگرے درجنگند لیک چوں درنگری متفق یک کارند

قادر مطلق کی حکمت وہم و تصور میں نہیں آسکتی ۔ وہ تمام احوال اور تغیرات پر قادر ہے ، اور ہم بعض باتوں کا نارسا سا قیاس ہی کر سکتے ہیں ۔ وہ دوستوں اور احباب کو ظاہری طور پر اکٹھا کرتا ہے مگر اس اجتماع کا معنوی دل جمعی اور اختلاط سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ باطنی دل جمعی خاص دوستوں کو ہی نصیب ہوتی ہے ۔ جن احباب کو باطنی اختلاط حاصل ہو ، وہ ایک دوسرے کی جدائی اور انتقال پر بھی روتے نہیں ، کیونکہ وہ معنوی قربت سے بہرہ مند ہوتے ہیں ۔ معنوی قربت کو کسی رنج و قلق سے خطرہ نہیں ہوتا مگر یہ عطائے عظیم ہر ایک کو نہیں ملتی ۔ جس طرح سمندر غلاظت اور گندگی سے آلودہ نہیں ہوتا ، اسی طرح معنوی قربت کے حامل لوگ صوری جدائی سے نالاں نہیں ہوتے "۔۔ (مکتوب ۴) ۔

مذکورہ بالا اقتباس میں منجملہ دیگر امور کے رومی نے اپنا فلسفہ ہجر و فراق بھی بیان کیا ہے ۔ رومی شمس تبریزی کی جدائی کے بعد فراق کے شاکی رہے مگر باطنی دل جمعی کی بنا پر انہوں نے یہ قلق جلد بھلا دیا ۔ جدائی کیا ہوتی بھی ان کے لئے بازیچۂ اطفال تھی ۔

"..... ازروئے تحقیق ہم انسان جسم واحد کی طرح ہیں کہ "ما خلقکم ولا بعثکم الا کنفسٍ واحدۃ" (۲۸ : ۳۱) ۔ مگر جسم کے جس حصے کو زیادہ تکلیف پہنچے اسے زیادہ احساس ہوتا ہے ۔ یہ بات اس امر کی غماز ہے کہ اعضائے جسم ایک دوسرے سے لڑیں نہیں بلکہ تکلیف میں مبتلا عضو یا اعضا کو سکون پہنچانے کی کوشش کریں ۔ مگر فاسد اعضا کا معاملہ دوسرا ہے" ۔ مجموعی اعتبار سے انسانوں کو جنگ و جدال کی نہیں ، بلکہ صلح و آشتی کی راہ اختیار کرنی چاہیئے ۔ ان کا بھلا اسی میں ہے ۔ خدائے لایزال ، جس نے ایک عام نباتاتی عنصر کو گندم کی سی غذائی جنس بنایا ، دھوئیں کو آسمان کی صورت دی ، مٹی کو انسانی حسن عطا کیا ، اور حرارت آفتاب کو باعث حیات و رونق بنایا ، وہ وحدت انسانی کی دعوت دیتا ہے ، مگر اختلافات اور تنازعات کی حکمت بھی اس نے کہیں کہیں سمجھائی ہے ۔ فروع ، اصل کو پہچاننے کا ذریعہ ہیں ، اور مجاز حقیقت کو سمجھنے کا وسیلہ بنتا ہے ۔ زبان کے تنوع ہی کو دیکھ لیں ۔ ارمنی ، ترک اور عرب وغیرہ

اپنی اپنی بولی بولتے ہیں اور ایک بولی کے جاننے والے کو دوسرے کی بولی سمجھانے کے لئے ترجمان کی ضرورت پڑتی ہے۔" وان من شیئٍ الا یسبح بحمدہ ولکن لاتفقہون تسبیحہم" (۴۴ : ۱۷) میں یہی حکمت بیان ہوئی ہے۔ (مکتوب ۸)۔

ایک حدیث قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے پوچھا: "موسیٰ تم جو مجھے اپنے دروازے پر کھڑا دیکھو تو کیا کرو گے؟" حضرت موسیٰ نے کہا: "میرے پروردگار تو اس قسم کے اعمال سے پاک اور منزہ ہے"۔ فرمایا: "موسیٰ جب میرے کسی بندے کو تم اپنے دروازے پر دیکھو، تو اس کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم میرے ساتھ کرتے، اس لئے کہ میرے ہر بندے کا وجود میری ہی صفتِ قیومی کے ساتھ وابستہ ہے"۔ نماز اگرچہ ایک بافضیلت کام ہے مگر اصل فضیلت روح نماز کی ہے۔ روحِ نماز اس کا دوام ہے کہ "الذین ہم علیٰ صلاتہم دائمون" (۲۳ : ۰۷) اور دوسرے رب العالمین کے ساتھ اتصال۔ کہتے ہیں کہ کسی شیخ نے نماز مغرب پڑھنے میں تساہل سے کام لیا اور لوگوں نے اس کا احترام ترک کر دیا۔ شیخ نے لوگوں کے عدم احترام کے سبب کو بھانپ لیا۔ بہرحال شیخ نے معذرت کی اور اپنے جذب و سکر کا راز بتایا۔ اس نے بتایا کہ فقہا کی نماز اور ہے اور صوفیا کی اور۔ پہلی کی شرط پانی سے طہارت اور وضو ہے اور دوسری کی سالہا سال کا مجاہدہ اور جہادِ اکبر۔ پہلی نماز فرض کی ادائیگی ہے اور دوسری دیدہ و دل کو خون کر کے فرض کی روح کو جاننا اور ذات متعال سے لو لگانا۔

گرچو شاہان برسریرِ تخت نتوانی نشست　　ہمچو فراشان طناب خیمۂ شاہی بگیر
چونکہ سلطان نہ ای، رعیت باش　　چوں پیمبر نہ ای نہ اُمت باش

جس کسی کو یہ دوسری نماز ملے وہ "الحقنا بہم ذریتہم" (۵۲ : ۲۱) کے بمصداق ہے۔ مگر پہلی نماز پر مغرور ہو جانے والے دوسری نماز کی حلاوت نہیں پا سکتے۔ کیونکہ وہ اہل دل سے اپنے آپ کو بے نیاز جانتے ہیں .... (مکتوب ۱۹)

رومی اور شمس تبریزی کی سہ سالہ ملاقات اور جدائی ایک مشہور واقعہ ہے۔ شمس تبریزی کی روپوشی کے بعد رومی کوئی سات برس (۶۴۵ - ۶۵۲ھ) تک بلادِ شام میں سرگرداں رہے، مگر بعد میں شیخ صلاح الدین زرکوب کی صحبت سے انہیں سکون و اطمینان ملا۔ پھر بھی ہجر و وصال کی باتیں ان کے مکتوبات میں بہ تکرار ملتی ہیں۔ مثلاً ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

اللہ تعالیٰ جنہیں چاہتا ہے ملا دیتا ہے اور جنہیں چاہتا ہے ملاقات کے بعد دور کر دیتا ہے۔ اپنے فضل و کرم

سے وہ فراق کو وصال سے بدل دیتا ہے اور دور کے فاصلے کو نزدیک کر دیتا ہے . . . حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کا واقعہ معروف ہے ۔ وہ باپ اور بھائیوں سے مدتوں جدا رہے اور ان سے ملنے کی بظاہر ناامیدی کے بعد ان کی امید بر آئی۔ حضرت یوسف نے اس وقت آسمان کی طرف مُنہ کیا اور بولے : خدایا، تو پاک ہے، تو نے کیا اسباب فراہم فرمائے کہ مدتوں کے بعد باپ اور بھائیوں کو مجھ سے ملا دیا اور فراق کے بعد وصل کی نعمت مجھے عطا فرمائی۔ ان ربی لطیف لما یشاء (آیہ ۱۰۰ سورہ یوسف)۔ میرے والد اور بھائی کنعان میں تھے اور میں مصر میں۔ انہیں میری خبر ہی نہ تھی۔ کیسا قحط پڑا کہ سونے کی اینٹیں دے کر روٹی نہیں ملتی۔ اس حالت میں وہ روٹی کے محتاج ہوئے اور ادھر کا رخ کیا۔ یہ خاص عطائے خداوندی ہے کہ میں بادشاہ مصر بنا اور چہار دانگ عالم میں میری شہرت ہوئی عزیز کے ہاں غلے کی فراوانی اور ارزانی کا سن کر میرے بھائی یہاں آئے۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ عزیز مصر کھوٹے سکے بھی قبول کر لیتا ہے اور میں نے بھی ان کی متاع لوٹا دی تھی۔ خدایا میں کس قدر شکر گزار ہوں کہ میرے بھائی لاعلمی میں یہاں آگئے ورنہ اگر انہیں خبر ہوتی کہ ان کا بھائی عزیز مصر ہے تو وہ میرے ساتھ اپنے برتاؤ کے پیش نظر ہرگز یہاں نہ آتے۔ خداوندا تو نے واقعی عجیب کارسازی سے حضرت یوسف صدیق کو ان کے والدین اور بھائی بہن ملوا دیئے۔ ذات لایزال شب و روز ایسے لاکھوں کام منصۂ شہود پہ لا رہی ہے۔ ایک گروہ یا شخص جدا ہوتا ہے۔ اور دوسرے گروہ یا شخص کے اسباب ملاقات فراہم ہوتے ہیں۔ موج تقدیر اسے دور پھینکتی ہے اور اسے قریب لے آتی ہے۔ دل جمعی سے زندگی گذارنے والوں کو لذت فراق چکھانا اور پراگندہ خاطر افراد کو لذت وصال سے آشنا کرنا اسی کا کام ہے . . . .“ (مکتوب ۳۸)

”. . . . . . خالق مطلق کی یہ کارسازی ہے کہ اس نے ایک قطرۂ منی کو، جس کے کان تھے نہ آنکھ، جس کی عقل تھی نہ ہوش، جس میں بندہ کی صفات تھیں نہ مالک کی، جس میں غم کا عنصر تھا نہ خوشی کا، جسے عزت کی خبر تھی نہ ذلت کی، رحم مادر میں پناہ دی، اسے قطرۂ خون بنایا، پھر مضغۂ گوشت، پھر اس ہیولیٰ اور نقش ناتمام سے، جس کے اعضاء و جوارح نہ تھے، یہ جملہ اعضا پیدا کیے: منہ، آنکھ، کان، ناک اور زبان، ہر عضو کا حیرت انگیز کام ہے، مگر سینے کے اندر ایک حیرت انگیز عضو ”دل“ ہے، جو قطرات خون پر مشتمل ہے، یا مضغۂ گوشت ہے، مگر وہ ایک بحر ہے، گوہر ہے اور جہاں نما ہے۔ ”دل“ بندہ ہے اور سلطان بھی۔ مگر تخلیق کے ان عجائبات پر کس کی توجہ ہے۔ اور کسے خبر ہے کہ خالق کل انہیں کس

پستی سے اس بلندی پر لایا ہے۔ پھر اس نے انسان کو کیا کیا حقائق سکھائے۔ اسی پر بس نہیں کیا۔ فرمایا کہ انسانوں کو نعمتِ حیات اور طبعی موت دے کر چھوڑ نہ دوں گا بلکہ انہیں زمین و افلاک سے ماورا لے جاؤں گا۔ فرمایا کہ تمہیں وہ وہ بلندیاں اور نعمتیں عطا کروں گا جن کا تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا اور جو تمہارے حاشیہ خیال میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ نعیم جنت اور مدارج عقبیٰ کی کوئی حد نہیں۔ وہاں بوسیدگی، فرسودگی، تھکاوٹ اور موت کا گذر نہیں۔ وہاں تروتازگی، نشوونما، طراوت اور زندگی کا دور دورہ ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ اس جہان ارضی کے باہر کئی آسمان، آفتاب ماہتاب، ممالک، بلاد اور باغات ہیں، یہ سب قطرۂ منی سے نشوونما پانے والے انسان کے استفادہ کی خاطر ہیں۔ اسی قطرۂ منی کے کرشمے، شاہ و گدا، اور عالم و جاہل ہیں .... مگر اے قطرۂ منی، اس تاریک منزل سے نکل اور اپنا مقام و مرتبہ پہچان، کیا تجھے خبر نہیں کہ تیری منزل اس جہان خور و خواب سے پرے ہے۔ "و ان الی ربک المنتہیٰ"..... (مکتوب ۳۶)

"..... موجودہ زمانہ کے فتنوں نے لوگوں کو ایسا بدحال کر رکھا ہے کہ "قل متاع الدنیا قلیل" (۷۷:۴) کے لقمۂ فانی کی تنگی میں لوگ ایک دوسرے کے پیالے میں ہاتھ ڈال رہے اور ایک دوسرے کی جیب پر حملہ کر رہے ہیں اس بے وفا دنیا سے متاع لقمہ ختم نہیں ہوئی مگر غاصبوں نے اسے غارت کر دیا۔ اور غذا کی فراہمی کی اب بھی کمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یا عبادی الذین آمنوا ان ارضی واسعۃ (۵۶:۲۹)۔ یہ وسیع زمین ہجرت کے علاوہ قناعت کا درس دیتی ہے کیونکہ قناعت بھی بے حد دراز ہے۔ قانع افراد چیونٹیوں کی طرح دانوں کے ساتھ چمٹتے نہیں ہیں۔ وہ فھو حسبہ (۳:۶۵) پر متوجہ رہتے ہیں اور سب کا بھلا چاہتے ہیں۔ مگر آج کل اکثر لوگ چیونٹیوں کی طرح دانوں سے چمٹے ہوئے ہیں اور خرمن جمع کرنے کی فکر میں ہیں ... کاش انہیں باقی رہنے والے خرمن کی بھی فکر ہوتی اور "ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء" (۵:۵۴) پر بھی توجہ رکھتے۔ اللہ تعالیٰ اس زمانے کے لوگوں کو قناعت و توکل کی نعمت عطا فرمائے" (مکتوب: ۴۳)۔

ارشاد رسولؐ ہے کہ "نکاح میری سنت ہے"۔ اس لئے ذی استطاعت لوگوں کو اہل حاجت کے نکاح کے اہتمام میں مدد کرنی چاہیئے۔ حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک ایسے گھوڑے کا تحفہ لائے جو سمندر کے راستے عرب لایا گیا تھا۔ گھوڑا بہت عمدہ تھا۔ آپ نے یہ تحفہ قبول فرماتے

ہوئے کہا: "مجھے زمین و افلاک پیش کئے گئے اور یہ کائنات ہی خدا نے میرے لئے بنائی ہے مگر میں تحفے کی قدر کروں گا۔" خدا نے نبی اکرمؐ کی سیر چشمی کے لئے خود فرمایا ہے کہ "ما زاغ البصر و ما طغیٰ" (۱۷: ۵۳) سبحان اللہ، جو ہستی ذات باری کو دیکھ کر کما کان رہے، وہ زخارف دنیا کو دیکھ کر کیا اتھلے گی۔ بہرحال گھوڑے کا تحفہ لے کر آپ نے صحابہ سے کہا: "بتاؤ یہ گھوڑا کس کام کے لئے مناسب رہے گا؟" صحابہ نے مختلف آراء دیں۔ "اسے کفار کے خلاف جہاد میں استعمال کیا جائے۔" "بہتر ہوگا کہ اسے بیچ کر اس کی قیمت فقراء میں تقسیم کردی جائے۔" صحابہ اسی طرح گھوڑے کے مختلف مصرف پیش کرتے رہے۔ نبی اکرمؐ نے ان سب کو پسند فرمایا مگر بہتر سے بہتر کا استفسار فرماتے رہے۔ آخر میں خود فرمایا: "زیادہ بہتر ہوگا کہ اس سے نکاح کے کاموں کی انجام دہی میں مدد لی جائے۔ جب کبھی نکاح میں کوئی رکاوٹ پڑے اور مہر یا جہیز یا کسی اور شرط پر کوئی اختلاف ہو، تو وہاں کسی معاملہ فہم اور شیریں سخن شخص کو اس گھوڑے پر سوار کرا کے بھیجا جائے تاکہ وہ جلد پہنچے اور نزاع کو رفع کرائے۔ اس طرح نکاح کے مراحل جلد طے ہو جانے میں مدد ملے گی۔" انبیائے کرام کے اقوال اور اعمال، خصوصاً خاتم الانبیاء کی احادیث اور سنن، حکمت و دانش کے گنجینے ہیں اور ما و شما کی عقل سو سال میں بھی حکمت کی سب باتوں کی تہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ انبیاء، مومنین حقیقی ہتے اور "مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔ لاکھوں کروڑوں چراغوں کو جلاؤ تو بھی وہ نورِ آفتاب کی برابری نہیں کر سکتے، حالانکہ آفتاب بھی نور اللہ نہیں، محض شعائر خداوندی میں سے ہے۔ اس کے نور سے کافر و مومن سب مستفید ہوتے ہیں مگر "مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔[9] اگر آفتاب نور اللہ ہوتا تو مومن کے لئے ایک دوسرے نور سے دیکھنے کی شرط نہ لگائی جاتی۔ عاقل کے لئے اشارہ کافی ہے۔ ان مثالوں سے مومن کا مقام اور سنت نکاح کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے ....." (مکتوب، ۴)۔

"بعض فلسفی اور معتزلی اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ، عالم، عادل، حکیم اور کریم وغیرہم کی نسبت اس ذات متعال کے ساتھ درست نہیں مانتے اور ان القاب اور اسمائے صفاتی کو ماسوا اللہ کی متاع مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ماسوا اللہ اور مخلوق کے لئے بھی استعمال ہونے والے القاب خدا کے شایان شان نہیں۔ پھر خدا کو ایسے طویل الذیل القاب کی کیا ضرورت ہے جو مخلوق کے لئے بھی لائے جا سکتے ہوں؟ اس طرح خالق اور مخلوق کی صفات میں فرق کیا رہ جاتا ہے؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی بادشاہ کی تعریف میں اس کے لبوں یا پلکوں کی تعریف کی جائے۔ بہرحال، لمبے چوڑے

آداب کبھی احترام کے لئے لکھے جاتے ہیں اور کبھی ان کا نہ لکھنا بھی اسلوب احترام ہوتا ہے۔ اور میرے مکتوبات میں بھی ایسا ہے کہ کبھی کسی ممدوح محترم کے القاب کا ذکر ہے اور کبھی ذکر نہیں ہے ......

حدیث قدسی ہے کہ "لوگوں میں اچھا وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے" اور "قوم کا رہنما وہ ہے جو ان کا خادم ہو" کیونکہ "واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض" (۱۷ : ۱۳)۔ ایک اور حدیث رسولؐ ہے کہ "عدل و انصاف کا ایک گھنٹہ ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے"۔ اور عدل کسی کام کو اس کے صحیح مقام تک پہنچانے کا نام ہے۔ حکم خداوندی ہے کہ فاما الیتیم فلا تقہر واما السائل فلا تنہر (۹ - ۱۰ : ۹۳) یتیم اور سائل دونوں مظلوم اور مسکین ہیں اور وہ غصے اور ڈانٹ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ مظلوم و مقہور پر غصہ کرنا بے محل ہے اور یہ عدل نہیں۔ دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی ازلی اور ابدی تائید کی مدد سے امیر معین الدین پروانہ کا تعلق عدل اور رحم کے ساتھ کبھی منقطع نہ ہو۔ شوق ملاقات غالب ہے۔

لو ان الریح یحملنی الیکم　　　تشبثت باذیال الریاح

وکدت اطیر من شوقی الیکم　　　وکیف یطیر مقصوص الجناح

(مکتوب ۴۹۔ رومی کے ایک رشتہ دار کریم الدین محمود کی خطا بخشی کی درخواست بنام امیر معین الدین پروانہ)

"کہتے ہیں کہ بعض راہبوں نے اپنے مذہبی پیشوا سے شکایت کی کہ ہم (حضرت) محمدؐ کے ساتھیوں سے زیادہ فقر و فاقہ کے مصائب کاٹتے ہیں اور حرص و ہوس سے بھی دور رہتے ہیں، پھر ان جیسی عظمت ہمیں کیوں نہیں ملتی؟ راہب رہنما نے جواب دیا، تم نے رہبانیت اور ترک دنیا میں مبالغہ کیا حالانکہ دنیا کے بارے میں معتدل رویہ زہد و تقویٰ اور خدا شناسی کا جزو ہے اور یہ رویہ انبیا کا ورثہ ہے۔ انبیائے کرام کی سیرتوں پر غور کرو اور دین و دنیا کے بارے میں معتدل رویہ اپناؤ۔ انبیا کی سیرتوں کے نمونے سامنے نہ ہوں تو شریعت و طریقت بے معنی الفاظ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ تم نے انبیا کی حقیقی تعلیمات فراموش کر دیں لیکن (حضرت) محمدؐ کے اصحاب ان پر کاربند ہیں۔ وہ جملہ انبیا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ان کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انبیا جسم واحد کی طرح ہیں اور اور کسی ایک کی تکذیب و تفریق سب کی تکذیب و تفریق ہے۔ مقررہ اعضا میں سے کسی ایک کو نہ دھونے سے وضو کیا ہوگا؟ انبیا یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کی تصدیق کرتے رہے مگر تم نے ان کی تصدیق نہ مانی۔ انبیا ایک ہی نور نبوت سے مستنیر رہے مگر تم نے اسے نہ پہچانا۔ ایک ہی آفتاب نبوت ضیا پاشیاں

کرتا رہا مگر تم نے بے وقوف بن کر آنکھیں بند رکھیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ موجودہ آفتاب کے مومن ہوں اور سابقہ آفتاب کے منکر یا اس کے برعکس؛ مگر آفتاب کبھی بدلا ہے اور اس کی تجدید ہوئی ہے؟ ... صحابہ اور مومنوں کی عظمت کا ایک راز، بہر حال، یہی ہے کہ وہ جملہ انبیا کی تعلیمات کے امین ہیں، مگر بعض مصلحتوں کی بنا پر ہم ان کی روش کو اپنا نہیں سکتے...." (مکتوب ۶۷)۔

حوالہ جات

۱۔ استنبول ، ۱۹۳۰ء۔ مرتب کتب ڈاکٹر فریدون نافذ بک ہیں۔

۲۔ مکتوبات رومی مرتبہ یوسف جمشید پوری و غلام حسین امین۔ تہران۔ ۱۹۵۶ء۔ مثنوی معنوی بانضمام مجالس سبعہ (از روی نسخہ محمد رمضانی مرحوم) تہران۔ ۱۹۶۶ء۔

۳۔ رسالہ در تحقیق احوال و زندگانی مولانا جلال الدین محمد مشہور بہ مولوی۔ تہران۔ طبع اول ، ۱۹۳۰ء۔ طبع دوم ۱۹۵۴ء۔ (ان کتابوں کا زیادہ ذکر طبع دوم میں ہے)۔

۴۔ اس خط (۱۳) میں ایک دو فارسی جملے بھی موجود ہیں۔

۵۔ دی یہ، یہ گذشتہ کل کا۔

۶۔ میری روح تیری روح کے ساتھ مربوط و متصل ہے۔ ہر وہ حادثہ جو تجھے اذیت دے، مجھے بھی اذیت دیتا ہے۔

۷۔ استاد فروزانفر کی کتاب میں (صفحہ ۱۶۹) یہاں دو فارسی شعر بھی ملتے ہیں:

انوار صلاح دین بر انگیختہ باد — در دیدہ و جان عاشقاں ریختہ باد
ہر جاں کہ لطیف گشت و از لطف گذشت — با خاک صلاح دین بر آمیختہ باد

۸۔ مثنوی میں جہاد کے بارے میں ہے:

امر حق را ہم بأمر حق شکن — بر زجاج دوست سنگ دوست زن

۹۔ حدیث قدسی: المؤمن ینظر من نور اللہ۔

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لئے دو نسخے ارسال فرمائیے!)

(۱) الادب الجمیل (۲) المدیح النبوی

گذشتہ دنوں ہندوستان کے مطالعاتی دورے میں جامعہ اشرفیہ مبارکپور (اعظم گڑھ) جانے کا اتفاق ہوا۔ جامعہ کے ایک فاضل استاد مولانا افتخار احمد قادری مصباحی نے اپنے ادارے کی دو مطبوعات "الادب الجمیل" اور "المدیح النبوی" عنایت کیں۔ اور یہ وعدہ لیا کہ میں ان پر تبصرہ لکھوں گا۔ یہ کتابیں خریت سے پاکستان تک آگئیں اور اب میں اس قابل ہوں کہ ایفائے وعدہ کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکوں۔

الادب الجمیل جس کے مؤلف خود مولانا قادری ہیں عربی ادب کا ایک جامع انتخاب ہے جو عربی مدارس کے طلبہ کی درسی ضروریات کو مدنظر رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ جس میں نظم و نثر کے قدیم اور جدید نمونے شامل ہیں۔ کتاب کا آغاز مؤلف کے لکھے ہوئے مقدمے سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد "تقدیم" کے عنوان سے ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایک مختصر تحریر ہے۔ مقدمہ اور تقدیم دونوں عربی میں ہیں۔ ان تحریروں سے جہاں کتاب کا اجمالی تعارف ہو جاتا ہے وہاں لکھنے والوں کی عربیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس انتخاب کی خصوصیت یہ ہے کہ مجامیع کے عام طریق سے ہٹ کر قرآن و حدیث کے منتخب اقتباسات سے اس کی ابتداء کی گئی ہے۔ اس کے بعد نظم و نثر کے قدیم و جدید اقتباسات درج کئے گئے ہیں اور ان کے انتخاب میں بھی اسلامی فکر کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ گویا اس انتخاب میں عربی ادب کی تعلیم کے ساتھ طالب علم کی ذہنی و روحانی تربیت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

الادب الجمیل ۲۶ × ۲۰ تقطیع کے ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلی بار ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ پندرہ روپے سکہ ہندوستانی اس کی قیمت ہے۔

دوسری کتاب "المدیح النبوی" محمد یاسین اختر اعظمی مصباحی کی تالیف بصورت انتخاب ہے۔ یہ بھی جامعہ اشرفیہ میں عربی ادب کے استاذ ہیں۔ کتاب کے شروع میں اعظمی صاحب کا اپنا لکھا ہوا عربی میں فاضلانہ مقدمہ لائق مطالعہ ہے۔ اس انتخاب کی تیاری میں مولانا اعظمی نے بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔ یہ واقعہ ہے اس کی ترتیب میں انہیں ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کرنی پڑی ہوگی۔ یہ انتخاب صرف عربی کا ہے اور اس کی جامعیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۲۶ صفحات کی اس کتاب میں چھوٹے بڑے ۱۳۴ اصحاب کی شعری تخلیقات کے نمونے ہیں۔ یہ کتاب بھی ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی اور اس کی قیمت ہندوستانی سکے میں ۱۴ روپے ہے۔

یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کتابیں مطبع کوثر سرائے میر کی چھاپی ہوئی ہیں۔ سرائے میر جیسی چھوٹی سی جگہ میں کانٹے کی چھپائی کا یہ معیار حیرت انگیز ہی ہو سکتا ہے۔ اس پر مصر اور بیروت کا گمان ہوتا ہے۔ اس مطبع کے مالک مدرسۃ الاصلاح کے نائب ناظم احمد محمود صاحب ہیں۔ ایک چھوٹی سی مشین پر جو اکثر بجلی نہ ہونے کے باعث ہاتھ یا پاؤں سے چلانی پڑتی ہے ایسی کتابیں چھاپ کر دینا کو دینا واقعۃً غیر معمولی کارنامہ ہے۔ چھوٹی دوکان کے چوکھے کوان پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اور اس آدمی کو آفرین کہنے کو بھی جو وسائل کی فراوانی اور برتری کے بل بوتے پر نہیں بلکہ محض اپنی محنت مشقت سے ایسی بہتر کارکردگی کی مثال قائم کر رہا ہے۔ جب تک وہاں میرا قیام رہا میں اکثر اس مطبع میں جاتا رہا ہوں۔ میں نے احمد محمود صاحب کو قریب سے کام کرتے دیکھا ہے۔ ملازمین کے ہاتھوں پچاس ساٹھ ہزار کا خسارہ اٹھانے کے بعد اب احمد محمود صاحب "دست خود دہان خود" پر عمل پیرا ہیں اور سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ کمپوزنگ ریک پر کھڑے اپنے ہاتھ سے ٹائپ کے حروف کمپوز کر رہے ہیں یا مشین چلا رہے ہیں۔ مشین اتنی چھوٹی ہے کہ ایک وقت میں صرف ۲ صفحے چھاپ سکتی ہے۔ یہی چھوٹا سا کام احمد محمود صاحب کا ذریعہ معاش ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کی نائب ناظمی ایک اعزازی خدمت ہے —

احمد محمود صاحب مدرسۃ الاصلاح کے تعلیم یافتہ ہیں۔ شاعر ادیب اور قومی کارکن ہونے کے علاوہ کوہکن بھی ہیں۔ ان کو دیکھ کر بے ساختہ اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ　　　جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

ان کے کام کرنے کے انداز کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ پریس نہیں چلا رہے ہیں شعر و ادب کی طرح کوئی تخلیقی کام سر انجام دے رہے ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی پروڈکشن میں یوں تو بہت سے لوگوں کا حصہ ہے مگر میں ان میں سب سے زیادہ مبارکباد کا مستحق احمد محمود صاحب کو سمجھتا ہوں۔

یہ دونوں کتابیں مندرجہ ذیل پتے سے طلب کی جا سکتی ہیں۔

قسم النشر والتوزیع، جامعہ اشرفیہ، مبارکپور، اعظم گڑھ، یوپی، انڈیا۔

(شرف الدین اصلاحی)

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کے علمی و عملی کمالات و افادات پر مشتمل

البلاغ کا

مفتیٔ اعظم رحمۃ اللہ علیہ نمبر

انشاء اللہ ماہ رجب میں منظر عام پر آرہا ہے

یہ نمبر اس صدی کے اس عظیم دینی مذاق کی دلکش تصویر ہوگا جسے اکابر علماء دیوبند نے اپنے خون اور پسینے سے پروان چڑھایا ہے

چند لکھنے والے

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی مدظلہم۔ حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب عارفی مدظلہم۔
حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم۔ حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی مدظلہم۔
حضرت مولانا محمد اشرف خان صاحب (پشاور یونیورسٹی) حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب (دہلی)۔
حضرت مولانا عبد القدوس قاسمی (پشاور یونیورسٹی)۔ حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب۔
حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر۔ جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (پیرس)۔
جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی۔ حضرت مولانا مفتی سیاح الدین صاحب
جناب ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب۔ حضرت مولانا سبحان محمود صاحب حضرت مولانا شمس الحق صاحب
حضرت مولانا مفتی عبد الحکیم صاحب۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری (مدینہ منورہ)
حضرت مولانا عبد الشکور صاحب ترمذی۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی
حضرت مولانا محمد ہارون صاحب پٹیہ (بنگلہ دیش)۔ جناب منشی عبد الرحمٰن خان صاحب
مولانا قاری فیوض الرحمٰن صاحب ایم اے اور دیگر بہت سے اہل علم و قلم

اس کے علاوہ

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مہتمم دار العلوم کراچی اور مدیر البلاغ کے متعدد تازہ مبسوط مقالے جو تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہیں۔

قیمت مجلد: ۵۰ روپے — خریداروں سے: نصف قیمت — بکس بورڈ کے ساتھ: ۴۰ روپے
ایجنٹ حضرات کو: ۲۰ فی صد کمیشن اور ۲۵ نسخوں پر ۲۵ فی صد کمیشن

دینی مجلہ

رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ ☐ اگست ۱۹۸۰ء

سکولوں، کالجوں اور لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

ماھنامہ **فکرونظر** اسلام آباد

جلد ـــــ ۱۸ | رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ۔ اگست ۱۹۸۰ء | شمارہ ـــــ ۲

فہرست

مجلس ادارت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

الوداع ماہِ مُبارک الوداع!

پورا مہینہ گزر گیا —— جیسے ابھی کل کی بات ہے کہ ہم نے ماہِ مبارک کو خوش آمدید کہا تھا۔ سچ ہے دن عیش کے گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں۔ ایمان کی بات ہے کہ ایمان والوں کے لیے یہ مہینہ خدائے رؤف و رحیم کی طرف سے خیر و برکت، رأفت و رحمت کا پیغام ہی نہیں، راحت، فرحت، مسرت و بہجت اور لذت زیست کا سامان لے کر آتا ہے۔ بظاہر یہ مہینہ بھوک پیاس کا مہینہ ہے۔ لیکن حقیقت میں سامان خورد و نوش کی فراوانی کے ساتھ لذت کام و دہن کی جو چاشنی اِس مہینے میں روزہ داروں کا مقسوم ہوتی ہے سال کے کسی اور مہینے میں کیا، کسی دن میں بھی نہیں ہوتی۔ ہر مسلمان اپنی استطاعت سے زیادہ اس مہینے میں اللہ کی دی ہوئی ظاہری نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور جس انداز سے لطف اندوز ہوتا ہے اس کا تو کہنا ہی کیا۔ اس کے علاوہ جو گہما گہمی، رونق اور چہل پہل پورے تیس دن شب و روز اس مہینے میں رہتی ہے وہ بس اسی مہینے کا حصہ ہے۔ اس کی مثال مسلم معاشرے کے سوا دنیا

کے کسی معاشرے میں نہیں۔ لہو و لعب کے ساتھ ہنگامہ پرور زندگی کی
شالیں تو بہت مل جائیں گی جس میں سفلی جذبات کی تسکین کے سوا کچھ
نہیں ہوتا، عبادت و ریاضت، نیکی تقویٰ اور طہارت کے ساتھ ثقافتی
دلچسپیوں کی اعلیٰ اقدار صرف اسلامی معاشرے کی خصوصیت ہے۔

رمضان اور اس کے روزے اسلامی ثقافت کا جز ہی نہیں،
مابہ الامتیاز ہیں۔ اسی سے ہماری ثقافت پہچانی جاتی ہے۔ اپنے عناصر
ترکیبی کے لحاظ سے یہ ثقافت اتنی بھرپور، اتنی رنگا رنگ، اتنی مالدار، اتنی
طاقتور، اثرات کے اعتبار سے اتنی دیرپا اور نتائج کے اعتبار سے اتنی دُور
رس ہے کہ دنیا کی کوئی ثقافت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اسی ثقافت نے
مسلم قوم کو اب تک من حیث القوم زندہ رکھا ہے اور وقت کی آندھیاں اس
کے چراغ کو بجھانے سے آئندہ بھی قاصر رہیں گی ۔ طاغوت کی ثقافتی یلغار
نے اسلامی ثقافت کے لیے مسائل ضرور پیدا کر دیئے ہیں۔ مگر پریشان ہونے
کی کوئی بات نہیں۔ یہ چیلنجنگ سچوایشن ہی ہے جو اسے زندہ رکھتی ہے۔
مسلمان اپنے تشخص کو نہ بھولیں۔ اور اس تشخص کو زندہ و پائندہ رکھنے میں دیگر
عناصر کے علاوہ روزہ بھی ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ
لوگ جنھوں نے رمضان کی برکتوں سے پورا فائدہ اُٹھا کر اپنے ملّی تشخص کے
احساس کو تقویت دی اور اپنے ثقافتی شعور کو پختہ کیا کہ اس میں ہمارے
لیے دنیا اور آخرت کی صلاح و فلاح ہے۔

ایک طرف ہمیں غمگین دلوں کے ساتھ مہمانِ عزیز ماہِ رمضان کو
الوداع کہنا ہے، جس کے دم سے ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات
کا سماں تھا، تو دوسری طرف باصد مسرت و شادمانی غرۂ شوال کا استقبال

کرتا ہے، جس کی دید صبحِ عید کی تمہید ہے۔ عید اسی طرح اسلامی ثقافت کا جُز اور مابہ الامتیاز ہے جس طرح کہ رمضان اور اس کے روزے یا اسلامی زندگی کی دوسری سرگرمیاں۔ رویتِ ہلال سے عید کی تقریبات کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ لمحہ کتنا دلفروز اور نشاط انگیز ہوتا ہے جب تیس دن کے روزے پورے کرکے ایک مسلمان اُفق کے مطلع پر عید کے چاند کا نظارہ کرتا ہے۔ چاند دیکھ کر اس پر سرور کی جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ کسی رندِ خراباتی کو مے خواری میں کیا نصیب ہوتی ہوگی۔ جو سرشاری اور سرخوشی کسی بلانوش بادہ خوار کو خم کے خم لنڈھانے کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتی وہ ایک مسلمان عید کی تقریبِ سعید کے ہر لمحہ میں پاتا ہے۔ عید کا ہر لمحہ سچی خوشی کی رُوح پرور خوشبو میں بَسا ہوتا ہے اور مسلمان اِس خوشبُو سے اپنے مشامِ جان کو معطر کرتا ہے۔ عید کا دن اچھے کپڑے، اچھے کھانے اور اچھی خوشبو کے لحاظ سے بھی اپنی ایک امتیازی شان رکھتا ہے لیکن ان ظاہری اور مادّی نعمتوں کے علاوہ اس دن میں باطنی اور رُوحانی برکتوں کا جو لامتناہی سلسلہ ہے۔ اس کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے جس کے لیے ایک خاص دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ روزہ سراپا صبر و شکیب تھا تو عید سراپا شکر و سپاس ہے۔ دوگانہ نماز سے عید کے دن کی ابتداء ہوتی ہے جس سے اس کا روحانی پہلوُ نمایاں ہے۔ مبارک سلامت کے پیغام کی داد و ستد، دوستوں اور عزیزوں کی ضیافت، غرباء اور مساکین کی مالی اعانت کی روایات سے اسلامی ثقافت کے مظہرِ اتم اس تہوار کا سماجی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

(مُدیر)

صُفہ اور اصحابِ صُفہ

عبدالقدوس ہاشمی

مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے ساتھ مسجد کے باہر کی طرف جانب شمال ایک چبوترہ تھا۔ اس چبوترے پر ساری مسجد نبوی کی طرح کھجور کی پتیوں سے ایک چھپر ڈال دیا گیا تھا۔ اس کو صفۃ المسجد کہا جاتا تھا جو بعد کو مختصر ہو کر "الصفہ" کہلانے لگا۔ مختلف زمانوں میں وہ صحابہ جو بے خانماں تھے، وہ اس چبوترے پر رہا کرتے تھے، اور دن کے وقت وہاں بیٹھ کر دوسرے صحابہ کرام بھی قرآن مجید یاد کرتے تھے۔ مختلف اوقات میں مختلف بزرگوں کی یہی چبوترہ رہائش گاہ رہا ہے، کسی کے لیے طویل مدت تک اور کسی کے لیے بہت تھوڑی مدت تک، اور شاید کسی کے لیے شروع سے وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ مستقل اقامت گاہ نہیں رہا۔ یہ قدسی صفات بزرگ زمانۂ قیام صفہ میں اپنا زیادہ وقت قرآن مجید اور کلام رسول ؐ کے ذریعہ علم دین حاصل کرنے میں صرف کیا کرتے تھے یا پھر ان خدمات کی انجام دہی میں اپنا وقت صرف کرتے تھے جو وقتاً فوقتاً حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کے سپرد کی جاتی تھیں۔ وہ آپ کا پیغام قبائل تک پہنچاتے، کبھی کبھی نو مسلم جماعت کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے لیے بعض دوسرے مقامات پر بھی متعین کیے جاتے تھے، ان بزرگوں کو اسلامی تاریخ اور سیر میں اصحاب صفہ، اہل صفہ اور ارباب صفہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس مختصر سی تحریر

میں ان ہی بزرگوں اور ان کے السعفہ کا ذکر مقصود ہے۔

وما التوفیق الا من اللہ العلیم الحکیم ۰

لفظی تشریح :

اَلصُّفَّۃُ کا مادہ لغوی، ص۔ف۔ف ہے۔ یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ اس لفظ کا کوئی تعلق ص ف و، یا ص و ف، یا ص ی ف کے مادوں سے ہے۔ یہ مادہ مضاعف ہے یعنی ایک صاد، اور دو فاء اس میں ہیں۔ یہ مادہ معتل نہیں ہے۔ یعنی اس میں کوئی حرفِ علت، الف، واؤ یا یائے شامل نہیں ہے۔ اور نہ کسی صرفی تبدیل و تقلیب میں حرف علت شامل ہو سکتا ہے۔

الصّفّہ، مادہ صفف سے بروزن فُعْلَۃٌ اسم صفت یعنی حاصل مصدر ہے۔ اس وزن پر عربی میں سینکڑوں ہی اسمائے صفات آتے ہیں مثلاً شعلۃ، عُمدۃ، قدوۃٌ، قُبلۃٌ وغیرہ وغیرہ۔

مادہ صَفّ کے اصلی معنی ہیں، انسانوں، جانوروں یا کسی شے کا ترتیب کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا ہونا۔ اسی لیے تحریر میں حروف، اور الفاظ کے برابر قائم ہونے کو صفہ اور سطر بھی کہتے ہیں۔ کسی بڑی تعمیر کے برابر کوئی چبوترہ بیٹھنے کے لیے بنا دیا جائے تو صفۃ البناء یا صفۃ البیت کہتے ہیں۔ مسجد کے ساتھ ایسی نشست گاہ بنائی جائے تو اسے صُفّۃ المسجد کہا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ فرق بھی بتایا ہے کہ بیٹھنے کی یہ جگہ کھلی ہو تو شرفۃ اور اگر اوپر چھپر ہو تو اسے سقیفہ یا صفہ کہا جائے گا۔ سقیفہ بہت بڑے چبوترے کو کہتے ہیں اور صفہ چھوٹے سے مسقف چبوترے کو۔

لفظ صُفّہ کی لغوی و لفظی تشریحات عربی زبان کے تمام ضخیم اور مستند لغات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً الصحاح للجوہری، قاموس اللغۃ للفیروز آبادی، لسان العرب لابن منظور الافریقی، اور سب سے زیادہ تاج العروس من جواہر القاموس للزبیدی میں۔

جو لوگ تصوف، صفا، صفی وغیرہ الفاظ کو لفظ صفہ سے مربوط کرتے ہیں وہ عربی لغات کے اعتبار سے صحیح ربط قائم نہیں کرتے۔ ان الفاظ اور لفظ صفہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ صوف صفی، صفا، وصف، اصف اور صفو وغیرہ الفاظ سب کے سب معتل ہیں یعنی ان کے حروف مادہ میں حرف علت (اوی) داخل ہے۔ اس کے برخلاف صفہ کا مادہ مضاعف ہے، اس میں ایک حرف صاد اور دو حرف فاء شامل ہیں۔ مضاعف میں تعلیل صرفی سے حرف علت پیدا ہونے کی صورت عام طور پر عربی زبان میں نہیں ہوا کرتی ہے۔

صفہ کیسے بنا؟:

مسجد نبوی کے ساتھ صفہ مدینہ منورہ کے یا عام عرب آبادیوں کے لیے کوئی نادر اور جدید بات نہ تھی۔ گھروں کے ساتھ، باغوں میں، اور شکار گاہوں میں اس طرح کی بیٹھکیں بنائی جاتی تھیں اور انہیں صفہ ہی کہا جاتا تھا۔ گھوڑے کی زین اور اونٹ کی کاٹھی پر نرم جگہ بنانے کے لیے نرم گھاس کی ایک گدی بنانے تھے، اسے بھی صفۃ الرحال کہتے تھے۔

۶۲۲ء۔ ۱ھ کے ماہ ربیع الاول میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخلص و بے مثال دوست اور اُمتی حضرت صدیق اکبر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ (اس وقت یثرب) کے قریب مقام قبا میں تشریف لائے تو آپ نے نزول قرآن مجید کے بعد پہلی مسجد مقام قبا میں تعمیر فرمائی۔ مہاجر صحابہ کی بڑی تعداد پچھلے چند ماہ کے اندر تھوڑے تھوڑے آگے پیچھے ہجرت کر کے یہاں پہنچ چکی تھی۔ اور اب یہ طے شدہ بات تھی کہ آئندہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقل قیام گاہ یثرب ہی ہوگا اور اسی کو اسلامی تبلیغ کے مرکز ہونے کا شرف حاصل ہونے والا ہے۔ مسلمانوں نے دار الہجرۃ یثرب کو مدینۃ النبی کہنا شروع کیا جو بعد کو المدینہ کے نام سے مشہور ہوا۔ قرآن حکیم میں اس شہر کے دونوں نام یثرب اور المدینہ کا ذکر آیا ہے۔

اب مدینہ منورہ میں چند لوگ تو وہ آگئے جو ہجرت کر کے آئے اور کوئی ٹھکانا نہ ہونے کی وجہ سے مسجد نبوی میں رات گزارنے کے لیے ٹھہرے۔ اسلامی تبلیغ کا دائرہ

اور وسیع ہُوا تو دُور اُفتادہ قبیلوں سے لوگ دین کی تعلیم حاصل کرنے کو آنے لگے۔ وہاں مدینہ میں کوئی سمان خانہ یا ہوسٹل تو نہ تھا۔ ابتداءً جو مہاجرین آئے تھے، اُن کے اور انصارِ مدینہ کے مابین مواخاۃ یعنی بھائی چارہ قائم کر دیا گیا تھا اور وہ اپنے انصاری بھائیوں کی مدد سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن دو چار ایسے بھی تھے، جن کا بھائی چارہ نہیں ہُوا تھا اور بعض ایسے بھی تھے کہ وہ مستقل طور پر مدینہ میں رہنے بسنے کو نہیں آئے تھے بلکہ کچھ دنوں کے لیے آئے تھے کہ اس مختصر سی مدت میں دینِ اسلام کی تعلیم خود زبانِ فیض رسانِ وحی و نبوّت سے حاصل کریں اور اس کے بعد واپس جا کر اپنے قبیلوں کو دین کی تعلیم دیں۔

ایک بات یہ بھی اب نئی پیدا ہو گئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرداری میں اب مدینہ کی شہری مملکت پیدا ہو گئی تھی۔ سربراہ قوم کو اس کی ضرورت تھی کہ اس کے احکام انتظامی کی تعمیل اور دوسری آبادیوں کو اس کے احکام پہنچانے کے لیے رضا کاروں کی ایک جماعت ہر وقت اس کے پاس موجود ہو جو بسر و چشم اس کے احکام کی تعمیل کے لیے تیار رہے، جہاں بھیجا جائے فوراً روانہ ہو جائے اور جس کو اطلاع پہنچانے کا کام اس کو سپرد کیا جائے وہ اس کام کی تکمیل میں اپنے گھریلو کاموں کی وجہ سے عاجز نہ ثابت ہو۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ ایک دن میں سارے اُمور کی تکمیل ممکن نہیں ہوتی۔ کسی حکومت و مملکت کے ضروری اجزاء کی تکمیل ہمیشہ آہستہ آہستہ اور تدریجی طور پر ہوتی ہے، اس لیے ایسے رضا کاروں کے لیے سر چھپانے کی جگہ بھی فوراً کہاں بن سکتی تھی، جب کہ ہمیں یہ حقیقت سامنے رکھنی چاہیئے کہ مدینہ میں آکر بسنے والے مہاجرین بلکہ پہلے سے وہاں بسے ہوئے انصار بھی بڑے بڑے وسائلِ معاش کے مالک نہ تھے اور نہ مملکت مدینہ کے پاس ٹیکسوں اور جائیدادوں سے کروڑوں کی آمدنی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ موجود تھا۔ اس صورت میں مسجد کے پاس ایک چھوٹا سا چبوترہ جس پر کھجور کی

پتیوں سے چھپر ڈال دیا گیا تھا وقتی طور پر ضرورت کی تکمیل کے لیے بنالیا گیا تھا۔ اسی چبوترے کو زمانہ کی عام بولی کے بموجب صفۃ المسجد کہتے تھے۔

دو یا تین صحابیان کرام کے سوا کوئی بہت بڑی تعداد اصحاب صفہ کی ہمیشہ نہیں رہتی تھی۔ کبھی دو تین شخص ہی ہوتے تھے اور کبھی دس بیس۔ یہ بھی خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ لوگ ہر وقت تسبیح و تہلیل میں لگے رہتے تھے اور کچھ نہ کرتے تھے۔ صفہ کوئی مٹھ یا گھور تپسیا کا آشرم نہ تھا جہاں لوگ ہر وقت یا کم از کم روزانہ مقررہ وقت پر گیان، دھیان، مراقبہ اور مکاشفہ میں مشغول ہوتے تھے۔ یا یہ لوگ ایسے تھے کہ دنیاوی علاقات سے ہمیشہ کے لیے دستبردار ہو کر بدھ مت کے مونڈوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ حضرت بلال رضؓ، حضرت عبداللہ بن اُمّ عبد رضؓ، حضرت ابوہریرہ رضؓ، حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضؓ، وغیرہ تو مشہور اصحابِ صفہ میں سے ہیں۔ ان کی سوانح عمریوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ جہادوں میں شریک ہوتے تھے، مالِ غنیمت میں سے حصہ بھی پاتے تھے، انھوں نے شادیاں بھی کیں، صاحبِ اولاد ہوئے، ان سے نسلیں چلیں اور آج تک بعض کی نسلیں موجود ہیں۔ کیا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت سعید بن المسیبؒ کے نکاح میں نہ تھیں، کیا حضرت انس بن مالکؓ نے ۹۳ھ میں تقریباً ایک سو پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں چھوڑ کر وفات نہیں پائی۔

صحابہ و صحابیات کے معروف ضخیم تذکرے مثلاً الاستیعاب لابن عبدالبر المتوفی ۴۶۳ھ، اُسد الغابہ لابن الجزری المتوفی ۶۳۰ھ اور الاصابہ لابنِ حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کو پوری طرح چھان ڈالیے ایسے پانچ اصحاب کا تذکرہ بھی نہیں ملے گا جنھوں نے چھ سات سال صاحب الصفہ کی حیثیت سے زندگی بسر کی ہو، اور تین صحابہ حضرت ابوہریرہ، حضرت انس، اور حضرت بلال کے علاوہ کسی چوتھے صحابی کا ذکر نہیں ملے گا۔ جنھوں نے مقیم صفہ ہونے کی چھوٹی یا بڑی مدت میں خود اپنے لیے معاش محنت

مزدوری / زراعت / ملازمت سے حاصل نہ کی ہو اور ایک بھی ایسے صاحب الصفہ صحابی کا ذکر نہیں ملے گا جنھوں نے پھونگیوں، نہنگوں، راہبوں اور جوگیوں کی طرح تارک الدنیا بن کر گیان و دھیان میں زندگی بسر کی ہو۔ وقتی طور پر ہفتہ دو ہفتہ کے لیے فقر و فاقہ کے ساتھ خیرات و مبرات پر بسر کرنے والے بھی دو چار ہی ملیں گے۔ جن میں مذکورۂ بالا تینوں بزرگ داخل ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض اصحابِ صفہ سرکاری نوکر تھے / کوئی صدقہ کے اونٹوں کی نگرانی پر، کوئی زکواۃ کی وصولی پر، اور کوئی تعلیم قرآن مجید پر مامور تھا۔ خوش حال صحابہ ان کی کبھی کبھی امداد بھی کرتے تھے لیکن امداد پر ہی ان کا گذارہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ اپنی محنت اور وقت کے عوض تنخواہیں اور اُجرتیں پاتے تھے۔ بعض وہ لوگ بھی تھے جو دوسرے صحابہ کے زراعتی و تجارتی کاموں میں شریک ہو کر مزدوریاں کرتے تھے اور فارغ وقت میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔

متعدد بزرگ وہ بھی تھے جنھوں نے دو چار مہینے صفہ پر رہنے کے بعد اتنی مزدوری کمائی کہ نکاح کر کے اپنا گھر بسا لیا، پھر بھی محنت مزدوری سے جو وقت بچ گیا وہ صفہ پر پابندی کے ساتھ بیٹھ کر علمِ دین حاصل کرنے میں صرف کرتے رہے۔

غرض یہ کہ صفہ ایک جگہ تھی جس پر مختلف اوقات میں اور مختلف مدّتوں کے لیے حسب ذیل مقاصد سے مدینہ منوّرہ آنے والے لوگ مقیم ہوتے رہے۔

(الف) وہ لوگ جو صرف اللہ کے لیے ملی خدمات انجام دینا چاہتے تھے، یعنی تحریکِ اسلامی کے مخلص رضا کار تھے لیکن یہ لوگ مستقلاً صفہ پر نہیں رہتے تھے اور نہ بڑی مدّت تک وہاں مقیم رہتے بلکہ اکثر وہ تعمیل ارشاد نبویؐ کے لیے دوسرے مقامات پر سفر میں ہوتے تھے۔

(ب) وہ لوگ جو بہت غریب تھے اور مواخاۃ کے بعد آئے تھے، ان کا نہ کوئی رشتہ دار مدینہ منورہ میں تھا اور نہ کوئی دوست۔ یہ لوگ کوئی ٹھکانا مل جانے اور آبادکاری

کی کوئی صورت پیدا ہونے تک صفہ پر رہا کرتے تھے۔

(ج) وہ لوگ جو تعلیم حاصل کرنے کے لیے تھوڑے دنوں کے لیے مدینہ منوّرہ آتے تھے، لیکن چونکہ وہاں ان کے لیے کوئی ہوسٹل یا مہمان خانہ نہ تھا اس لیے وہ اپنے قیام کی مدت صفہ پر گزارتے تھے۔ ان لوگوں کے متعلق قرآن مجید میں خصوصی حکم دیا گیا تھا:

وان احد من المشرکین استجارك فاجره حتیٰ یسمع کلام الله ثمّ ابلغه مامنه ذالك بانّهم قوم لا یعلمون ۝ ۔

(سورۃ "التوبہ" آیت ۶)

"اور اگر کوئی مشرکین میں سے تمہاری پناہ میں آجائے تو اسے پناہ دے دو تاکہ اللہ کا کلام سنے پھر اسے اس کی امن کی جگہ پہنچا دو، یہ اس لیے ہے کہ یہ لوگ بے علم ہیں۔"

وما کان المؤمنون لینفروا کافة فلولا نفر من کلِ فرقةٍ طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلّهم یحذرون ۝ (سورۃ "التوبہ" آیت ۱۲۲)

"ایمان والوں کے لیے یہ مناسب نہیں کہ سب لوگ نکل جائیں۔ کیوں نہ ہر گروہ سے کچھ لوگ (ٹھہر جائیں) تاکہ دین میں سمجھ بوجھ حاصل کریں اور جب واپس اپنی قوم میں جائیں تو ان کو اللہ کا خوف دلائیں، شاید وہ لوگ کفر سے پرہیز کرنے لگیں۔"

(د) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس آنے والے غیر مسلم مہمان۔

(ھ) وہ لوگ جو وقتاً فوقتاً وفود کی صورت میں یا تنہا مدینہ منوّرہ میں آیا کرتے تھے تاکہ ہدایاتِ نبوی سے بہرہ یاب ہوں۔

صفہ کب بنا تھا؟

صفہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے مسجد نبوی مدینہ منوّرہ سے ملحق ایک مسقف چبوترہ تھا۔ اس کا محل وقوع یہ ہے کہ مسجد نبوی کے صحن سے باہر مشرق کی طرف قبلہ سے مخالف سمت یعنی

شمال میں مسجد کے دروازہ سے باہر ایک چبوترہ تھا، کہیں اس کی پیمائش کا ذکر تو روایات میں نظر سے نہیں گزرا لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تقریباً ۲۰ فٹ طویل اور تقریباً ۱۵ فٹ عریض چبوترہ تھا۔

یہ چبوترہ کب بنایا گیا تھا، اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا لیکن چونکہ ۲ھ میں غزوۂ بدر سے پہلے اور ۱۱ھ میں وفاتِ رسولؐ کے بعد صفہ اور اہلِ صفہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا اس لیے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صفہ تقریباً سات یا آٹھ سال تک قائم رہا۔ اس اثنا میں مندرجہ بالا چاروں قسم کے لوگ مختلف اوقات میں مختلف مدتوں کے لیے مقیم رہے۔

اگر صفہ کوئی مستقل خانقاہ یا زاویہ ہوتا تو عہدِ صدیقی و عہدِ فاروقی میں بھی قائم رہتا، ختم نہ ہو جاتا۔ ہمیں تاریخی روایتوں میں وفاتِ رسولؐ کے بعد صفہ و اہلِ صفہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے، اور نہ عہدِ فاروقی میں جو وظائف مجاہدین اور اُمہات المومنین کے لیے مقرر کیے گئے اس سلسلہ میں اہلِ صفہ کا کوئی ذکر ملتا ہے۔

صفہ کب بنا تھا، اس کے لیے صفہ کا محلِ وقوع خود ایک دلیل ہے۔ صفہ مسجدِ نبوی سے باہر جانب شمال میں تھا اور یقیناً وہ تحویلِ قبلہ یعنی ۱۵ شعبان ۲ھ کے بعد ہی بنا ہوگا۔ کیونکہ اس وقت تک مسجدِ نبوی کا قبلہ جانب شمال تھا۔ جب کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا تو جنوبی رُخ پر قبلہ کی دیوار بنائی گئی اور شمالی رُخ خالی ہو گیا۔ پھر حدودِ مسجد سے باہر شمالی رُخ پر یہ چبوترہ بنا ہوگا، بہرحال اس کے بعد بھی کوئی ذکر اس کا غزوۂ بدر کبریٰ سے پہلے نہیں ملتا ہے۔ غزوۂ بدر کبریٰ رمضان ۲ھ میں ہوا تھا۔

اصحاب الصفہ :

مختلف اوقات میں کتنے لوگ صفہ پر قیام پذیر رہے، ان کی مکمل یا غیر مکمل کوئی فہرست مہیا کرنا ممکن نہیں ہے۔ سات یا آٹھ سال کی مدت میں جب کہ صفۃ المسجد واردانِ مدینہ کے لیے وقتی قیام گاہ رہا۔ سیکڑوں ہی اشخاص کو اس چبوترے پر قیام پذیر ہونے کا موقع ملا، کہاں اس کا کوئی رجسٹر تھا، یا اس سلسلہ میں کوئی یادداشت تیار کی جاتی

تھی جو فہرست مہیا کی جاسکے ۔ سینکڑوں سال کے بعد سیرت نگار حضرات نے ان کی تعداد بھی مختلف بتائی ہے ، کوئی کہتا ہے کہ ان کی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے ، کوئی کہتا ہے کہ ستر اسی تک ، لیکن یہ سب محض قیاسی باتیں ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ و صحابیات کے تذکرہ میں سب سے بڑی کتاب جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے ۔ وہ امام ابن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کی کتاب الاصابہ ہے ۔ اس میں یقینی و غیر یقینی صحابہ و صحابیات کے جملہ اسماء بارہ ہزار سے کم ہیں ، اور ان میں سے بھی بہتوں کا کوئی حال نہیں ہے ۔ حالانکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ حجۃ الوداع میں آپ کے ساتھ حج کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار یا اس کے قریب قریب تھی ۔ اس طرح شرکائے حجۃ الوداع میں سے شاید سات فیصد کے نام بھی ہم تک نہیں پہنچے ہیں ، تو یہ کہاں ممکن ہے کہ سارے اصحاب صفہ کی فہرست مہیا ہو سکے ۔

الحاکم نے المستدرک ج ۳ ، ص ۱۶ میں حسب ذیل اصحاب کے اسمائے گرامی اصحاب صفہ میں لکھے ہیں ، لیکن ظاہر ہے کہ یہ وہ چند اسمائے گرامی ہیں جو امام الحاکم کو مل سکے ہیں ۔ یہ کوئی فہرست نہیں ہے ۔ بہر حال وہ اسمائے گرامی یہ ہیں :-

(۱) حضرت ابو عبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ ۔
(۲) حضرت عبد اللہ بن مسعود رض
(۳) حضرت بلال بن رباح رض
(۴) حضرت عمار بن یاسر رض
(۵) حضرت مقداد بن عمرو رض
(۶) حضرت خباب بن ارت رض
(۷) حضرت صہیب بن سنان رض
(۸) حضرت زید بن الخطاب رض
(۹) حضرت کنانہ بن حصین رض
(۱۰) حضرت ابو کبشہ مولی رسول ؐ
(۱۱) حضرت صفوان بن بیضاء رض
(۱۲) حضرت ابو عبس بن جبر رضی اللہ عنہ
(۱۳) حضرت سالم مولی ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ ۔
(۱۴) حضرت مسطح بن اثاثہ رض
(۱۵) حضرت مسعود بن ربیع رض
(۱۶) حضرت عکاشہ بن محصن رض
(۱۷) حضرت عمیر بن عوف رض

(۱۸) حضرت عویم بن ساعدہ رضؓ (۱۹) حضرت ابو لبابہ رضؓ
(۲۰) حضرت کعب بن عمیر رضؓ (۲۱) حضرت خبیب بن سیاف رضؓ
(۲۲) حضرت عبداللہ بن انیس رضؓ (۲۳) حضرت ابوذر جندب غفاری رضؓ
(۲۴) حضرت عتبہ بن مسعودؓ ہذلی رضؓ (۲۵) حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ
(۲۶) حضرت سلمان الفارسی رضؓ (۲۷) حضرت حذیفہ بن الیمان رضؓ
(۲۸) حضرت حجاج بن عمر الاسلمی رضؓ (۲۹) حضرت ابو ہریرہ عبدالرحمٰن بن صخر الدوسی رضؓ
(۳۰) حضرت ابوالدرداء عویمر بن عامر رضؓ (۳۱) حضرت عبداللہ بن زید جہنی رضؓ
(۳۲) حضرت ثوبان مولیٰ رسولؐ اللہ رضؓ (۳۳) حضرت معاذ بن الحارث رضؓ
(۳۴) حضرت سائب بن الخلاد رضؓ (۳۵) حضرت ثابت بن ودیعہ رضؓ

اس سے بڑی کوئی فہرست میری نظر سے نہیں گزری۔ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء ج ۱ — ص۳۴۹، اور السمہودی نے وفاء الوفا ج ۱ ص۳۲۹ میں اصحاب الصفہ کے کچھ احوال لکھے ہیں، لیکن نہ ابونعیم قابلِ وثوق راوی ہے اور نہ السمہودی پر اعتماد ہے۔ ان لوگوں نے بھی اس سے بڑی کوئی فہرست پیش نہیں کی ہے۔

بہر حال اس فہرست پر نظر ڈالنے سے یہ دو باتیں تو واضح ہو جاتی ہیں کہ :

(۱) مقامی بزرگوں میں سے کوئی مدنی صحابی ان میں نہیں ہے۔

(۲) ان بزرگوں میں اکثر وہ ہیں جن کی اولاد تھی۔ یہ لوگ کسی طرح تارک الدنیا خانقاہی فقراء نہ تھے۔ یہ مزدوریاں بھی کرتے تھے، جہاد میں بھی شریک ہوتے تھے، اور مالِ غنیمت بھی حاصل کرتے تھے۔ مثلاً :

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن الخطاب رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ، کے احوال تو تذکروں میں کسی نہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ مل ہی جاتے ہیں۔ یہ لوگ صاحبِ اولاد، صاحبِ جائیداد اور صاحبِ مال تھے، انہیں تارک الدنیا خانقاہی کیسے کہا جا سکتا ہے۔

اللہ ہی جانتا ہے کہ لوگوں نے یہ کیوں اور کس بنیاد پر مشہور کر دیا ہے، کہ اصحاب الصفہ پھونگیوں اور جوگیوں کی طرح "تارک الدنیا" لوگ تھے، یا یہ لوگ ہمیشہ خیرات و مبرات پر زندگی بسر کرتے رہے۔ بلکہ اس فہرست میں تو ایسے لوگ بھی ہیں، جو خود صاحبِ نصاب تھے اور پابندگی کے ساتھ زکواۃ ادا کرتے تھے، اور ایسے لوگ بھی ہیں، جنہوں نے بڑی بڑی سرکاری ملازمتیں کیں، گورنر رہے، افسر مال رہے، فوجوں کے کمانڈار رہے۔ نعوذ باللہ یہ لوگ خیرات خور قلندر تو نظر نہیں آتے۔ ایسی زندگی تو اسلام نے نہیں سکھائی، اور نہ ایسے لوگ صحابہ کرام میں ہوتے تھے۔ قرآن مجید تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھ جو لوگ تھے، ان کی کیفیت یہ بتائی ہے،

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم، تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ و رضوانا، سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود.... (سورۃ الفتح، آیت ۲۹)

"محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں، آپس میں رحم دل ہیں، تم انہیں دیکھو گے کہ وہ رکوع و سجدہ بھی کرتے ہیں اور اللہ کی دی ہوئی روزی اور مال و دولت بھی تلاش کرتے ہیں اور اللہ کی رضا بھی چاہتے ہیں ان کے چہروں پر سجدوں کے نشان بھی ہیں۔"

یہ کہاں ممکن تھا کہ لوگ مجہول بے حرکت، خیرات خور اور رہبان ہوتے اور پھر بھی اللہ تعالیٰ ان کی یہ صفات بیان فرماتا، وہ لوگ سنتِ رسول ﷺ کو بالارادہ اور دوامی طور پر ترک کرتے اور پھر بھی اللہ تعالیٰ ان کی تعریف فرماتا۔؟

تعالی اللہ عمّا علواً کبیراً

زکوٰۃ اور اُس کا نفاذ

محمد یوسف گورایہ

زکوٰۃ کی اہمیت :۔ ایتاءِ زکوٰۃ کو تمام انبیاء کی تعلیمات میں اساسی حیثیت حاصل رہی ہے :۔

وجعلناھم اُئمۃ یھدون بأمرنا و اوحینا الیھم فعل الخیرات و اقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ[1]

"اور ہم نے انہیں پیشوا بنایا، جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں اور ہم نے ان پر نیک کام کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی۔"

بعثت محمدیؐ کے بعد مسلمانوں کو مکی عہد ہی میں زکوٰۃ کی تعلیم دے دی گئی تھی :۔

واقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ[2]۔

"نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو"

اسلامی ریاست اور ایتاءِ زکوٰۃ : قرآن حکیم میں اسلامی ریاست کے جو فرائض بیان ہوئے ہیں، اقامت صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ ان میں سرفہرست ہیں ۔

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر[3]

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں تمکن عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کاموں کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے روکیں"

ہجرت مدینہ کے بعد جب مسلمانوں کو تمکن فی الارض حاصل ہوا تو نظامِ زکوٰۃ کے باقاعدہ قیام کا حکم نازل ہوا :۔

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا وصل علیھم ان صلوتک سکن لھم[4]۔

"آپ ان کے مال میں سے زکوٰۃ وصول کیجئے، اس کے ذریعے ان کی تطہیر اور تزکیہ کیجئے، اور ان پر دعائے خیر بھیجئے، تحقیق آپ کی دعا ان کے لئے تسکین ہے۔"

مصارف زکوٰۃ :۔ قرآن حکیم نے زکوٰۃ کی وصولی کے ساتھ ساتھ اس کے مصارف بھی تفصیل سے بیان کئے ہیں

انما الصدقت للفقراء والمساکین والعاملین علیھا والمؤلفۃ قلوبھم وفی الرقاب والغارمین

"صدقات (زکوٰۃ) تو حق ہے فقراء کا، مساکین کا، اور اس پر مامور کارندوں کا، اور جن کی تالیف قلوب منظور ہو، اور غلاموں کے آزاد کرانے میں، اور قرضداروں پر"

وفی سبیل اللہ وابن السبیل ط فریضۃً من اللہ ۵ — اور اللہ کی راہ میں، اور مسافروں کی مدد میں یہ اللہ کی طرف سے فریضہ ہے

یہ مصارف فقر و مسکنت، غربت و افلاس، اور معاشی بدحالی کے ہر پہلو پر محیط ہیں اور ان کا انسداد اللہ کی طرف سے اسلامی ریاست پر بطور فریضہ عائد کیا گیا ہے۔

نصاب زکوٰۃ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اموال کا نصاب زکوٰۃ مقرر فرمایا۔ آپؐ عاملین زکوٰۃ کو متعلقہ علاقوں کی طرف روانہ کرتے وقت انہیں نصاب زکوٰۃ پر مبنی تحریری احکام عطا فرماتے تاکہ وہ اس مقررہ نصاب کے مطابق زکوٰۃ کی وصولی کریں۔ آپ کی طرف سے نصاب زکوٰۃ پر مبنی مفصل تحریری ضابطے، حدیث، فقہ، اور تاریخ کی کتابوں میں حضرت عمرو بن حزمؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کے نام محفوظ ہیں۔(۱)

سونے کی زکوٰۃ کا نصاب: بیس مثقال مساوی ساڑھے سات تولے سونے پر پورا ایک سال گذر جانے کے بعد چالیسواں حصہ زکوٰۃ ہے اس سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔

چاندی کی زکوٰۃ کا نصاب:۔ دو سو درہم مساوی باون تولے چھ ماشے پانچ رتی پر پورا ایک سال گذر جانے کے بعد چالیسواں حصہ زکوٰۃ ہے اس سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔

مال تجارت پر زکوٰۃ کا نصاب:۔ اس تجارتی مال پر زکوٰۃ فرض ہے جو فروخت کی نیت سے لیا گیا ہو۔ اس کا نصاب مال کی قیمت کے اعتبار سے ہوگا۔ اگر کل مال کی قیمت تقریباً ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونے کی قیمت کے برابر ہے یا اس سے زائد ہے تو سال گذر جانے پر اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ دینا ہوگا۔

اونٹوں کی زکوٰۃ کا نصاب:۔ پانچ اونٹوں سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔ پانچ یا پانچ سے زائد اونٹوں پر سال گذر جانے کے بعد زکوٰۃ ہے۔ پانچ اونٹوں سے نو اونٹوں تک ایک بکری زکوٰۃ ہوگی۔ دس سے چودہ تک دو بکریاں، پندرہ سے انیس تک تین بکریاں، بیس سے چوبیس تک چار بکریاں، پچیس سے پینتیس اونٹوں پر ایک اونٹنی جس کی عمر کا دوسرا سال شروع ہو چکا ہو۔ چھتیس سے پینتالیس اونٹوں پر ایک اونٹنی جس کا تیسرا سال شروع ہو چکا ہو۔ اسی طرح ایک خاص تعداد کے مطابق زکوٰۃ بڑھتی جائے گی۔

گائے بھینس کی زکوٰۃ کا نصاب:۔ تیس سے کم گایوں، بھینسوں پر زکوٰۃ نہیں، تیس گایوں یا بھینسوں پر سال گذرنے پر ایک گائے یا بھینس کا ایک سالہ بچھڑا زکوٰۃ ہے۔ چالیس گایوں بھینسوں پر گائے بھینس کا بچھڑا جس کی عمر

تیسرا سال شروع ہو چکا ہو۔ اسی طرح ایک خاص تعداد کے مطابق زکوٰۃ بڑھتی جائے گی۔

بھیڑ بکری کی زکوٰۃ کا نصاب:۔ چالیس بھیڑ بکریوں سے کم پر زکوٰۃ نہیں، چالیس سے ایک سو بیس بھیڑ بکریوں پر ایک سال گذر جانے کے بعد ایک بھیڑ بکری زکوٰۃ ہوگی۔

عشر:۔ اسلام کے نظام زکوٰۃ میں عشر اس مد کے لئے مخصوص ہے جو زمین (کھیتوں، باغات وغیرہ) کی پیداوار سے ادا کی جاتی ہے۔ اس کا نصاب کل پیداوار کا دسواں اور بعض صورتوں میں بیسواں حصہ مقرر ہے۔ عشر کی فرضیت پر زکوٰۃ کے عمومی دلائل کے علاوہ قرآن حکیم کی درج ذیل آیات خاص دلائل کے طور پر پیش کی جاتی ہیں:

وآتوا حقہ یوم حصادہ[۷] "کھیتی کے کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو"

اس آیت میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور حضرت سعید بن جبیرؓ نے "حقہ" کا مفہوم عشر اور نصف عشر مراد لیا ہے[۸]۔

یا ایھا الذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض[۹]۔ "اے ایمان والو! خرچ کرو اپنی نیک کمائی سے اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیا ہے۔"

اس آیت میں "ومما اخرجنا لکم من الارض" سے عشر مراد لیا گیا ہے۔

عشر کا نصاب:۔ قرآن مجید کی ان آیات سے عشر کا مفہوم ملتا ہے مگر عشر کے بارے میں تفصیلی احکام احادیث رسول اللہ ﷺ میں موجود ہیں۔ ان کے مطابق بارش (قدرتی) نہروں، چشموں وغیرہ سے سیراب ہونے والی زمینوں کی پیداوار میں سے دسواں حصہ لیا جاتا ہے۔ اور جو رہٹ وغیرہ سے سیراب ہونے والی زمینوں کی پیداوار میں سے بیسواں حصہ لیا جاتا ہے۔

فیما سقت السماء والعیون او کان عثریا العشر وما سقی بالنضح نصف العشر[۱۰]۔ جس زمین کو بارش یا چشموں کا پانی سیراب کرے یا خود بخود بارش کے پانی سے سیراب ہو اس میں عشر ہے اور جس زمین کو کنوئیں سے سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر ہے۔

نصاب عشر کے اس عمومی حکم کی مزید وضاحت ناپ تول کے پیمانہ "وسق" سے کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لیس فیما اقل من خمسۃ اوسق صدقۃ[۱۱] "پانچ وسق سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔"

ایک وسق ساٹھ صاع کا اور ایک صاع چار مد کا ہوتا ہے۔ عموماً صاع کا وزن ڈھائی سیر سے پونے چار سیر تک بتایا گیا ہے۔ ڈھائی سیر کے اعتبار سے پانچ وسق تقریباً انیس من ہوتے ہیں، جبکہ پونے چار سیر کے اعتبار سے ۲۸

مقدار تقریباً اٹھائیس من ہو جاتی ہے۔ نصاب عشر کی حکمت یہ بتائی گئی ہے کہ پانچ وسق کی قیمت دو سو درہم تھی
وتاویل ماروی یاہ زکوٰۃ التجارۃ لانہم کانوا یتبایعون بالاوساق وقیمۃ الوسق اربعون درھماً[۱۲]۔

زکوٰۃ و عشر کے نصاب کی تعیین میں گہری حکمت پنہاں ہے۔ جس مال کی پیدائش براہِ راست قدرت سے ہوتی ہے اور اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس میں زکوٰۃ کی مقدار سب سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ پھر جس مال کی پیدائش میں انسان کا تھوڑا بہت دخل ہوتا ہے اس میں مقدار کم کر دی گئی ہے۔ اس قاعدے کے مطابق جس پیداوار میں انسان کی محنت و سرمایہ جتنا بڑھتا جائے گا اس کی نسبت سے اس کی مقدار میں کمی ہوتی جائے گی۔

معادن (کانوں) اور قدیم دفینوں کی پیداوار میں انسان کی محنت کو زیادہ دخل نہیں اسی لئے ان کی مقدار زکوٰۃ سب سے زیادہ یعنی کل کا پانچواں حصہ ہے۔ بارش کے پانی سے سیراب ہونے والی زمین جس پر ہل چلانا، بیج ڈالنا، دیکھ بھال کرنا، کاٹنا اور گاہنا شامل ہے اس میں معادن و خزائن کی زکوٰۃ کا آدھا یعنی دسواں حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ وہ اراضی جن کی آبپاشی کے لئے کنویں اور نہریں کھودنے پر محنت اور خرچ اور بڑھ جاتا ہے ان پر بیسواں حصہ کر دیا گیا ہے۔ زمین کے علاوہ سونا، چاندی، مال تجارت وغیرہ کی کمائی میں انسانی محنت و عمل کو اس سے بھی زیادہ دخل ہے اس لئے اس کی زکوٰۃ کا چالیسواں حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ اور یہی حکمت مویشی کی زکوٰۃ میں مضمر ہے۔

<u>نظامِ زکوٰۃ کا قیام</u>:۔ مصارف و نصاب زکوٰۃ کی تعیین کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نظامِ زکوٰۃ کے قیام کا اہتمام فرمایا۔ آپ نے جزیرۃ العرب کو مختلف انتظامی حصوں میں تقسیم فرما کر ان پر عمال مقرر فرمائے۔ ان عاملین زکوٰۃ میں سے چند معروف کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں

حضرت علیؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ، حضرت عمرو بن حزمؓ حضرت عتاب بن اسیدؓ، حضرت حارث بن عبدالمطلب، حضرت العلاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہم۔

یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے۔ خدا، قرآن اور قیامت پر دل کی گہرائیوں سے ایمان رکھتے تھے۔ کتاب و سنت کی تعلیمات پر دل و جان سے فدا اور ان پر عمل کرنے اور حکمت و دانائی سے ان کے نفاذ کے لئے بے چین و بے قرار تھے۔ انسانیت کی دینی و دنیاوی فلاح و بہبود اسلام کی اساسی تعلیمات میں سے

اور نظامِ زکوٰۃ، فقر و مسکنت اور غربت و افلاس کے انسداد کا انتہائی مؤثر ذریعہ ہے۔

نتائج :۔ یہ تفصیل کسی منصوبہ یا اسکیم کی نہیں، بلکہ بیان ہے اس نظام کا جو تاریخ کے نصف النہار میں اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ عملاً قائم ہوا۔ جس کے انمٹ نقوش تاریخ کے اوراق پر ثبت ہیں اور تا قیامت اقوام و ملل کے لئے اسوہ و نمونہ کا کام دیتے رہیں گے۔

عہد رسالت میں نظامِ زکوٰۃ اپنی تمام تفصیلات و جزئیات کے ساتھ باقاعدہ طور پر تقریباً ۹ھ میں نافذ ہوا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک صرف ایک سال میں اس کے جو اثرات و نتائج مترتب ہوئے، اس کی تفصیل مشہور سیرت نگار ابن سید الناس نے اپنی معروف تالیف "عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر" میں بیان کی ہے، اس نے جزیرۃ العرب کے ایسے بہت سے قبائل کا ذکر کیا ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عاملین مقرر فرما کر نظامِ زکوٰۃ نافذ فرمایا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر قبیلے میں ایک عامل مقرر فرما دیتے تھے۔ جو اس قبیلے کے فقراء و مساکین اور دیگر حاجتمندوں کی فہرست تیار کرتے اور قبیلے کے خوش حال افراد اور اصحاب نصاب سے جمع ہونے والی زکوٰۃ ان میں تقسیم کر دیتے۔ اس طرح وہ انہیں فقر و فاقہ پر قابو پانے میں مدد دیتے، اس حکمت عملی سے محتاج و فقیر مستقل طور پر بھکاری رہنے کے بجائے خود کفیل ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو تے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کئے ہوئے اس نظام کو خلفائے راشدین نے بھی جاری رکھا۔ اور قلیل ترین مدت میں اس کے جو انتہائی مفید اور کامیاب نتائج برآمد ہوئے وہ تاریخ عالم میں اپنی مثال آپ ہیں۔

عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ کے دوران میں ربع مسکوں کا ایک بڑا حصہ فتح ہوا اور مفتوحہ ممالک عرب عراق، شام، ایران، لبنان، فلسطین، مصر، شمالی افریقہ، سے فقر و فاقہ کا کامیاب حد تک انسداد کر دیا گیا۔ نظام زکوٰۃ کے ذریعے اسلام کے معاشی انقلاب پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں امام ابو یوسف کی کتاب الخراج، امام یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج اور امام ابو عبید القاسم بن سلام کی کتاب الاموال خاص طور پر قابل ذکر ہیں مجملہ دیگر ممالک کے، یمن میں نظامِ زکوٰۃ کے ذریعے غربت و افلاس، فقر و مسکنت اور احتیاج و رقاب جیسے معاشی مسائل کو جس طرح حل کیا گیا امام ابو عبید نے اس کی تفصیلات محفوظ کی ہیں۔

یمن نو ہجری میں فتح ہوا۔ حضرت معاذؓ بن جبل عامل مقرر ہوئے اور حضرت عمرؓ کے عہد تک اس عہدے پر

فائز رہے۔ عہد رسالت سے عہد فاروقی تک چار سال کے مختصر عرصہ میں نظام زکوٰۃ کے ذریعے آپ نے جو معاشی انقلاب برپا کیا اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ عہد فاروقی کے پہلے سال کے اختتام پر اپنے علاقے سے جمع شدہ کل زکوٰۃ کا ایک تہائی حصہ مرکزی حکومت کو بھجوایا۔ حضرت عمرؓ نے جواب طلبی کی "میں نے تمہیں مال جمع کرنے یا جزیہ وصول کرنے کے لئے نہیں بھیجا۔ تمہارا تقرر اس لئے ہوا کہ وہاں کے خوشحال لوگوں سے زکوٰۃ وصول کر کے وہاں کے فقراء پر لوٹا دو" حضرت معاذؓ نے جواب دیا "میں نے جو کچھ آپ کے پاس بھیجا ہے وہ مقامی ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے بعد بھیجا ہے" دوسرے سال کل زکوٰۃ کا نصف بھیج دیا۔ پھر جواب طلبی ہوئی آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ تیسرے سال حضرت معاذؓ نے زکوٰۃ کی کل آمدنی مرکز کو بھجوا دی اور ساتھ ہی کہلوا بھیجا کہ "اب یہاں مجھے ایک بھی ایسا شخص نہیں ملتا جو زکوٰۃ کے مال کا محتاج ہو"۔(۱۳)

طریق کار :- نظام زکوٰۃ وعشر کے ذریعے معاشی مسئلے کے حل اور اس کے بے مثال نتائج کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے اس ماحول کو جاننا ضروری ہے جس میں یہ انقلاب آفریں نظام نافذ ہوا تھا۔

مصارف زکوٰۃ والی تفصیلی آیت کے آخر میں ایک انتہائی قابل غور جملہ "فریضۃ من اللہ" موجود ہے۔ جس سے مصارف زکوٰۃ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے اسی طرح خذ من اموالھم صدقۃً سے زکوٰۃ کی وصولی کی فرضیت ثابت ہوتی ہے، جس کی رو سے مسلمانوں پر فریضہ عائد ہوتا ہے۔ کہ وہ اسلامی حکومت کی موجودگی میں زکوٰۃ کی ادائیگی صرف حکومت کو کریں۔ اس حکم کے تحت خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حکومت کو زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا اور فرمایا "واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ"(۱۴)

آپ نے یہ اعلان اس وقت فرمایا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر بعض عرب قبائل نے باقی ارکان دین تو ویسے ہی ادا کرتے رہنے کا یقین دلایا مگر زکوٰۃ حکومت کو ادا کرنے کی بجائے اپنے طور پر جمع و تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی جو دراصل نظام زکوٰۃ میں ایک ترمیم کے مترادف تھی۔ تاریخ اسلام سے آگاہ حضرات ان سنگین و نازک ترین حالات سے بخوبی آگاہ ہیں جن کا خلافت راشدہ کو وصالِ رسالتمآب کے بعد سامنا کرنا پڑا تھا۔ مگر حضرت ابوبکرؓ کی عظمت و فضیلت کا راز بھی حالات کی اس سنگینی و نزاکت ہی میں پنہاں ہے کہ آپ نے سیاست کی خاطر دین میں ترمیم قبول کرنا گوارا نہ فرمایا اور اعلان کر دیا :

"اگر ان لوگوں نے اس نظام زکوٰۃ میں رتی بھر ردو بدل کرنے کی کوشش کی اور جو کچھ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کرتے تھے اس میں سے مجھے اونٹ کے پاؤں سے باندھی جانے والی ایک رسی بھی دینے سے انکار کیا تو میں ان کے خلاف بحیثیت سربراہِ حکومت جہاد کروں گا۔"(۱۵)

عہد خلافت راشدہ کے بعد "فریضۃ من اللہ" اور "خذ من اموالھم صدقۃ" کے اس پہلو کو بالعموم نظر انداز کیا گیا کہ یہ فریضہ یک طرفہ نہیں دو طرفہ ہے۔ ان کے مطابق جہاں اصحاب نصاب مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوا کہ وہ زکوٰۃ کی ادائیگی صرف حکومت اسلامیہ کو کریں وہاں حکومت پر یہ فریضہ عائد ہوا کہ وہ مصارف زکوٰۃ کے ذریعے فقر و مسکنت اور غربت و افلاس کا مکمل طور پر انسداد کرے۔

اسلام نے زکوٰۃ کی وصولی کے سلسلے میں حکومت کو اتنے وسیع اختیارات اس لئے دیئے ہیں تاکہ اسے مالی وسائل کی کمی کا عذر نہ رہے۔ لیکن اتنے وسیع اختیارات کے باوجود اگر حکومت فقر و مسکنت، غربت و افلاس، تنگدستی و محتاجی، جہالت و بیماری کا سدباب نہیں کرتی تو ایسی حکومت اللہ تعالیٰ کے ہاں مجرم قرار پاتی ہے اور اگر حکومت اسلامیہ کی موجودگی میں مسلمان زکوٰۃ کی ادائیگی حکومت کو نہیں کرتے تو وہ حکومت کے مجرم قرار پاتے ہیں۔ ان کے خلاف حکومت کو مکمل اختیار ہے کہ وہ ایسے باغیوں کی پوری قوت کے ساتھ سرکوبی کرے۔

حکومت کو فقر و فاقہ کے خلاف پوری قوت استعمال کرنی چاہیئے۔ کیونکہ غربت و افلاس کو باقی رکھنا اور نظام زکوٰۃ نافذ نہ کرکے مسلمانوں کو مسلسل محتاج و مقروض رکھنا شیطان کے ساتھ تعاون اور اس کے عہد کی پاسداری کرنا ہے کیونکہ یہ شیطان کا عہد ہے کہ وہ انسانوں کو غربت و افلاس میں مبتلا رکھے گا اور انہیں منکر و فحشاء کا حکم دے گا:۔ الشیطان یعدکم الفقر و یامرکم بالفحشاء(۱۶) "شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا اور حکم کرتا ہے بے حیائی کا"

مفلس و نادار لوگوں کو آسانی سے ایسے کاموں پر لگایا جا سکتا ہے جن سے معاشرہ میں فساد بپا ہو۔ چوری ڈاکہ، اغوا، زنا و دیگر فواحش و منکرات اسی شیطانی منبع سے جنم لیتے ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں فقر و مسکنت کا مکمل طور پر ازالہ کرنا اور نظام زکوٰۃ رائج کرکے مسلمانوں میں فضل و خوشحالی لانا اللہ تعالیٰ کے عہد کی پاسداری کرنا ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عہد ہے کہ وہ اپنے بندوں کو اپنے فضل سے زیادہ دے گا اور اپنی مغفرت سے انہیں فلاح و بہبود اور ترقی و خوشحالی سے نوازے گا:۔

واللّٰہ یعدکم مغفرۃ منہ وفضلاً واللّٰہ واسع علیم[17]۔ "اور اللّٰہ وعدہ دیتا ہے تم کو اپنی بخشش اور فضل کا اور اللّٰہ بہت کشائش والا ہے سب کچھ جانتا ہے"۔

عاملین زکوٰۃ ہمیشہ اس حکم کو سامنے رکھتے کہ اللّٰہ کی طرف سے ان پر یہ فریضہ عائد ہے کہ وہ اپنے علاقوں سے غربت وافلاس کا مکمل انسداد کریں اور اس کام میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں۔ اور جب تک فقر ومسکنت ان کے حدود واختیار سے ختم نہیں ہو جاتی وہ ہنگامی بنیادوں پر اس کے خلاف مصروف پیکار رہیں۔

اسلام کے نزدیک مالی، مادی اور معاشی ترقی وخوشحالی کی بنیاد پر فقط ایک لادینی فلاحی مملکت کا قیام فی نفسہ کوئی زیادہ اہمیت کا حامل نہیں۔ اسلام میں مادی خوشحالی کا مقصود مسلمانوں کو پاکیزہ اخلاق بنانا اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرنا اور انہیں امن وسکون اور چین وسلامتی فراہم کرنا ہے۔

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا وصل علیھم ان صلوٰتک سکن لھم واللّٰہ سمیع علیم[18]۔ "لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ تاکہ تو انہیں پاک کرے اور ان کا تزکیہ نفس کرے اور انہیں دعا دے بے شک آپ کی دعا ان کے لئے تسکین ہے اور اللّٰہ جانتا اور سنتا ہے۔"

اس آیت میں زکوٰۃ کی غایت بیان ہوئی ہے اور انہی اغراض ومقاصد کا حصول عاملین زکوٰۃ کے فرائض منصبی تھے۔ اس میں واضح طور پر حکومت اسلامیہ کو مکمل اور وسیع اختیارات کے ذریعے زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم موجود ہے۔ "خذ من اموالھم صدقۃ" اور اس آیت میں پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ مقاصد زکوٰۃ موجود ہیں۔ "تطھرھم وتزکیھم بھا وصل علیھم ان صلوٰتک سکن لھم" اب اگر زکوٰۃ کو عام ٹیکس قرار دے دیا جائے اور اس کی وصولی پر مامور کارندے فقط رقوم وفصول کی جمع تک محدود ہو کر رہ جائیں یا زیادہ سے زیادہ یہ کریں کہ جمع کردہ رقوم میں سے کچھ علاقے کے غریبوں، مسکینوں، بیواؤں، معذوروں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیں تو یہ قرآنی احکام کی بجا آوری کی بجائے ان کی تضحیک ہو گی۔ قرآن بہتر سے بہتر اور خوب سے خوب تر انسان بنانے کا متمنی ہے۔ اور ایسا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عاملین زکوٰۃ خود ان اوصاف حمیدہ اور صفات عالیہ کے مجسمہ نہ ہوں، جو اوصاف وصفات وہ اپنے علاقے کے مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتے ہوں۔

جو ملک وملت اور قوم ومعاشرہ ایسے عاملین زکوٰۃ پیدا کر لے وہ پوری قوم کی تطہیر، تزکیہ اور تسکین کر

سکتا ہے اور جس ملک و قوم کے سامنے محض مادی اور مالی خوشحالی ہو اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ قرآنی احکام کا نام لئے بغیر عام مادی روش پر چل کر ملک میں فلاحی مملکت کے قیام کا پروگرام مرتب کرے۔

عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں ایک انتہائی قلیل مدت میں جو معاشی عدل و انصاف کا انقلاب بپا ہوا وہ کافی حد تک عاملین زکوٰۃ کے ذاتی کردار و اخلاق کا مرہونِ منت تھا۔ عاملین اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں عنداللہ و عندالناس مسئولیت کے احساس کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ہر وقت محسوس کرتے تھے۔

کتاب و سنت کی پیروی اور ان کے احکام کی اتباع میں وہ شب و روز مصروف و مشغول رہتے۔ شک و ریب کی صورت میں ایقان و اطمینان حاصل کرتے۔ صحیح اور مستند احکام پر عبور ان کا طرہ امتیاز تھا۔ راتوں کو خالق کی بارگاہ میں جاگنا اور دن کو اس کی مخلوق کی خدمت میں بے چین و بے قرار رہنا ان کا امتیازی وصف تھا۔ "رہبان باللیل و فرسان بالنھار" ان کی امتیازی شان تھی۔ اسی احساسِ ذمہ داری اور ذہن، زبان اور ضمیر کی مسئولیت کے پیش نظر اسلامی حکومت کے فرائض منصبی پر فائز ہونے والے عہدہ داروں، بالخصوص عہدۂ قضا سے منسلک ہونے والوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہمیشہ سامنے رکھنا چاہئے:۔ من جعل قاضیا بین الناس فقد ذبح بغیر سکین"[19]۔ "جسے لوگوں پر منصف مقرر کیا گیا اسے گویا چھری کے بغیر ذبح کیا گیا"۔

فرائض منصبی کی صحیح صحیح بجا آوری کے احساس کی یہ انتہا ہے۔ اسی لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:۔

والذی بعث محمدًا بالحق لو ان جملا ھلک ضیاعًا بشط الفرات خشیت ان یسأل اللہ عنہ آل الخطاب"[20]۔ "اس اللہ کی قسم جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اگر ایک اونٹ دریائے فرات کے کنارے (بھوک سے) مرگیا تو مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ آلِ خطاب کو اس کا جوابدہ ہونا پڑے گا"۔

اس سلسلے میں زکوٰۃ و عشر سے وابستہ حضرات سرور کائنات سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہمیشہ اپنے سامنے رکھیں:۔

ابو حمید ساعدی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو کسی علاقہ کا والی بنایا۔ جب وہ آیا تو کہنے لگا "یہ تمہارا ہے اور یہ مجھے ہدیۃً دیا گیا ہے" اس پر رسول اللہ نے کھڑے ہو کر اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا "ہمارے مقرر کردہ والی نے یہ کونسا ڈھنگ اختیار کیا ہے کہ وہ کہتا ہے "یہ تمہارا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے" اگر یہی بات ہے تو ذرا

وہ اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھ کر دیکھے کہ وہاں اسے ہدایا پیش کئے جاتے ہیں یا نہیں؛ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے تم میں سے جو بھی لوگوں سے کوئی چیز لائے تو روز قیامت وہ اسے اپنی گردن پہ لادے ہوئے آئے گا۔ اونٹ ہوگا تو وہ بلبلا رہا ہوگا، گائے ہوگی تو وہ ڈکار رہی ہوگی بکری ہوگی تو وہ ممیا رہی ہوگی۔ پھر آپ نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے تا آنکہ ہمیں آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ اور آپ نے فرمایا "اے اللہ! کیا میں نے اپنا فریضہ تبلیغ ادا کر دیا۔ اے اللہ! کیا میں نے لوگوں کو (تعلیم دین) پہنچا دی؟"۔ (۲۱)

عہد حاضر میں نفاذ زکوٰۃ

نظام زکوٰۃ صدیوں معطل رہنے کے بعد دوبارہ نفاذ کے مراحل سے گذر رہا ہے۔ متعدد اقدامات کئے جا چکے ہیں۔ مزید متوقع ہیں۔ در پیش مسائل میں سے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان عوام کو کیسے اعتماد میں لیا جائے کہ جو ظالمانہ معاشی نظام ان پہ مسلط ہے نظام زکوٰۃ کے نفاذ کے بعد ملک میں اس کی جگہ عدل و انصاف پہ مبنی نظام قائم ہو جائے گا۔ اور انہیں معاشی تحفظ میسر آجائے گا۔ وہ موجودہ نظام مال کی جگہ نیا معاشی نظام دیکھنے کے متمنی ہیں اور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ نظام زکوٰۃ و عشر مروجہ نظام مال اور بینکنگ سے کس طرح مختلف ہو گا۔ جہاں تک ان مسائل پہ نظری مباحث کا تعلق ہے۔ ان پہ تحریری و تقریری مواد کی کمی نہیں، سوال نظام زکوٰۃ و عشر کے عملی نفاذ کا ہے اور عملی نفاذ بھی ایسا جس سے مسلمان رہتے ہوئے بلکہ پہلے سے بہتر مسلمان ہوتے ہوئے وہ مادی خوشحالی سے ہمکنار ہوں۔

اسلام انتہائی حکیمانہ انداز میں ہر مسئلے کو بتدریج حل کرنے کی تلقین کرتا ہے " ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ "۔ (۲۲) اس اصول کے پیش نظر سب سے بڑی اور اہم ذمہ داری عاملین زکوٰۃ پہ عائد ہوتی ہے، اگر وہ مروجہ اصطلاح کے مطابق اپنے عہدہ کو ذریعہ معاش، عزت، شہرت اور عظمت کی بجائے طاعت خالق و خدمت خلق، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی عظیم ذمہ داری محسوس کریں اور سمجھیں کہ امت کی طرف سے صدیوں بعد ایک اہم ترین اسلامی فریضہ کو کامیاب بنانے کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی ہے اور اس کی کامیابی و ناکامی کا دارو مدار ان کی ذات پہ ہے تو خشت اوّل کی صحت کی بنیاد پہ زکوٰۃ کے نام سے معرض وجود میں آنے والا نظام یقیناً کامیاب ہوگا۔ اس کے لئے فقط احساس ذمہ داری کافی نہیں بلکہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا اس کے لئے اللہ و رسول ﷺ

پر جان نثاری کے لئے تیار ہونا سب سے پہلی شرط ہے۔ اسلام پر کامل ایمان کے بغیر عاملین زکوٰۃ ایک معا
معاشی نظام کے کارندے متصور ہوں گے۔ اسلامی نظام زکوٰۃ کے کارندے ہونے کی حیثیت سے انہیں سب
سے پہلے تجدید ایمان (یا ایھا الذین آمنوا آمنوا)[۲۳] ذاتی تطہیر اور تزکیۂ نفس سے کام لینا پڑے گا۔ انہیں ا۔
دل سے عہد و پیمان کرنا ہوگا کہ وہ نظام مصطفےٰؐ کے کارندے ہیں۔ انہیں، امانت، دیانت، صداقت اور خلو
کے ساتھ ساتھ اہلیت، قابلیت اور صلاحیت پیدا کرنا ہوگی۔

نظام زکوٰۃ میں کام کرنے والوں کی کامیابی کا دارومدار اس بنیادی نقطہ پر بھی ہے کہ فقر و مسکنت میں مبتلا
لوگوں کو ان کی مشکلات و مصائب پر قابو پانے میں مدد دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور تھوڑے عرصے میں
انہیں خود کفیل بنانے کی قابلیت کے مالک ہوں اس سلسلے میں اسوہ رسول اللہ کو انہیں روشنی کے مینار کی
طرح اپنے سامنے رکھنا ہوگا کبار محدثین ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی نے روایت کی ہے کہ :۔

"انصار میں سے ایک شخص سائل کی حیثیت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ۔
دریافت فرمایا کیا تیرے گھر میں کوئی چیز ہے؟ اس نے عرض کیا: ہاں! ایک بچھونا ہے جس کا کچھ حصہ ہم اوڑھ
ہیں اور کچھ بچھا لیتے ہیں۔ ایک پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: دونوں چیزیں میرے پاس ا
وہ شخص دونوں چیزیں لے آیا۔ رسول اللہ نے دونوں چیزیں اپنے ہاتھوں میں پکڑلیں اور فرمایا: یہ دونوں چ
کون خریدے گا؟ ایک شخص نے کہا: میں یہ دونوں ایک درہم کے عوض خریدتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و
نے فرمایا: کوئی ایک درہم سے زیادہ بولی دیتا ہے۔ آپ نے دو یا تین بار یہ بات دہرائی۔ ایک شخص نے کہا:
یہ دونوں چیزیں دو درہم کے عوض خریدتا ہوں۔ آپ نے دو درہم کے عوض دونوں چیزیں اسے دے دیں اور دو
درہم انصاری کے حوالے کئے اور فرمایا: ان میں سے ایک کا غلہ خرید کر گھر والوں کو دو اور دوسرے کا کلہاڑا خرید
میرے پاس لاؤ۔ اس نے ایسا ہی کیا، آپ نے اس سے کلہاڑا لے کر اس میں اپنے ہاتھ سے دستہ جما دیا اور فرما
جاؤ لکڑی کاٹو اور بیچو، میں تمہیں پندرہ روز تک نہ دیکھوں۔ وہ شخص چلا گیا۔ لکڑی کاٹتا اور بیچتا رہا اور
آیا تو دس درہم کما چکا تھا۔ آپ نے فرمایا: ان میں سے چند درہم کا غلہ اور چند کے کپڑے خریدلو۔ پھر آپ۔
سمجھایا کہ ایسے (خود کما کر کھانا) تیرے لئے بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تو قیامت کے روز اس حال میں آئے

سوال تیرے چہرے پہ داغ کی طرح نمایاں ہو"۔[۲۴]

یہ واقعہ عاملین زکوٰۃ کے سامنے ایک ابدی اور سرمدی رہنما اصول کی طرح ہر وقت رہنا چاہیئے۔ اس سے نتیجہ خود بخود سامنے آتا ہے کہ اگر حکومتِ وقت کو یہ اختیار رہے کہ وہ کسی کے ذاتی مال میں تعمیری تصرف کر سکے تو وہ مال جو دوسروں کے مال سے حاصل کیا جائے اس کے بہتر و تعمیری استعمال کی ہدایت کرنے کا جواز حکومت کے لیئے بدرجۂ اولیٰ موجود ہے۔ اگر عہد حاضر کے عاملینِ زکوٰۃ اس رہنما اصول کو اپنا لیں تو وہ بھی انتہائی قلیل مدت میں مفلس و محتاج لوگوں کی مدد کر کے بہت جلد ملک کی ایک کثیر تعداد کو معاشی طور پر خود کفیل بنا سکتے ہیں۔ آج کے عاملین زکوٰۃ کو مشینی دور کی سہولت حاصل ہے آج صنعت و زراعت میں اتنا تنوع پایا جاتا ہے کہ معاش کے مختلف ذرائع پیدا کر کے بے شمار لوگوں کو آسانی کے ساتھ وسائلِ روزگار مہیا کیئے جا سکتے ہیں۔ نظامت ہائے زکوٰۃ و عشر، معاشرتی بہبود، دیہی ترقیاتی مراکز و دیگر ادارے مل کر صرف ایک پانچ سالہ منصوبہ کے اندر اندر فقر و مسکنت سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

اسلامی علوم و تاریخ سے آگاہ حضرات واقف ہیں کہ اسلام میں ہجرت کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ مگر معاشی نقطہ نظر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم پر شاید پوری توجہ نہیں دی گئی "لا ہجرۃ بعد الفتح" فتح مکہ کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت نہ کی جائے۔ یہ نبی آخرالزمان، ختم الرسل، اور رحمۃ للعالمین کی دور بینی، بصیرت، معاشی اور تاریخی عوامل پر عبور کا زندہ شاہکار ہے۔ فتح مکہ تک اگرچہ سیاسی نقطہ نظر سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا انتہائی ضروری تھا مگر فتح مکہ کے بعد اب ہجرت فائدہ کی بجائے معاشی اور تمدنی نقطہ نظر سے نقصان دہ تھی۔ کیونکہ آپؐ ملک کے مختلف اطراف و اکناف سے وسیع پیمانے پر آبادی کی نقل مکانی کے مضر اثرات سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ اس سے کس قسم کے سیاسی، اقتصادی، تمدنی، تہذیبی، اخلاقی، اور تعلیمی مسائل جنم لے سکتے ہیں۔ اس لئے جیسے ہی فتح مکہ کے بعد سیاسی حالات سازگار ہوئے آپ نے فوری طور پر آبادی کی نقل مکانی کو روک دیا۔ اور اس کی جگہ زکوٰۃ و عشر کا نظام نافذ کر دیا۔ اس سے دو فائدے حاصل ہوئے۔ ایک تو یہ کہ مدینہ منورہ پر گنجائش سے زیادہ آبادی کا بوجھ نہ پڑا۔ دوسرے یہ کہ دیہات و قریٰ و قصبات کی آبادی خلل سے بچ گئی۔ کیونکہ ایسے مقامات پر کسان، ہنرمند کاریگر اور دوسرے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعاون کی بنیاد پر کام کرتے ہیں اور ایک مربوط نظام معاشرت

میں رہتے ہیں۔ اگر اس جگہ سے آبادی کی نقل مکانی شروع ہو جائے تو زراعت وصنعت فوری طور پر متاثر ہوتی ہے۔ جس کا براہ راست اثر ملکی معیشت پر پڑتا ہے۔

پاکستان میں دیہات سے شہروں کی طرف وسیع پیمانے پر آبادی کی نقل مکانی ایک سنگین مسئلہ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اور اگر اس مسئلہ کا حل مسئلہ کی جگہ یعنی دیہات میں بہت جلد نہ تلاش کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ صورت حال قابو سے باہر ہو جائے گی۔

شاید اتنی بڑی نیکی نظامت زکوٰۃ کے حصہ میں آنے والی ہو۔ اگر نظامت زکوٰۃ وعشر کتاب وسنت کی تعلیمات کے پیش نظر صحیح معنوں میں نظام زکوٰۃ کے نفاذ کے لئے منصوبہ بندی کر سکے، اور اس کے عاملین اپنے حسن کردار و کارکردگی سے عوام کا اعتماد حاصل کر لیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ حکومت کی طرف سے قانون بنائے بغیر دیہات سے وسیع پیمانے پر نقل مکانی خود بخود رک جائے اور دیہات کے لوگوں کو اپنے گھر میں ہی روزگار میسر آ جائے۔ نہ شہروں میں مصنوعی اور خود ساختہ مسائل پیدا ہوں اور نہ دیہات کی آبادی میں خلل پیدا ہو۔

حواشی ومراجع

(۱) قرآن سورۃ الانبیاء ۲۱ : ۷۳ (۲) قرآن سورۃ المزمل ۷۳ : ۲۰

(۳) قرآن سورۃ الحج ۲۲ : ۴۱ (۴) قرآن سورۃ التوبہ ۹ : ۱۰۳

(۵) قرآن سورۃ التوبہ ۹ : ۶۰ (۶) ملاحظہ ہو کتاب الاموال از ابو عبید القاسم بن سلام دو جلدیں، کتاب الخراج از امام ابو یوسف کتاب الخراج از امام یحییٰ بن آدم۔

(۷) قرآن سورۃ الانعام ۶ : ۱۴۲۔

(۸) ابو یوسف۔ کتاب الخراج مطبع قاھرہ ۱۳۰۲ھ ص ۳۲

(۹) قرآن سورۃ البقرۃ ۲ : ۲۶۷

(۱۰) صحیح البخاری، کتاب الزکوٰۃ باب ۵۵، سنن ابن ماجہ، کتاب الزکوٰۃ باب صدقۃ الزروع والثمار

(۱۱) صحیح البخاری کتاب الزکوٰۃ باب ۷۴۔

(۱۲) الہدایہ ج اول ص ۲۰۱ ۔

(۱۳) کتاب الاموال، ابوعبید القاسم بن سلام (اردو ترجمہ) ج دوم ص ۳۴۸ ۔

(۱۴) صحیح البخاری (طبع دہلی ۱۹۳۸ء) ج اول ص ۱۸۸ ۔

(۱۵) ابویوسف، کتاب الخراج (طبع بولاق ۱۳۰۲ھ) ص ۴۵ ۔

(۱۶) قرآن سورۃ البقرۃ ۲ : ۲۴۸ ۔

(۱۷) قرآن ایضاً ۔

(۱۸) قرآن سورۃ التوبہ ۹ : ۱۰۳

(۱۹) مشکوٰۃ المصابیح ، باب العمل فی القضا

(۲۰) تاریخ طبری (مطبع حسینیہ، مصر) جلد پنجم ص ۲۳ ۔

(۲۱) کتاب الاموال، ابوعبید القاسم بن سلّام ، (اُردو ترجمہ) ج اول صفحہ ۴۲۵ ۔

(۲۲) قرآن سورۃ النحل ۱۶ : ۱۲۵ ۔

(۲۳) قرآن سورۃ النساء ۴ : ۱۳۶ ۔

(۲۴) ابوداؤد ، سنن ابی داؤد، کتاب الزکوٰۃ ، ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات باب بیع المزایدۃ، ص ۴۰، المنذری، حافظ ابومحمد زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی، الترغیب والترھیب، کتاب البیوع، الترغیب فی الاکتساب بالبیع ۱۳۸۱/۱۹۶۱

(۲۵) محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح البخاری (طبع نور محمد اصح المطابع ، ۱۳۸۱ھ - ۱۹۶۱ء) جلد اوّل، کتاب الجہاد، ص ۴۲۳ ۔

قرونِ وسطیٰ میں اسلامی ہند کا نظامِ تعلیم

ڈاکٹر اخلاق احمد

مسلمانوں نے نصف صدی کے اندر تقریباً آدھی دنیا کو زیرنگیں کر لیا۔ فتوحات کی سرگرمیوں اور دیگر دشواریوں کے باوجود علمی محرکات سے سرشار مسلمانوں نے علمی ترقی میں کوتاہی نہیں کی۔ مکہ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا مکان اور مدینہ میں اصحاب صفہ کا چبوترہ عہد نبویؐ کی ابتدائی درسگاہیں تھیں۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں کوفہ اور بصرہ اپنی علمی سرگرمیوں کے لیے مشہور تھے، جہاں قرآن، حدیث، فقہ، نحو، ادب، بلاغت اور عربی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے بعد شام و فلسطین، مصر، خراسان، اسپین، سسلی، ایران، افغانستان اور ہندوستان میں بے شمار شہر اور قصبات علم دین کے مرکز بن گئے۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستان کے اندر مختلف جگہوں پر ہزاروں کی تعداد میں دارالعلوم، مدارس اور مکتب قائم ہوئے جن میں سے کچھ مشہور جگہیں یہ تھیں: آگرہ، دہلی، اجمیر، ٹھٹھہ، جونپور، جلال آباد، سرہند، سہالی، قنوج، کلیر، امیٹھ، بدایوں، بریلی، بجنور، بلگرام، بھوپال، پانی پت، بنارس، اعظم گڑھ، پٹنہ، تھانیسر، حیدرآباد، رامپور، سورت، شاہجہاں پور، خیرآباد، لکھنؤ اور کلکتہ وغیرہ۔

جب مسلمان ہندوستان آئے اور یہاں اپنی سلطنت قائم کی تو انہوں نے اس ملک کو اپنے طریقۂ تعلیم سے روشناس کرایا۔ الغزالی اور نظام الملک جیسے ماہرین تعلیم اور بلند مرتبہ معلمین کا طریقہ تعلیم یعنی "مدرسہ سسٹم" یہاں رائج ہوا۔ یہاں کے مخصوص حالات کے پیش نظر یقیناً کچھ تبدیلیاں کی گئیں، لیکن بنیادی ڈھانچہ تقریباً وہی رہا۔

مسلم ہندوستان میں تعلیم کے ارتقاء کی تاریخ دورِ غلامان سے شروع ہوتی ہے۔ اس دور میں سینکڑوں مسجدیں تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز نظر آتی ہیں۔ جس طرح عہد وسطیٰ کے یورپ میں چرچ مذہبی اور دنیوی تعلیم کا مرکز تھا۔ اس دور کا سب سے اہم فرد جس نے تعلیم کی طرف توجہ کی سلطان ناصرالدین تھا جس نے دہلی میں مدرسہ ناصریہ قائم کیا تھا۔

تعلیم کو آگے بڑھانے میں خلجی خاندان نے بھی کم کام نہیں کیا۔ لیکن حقیقت میں یہ فیروز شاہ تغلق تھا جس نے تعلیم میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اسے علم سے اتنی محبت تھی کہ اس نے اپنے دور میں تقریباً تیس نئی درسگاہیں قائم کیں۔ قدیم مدارس جن کو اس نے دوبارہ شروع کرایا اس کے علاوہ ہیں۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ایک بڑے مدرسے کا قیام تھا جو اسی کے نام سے موسوم تھا اور جہاں روایتی تعلیم کا مکمل انتظام تھا۔ یہ مدرسہ ایک شاندار عمارت میں قائم کیا گیا تھا۔ اس میں ایک عظیم الشان مسجد بھی تھی۔ ان مدارس کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں وقت کے بڑے بڑے علماٗ درس دیتے تھے جن کی تنخواہیں سرکاری خزانہ سے ادا کی جاتی تھیں۔

فیروز شاہ تغلق کے بعد سکندر لودھی کو اس بات کا شوق ہوا کہ تعلیم عام کی جائے۔ اسے تعلیم سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ سکندر لودھی ہی وہ پہلا حکمران تھا جسے انتظامی ضروریات کے لئے غیر مذہبی تعلیم کا خیال پیدا ہوا۔ فرشتہ رقمطراز ہے کہ "ہندو جنھوں نے کبھی فارسی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی تھی اس کے عہد میں عام طور سے اسلامی ادب کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔"(۲) اس کے علاوہ لودھی ہی کے عہد میں محقق طوسی کے بنائے ہوئے روایتی نصاب تعلیم میں شیخ عزیز اللہ اور شیخ عبداللہ نے قابل قدر اضافے کئے۔ قاضی عضد کی تصانیف مطالع اور مواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم کو نصاب میں داخل کیا گیا۔ علم منطق کو ہندوستان میں انہی حضرات نے فروغ دیا۔(۳)

اس کے بعد مغل دور حکومت میں قدم رکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں مسلم تہذیب و تمدن عروج پر ہے۔ مغل کلچر صرف کورٹ کلچر کا چربہ تھا۔ حکمرانوں نے بالعموم اسلام کے جمہوری مزاج کو اہمیت نہیں دی۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم اتحاد کی ضرورت صرف اسی وقت پیش آتی ہے جب ہندوؤں کا مقابلہ کرنا ہو۔ اسی لئے اکبر کے علاوہ کسی بھی مغل حکمران نے عوام کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ تعلیم صرف امراء کے چند خاندانوں تک ہی محدود رہتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم پر ریاست کا کنٹرول تھا لیکن ابتدائی تعلیم کا انتظام تمام تر نجی ہاتھوں میں تھا۔ ہمایوں کبیر نے اپنی کتاب میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "دلچسپ بات یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے مدارس تو ریاست خود چلاتی تھی لیکن ابتدائی تعلیم کا بندوبست پرائیویٹ کنٹرول میں تھا۔ موجودہ دور میں ریاست کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری قبول کرے۔ بلکہ کچھ ممالک تو ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی ذمہ داری بھی ریاست ہی کے سر ڈالتے ہیں۔ لیکن دور وسطیٰ میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک میں بھی یہی کیفیت تھی کہ ریاست صرف اعلیٰ تعلیم کے کچھ مدارس ہی کی سرپرستی کرتی تھی۔"(۴)

ابتدائی تعلیم کو نظر انداز کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ امراء اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ ان کے بچے مسجدوں میں جاکر تعلیم حاصل کریں۔ وہ یا تو خود بچوں کو تعلیم دیتے تھے یا گھر پر نجی طور سے اس کا انتظام کرتے تھے۔ تعلیم یافتہ افراد اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام گھر ہی پر کرتے تھے۔ شیخ مبارک کی ذاتی دلچسپی اور تعلیمی سرپرستی ہی نے ابوالفضل کو بلند مقام پر فائز کیا۔[5]

بابر سے لے کر اورنگ زیب تک سبھی حکمران تعلیم یافتہ تھے۔ اکبر خود تعلیم یافتہ نہ تھا لیکن اس نے بھی اس دور کی مغل روح کو جاری و ساری رکھا۔ اکبر کا نقطۂ نظر مذاہب کا اتحاد تھا۔ وہ ہندوستانی سماج کو سیکولر ڈھانچہ میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ مسلمان حکمرانوں میں اکبر پہلا حکمران تھا جس نے ہندو اور مسلمان دونوں کی تعلیم کی طرف یکساں توجہ دی۔ اس کے زمانے میں پہلی مرتبہ ہندو اور مسلمان طلبہ کو ایک ساتھ پڑھتے ہوئے دیکھا گیا۔ اکبر بچوں کی تعلیم میں بے حد دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے ابتدائی تعلیم کے لئے بہت سی ہدایات جاری کیں۔ ان ہدایات نے پورے نظام کو متاثر کیا۔ اکبر کے تعلیمی ڈھانچے میں درج ذیل نکات لائق توجہ ہیں۔ ان سے تعلیم کے بارے میں اکبر کے رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۔ سب سے زیادہ اہمیت زبان کے حروف کو دی گئی۔ ہر بچہ کے لئے زبان سیکھنا ضروری تھا۔ اس لئے دو دن حروف کو سیکھنے سمجھنے کے لئے مقرر ہوئے۔

۲۔ ان حروف کو سیکھنے کے بعد ان کا ملانا اگلا قدم تھا۔ اس کے لئے ایک ہفتہ رکھا گیا۔

۳۔ نثر و نظم دونوں کے لئے یہ ضروری تھا کہ بچے اسے زبانی یاد کریں۔

۴۔ معلموں کو ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ طلبہ کے روزانہ کام کا جائزہ لیں اور ان کے کام سے ان کے معیار کو جانچا جائے۔

۵۔ ہر طالب علم کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہندسہ، ریاضی، علم نجوم، منطق، علم معاشیات، علم تمدن، علم طب اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کرے۔

۶۔ اعلیٰ تعلیم کو تین حصوں میں منقسم کر دیا گیا۔

(۱) الٰہی (دینیات) (۲) ریاضی (حساب) (۳) طبعی (سائنس)۔

۷۔ سنسکرت تعلیم کے لئے ویاکرن (صرف و نحو) ویدانت (فلسفہ) پتن جلی (یوگ) کا جاننا ضروری تھا۔[6]

عہد اکبری میں روایتی تعلیم کے نصاب میں عضد الملک فتح اللہ شیرازی نے نصاب میں کچھ اضافے کئے اور انہیں بعد خوشی قبول کیا گیا۔ مولانا غلام آزاد فتح اللہ شیرازی کے بارے میں فرماتے ہیں "تصانیف علماء متأخرین ولایت ایران وخراسان وغیرہ مثل محقق دوانی ومیر صدرالدین ومیر غیاث منصور و مرزا جان میر فتح اللہ شیرازی در ہندوستان آورد۔"(۷)

ترجمہ ایران وخراسان وغیرہ کے متأخرین علما کی تصانیف ہندوستان لائے جیسے محقق دوانی، میر صدرالدین، میر غیاث منصور، مرزا جان میر فتح اللہ شیرازی کی کتابیں۔

جہانگیر اور شاہ جہان کے زمانہ میں تعلیم کا یہی سلسلہ جاری رہا۔ اس دور میں بھی ابتدائی تعلیم نجی افراد کے سپرد رہی اور کہیں ریاست کی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا۔

اورنگ زیب دینی تعلیم کا بہت دلدادہ تھا۔ اس کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ اس لئے اس نے فطری طور پر اس نظام تعلیم میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ مدارس میں طلبہ کی تعداد بڑھانے اور ان میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اس نے گجرات کے دیوان مکرمت خان کو خاص طور سے یہ ہدایات جاری کیں۔

۱۔ جو طلبہ عربی صرف ونحو کی ابتدائی کتاب میزان کا مطالعہ کریں انہیں ایک آنہ یومیہ دیا جائے۔

۲۔ جو منشعب کا مطالعہ کریں ان کو ۲ آنہ یومیہ دیا جائے۔

۳۔ جو لوگ کشاف کی تعلیم حاصل کریں انہیں دو آنہ یومیہ دیا جائے۔

۴۔ وہ طالب علم جو شریعت اور فقہ کی کتابوں کی تعلیم حاصل کریں جیسے کہ شرح وقایہ انہیں آٹھ آنہ یومیہ دیا جائے۔(۸)

اس نظام کو پسند کرنے کے باوجود اورنگ زیب اس کے طریقہ تعلیم کے خلاف تھا۔ وہ اس کے نصاب اور طریقہ تدریس دونوں سے اختلاف رکھتا تھا۔ برنیئر نے اپنی کتاب میں اورنگ زیب کی اس مخالفت کا بہت تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس نے صاف طور سے یہ واضح کیا کہ ایک طالب علم کے لئے عملی دنیا کی تعلیم ضروری ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں ان کی شکست وفتح کے اسباب، ان کا انتظام سلطنت، ان کی پالیسی اور اس کا ردعمل، یہ سب کچھ طالب علموں کو جاننا چاہیئے، تاکہ وہ ان کی روشنی میں آئندہ کا لائحہ عمل تیار کر سکیں۔

اورنگ زیب نے خود اپنی تعلیم پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور ان معلموں کے طریقہ تدریس پر غیظ وغضب کا

اظہار کیا ہے جو شہزادوں کو عملی تعلیم کے بجائے چند کتابی الفاظ سے روشناس کراتے ہیں۔ اپنے استاد ملا صالح سے مخاطب ہوکر کہتا ہے "کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ طفلی ہی وہ زمانہ ہے جب بچوں کو بہترین ہدایات دی جاسکتی ہیں اور انہیں شاندار کارنامے انجام دینے کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔ کیا صرف عربی زبان کی لیاقت کے ذریعہ ہی قانون اور سائنس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے میرے والد شاہجہان کو یقین دلایا کہ مجھے فلسفہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ برسوں آپ نے حماقت انگیز نکات کو سمجھانے میں صرف کئے۔ اور میرے دماغ کو کسی لائق نہ چھوڑا۔ اس تعلیم کا مقصد صرف دماغ کی تمام قوتوں اور فکرانگیزی کو زنگ آلود کرنا ہے۔ گردونواح کی اقوام کی زبان سے واقفیت ایک حکمران کے لئے بہت ضروری ہے۔ لیکن آپ نے مجھے صرف عربی کی تعلیم دی۔ ایک ایسی زبان سکھانا ہے جسے دس بارہ سال سخت محنت کے بغیر کوئی شخص اچھی طرح سیکھ نہیں سکتا۔ آپ امید رکھتے ہیں کہ میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے میرا قیمتی وقت برباد کردیا۔ آپ یہ بھول گئے کہ ایک شہزادہ کی تعلیم میں کیا کیا باتیں شامل ہونی چاہئیں۔ آپ نے یہ فرض کرلیا کہ اسے عربی قواعد اور فقہ پر حاوی ہونا چاہئیے۔ میری جوانی کے قیمتی سال آپ نے محض الفاظ یاد کرانے میں ضائع کرادیئے۔"[9]

اگر برنیئر کی بات میں صداقت ہے تو یہ بات محسوس کی جاسکتی ہے کہ اورنگ زیب آج کی دنیا کا عملی انسان تھا۔ فلسفہ کی تعلیم کے خلاف اس کی شکایت بجا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے مادری زبان کی تعلیم اور ذریعہ تعلیم پر جو زور دیا ہے اس کا احساس آج کے انسان کے دماغ کو زیادہ متاثر کرسکتا ہے۔ ایک بات البتہ تشریح طلب ہے اور وہ یہ کہ اورنگ زیب جب اس روایتی تعلیم کے خلاف تھا تو اس نے اس میں بنیادی تبدیلی کیوں نہیں کی؟ جبکہ برعکس یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے زمانہ میں مدارس میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور ریاست کے کونہ کونہ میں روایتی تعلیم کا چرچا عام ہوا۔ اس نظام میں بنیادی تبدیلی کی ذمہ داری ملّا نظام الدین پر ہے۔ وہ ملّا قطب الدین شہید کے بیٹے تھے اور انہی کی توجہ و دلچسپی کی وجہ سے اس نظام کو درس نظامیہ کے نام سے پکارا جانے لگا۔ درس نظامیہ اور نظام الملک طوسی نے جو طریقہ جاری کیا تھا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ان میں فرق کیا جانا چاہئیے۔ درس نظامیہ کو سمجھنے کے لئے اس کے بنیادی عناصر کو سمجھنا ضروری ہے۔

۱۔ درس نظامیہ میں ہر مضمون کی دو بنیادی کتابیں شامل تھیں۔ ان کتابوں پر عبور حاصل کرنے کے بعد اس مضمون

کی ہر کتاب کو سمجھا جا سکتا تھا۔

۲۔ پرانے نصاب میں ایک طالب علم تقریباً بیس سال کی عمر میں اپنا کورس مکمل کرتا تھا لیکن اس نئے نصاب میں کتابوں کے مشکل ہونے کے باوجود طالب علم سولہ یا سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو جاتا تھا۔

۳۔ فلسفہ اور اخلاقیات کی کتابوں کی تعداد دوسری کتابوں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ حدیث کی صرف ایک کتاب مشکوٰۃ تھی۔ فقہ پہ کتابیں کم تھیں لیکن طلبہ کا رجحان آج کے علماء سے مختلف تھا۔ ان میں وسیع النظری ہوتی تھی جو آج کل کم دکھائی دیتی ہے۔

۴۔ درس نظامیہ میں ادب کی کوئی اہمیت نہیں تھی اس لئے ادب کی کتابوں کی تعداد سب سے کم تھی۔[10]

یہ ملا نظام الدین تھے جنہوں نے مسلمانوں کے طریقہ تعلیم میں بنیادی تبدیلی کی۔ اس کا اثر آج تک مسلمانوں کی تعلیم پہ ہے۔ ان کی اہمیت اور شہرت ... نئے نظام ہی کی وجہ سے ہے۔ ہندوستان کے کونہ کونہ میں اس نظام تعلیم کے فضلاء موجود ہیں۔ جن کی وجہ سے آج بھی اسلامی علوم کی شمع روشن ہے۔[11]

عہد عالمگیری کے بعد شاہ ولی اللہ نے اس میں ... ترمیمات کیں۔ بہت حد تک کتابوں کی ترتیب کو بھی بدل دیا۔ جس کا ذکر ان کے رسالۃ الجز اللطیف میں موجود ہے۔ لیکن فرنگی محل و ... تھی پائش کے ساتھ ولی اللہی نصاب کا مزہ پھیکا لگا اور اپنایا نہیں گیا اگرچہ بعد میں دارالعلوم دیوبند نے اس کو اپنی بنیاد بنایا۔

ولی اللہی نصاب ۔ نحو میں کافیہ۔ شرح جامی۔ منطق میں شرح شمسیہ شرح مطالع۔ فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ۔ کلام میں شرح عقاید نسفی مع حاشیہ خیالی شرح مواقف نسفی فقہ میں شرح وقایہ۔ ہدایہ (کامل)۔ اصول فقہ میں حسامی اور کسی قدر توضیح تلویح۔ بلاغت میں مختصر و مطول۔ ہیأت و حساب میں بعض رسائل مختصرہ۔ طب میں موجز القانون۔ حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح کامل، ترمذی کامل، کسی قدر صحیح بخاری تفسیر میں مدارک، بیضاوی۔ تصوف و سلوک میں عوارف و رسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی مقدمہ شرح لمعات۔ مقدمہ نقد النصوص۔[12]

حوالہ جات

1. **Law, Narendra Nathe, Promotion of Learning in India During Muhammaden Rule, London, 1916 p. 19.**

2. Ibid, P. 76

۳۔ مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، حصہ اوّل۔ دہلی، ۱۹۶۶ء، صفحہ ۲۵۱۔ اور جائزہ مدارس اسلامیہ مغربی پاکستان جامعہ چشتیہ ٹرسٹ، لائل پور ۱۹۶۰ء، صفحہ ۷۶۵۔

4. **Humayun** Kabir, Continuity of Tradition in Indian Educational **Thought,** ***Indo-Arian culture***, January 1959, P. 230.

5. **Beni Prasad, A. Few Aspects of Education and Literature under the great Mughals, Indian Historical Records Commission Proceedings of Fifth Meeting held at Calcutta, January 1923, P. 42.**

6. **Abul-Fazl Ain-i-Akbari, tr. by Blochmann, Calcutta, 1927, vol. I PP. 288-89**

۷۔ مناظر احسن گیلانی۔ صفحہ ۲۵۷۔

8. **Law, Narendra Nath, P. 188**
9. **Bernien, F. Travels in the Moghul Empire, tr. by Archibald Constable,**

۱۰۔ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، اعظم گڑھ، ۱۹۳۲ء، جلد سوم، صفحات ۲۵ - ۲۲۔

۱۱۔ مُلّا نظام الدین لکھنؤ سے اٹھائیس میل کے فاصلہ پر قصبہ سہالی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مُلّا قطب الدین اپنے دور کے علما میں ممتاز تھے جن کے پاس دور دور سے لوگ درس کے لئے آتے تھے۔ مُلّا نظام الدین ابھی[۱۲] تیرہ برس ہی کے تھے کہ عثمانیوں نے ان کے والد کو شہید کر دیا۔ یہ خاندان کے لئے ایک بڑا سانحہ تھا۔ لیکن چونکہ بڑے صاحبزادے اورنگ زیب کے دربار میں ملازم تھے وہ بادشاہ سے شاہی فرمان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس فرمان کی رو سے لکھنؤ میں فرنگی محل اس خاندان کو عطا کیا

گیا۔ ملّا کے خاندان کے سب افراد یہاں آکر آباد ہو گئے اور یہ جگہ ان کا مستقل ٹھکانا بن گئی۔

ملّا نظام الدین نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے دیوا اور بنارس جانا پڑا۔ حافظ امان اللہ بنارسی جیسے معلّم کی شاگردی کا انہیں موقع ملا۔ اور انہی کے فیض تربیت نے آپ کو تعلیم کی نئی راہ سے آشنا کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد والد کی گدی پر بیٹھے اور اپنے مشہور مدرسے کی بنیاد رکھی۔ جلد ہی ان کی شہرت پورے ہندوستان میں عام ہو گئی۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں لیکن ان کی اصل شہرت اس نظام تعلیم کی وجہ سے ہے جو اس وقت سے لے کر آج تک کسی نہ کسی شکل میں رائج چلا آتا ہے۔

۱۲۔ مولانا عبدالحیٔ، ہندوستان کا نصاب درس اور اس کے تغیرات، صفحہ ۱۲، اور جائزہ مدارس عربیہ اسلامیہ مغربی پاکستان، صفحہ ۷۶۔

مسئلہ تصویر کا علمی جائزہ

محمد یوسف فاروقی

موجودہ دور میں تصویر سازی کا مسئلہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے، ایک طرف تو اس کی ضرورت اور استعمال اس قدر بڑھ گیا ہے کہ قدم قدم پر تصویر کی ضرورت پڑتی ہے، شناختی کارڈ ہوں یا پاسپورٹ، تعلیمی اداروں میں داخلہ کا مسئلہ ہو یا ڈرائیونگ لائسنس، اسی طرح نشر و اشاعت کی دنیا میں تصویر سازی نے ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے، جامد تصاویر کے ساتھ ساتھ متحرک تصویریں بھی نشر و اشاعت اور پیغام رسانی میں نمایاں کردار انجام دے رہی ہیں، بات یہیں تک نہیں رہی بلکہ تعلیم و تدریس، جدید تحقیقات اور سائنسی تجربات کا کافی حد تک اس پر انحصار ہے۔

دوسری طرف اس کی شرعی حیثیت ہے۔ علماء کرام کا ایک طبقہ بالخصوص برصغیر کے علماء اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ اصل اہمیت اس بات کی نہیں ہے کہ آج کے دور میں اس کا استعمال اس قدر عام ہو چکا ہے یا ترقیاتی، علمی اور تفتیشی کاموں میں اس کی ضرورت ہے بلکہ اصل اہمیت شرعی حکم کی ہے، اگر شریعت میں اس کے جواز کی کوئی صورت ملتی ہے تو اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، لیکن اگر شریعت میں یہ قطعاً حرام ہے تو پھر ہمیں زندگی کے تمام معاملات میں اس کا کوئی متبادل حل تلاش کرنا ہوگا۔ اور اس عمل حرام کو بالکل ترک کرنا ہوگا محض چند سہولتوں یا بعض فوائد کی خاطر مسلم معاشرہ میں ایک حرام چیز کو رواج نہیں دیا جا سکتا، جس طرح شراب نوشی یا رشوت ستانی وغیرہ کی حرمت ہے اور اسلامی معاشرہ یا اسلامی مملکت نہ اس کے جواز کی راہ تلاش کر سکتی ہے نہ ہی افراد ملت کو ان محرمات کے ارتکاب کی اجازت دے سکتی ہے۔

ہم نے تصویر سازی کا ہر پہلو سے جائزہ لیا ہے اور اس موضوع سے متعلق آیات قرآنی، احادیث نبوی، فقہاء کے اقوال اور علماء کی تحریروں کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ شریعت کا صحیح صحیح نقطۂ نگاہ معلوم کیا جائے اور نتیجہ اہل علم کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

زمانۂ جاہلیت میں مختلف قسم کے مجسموں، مورتیوں اور تصویروں کا تذکرہ ملتا ہے مثلاً :

۱۔ وہ مجسمے، مورتیاں اور تصاویر جن کی پرستش کی جاتی تھی، قرآن حکیم کی اصطلاح میں انہیں اصنام اور اوثان کہا جاتا ہے۔[1]

۲۔ انبیاء و صالحین کے مجسمے یا تصاویر

۳۔ وہ تصاویر جو محض لہو و لعب کے لئے ہوتی تھیں اور ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا تھا۔

۴۔ وہ تصاویر یا مورتیاں جو چھوٹے بچوں کے کھیلنے اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ہوا کرتی تھیں۔

پہلی قسم کی تصاویر یا مجسمے اسلام میں قطعاً جائز نہیں، اسلام کی بنیاد توحید پر ہے اس دین حنیف میں شرک کی ذرہ برابر گنجائش نہیں، جو مجسمہ یا تصویر پرستش کے لئے بنائی جائے اسے قرآن حکیم اصنام اور اوثان کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے، یہ بت قطعاً حرام ہیں کسی دور اور کسی بھی زمانہ میں بت سازی کی اجازت نہیں دی جاسکتی قرآن و سنت میں اس قسم کی مشرکانہ تصاویر اور مورتیوں پر سخت وعید آئی ہے۔

دوسری قسم کی تصاویر جن میں انبیاء و صالحین کی تصاویر اور مجسمے ہوتے تھے۔ قدیم اقوام، انبیاء اور صالحین کی تصاویر اور مجسمے بنایا کرتی تھیں اور انہیں عبادت کی حالت میں دکھایا جاتا تھا، مقصد یہ ہوتا تھا کہ ان کو عبادت کی حالت میں دیکھ کر لوگوں میں بھی جذبۂ عمل پیدا ہو۔ لیکن امتدادِ زمانہ اور آسمانی تعلیمات میں تحریف و تبدیلی کے ساتھ یہ غلط تصور پیدا ہوگیا تھا کہ چونکہ یہ انبیاء و صالحین اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہیں، اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں، اس لئے یہ بھی ہمارے معاملات میں اختیارات رکھتے ہیں، یہ بھی نفع و نقصان کے مالک ہیں، اس عقیدہ کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ لوگ ان سے امیدیں وابستہ کرنے لگے، حاجت روائی کے لئے انہیں پکارا جانے لگا، ان کے نام پر نذرانے چڑھائے لگے، پھر ان کے مجسمے اور تصاویر اس قدر متبرک ہوگئے کہ ان کی بھی پرستش ہونے لگی، جیساکہ قوم ود، سواع، یغوث اور نسر نے کیا۔[2]

سابقہ اقوام نے یہی کچھ نہیں کیا بلکہ جن غلط عادتوں رسوم و رواج میں خود مبتلا تھے انبیاء علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو بھی ان برائیوں میں ملوث دکھانے لگے، صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ میں داخل ہوئے تو وہاں حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام

کی تصاویر کو بھی دیکھا، ان کے ہاتھوں میں پانسوں کے تیر تھے، آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرے، بخدا ان بزرگوں نے تو کبھی پانسوں کے تیر نہیں چلائے[۳]۔

اس قسم کی تصاویر جہاں شرک کا سبب بن رہی تھیں وہاں انبیاء علیہم السلام اور صلحاء و عابدین کی عظمت اور ان کے تقدس کو بھی پامال کر رہی تھیں۔ اس قسم کی شخصیتیں کہ جن کے ساتھ مذہب کی بنا پر وابستگی اور عقیدت ہو کم علمی کی وجہ سے ان کے ساتھ مشرکانہ تصور پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ان کے مجسمے اور تصاویر معاشرہ میں شرک کا سبب بن جاتے ہیں، اسلام نے نہ صرف شرک کی بیخ کنی کی ہے بلکہ شرک کے اسباب و ذرائع کو بھی ختم کیا ہے۔ لہٰذا اس قسم کی تصاویر کو بھی ختم کیا گیا ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں اس قسم کے مجسمے اور تصاویر بکثرت ہوتی تھیں جن قسموں کو ہم نے اوپر بیان کیا ہے اور اسلام میں اسی قسم کی تصاویر اور مجسمے ممنوع ہیں، لیکن اگر تصاویر اور مورتیاں مشرکانہ نہ ہوں بلکہ ان کا مقصد تعلیم و تربیت نشر و اشاعت اور ترسیل پیغام ہو یا دیگر انتظامی اور تفتیشی مقاصد کے لئے ہوں تو وہ مباح ہیں۔ تصاویر میں اصل علت حرمت شرک اور سبب شرک ہیں اور اس میں جاندار و بے جان کی کوئی تفریق نہیں ہے، اگر غیر جاندار کی تصاویر مشرکانہ ہوں گی تو وہ بھی حرام ہوں گی مثلاً اگر مجوسیوں کے ہاں آتش کدوں کی تصاویر کی پرستش ہونے لگے یا کسی عیسائی معاشرہ میں علامت صلیب کی پوجا کی جاتی ہو تو ایسے علاقوں میں آتش کدوں اور صلیبوں کی تصاویر کو حرام ہی قرار دیا جائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلیب کو اسی وجہ سے وثن کہا ہے، عدی بن حاتم کی روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، میری گردن میں سونے کی صلیب تھی، تو آپ نے فرمایا "الق ھذا الوثن عنک"۔ اس بت کو نکال پھینکو[۴]۔ عمران بن حطان حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں ایسی چیزوں کو توڑ دیا کرتے تھے جن میں صلیب کی تصاویر ہوتی تھیں۔

قرآن حکیم میں تصاویر، مورتیوں اور مجسموں کی حلت یا حرمت کے بارے میں کوئی حکم یا وضاحت نہیں آئی ہے، دو مقامات پر تماثیل (مورتیوں، مجسموں) کا ذکر آیا ہے۔ پہلی آیت سورۂ انبیاء میں ہے، "اذ قال لابیہ وقومہ ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون"[۵]۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ مجسمے کیسے ہیں جن کے تم گرویدہ ہو رہے ہو۔ جب ان لوگوں نے یہ بتایا کہ ہمارے آباؤ اجداد ان کی پرستش کیا کرتے تھے، ہم بھی اسی

لئے ان کے گرد جمع ہیں تو اس پر حضرت ابراہیمؑ نے ان سے کہا کہ تم لوگ تو صراحتاً گمراہی میں پڑے ہوئے ہو، اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے ان مجسموں کے لئے تماثیل کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ اصنام کا لفظ استعمال کیا۔[6] دوسری جگہ یہ سورۂ سبا میں آیا ہے۔ یعملون لہ مایشاء من محاریب وتماثیل وجفان کالجواب وقدور راسیات[7] وہ (جن) ان کے لئے بناتے جو وہ چاہتے۔ محرابیں، مجسمے، حوضوں کے مانند لگن اور ایک ہی جگہ لگی ہوئی دیگیں، اس آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا تذکرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کن کن نعمتوں سے نوازا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں یہ بھی اہم نعمت اور اللہ کا فضل تھا کہ جنات پر حضرت سلیمانؑ کو اختیار حاصل تھا اور وہ ان سے مختلف کام لیا کرتے تھے، ایک کام یہ بھی تھا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نگرانی میں مجسمے بناتے تھے، آیت میں ان کاموں کی تفصیل ہے جو اس دور میں تعمیری، تمدنی اور سماجی کام تھے، آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے اپنی ان نعمتوں کے جواب میں آل داؤد سے شکر کا مطالبہ کیا ہے، اعملوا آل داؤد شکراً۔

ہمارے بعض مفسرین نے اس آیت کی بنا پر یہ کہہ دیا ہے کہ تصویر سابقہ مذاہب میں جائز تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں اسے حرام قرار دیا گیا ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے، جس قسم کی تصاویر ہماری شریعت میں حرام ہیں یہ تمام آسمانی مذاہب میں حرام رہی ہیں، البتہ ایسی تصاویر جو مشرکانہ قسم کی نہ ہوں بلکہ تعمیری، اصلاحی اور تعلیمی مقاصد کے لئے ہوں وہ سابقہ مذاہب میں بھی جائز تھیں ہماری شریعت میں بھی جائز ہیں[8]۔

علامہ قرطبیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ پہلی قوموں میں یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی نیک وصالح فرد انتقال کر جاتا یا کوئی عالم وفات پا جاتا تو لوگ اس کی تصویر یا مجسمہ بناتے اور انہیں حالت عبادت میں دکھاتے تھے اور ان مجسموں اور تصاویر کو عمارتوں اور عبادت گاہوں میں آویزاں کیا جاتا تھا تاکہ لوگوں میں انہیں دیکھ کر جذبہ عبودیت پیدا ہو[9]۔

علامہ قرطبیؒ مزید لکھتے ہیں کہ اس آیت کی بنا پر بعض لوگ تصویر کے جواز کے قائل ہوئے ہیں اور وہ صرف اسی آیت سے استدلال نہیں کرتے بلکہ آل عمران کی اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر ہے۔ انی اخلق لکم من الطین کہیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیراً باذن اللہ۔[10] "میں تمہارے سامنے مٹی کی صورت بشکل پرندہ بناتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ ہو جاتا ہے"۔ نحاس بھی کہتے ہیں کہ

علمار کی ایک جماعت تصویرسازی کے عمل کو ان آیات کی وجہ سے جائز کہتی ہے۔[11] بہرحال سورۂ سبا اور آل عمران کی آیات میں اباحت اور جواز ہی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

اب ہم ان روایات کا ذکر کرتے ہیں جن سے تصاویر اور مورتیوں کے جواز و اباحت کا اظہار ہوتا ہے، انہی روایات کی وجہ سے فقہا و علمار کو تصاویر کے مسئلہ میں بہت الجھنیں پیش آئیں اور انہوں نے علت و سبب کو تلاش کرنے کے بجائے تصاویر کی بہت سی مختلف صورتوں کو حرمت کے حکم سے مستثنیٰ کر دیا۔

ان روایات میں سب سے اہم حدیث عائشہؓ ہے جس میں حضرت عائشہؓ نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ گڑیوں سے کھیلنے کا تذکرہ کیا ہے، یہ روایت صحاح کی متند کتابوں میں کئی طریقوں سے منقول ہے۔ صحیح مسلم میں یہ روایت اس طرح ہے، عن عائشۃ أنھا کانت تلعب بالبنات عند رسول اللہ قالت وکانت تاتینی صواحبی فکن ینقمعن من رسول اللہ قالت فکان رسول اللہ یسربھن الی۔[12] حضرت عائشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر گڑیوں سے کھیلا کرتی تھیں، آپ کی سہیلیاں بھی آجایا کرتی تھیں، جب رسول اللہؐ تشریف لاتے تو حضرت عائشہؓ کی سہیلیاں آپ کو دیکھ کر چھپ جاتی تھیں، رسول اللہ پھر ان لڑکیوں کو حضرت عائشہ کے پاس بھیج دیا کرتے۔ ابوداؤد اور امام نسائی نے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گڑیوں کا تذکرہ کیا ہے، "حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک یا غزوۂ خیبر سے جب واپس تشریف لائے تو حضرت عائشہ کی گڑیاں طاق میں رکھی ہوئی تھیں اور سامنے پردہ پڑا ہوا تھا، ہوا کے جھونکے سے پردہ ہٹ گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ان گڑیوں پر پڑی تو آپ نے پوچھا اے عائشہ یہ کیا ہے؟ حضرت عائشہ نے کہا کہ یہ میری گڑیاں ہیں۔ ان گڑیوں میں ایک گھوڑا بھی رکھا ہوا تھا جس کے پر بنے ہوئے تھے۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ یہ گھوڑا ہے۔ آپ نے پھر پوچھا کہ اس کے اوپر کیا لگا ہوا ہے؟ حضرت عائشہ نے کہا کہ اس کے پر ہیں، آپ نے فرمایا کہ بھلا گھوڑے کے بھی پر ہوتے ہیں؟ حضرت عائشہ نے کہا کہ کیا آپ نے نہیں سنا کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس ایک پر والا گھوڑا تھا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے کہ آپ کے دانت بھی نظر آنے لگے۔"[13]

ایک روایت وہ تھی جس میں سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے کا ذکر تھا، یہ اس وقت کا واقعہ ہوگا جب ان کی عمر سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے کی تھی، اور یہ دوسری روایت اس کے بعد کی ہے جب ان گڑیوں سے کھیلنے کا زمانہ نہیں تھا، کیونکہ یہ واقعہ خیبر یا تبوک سے واپسی پر پیش آیا تھا، خیبر کا معرکہ ۷ھ میں پیش آیا اور غزوۂ تبوک ۹ھ

یں ۷ھ یا ۹ھ میں حضرت عائشہؓ کی عمر گڑیوں سے کھیلنے کی نہ تھی۔ یہ گڑیاں اور گھوڑے وغیرہ ویسے ہی طاق میں رکھے ہوئے تھے۔ رسول اللہؐ نے ان دونوں موقعوں پر کوئی اظہار ناگواری نہیں فرمایا، بلکہ دونوں موقعوں پر مسرت وخوشی کا اظہار کیا ہے۔ ان روایات کی بنیاد پر بہت سے فقہاء وعلماء نے گڑیوں کے جواز کا قول اختیار کیا ہے، اس لئے کہ ان سے مقصد بچوں اور بچیوں کی تربیت وتفریح ہوتی ہے۔ اس قسم کی مورتیوں میں بت پرستی اور شرک کا رجحان نہیں ہوتا۔ اسی لئے اسے مباح رکھا گیا ہے۔ امام ماوردیؒ بھی گڑیوں کو جائز کہتے ہیں، لیکن ان کا خیال ہے کہ انہیں مقتضائے قرائن کے تحت باقی رکھنا چاہئیے۔ اگر گڑیوں سے محض بچوں کی تربیت وتعلیم کا مقصد حاصل کیا جائے تو پھر انہیں باقی رکھنا چاہئیے۔ لیکن اگر گڑیاں تعلیم وتربیت کے بجائے کسی غیر اسلامی عمل کا ذریعہ بن جائیں یا ایسی بنائی جائیں کہ ان سے اسلامی تہذیب وتمدن کو نقصان پہنچے تو انہیں بند کر دینا چاہئیے۔ علامہ ماوردیؒ نے بغداد کے مشہور قاضی ابوسعید اصطخری شافعی کا واقعہ بھی نقل کیا ہے۔ اصطخری مقتدر کے زمانہ میں قاضی مقرر ہوئے تو انہوں نے بغداد کے بازاروں کا معائنہ کیا، انہوں نے دادی کے بازار کو بند کرا دیا مگر گڑیوں کے بازار کو رہنے دیا۔[۱۴] آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ علامہ اصطخری نے متفق علیہ مباحات کو تو برقرار رکھا، اور اس چیز کی فروخت پر پابندی عائد کر دی جو بالاتفاق مباح نہیں، دادی پر اس لئے پابندی لگائی کہ وہ نبیذ بنانے کے لئے استعمال ہوتی ہے اور نبیذ شوافع کے نزدیک جائز نہیں۔

حضرت انسؓ کی یہ حدیث بھی قابل غور ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں "عن انس قال کان قرام لعائشۃ سترت بہا فقال لہا النبی امیطی عنی فانہ لاتزال تصاویرہ تعرض لی فی صلوٰتی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے پاس پردہ تھا جو انہوں نے گھر کے ایک حصہ میں لٹکا رکھا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اس پردہ کو میرے سامنے سے ہٹا دو، اس لئے کہ اس میں بنی ہوئی تصاویر میری نماز میں مخل ہوتی ہیں"[۱۵]۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصاویر والے پردہ کو اس وجہ سے ہٹانے کا حکم دیا تھا کہ وہ نماز میں مخل ہوتا تھا، یہاں تصاویر پر کسی قسم کا اظہار ناگواری نہیں پایا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پردہ میں ایسی تصاویر نہیں تھیں جنہیں اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے، نہ ہی اس قسم کی جو اسلامی روایات کے خلاف ہوں، اگر ایسا ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ہٹانے کا حکم نہ دیتے بلکہ اسے پھاڑ ڈالنے کا حکم دیتے۔

صحیح مسلم کی ایک اور روایت ہے "عن عائشۃ قالت کان لنا ستر فیہ تماثیل طائر وکان الداخل اذا دخل

استقبلہ فقال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حوّلی ھذا فانی کلما دخلت فرأیتہ ذکرت الدنیا" حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ہمارے ہاں ایک پردہ تھا جس میں پرندوں کی تصویریں تھیں وہ اس طرح لٹکا ہوا تھا کہ گھر میں داخل ہونے والے شخص کے بالکل سامنے ہوتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا کہ اس پردہ کو یہاں سے ہٹا دو کیونکہ میں جب بھی گھر میں داخل ہوتا ہوں تو اس پہ نظر پڑتی ہے اور میں دنیا کو یاد کرتا ہوں"[۱۲]

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پردہ کو جس میں پرندوں کی تصاویر تھیں صرف ہٹانے کا حکم دیا تھا اور ہٹانے کی وجہ بھی خود ہی بیان کر دی کہ اس سے دنیا کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ کلما رأیتہ کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ نے بارہا اسے دیکھا تھا اور آپ نے بار بار یہ بات محسوس کی تھی۔ لہٰذا پردہ کو اس جگہ سے ہٹانے کا حکم دیا جہاں سے گھر میں داخل ہوتے ہی اس پہ نگاہ پڑتی تھی، اگر ہر قسم کی تصاویر حرام ہوتیں تو رسول اللہ پہلی ہی مرتبہ اسے چاک کر دینے کا حکم دیتے مگر یہ تو پرندوں کی تصاویر تھیں جن کی پرستش نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان پہ کوئی گرفت نہیں کی گئی نہ ہی انہیں پھاڑنے یا مٹانے کا حکم دیا۔

امام بخاری نے حضرت ابو طلحہؓ کی ایک روایت کو نقل کیا ہے۔

عن ابی طلحۃ صاحب رسول اللہ قال ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان الملئکۃ لا تدخل بیتاً فیہ الصورۃ، قال بسر ثم اشتکی زید فعدناہ فاذا علی بابہ ستر فیہ صورۃ فقلت لعبید اللہ ربیب میمونۃ زوج النبیؐ الم یخبرنا زید عن الصور یوم الاول فقال عبید اللہ الم تسمعہ حین قال الا رقماً فی ثوب"[۱۳]

ابو طلحہؓ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ ملائکہ ان گھروں میں داخل نہیں ہوتے جن میں تصویریں ہوں۔ بسرؓ کا بیان ہے کہ حضرت زید بیمار ہوئے تو ہم ان کی مزاج پرسی کے لئے گئے، ہم نے دیکھا کہ ان کے دروازے پر پردہ لٹکا ہوا تھا اور اس میں تصویریں بھی تھیں، تو میں نے عبید اللہ سے جو حضرت میمونہ زوجہ رسول اللہ کے پروردہ تھے کہا کہ زید نے ہمیں پہلے دن ملاقات میں تصویروں کے بارے میں نہیں بتایا تھا؟ اس پہ عبید اللہ نے کہا کہ کیا تم نے نہیں سنا تھا کہ انہوں نے کپڑوں میں نقش تصویروں کو مستثنیٰ کیا تھا۔

اس حدیث کو امام مسلمؒ نے بھی اپنی جامع صحیح میں روایت کیا ہے، اس میں اتنا زائد ہے کہ جب عبید اللہ نے یہ کہا کہ
[illegible]

تھا۔(۱۸)

اس حدیث میں صحابی رسولؐ کے عمل کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ تصویر والے پردوں میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ اگر تصویر کی حرمت مطلق ہوتی تو یقیناً صحابی رسولؐ کا عمل یہ نہ ہوتا۔

فتح الباری میں ابن حجر عسقلانیؒ نے ایک اور روایت بیان کی ہے، ہم اسے بھی یہاں نقل کرتے ہیں۔ "ابن عون بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ قاسم بن محمد کے گھر گیا وہ مکہ معظمہ کے آخری حصہ میں رہا کرتے تھے، میں نے ان کے گھر میں ایک سجا ہوا کمرہ دیکھا جس میں سینگ والی اور عنقا کی تصاویر تھیں"۔ آگے چل کر ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ قاسم بن محمد بہت بڑے فقیہ عالم اور اپنے زمانہ کے بہترین انسان تھے اور وہ حدیث نمرقہ کے راوی بھی ہیں۔(۱۹)

انہی روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہاء کرام کی ایک جماعت کپڑوں اور پردوں میں تصاویر کو جائز قرار دیتی ہے۔ علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ اس بات میں اہل علم کا اختلاف نہیں ہے کہ تصویریں اگر پردوں میں ہوں تو صرف کراہت ہے حرام نہیں ہیں، اسی طرح اگر عمارت پر نقش ہوں یا ہینیت کی گئی ہوں تو وہ بھی مباح ہیں۔(۲۰)

ابن سعدؒ کی ایک روایت سے بھی ہماری رائے کی تائید ہوتی ہے۔

أخبرنا الفضل بن دكين قال حدثنا قيس بن ربيع عن جابر عن عبداللّٰه بن محمد بن عقيل قال أصاب عقيل بن أبي طالب خاتماً يوم موته فيه تماثيل فأتى به رسول اللّٰه فنفله اياه . فكان في يده قال قيس فرأيته انا بعد۔(۲۱)

محمد بن عقیل بیان کرتے ہیں کہ انہیں اپنے والد ابو طالب کی وفات پر ایک انگوٹھی ملی اس میں مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ اس انگوٹھی کو لے کر رسول اللہ کے پاس آئے تو رسول اللہؐ نے وہ انگوٹھی انہی کو دے دی، یہ انگوٹھی ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی قیس کہتے ہیں کہ میں نے بعد میں بھی یہ انگوٹھی دیکھی تھی۔

خاندان نبوت ہی کے ایک فرد نے اس روایت کو بیان کیا، اس حدیث سے صحابی رسول اور رسول اللہؐ دونوں کا عمل ظاہر ہو رہا ہے، اگر تصویر کی حرمت عمومی ہوتی تو رسول اللہ اور صحابی دونوں کا عمل بالکل مختلف ہوتا۔

جامع ترمذی کی ایک حدیث ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ فخر کے ساتھ بیان کیا کرتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے سے پہلے جبریل امینؑ ایک ریشمی رومال میں میری تصویر لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ یہ

تمہاری زوجہ ہے[۲۲]۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کبار صحابہ میں سے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں عمر کا طویل حصہ گذارا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں انہی کی قیادت میں ایران فتح ہوا تھا۔ سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص جب ایوان کسریٰ میں داخل ہوئے تو انہوں نے ایوان میں لگی ہوئی تصاویر کو برقرار رکھا[۲۳]۔

سورۂ سبا کی آیت، مذکورہ احادیث و روایات اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل بتا رہا ہے کہ ہر قسم کی تصاویر حرام نہیں ہیں بلکہ صرف وہ تصاویر حرام ہیں جو مشرکانہ ہوں، مجسموں اور تصاویر میں اصل علت بت پرستی اور شرک ہے، اس علت کی طرف احادیث میں وضاحت بھی ملتی ہے۔ آپ کی حدیث ہے:

ان اللہ عزوجل بعثنی ھدی و رحمۃ للعالمین — اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام عالم کے لئے باعث رحمت اور ہدایت بنا

وامرنی ان امحق المزامیر والمعازف والخمور — کر بھیجا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں گانے بجانے کے آلات شراب اور

والاوثان التی تعبد فی الجاھلیہ[۲۴]۔ — ان بتوں کو مٹادوں جن کی زمانہ جاہلیت میں پرستش کی جاتی تھی۔

وہ حضرات جنہوں نے حرمت تصویر کی صحیح صحیح علت کو نہیں سمجھا انہیں مسئلہ تصویر میں بہت الجھنیں پیش آئیں، اور مجبوراً تصاویر کی بہت سی اقسام کو جائز کہنا پڑا، مثلاً ان تصاویر کو جائز کہا گیا جو محل اہانت میں ہوں مثلاً فرش، قالین یا بستر وغیرہ میں، وہ تصاویر جائز ہیں جو پردوں میں نقش ہوں، وہ تصاویر جائز ہیں جن کا سایہ نہ ہو، اسی طرح وہ تصاویر جائز ہیں جن کے جسم کا کچھ حصہ کٹا ہوا ہو یا ایسا حصہ غائب ہو جس کے بغیر حیات ممکن نہیں، مدھم اور چھوٹی تصاویر جو دور سے نظر نہ آئیں یا گڑیاں ہوں یا ایسے مادہ سے بنائی گئی ہوں جو زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکے وغیرہ وغیرہ[۲۵]۔

احناف، شوافع، مالکیہ اور حنابلہ سب ہی تصویر کی کسی نہ کسی صورت کو جائز قرار دیتے ہیں[۲۶]۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو انہوں نے بھی تصاویر کی ایسی اقسام کو جائز کہا ہے جن میں شرک و بت پرستی کا تصور نہیں تھا۔ سید سابق کو اصل علت نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ تاویل کرنا پڑی کہ شروع میں حضور نے تصویر کو حرام قرار دیا تھا لیکن بعد میں اس کی حرمت ختم ہو گئی تھی، سید سابق کا خیال ہے کہ ابتداء میں تصویر اس لئے حرام کر دی گئی تھی کہ زمانہ بت پرستی کا تھا اور عام طور پر شرک و بت پرستی کے لئے تصاویر بنائی جاتی تھیں، لیکن جب بت پرستی سرزمین عرب سے ختم ہو گئی تو اس کی حرمت کا حکم بھی ختم ہو گیا، دلیل میں وہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کو پیش کرتے ہیں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ حولی ھذا۔ اسے میرے سامنے سے ہٹا دو[۲۷]۔ احناف کے مشہور امام و محدث امام طحاوی

فرماتے ہیں کہ وہ تصاویر ممنوع ہیں جو ایسی ہوں جیسی نصاریٰ اپنی عبادت گاہوں میں نصب کرتے تھے یا دیواروں پر لگایا کرتے تھے۔ امام طحاویؒ کی عبارت یہ ہے۔

فثبت بما روینا خروج الصور التی فی الثیاب من الصور المنہی عنہا، وثبت ان المنہی عنہ الصور التی ھی نظیر ما یفعلہ النصاری فی کنائسہم من الصور فی جدرانہا ومن تعلیق الثیاب المصورۃ فیہا، فاما ما کان یوطأ ویمتہن ویفترش فہو خارج من ذالک وھذا مذہب ابی حنیفۃ وابی یوسف ومحمدؒ۔ (۲۸)

جو کچھ ہم نے روایت کیا ہے اس سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایسی تصاویر جو کپڑوں میں نقش ہوں وہ ممنوعہ تصاویر سے خارج ہیں یہ بات بھی ثابت ہے کہ وہی تصاویر ممنوع ہیں جو ان تصاویر کے مثل ہوں جنہیں عیسائی اپنی عبادت گاہوں میں نصب کرتے تھے۔ یا کپڑوں میں نقش کر کے کنیسہ کی دیواروں پر آویزاں کرتے تھے لیکن ایسی تمام تصاویر جو قدموں تلے آتی ہوں یا محل اہانت میں ہوں یا بستر وغیرہ پر بچھی ہوئی ہوں وہ حکم حرام سے خارج ہیں یہی امام ابو حنیفہ امام ابو یوسف اور امام محمد کا مسلک ہے۔

امام طحاوی کے یہ الفاظ "الصور التی ھی نظیر ما یفعلہ النصاری" ظاہر کرتے ہیں کہ امام طحاوی کے نزدیک بھی ایسی ہی تصاویر ممنوع ہیں جو مشرکانہ ہوں۔ نصاریٰ کے ہاں تصور توحید مسخ ہو چکا تھا۔ وہ روح القدس حضرت مریم اور حضرت مسیح علیہ السلام کے مجسمے اور تصاویر بنا کر اپنی عبادت گاہوں میں لگاتے تھے، ان کے سامنے جھکتے اور دعائیں مانگتے تھے۔ ان کا یہ عمل اسلامی تعلیمات اور خالص تصور توحید کے بالکل منافی تھا۔ لہٰذا اس قسم کی تصاویر کو ختم کرنا ضروری بلکہ فرض ہے، لیکن جن تصاویر میں عبادت و پرستش کا کوئی شائبہ نہ تھا علماء کرام اور فقہاء نے انہیں جائز کہا ہے۔ (۲۹) علامہ عبدالرحمٰن جزیری نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ تصویر شریعت کی نظر میں اس وقت حرام ہے جب کسی فاسد غرض کے لئے بنائی گئی ہو جیسے بت جن کی پرستش کی جاتی ہو لیکن اگر تعمیری مقصد کے لئے تصاویر ہوں یا تعلیم و تعلم مقصد ہو تو مباح ہیں۔ (۳۰) د۔

احادیث نبوی جن میں تصویر کی حرمت ہے اور تصاویر بنانے والوں کے لئے سخت ترین عذاب کی دھمکی ہے۔ ان احادیث میں بھی غور کرنا ہوگا۔ یہ احادیث صحاح کی تمام کتابوں میں موجود ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ آیا ان احادیث سے ہر قسم کی تصاویر مراد ہیں یا خاص قسم کی تصاویر۔ ہم نے اپنی سابقہ بحث میں یہ بات ثابت کی ہے کہ ان احادیث کا مصداق وہ افراد ہیں جو اصنام و اوثان بناتے ہیں، لیکن بعض علماء نے ان احادیث کا مصداق ان تمام افراد کو قرار دیا ہے جو جاندار کی تصویر بناتے ہیں، بے جان کی تصاویر کو سب نے مباح کہا ہے، اس لئے کہ عام طور

پر بے جان چیزوں کی تصاویر کی پرستش نہیں ہوتی تھی، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اصل تقسیم جاندار اور بے جان کی نہیں بلکہ اصل تقسیم یہ ہے کہ کونسی تصاویر شرک و بت پرستی کا سبب ہیں اور کونسی تصاویر شرک و بت پرستی کا سبب نہیں ہیں، بت جاندار کا ہو یا بے جان کا حرام ہے۔ احادیث میں وعید اور سخت عذاب کی دھمکی صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو ایسی تصاویر بناتے ہیں یا ایسے مجسمے ڈھالتے ہیں جن کی پرستش کی جاتی ہو، پچھلے صفحات میں ہم نے حدیث عائشہ، صحابہ کرام کا عمل اور بعض ان روایات کو ذکر کیا ہے جن سے تصویر کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ ہماری رائے کی تائید کرتی ہیں، حدیث کے عظیم امام علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے یہی علت بیان کی ہے، ابن حجرؒ "ان اشد الناس عذاباً عند اللہ المصورون" کے بارے میں لکھتے ہیں "ای الذین یصورون الاصنام والاوثان التی تعبد" یعنی اس سخت عذاب کے مستحق وہ لوگ ہوں گے جو ایسے مجسمے یا تصویریں بناتے ہیں جن کی پرستش کی جاتی ہے۔"[31] امام عسقلانیؒ نے خطابی کی رائے کو بھی ذکر کیا ہے لکھتے ہیں۔ "وقال الخطابی انما عظمت عقوبۃ المصور لان الصور کانت تعبد من دون اللہ" مصور کی سزا اس لئے سخت ہے کہ وہ ایسی تصاویر بناتا ہے جن کی اللہ تعالیٰ کے علاوہ پرستش ہوتی ہے"[32] ابو علی فارسی کا خیال یہ ہے کہ "ان اشد الناس عذاباً" کی سخت وعید مشبہہ کے لئے ہے، یعنی جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی خاص شکل وصورت ہے اور اس صورت کو تصویر یا مجسمہ کے قالب میں ڈھالتے ہیں، ابو بکر جصاصؒ نے اس گروہ کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ احادیث وعید نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

وقد قیل فیہ ان المراد من شبہ اللہ تعالیٰ بخلقہ۔[33] یعنی مراد ایسا شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی شبیہ بنائے اس کی مخلوق کی طرح۔

یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ حدیث نافع و عائشہؓ "ان اصحاب ھذہ الصور" اور حدیث ابو طلحہ میں "الصورۃ" سے مراد اسی قسم کی تصاویر ہوں۔ اس وعید میں وہ طبقہ بھی داخل ہے جو تصویر یا مجسمہ بنا کر اس قدر فخر و غرور میں مبتلا ہو جائے کہ اپنے آپ کو خدا کے مثل سمجھنے لگے، مثلاً حضرت عائشہ کی حدیث میں ایسے ہی لوگوں پر سخت عذاب کی دھمکی ہے۔

ان اشد الناس عذاباً یوم القیٰمۃ الذین یضاھون بخلق اللہ۔ — قیامت کے دن سب سے سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو اللہ کی خلق کی تشبیہ بنا کر اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کرتے ہیں۔

اسی طرح یہ حدیث: ومن اظلم ممن ذھب یخلق خلقاً — ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو میری خلق جیسی مخلوق بناتے ہیں۔

کنلق فلیخلقوا ذرہ او لیخلقوا شعیرۃ۔[۳۴] وہ ایک چھوٹی چونٹی یا ایک دانہ جو تو پیدا کردیں۔

ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں "وخص لبعضهم بمن صور قاصداً ان یضاهی"۔ بعض علماء نے اس وعید کا مستحق ان لوگوں کو قرار دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے مثل ہونے کا قصد کرتے ہوئے تصویر بنائیں۔[۳۵]

مسئلہ تصویر پر ہماری اس بحث کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہر قسم کی تصاویر، مجسموں اور مورتیوں کی مسلم معاشرہ میں ہمت افزائی کی جائے، یا بلا کسی مقصد و ضرورت کے محض آرائش و زیبائش کے لئے تصویر سازی کی جائے، اس قسم کی تصاویر کو کبھی بھی اسلامی معاشرہ میں پسند نہیں کیا گیا، احادیث وعید کو پیش نظر رکھتے ہوئے علماء نے ہر قسم کی تصاویر کی مذمت کی ہے، ہمارا مقصد تو علمی انداز میں صرف یہ بتانا ہے کہ آج کل تعلیم و تربیت، پیغام رسانی، سائنسی اور تحقیقاتی کاموں اور انتظامی و تفتیشی امور کے لئے اگر تصاویر سے فائدہ اٹھایا جائے تو یہ بالکل جائز ہوگا شرعاً اس میں حرمت یا عدم جواز کا کوئی سبب نہیں ہے۔

واللہ الموفق وھو المعین۔

حواشی

۱۔ ابن خالویہ لکھتے ہیں "سمی اللہ تعالیٰ الصنم بعلاً حیث اتخذ رباً أعراب ثلاثین سورۃ، من سورۃ البقرہ۔ نیز دیکھئے آیات۔ الانعام۔ ۷۴۔ الاعراف ۱۳۸، ابراہیم ۳۵۔ الشعراء آیہ ۷۱۔ نفظ وثن، الحج۔ ۳۰۔ العنکبوت ۱۷۔ ۲۵۔

۲۔ دیکھئے الحلال والحرام فی الاسلام علامہ یوسف القرضاوی ص ۹۸ مطبوعہ المکتب الاسلامی، ۱۹۶۹ء۔ احکام القرآن، جصاص ج ۲ ص ۲۷۲۔ الجامع لاحکام القرآن قرطبی ج ۱۴ ص ۲۷۲۔ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۷۷ء

۳۔ الجامع الصحیح للبخاری ج ۲ ص ۱۵۹ مطبوعہ مصر ۱۹۰۳ء

۴۔ تاج العروس ج ۹۔ الجامع الصحیح لمسلم ج ۲ ص ۲۰۲ مکتبہ رشیدیہ دہلی۔

۵۔ الانبیاء۔ ۵۲۔

۶۔ وتاللہ لاکیدن اصنامکم۔ الانبیاء۔ ۵۷

۷۔ سبا۔ ۱۳۔

۸۔ تورات میں ہے تم اپنے لئے بت نہ بنانا نہ تراشی ہوئی مورت یالاٹ اپنے لئے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں شبیہ دار پتھر رکھنا کراسے سجدہ کرو۔" خروج باب ۲۰ آیت ۴۔ لعنت ہے اس آدمی پر جو کاریگری اور صناعی سے لکڑی یا پتھر میں کھودی ہوئی یا کسی دھات کی ڈھالی ہوئی مورت بنائے جو خداوند کو ناپسند ہے پھر اس کو کسی پوشیدہ جگہ نصب کرے۔ استثنار باب ۲۷ آیت ۱۵۔

۹۔ الجامع لاحکام القرآن۔ قرطبی، ج ۱۴ ص ۲۷۲ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۷ء۔

۱۰۔ آل عمران۔ ۴۹۔

۱۱۔ الجامع لاحکام القرآن، قرطبی، ج ۱۴ ص ۲۷۲۔

۱۲۔ الجامع الصحیح للمسلم ج ۲ ص ۲۸۵ کتاب الفضائل، فضائل عائشہ۔

۱۳۔ فقہ السنہ، سید سابق ج ۳ ص ۵۰۰۔ بحوالہ ابوداؤد و نسائی۔

۱۴۔ الاحکام السلطانیہ باب ۲۰، احکام الاحتساب ص ۳۲۷۔ داوی نبیذ بنانے کے کام آتا ہے۔ داوی اگرچہ فی نفسہ حلال ہے لیکن اس کا استعمال چونکہ شراب سازی کے لئے ہوتا تھا اس وجہ سے اس کی فروخت پر پابندی لگادی۔

۱۵۔ الجامع الصحیح للمسلم ج ۲ ص ۲۰۰ مکتبہ رشیدیہ دہلی۔

۱۶۔ الجامع الصحیح للمسلم ج ۲ ص ۲۰۰ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ دہلی۔

۱۷۔ الجامع الصحیح للبخاری۔

۱۸۔ الجامع الصحیح للمسلم ج ۲ ص ۲۰۰

۱۹۔ فتح الباری ج ۱۱ ص ۵۱۲ حدیث نمرقہ: عن عائشہ انھا اشترت نمرقۃ فیھا تصاویر فقام النبی بالباب الخ۔ دیکھئے الجامع الصحیح للبخاری باب التصاویر۔

۲۰۔ القرطبی، ج ۱۴ ص ۲۷۲۔

۲۱۔ ابن سعد، ج ۴ ص ۴۳ مطبوعہ بیروت۔

۲۲۔ جامع ترمذی مع شرح تحفۃ الاحوذی، طبع بیروت، جلد چہارم، ص ۳۶۳۔

۲۳۔ الفاروق، شبلی، ص ۳۴۳ مطبوعہ سجاد پبلشرز لاہور۔

۲۴۔ الزواجر عن اقتراف الکبائر ج ۱ ص ۸، مطبوعہ مصر ۱۹۵۱ء۔

۲۵۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۲، احکام التصویر۔

۲۶۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ ج ۲، احکام التصویر۔ جمع الفوائد ج ۱ ص ۸۲۷۔
فتح الباری ج ۱۲۔

۲۷۔ فقہ السنۃ، سید سابق، ج ۳ ص ۵۰۲۔

۲۸۔ شرح معانی الآثار، طحاوی ج ۲ باب التصاویر فی الثوب۔

۲۹۔ جیسا کہ ہم نے پچھلے صفحات میں ذکر کیا ہے، مثلاً وہ تصاویر جو موضع اہانت میں ہوں، پردوں میں ہوں، بستر، فرش یا قالین وغیرہ میں ہوں، ناقص الاعضاء ہوں، وغیرہ۔ اس قسم کی تصاویر کی پرستش نہیں ہوتی تھی۔ مشہور عالم دین مفتی محمد عبدہؒ اور شیخ عبدالعزیز جاویش بھی مشرکانہ تصاویر کو حرام قرار دیتے ہیں، شائبہ شرک نہ ہو تو مباح ہے دیکھئے مقالہ "حول تمثیل شخصیۃ الرسولؐ" الدراسات الاسلامیہ، مارچ ۱۹۷۵ء۔

۳۰۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۲ ص ۳۰۔

۳۱۔ فتح الباری ج ۱۲ ص ۵۰۰۔

۳۲۔ فتح الباری ج ۱۲ ص ۵۰۰۔

۳۳۔ احکام القرآن، جصاص، ج ۳ ص ۳۷۲۔

۳۴۔ الجامع الصحیح للمسلم ج ۲ ص ۱۹۹۔

۳۵۔ فتح الباری ج ۱۲ ص ۵۰۰ مطبوعہ مصر۔

عصرِ جدید کی علمی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ

ڈاکٹر صابر آفاقی

علم طب

علم طب کی ترقی میں مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ مسلم اطباء نے یونان، ایران اور مصر میں موجود کتبِ طب سے استفادہ کیا اور پھر اس علم میں قابل قدر اضافہ بھی کیا، علم طب کی اہمیت کو مانتے ہوئے عربوں نے طبیبوں کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور ان کو خاص سماجی مرتبہ دیا۔ جس طرح یونان میں فلسفہ کا مطالعہ ضروری سمجھا جاتا تھا اسی طرح اسلام کے قرون اولیٰ میں فن طب کو ناگزیر سمجھا گیا اور ہر خلیفہ کے عہد میں اس کی تدریس و تحقیق اہم ضرورت سمجھی جاتی رہی، مسلمانوں نے اس فن کو ترقی بھی دی اور معالجاتی ادویہ کی تلاش کا کام بھی جاری رکھا۔ دنیا کا فارماکوپیا ان کے انکشافات سے بھرا پڑا ہے۔ انہوں نے سلطنت اسلامیہ کے گوشے گوشے میں ہسپتال قائم کیے اور بعض زندان خانوں میں بھی علاج معالجے کی سہولتیں فراہم کیں۔ انہوں نے بیماریوں کی تشخیص کے کلینک بھی قائم کیے۔ آنکھوں کی بیماریوں کے سلسلے میں بعض تخلیقی کام انجام دیے۔

مسلمانوں نے عہدِ وسطیٰ میں جو یورپ پر احسانات کیے ان میں سے ایک انسائیکلوپیڈیا کی تصنیف ہے۔ الرازی (۸۶۵ء-۹۲۵ء) نے جو طہران کے نزدیک رے شہر کا باشندہ تھا، "الحاوی" جیسا اہم انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا۔ اس میں ان طبی علوم کی تفصیل ملتی ہے جن میں دسویں صدی ہجری میں مسلمانوں کو مہارت حاصل تھی۔ یہ تصنیف ترجمہ ہوکر ۱۲۷۹ء میں سسلی میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کے بعد کتابِ مذکور کے متعدد ایڈیشن چھپے اور عیسائی یورپ کی صدیوں تک رہنمائی کرتے رہے۔

انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے والے بڑے علماء میں ایک ابن سینا (۹۸۰ء-۱۰۳۷ء) بھی ہوا ہے۔ یہ دنیا کا ذہین ترین انسان خود علوم و فنون کا دائرۃ المعارف تھا اور کمپیوٹر جیسی یادداشت کا مالک تھا۔ اس نے اکیس سال کی عمر میں سلطان بخارا کے کتب خانے میں موجود تمام کتابوں کا مطالعہ کر ڈالا تھا۔ ابن سینا نے اپنی تصنیف "قانون" میں یونان و عرب کے طبی علوم کو یکجا کر دیا۔ قانون کا لاطینی میں ترجمہ بارہویں صدی میں گیرارڈ نے کیا اور یہ کتاب عہدِ وسطیٰ میں مستند درسی نصاب

کی کتاب سمجھی گئی۔ یہ یورپ کی تمام میڈیکل درس گاہوں میں پڑھائی جاتی رہی۔ ابن سینا کے اس میٹریا میڈیکا میں کوئی سات سو ساٹھ دواؤں کی تفصیل دی گئی ہے۔ بارہویں صدی سے لے کر سترھویں صدی تک یہ تصنیف مغربی دنیا میں طبی علوم کی واحد رہنما بنی رہی۔ مسلم ممالک کے اسلامی اداروں اور درس گاہوں میں یہ آج بھی پڑھائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اوسلر کے الفاظ میں: "یہ کتاب ایک طویل زمانے تک اطبا کی بائیبل بنی رہی۔"

عظیم یونانی طبیب گالن کے نظریات جن کی اصلاح عرب اطبائے کی یورپ عہد وسطیٰ میں یورپ پر چھائے رہے۔ جب تحریک احیائے علوم نے انسانی اذہان میں انقلاب پیدا کیا تو یورپ نے جو اسلامی ثقافت سے زیادہ متاثر تھا انقلاب کی طرف ایک قدم اور بڑھایا۔

کیمسٹری

عربوں نے جب ۶۴۱ء میں اسکندریہ فتح کیا تو ان کو مصر قدیم کے تمام علوم بھی ہاتھ لگے۔ چونکہ قدیم عہد میں دیگر سبھی اقوام سے بڑھ کر مصریوں نے کیمسٹری میں ترقی کی تھی مسلمانوں نے اہل اسکندریہ سے یہ علم حاصل کر کے پھیلایا اور پھر یورپ تک پہنچا دیا۔ کیمسٹری کو مدت تک کیمیا گری کا نام بھی دیا گیا۔ اور سونا بنانے کے فن کی تلاش میں عرب اطبائے تین بڑے معدنی ایسڈ بنانے کے کلیے دریافت کر لئے۔ تین ایسڈوں سے مراد نٹرک ایسڈ، سلفورک ایسڈ اور ہائیڈرو کلورک ایسڈ ہے۔

یورپ کیمیا گری اور کیمسٹری میں عربوں کی کیمیکل سائنس کا ممنون و مرہون ہے۔ یہ علم عرب علماء کی تصانیف کے لاطینی تراجم کے ذریعے یورپی محققین تک پہنچا تھا۔ دوسرے علوم کی طرح اس علم میں بھی عربوں نے یونانیوں کی خشک تھیوریوں کو جامۂ عمل پہنایا اور ان میں گوناگوں تجربے کر کے آگے بڑھایا۔

عرب کا بابائے کیمسٹری جابر تھا۔ اس سائنس میں اس نے بہت سے تجربے کئے اور نئے قاعدے پیش کئے۔ اس کی تصانیف لاطینی میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئیں اور ماڈرن کیمسٹری کے آغاز تک یہ تصانیف یورپ کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہیں۔

نجوم و جغرافیہ

عرب مسلمان نجوم، جغرافیہ اور جہاز رانی کے قدیم علوم میں ماہر تھے اور انہوں نے ان نظری علوم کو عملی سائنس میں تبدیل کر دیا۔ یونانی ماخذ سے استفادہ کرنے کے بعد مسلمانوں نے بطلیموس کی تصانیف سے یورپ کو متعارف کرایا۔ ارسطو، ہیپارکس، تھینس اور دیگر یونانی جغرافیہ دانوں کے قدیم نظریے کو مانتے ہوئے کہ زمین گول ہے، عربوں نے اس کا قطر دریافت کیا اور

رضِ بلد و طولِ بلد کی صحیح صحیح پیمائش کی۔

بحیرۂ روم میں جہاز رانی کا دار و مدار ستاروں کے علم پر تھا، مگر او قیانوس میں جہاز رانی کے لئے اس سے بڑھ علوم کی ضرورت پڑتی تھی۔ قطب نما عرب مسلمانوں نے چینیوں سے لیا تھا اور یونانیوں سے انہوں نے ستاروں کی بلندی معلوم کرنے کا آلہ حاصل کیا جو ستاروں کی صحیح پوزیشن معلوم کرنے کے کام آتا تھا۔ عرب جہاز رانی میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ ہزاروں سال تک افریقہ اور برصغیر سے تجارتی تعلقات برقرار رکھنے کے لئے بحرِ ہند میں سفر کرتے رہے۔ بحیرہ روم پر کوئی پانچ سو سال تک چھائے رہے۔

غالباً عرب مسلمانوں کی ذہانت سے استفادہ کر کے مشہور جہاز راں پرنس ہنری نے اپنے جہاز راں تیار کئے اور جلد ہی پرتگال کو بہترین نیوی فورس مل گئی۔ پرتگال کے جہاز راں اور بحری رہنما اپنے وقت کی بحری سائنس میں اوروں سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ ان کے پاس اس وقت کے بہترین مروجہ آلات ہوتے تھے۔ کولمبس نے پرتگال ہی میں جہاز رانی سیکھی تھی۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اگر عربوں کی بحری مہارت نہ ہوتی اور زمین کے بیضوی ہونے کا یونانی نظریہ نہ ہوتا جسے عربوں نے یورپ تک منتقل کیا تو کولمبس نئی دنیا دریافت نہ کر سکتا، بلکہ وہ بحری سفر کا تصور بھی نہ کر سکتا۔

عشاری سسٹم

مورس کلائن اپنی تصنیف "مغربی تہذیب میں ریاضی" (انگریزی) میں لکھتا ہے کہ عرب و ہند علامتوں کے تعارف نے ہمارے آج کے ابتدائی اسکولوں کے بچوں کے لئے یہ آسانی پیدا کر دی ہے کہ وہ یونانی اور رومن ریاضی سے سیکھی ہوئی مہارت کے علاوہ بھی حساب نکال سکیں۔ اس بات کا سہرا بھی عرب مسلمانوں کے سر بندھتا ہے کہ انہوں نے صفر "0" صفر سے لیا اور پھر اسے اعشاری سسٹم میں استعمال کیا جس کے بغیر موجودہ سائنس کی ترقی ناممکن ہوتی۔

یہ ہندی فلسفیانہ ذہن تھا جس نے یہ دریافت کیا کہ عدم محض جس کی نمائندگی صفر کرتا ہے اس کی اپنی ریاضیاتی قدر ہے۔ ہندی بنیادوں پر کام کرتے ہوئے عرب مسلمانوں نے مزید ترقی کی اور اس طرح ہمارا موجودہ اعشاری سسٹم وجود میں آیا۔ انہوں نے عرب ہندسوں کو بھی متعارف کرایا جو دس ہندی ہندسوں سے بنے تھے۔ اس طرح مبہم یونانی علامات اور ناممکن رومن اعداد اپنی اہمیت کھو بیٹھے۔ اعشاری سسٹم آہستہ آہستہ یورپ میں پھیلا۔

لیونارڈو عیسائی نے جو کئی سال شمالی افریقہ میں ٹھہرا رہا اور وہاں اس نے عرب طریقہ اعداد اور اعشاری سسٹم کا استعمال سیکھا تھا، ریاضی اہل یورپ کو سکھائی۔ آکسفورڈ ہسٹری آف ٹیکنالوجی کے مطابق لیونارڈو کی تصنیف اہم ترین مغربی تصنیف ہے جسے ایک لاطینی عیسائی نے قلم بند کیا اور جس میں وہ اعداد کا سسٹم بیان ہوا جو عربی بولنے والے صنعتکاروں اور تاجروں میں ٹیکنیکل اور تجارتی مقاصد کے لئے مدت تک مروج رہا۔ یہ سسٹم اسی مصنف کے ذریعے یورپ میں مروج ہوا۔

الجبرا

الجبرا کی سائنس بھی عہد اسلامی کے ریاضی دانوں کی مرہون منت ہے۔ اس سائنس کا نام ہی بتاتا ہے کہ یہ عرب مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ کیونکہ عربی میں جبر کے معنی آپس میں جوڑنے کے ہیں۔ الجبرا کا آغاز تو بیشک یونان میں ہوا مگر اسے وسعت و ترقی عرب ریاضی دانوں نے دی۔ آٹھویں صدی سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک عرب مساوی تقسیم کے مطالعہ میں مصروف رہے پھر الجبرا ہسپانیہ اور سسلی کے راستے یورپ تک پہنچا۔

کاغذ

اسلامی اور یورپی دنیا کو کاغذ کا علم اس وقت ہوا جب آٹھویں صدی میں مسلمانوں نے ایشیائی اور افریقی ممالک فتح کئے۔ ۷۵۱ء میں چینیوں نے سمرقند کے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور پھر شکست کھائی۔ یہاں مسلمان گورنر کو کاغذ کا ایک ٹکڑا ملا جو قبل مسیح میں بنایا گیا تھا۔ گورنر نے جنگی قیدیوں سے بہت سے سوال کئے اور معلوم ہوا کہ ان قیدیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو صنعت کاغذ سازی میں مہارت رکھتے ہیں۔ پھر یہ صناع ایران اور مصر میں بھیجے گئے تاکہ وہاں وہ یہ صنعت دوسروں کو سکھائیں۔ عربوں نے صنعت کاغذ سازی میں زیادہ دلچسپی اس لئے لی کہ وہ پہلے ہی مصری پیپ رس سے واقف تھے اور اس مہنگے استعمال سے بچنا چاہتے تھے۔ کاغذ اور پیپ رس کی ساخت میں ایک جیسا طریقہ ہی رائج تھا مگر ظاہر ہے کہ کاغذ کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔

کاغذ بنانے کی صنعت ہسپانیہ میں بارھویں صدی میں پہنچی۔ ٹولیڈو سے جو کاغذ سازی کی صنعت کا مرکز تھا مور قوم کی سرپرستی میں یہ صنعت ہسپانیہ کی عیسائی بادشاہتوں تک پہنچی۔ اسی طرح سسلی کے مسلمانوں نے یہ صنعت اٹلی کے عیسائیوں کو سکھائی۔ کاغذ پر اولین یورپی دستاویز سسلی کے کنگ راجر کا وصیت نامہ ہے جو ۱۱۰۲ء میں

لکھا گیا۔ اٹلی میں پہلی کاغذ مل ۱۲۷۶ء میں قائم ہوئی۔ یہ مل فیبریانو میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے بعد تمام بڑے شہروں میں کاغذ کی فیکٹریاں بنائی گئیں۔

بارود

بندوق کا بارود بنانا تو عربوں نے چینیوں سے ہی سیکھا تھا۔ مگر اس کا استعمال جس طرح عرب مسلمانوں نے کیا وہ خود چینی بھی نہ جانتے تھے۔ انہوں نے اس نظریہ کے تحت تجربے کئے کہ بارود پھٹنے کی طاقت کو ایک سا تھ والے حصے استعمال کیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی توپ مصر میں گیارہویں صدی عیسوی میں ایجاد ہوئی۔ یہ توپ لکڑی کی تھی جسے دھات کے تاروں سے باندھا گیا تھا اور یہ پتھر کے ٹکڑے ادھر ادھر پھینک سکتی تھی۔ پندرہویں صدی کے نصف تک مسلمانوں نے توپ میں اس قدر اصلاح کر لی تھی کہ یہ استنبول پر حملہ اور پھر اس کی فتح میں استعمال ہوئی۔ بندوق یورپ میں پہلے پہل ان ہسپانوی فوجیوں نے استعمال کی جو ۱۵۲۲ء کی جنگ اٹلی میں لڑ رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندوق سب سے پہلے ہسپانیہ میں بنائی گئی۔

کپڑے کی صنعت

عہد ظلمت میں یورپی اقوام کا لباس ان کی خوراک کی طرح کھردرا اور سخت تھا۔ صلیبی جنگوں میں حصہ لینے والے عیسائی مشرق سے بہترین کپڑے کے نمونے یورپ لے گئے تھے۔ پھر یہ کپڑا اٹلی اور مشرق قریب کی بندرگاہوں کے درمیان بہترین مال تجارت بن گیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ہسپانیہ اور سسلی کے موروں نے اپنے زمانہ کے عیسائیوں کو کپڑا بنانے کا فن سکھایا اور یہ بھی بتایا کہ ریشم پیدا کرنے کے لئے ریشم کے کیڑے کس طرح پالے جاتے ہیں۔

غذا

عہد وسطیٰ کے یورپ کی غذا قابل ذکر نہ تھی۔ وہ عام طور سے گوشت اور روٹی شراب میں بھگو کر کھاتے معمولی سبزیاں اور میوے ان کی غذا تھی۔ نئی غذائیں یورپ میں ہسپانیہ اور سسلی کے راستے داخل ہوئیں۔ ان میں چاول کا اضافہ ہوا۔ متعدد پھلدار درخت بھی عرب مسلمانوں نے یورپ کو دیئے۔ کافی بھی عربوں نے ہی پوری دنیا کو دی۔ کافی دنیا میں سترھویں صدی میں یمن سے پہنچی۔ اس کے جلد ہی بعد تمام یورپ میں کافی ہاؤس بنائے گئے پھر ڈچوں نے کافی کا پودا جس کا حاصل کرنا ممنوع تھا جاوا سے چرالیا اور پھر انگریزوں نے اسے جمائیکا میں کاشت

کر لیا۔

شکر یہ صغیر کی غذائی جنس ہے جو پہلی صدی مسیحی میں یہاں دریافت ہوئی۔ جزیرہ مشرق کی طرف سے بڑھتی ہوئی چین تک اور مغرب کی طرف ایران تک پہنچی۔ دسویں صدی میں عربوں نے ایرانیوں سے سیکھ کر اسے شام، ہسپانیہ اور سسلی تک پہنچا دیا۔ مصریوں نے جب دریافت کیا کہ شکر میں طبی خصائص موجود ہیں تو انہوں نے اسے صاف کرنے کے کیمیکل طریقے ایجاد کیے۔ صلیبی جنگ آزماؤں نے شکر کی لذت چکھی تو اسے عیسائی دنیا میں متعارف کرایا۔ ایک مدت دراز تک وینس شہر شکر کو شام سے یورپ پہنچانے کا اہم کاروباری کام کرتا رہا۔

یونیورسٹی کا قیام

مسلمانوں نے نویں صدی میں پہلے بغداد اور اس کے بعد قاہرہ اور دیگر اسلامی شہروں میں یونیورسٹیاں قائم کیں۔ قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ اس وقت دنیا میں موجود تمام یونیورسٹیوں میں قدیم ترین یونیورسٹی ہے۔ یہ دسویں صدی عیسوی میں قائم ہوئی اور جب سے اب تک اسلامی دنیا کا علمی و مذہبی مرکز بنی ہوئی ہے۔

کارڈووا اور ٹولیڈو کی مسلم یونیورسٹیاں یورپ میں خوب مشہور تھیں اور ان کے ہسپتالوں کے دروازے عیسائی شہزادوں پر کھلے ہوئے تھے جو علاج کے لئے آتے۔ یورپ کے اولین میڈیکل اسکول مورقوم سے اسی سیاسی تعلق کا نتیجہ تھے۔ سسلی کے شہر سلرنو میں قائم ہونے والی پہلی یورپی یونیورسٹی اسی میڈیکل بنیاد پر کھڑی کی گئی۔ اس یونیورسٹی کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات تو نہیں ملتیں مگر اتنا معلوم ہے کہ اس کی بنیاد نویں صدی میں ایک لاطینی، ایک یونانی، ایک یہودی اور ایک مسلمان نے مل کر رکھی تھی۔ اس کی نصابی کتب کا ترجمہ ایک ممتاز افریقی عالم کنسٹائن نے عربی کتب سے کیا تھا۔ یہ کتابیں یا تو اصل عربی میں تھیں یا ان کے تراجم یونانی سے کیے گئے تھے۔ سلرنو کے مقام پر ہی ۱۲۲۴ء میں فریڈرک دوم نے یونیورسٹی آف نیپلز قائم کی۔ فریڈرک نے ارسطو کی تصانیف کا ترجمہ کرایا۔ اس نے مشہور منجم، طبیب، شارح ارسطو اور عظیم مسلم فیلسوف ابن رشد کی کتابوں کا ترجمہ بھی کرایا تھا۔

تیرھویں صدی کے شروع میں یونیورسٹیاں سارے یورپ میں عام ہو گئیں۔ مثلاً بولگن، پاڈوآ، پیرس اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیاں، جن میں پہلے پہل یورپی علماء نے ایسے مضامین پر کام کرنا شروع کیا جن کی اہمیت خالصۃً علمی و تحقیقی تھی، مثال کے طور پر نجوم، فلسفہ اور طب۔ ان کے پاس یونانی متون بھی تھے اور مسلمانوں کی تصانیف بھی۔

مشینری

مشینری کی ایجاد یونانیوں نے کی اور پھر یہ موجودہ صنعتی دور تک پہنچی۔ تیسری صدی کے لگ بھگ ارشمیدس نے مشینری میں کئی باتوں کا اضافہ کیا۔ ایک اور یونانی مکینک ہیرو نے مزید اضافہ کیا اور مکینکل سائنس سے متعلق معلومات اپنی کتاب میکینکس میں جو تین جلدوں میں ہے جمع کر دیں۔ مشینری کا تعلق مزدوری اور روپیہ کمانے سے ہے۔ یونان کے عہد قدیم میں اکثر مزدور غلام تھے جو مفت کام کیا کرتے۔ اس لئے اس عہد میں اگر مشینری نے ترقی نہیں کی تو اس میں تعجب کی بات نہیں۔ مزید برآں یہ کہ یونانی ذہن تھیوری کا دلدادہ تھا۔ یہ لوگ تھیوری کو عملی جامہ پہنانے کے شائق نہ تھے۔ جب عربوں نے ۶۴۱ء میں مصر کو فتح کیا اور اسکندریہ پر قابض ہو گئے تو نہ کچھ یونانی تحقیقات کے مالک بھی بن گئے۔ انہوں نے ہیرو کی مذکورہ بالا تصنیف کا ترجمہ کیا اور اس میں دیئے گئے اصولوں کو دو اہم ایجادوں ، پن چکی اور ہوا کی چکی میں استعمال کیا۔ پن چکی دراصل رومیوں کے رہٹ کی ترقی یافتہ شکل تھی جس کے ذریعے ہسپانیہ اور شمالی افریقہ کے علاقوں کی زمینیں سیراب کی جاتی تھیں۔ بادچکی خالصۃً عربوں کی ایجاد ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بادچکی ۶۴۰ء میں حضرت عمرؓ کے حکم سے بنائی گئی تھی۔ کچھ صدیاں بعد ایک عرب جغرافیہ داں نے بتایا کہ بادچکی ایران میں عام تھی اور اس سے زمینوں کو سیراب کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔

ایران اور پھر افغانستان سے بادچکی پوری اسلامی دنیا میں پھیلی۔ راقم نے خود ایسی بادچکیاں ہرات میں ۱۹۷۱ء میں دیکھی تھیں جو استعمال تو نہیں ہوتی تھیں مگر بطور یادگار محفوظ رکھی گئی تھیں۔ ان بادچکیوں سے گیہوں پیسنے ، گنا بیلنے اور زمین سے پانی کھینچ کر اوپر لانے کا کام لیا جاتا تھا۔ بعد میں یہ بادچکیاں ہسپانیہ اور مراکش کے راستے یورپ میں پہنچیں اور پھیلیں۔

یہاں پر یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ جب اسلام کا ظہور ہوا یونانی اور رومن تہذیب فرسودہ اور جامد ہو چکی تھی۔ اس میں اب طاقت اور روح نہ تھی۔ دنیا کے کسی خطے میں سائنسی سرگرمیاں جاری نہ تھیں۔ عربوں نے جو قدیم تہذیب سے اکتائے ہوئے تھے قدیم علوم ٹیکنالوجی کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کو ترقی کی راہ پر ڈال دیا۔ انہوں نے عہد وسطیٰ کے علوم وفنون کو محفوظ کر کے ان کا مطالعہ کیا اور انہیں پانچ سو سال تک ترقی دیتے رہے۔ انہوں نے اس وقت کے معلوم تمام علوم کی حدود میں بے انتہا وسعت پیدا کی۔ مگر وہ ماہر علوم ہی نہ تھے ان علوم کی عملی ترویج کے شیدائی

بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے مسلمانوں نے اپنے لئے بے حد خوشحالی اور سہولتیں پیدا کر لی تھیں۔ ان ارتقا پذیر مقاصد کے حصول میں مسلمان سائنس دانوں نے وہ تجرباتی مقصدیت حاصل کر لی تھی جسے یونانی حاصل نہ کر سکے تھے انہوں نے موجودہ سائنس کے بارے میں بیکن کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کا بیڑا اٹھایا جس میں کہا گیا ہے کہ "تجربہ سے صداقت دریافت کی جائے اور پھر اس صداقت کے ذریعے نوع انسانی کے ارتقاء کو تیز تر کر دیا جائے"۔ اسلامی سائنس اور ٹیکنالوجی جب سسلی اور ہسپانیہ کے راستے یورپ میں پہنچی تو وہ عہد وسطیٰ کے خواب سے بیدار ہو گیا۔ اس طرح پہلے یورپ اور پھر روس اور امریکہ اسلامی سائنس اور ٹیکنالوجی کو مزید ترقی دے کر ستاروں پر کمندیں ڈالنے لگے۔

ماٰخذ

1. George Sarton: Lecture on Islam.
2. Dr. Osler: History of the Arabs.
3. ——— Portugal, Wharf of Europe.
4. Morris Kline: Mathematics in Western Culture
5. ——— Oxford history of technology.
6. Stanwood cabb: Islamic contribution to civilization.

نقد و تبصرہ

فہرست نسخہ ہائے خطی کتابخانہ گنج بخش، جلد اوّل و دوم

تالیف : احمد منزوی

ناشر : مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۷۸ء۔

صفحات : ۱۰۰۸ قیمت : ۱۲۰ روپے

کتاب داری کے حوالے سے کتابخانۂ گنج بخش، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد (حال راولپنڈی) اور کتاب شناسی کے حوالے سے احمد منزوی کا نام کتاب بینوں کے لئے نیا نہیں ہے۔ کتابخانہ مذکور میں مختلف زبانوں میں آٹھ ہزار سے اوپر قلمی نسخے موجود ہیں اور جناب منزوی اس وقت تک فہرست مخطوطات کی پندرہ جلدات (مستقل و مشترک) تالیف و طبع کر چکے ہیں۔ اس وقت ان کی تالیف کردہ کتابخانہ گنج بخش کے فارسی مخطوطات کی فہرست ہمارے پیش نظر ہے۔

جلد اوّل: اس میں مندرجہ ذیل علوم و فنون کی ۵۱۹ کتابوں کے ۵۸۰ ا نسخوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ (۱) تفسیر (۲) تجوید (۳) علوم قرآنی (۴) ریاضی (۵) موسیقی (۶) نجوم (۷) طبعیات (۸) کیمیا (۹) طب (۱۰) دوائرالمعارف آخر میں مؤلفین کی فہرست بھی شامل ہے۔

جلد دوم: اس جلد میں مندرجہ ذیل علوم کی ۵۶۷ کتابوں کے ۱۲۵۸ نسخوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ (۱۱) منطق (۱۲) حکمت و فلسفہ (۱۳) ملل و نحل (۱۴) کلام و عقائد (۱۵) تصوف (۱۶) اخلاق۔ آخر میں مؤلفین کی فہرست بھی ہے۔

یعنی مجموعی طور پر ان دو جلدوں میں ۱۲۷۶ کتب کے ۲۴۲ ا نسخوں کو شامل کیا گیا ہے۔ جبکہ بقیہ نہایت اہم موضوعات مثلاً انشاء، لغت، قصص، شاعری، تاریخ و تذکرہ وغیرہ پر مخطوطات کا تعارف بعد کی جلدوں میں آئے گا جو چھپ چکی ہیں۔

فاضل فہرست نگار نے کسی کتاب کے تعارف کے لئے صرف محتویات نسخہ کو ہی کافی اور معتبر نہیں سمجھا بلکہ انہوں نے دستیاب بیرونی ماخذوں سے بھی استفادہ کر کے اپنے مندرجات کو مستند بنایا ہے۔ اس طرح وہ بعض ایسی غلطیوں

کا سراغ لگانے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں جو متأخر مصنفوں اور کاتبوں نے نسخے میں تحریف کی صورت میں کی ہیں۔

محترم فہرست نگار چونکہ ایرانی الاصل ہیں اس لئے برصغیر کی بعض کتابوں پر ان کی گرفت قدرے ڈھیلی رہی ہے کتاب کا نام، مصنف اور تاریخ تصنیف کے تعیین میں بعض فروگذاشتیں سامنے آئی ہیں۔ ہم ذیل میں ان کی تصحیح کرتے ہیں۔

جلد اول:

۱۔ عدد کتاب ۲۵۔ "تفسیر سورہ فاتحہ" از شیخ نظام الدین تھانیسری۔ تفسیر کا اصل نام "ریاض القدس" ہے جو "تفسیر نظامی" کے نام سے بھی شہرت رکھتی ہے۔ اس کے مفسر ۱۰۲۴ھ میں فوت ہوئے۔

۲۔ عدد کتاب ۴۳۔ "رسالہ در تجوید قرآن" از ناشناس۔ یہ "قواعد القرآن" تالیف یار محمد سمرقندی ہے۔

۳۔ عدد کتاب ۳۰۰۔ "بیاض جواہر ینہ"۔ اسے صرف "بیاض" پڑھا جائے۔ فہرست نگار کو اس اردو و فارسی بیاض کے آغاز کی عبارت سے نام متعین کرنے میں اشتباہ ہوا ہے۔

جلد دوم

۴۔ عدد کتاب ۵۸۰ "تحفۃ الکلام"۔ از ناشناس۔ ہماری معلومات کے مطابق اس کے مصنف کا نام محمود طاہر سبجزی ہے۔

۵۔ عدد کتاب ۶۱۵۔ "ردّ وہابیان" یا "بوارق المحمدیہ"۔ از ناشناس۔ کتاب کا مکمل نام "بوارق المحمدیہ لرجم الشیاطین النجدیہ" ہے اور اس کے مصنف مولانا فضل رسول بدایونی (م ۱۲۸۹ھ) ہیں۔

۶۔ عدد کتاب ۶۱۷۔ "رسائل کریمداد" از کریمداد بن آخوند درویزہ۔ یہ رسائل خود آخوند درویزہ (م ۱۰۴۸ھ) کے ہیں جو اُن کے صاحبزادے کریم داد نے مرتب کئے۔

۷۔ عدد کتاب ۶۴۱ "قصر الآمال"۔ از رفیع الدین۔ مصنف وہی مولانا رفیع الدین مرادآبادی (م ۱۲۱۸ھ) ہیں

۸۔ عدد کتاب ۶۵۰۔ "کفایت الاعتقاد" از حسین کہ در کشمیر می زلیستہ است۔ یہ وہی محمد حسین خباز کشمیری (م ۱۰۵۲ھ) صاحب "ہدایت الاعمیٰ" ہیں۔

۹۔ عدد کتاب ۶۲۴۔ "ترجمۂ تحفۂ مرسلہ" از محمد بن شیخ فضل اللہ (بلخی؟)۔ مصنف کی نسبت مکانی برہانپور سے ہے۔ بلخ سے نہیں۔

۱۰۔ عدد کتاب ۴۳، ۔ "ثمرات المکیہ"۔ از ناشناس۔ چونکہ فہرست نگار کے پیش نظر نسخہ ناقص الاول تھا لہٰذا ان کے مندرجات نامکمل ہے۔ ہم ایک دوسرے نسخے سے اس کتاب کے کوائف کی تکمیل یوں کرتے ہیں "ثمرات المکیہ فی طریق القادریہ العالیہ" از محمد رفیع الدین بن محمد شمس الدین بتاریخ ۲۶ محرم ۱۱۸۹ھ در مکہ مکرمہ۔

۱۱۔ عدد کتاب ۸۲۰، ۔ رسالہ عرفانی از محمد بن فضل بلخی۔ یہ کوئی مستقل رسالہ نہیں، بلکہ حضرت ہجویری کی کتاب "کشف المحجوب" کے باب العلم کا ایک حصہ ہے اور جس شخص کو یہاں مصنف خیال کیا گیا ہے وہ درحقیقت کشف المحجوب میں محض ایک راوی ہے۔

۱۲۔ عدد کتاب ۸۹۸۔ شطحیات، از ناشناس۔ یہ شہزادہ دارا شکوہ قادری کی کتاب "حسنات العارفین" ہے۔

۱۳۔ عدد کتاب ۹۳۴۔ شرح فصوص الحکم۔ فہرست نگار نے وہاں شارح کے قول سے جو سبب شرح بیان لیا ہے وہ دراصل خود "فصوص الحکم" کا باعث تالیف ہے۔ البتہ زیر فہرست تحریف شدہ نسخے میں مصنف کے خواب دیکھنے کا واقعہ بجائے ۶۲۷ھ کے ۷۲۰ھ میں درج ہوا ہے۔ نسخے کے بغور مطالعہ سے سارے قصے کی تصریح ہو جاتی ہے۔

۱۴۔ عدد کتاب ۱۰۴۳ - ۱۰۴۴۔ "مقصد الاقصیٰ"۔ فہرست نگار نے کتاب کے مقدمے کا تعارف عدد ۱۰۴۳ کے ذیل میں کرا دیا ہے اور متن کو عدد ۱۰۴۴ کے نیچے لے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک ہی کتاب ہے۔

۱۵۔ عدد کتاب ۱۱۴۲۔ "اخلاق دینی" از ناشناس۔ یہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ) کی تصنیف "حقیقت الاسلام" ہے۔

۱۶۔ عدد کتاب ۱۱۴۰، ۔ "اخلاق عالم آرا" از محسن فانی۔ فہرست نگار نے مادہ "اخلاق عالم آرا" سے تاریخ لیف ۱۰۶۵ یا ۱۰۶۶ھ نکالی ہے۔ جو غلط ہے۔ اس مادے کے مجموعی اعداد (بشمول ایک عدد الف ممدودہ) ۱۰۷۰ھ بنتے ہیں۔

۱۷۔ عدد کتاب ۱۱۵۰۔ "اخلاق ناشناختہ" کے ذیل میں عدد مسلسل ۲۰۸۱ نامعلوم مخطوطہ دراصل ملا حسین کاشفی کی کتاب "اخلاق محسنی" ہے۔ اور عدد مسلسل ۲۰۸۳ کا نسخہ وہی کتاب ہے جس کا عدد کتاب ۱۱۴۱ کے ذیل میں بعنوان "اخلاق دینی" الگ احوال درج ہے۔

۱۸۔ عدد کتاب ۱۱۷۲۔ "توقیعات کسریٰ نوشیروان" از جلال الدین طباطبائی (م ۹۹۵ھ) برائے شہزادہ مراد بخش۔

شہزادہ مراد بخش ۱۰۳۳ھ میں پیدا ہوا تھا اور یہ تاریخ مصنف کی تاریخ وفات سے متناقض ہے۔ درحقیقت مذکورہ کتاب ۱۰۶۲ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔

۱۹۔ عدد کتاب ۱۱۰۵۔ "چہل باب" از ناشناس۔ یہ محمد بن محمود مستوفی کی کتاب "لباب الاخبار" ہے۔ عدد کتاب ۱۲۴۲ "لباب الاخبار" کے نسخوں سے تقابل کیا جائے۔

۲۰۔ عدد کتاب ۱۲۰۶ "مراج الابرار و منہاج الانوار" از ناشناس۔ اور عدد کتاب ۱۲۶۵ "منہاج الانوار" ایک ہی کتاب ہے جو دو مختلف جگہوں پر دو مختلف ناموں سے متعارف ہو گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زیر تبصرہ فہرست کے شائع ہونے سے متعدد ایسے آثار، مصنفین اور کاتبان سامنے آئے ہیں جو برصغیر پاک و ہند کی علمی و ثقافتی تاریخ میں نئے ناموں کا اضافہ کرتے ہیں۔ ہمیں کتابخانہ گنج بخش کے بقیہ مخطوطات کی فہارس کا بھی انتظار ہے۔ ان کے بغیر اس علاقے کی علمی تاریخ نامکمل رہے گی۔

(سید عارف نوشاہی)

گذارش

فکر و نظر کے مندرجہ ذیل شمارے ہدیۃً یا قیمۃً مطلوب ہیں:۔ ایڈیٹر فکر و نظر کے نام ارسال کر کے ممنون فرمائیں۔

اپریل ۱۹۶۵ء۔ اگست، دسمبر ۱۹۶۵ء۔ اپریل، مئی ۱۹۶۶ء۔ جنوری، فروری ۱۹۶۷ء ستمبر ۱۹۶۸ء۔

دینی مجلہ

لیتفقهوا

THAT THEY MAY GAIN UNDERSTANDING IN FAITH

شوال المکرم ۱۴۰۰ھ ☐ ستمبر ۱۹۸۰ء

ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد

نگران

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا

ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد

مدیر

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی

سالانہ چندہ سترہ روپے	ششماہی آٹھ روپے	فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

طابع و ناشر: — محمد سمیع اللہ سکریٹری ادارۂ تحقیقات اسلامی - اسلام آباد

مطبوعہ: اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پریس - پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵ - اسلام آباد

سکولوں، کالجوں اور لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

ماہنامہ **فکر و نظر** اسلام آباد

جلد ۱۸ | شوال المکرم ۱۴۰۰ھ ۔ ستمبر ۱۹۸۰ء | شمارہ ۔ ۳

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں اب تک جو اقدامات کئے گئے ہیں ان کے پیش نظر
بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ رفتہ رفتہ ہمارا ملک اسلام کے دیئے ہوئے آفاقی اصولوں پر عمل
ہو کر انسانی اخوت، مساوات اور بھائی چارے پر مبنی اسلامی معاشرہ کی برکتوں سے متمتع ہو جائے
حال ہی میں زکوٰۃ اور عشر کے نفاذ کا جو اہم قدم اٹھایا گیا ہے اس کے ذریعے پاکستان کو صحیح معنوں میں
ایک اسلامی، فلاحی مملکت بنانے میں مدد ملے گی۔ اقتصادیات کے اس دور میں اقتصادی مسائل کو جو
اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ موجودہ دنیا کا کوئی بھی نظام حیات، چاہے اس کا تعلق کسی
بھی نظریہ حیات یا مکتب فکر سے ہو انسان کے معاشی مسئلہ کو نظر انداز نہیں کرتا ہے لیکن وہ اس مسئلے کا
جو حل تجویز کرتا ہے اس سے معاشی مسئلہ اگر حل بھی ہو جائے تو اس کی جگہ کچھ نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں
اسلام نے انسان کے معاشی مسئلے کا جو حل پیش کیا ہے وہ ایک متوازن حل ہے جس کے نفاذ کے بعد یہ صورت
پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اسلام کے اصولوں کو اس کے مجموعی خاکے کے اندر رکھ کر دیکھا جائے اور
بحیثیت مجموعی ان کو عمل میں لایا جائے۔ یہی ایک صورت ہے جس سے ہم اسلامی احکام، اصول اور ضوابط
کی برکتوں سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ زکوٰۃ اور عشر کا نفاذ چونکہ ایک جزوی قدم ہے اور پاکستان میں حکومتی
سطح پر پہلی بار اس کا تجربہ کیا جا رہا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس کے وہ نتائج برآمد نہ ہوں جن کی توقع کی جا رہی
ہے۔ اس تجربے میں بعض کوتاہیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن کوتاہیوں یا خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہونے کے
اندیشے سے کسی اچھے فیصلے کو مؤخر کرنا اور ملتوی رکھنا یہ بھی قرین مصلحت نہیں۔ اصلاح کرو اور غلطی

کے مقولے پر عمل پیرا ہو کر ہم ایک نہ ایک دن اس منزل کو ضرور پالیں گے جس کے لئے پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔

صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں جس عزم و ارادے کا اظہار ایک مرتبہ نہیں بار بار کیا ہے اور اس ضمن میں وقفے وقفے سے جو عملی اقدامات کیے گئے ہیں ان کا پاکستان کے ہر طبقے اور ہر حلقے میں، بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو خیر مقدم کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ جب لوگ اسلامی اصولوں کی برکتوں سے عملاً مستفیض ہوں گے تو اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد میں پہلے سے زیادہ سرگرمی اور جوش عمل کا مظاہرہ کریں گے۔ لیکن پاکستان میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں ہونیوالی پیش رفت سے خوش نہیں ہے۔ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے اس کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ ظاہر ہے یہ لوگ جہاں تک ان کا بس چلے گا روڑے اٹکانے کی کوشش کریں گے۔ ان کی طرف سے عامۃ المسلمین کو ہوشیار اور خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ طبقہ ہر قدم پر یہ کوشش کرے گا کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا جو تجربہ کیا جا رہا ہے اسے ناکام بنا دیا جائے۔ اسلامی نظام کے قیام کے حامیوں کے لئے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ یہ حقیقت ان کے پیش نظر رہنی چاہئے کہ خدانخواستہ پاکستان میں یہ تجربہ ناکام ہو گیا تو اسلام ہی کے حق میں نہیں بلکہ مسلمانوں کے حق میں یہ ایک بہت بڑا المیہ ہو گا۔ اور پاکستان اس منزل سے بہت دور چلا جائے گا جس کے لئے اس کا قیام عمل میں آیا تھا اور جس منزل کی طرف خدا خدا کر کے ہم نے ابھی بمشکل چند قدم اٹھائے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکومت کے اہل کاروں اجتماعی تنظیموں اور مسلم عوام کو عمل کی توفیق ارزانی فرمائے اور وہ اللہ کے دیئے ہوئے بابرکت نظام کو پورا پورا نافذ کر کے اس کے ثمرات سے کماحقہ بہرہ اندوز ہوں۔ آمین!

(مدیر)

قرآن مجید اور ۱۹ کا عدد

ایک استفسار کا جواب

مولانا عبدالقدوس ہاشمی

کراچی مورخہ ۷ر شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ

۲۲ر جون ۱۹۸۰ء

بگرامی خدمت جناب محمد سمیع اللہ صاحب

سیکرٹری ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد

مکرمی! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مراسلہ نشان ۱-(۱) ۸۰ سیکرٹری - ۶۵۲ - ۸۱۲۶ مورخہ ۴ر جون ۱۹۸۰ء بہت دیر سے مل سکا۔ اس کے ساتھ مصحوبہ کاغذات بھی ملے ۔ اس سے پہلے بھی امریکہ اور ڈربن (افریقہ) سے میرے پاس "قرآن مجید اور عدد ۱۹" پہ کتابچے و اشتہارات آئے تھے میں نے ان کے جوابات دے دیئے تھے اب میں نے آپ کے مراسلہ کے بعد ان جوابوں کی نقلیں حاصل کیں۔ مشکل سے کاغذات میں مل سکیں ۔

آپ کے مراسلہ کے ساتھ جو نقول ملی ہیں وہ بھی دیکھیں، میں لیفٹیننٹ کرنل این اے اختر صاحب کے خط بنام مینجنگ ڈائرکٹر ٹیلی ویژن سے اپنے آپ کو متفق نہیں پاتا۔ یہ خط مخلصانہ طور پر لکھا گیا ہے مگر ٹیلی ویژن کے ذریعہ اس جاہلانہ مغالطہ کی اشاعت سے جاہلوں میں کچھ مزید اوہام پیدا ہوں گے اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے لئے ہم پہ ہنسی کا مزید سامان مہیا کر دے گی۔ قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت، ہدایات و ہمہ گیری کی

وجہ سے معجزہ ہے کسی ریاضیاتی نظم یا بنیاد کی بنا پر معجزہ نہیں ہے۔ کافروں کو جب قرآن مجید نے چیلنج کیا تو اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ایسی ہی ریاضیاتی بنیاد پر ایک یا دس سورہ بنا لاؤ۔ اور نہ یہ بات قابل قبول ہے کہ قرآن کا یہ کمال نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا اور نہ صحابہ کرام کو۔

یہ ۱۹ کا عدد قدیم دیومالا میں مقدس تھا کہ اس میں عدد اول یعنی ۱ اور سب سے بڑی اکائی ۹ شامل ہے۔ اس کو مدعی نبوت بابک خرمی مقتول ۲۲۲ھ اور اس کے ساتھیوں نے پھیلایا۔ پھر پچھلی صدی میں بہاء اللہ مرزا حسین علی نوری نے اسے تقدس عطا کیا۔ (دیکھئے نوٹ منسلکہ) اب بہائیوں نے اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں یہ بات امریکہ سے پھیلائی ہے۔

لوگ عجائب پسند ہوتے ہیں۔ یہودی ۷ - ۹ - ۱۲ کو مقدس کہتے ہیں، عیسائی ۱۳ کو منحوس سمجھتے ہیں اور خود مسلمانوں میں پورا نظام اعداد منحوسہ، اعداد متحابہ، اعداد متباغضہ کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ قمر در عقرب، پنچک، رجال الغیب۔ سفر چہار شنبہ منحوس، اور نہ جانے اور کتنے ہی اوہام پیدا ہو چکے ہیں۔ اب اس نئی مہم کی اشاعت سے ایک مزید واہمہ پیدا کرنے کے سوا اور کیا فائدہ ہوگا۔

دعا ہے کہ اللہ ہم کو اور آپ کو بھی اوہام سے بچائے۔

والسلام

مخلص

(عبدالقدوس ہاشمی)

اے - ۴۴۰ - بلاک ڈی - شمالی ناظم آباد کراچی ۳۳

ٹیلیفون - ۶۱۷۲۳۳

(ملاحظہ ہو منسلکہ نوٹ)

قرآن مجید اور عدد ۱۹

کوئی سال ڈیڑھ سال سے کئی کتابچے اور اشتہارات مجھے اس مضمون کے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن مجید میں ۱۹ کے عدد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور کمپیوٹر کے ذریعہ مختلف حروف کی تعداد کو جمع اور ضرب کے عمل سے یہ ثابت

ر یہ سب ۱۹ کے گرد گھومتے ہیں اور یہی قرآن مجید کی ریاضیاتی بنیاد ہے۔ یہ ریاضیاتی بنیاد قرآن مجید
ہے اور کتاب اللہ کے الہامی ہونے کی دلیل ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں کمپیوٹر کے ذریعہ اس کی تحقیق
اور وہیں سے اسے پھیلایا جا رہا ہے۔ قرآن مجید کا یہ معجزہ پچھلے چند سال کے اندر ظاہر ہوا ہے جو پہلے کسی
م نہ تھا۔

اس تحقیق کی بنیاد اس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی سورہ المدثر کی آیت ۳۰ میں جہنم پر متعین فرشتوں
د ۱۹ بتائی ہے۔ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں حروف کی تعداد ۱۹ ہے۔ اس کے بعد مختلف حروف کی تعداد
: ۱۹ کا حاصل ضرب ثابت کر کے یہ تأثر پیدا کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کا ایک ریاضیاتی نظام ہے اور وہ نظام
عدد پر قائم ہے۔

اس سلسلہ میں جتنے اشتہارات اور کتابچے ملے میں نے انہیں بہت غور کے ساتھ بار بار پڑھا، سب
دو سوالات ذہن میں آئے۔ اول یہ کہ قرآن مجید میں تو اور بہت سے اعداد مختلف آیات میں مذکور ہیں
۳-۴-۵-۶-۷-۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲- اور اسی طرح ۱۹-۲۰-۳۰-۴۰- سو- ہزار سب ہی
ہیں۔ فرشتوں کی تعداد بھی سورۃ الحاقہ، آیت ۱۷ میں حاملان عرش کی آٹھ بتائی گئی ہے۔ پھر صرف
عدد ہی کو کیوں ریاضیاتی بنیاد بتایا جا رہا ہے۔ کیا اس عدد سے کسی کی عقیدت وابستہ ہے؟ دوم
گوں نے امریکہ سے یہ آواز اٹھائی ہے وہ کون لوگ ہیں؟

س سے قبل کہ اس نظریہ کی عقلی و عملی تحلیل کی جائے، ان دونوں سوالوں کو حل کر لیا جائے تو بہتر ہے
دنیا کے مختلف علم الاصنام (میتھالوجی) میں اعداد کے اثرات کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بلکہ
نہ میں بھی جیرو وغیرہ کی تصنیفات علم الاعداد کے اثرات کو ظاہر کرتی ہیں۔ اسکندریہ اور شام سے جب
سلام کے بت پرستانہ اوہام مسلمانوں میں پھیلے تو یہ افکار مسلمانوں میں آ گئے۔ یہاں تک کہ ۷۸۶ کا عدد بجائے
ستعمال ہونے لگا۔ اور آہستہ آہستہ یہ واہمہ اتنا ترقی کر گیا کہ قرآن مجید کی ہر سورہ اور ہر آیت کے اعداد
ہونے اور ان سے تعویذوں کا کام اب بھی لیا جاتا ہے۔ ۱۹ کا عدد سب سے بڑی اکائی ۹ اور الدین

عدد ۱ کا مرکب ہے اس سے بڑی بڑی کرامات لوگوں نے وابستہ کی ہیں۔ اگرچہ مسلمانوں نے ان اوہام کو کبھی قبول نہیں کیا۔ مگر جاہل عوام چالاک پیشواؤں کے پھندوں میں کچھ نہ کچھ پھنستے رہے اور آج بھی بہت سے لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔

۲۔ اس وقت جو ۱۹ کی اہمیت قرآن مجید میں ثابت کی جارہی ہے وہ بہائیوں کی تبلیغی مساعی کی پیداوار ہے۔ کئی ہزار بہائی امریکہ میں رہتے ہیں۔ ان کے عقیدہ میں ۱۹ کا عدد پوری کائنات کا بنیادی عدد ہے اس پر سارا جہان قائم ہے انہوں نے حسابی مغالطہ دے کر مسلمانوں کو متاثر کرنے کی ایک جدوجہد کے طور پر اسے شروع کیا ہے اور ہر زبان میں اس کی اشاعت ہو رہی ہے۔

عدد ۱۹ کی برتری کا عقیدہ انہوں نے اس طرح قائم کیا ہے کہ بابی مذہب کا بانی علی محمد باب ۱۸۱۹ء میں شیراز کے شیعہ گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اور ۱۹۵۰ء میں اسے بجرم بغاوت پھانسی دی گئی۔ اس کے ماننے والے تین فرقوں میں بٹ گئے، بابی اصلی بہاء اللہ مرزا حسین علی نوری کے پیرو بہائی اور اس کے بڑے بھائی یحییٰ نوری نور ازل کے پیرو ازلی۔ علی محمد باب نے قرآن مجید کے مقابلہ میں ایک کتاب "البیان" بھی لکھی ہے اور بہاء اللہ نے بھی ایک کتاب "الاقدس" تیار کی ہے جسے بہائی قرآن مجید کے برابر الہامی مانتے ہیں۔ ان کے عقیدہ میں علی محمد باب ظہور الٰہی تھا۔ اس کا سال پیدائش ۱۸۱۹ء ہے اور اس کو جمع کیجیے تو ۱۹ کا عدد حاصل ہوتا ہے۔ ۹ + ۱ + ۸ + ۱ = ۱۹ اس عقیدہ کے بعد ساری کائنات کی ریاضیاتی بنیاد ۱۹ کو قرار دیا گیا۔ بہائیوں کی مذہبی تقویم میں ۱۹ - ۱۹ دن کے ۱۹ مہینے ہوتے ہیں۔ ۱۹ × ۱۹ = ۳۶۱ شمسی سال کے باقی چار دن کو سال کے ایام مسترقہ قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح ۳۶۵ دن پورے کر لئے گئے۔ ازلی فرقہ تو یحییٰ نور ازل کے جلد ہی وفات پا جانے کے بعد کچھ پھل پھول نہ سکا لیکن بہائی خوب پھلے پھولے۔ بہاؤ اللہ اور اس کے بعد عبد البہاء پھر عباس آفندی اور اس کے بعد شوقی ایک دوسرے کے بعد مہدی اور ملہم ہوتے رہے۔ دولت اسرائیل ان کی سرپرست ہے اور فلسطین میں مقام عکہ ان کا صدر مقام ہے۔ یہ لوگ جگہ جگہ اپنا تبلیغی مرکز "بہائی ہال" بناتے ہیں اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ

مگر خفیہ طور پہ اپنا کام کرتے ہیں۔ آگرہ میں اور دہلی میں ان کے مراکز ہیں۔ کراچی میں بزنس ریکارڈر روڈ پہ ان کا بہائی ہال ہے۔ ہر جگہ دیواروں پہ ۱۹ کا عدد لکھا ہوتا ہے۔ ہر تحریر کو ۱۹ سے شروع کرتے ہیں اور ہر شہ نشین پہ ۱۹ کا عدد نمایاں طور پہ لکھا جاتا ہے۔

اوپر کی تحریر و تحلیل سے ہم ان دو سوالوں کے جواب تو پا لیتے ہیں کہ عدد ۱۹ کا انتخاب کیوں کیا گیا اور کون لوگ اس مہم کو چلا رہے ہیں۔ رہا اس پورے نظریہ کا عملی جائزہ تو اس کے لئے کسی طویل تحریر کی ضرورت نہیں۔ ذرا غور کیجئے تو اس نظریہ میں پنہاں جہالت اور مغالطہ کھل کر سامنے آجائے گا۔

۱۔ اگر کسی کتاب میں کوئی عدد، حرف یا اعراب یکساں ٹوٹے تو کیا ایسا ہونا کتاب کو الہامی ثابت کرتا ہے؟ اگر چاول کا رنگ سفید ہے تو یہ بات زمین کے کروی ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے؟ یہ معیار کس نے قائم کیا اور دعویٰ و دلیل کے مابین منطقی تعلق کیا ہے؟

۲۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے حروف خاص طرز کتابت کی وجہ سے ۱۹ نظر آتے ہیں ورنہ اصلاً ۲۱ ہیں۔ باسم اللہ الرحمان الرحیم۔ اس میں اسم کا الف نہیں لکھا جاتا ہے اور رحمٰن اصل میں فعلان کے وزن پہ سعدان، غفران، حیران وغیرہ کی طرح رحمان ہے۔ خود قرآن مجید کی پہلی وحی میں "اقرا باسم ربک" موجود ہے۔ "سبح باسم ربک" موجود ہے۔ سب جگہ الف لکھا جاتا ہے۔ قرآن مجید آسمان سے تحریری شکل میں نازل نہیں ہوا تھا اس لئے اس کے رسم الخط سے کوئی استدلال صحیح نہیں ہو سکتا۔

۳۔ سورۃ الاعراف میں بسطہ پہ ص آواز میں عدنانی قبائل کے فرق کو ظاہر کرنے کے لئے بنا دیا جاتا ہے۔ ورنہ عربی زبان میں بصط کوئی مادہ نہیں ہے۔ یہ استدلال محض نادانی اور جہالت کا کرشمہ ہے۔

۴۔ اس طرح جمع، تفریق اور ضرب و تقسیم کر کے بیسیوں عددی عجائبات قرآن مجید میں بلکہ معمولی انسانی تصانیف میں پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً حٰمٓ کے اعداد جمل ۴۸ کو اگر سورۃ الحاقہ میں بیان کئے ہوئے عدد یعنی ۸ پہ تقسیم کیا جائے تو ۶ کا عدد برآمد ہوگا۔ اور الٓمٓ ۶ سورتوں کے اوائل میں ہے۔ قرآن مجید میں ۲۹ سورتوں پہ ۱۴ حروف تہجی بطور حروف مقطعات موجود ہیں اور یہ ۱۴ گروپ ہیں۔ ۱۴×۱۴ = ۱۹۶ اور اس عدد کو اصحاب کہف کے عدد ۷ پہ تقسیم کیجئے تو چاند کے ۲۸ لمعات کا عدد ہو جائے گا۔ اس طرح جتنے عجائبات عددی چاہیں کسی کتاب

سے نکال سکتے ہیں۔ کتنی دلچسپ ابلہ فریبی ہے کہ اس قسم کے حسابی اور عددی عجائبات کو قرآن مجید کے معجزہ یا الٰہی آسمانی ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا جائے۔ انسان طبعاً عجوبہ پسند ہوتا ہے اس لئے اچھے خاصے ذی ہوش اور تعلیم یافتہ لوگ بھی ایسی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور ابلہ فریبی کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ خدا ہم سب کو وہم سے بچائے اور بہائیوں کے اس چکر سے محفوظ رکھے۔

زیب النساء اور مورخین کی افسانہ طرازی

صوفی عبدالرشید

اگر تاریخ کے کسی دور کی عظمت کا معیار مختلف تہذیبی اور ثقافتی مظاہر ہی ہیں، تو اس اعتبار سے مغلیہ عہد کا
دور پورے برصغیر کی تاریخ کا شاندار دور کہلانے کا مستحق ہے۔ وسعت ملکی میں مغلوں کے جاہ و جلال کا سکہ جہاں پورے
صغیر میں چلتا رہا، وہاں علوم و فنون کی ترقی بھی اس عہد کا طرۂ امتیاز رہی۔ بابری خاندان کے تاجداروں نے معارف
پروری اور علم دوستی کی وہ مثال قائم کی کہ دور دراز سے علماء و فضلاء کھنچے ہوئے ان کے درباروں میں چلے آئے۔
اس کا ایک سبب جسے اکثر مورخین نے بیان کیا ہے یہ تھا کہ مغلوں نے ارباب علم و فن کی تربیت میں خزانوں کے
منہ کھول دیئے تھے۔ لیکن اس ضمن میں یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اس خاندان کے اکثر فرمانروا خود دولت
علم سے بہرہ مند تھے۔ یہی وجہ تھی کہ "آشنا سخن آشنا نگہدارد" کے مصداق ان کے دربار علماء اور اہل فن کے لئے بے پایاں
کشش کا باعث بن گئے تھے۔ حکمرانی اور کشورستانی کی مشغولیتوں کے پہلو بہ پہلو ان شہنشاہوں نے علم و ادب اور
تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ بابر نہ صرف اپنی خود نوشت میں حقیقت
نگاری، انشاء پردازی اور اسلوب کی دلآویزی کے جوہر دکھاتا ہے بلکہ ترکی شاعری میں بھی مؤلف تاریخ رشیدی
کے بقول امیر علی شیر نوائی کے بعد دوسری بڑی اہم شخصیت قرار پاتا ہے۔ جہانگیر کی تزک زبان کی سادگی و سلاست
اور بیان کی خوبی و لطافت کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ عالمگیر کے رقعات برصغیر کے فارسی ادب میں ایک منفرد
مقام کے حامل ہیں۔ ہمایوں کی زندگی کا بیشتر حصہ دربدری میں بسر ہوا اس لئے وہ باپ کی طرح دیوان کے سوا
کوئی تصنیفی کارنامہ انجام نہ دے سکا لیکن اس کی علم دوستی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی موت
کتب خانے کی سیڑھیوں سے گر کر واقع ہوئی[1]۔ اکبر اگرچہ اوائل عمر میں نامساعد حالات کے باعث رسمی تعلیم سے

بہرہ اندوز نہ ہو سکا لیکن اس کی شاہانہ فیاضیوں کے طفیل میں اگر ایک طرف برصغیر کی فضائیں شیراز و اصفہان کے جانفزا نغموں سے گونج رہی تھیں تو دوسری جانب یہاں کے در و بام علم کے نور سے جگمگا رہے تھے۔ شاہجہان کا ذوقِ جمال تاج محل ہی کی تعمیر کا باعث نہیں بنا، قدسی اور کلیم کی زمزمہ سنجیوں کو بھی زندہ جاوید کر گیا۔ اس کی علم پروری کا اندازہ کرنا ہو تو علامہ سعد اللہ خاں کے مقام سے کیجیے یا اس کی جھلک محمد صالح کنبوہ اور حمید لاہوری کے ہاں دیکھیے۔

اس خاندان کے شہزادوں میں دارا شکوہ کی تصانیف سے کون صرف نظر کر سکتا ہے؟ "سفینۃ الاولیاء" اور "سکینۃ الاولیاء" کے ساتھ ساتھ اس کا دیوان بھی بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے جس میں قدم قدم پر اس نے شاعرانہ فکر و خیال کے گلستان سجائے ہیں اور وحدۃ الوجود کے پردے میں وحدت حیات کے رموز سمجھائے ہیں۔ خواتین میں بابر کی بیٹی گلبدن بیگم کا تصنیفی شاہکار "ہمایوں نامہ" سیدھے سادے لیکن دل نشین اسلوب میں اس عہد کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے بہت سے گوشوں کی نقاب کشائی کرتا ہے۔

مغلوں کی سرپرستی میں فارسی شعر و ادب نے ایک نئی آن اور انوکھی شان پیدا کی۔ مضمون کی نزاکتیں، جذبے کی رعنائیاں، فکر کی عظمتیں اور اسلوب کی رنگینیاں برصغیر کی فارسی شاعری کو وہ رنگ و آہنگ عطا کرتی ہیں کہ ایران کی زمزمہ سنجیوں کے مقابلے میں اس کی انفرادی حیثیت کو ہم آسانی کے ساتھ جان اور پہچان سکتے ہیں۔ اس دور میں جبکہ ایران میں شاعری کا بازار قریب قریب سرد ہو چکا تھا، برصغیر میں فارسی شاعری کی حیات نو کے سامان فراہم ہو رہے تھے۔ بادشاہوں اور امراء کے دربار تو شعراء کا مرجع تھے ہی لیکن حرم سرائیں اور خلوت گاہیں بھی شعر کے سحر سے خالی نہ تھیں۔ ناخواندہ کنیزیں اور خادمائیں تک روزمرہ کی معمولی بات چیت میں مصرعے کے مصرعے موزوں کرتی چلی جاتی تھیں۔ فیضی، عرفی، نظیری، طالب، کلیم، صائب اور سلیم کی بہار آفرینیاں اور دل سوزیاں اسی ماحول میں پنپ سکیں۔ ظہوری، قدسی، غنی، ناصر علی، بیدل، غنیمت کنجاہی اور منیر لاہوری کی نکتہ سنجیاں بھی اسی فضا کی رہین منت ہیں۔

مغلوں کے عہد میں فارسی شعر و ادب نے ارتقا کے جو مراحل طے کیے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی اس خطۂ زمین کے اطراف و اکناف میں فارسی زبان و ادب سے دل بستگی کے آثار بڑے صاف، اجلے اور روشن نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود اردو شعر و ادب کی روایات میں فارسی ادب کے اثرات سے صرف نظر کسی صورت میں بھی ممکن نہیں کہ اس زبان کی پرورش و

پرداخت بھی حافظ، سعدی، رومی، فغانی، عرفی، نظیری اور صائب کے افکار کے سائے میں ہوئی۔

ادبی ماحول کی بھی شادابی و شگفتگی تھی جس میں اورنگ زیب کی چہیتی بیٹی زیب النساء نے تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ اورنگ زیب اپنے مذہبی رجحان کے باعث شاعرانہ مدح سرائی کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اور اسی سبب سے اس نے اپنے عہد میں ملک الشعرائی کا منصب ختم کر دیا تھا۔ لیکن وہ نفس شاعری کا ہرگز مخالف نہ تھا۔ تاریخ میں ایسے کئی شواہد ملتے ہیں کہ اس نے نہ صرف اچھے شعر پر خوشنودی کا اظہار کیا بلکہ کبھی کبھی خود بھی شعرگوئی کی طرف مائل ہوا۔ رقعات میں وہ موقع بموقع اساتذہ ایران کے اشعار نقل کرتا چلا جاتا ہے۔ مثنوی مولانا روم کا ایک انتخاب بھی اس سے منسوب ہے۔ وقائع نگار یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس نے ایک بیاض رکھی ہوئی تھی جس میں وہ فارسی شعراء کے پسندیدہ اشعار درج کیا کرتا تھا۔ بہرطور اگر اس کے عہد میں اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کی طرح شعراء کی پذیرائی نہ ہو سکی، تو اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ خود بھی ذوق سخن سے عاری تھا یا نفس شاعری کو مٹا دینے کے درپے تھا۔ اگر فی الواقع ایسا ہوتا تو ناممکن تھا کہ زیب النساء کے شاعرانہ جوہر اس قدر کھل کر نمایاں ہونے پاتے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ شہزادی کے ذوق سخن کی آبیاری میں خود اورنگ زیب کی تشویق کو بڑا دخل تھا۔

زیب النساء بیگم ۱۰ شوال ۱۰۴۸ھ کو دل رس[۲] بیگم کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اس کی ماں شاہنواز خان صفوی کی بیٹی تھی جو جہانگیر اور شاہجہان کے دور حکومت میں معزز عہدوں پر فائز رہا[۳]۔ زیب النساء ذرا بڑی ہوئی تو شاہی دستور کے مطابق اس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہوا۔ عالمگیری امراء میں عنایت اللہ خان ایک بڑے منصب کا مالک تھا اس کی والدہ حافظہ مریم ایک تعلیم یافتہ خاتون تھی۔ زیب النساء کی تعلیم کے لئے عالمگیر کی نظر انتخاب اس پر پڑی۔ شہزادی نے اس معزز خاتون کے زیر تربیت مختصر سی مدت میں نوشت و خواند کے علاوہ قرآن مجید بھی حفظ کر لیا۔ جس کے صلے میں عالمگیر نے تیس ہزار اشرفیاں بطور انعام عطا کیں[۴]۔ شہزادی نے تعلیم و تربیت کی بقیہ منازل بڑی خوش اسلوبی سے طے کیں اور علوم عربی و فارسی میں مہارت تامہ بہم پہنچالی۔ علم و ادب سے اس کے ذوق و شغف نے یہ صورت پیدا کر لی کہ اس عہد کے جید علماء و فضلاء اس کی سرکار سے وابستہ رہنے لگے۔ اس کی کچھ تفصیل ساقی مستعد خان سے سنئے۔

" شاہزادی ہنر پرور و علم شناس تھیں اور ہمیشہ کتابوں کے جمع کرنے اور نیز جدید تصنیف و تالیف کو جاری رکھنے میں کوشاں رہتی تھیں۔ شاہزادی کا کتب خانہ ہر حیثیت سے نادر الوجود تھا۔ علماء و فضلاء اور خوشنویسوں کا ایک

گروہ اس کی سرکار سے فیض یاب ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ ملا صفی الدین اردبیلی نے شاہزادی کے حکم سے تفسیر کبیر کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا جو "زیب التفاسیر" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب کے علاوہ اور دیگر رسائل بھی تقدس مآب کے نام نامی سے معنون ہوئے۔[۵] علامہ شبلی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

"تمام تاریخیں اور تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ زیب النساء نے عربی اور فارسی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی حاصل کی تھی اور بڑے بڑے علماء وفضلا اس کی خدمت میں رہتے تھے۔"[۶]

شہزادی کے علم وفضل کا تذکرہ کرتے ہوئے آیت اللہ زادہ یزدی حاج سید محمد رضا طباطبائی "بزم ایران" میں لکھتے ہیں۔

"زیب النساء دختر عالمگیر پادشاہ ہندوستان است و در ہندوستان کمتر زنی مانند او دارای کمالات وفضل و دانشہای گوناگون است"[۷]۔

حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی کی رائے بھی سن لیجئے۔

عصمت میں لاثانی، ذہن میں یادگار خاقانی، فصاحت میں سحبان زمان، صنائع بدائع میں متشنائے جہان"[۸]۔

شہزادی کی علمی لگن کا یہ عالم تھا کہ جہاں کہیں وہ سن پاتی تھی کہ کسی مصنف نے کوئی عمدہ کتاب تصنیف کی ہے فوراً اسے اپنی سرکار میں طلب کر کے کتاب اپنے کتب خانے کے لئے حاصل کر لیتی تھی۔ اس ضمن میں نادر العصر استاد احمد معمار لاہوری کے پوتے اور لطف اللہ مہندس کے بیٹے ملا امام الدین ریاضی کی یہ تحریر ملاحظہ فرمایئے۔

"اما بعد چنین گوید افقر عباد اللہ الغنی امام الدین الریاضی بن لطف اللہ المہندس اللاہوری ثم الدہلوی کہ در خلال ازمنہ تحصیل در آوانہ اکمال وتکمیل قواعد چند کہ اساس علم البیان رفیع البیان است تحریر نمود۔ ولیکن بسبب اشتغال بعض امور ماموره نقل آن از مسوده ببیضہ مقتضا، وقت نمی نمود۔ تا فی الحال یعنی سن الف ومائۃ سبع ہجری مطابق سن سی جلوس امیر کبیر بسیار بخش، کم پذیر، اورنگ زیب بہادر عالمگیر، این معنی بعرض جناب عالیجاہ مآب، بادشاہزادہ، ذوالقدر الرفیع، فیاض جہانیاں، ملکہ دوران، حافظ قرآن، قرۃ العین خلیفۃ الرحمٰن، نواب قدسیۃ القاب، زیب النساء بیگم، سلمہا اللہ تعالیٰ وابقیٰ ظلال رافتہا علی العالمین، خصوصاً رسید۔ حکم جہان مطاع عالم مطیع شرف صدور وعز ورود بخشید کہ آں را مرتب ومہذب سازد تا بشرف مطالعہ لامع طلع مشرق باشراقات

از الٰہی مشرف شود، فان وقع فی حیز القبول فھو المنتہی المقصود و اقصی المأمول ۔ لہٰذا سمعاً و طاعۃً باینساں ایں حکم پرداختہ، مہذب و مدوّن ساختہ، بہ "بیانیہ" موسوم نمود(۹)۔"

شہزادی علوم متداولہ کے علاوہ فن خطاطی میں بھی دسترس رکھتی تھی۔ چنانچہ ساقی مستعد خان کے بقول نسخ نستعلیق اور شکستہ بڑی خوبی کے ساتھ تحریر کرتی تھی۔

زیب النساء کے اساتذہ میں ملا سعید اشرف ماژندرانی کا نام خاص طور سے نمایاں ہے۔ وہ عالمگیر کے آغاز جلوس میں ایران سے برصغیر آئے۔ بادشاہ نے انہیں زیب النساء کی تعلیم کا فریضہ تفویض کیا۔ اس وقت شہزادی کی عمر اکیس برس کی تھی۔ ملا اشرف شاعر بھی تھے۔ زیب النساء میں شعر گوئی کا ملکہ فطری تھا، ملا اشرف کی تربیت نے اسے اور بھی نکھار دیا اور شہزادی باقاعدہ طور پر شعر کہنے لگی۔ نظم و نثر میں وہ ملا صاحب ہی سے اصلاح لیتی تھی تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ تیرہ چودہ برس تک جاری رہا تا آنکہ ملا صاحب کو وطن اور عزیزان وطن کی یاد ستانے لگی۔ انہوں نے شہزادی کی خدمت میں ایک درخواست قصیدے کی صورت میں پیش کی۔ جس میں وطن کو مراجعت کی خواہش کا یوں اظہار کیا۔

یک بار از وطن نتوان برگرفت دل	در غربتم اگرچہ فزون است اعتبار
پیش تو قرب و بعد تفاوت نمی کند	گو خدمت حضور نباشد مرا شعار
نسبت چو باطنی است چہ دہلی چہ اصفہان	دل پیش تست من چہ بہ کابل چہ قندھار

استاد کہن سال کی یہ درخواست شہزادی کے حضور میں پذیرا ہوئی اور وہ گرانقدر صلے اور انعام کے ساتھ عازم وطن ہوئے۔

شہزادی نے ساری عمر ناکتخدائی میں بسر کی۔ مورخین نے اس کے مختلف اسباب بتائے ہیں جن میں تضاد ہے۔ اس لئے کسی ایک رائے کو حتمی اور قطعی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جیسی ڈنکن ویسٹ بروک Jessie Duncan Westbrook نے دیوان آف زیب النساء کے تعارف میں لکھا ہے کہ شہزادی کی نسبت خود شاہجہان نے اس کے عمزاد اور دارا شکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ سے ٹھہرائی تھی۔ لیکن دارا سے دشمنی کے باعث اورنگ زیب شادی پر رضامند

نہ تھا۔ چنانچہ اس نے سلیمان شکوہ کو زہر دلوا دیا۔ اسے انگریز ذہن کی اختراع کہنا چاہئیے کہ معاصر تاریخیں اس باب میں سکوت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اسی محترم خاتون نے ایرانی شہزادے مرزا فرخ کا واقعہ بھی بیان کیا ہے جو زیب النساء سے ملاقات کے لیے خود اسی کی دعوت پر دہلی آیا[۱۱]۔ یہ واقعہ بھی ان سنی سنائی روایات پر مبنی ہے جنہیں جیسی ڈنکن ویسٹ بروک نے "دیوان آف زیب النساء" کے ابتدائیے میں اکٹھا کر دیا ہے اور جو بہرحال ثبوت کی محتاج ہیں۔

ڈاکٹر سدارنگانی اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

"برخی برآنند کہ چوں شاہزادہ خانم بسیار زیرک و از استعداد فطری و عالی سخن سرائی بہرہ مند بود اصلاً حاضر نبود شخصی را برای ہمسری قبول کند کہ در استعداد ذہنی ہمپایہ اش نباشد۔ بنابر ایں عمر خود را بتحصیل علم و ہنر و معاشرت با دانشمندان و سخن گویان گذرانید[۱۱]"

علامہ شبلی نے اس کی کیفیت یوں بیان کی ہے۔

"زیب النساء نے شادی نہیں کی۔ عام طور پر مشہور ہے کہ سلاطین تیموریہ لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے۔ اس غلط روایت کو یورپین مصنفوں نے بہت شہرت دی ہے اور اس سے ان کو شاہی بیگمات کی بدنامی پھیلانے میں بہت مدد ملی ہے۔ لیکن یہ قصہ ہی سرے سے بے بنیاد ہے۔ خود عالمگیر کی دو بیٹیاں زبدۃ النساء بیگم اور مہر النساء بیگم سپہر شکوہ اور ایزد بخش (پسر شہزادہ مراد) سے بیاہی تھیں۔ چنانچہ مآثر عالمگیری میں دونوں شادیوں کی تاریخیں اور مختصر حالات لکھے ہیں اور خاتمہ کتاب میں بھی اس کا ذکر کیا ہے[۱۲]"

اس بارۂ خاص میں لوگ کچھ بھی کہیں، اس کا اصل سبب شہزادی کا علمی انہماک اور متصوفانہ مزاج ہے۔ شہزادی کی عصمت و عفت اور پاکدامنی و نیک نفسی پر تمام معاصر تاریخیں اور تذکرے گواہ ہیں۔ اورنگزیب کو حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصومؒ سے خاص نسبت ارادت تھی۔ چنانچہ وہ ان سے بیعت بھی تھا۔ متعدد شہزادے اور امراء بھی سرہندی بزرگوں سے عقیدت رکھتے تھے۔ زیب النساء کو بھی اس خاندان سے روحانی وابستگی تھی۔ حضرت خواجہ محمد معصومؒ کے فرزند حضرت محمد نقش بند ثانیؒ کے متعدد مکتوبات اس کے نام پائے جاتے ہیں[۱۳]۔ جن میں انہوں نے اسے "بادشاہ زادہ پردہ نشین سرادقات عصمت و عفت و

عظمت ابہت" اور "فاطمۂ زمان" کے القاب سے یاد کیا ہے۔ یہ شاہی دباؤ نہیں، امر واقعہ ہے، ورگرنہ تاریخ شاہد ہے کہ خاندان سرہند کے بزرگ کبھی شاہانہ جاہ وجلال کے سامنے نہیں جھکے۔ اس تحریر کے مقابلے میں وہ بے سروپا روایات کوئی حقیقت نہیں رکھتیں، جن میں زیب النسا اور عاقل خان کے معاشقوں کی تفصیلات بڑے مزے لے کر بیان ہوئی ہیں اور جن میں ناصر علی سرہندی کو بھی شہزادی کے عشاق کی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔ لیکن ان تمام روایات پر تکیہ کرنے والوں نے دانستہ یا نادانستہ اس امر کو فراموش کر دیا کہ وہ اورنگ زیب کی بیٹی تھی جس کی سخت گیری تاریخ میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ یہ روایات بذات خود ایک دوسرے کی نفی کر رہی ہیں۔ مثال کے طور پر عاقل خان کے دیگ میں جلائے جانے کا واقعہ سنیئے جسے جیسی ڈنکن ولیسٹ بروک نے بڑے شدومد سے بیان کیا ہے۔

عاقل خان خفیہ طور پر زیب النسا سے ملنے دہلی آیا۔ باغ میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اورنگ زیب کو پتہ چلا تو وہ فوراً وہاں آپہنچا۔ مشکل یہ تھی کہ عاقل خان کو کہاں چھپایا جائے۔ بالآخر وہیں قریب پڑی ہوئی دیگ میں وہ چھپ گیا۔ بادشاہ کے دریافت کرنے پر شہزادی نے بتایا کہ دیگ میں گرم کرنے کو پانی رکھا ہوا ہے جس پر بادشاہ نے حکم دیا کہ دیگ چولہے پر چڑھا دی جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ زیب النسا کو اپنے عاشق سے زیادہ اپنی آبرو کا خیال تھا۔ چنانچہ وہ دیگ کے قریب آئی اور سرگوشی میں کہا کہ "اگر تم میرے عاشق صادق ہو تو لب بستہ رہو۔ دیکھنا میری عزت و آبرو پہ حرف نہ آنے پائے"! بیچارہ عاقل خان اس کی عزت کی خاطر دیگ میں جل بھن گیا۔

اسی سے ملتا جلتا واقعہ ڈاکٹر برنیئر کی زبانی سنیئے۔ وہ شاہجہان کی بیٹی جہاں آرا بیگم کے معاشقوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"کہتے ہیں کہ بیگم صاحبہ اگرچہ محل سرا میں حسب معمول محصور رہتی تھی اور محل کی اور مستورات کی طرح اس کی نگہبانی بھی ہوتی تھی۔ مگر مخفی طور سے اس کے پاس ایک نوجوان شخص کی آمد و رفت ہو گئی جو اگرچہ کوئی خاندانی آدمی نہ تھا مگر حسین بہت تھا۔ لیکن ظاہر ہے اس بات کا سہیلیوں اور محافظوں سے مخفی رہنا ممکن نہ تھا۔ اور جب کہ عورتیں بیگم صاحبہ کے رشک وحسد سے پہلے ہی جل رہی تھیں تو محل کی اکثر خواصوں پر اس بھید کا کھلنا لازمی تھا۔ الغرض شاہجہان بھی بیگم صاحبہ کی خطا و لغزش سے واقف ہو گیا اور حقیقت حال معلوم کرنے کے خیال سے ناگہاں محل میں چلا گیا۔

چونکہ بادشاہ کے آنے کی خبر بیگم صاحبہ کو جلدی نہ مل سکی کہ وہ اس شخص کو کسی مناسب جگہ چھپا دیتی اس لئے مجبوراً اسے اپنے خوف زدہ جوان عاشق کو حمام کی ایک بڑی دیگ میں چھپانا پڑا۔ اس واردات پر بادشاہ کے چہرے سے نہ تو کچھ تعجب ہی کے آثار ظاہر ہوئے اور نہ کچھ غصہ اور ناخوشی ہی معلوم ہوئی بلکہ بیٹی سے معمولی باتیں کرتا رہا۔ لیکن کسی قدر بات چیت کے بعد کہا کہ معلوم ہوتا ہے تم نے آج حسب معمول غسل نہیں کیا۔ حمام کرنا چاہیئے اور خواجہ سراؤں کو حکم دیا کہ دیگ کے نیچے آگ جلائیں اور جب تک کہ انہوں نے اسے یہ یقین نہ دلا دیا کہ وہ قسمت کا مارا جل کر خاک ہو گیا ہے وہاں سے نہ ہلا۔[۱۵]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعے کو کس سے منسوب کیا جائے، پھوپھی سے یا بھتیجی سے؟ آیا یہ اورنگ زیب کے عہد کا واقعہ ہے یا شاہجہاں کے دور کا؟ داستان سرائی برنیئر نے بھی کی ہے اور منوچی نے بھی۔ مگر حقیقت کہاں تلاش کی جائے؟ مآثر الامرا اور مآثر عالمگیری وغیرہ میں اس دور کے امرا میں صرف ایک عاقل خان کا ذکر ہوا ہے جو اورنگزیب کا شہزادگی کے زمانے سے مصاحب تھا۔ جس کا اصل نام میر عسکری تھا اور جو سادات خواف (خراسان) سے نسبی تعلق رکھتا تھا۔ عالمگیر نے اس کے حسن کارکردگی سے خوش ہو کر اسے عاقل خان کا خطاب دیا تھا۔ وہ شیخ برہان الدین راز الٰہی کا مرید تھا اور اسی نسبت سے رازی تخلص کرتا تھا۔ فارسی نثر اور نظم میں متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں جن میں "واقعات عالمگیری" (نثر) اور دو مثنویاں "مہر و ماہ" اور "شمع و پروانہ" بڑی شہرت رکھتی ہیں۔ غزلوں کا ایک دیوان بھی مرتب کیا۔ تذکروں میں اس کے اشعار اکثر مل جاتے ہیں۔ اس کا ایک شعر بہت مشہور ہے زیب النساء اور اورنگ زیب کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے غبار خاطر میں بھی نقل کیا ہے۔

عشق چہ آسان نمود آہ چہ دشوار بود   ہجر چہ دشوار بود یار چہ آسان گرفت

۱۰۹۱ھ میں اسے دہلی کی صوبیداری تفویض ہوئی۔ آخر عمر میں بادشاہ کے حضور میں ترک منصب کی درخواست گذاری جسے منظور کر لیا گیا۔ خود اورنگ زیب کی تحریر میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے۔

"جواب عرضی عاقل خان صوبہ دار دہلی کہ در باب ترک منصب نوشتہ صادر شدہ۔ حقوق خدمت ہای سابق مدنظر داشتہ ہرگاہ گوشۂ خاطر خود را کہ معدن لطف و مخزن عنایت است بآن فدوی بردہ باشم۔ کلام گوشہ بہ

ازیں خدمت خواہند یافت۔ باوجود ایں عنایت و لطف بے اندازہ اگر بر ترک و گوشہ نشینی راضی اند، التماس آن قدیم الخدمت قبول خواہم کرد و دوازدہ ہزار روپیہ سالیانہ مقرر خواہد شد۔"(۱۶)

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ عالمگیر کی نگاہوں میں عاقل خان کس قدر و منزلت کا مالک تھا! عاقل خان نے ۱۱۰۷ھ میں دہلی میں وفات پائی۔ تمام معاصرین نے اس کے اخلاق و خصائل کی تعریف کی ہے۔ صاحب مآثرالامراء کے بقول وہ نہایت مخیر اور کریم الصفات تھا۔(۱۷) ساقی مستعد خان نے اس کی وفات کے ذیل میں لکھا ہے کہ وہ صاحب خیر و توفیق نیز پسندیدہ خصائل کا مجموعہ تھا۔(۱۸)

اگر جیسی ڈنکن ویسٹ بروک کی مراد اسی عاقل خان سے ہے تو زیب النساء سے اس کا معاشقہ محض افسانہ طرازی ہے۔ اور اس کے دیگ میں جلائے جانے کا واقعہ تاریخ کا ایک بہت بڑا جھوٹ ہے۔ جسے سچا ثابت کرنے کی کوئی بھی کوشش بارآور نہیں ہو سکتی۔ اسی سلسلے میں "جیسی" کے بیان کئے ہوئے دوسرے واقعات پر بھی ایک نظر ڈالئے۔

لاہور میں عاقل خان اور زیب النساء ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ تاآنکہ اورنگ زیب کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ وہ اس وقت دہلی میں تھا۔ یہ سنتے ہی لاہور پہنچا۔ وہ جلد جلد اس کی شادی کر کے معاملہ رفع دفع کرنا چاہتا تھا۔ زیب النساء نے انتخاب کی اجازت چاہی اور اس مقصد کے لئے مختلف لوگوں کی تصاویر منگوائی گئیں۔ اس نے عاقل خان کے حق میں رائے کا اظہار کر دیا۔ اورنگ زیب نے اسے بلاوا بھیجا۔ لیکن عاقل خان کے رقیبوں میں سے کسی دل جلے اور مایوس شخص نے اسے لکھا کہ" بادشاہ کی بیٹی کا عاشق ہونا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اورنگ زیب تمہارے کرتوتوں سے واقف ہے۔ جونہی تم دہلی پہنچو گے تمہیں یہ محبت بڑی مہنگی پڑے گی"۔ عاقل خان نے سوچا کہ بادشاہ انتقام لینے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ مگر افسوس کہ زیب النساء کا عاشق بزدل ثابت ہوا۔ اس نے شادی سے انکار کر دیا اور ملازمت سے مستعفی ہو گیا۔ یہ سن کر زیب النساء بڑی مایوس ہوئی اور اس کے سینے میں عاقل خان کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اسی عالم میں اس نے کہا۔

شنیدم ترک خدمت کرد عاقل خان بہ نادانی

عاقل خان نے اس کے جواب میں کہا۔

چہ را کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

لیکن وہ خفیہ طور پہ دہلی آیا تاکہ زیب النساء سے ملاقات کر سکے اور پھر دیگ میں جلنے کا واقعہ ظہور میں آیا۔

اب سلسلہ وار واقعات پر نظر ڈالئے۔

(۱) عاقل خان آخر عمر میں ملازمت سے مستعفی ضرور ہوا تھا لیکن وہ اس وقت دہلی کا صوبہ دار تھا لاہور کا نہیں۔

(۲) وہ طبعی موت مرا تھا، دیگ میں جل کر نہیں۔

(۳) عالمگیر اس کی اس حد تک قدر و منزلت کرتا تھا کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی بادشاہ کی طرف سے اسے بارہ ہزار روپے سالانہ پنشن ملتی رہی۔

(۴) موت کے وقت وہ انتہائی بوڑھا ہو چکا تھا اور عمر کی اس منزل پہ تھا جہاں صرف یاد خدا ہی انسان کا سب سے بڑا سہارا ہو سکتی ہے۔

(۵) مورخین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس کی وفات ۱۱۰۷ھ میں ہوئی۔ زیب النساء کی ولادت کا سال ۱۰۴۸ھ ہے۔ اس اعتبار سے عاقل خان کی وفات کے وقت اس کی عمر انسٹھ برس ہوتی ہے۔ اگر عاقل خان دیگ میں جلایا گیا ہے تو یہ واقعہ ۱۱۰۷ھ کا ہو سکتا ہے۔ کیا انسٹھ برس کی عمر میں شہزادی شادی کا تصور کر سکتی ہے اور اس طرح جس طرح جیسی نے بیان کیا ہے؟

(۶) تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عاقل خان شہزادگی کے زمانے سے عالمگیر کا مصاحب تھا۔ اس اعتبار سے وہ قریب قریب بادشاہ کا ہم عمر تھا۔ زیب النساء کے ساتھ اس کے معاشقے کا خیال کسی فاسد ذہن ہی میں آ سکتا ہے۔

اب ذرا وہ واقعات بھی دیکھتے جائیے جو بعض دوسرے لکھنے والوں نے اپنی تحریروں میں دھرائے ہیں اور جن کے درجہ استناد پہ خود انہیں بھی شک ہے۔ "زنان سخنور"[191] کے فاضل مولفین نے مختلف تذکروں سے ایسے واقعات نقل کئے ہیں اور شاید انہی کی پیروی میں ڈاکٹر سدا رنگانی نے بھی اپنے مقالے میں انہیں جگہ دینا ضروری سمجھا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ رائے بھی ظاہر کی ہے۔

"یکصدہ داستان وقصہ در بارہ مخفی وجود دارد کہ اغلب آن ھا محقق و موثق بنظر نمی آید از جملہ افسانہ ہا کہ پیرامونِ معاشقہ وی با عاقل خان رازی مشہور است"۔[20]

جناب حسنین کاظمی نے بھی اپنے فارسی مقالہ میں ان واقعات کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے۔

"اینگونہ داستان ہای پوچ مہمل و دور از حق و حقیقت ساختہ و پرداختہ دشمنان آن خانوادہ می باشد کہ می خواستند ازیں راہ انتقام خود را گرفتہ باشند"۔[21]

ان قصوں سے عاقل خان کے کردار پر بھی حرف آرہا ہے۔ مثلاً عاقل خان نے زیب النساء سے اشعار کی صورت میں اپنی دلی خواہش کا یوں اظہار کیا ہے۔

بلبل رویت شوم گر در چمن بنیم ترا — میشوم پروانہ گر در انجمن بنیم ترا
خود نمائی می کنی اے شمع محفل خوب نیست — من ہمی خواہم کہ در یک پیرہن بنیم ترا

اس کے جواب میں شہزادی نے اسے لکھ بھیجا۔

بلبل از گل بگذرد چون در چمن بیند مرا — بت پرستی کی کند گر برہمن بیند مرا
در سخن مخفی شدم مانندِ بو در برگِ گل — ہر کہ دارد میل دیدن در سخن بیند مرا

لطف یہ کہ یہ واقعہ شہزادہ فرخ سے بھی منسوب ہے اور "عیسیٰ" نے راز و نیاز کی اس خیالی داستان کا ایک ہیرو مشہور شاعر ناصر علی سرہندی کو بھی بنا دیا ہے۔ عجیب تر یہ کہ زیب النساء سے منسوب یہ دو شعر قطعات و رباعیات کے ذیل میں "دیوان مخفی" میں بھی آگئے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر نہ زیب النساء کے ہیں نہ مخفی کے۔ ان کا مصنف شاہجہانی عہد کا معروف طبیب اور شاعر "حکیم حاذق" تھا جو مشہور اکبری نو رتن حکیم ہمام کا بیٹا تھا۔ پہلا شعر منشی محمد دین فوق نے "مزارات الشعراء"[22] میں نقل کیا ہے۔ ان کے ہاں شعر نمبر ۱ کی یہ صورت ہے۔

بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا — بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا[23]

دوسرا شعر محمد صالح کنبوہ نے اپنی شہرہ آفاق تاریخ "عمل صالح" میں حکیم حاذق کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے انتخاب کلام کے ذیل میں درج کیا ہے۔ "عمل صالح" میں یہ شعر یوں آیا ہے۔

در سخن پنہاں شدم مانند بو در برگِ گل ‎ ‎ ‎ ‎ میل دیدن ہر کہ دارد در سخن بیند مرا[۲۴]

ان شواہد کی روشنی میں وہ بہت سے واقعات جو ان دو شعروں کے حوالے سے "زیب النساء" کی "داستانِ عشق" کو اجاگر کرنے کے لئے مختلف لوگوں نے بیان (یا اختراع) کئے ہیں، قطعاً بے حقیقت ثابت ہوتے ہیں۔ انہی میں معلوم شد کہ زن است والا افسانہ بھی شامل ہے۔ مزے کی بات یہ ہے یہاں وہ احتیاط بھی ملحوظ نہیں رکھی گئی جس کا پرانے وقتوں میں ارباب ذوق ہمیشہ خیال کیا کرتے تھے یعنی مختلف اصناف سخن کا باہمی امتیاز۔ یہ دو شعر غزل کے ہیں مگر انہیں دیوان مخفی میں[۲۵] رباعیات و قطعات کے ذیل میں درج کیا گیا ہے۔ "زیب النساء" پر لکھنے والوں نے بھی انہیں رباعی قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ رباعی کے مخصوص وزن میں تو کجا سرے سے بحر ہزج میں بھی نہیں۔

ع۔ ‎ ‎ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اسی طرح عاقل خان کی طرف سے بھیجا ہوا معما

آں چیز کدام ست.......... اور زیب النساء کا جواب

آں چیز عماں است ...... کوئی اصلیت نہیں رکھتا۔ جو شخص مغلوں کے دور کے آداب کا تھوڑا بہت علم بھی رکھتا ہے اس کی نظر میں اس طرح کے واقعات محض جھوٹ کا پلندہ ہیں۔

اسی نوع کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک بار زیب النساء نے ناصر علی سرہندی کو ایک مصرع لکھ بھیجا کہ اس پہ گرہ لگائے۔ ناصر علی نے اس پہ گرہ لگائی جس میں ابتذال تھا۔ زیب النساء سن کر سخت برہم ہوئی اور جواب میں یہ شعر کہا۔

"ناصر علی بنام علی بردہ ای پناہ ‎ ‎ ‎ ‎ ورنہ بہ ذوالفقار علی سر بہ یدمست

اس کی حقیقت یوں بھی کھل جاتی ہے کہ یار لوگوں نے یہ واقعہ کلیم کاشی ملک الشعرائے شاہجہانی سے بھی منسوب کیا ہے اور "زنانِ سخنور" کے مولفین نے اس پہ یہ حاشیہ بھی چڑھایا ہے کہ یہی واقعہ کلیم[۲۶] کاشی کے برصغیر سے نکل جانے کا سبب بن گیا۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے ؟

بات صرف اتنی ہے کہ زیب النساء بلا کی ذہین، نکتہ سنج اور بدیہہ گو تھی۔ اس کی انہی طبعی خصوصیات کو لے کر لوگ افسانے پہ افسانہ تراشتے چلے گئے۔ قصے کی دلچسپی تو اس سے ضرور بڑھی مگر تاریخ مسخ ہو گئی۔ رہا مغربی ذہن تو اس

نے اکثر انہی قصوں کو تاریخ کا رنگ دے کر پیش کیا ہے، کہ استعماری عزائم کی تکمیل کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے۔

زیب النساء کو آخر عمر میں قید و بند کی صعوبتیں سہنا پڑیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شہزادہ اکبر جسے راجپوتانے کی مہم پر بھیجا گیا تھا بعض لوگوں کے بہکاوے میں آکر باغی ہوگیا۔ زیب النساء اور اکبر ایک ہی ماں کے بطن سے تھے اور دونوں بہن بھائیوں میں بڑی محبت تھی۔ باوجود بغاوت کے اکبر اور زیب النساء میں مراسلت جاری رہی جیسا کہ ساقی مستعد خان نے لکھا ہے۔ شہزادہ اکبر کے نام زیب النساء کے خطوط پکڑے گئے جس کے نتیجے میں اس پر عتاب شاہی نازل ہوا۔ مال و اسباب کے علاوہ چار لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ بھی بند ہوگیا۔ اور شہزادی کو قلعہ سلیم گڑھ میں قید کر دیا گیا۔[۲۷] لیکن جلد ہی اس کی بے گناہی ثابت ہوگئی اور عفو قصور کر دیا گیا۔[۲۸] "مغل رول ان انڈیا" کے مصنفین ایس۔ایم ایڈورڈز (S.M. Edwardes) اور ایچ۔ایل۔او۔گیرٹ (H.L.O. Garettee) کا یہ خیال درست نہیں کہ صرف موت ہی اس قید سے اس کی نجات کا باعث بنی۔[۲۹] واقعہ اسیری ۱۰۹۱ھ میں پیش آیا جب کہ ۱۰۹۴ھ میں زیب النساء بادشاہ کی ملاقات کے لئے دکن میں حاضر ہوئی۔ شہزادہ محمد کام بخش، سیادت خان اور کامگار خان نے شہزادی کا استقبال کیا۔[۳۰]

زیب النساء کا انتقال ۱۱۱۳ھ (مطابق ۴۶ جلوس عالمگیری) میں دہلی میں ہوا۔ اورنگ زیب اس وقت دکن میں تھا۔ یہ خبر جب اس تک پہنچی تو بقول ساقی مستعد خان دختر نیک اختر کی دائمی مفارقت کے صدمے سے قلب مبارک پر اندوہ و الم کے بادل چھا گئے اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوئے۔ لیکن حضرت نے صبر فرمایا اور سید امجد خان، شیخ عطا واللہ اور حافظ خان کے نام خیرات و صدقات جاری کرنے اور مرحومہ کا روضہ تعمیر کرانے کے احکام جاری فرمائے۔ ملکہ مرحومہ صاحبۃ الزمانی کے باغ سی ہزاری میں پیوند خاک کی گئیں۔[۳۱]

جیسی ڈنکن ویسٹ برُوک نے "دیوان آف زیب النساء" کے تعارف میں لکھا ہے کہ شہزادی کی وفات ۱۶۸۹ء میں واقع ہوئی اور وہ اپنی ہی وصیت کے مطابق لاہور کے قریب نواں کوٹ میں مدفون ہوئی۔ اسے بھی ان چند در چند اغلاط میں تصور کیجئے جو اس باب میں جیسی سے سرزد ہوئیں۔ صاحب مآثر عالمگیری کا بیان آپ کی نظر سے گذر چکا اس نے شہزادی کا انتقال ۱۱۱۳ھ میں بتایا ہے جو سن عیسوی کے اعتبار سے ۱۷۰۲ء سے مطابقت رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شہزادی کا انتقال دلی میں ہوا اور اسے وہیں باغ سی ہزاری میں سپرد خاک کیا گیا۔ لیکن جیسی اسے نواں کوٹ میں مدفون بتاتی ہے۔

برطانوی دور اقتدار میں زیب النساء کا مقبرہ گرا دیا گیا اور وہاں سے راجپوتانے کو ریلوے لائن گزاری گئی۔[۳۲]

زیب النساء اور دیوان مخفی

اب رہا یہ مسئلہ کہ زیب النساء نے شعر و سخن کے میدان میں کیا کارنامے انجام دیئے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں کہ وہ شاعرہ تھی لیکن اس کا تخلص کیا تھا نیز جو مجموعہ دیوان مخفی کے نام سے متداول و مروج ہے آیا وہ اسی کا ہے ؟ اس سلسلے میں تحقیق و تفتیش نے بہت سے عقدے وا کر دیئے ہیں۔ معاصر تاریخوں میں زیب النساء کے علمی معمولات اور ادبی مشاغل پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن کہیں بھی اس امر کا سراغ نہیں ملتا کہ وہ مخفی تخلص کرتی تھی۔ بعد کے تذکرہ نگاروں نے اس کے نام کے ساتھ مخفی کا اضافہ کر دیا اور یار لوگ اسے لے اڑے اور اتنی شہرت دی کہ اس کے نام کے ساتھ اس تخلص کا لکھنا گویا لازمی ہو گیا۔ یہاں علامہ شبلی کی رائے ملاحظہ فرمایئے :

"عام طور پر مشہور ہے کہ وہ مخفی تخلص کرتی تھی اور دیوان مخفی جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے، اسی کا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں، کسی تاریخ یا تذکرہ میں اس کے تخلص یا دیوان کا تذکرہ نہیں"۔[۳۳]

یہ تو تھی تخلص کی بات، رہا دیوان تو اس کے بارے میں علامہ شبلی کے مذکورہ بالا بیان کے ساتھ درج ذیل اقتباس بھی قابل غور ہے۔

"اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ شاعرہ تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام ضائع ہو گیا"۔[۳۴]

احمد علی سندیلوی نے اپنے مشہور تذکرے "مخزن الغرائب" میں زیب النساء کے ضمن میں لکھا ہے۔

"اما دیوان اشعارش بنظر نیامدہ، مگر در تذکرہ انتخابش بہ نظر آمدہ لیکن اعتبار را نشاید۔ بسبب آنکہ اکثر شعر اساتذہ صاحب آن تذکرہ بنام بیگم نوشتہ بود"۔[۳۵]

جو دیوان اس کے نام سے شائع اور رائج ہوتا رہا ہے، اس کی حقیقت سید صباح الدین عبدالرحمن کی زبان سے سنیئے :

"زیب النساء کے عشق و محبت کی طرح اس کا دیوان بھی محض افسانہ بن کر رہ گیا ہے۔ زیب النساء کا ایک مجموعہ کلام "دیوان مخفی" کے نام سے مختلف مطابع سے چھپ کر بازار میں فروخت ہوتا رہا ہے، مگر ارباب نظر ان متداول

نسخوں پر اپنے خیالات ظاہر کرکے بتا چکے ہیں کہ دیوان کی اندرونی شہادت کی بنا پر اس کو کسی طرح زیب النساء کا دیوان نہیں کہا جا سکتا ہے۔ پروفیسر محفوظ الحق (پریذیڈنسی کالج کلکتہ) نے معارف نمبرہ جلد نمبر۲۸ میں یہ بتایا ہے کہ دیوان مخفی دراصل مخفی رشتی کا دیوان ہے جس کا وطن یا مسقط تھا۔ وہ شاہجہان کے عہد میں خراسان سے ہندوستان طلب منفعت کے لئے آیا۔ مگر یہاں کی ہوا راس نہیں آئی اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے قید کر دیا گیا۔ چونکہ شاہی دربار میں اس کی رسائی نہ ہو سکی اس لئے اس کا کلام اوروں کی طرح مشہور نہ ہو سکا اور ایک حد تک مخفی مگر محفوظ رہا۔ اس کا دیوان بعض غیر محقق مصنفوں کے ہاتھ لگا اور ا سے دیکھے اور سمجھے بغیر محض مخفی کی رعایت کی بنا پر بیگم کی جانب منسوب کر دیا۔"(۳۶)

پروفیسر محفوظ الحق کا مقالہ مجھے نہیں ملا۔ البتہ دیوانِ مخفی کے مطالعے کے بعد میں کچھ ایسے داخلی شواہد بہم پہنچا سکا ہوں جن کی بنا پر موجودہ دیوان کو بتمامہ زیب النساء کی تصنیف نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ایک آدھ غزل یا قطعہ ضرور ایسا ہے جس کے بارے میں قیاس آرائی کی گنجائش ہے۔ لیکن باقی ماندہ کلام خراسانی شاعر مخفی رشتی ہی کا ہے۔ قصائد میں تو کھل کر اس نے اپنے خراسانی ہونے کا اظہار کیا ہے۔ غزلیات بھی ایسے اشارات سے خالی نہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر میں وہ غریب الوطن تھا اور یہاں اس نے بڑے رنج اٹھائے۔ مخالفین کی ریشہ دوانیوں اور قید و بند کے مصائب کا ذکر وہ اکثر کرتا ہے اور چونکہ وہ اس خیال سے برصغیر آیا تھا کہ یہاں اس کے کمال فن کی قدر ہوگی اس لئے جب نتائج برعکس نکلے تو اسے سخت مایوسی ہوئی۔ قدسی اور کلیم کے ساتھ تو اسے دربار میں کیا جگہ ملتی اُلٹا بقول خود "جرم بیگناہی" میں قید کر دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بقیہ زندگی نہایت بے سروسامانی اور احتیاج و افلاس میں بسر ہوئی۔

یوں تو اس کی ہر غزل اس کے احوال کی شاہد عادل ہے لیکن ذیل کے اشعار میں صورت حال قدرے زیادہ واضح ہے۔

شب ز آہم خرمن انجم ہمہ برباد رفت	ہر چہ بُد در خاطرِ گردوں ہمہ از یاد رفت
رنگ ظلمت بس گرفت آئینۂ عدل جہاں	روشنی در رنگ ظلمت از دلِ فولاد رفت
می کشد آخر فلک از ہر کہ باشد انتقام	دید خسرو عاقبت زان آنچہ بر فرہاد رفت

از گل این بوستان چشم وفا داری مدار | کاندرین گلشن بسی بر بلبلان بیداد رفت
رفت مخفی گر ز دستم نیم نانی باک نیست | چون بهشت جاودانی از کف شداد رفت

بسکه الفت گریه را با چشم خونبار من است | ریختن بر خاک رہ خون جگر کار من است
باوجود آنکه آزارم ز سر تا پا ہنوز | گردش گردون دون در فکر آزار من است
نیست در بازار راحت گرچہ یک جو قیمتم | شکر للہ نعمت عالم خریدار من است
فتنۂ ہر جا بر آرد سر ز غوش فلک | جستجویم دارد و در فکر آزار من است
مخفیا زنہار خود بینی و خود رای مکن | کین پریشانیٔ من بر من زپندار من است

اہل نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ مخفی کا سوز نہاں کیونکر اس کے لہجے میں جھلک رہا ہے۔ اس کے شکوۂ ہند کے چند نمونے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ پہلا یہ غزل کا ہے۔

نادان اگر نبودی در ملک ہند مخفی | اجزای عمر خود را شیرازہ گم نمی کرد

آفرین بر جگرم باد کہ در کشور ہند | سکۂ نقد سخن رائج ایران زدہ ام

جستجو بے حاصل است مخفی برایں گرداب ہند | گوہر مقصود را جای دگر گم کردہ ام

دیدہ ام ظلم و ستم چند آنکہ از ظلمات ہند | میروم کز بہر خود جای دگر پیدا کنم

غنچۂ طبعم نمی خندد بشورستان ہند | ہمتی یاران کہ از گلزار کابل بشکند

وانشد چوں غنچۂ دل در بہارستان ہند — رفت مرغ روح مخفی گوشۂ کابل گرفت

آخری دو شعروں کے مصرعہ ہای ثانی پر تحقیقی نظر شاید مخفی کی زندگی کے کسی اور مخفی گوشے سے پردہ ہٹا دے کہیں کہیں غربت کا احساس بڑی شدت کے ساتھ اس کے ہاں اظہار پاتا ہے۔

مخفیا چند بدل حسرتِ دیدار وطن — عنقریب است کہ در خاک فنایت وطن است

بریدم از وطن الفت بغربت زاں گرفتم خو — کہ تنہائی غربت با خیالت آشنا باشد

بناکامی بغربت رو نہادم تا چہ پیش آید — عنانِ دل بدست ہجر دادم تا چہ پیش آید

مخفی امیدِ رہائی تا بروزِ حشر نیست — خاک غربت ہر کرا در مہد دامنگیر شد

ز ناسازئ بخت آخر نہادم روی در غربت — دل پر دردِ ہجراں یادگاری از وطن بردم

وہ اپنی داستان غربت سناتے ہوئے حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ کے قصے سے متعلق تلمیحات کا بھی اکثر و بیشتر استعمال کرتا ہے۔ دیدۂ یعقوبؑ، بوئے پیرہن اور باد صبا سے وابستہ جملہ واقعات اسے اپنے حال کے مناسب و مطابق نظر آتے ہیں۔ اس سے اس کا مقصود یہی ظاہر کرنا ہے کہ بے وطن ہو کر وہ روح فرسا مصائب و آلام سے دوچار ہوئی عزیزانِ وطن اور خویش و اقارب کی یاد اس کے دل سے ایک لحظہ بھی محو نہیں ہوئی۔ چند شعر دیکھیے۔

تمام عمر بکنعانم از جدائی رفت — ز سوئ مصر نسیم صبا نمی آید

بوئ یوسف کرد بینا دیدہ یعقوبؑ را — ورنہ با بادِ صبا چشم کسی بینا نہ شد

خدم یعقوبؑ ہجران و نیامد بوئی پیراہن　　　پسر را نیست آن مہری کہ در خاطر پدر دارد

مخفیا چند ز جور فلک شعبدہ باز　　　ہمچو یعقوبؑ بدل داغ پسر تازہ کنم

چو گم شد یوسفؑ عہد تو مخفی　　　وطن در گوشۂ بیت الحزن کن

پیر کنعانم ز گریہ چشم تر گم کردہ ایم　　　روشنی چشم از بہر پسر گم کردہ ایم

اس انتخاب کے تیسرے، چوتھے اور چھٹے شعر سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ صاحب اولاد تھا[۲۷] اور بیٹے کی جدائی کا غم اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ اس نوع کے اشعار کو زیب النساء سے نسبت دینا کتنی مضحکہ خیز صورت حال کا موجب ہو سکتا ہے جبکہ وہ عمر بھر ناکتخدا رہی۔ یہاں حضرت یعقوبؑ کی تلمیح سے بالعموم اور آخری شعر سے بالخصوص یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بینائی سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ درج ذیل اشعار سے بھی اس کا کچھ کچھ ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

رفتی بہ پیش دیدہ و من بیخبر ہنوز　　　دارم خیال روی ترا در نظر ہنوز

باآنکہ چشم من ز تمنا سفید شد　　　دارم دو دیدہ بر رہ باد سحر ہنوز

نقود روشنیٔ دیدہ صرف دل کردم　　　ہنوز بر سرم آن بی وفا نمی آید

بعض غزلوں میں خراسان کا ذکر کھل کر کیا ہے۔ یاد وطن کے تأثر میں ڈوبی ہوئی ایک غزل دیکھیے۔

باز امروز دلم سوی خراسان رفت است　　　رشتۂ کفر بریداست و بہ ایمان رفت است

نالہ بر دردِ دلم محرم و بیگانہ کنند　　　گر بگویم کہ چہ بیداد ز ہجران رفت است

رشک بستان دارم گشت مرا دامن و جیب　　　بسکہ خون جگر از دیدہ بدامان رفت است

نور بیدا نہ کند چشم تمنا ز نسیم　　　بوئی پیراہن یوسف سوی کنعان رفت است

بر جفای کہ بمن کرد فلک مخفی نیست　　چاک باقی ست مرا گرچہ گریبان رفت است

ہندوستان اور خراسان کی رعایت سے مطلع کے دوسرے مصرعے میں کفر و ایمان کے ذکر اور مقطع میں تخلص کے استعمال کی داد دی جاسکتی ہے۔

ایک مقام پر اپنی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے وہ شاہ خراسان یعنی حضرت امام زادہ علی رضا سے یوں استمداد کرتا ہے۔

چہ کنم بختِ زبون چرخِ جفا پیشۂ من　　از ضعیفی نتوانم رہ عقبیٰ گیرم
آبرو ریختہ ام بس ز مذلت بر خاک　　خواہ آتش شوم و در ہمہ اعضا گیرم
بیش ازیں نیست مرا طاقت دوری ز درت　　ہمتی دہ کہ بواہت سر سودا گیرم
از گدایانِ توام شاہ خراسان مددے　　کہ چو مرغان حرم در حرمت جا گیرم
نیست مخفی چو مرا قدرتِ گفتار بصبر　　پا بداماں کشم و دامن مولا گیرم

یہ تو تھی غزل کی بات جس کے اشارے اتنے عمومی بھی نہیں ہوتے کہ ان سے شاعر اور اس کے ماحول کے بارے میں کچھ بھی اخذ نہ کیا جاسکے۔ اب آیئے مخفی کے قصائد اور دیگر اصناف پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔

ایک قصیدے سے مخفی کے عہد کا تعین ہوتا ہے۔ یہ صاحبقراں ثانی شاہجہان کا دور تھا کہ وہ برصغیر آیا۔ یہ اشعار اس کی نشاندہی کر رہے ہیں۔

بر در سلطانِ عصر حیف ندارم دگر　　تا کہ رساند بعرض مقصد ارکان او
ثانی صاحبقران بادشۂ انس و جان　　آنکہ فلک سر نہد بر خط فرمان او
بر رہ اقلیم او حادثہ را راہ نیست　　لطفِ خداوند آن ہست نگہبان او
قوت بازوی ظلم رفتہ بملک عدم　　یافتہ عمر ابد عدل بدوران او
زہرۂ شیر فلک آب شود در ہراس　　تیز کند گر نگہ جانب ایوان او
فتح ز اقبال آن بر سر ہر کس رود　　پیکر نصرت زند دست بداماں او

لیکن بہر حال اسے دربار شاہی میں رسائی حاصل نہ ہوسکی۔ شاید بعض ارکان دولت اس کے

رستے میں حائل تھے۔ اور اس کے بعد قید و بند کا سلسلہ شروع ہوا۔ اپنے مصائب کے تذکرے کے ساتھ ایک قصیدے میں وہ شاہجہانی امیر خانِ دوراں سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

سپہر منزلتان صاحبانِ دادآور شکوہ دولت فیروز خان دورانی

نرودی لطف بتقصیر من قلم درکش کہ باتو ہست مرا نسبتِ خراسانی

نوید وعدۂ عدلِ تو دارد م زندہ وگرنہ نیست مرا قدرت سخندانی

"کہ باتو ہست مرا نسبت خراسانی" یہ مصرعہ مخفی کی اصلیت کو بر افگندہ نقاب کر رہا ہے۔

اسی طرح ایک قصیدے کا یہ شعر بھی اعتنا کے لائق ہے۔

وجودِ بی وجود من بمن ہموارہ در جنگ است کہ مشتِ استخوانش را برم سوی خراسانش

ایک مقام پر تو اس نے یہ وضاحت بھی کر دی ہے۔

تو از ملک خراسانی باصطرغ از وطن داری بخوابِ شب اگر درد و غم ہندوستان بینی

گویا وہ خراسان کے شہر باصطرغ کا رہنے والا تھا۔ چلتے چلتے ذیل کے انتخاب پر بھی غور کرتے جائیے۔

دل آشفتۂ مخفی لغن خود ارسطو یست بہند افتادہ است اما خراسان است یونانش

درین کشور ز لہنیہای طالع ناقصم دارد وگرنہ در ہنرمندی نباشد ہیچ نقصانش

ایک ترکیب بند کے یہ شعر بھی لائق توجہ ہیں۔

بوصلی روزگارم از خراسان آمدہ از پئی اغراض در درگاہ سلطان آمدہ

بسکہ در یاد وطن نادیدہ ماتم داشتم تا بدامان دلم چاک گریبان آمدہ

حیرتی دارم کہ یارب چون دریں ظلمات ہند طوطی فکر پئ شکر ز رضوان آمدہ

اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ

(ا) دیوان مخفی زیب النساء کی تصنیف نہیں۔

(ب) یہ مخفی خراسانی کا دیوان ہے، جو اپنے خالق کی طرح بے اعتنائی کا شکار رہا۔ مدتوں زمانے کی نگاہوں سے

مخفی رہنے کے بعد اسے لوگوں میں پذیرائی حاصل بھی ہوئی تو کسی اور نام کی نسبت سے ۔

(ج) مخفی باصطرخ کار ہنے والا تھا۔ اور ایران کے دوسرے شعراء کی طرح قدر دانی کے خیال سے برصغیر آیا تھا۔

(د) دربار میں اسے رسائی حاصل نہ ہو سکی ۔

(ر) وہ یہاں طرح طرح کے مصائب و آلام جھیلتا رہا۔ حتیٰ کہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں ۔

(س) وہ باوجودیکہ قادر الکلام شاعر تھا لیکن اس کے جوہر لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہی رہے ۔

دیوان مخفی کے سلسلے میں بات قدرے طویل ہوگئی ہے لیکن میں اسے بوجوہ ضروری سمجھتا ہوں اس لئے کہ جیسی ڈنکن ویسٹ بروک نے مگن لال کے اشتراک سے جن پچاس غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے وہ اسی مجموعے کی ہیں۔ گویا وہ بنیاد ہی سرے سے غلط ہے جس پر جیسی نے اپنے مفروضات کی عمارت اٹھائی ہے۔ اور نثر میں ایسا مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں تاریخی حقائق محض نام کو ہیں اور سنی سنائی باتیں زیادہ ہیں۔ مشرقی علوم و آداب کے بارے میں مغرب کی تحقیقی نظر کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے اور اس میں جو مخصوص مقاصد پنہاں ہیں وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس میں کسی حد تک ہم خود بھی قصور وار ہیں کہ بلا تحقیق ہر کس و ناکس کے بیان کو درست تسلیم کر لیتے ہیں ۔ اس دیوان کے جتنے بھی مطبوعہ نسخے میری نظر سے گذرے ہیں ان میں سوائے نولکشور کے ایک نسخے کے باقی سب کے سب زیب النساء سے منسوب کئے گئے ہیں۔ مطبع مجیدی کانپور کی طرف سے شائع ہونے والے دیوان مخفی کے اختتامیے میں ہے۔

" امابعد بر صیرفیان بازار معانی و جوہریان بازار سخندانی پوشیدہ مباد کہ درین ایام خجستہ آغاز ہمایوں انجام کلام بلند پایہ عالم از نواب زیب النساء بیگم معروف بہ دیوان مخفی کہ در وصفش زبان قلم گنگ و پای ارادت لنگ است حسب فرمائش جناب حاجی محمد سعید صاحب تاجر کتب کلکتہ خلاصی ٹولہ نمبر (۵۵) در مطبع مجیدی پٹکاپور کانپور باہتمام راجئ رب رشید محمد عبد المجید بماہ ذیقعدہ ۱۳۳۰ھ بمطابق ماہ اکتوبر ۱۹۱۲ء بلباس طبع آرائش یافتہ آویزہ گوش روزگار گردید ۔"(۳۸)

لاہور میں طبع ہونے والے نسخوں کا بھی یہی عالم ہے۔ اس کے برعکس نولکشوری نسخے کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے ۔

" درین ایام ہمایوں انجام کلام فصاحت التیام سراپا مملو از شوخی یعنی دیوان مخفی کہ از تیز دستی نقاد سخن سرآمد شعرائی نامی اہل زبان رشتی است۔"(۳۹)

اور دیوان کی اندرونی شہادتیں نولکشوری نسخے پر درج شدہ عبارت کی تائید کر رہی ہیں۔ اس میں خلط بحث کی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسی دیوان میں ہم یہ غزل دیکھتے ہیں۔

گرچہ من لیلیٰ اساسم دل چو مجنوں در ہواست	سر بصحرا می زنم لیکن حیا زنجیر پاست
بلبل از شاگردیم شد ہمنشین گل بباغ	در محبت کاملم پروانہ ہم شاگرد ماست
در نہاں خونیم ظاہر گرچہ رنگ نازکم	رنگ من در من نہاں چوں رنگ سرخ اندر حناست
بسکہ بار غم برون انداختم بر روزگار	جامہ نیلی کرد اینک بین کہ پشت او دوتاست
دختر شاہم ولیکن رو بفقر آوردہ ام	زیب و زینت بس ہمینم نام من زیب النساست(۴۰)

یہی غزل بادنیٰ تغیر مطبع مجیدی کے نسخے میں بھی شامل ہے۔

شاید اسی غزل کی بنا پر اس دیوان کو زیب النساء کا دیوان سمجھ لیا گیا۔ مطبع مجیدی اور دیگر مطابع کے نسخوں میں تو اس ضمن میں کوئی وضاحت نہیں ہوئی۔ نولکشوری نسخے کے حاشیے میں اس کے مصحح کی یہ عبارت قابل غور ہے۔

"این غزل در ہر دو نسخہ قلمی کہ برای مقابلہ پیش نظر بودند، یافتہ نشد۔"(۴۱) یعنی یہ غزل الحاقی ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ اس کے بعد بھی کہ اس دیوان کو مطبع نولکشوری کے کارپردازوں نے ایک اہل زبان رشتی شاعر کا دیوان قرار دیا ہے، پھر اس میں اس غزل کی شمولیت کس جواز کی بنا پر ضروری سمجھی گئی۔ ناقدانہ نقطۂ نظر سے دیکھئے تو اس غزل کا اسلوب، زبان، لہجہ اور دیگر قرائن اس مجموعے کی دوسری غزلیات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ غزل اس مجموعے میں کیسے شامل ہوئی اور کس نے کی؟ اس کے متعلق جب تک کافی و وافی معلومات مہیا نہ ہوں، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال اس دیوان میں اگر زیب النساء کی کوئی چیز موجود ہے تو وہ یہی غزل ہے۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ اس میں اس کا نام آگیا۔

اس موقع پر سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ جب یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ زیب النساء شاعرہ تھی تو اس کا کلام کیا ہوا؟ گذشتہ سطور میں آپ علامہ شبلی کی رائے ملاحظہ کر چکے ہیں۔ یہاں ان کا تفصیلی بیان دیکھئے۔

" اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ شاعرہ تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کلام ضائع ہو گیا۔ اسی تذکرے (مخزن الغرائب) میں ملا سعید اشرف کے حال میں لکھا ہے کہ زیب النساء کی بیاض خاص ایک خواص کے ہاتھ سے جس کا نام امادت فہم تھا، حوض میں گر پڑی۔ چنانچہ سعید اشرف نے اس پہ ایک قطعہ لکھا۔ غالباً یہ اشعار کی بیاض ہوگی۔" (۴۲)

علامہ کا خیال ہے کہ زیب النسار کا سارا کلام شاید اسی بیاض میں جمع تھا۔ ملا سعید اشرف کے معذرت نامے کا ایک حصہ ملاحظہ ہو۔

ای ادا فہمی کہ بیشیت فاضلانِ عصر را — شستنِ مجموعۂ اندیشہ باب افتادہ است
در خم افلاطون زیادِ دانشت سرخوش بود — ہمچو مخموری کہ در فکر شراب افتادہ است
ذہن صافت تا علم گردید در دانشوری — طبع افلاطون زلس در اضطراب افتادہ است
دفتر فرہنگ در طبعش مجزا گشتہ است — از کفش مجموعۂ دانش در آب افتادہ است
آن بیاض خاصہ شاہی کہ در اطراف آن — جای افشان نقطہ ہای انتخاب افتادہ است
آن مرصع خوان گہر ریزی کہ باشد جلوہ گر — در الفاظش لبی بی آب و تاب افتادہ است (۴۳)

خیر، کچھ بھی ہو جب تک اس سلسلے میں مزید حقائق سامنے نہیں آجاتے، ہمیں یہ ماننا ہی پڑے گا کہ زیب النسار کا کلام زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ تذکروں میں جس قدر اشعار نقل ہوئے ہیں ان کے بارے میں احمد علی سندیلوی کی رائے آپ کی نظر سے گزر چکی ہے۔ اگر اس نوع کے انتخاب میں زیب النساء کا کچھ کلام ہے بھی تو وہ دوسروں کے اشعار کے ساتھ اس قدر خلط ملط ہو گیا ہے کہ اسے الگ کرنا امر محال نظر آتا ہے۔ اسے بھی ہماری تاریخ ادب کا ایک المیہ سمجھئے کہ جس کی سرپرستی میں بڑے بڑے علمار و شعرار نے اپنے تصنیفی و تخلیقی جوہروں کو چمکتے دیکھا خود اس کا کلام ناپید ہے۔ احمد علی سندیلوی نے مخزن الغرائب میں زیب النسار کے مجموعۂ مکاتیب زیب المنشآت کا ذکر کیا ہے۔ مگر یہ کتاب بھی اس تذکرے کے مولف کے سوا کسی نے نہیں دیکھی۔

حوالہ جات

۱۔ ہمایوں نے شعر گوئی کی طرف ہر حال میں توجہ کی۔ اس کے دیوان کا ذکر ابوالفضل نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"و توجہ عالی بہ شعر و شعراء نیز داشتند۔ و آنجا کہ طبع موزون از خصائص فطرت سلیم است، در خلال اوقات واردات قدسی راچہ از حقیقت وچہ از مجاز در سلک نظم می کشیدند و دیوان شعر حضرت در کتابخانہ عالی موجود است۔"
(اکبر نامہ۔ ابوالفضل)

۲۔ مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ) محمد ساقی مستعد خان

۳۔ مقالات شبلیؒ

۴۔ ساقی مستعد خان۔ مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ) ص ۴۷۹ و مقالات شبلی

۵۔ ساقی مستعد خان۔ مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ) ص ۴۷۹

۶۔ مقالات شبلیؒ جلد پنجم

۷۔ بحوالہ "زنان سخنور" مولفہ علی اکبر و مشیر سلیمی

۸۔ تذکرہ بہارستان ناز ص ۱۹۹ طبع مجلس ترقی ادب لاہور

۹۔ سید سلیمان ندویؒ۔ تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" مشمولہ کتاب" تاج" مرتبہ محمود بنگلوری ص ۱۳۰، مطبوعہ لاہور۔

10 - Jessie Duncan West Brook; "Diwan of Zeb-un-Nisa" Introduction pp. 3,4 published by Orientia, Lahore, 1954.

۱۱۔ سید ارنگانی۔ "زیب النساء مخفی" مجلہ "سخن" تہران بابت دی و بہمن ۱۳۵۴ شمسی

۱۲۔ مقالات شبلیؒ۔

۱۳۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کا مقالہ "شہزادی زیب النساء کے نام چند غیر مطبوعہ خطوط" مطبوعہ مجلہ "نقوش" لاہور سالنامہ بابت مئی، جون، جولائی ۱۹۶۶ء

14 - Jessie Duncan West Brook "Diwan of Zeb-un-Nisa" Introduction pp.

۱۵۔ شاہجہان کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب۔ ڈاکٹر برنیئر۔ مترجمہ خلیفہ سید محمد حسین مطبوعہ نفیس اکیڈمی کر
ص ۴۰،۳۶

۱۶۔ شقعہ جات عالمگیر ورق ۵۲ کتب خانہ آصفیہ نمبر ۱۳۵ انشار۔ اس حوالے کے لیے میں محترم ڈاکٹر عبداللہ
کا ممنون ہوں۔ ملاحظہ ہو "واقعات عالمگیری" مرتبہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مقدمہ ص ج مطبوعہ لاہور ۳۶،

۱۷۔ مآثر الامراء، شاہنواز خان صفوی جلد دوم

۱۸۔ مآثر عالمگیری۔ ساقی مستعد خان ص ۳۶۰ (اردو ترجمہ)

۱۹۔ "زنان سخنور" مؤلفہ علی اکبر و مشیر سلیمی جلد دوم۔ ذکر زیب النسا مخفی۔

۲۰۔ سدار نگانی "زیب النساء مخفی۔ مطبوعہ مجلہ "سخن" تہران بابت دی و بہمن ۱۳۵۴ شمسی۔

۲۱۔ مجلہ "ہلال" کراچی بابت مارچ ۱۹۶۴ء مقالہ بعنوان "پارہ لعلی کہ دارم" از حسنین کاظمی۔

۲۲۔ "مزار الشعرای کشمیر" از منشی محمد دین فوق مشمولہ "ادبی دنیا" کشمیر نمبر بابت مارچ و اپریل ۱۹۶۲ء نیز دیکھے
ایران صغیر و کبیر" مرتبہ محمود عبداللہ قریشی۔

۲۳۔ فوق مرحوم نے اس شعر سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ بھی لکھا ہے۔ حکیم حمام کے فرزند حکیم حاذق صاحب دا
تھے۔ ایک مرتبہ شیدا (شیدا فتح پوری) ان کی ملاقات کو گئے۔ شعر و شاعری کا تذکرہ ہوتا رہا۔ حکیم نے اپنی غزل کا
یہ مطلع پڑھا۔

بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا　　　　بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا

"شیدا تو ظریف الطبع تھے۔ مسکرا کر بولے۔ یہ شاید اس زمانہ کا ذکر ہے جب داڑھی نہ نکلی ہوگی۔ حکیم کو اس پر ندامت
آمیز غصہ آیا۔ پاس ہی پانی کا حوض تھا اس میں شیدا کو خوب غوطے دلوائے۔"

۲۴۔ ملاحظہ ہو عمل صالح از ملا محمد صالح کنبوہ جلد سوم ص ۴۰۸ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

۲۵۔ اس دیوان کے سلسلے میں مفصل بحث آگے آئے گی۔

۲۶۔ کلیم کاشی کب ہندوستان آیا؟ کب ایران گیا؟ اور پھر کیسے یہاں لوٹا؟ شاہجہان کے زمانے میں اس کی کیا قدر و منزلت

اور اس کی موت کہاں واقع ہوئی؟ ان تمام حالات کے لئے شعر العجم حصہ سوم میں کلیم کا تذکرہ دیکھئے۔ بات صاف ہو جائے گی۔

۲۷۔ ساقی مستعد خان۔ مآثر عالمگیری ص ۲۴۴ (اردو ترجمہ)۔

۲۸۔ مقالات شبلی جلد پنجم۔

29 - Edwardes and Garette, "Mughal Rule in India pp. 232

۳۰۔ ساقی مستعد خان۔ مآثر عالمگیری ص ۲۵۹ (اردو ترجمہ)۔

۳۱۔ ساقی مستعد خان۔ مآثر عالمگیری ص ۴۲۳ (اُردو ترجمہ)

۳۲۔ "مغل رول ان انڈیا" کے مصنفین اس پر یوں افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔

"ONE CANNOT HELP EXPRESSING A WORD OF REGRET THAT MODERN VANDALISM IN THE GUISE OF CONSTRUCTORS OF THE RAJPUTANA RAILWAY SHOULD HAVE DEMOLISHED THE TOME WHICH AURANGZEB ORDERED TO BE BUILT FOR HER REMANS IN THE "GARDEN OF THIRTY THOUSAND TREES" OUTSIDE KABULI GATE OF DELHI. PP : 232

۳۳۔ مقالات شبلی جلد پنجم۔

۳۴۔ مقالات شبلی جلد پنجم۔

۳۵۔ مخزن الغرائب بحوالہ "بزم تیموریہ" صباح الدین عبدالرحمٰن ص ۳۷۰۔

۳۶۔ بزم تیموریہ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے ص ۳۷۰ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۴۸ء۔

۳۷۔ یہ شعر بھی دیکھئے۔

مخفی دریمین بردل تو بار فراق است — ہر جا پدری ہست فراق پسری ہست

۳۸۔ دیوان مخفی مطبوعہ مطبع مجیدی کانپور۔

۳۹ ۔ دیوان مخفی۔ مطبوعہ نولکشور باہتمام کیسر داس سیٹھ

۴۰ ۔ ایضاً

۴۱ ۔ دیوان مخفی مطبوعہ نولکشور

۴۲ ۔ مقالات شبلی جلد پنجم ۔

۴۳ ۔ مخزن الغرائب بحوالہ مقالات شبلی و بزم تیموریہ ۔

منظومۂ صرف

شرف الدین اصلاحی

منظومۂ صرف مولانا فراہی کی ایک نامکمل تصنیف ہے۔ نہیں معلوم اس کو نامکمل تصنیف کہنا بھی درست ہے یا نہیں۔ اس میں صرف ۲۶ اشعار ہیں۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فارسی میں عربی قواعد نظم کرنا چاہتے تھے۔ جس طرح کہ اردو میں تحفۃ الاعراب[1] نظم کی ہے تحفۃ الاعراب کی طرح اس کی بھی سب سے نمایاں خصوصیت اختصار ہے۔ ایک شعر بلکہ ایک مصرعے میں پورا پورا مسئلہ سمیٹ دیا ہے جس کی تفصیل کے لیے ابواب وفصول کی وسعت چاہیئے ہوتی۔ اس پر کوزے میں دریا بند کرنے کی مثل صادق آتی ہے۔ اس کا مقصد غالبًا یہ ہوگا کہ مسائل آسانی سے یاد رکھے جاسکیں۔

مولانا فراہی پر تھوڑا بہت جن لوگوں نے اب تک لکھا ہے ان میں سے کسی نے ان کی اس کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یا تو ان کو اس کا علم نہیں تھا یا انہیں اس قابل نظر

---

[1] تحفۃ الاعراب کے تفصیلی تعارف کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون عربی نحو پر مولانا فراہی کے رسائل۔ فکر و نظر۔ ستمبر ۱۹۷۸ء۔

نہیں آئی کہ اس کا ذکر کیا جائے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس کے بارے میں قدرے تفصیل سے لکھا جائے۔ خصوصیت سے اس کے استنادی پہلو پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔

میں اس کے لیے محترمی مولانا بدرالدین اصلاحی اور عزیزی محمد اجمل اصلاحی کا ممنون ہوں۔ اجمل سلمہٗ نے مدرستہ الاصلاح سے فراغت کے بعد ابھی سالِ گذشتہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے امتیاز کے ساتھ عربی میں ایم اے کا امتحان پاس کیا ہے اور بالفعل مولانا فراہی کی "مفردات القرآن" کو تعلیقات و حواشی اور بعض اضافوں کے ساتھ از سرِ نو مرتب کر رہے ہیں۔ اس کام پر لکھنو یونیورسٹی ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دے گی۔ انہی نے مجھے اس کتاب کی موجودگی کا پتا دیا اور انہی کی رفاقت اور رہنمائی میں میں مولانا بدرالدین صاحب کے گاؤں نیاورج پہنچا جہاں باقیاتِ فراہی کا اصل خزانہ محفوظ ہے۔

نیاورج قصبہ سرائے میر کی آبادی اور سرائے میر ریلوے اسٹیشن کے شمال میں کوئی چار میل کے فاصلے پر ضلع اعظم گڑھ کے ان چند مواضعات میں سے ہے، جو مسلم آبادی کی اکثریت، تعلیم، خوشحالی اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے غلبہ کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ اور اپنی سرکردہ حیثیت کے باعث ممتاز ہیں اور میرے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ اقلیم ہند میں دلدادۂ فراہی بدر اصلاحی کا مولد و مسکن ہونے کے علاوہ بالفعل دائرۂ حمیدیہ کا مخزن بھی ہے۔ دائرہ حمیدیہ کے دفاتر یوں تو مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں واقع ہیں مگر اس کا اصل خزانہ یعنی مولانا حمید الدین فراہی کے کاغذات اور مسودات مولانا بدرالدین اصلاحی کی تحویل میں یہیں محفوظ ہیں۔ میرے اسفار ہند میں نیاورج کی زیارت میرے مقاصدِ سفر میں سرِ فہرست تھی۔ لیکن نیاورج کے محلِ وقوع کے پیشِ نظر غیر معمولی عزم و ارادہ کے بغیر وہاں پہنچنا آسان نہیں۔ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں لیکن "رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر" اور یہاں بعبور دریائے شور کی سرا بھگتنی ضروری ہے اور وہ بھی کشتی کے بغیر۔

راستے میں ندی نالے، دشت و بیابان سبھی کچھ آتے ہیں اور ذرائع سفر یکسر مفقود۔ اس لیے اعظم گڑھ پہنچنے کے بعد تقریباً مہینہ بھر تو زبان قال سے یہ شعر پڑھتے رہے:

نیاد ارہا بالخیف ان مزارہا قریب ولکن دون ذالک اہوال

اور جب وہاں کے لیے روانہ ہوئے تو زبانِ حال سے یہ شعر پڑھتے رہے:

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

لیکن وہاں پہنچ کر جب مولانا بدرالدین اصلاحی سے ملاقات ہوگئی تو دشوار گذار راستے کی صعوبت اور سفر کی تھکن راحت اور آرام میں بدل گئی۔

مولانا بدرالدین ایک عرصہ دراز تک مدرسۃ الاصلاح کے ناظم رہ چکے ہیں۔ اس زمانے میں بھی وہ مدرسے کے ناظم تھے جب میں وہاں کا طالب علم تھا۔ آج کل سبکدوشی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ عمر کے اس حصے میں بھی مولانا فراہی کے مسودات کی ترتیب واشاعت کا بارِ گراں اُٹھائے ہوئے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی کی نقل مکانی اور استاذی مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کی رحلت کے بعد ہندوستان میں مولانا فراہی کے ترکے کے وارث اور امین وہی رہ گئے ہیں۔ آج کل دائرہ حمیدیہ کے کرتا دھرتا، ڈائرکٹر یا ناظم سب کچھ وہی ہیں — حالات کی نامساعدت کے باوجود وقفے وقفے سے یکے بعد دیگرے مولانا فراہی کی غیر مطبوعہ تصانیف کی طباعت واشاعت کا کام کرتے رہتے ہیں۔

فروری ۱۹۸۸ء میں میں ہندوستان گیا تو وہ اعظم گڑھ سے بمبئی جا چکے تھے۔ ان سے بمبئی میں ملاقات ہوئی مگر مجھے اپنے مقصد میں اس لیے کامیابی نہیں ہوئی کہ فراہی کے کاغذات اور مسودات جو میں دیکھنا چاہتا تھا وہ نیاورج میں تھے۔

فروری ۱۹۸۹ء کے سفر میں مجھے اس خزانے تک رسائی حاصل ہوئی۔ مولانا ہم لوگوں کے بزرگ ہیں محترم ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ہمارے کام میں پوری پوری

مدد کی۔ بلکہ ضیافت اور مہمانداری کی تکلیف بھی اٹھائی۔ میں نے تقریباً ایک ہفتہ نیاورج میں ان کے پاس گذارا۔ یہ سات دن عجیب انداز سے گزرے۔ صبح سے شام تک مسلسل کام کام، اس میں مولانا برابر ہمارے ساتھ رہے۔ ان کی وجہ سے میرا کام بہت آسان ہوگیا۔ مسودات اور کاغذات کے پڑھنے اور سمجھنے میں جہاں کہیں ضرورت ہوئی انھوں نے میری بطیب خاطر مدد فرمائی۔ مولانا فراہی کے حالاتِ زندگی بھی انہوں نے بتائے جو میں نے قلمبند کر لیے ہیں۔ منظومۂ صرف کا مسوّدہ مولانا فراہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نحویات کے فائل میں ہے اور اچھی حالت میں ہے۔ ۲۲ر مارچ ۸۰ء کو میں نے نیاورج میں مولانا بدرالدین اصلاحی کی مدد سے اس کی نقل اپنے ہاتھ سے تیار کی۔ ملاحظہ ہو:۔

منظومۂ صرف

بعد حمدِ خالق و بعد از درودِ مصطفیٰ ؐ
خوش بود در صرف زیں منظوم کردن ابتدا

پس بداں موضوعِ علمِ صرف باشد اشتقاق
کہ چساں از مادہ سازند چندیں لفظہا

مادہ باشد بہر لفظے حروفِ اصلیش
کان بجز تخفیف با ترتیب می ماند بجا

آنچہ غیر از مادہ باشد حروفِ زاید است
کان بود از انسان کہ وزن لفظ دارد اقتضا

وزن ہر لفظ است ترکیبِ حروفش جملگی
کہ نماید ہیأت آں لفظ را سرتا بپا

چونکہ یک معنی نماید جلوہ در چندیں صور
مادہ بر معنی و وزن است بر صورت گواہ،

مادہ فعلیہ یا اسمیہ باشد در کلام
لیک ایں اسمیہ را جامد بود گفتن سزا

نسبت و تصغیر و ترخیم و دگر صنف و عدد — باعث تغییر اندر اسم زیں نبود سوا،
آنچہ فعلیہ است ازو صد گونہ لفظ آید بروں — پس بعلم صرف با فعلیہ باشد ماجرا
ہست فعلیہ ثلاثی یا رباعی اولا — پس مجرد یا مزید فیہ باشد ثانیا

مشتقاتِ عشرہ

مصدر و زو فعل ماضی و مضارع باز امر — از ہمہ فعلیہ کن ایں پنج مشتق را بنا

از ثلاثی مجرد پنج دیگر ہم کنند — ظرف و آلہ و صفت و تفضیل و دگر فعّال را

فعلِ پس اصل است و دیگر فرع اندر اشتقاق — پس نخست از وزن ہائے فعل بکشا ہم غطا

فعلہا گر کنی تحلیل یابی مشتمل — بر حدوث و نسبتِ ذات و زمانہ دائما

پس حدوثِ فعل یا مثبت بود یا منفی است — ہم چنیں اخبار یا امر است در اصل بنا

نسبت فعل از بفاعل ہست معروفش بخواں — ور بسوی مفعول مجہولش بخواں زیں انتما

ذات گہہ واحد بود گاہے مثنی گاہ جمع — باز غائب باز حاضر باز قائل اے فتیٰ

پس مذکر یا مونث زیں تغیرہائے ذات — می شود در جدولِ تصریف در یکجا ادا

بس اہم باشد دریں تصریف ترتیب درست — تا بہر یک صیغہ بے تکلیف گردی آشنا

در زمانہ فعلِ ماضی از پے ماضی بود — شد مضارع مشترک در حال و مستقبل سوا

ماضی معروف مثبت هست در افعال اصل — واحد غائب مذکر هست اصل صیغها

جدول تصریف را شش وضع در امکاں بود — هاں مشو ششدر رہ بگزیں که باشد راستا

واں بود تقسیم در سه سطر از روئے عدد — باز در ہر سطر غائب و حاضر و قائل جدا

پس مؤنث را به پہلوئے مذکر جا دہی — بر مثالِ ہو ہی انتَ و انتِ و انا

اندریں ترتیب بینی مشترکہا مجتمع — گردی از تکرار و تفریق مشابه ها رہا

گردانِ ماضی

سطرِ اوّل قال قالت قلتَ قلتِ قلتُ هست — سطرِ دوم هست قالا قالتا پس قلتما

سطرِ سوم هست قالوا قلن قلتم بعد ازاں — در چپ دو سطرِ آخر لفظ قلنا است جا

مضارع

پنج قسم آمد مضارع اصلی و دیگر اخف — پس خفیف و اثقل و آخر ثقیل آمد بنا

یفعل اصلی اخف یفعل خفیفش یفعلن — یفعلنّ یفعلن کاں را بود نون در قفا

ہفت جا آید اخف یعنی پس لما و لم — لام امر و لائے نہی و لفظ شرط و در جزا

ہفده است الفاظ شرط اِن ما و ای من متی — این ایان و ان انچه منضم شد بما

واں بود اِمّا مہما پس متی ما اینما — ایما اذما اذا ما حیثما پس کیفما!

ہم جواب طالبات ستہ کاں امر است و نہی — باز استفہام و عرض است و تمنّی و دعا

پنج جا آید خفیف از بعد اَن لن کے اذن — ہم پس از اضمار اَن کان ہم بود در پنج جا

بعد حتی لام جر داں او کہ الا معنی اش — واو فا کاید جواب طالبات و انتفا !

پنج جا آید منون بعد لیت و لا — لفظ استفہام و شرطے کاں بود منضم بما

نسخ فی القرآن

صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر نقشبندی

جولائی ۱۹۸۰ء کے فکر و نظر میں خلیل الرحمن صاحب کی تحریر "قرآن میں ناسخ و منسوخ کا مسئلہ" نظر سے گذری۔ موصوف نے اپنے عقلی دلائل کی روشنی میں قرآن کی آیات میں ناسخ و منسوخ کے وجود سے جو انکار کیا ہے وہ انتہائی تعجب انگیز ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے ثبوت میں تفسیر، حدیث اور اصول حدیث کی ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں کتابیں بھری پڑی ہیں بلکہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ یہاں تک فرماتے ہیں :۔

"و قد اجمع المسلمون علی جوازہ"(۱)

"اور مسلمانوں کا ناسخ و منسوخ کے جواز پر اجماع ہو چکا ہے"۔ لہٰذا ایسے اجماعی مسئلہ سے بھلا کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے۔ نسخ کے متعلق قرآن کا صاف اور واضح ارشاد موجود ہے ۔

ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نأت بخیر منہا أو مثلہا الم تعلم أن اللہ علی کل شیء قدیر(۲)۔

یعنی جب کوئی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

اس آیت کے تحت تفسیر بیضاوی میں ہے "والآیۃ دلت علی جواز النسخ"(۳) کہ یہ آیت قرآن پاک میں نسخ کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ پھر "نسخ" کے اقسام بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "نسخ آیات" کی

۱۔ جلال الدین عبدالرحمن سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ص ۲۱ ۔

۲۔ سورۃ البقرہ، رکوع ۱۳ - آیت ۱۰۶ ۔

۳ - عبداللہ بن عمر بیضاوی، انوار التنزیل و اسرار التاویل، ص ۹۸ ۔

ن قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ آیت کی صرف قرأت منسوخ ہو حکم باقی ہو۔ دوسرا یہ کہ حکم صرف منسوخ ہوا ہو تلاوت
ت آیت کی باقی ہو۔ تیسرا یہ کہ قرأت اور حکم دونوں منسوخ ہو گئے ہوں اور ان آیات کو اللہ تعالےٰ نے ذہن
سے بالکل بھلا دیا ہو۔ کسی کو وہ آیات یاد ہی نہیں رہیں۔ چنانچہ بیہقی جو حدیث کی معتبر کتاب ہے اس
ں ایک روایت ہے جو حضرت ابوامامہ رضؓ سے مروی ہے کہ ایک صحابی رات کو تہجد کی نماز ادا کرنے کے لئے
اٹھے اور نماز پڑھنی شروع کی اور سورہ فاتحہ کے بعد وہ سورت جو ہمیشہ پڑھا کرتے تھے اس کو پڑھنا چاہا
لیکن وہ بالکل یاد ہی نہ آئی اور سوائے بسم اللہ کے کچھ نہ پڑھ سکے۔ صبح کو دوسرے صحابہ سے اس کا ذکر کیا
تو ان صحابہ کرام نے بھی فرمایا کہ ہمارا بھی یہی حال ہوا ہمیں بھی وہ سورت ذہن پہ زور ڈالنے کے
باوجود یاد نہ آئی اور اب وہ ہمارے حافظہ میں ہی نہیں ہے۔ سب نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم
کی خدمت اقدس میں یہ ماجرا عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ آج کی شب وہ سورت اٹھا لی گئی اس
کا حکم اور تلاوت دونوں منسوخ ہو گئے ہیں، حتیٰ کہ جن چیزوں پر وہ لکھی گئی تھی ان پہ اس کے نقوش بھی
مٹ گئے اور وہ بھی اب باقی نہیں ہیں۔ (۴)

صاحب تفسیر خازن نے اس آیت کے تحت اپنی مشہور تفسیر میں یہ فرما کر کہ والنسخ جائز عقلاً
وواقع سمعاً خلافاً للیہود (۵) کہ قرآنی آیات میں نسخ نہ صرف عقلاً جائز ہے بلکہ نقلاً اور سمعاً یعنی از روئے
احادیث و روایات واقع اور ثابت ہے اور یہ امر یہود کے برخلاف ہے، نسخ کے مندرجہ بالا اقسام
بھی گنوائے ہیں اور اس کی ہر ہر قسم کو احادیث سے ثابت کیا ہے۔ چنانچہ نسخ کی تیسری قسم یعنی جس
آیت کا حکم اور تلاوت دونوں نسخ ہو گئے اور قلوب سے محو کر دیئے گئے کی بابت انہوں نے بھی وہی
روایت نقل کی ہے جو ابھی بیہقی کے حوالہ سے اوپر مذکور ہوئی۔

نسخ کی پہلی قسم یعنی جس آیت کی صرف تلاوت منسوخ ہوئی ہو اور اس کا حکم اب بھی بدستور باقی
ہو اس کے متعلق صاحب تفسیر خازن، بخاری شریف اور مسلم شریف کی یہ روایت نقل فرماتے ہیں کہ

۴۔ محمد نعیم الدین، خزائن العرفان فی تفسیر القرآن۔ ص ۱۹۔

۵۔ علاء الدین علی بن محمد خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل، ج ۱، ص ۷۲۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ منبر رسول پر رونق افروز ہوئے اور آپ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے حضور کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، آپ پر کتاب نازل فرمائی اور اس میں آپ پر آیت رجم "بھی نازل ہوئی، ہم نے اس کو پڑھا اور اچھی طرح اس کو سمجھ کے یاد کر لیا، اس آیت میں جو حکم تھا اس کے مطابق آنحضرت نے رجم بھی کیا اور آنحضرت کے بعد ہم نے بھی اس حکم پر عمل کیا اور زانی کو رجم کیا۔ لیکن اب مجھے ڈر ہے کہ زمانۂ دراز کے بعد کہیں لوگ یہ کہہ کر رجم کو ترک نہ کر دیں کہ یہ حکم اور آیت تو قرآن میں موجود ہی نہیں ہے، حالانکہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو اس حکم کو چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں گے، کیونکہ یہ وہ فریضہ ہے جس کو اللہ نے نازل کیا ہے اور اس رجم کا کتاب اللہ میں سے ہونا حق ہے۔(۶)

آیت رجم کی صرف تلاوت منسوخ ہونے کی یہ حدیث بھی مؤید ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت زر بن جیش سے دریافت فرمایا کہ تم سورۂ احزاب کی کتنی آیتیں شمار کرتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ بہتر یا تہتر۔ پھر اس پر حضرت ابن کعب نے فرمایا کہ یہ سورت سورۂ بقرہ کے برابر تھی اور ہم اس میں آیت رجم بھی تلاوت کیا کرتے تھے۔ تو زر بن جیش نے پوچھا کہ یہ آیت رجم کون سی تھی؟ حضرت ابی بن کعب نے فرمایا کہ وہ یہ تھی اذا زنا الشیخ والشیخۃ فارجموھما البتۃ نکالاً من اللہ واللہ عزیز حکیم۔(۷)

علامہ سیوطی نے نسخ کی اس قسم اول کی اور بیسیوں مثالیں احادیث سے دی ہیں جن میں سے ایک صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی یہ روایت بھی ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ بئر معونہ میں جن اصحاب رسول کو قتل کر دیا گیا تھا ان مظلوم مقتولین کے بارے میں کچھ قرآن نازل ہوا تھا۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کو پڑھا بھی تھا لیکن وہ بعد میں اٹھا لیا گیا۔ اور وہ اس طرح سے تھا کہ ان بلغوا عنا قومنا

۶۔ علاؤالدین علی بن محمد خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل، ج ۱۔ ص ۷۲۔

۷۔ جلال الدین سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن۔

انا لقینا ربنا فرضی عنا وارضانا (۸)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تلاوت کو منسوخ کر کے صرف حکم باقی رکھنے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ تو اس کے متعلق علامہ ابن جوزی "فنون" میں فرماتے ہیں کہ اس سے مقصود امت مسلمہ کی "فرمانبرداری اور اطاعت شعاری" بتانی مقصود ہے۔ کہ اس امت کے جاں نثار اور وفا شعار لوگ بغیر کسی دلیل اور حجت کے صرف ادنیٰ اشارہ پر اپنی گردنیں جھکا دیتے ہیں۔ محبوب کے حکم کی تعمیل میں انہیں کہنے کی بھی ضرورت نہیں پیش آتی۔ یہ بغیر کہے صرف اس کا منشاء اور رضا معلوم کر کے جو کرنا ہے کر گزرتے ہیں۔

اب رہی نسخ آیات کی دوسری قسم یعنی حکم منسوخ ہو گیا لیکن تلاوت باقی ہے تو اس کے متعلق صاحب تفسیر خازن فرماتے ہیں کہ اس کی مثالیں قرآن میں بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً یہ آیت کہ ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین الآیۃ۔ اس آیت کا حکم اور معنی منسوخ ہو گئے اور اس کی ناسخ یہ آیت ہے جو اس کے بعد نازل ہوئی الآن خفف اللہ عنکم وعلم ان فیکم ضعفاء الآیۃ (۹)

علامہ صاوی رحمۃ اللہ علیہ حاشیہ تفسیر جلالین میں اس کی چند اور مثالیں دیتے ہیں۔ مثلاً کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین اس آیہ کریمہ کی تلاوت باقی ہے مگر حکم بعد میں نازل ہونے والی میراث کی آیتوں سے منسوخ ہو گیا اور اس حدیث رسول کے ذریعہ بھی منسوخ ہو گیا کہ "لاوصیۃ لوارث"۔ اسی طرح ایک اور آیت ہے والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً وصیۃ لازواجھم متاعا الی الحول الآیۃ۔ یہ آیۃ منسوخ ہے اس آیت سے یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر وعشرا۔ (۱۰)

سیوطی نے اس قسم کی بہت سی مثالیں ہر سورہ کے تحت علیحدہ علیحدہ ذکر کی ہیں جن کا احصار یہاں ناممکن ہے۔ ہاں اس سے یہ اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ نسخ آیات قرآن میں کتنی کثرت سے موجود ہے۔ لہذا اس سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔

۸۔ جلال الدین سیوطی۔ الاتقان فی علوم القرآن ص ۲۶

۹۔ علاؤالدین علی بن محمد خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل ص ۷۰۔

۱۰۔ احمد الصاوی، حاشیہ الصاوی علی تفسیر الجلالین، ص ۵۱ ج ۱

اس دوسری قسم میں بھی یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر حکم کو منسوخ کر کے تلاوت باقی رکھنے میں کیا حکمت ہے ؟
تو اس کے راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے علامہ سیوطی یوں فرماتے ہیں کہ قرآن کی تلاوت کا جہاں یہ مقصود ہے کہ اس کو پڑھ کر سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے وہاں اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس کو پڑھ کر ثواب عظیم حاصل کیا جائے۔ کیونکہ اس کے ایک ایک حرف پر کئی کئی نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ لہذا اس کی تلاوت کو باقی رکھ دیا گیا تاکہ صرف اس کی تلاوت سے ہی لوگ برکت، فیض اور دولت اخروی کے بیش بہا خزانے حاصل کر سکیں اور اپنی جھولیوں کو ان انمول موتیوں سے بھر لیں۔ تلاوت کے باقی رکھنے میں دوسری حکمت یہ ہے کہ نسخ اکثر تخفیف حکم کے لئے ہوتا ہے یعنی پہلے کوئی حکم امت پر شاق اور مشکل تھا تو اس کو منسوخ کر کے دوسرا آسان حکم نازل فرما دیا گیا تو دراصل اس پرانے حکم کی تلاوت کو باقی رکھ کر خدا کے انعام واکرام اور اپنے بندوں پر اس کی رحمت و رأفت کی یاد دہانی مقصود ہے کہ کس طرح اس خدائے رحیم وکریم نے ان کو مشقتوں اور مصیبتوں سے بچا کر ان کے لئے آسانی اور سہولت کا سامان مہیا فرما دیا۔

"نسخ آیات" کی مجموعی حکمت اور مصلحت کو علامہ بیضاوی اپنے فلسفیانہ اور محققانہ انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں لان الاحکام شرعت والآیات نزلت لمصالح العباد وتکمیل نفوسہم فضلا من اللہ ورحمۃ وذلک یختلف باختلاف الاعصار والاشخاص الخ [11]

آپ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ شرعی احکام اور آیات دراصل بندوں کی اصلاح ان کے فائدے اور ان کی تکمیل نفوس کے لئے نازل کی جاتی ہیں جبکہ بندوں کی اصلاح ان کے فوائد زمانہ اور اشخاص کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں جیسے اسباب معاش کہ یہ بھی ہر دور میں مختلف رہے بلکہ بعض دفعہ ایک چیز ایک زمانہ میں مفید ہوتی ہے اور وہی چیز دوسرے زمانہ میں مضر ہوتی ہے۔ لہذا زمانہ اور اشخاص کے تغیرات کے لحاظ سے احکامات میں بھی تبدل و تغیر ہو جائے تو یہ کوئی بری بات نہیں بلکہ یہ عین حکمت کے مطابق ہے لہذا وہ حکیم علی الاطلاق جل مجدہ اپنے بندوں کی اصلاح اور فوائد کی خاطر اپنے احکامات میں تغیر و تبدل فرما دے تو یہ کون سے تعجب کی بات ہے۔
یہ تو تھے مختصراً قرآنی آیات کے نسخ سے متعلق کچھ دلائل۔ آیئے اب ذرا اس تحریر کا بھی جائزہ

۱۱۔ عبداللہ بن عمر بیضاوی، انوار التنزیل و اسرار التاویل، ص ۹۸۔

نیں جس میں اس قسم کے نسخ سے انکار کیا گیا ہے۔

فاضل مضمون نگار نے جو پہلی بات اور پہلی دلیل ذکر فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت تنسیخ (یعنی ما ننسخ من آیۃ او ننسہا) الآیۃ میں پچھلی کتابوں کا نسخ مراد ہے اور اس پر دلیل یہ ہے سیاق آیت اس پر دلالت کرتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں علمائے کرام نے نسخ کی تین تفسیریں کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے پچھلی کتب اور سابقہ شریعتوں کا نسخ مراد ہے۔ دوسری یہ کہ نسخ کے معنی نقل کے ہیں اور لوح محفوظ سے سمائے دنیا پر قرآن کا نسخ یعنی نقل مراد ہے۔ تیسری یہ کہ اس نسخ سے بعض آیات کا حکم دوسری آیات سے رفع حکم اور نسخ مراد ہے۔ ان تینوں معانی میں کوئی تعارض نہیں لہٰذا بیک وقت اس آیۃ میں تینوں معانی اور تفسیریں مراد لی جاسکتی ہیں۔ اس آیت میں اس تیسرے معنی کی نفی کب ثابت ہوتی ہے کہ اس کو نہ لیا جائے، بلکہ اگر مفسرین کے اقوال کو دیکھا جائے تو وہ دلائل کی روشنی میں تیسرے معنی کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ صاحب خازن فرماتے ہیں الوجہ الثالث وھو الصحیح الذی علیہ جمہور العلماء۔

تیسری وجہ ہی درست اور صحیح ہے اور اسی رائے پر جمہور علماء ہیں اس کے بعد اسی تیسری وجہ کی فوقیت اور ترجیح پر دلیل لاتے ہوئے فرماتے ہیں لان الآیۃ اذا اطلقت فالمراد بہا آیات القرآن لانہ ھو المعہود عندنا۔[۱۲]

کیونکہ جب مطلق "آیت" کا لفظ بولا جائے تو اس سے قرآن کی آیات ہی مراد ہوتی ہیں اس لئے کہ آیت سے ہمارے یہاں عرف و شرع میں یہی معہود اور معروف ہے۔

رہی یہ دلیل کہ آیت کا سیاق پہلے معنی پر دال ہے سو یہ بھی درست نہیں کیونکہ سیاق و سباق میں کوئی ایسی دلیل یا آیت نہیں جس سے کتب سابقہ یا شرائع متقدمہ کے نسخ کا ذکر ہو۔ بلکہ اس سے ماقبل آیت جو فاضل محترم نے ذکر فرمائی ہے وہ حقیقتاً اس تیسرے معنی کی ہی موید ہے۔ یعنی یہ آیت کہ وہ جو کافر ہیں کتابی یا مشرک وہ نہیں چاہتے کہ تم پر کوئی بھلائی اترے تمہارے رب کے پاس سے اور اللہ اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے (کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن (ص ۱۸)۔ اس

۱۲۔ علاؤ الدین علی بن محمد خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل ج ۱ ص ۷۲۔

آیت میں ایک تو صرف یہود و نصاریٰ کا ذکر نہیں بلکہ اس کے ساتھ مشرکین کا بھی ذکر ہے۔ لہٰذا وہ معنی مراد لئے جانے زیادہ بہتر ہیں بلکہ وہی مراد لئے جائیں گے جو ان دونوں گروہوں کے زیادہ مناسب ہوں اور وہ معنی دوسرے ہی ہیں کیونکہ مشرکین کو پچھلی کتابوں سے کیا غرض وہ تو قرآن کو ہی جانتے تھے اسی کو نازل ہوتا دیکھتے تھے اور معاذاللہ اسی میں عیوب اور برائیاں نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ سورہ نحل کی یہ آیت ہے کہ و اذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ۔ الآیۃ۔ اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارتا ہے، کافر کہیں کہ تم دل سے بنا لیتے ہو (یعنی گھڑ لیتے ہو) بلکہ ان میں اکثر کو علم نہیں تو اس آیت کی شان نزول علماء اور مفسرین یہی بیان فرماتے ہیں کہ مشرکین قرآنی آیات کے نسخ پر اعتراض کرتے تھے اور اس کی مصلحتوں سے عدم واقفیت کی بنا پر اس کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک روز ایک حکم دیتا ہے اور دوسرے روز دوسرا حکم دیتا ہے وہ تو اپنے دل سے باتیں بنا لیتا ہے۔ اس پر یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔[۱۳]

دوسرا نکتہ آیت (ما ننسخ من آیۃ الآیۃ) میں یہ بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خیر کا لفظ ذکر فرمایا ہے جس کے معنی ہیں بہتری اور بھلائی کے جبکہ نسخ میں بھی یہی حکمت کارفرما ہوتی ہے کہ دوسرا حکم پہلے حکم سے بہتر ہوتا ہے اور امت کی بھلائی اور نفع کے لئے نازل کیا جاتا ہے اور امت کی خیرخواہی کے لئے ہی پہلے حکم کو منسوخ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا کفار ایسی مسلمانوں کی بھلائی اور خیرخواہی کو پسند نہیں کرتے اور اللہ فرماتا ہے کہ ہم تمہارے لئے بہتر چیز اتارتے ہیں اور وہ وہی دوسرا حکم ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ آیت تو صراحۃ نسخ آیات کی موید ہوئی نہ کہ اس کی مخالف۔

سورہ نحل کی آیت نمبر ۱۰۱ سے جو محرر نے استدلال کیا ہے اس کی تفصیل ماقبل میں آگئی۔ اس آیت کی شان نزول کے ذریعہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس آیت میں قرآن کی نسخ آیات ہی مراد ہے کیونکہ یہی مشرکین کا اعتراض تھا اور قرآن اس آیت میں اسی کا جواب دے رہا ہے۔ اس منقولی اور سماعی توجیہہ کے بعد اب اس آیت میں کسی عقلی توجیہہ یا قیاس وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی جبکہ فاضل محترم نے جو عقلی قیاس

۱۳۔ محمد نعیم الدین، مولانا، خزائن العرفان فی تفسیر القرآن ص ۲۲۳۔

پیش کیا ہے وہ کوئی معقول بھی نہیں ۔ اس لئے کہ ان کا یہ فرمانا کہ "وہ نہ تو پہلی آیت کو ماننے والے تھے نہ دوسری کو خود ان کے دعوے کو باطل کر دیتا ہے ۔ کیونکہ جس طرح وہ آیات قرآنی میں سے کسی آیت کو نہیں مانتے تھے اسی طرح پچھلی کتابوں میں سے بھی کسی کتاب کو تسلیم نہیں کرتے تھے ۔ تو پھر آپ کی دلیل کے مطابق اب بھی ان کا "انت مفتر" کہنا درست نہ ہوا اور نہ ان کو نسخ شرائع اور نسخ کتب سابقہ پر اعتراض کا کوئی حق ہوا کیونکہ آپ کے نزدیک اعتراض کا حق اسی کو ہے جو اس کو مانے ۔

ایک بات فاضل محرر نے یہ بھی فرمائی کہ "آیات کو آپس میں تطبیق نہ دے سکنے کی وجہ سے یہ غلط نظریہ راہ پا گیا" یہ اعتراض اس وقت ہو سکتا تھا جب نسخ کی صرف ایک ہی قسم ہوتی یعنی وہ جس میں حکم منسوخ ہو جائے اور تلاوت باقی رہے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ نسخ کی تین قسمیں ہیں ۔ ان تمام قسموں کو اگر مد نظر رکھا جائے تو یہ اعتراض ہی نہیں بنتا ۔ اور اس دوسری قسم کے لحاظ سے بھی یہ اعتراض درست نہیں ۔ اگر یقین نہ آئے تو ماقبل کچھ آیات (ناسخ و منسوخ) گذر چکی ہیں ۔ ان میں غور کر کے دیکھ لیں ۔ سوائے نسخ کے ان میں کوئی تطبیق ممکن نہیں ۔

نسخ کے عدم جواز پر تیسرے نمبر کے تحت یہ عقلی دلیل لائی گئی ہے کہ اگر آیات کے نسخ کو مان لیا جائے تو اس سے قرآن میں تضاد، اختلاف اور تناقض لازم آئے گا ۔ حالانکہ اس کی شان یہ ہے کہ افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا ۔ لہٰذا اس آیت کے مطابق نسخ آیات کی صورت میں اختلاف کے باعث اس کا من عند غیر اللہ ہونا لازم آ جائے گا ۔ تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ یہ تمام مفروضے اس وقت ثابت ہوں گے جب ان آیات کے حکم ثابت قائم اور باقی ہوں جبکہ نسخ کا مطلب ہی یہ ہے کہ پہلا حکم ختم ہو گیا ۔ اب صرف ایک حکم رہ گیا تو اختلاف کہاں رہا ۔

چوتھی دلیل یہ ذکر کی گئی کہ نسخ آیات سے تبدیلی لازم آئے گی جبکہ قرآن کا ارشاد ہے لا مبدل لکلمتہ ۔ اس کا جواب معترض نے خود دے دیا ہے یہ کہہ کر کہ دوسرا کوئی نہیں بدل سکتا انہیں خود اللہ تعالیٰ ہی بدل سکتا ہے جبکہ نسخ کے بعد دوسری آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی نازل ہوتی ہے اور وہی اس کو بدلتا ہے ۔ صاف قرآن میں اس بدلنے کی نسبت اپنی طرف کر کے مشرکین کا یوں

رد کرتا ہے کہ وا ذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ الآیۃ ۔ اور اس وہم کا ازالہ تو پچھلے مباحث سے خود بخود ہو جانا چاہیے کہ آنحضرت کا اس کے متعلق کوئی ارشاد نہیں جبکہ ماقبل میں کئی احادیث گذر چکی ہیں اس کے علاوہ بخاری، مسلم ترمذی اور دیگر کتب حدیث میں متعدد روایات اس کے متعلق موجود ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان وضاحتوں کے بعد اب کسی کے ذہن میں اس مسئلہ پر کوئی خلش باقی نہیں رہے گی۔

علامہ میمنی کا علمی مرتبہ

محمد محمود میمن

والد محترم علامہ عبدالعزیز میمن مرحوم عربی کے ایک متبحر عالم، عظیم محقق، بلند پایہ ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ ان کی شخصیت عربی سے تعلق رکھنے والوں کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ پاک و ہند سے جو کوئی عرب ممالک جاتا تھا اور وہاں اس کا واسطہ عربی کے طلباء، علماء، فضلاء یا محققین سے پڑتا تھا تو یہ حضرات سب سے پہلے اس سے یہ سوال کرتے تھے کہ کیا آپ "استاذ المیمنی" کو جانتے ہیں اور یہ کہ وہ کیسے ہیں۔ یہ سب حضرات ان کے علمی اور تحقیقی کارناموں کی وجہ سے ان سے غائبانہ طور پر بخوبی واقف ہوتے تھے۔ ان کی اس جستجو سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عرب ممالک کے علماء اور فضلاء کے دلوں میں ان کا کیا مقام تھا اور یہ کہ ان کی شہرت پاک و ہند کی سرحدوں سے کتنی دور تک جا پہنچی تھی۔ افسوس کہ ان کی رحلت سے برصغیر ہی نہیں بلکہ سارا عالم عرب ایک عظیم محقق، مبصر اور عربی دان سے محروم ہو گیا۔ ان جیسی عالی مرتبت شخصیتیں تو کہیں صدیوں میں جنم لیتی ہیں۔ اگر ہم موجودہ حالات، تعلیمی نظام اور مدارس کا جائزہ لیں تو مشکل ہی نظر آتا ہے کہ یہ عہد ان کے پایہ کی کسی علمی شخصیت کو جنم دے سکے۔

والد محترم علامہ عبدالعزیز میمن بن حاجی عبدالکریم ۱۸۸۸ء میں بمقام گونڈل (ہندوستان) پیدا ہوئے۔ دادا حضور بہت عبادت گزار اور دیندار آدمی تھے۔ شادی سے قبل ہی انہوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اپنی پہلی اولاد نرینہ کو دینی تعلیم اور عربی زبان کے لئے وقف کر دیں گے۔ چنانچہ والد محترم نے اپنی ابتدائی تعلیم راجکوٹ میں حاصل کی جہاں دادا حضور رہائش پذیر تھے۔ کچھ عرصہ جوناگڑھ میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد غالباً ۱۹۰۱ء میں دادا حضور نے انہیں مزید تعلیم کے لئے اپنے ا[illegible]

ہمراہ دہلی بھیج دیا۔ ان دنوں دہلی علوم اسلامیہ کا ایک بڑا مرکز تھا۔ بڑے بڑے علماء، فضلاء اور ادبا وہاں موجود تھے۔ انہوں نے اپنی عربی کی تعلیم اس وقت کے مروجہ طریقہ پر مساجد اور دینی مدارس میں حاصل کی۔ انہیں بڑا اشتیاق تھا کہ سید نذیر حسین محدث دہلوی سے شرف تلمذ حاصل ہو مگر افسوس کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اس لئے کہ غالباً ۱۹۰۲ء کے اوائل ہی میں وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے تھے۔

والد محترم نے بخاری شریف اور صحیح مسلم مولوی عبدالرحمٰن پنجابی سے پڑھی جو خود ایک ممتاز محدث اور صرف و نحو کے ماہر تھے۔ ترمذی جہاں تک انہیں یاد تھا مولوی عبدالجبار عمرپوری سے پڑھی۔ بقول والد محترم اس وقت کے حدیث کے علماء میں جید ترین عالم مولانا محمد بشیر سہسوانی تھے ان سے انہوں نے ابوداؤد شریف پڑھی۔ طالب علمی کے آخری دور میں انہیں مولوی ڈپٹی نذیر احمد کی شاگردی کا بھی شرف حاصل ہوا جو عربی علم و ادب کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ ان سے حماسہ، متنبی، مقامات اور سقط الزند پڑھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد اپنی فارسی اور اردو کی استعداد کے سبب بھی بہت ممتاز تھے۔ بقول والد محترم وہ اُردو ترجمہ اس قدر خوبصورت کرتے تھے کہ جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ والد محترم فرماتے تھے کہ جس استاد کی تعلیم سے انہوں نے عملاً سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا وہ مولوی عبدالرحمٰن پنجابی کی ذات باصفات تھی جو دہلی میں حاجی علی جان کی مسجد میں جو گھنٹہ گھر کے قریب تھی درس دیا کرتے تھے۔ وہ مزید فرماتے تھے کہ انہوں نے جس محبت اور شفقت سے انہیں تعلیم دی اس کا احسان وہ زندگی بھر نہ بھولیں گے۔ ان کے حالات کے ذیل میں امام خاں نوشہروی نے جو "تاریخ علمائے حدیث ہند" میں حالات لکھے ہیں اس کا ایک جملہ یہاں تحریر کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالرحمٰن کے بے انتہا شاگرد ہیں مگر سب سے بڑا شرف اور سب سے بڑی منقبت ان کی یہ ہے کہ علامہ عبدالعزیز میمن ان کے خاص شاگرد ہیں اور اس پر وہ جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔"

دہلی میں قیام کے دوران جب والد محترم کی عمر سترہ، اٹھارہ سال تھی تو اس وقت انہوں نے شیخ حسین بن محسن الانصاری سے حدیث کی سند حاصل کی جو شیخ نے اپنے قلم سے تحریر کر کے ان کو "علامہ عبدالعزیز الولد العزیز" کے لقب کے ساتھ عطا کی۔ اس طرح سے انہوں نے حدیث کے

ایک عظیم امام محمد ابن علی شوکانی کے ساتھ اپنا سلسلہ قائم کیا۔ یہ سند، علمائے حدیث کی نظر میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ وفات کے وقت وہ آخری بقید حیات شخص تھے جن کے پاس یہ سند تھی۔ ۱۹۰۸ء میں وہ دہلی سے امروہہ تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے فقہ کی خصوصی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۰ء میں وہ رامپور چلے گئے اور وہاں انہوں نے محمد طیّب مکّی استاد حکیم اجمل خاں، مولوی عبدالعزیز صاحب استاد نواب رامپور اور مولوی فضل حق صاحب صدر مدرس مدرسۂ عالیہ رامپور سے فلسفہ اور منطق کی تعلیم حاصل کی۔ رامپور ہی کے قیام کے دوران انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۱۱ء میں منشی فاضل اور ۱۹۱۳ء میں مولوی فاضل کے امتحانات بحیثیت پرائیوٹ امیدوار کے دیئے اور ہر دو امتحانات میں تو انہوں نے ریکارڈ بھی قائم کیا جو بقول ان کے چالیس سال تک قائم رہا۔

والد محترم کی تصانیف جہاں تک میرے علم میں ہے تیس کے لگ بھگ ہیں اور ان میں سے زیادہ تر کتب مصر، شام اور دیگر اسلامی ممالک سے شائع ہوئیں۔

علی گڑھ کے قیام کے زمانے کا ان کا مایہ ناز تحقیقی کارنامہ ان کی کتاب 'سمط اللآلی' ہے جو مصر سے شائع ہوئی۔ اس کا تعلق ابوعلی القالی کی کتاب 'الآمالی' سے ہے۔ اس کی شرح ابوعبید البکری نے اللآلی کے نام سے پانچویں صدی ہجری میں لکھی تھی جو بہت نایاب ہے۔ والد محترم نے اس کے بہت سے نسخے جمع کئے، تقابلی مطالعہ کیا اور موازنہ و تصحیح کے بعد ایک نسخہ ترتیب دیا اور اس پر حواشی لکھے اور خود قاہرہ جاکر ۱۹۳۵ء میں اسے شائع کرایا۔ یہ ان کی محبوب ترین کتاب ہے اور وہ اس کو نوادر لغات و اشعار کا بہترین ذخیرہ سمجھتے تھے۔ ان کی اس کتاب نے شائع ہوتے ہی عرب دنیا میں ہل چل مچادی اور اس کے سبب عربی لغت اور ادب میں علمائے عرب اور محققین زبان سے انہوں نے اپنے عمیق مطالعہ اور تحقیق کا لوہا منوایا اور اسی کتاب کی بدولت وہ عرب دنیا سے روشناس ہوئے اور انہیں عربی زبان و ادب کا امام تسلیم کیا جانے لگا۔

ان کی دوسری معرکتہ الآرا کتاب جو انہوں نے اپنے لاہور کے قیام کے دوران تصنیف کی اور مصر سے شائع کرائی 'ابوالعلا و ما الیہ' ہے۔ مصر کے مشہور عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو عرب کے نامی گرامی شاعر

اور فلسفی ابوالعلاء المعری پر سند مانا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ان کو جسمانی، ذہنی اور کئی دوسرے طریقوں سے بھی کافی مناسبت تھی۔ ان کی کتاب 'ذکری ابی العلاء' جب چھپی تو اسے عرب دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مگر جب والد محترم کی کتاب ابوالعلاء وما الیہ شائع ہوئی تو اس نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی 'ذکری ابی العلاء' کو پیچھے ڈال دیا۔ مصر کے عظیم علماء و فضلاء مثلاً مرحوم احمد تیمور پاشا، شیخ محمد خضر الیتونسی احمد الاسکندری اور احمد شاکر اور بہت سے دوسرے حضرات نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "بہترین کتاب جو کبھی لکھی گئی"۔ شام کے مشہور عالم علامہ کرد علی نے "المجمع العلمی العربی" کے مجلہ کے ایک شمارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا "یہ سب سے عمدہ کتاب ہے جہاں تک تحقیق کا تعلق ہے"۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین الفاظ اور طرز تحریر کے ماہر تھے مگر ان کو کرم خوردہ نسخوں کی تصحیح و مقابلہ، روایات اور بیانات کے تقابل و ترجیح اور اغلاط و فروگذاشتوں کی تصحیح پر قدرت نہ تھی۔ اس کام کے لئے بینائی، فہم، حیرت انگیز اور غیر معمولی یادداشت، لگن اور سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے ان اوصاف کی ڈاکٹر طٰہٰ حسین مرحوم میں اپنی تمام خوبیوں اور کمالات کے باوجود کمی تھی اور والد محترم میں یہ سب باتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

ان کا تیسرا نمایاں تحقیقی کام 'الوحشیات' ہے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے شاعر ابو تمام کے کلام کی ضروری تصحیح کی اور اسے مرتب کر کے شائع کرایا۔ ان کا یہ کام کراچی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

خزانۃ الادب (عبدالقادر لبغدادی) کا انڈکس 'اقلید الخزانہ' کے نام سے شائع کرایا۔

امام عبدالقاہر الجرجانی نے ابو تمام اور متنبی کے دواوین کا انتخاب 'الطرائف الادبیہ' کے نام سے کیا تھا اسے بھی انہوں نے حواشی اور ضروری تشریحات کے ساتھ المختار من شعر المتنبی والبحتری وابی تمام للامام عبدالقاہر الجرجانی، کے نام سے شائع کرایا۔

ابو تمام کا دیوان الحماسۃ الصغری، اور علی حمزہ بصری کی 'التنبیہات علی اغالیط الرواۃ' شائع کیں۔

ان چھ کتابوں کے علاوہ ان کی دیگر تالیفات جن کا مجھے علم ہو سکا وہ مندرجہ ذیل ہیں: (۷) 'زیادات دیوان شعر المتنبی' (۸) دیوان حمید بن ثور (۹) 'دیوان سحیم' (۱۰) 'الافاضل للمبرد' (۱۱) المقصور والممدود

ولابن ولاد (۱۲) نسب عدنان و قحطان (۱۳) ثلاث رسائل نادرة (۱۴) تکملة دیوان ابن عنین (۱۵) القائت ، من شعر المتنبی (۱۶) النتف من شعر ابن رشیق و ابن شرف (۱۷) المداخلات للمطرز غلام ثعلب (۱۸) فہارس سمط اللآلی (۱۹) تسع قصائد نادرة (۲۰) المباحث العلمیہ (۲۱) ما اتفق لفظہ و اختلف معناہ من القرآن المجید (۲۲) رسالۃ الملائکۃ (۲۳) ابواب مختارۃ من کتاب ابی یوسف یعقوب بن اسحاق الاصبہانی (۲۴) کتاب التصحیف (۲۵) کتاب الانواء (۲۶) دیوان الافوہ الاودی (۲۷) دیوان الشنفری (۲۸) دیوان ابراہیم بن العباس الصولی اور (۲۹) کتاب لحن العامہ

والد محترم نے کافی تعداد میں مقالے پڑھے اور مضامین لکھے جو بین الاقوامی شہرت کے علمی جریدوں میں شائع ہوئے۔ پشاور میں ملازمت کے دوران جو غالباً ۲۰-۱۹۱۴ء کا زمانہ تھا عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر ان کے مضامین لاہور کے ادبی رسالے مخزن میں شائع ہوئے۔ لاہور میں قیام کے دوران (۲۵-۱۹۲۱ء) اورینٹیل کالج میگزین میں مختلف موضوعات پر ان کے مضامین چھپے۔ علی گڑھ کی ملازمت کے زمانہ میں جو ۵۱-۱۹۲۶ء تک محیط تھا ان کے مضامین مختلف رسائل اور جریدوں میں چھپتے رہے مثلاً معارف (اعظم گڑھ) برہان (دہلی) الندوہ (لکھنو) اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) مجلہ المجمع العلمی العربی (دمشق) الزہرۃ (مصر) وغیرہ وغیرہ۔ ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے انعقاد کے سلسلے کے تیسرے اجلاس میں جو دسمبر ۱۹۳۸ء میں دہلی میں منعقد ہوا تھا انہوں نے ایک مقالہ کتاب اسماء جبال تہامہ و سکانہا وما فیہا من القری وما ینبت علیہا من الاشجار وما فیہا من المیاہ کے عنوان سے پڑھا جو اس جلسے کی طبع شدہ روداد میں موجود ہے۔ ۱۹۴۰ء میں میری محسن کتابیں کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شروع ہوا تھا۔ اس میں نومبر ۱۹۴۱ء کے شمارے میں ان کا بھی ایک نہایت فاضلانہ اور ذہانت سے بھرپور مضمون شائع ہوا جو عربی سے شغف رکھنے والے طلباء ہی کے لئے نہیں بلکہ فضلاء کے لئے بھی معلومات کا خزانہ ہے۔ معارف (اعظم گڑھ) میں ابوالعلاء وما الیہ اور اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) میں المفضلیات پر ان کے مضامین چھپے ہیں۔ مجلہ المجمع العلمی العربی دمشق میں انہوں نے یاقوت الحموی کی معجم الادباء پر تبصرہ لکھا جو کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ ان کا ایک مضمون بعنوان ابوعمر الزاہد مجلہ المجمع العلمی الہندی علی گڑھ

(ہندوستان) میں ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ شاید یہ والد محترم کا طبع شدہ آخری مضمون ہو۔

والد محترم حیرت انگیز اور قابل رشک یادداشت کے مالک تھے اور علمائے سلف کا نمونہ تھے۔ انہیں تقریباً ایک لاکھ سے زائد اشعار زبانی یاد تھے۔ دیوان متنبی اور دیوان حماسہ تقریباً مکمل حفظ تھے۔ اس حقیقت کا اعتراف ان کے بہت سے دوستوں اور مداحوں نے اپنی محفلوں اور تحریروں میں بھی کیا ہے۔ اکثر حضرات ان کے پاس تحقیق کے سلسلے میں حاضر ہوتے تھے تو وہ ان کو کتابوں، نادر قلمی نسخوں اور دستاویزات کے عنوانات معہ ان کے مصنفین اور مولفین کے نام اور ایڈیشن اور دنیا کی کن کن لائبریریوں میں وہ دستیاب ہیں بتلایا کرتے تھے۔ نادر قلمی نسخوں کے حوالہ جات پر انہیں غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ والد محترم ۱۹۳۵ء، ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء میں اسلامی ممالک کے دورہ پر تشریف لے گئے۔ ایران، فلسطین، شام، عراق، ترکی، تیونس اور مراکش میں وہاں کے علما اور فضلا سے ملاقاتیں کیں اور لائبریریاں کھنگالیں، نادر قلمی نسخوں کا مطالعہ کیا اور ان سے خوب خوب استفادہ کیا۔ وہ برصغیر سے المجمع العلمی العربی (دمشق) کے سب سے پرانے اور نمایاں رکن تھے۔ ان سے قبل صرف دہلی کے حاذق الملک حکیم اجمل خان مرحوم کو یہ اعزاز حاصل رہا اور ان کی سند بھی وہ اپنے ہمراہ عرب ممالک کے دورے سے واپسی پر اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کے متعلقین کے حوالے کی تھی۔ المجمع العلمی العربی کی رکنیت ایک بہت بڑا ادبی اعزاز ہے جو بہت ہی نمایاں مستشرقین اور مشرقی علما اور فضلا میں سے کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ والد محترم کے مضامین بڑے آب و تاب اور بڑی باقاعدگی کے ساتھ اس ادارے کے مجلے میں شائع ہوتے تھے اور ان کا اپنا ایک مقام ہوتا تھا اور یہ مضامین عربی کے شیدائیوں کو زبان کے مطالعے کے اچھے اور نادر مواقع فراہم کرتے تھے۔ والد محترم چوٹی کے علماء کے ساتھ علمی مباحثوں میں اپنے مطالعے اور تحقیق کے سبب بہت جلد محفل پر چھا جاتے تھے اور اپنی قابلیت اور عربی دانی کا لوہا منوا لیتے تھے۔ ایک نہیں ایسے بہت سے واقعات ہیں جن کا تذکرہ ان کے احباب اور معتقدین نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

جمیل الدین عالی نے روزنامہ "جنگ" مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۸۰ء میں والد محترم کے سلسلے میں اپنے

تجربات کا اظہار اس طرح سے کیا ہے علامہ شبیبی وائس چانسلر بغداد یونیورسٹی اور وزیر تعلیم عراق نے پروفیسر محمد شریف مرحوم اور میر خلیل الرحمٰن کی موجودگی میں مجھ عاجز سے ایک بات کہی۔ یہ ۱۹۶۰ء کا واقعہ ہے۔ ہم پاکستانی وفد کے اراکین تھے اور جنرل کریم قاسم کی دعوت پر بغداد گئے تھے۔ بڑے عشائیے میں علامہ شبیبی سے ملاقات ہوئی تو بولے ہم عراقی پاکستان کو اسلامی برادری کا ایک اہم رکن سمجھتے ہیں (وغیرہ وغیرہ) مگر معاف کیجئے میں پاکستان پر بڑا رشک کرتا ہوں۔ حضرت وہ کیوں! فرمایا۔ عربی زبان اور قدیم عربی کے سب سے بڑے ماہر علامہ میمن راجکوٹی آپ کے پاس ہیں۔ پوری دنیائے عرب میں ایسا کوئی آدمی نہیں بھئی میں تو پاکستان کو دراصل علامہ میمن کے حوالے سے جانتا ہوں۔

عالی صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں۔ "شیخ الازہر شیخ محمد شلطوت کے ایک شاگرد پروفیسر سید بداوی امریکہ میں میرے ساتھ تھے۔ ایک دن سنایا کہ ایک مجلس میں ایک قدیم محاورے پر بحث تھی۔ مراکش سے ایک بڑے استاد آئے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے شیخ کی بات نہ مانتے تھے۔ جونیئر اساتذہ حیران کہ ہمارے شیخ کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ مگر مراکشی بزرگ کا پلّہ بھاری پڑتا نظر آتا تھا۔ یکایک شیخ شلطوت اٹھے اور اپنی لائبریری کی طرف گئے۔ ایک کتاب لائے بیٹھ کر ایک صفحہ نکالا اور مراکشی بزرگ کے سامنے بڑھا دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے کتاب الٹ کر مصنف کا نام پڑھا۔ پھر ایک دم وہ ورق دیکھا اور لمحہ بھر میں آنکھیں نیچی کرلیں۔ الحمدللہ۔ انہوں نے کہا۔ یا شیخ میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ علامہ میمنی نے یوں بتایا ہے تو درست ہی بتایا ہوگا۔ ہم لوگوں نے پریشان ہوکر اپنے شیخ سے پوچھا۔ آپ عرب ہوکر ان سے سند لائے ہیں۔ فرمایا۔ ان کی نظر سے ایک لاکھ کے قریب تو مخطوطات گزر چکے ہیں۔ عزیزو! یاد رکھنا علامہ میمنی اس زمانہ میں عربی زبان کے سب سے بڑے آدمی ہیں۔"

والد محترم کے یورپی مستشرقین اور عالم عرب کے بیشتر علماء اور فضلاء سے گہرے اور ذاتی مراسم تھے۔ مثلاً برطانیہ کے ڈاکٹر ایف کرینکو جرمنی کے ڈاکٹر اوٹو اسپیس شام کے علماء میں سلفی عالم شیخ محمد بہجت بیطار، مشہور عالم استاد محمد المبارک، فاضل ادیب علامہ کرد علی، مصر کے عبدالوہاب عزام بے مراکش کے شیخ محمد العربی اور عرب کے علامہ خیرالدین زرکلی۔ ان میں سے اکثر حضرات ادبی تحقیق کے سلسلے میں

ان سے رجوع بھی کرتے تھے ۔

والد محترم نے نوے سال اس دار فانی میں گذارے ۔ حالانکہ وہ اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکے تھے لیکن پھر بھی اس وقت تک عربی زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے جب تک قوائے جسمانی نے ان کا بالکل ساتھ نہ چھوڑ دیا۔ وہ کراچی میں ۲۶ - ۲۷ ، اکتوبر کی درمیانی شب بوقت ساڑھے تین بجے بروز جمعہ (۲۰ اکتوبر ۱۹۷۰ء مطابق ۲۳ ذیقعدہ ۱۳۹۰ھ) اس دار فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کر گئے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ تصانیف و تالیفات کی صورت میں جو انہوں نے عظیم الشان ادبی کام اپنے پیچھے چھوڑا ہے وہ رہتی دنیا تک ان کے نام کو کبھی فراموش نہ ہونے دے گا اور عربی کے عظیم ادبا کی فہرست میں ان کے لئے ایک عزت کا مقام حاصل کرے گا ۔ وہ ایک مستند استاد و محقق اور کہنہ مشق نقاد و مورخ تھے جن کی عظیم شخصیت سے پاکستان کو عزت و شرف حاصل ہوا اور آج وہ اپنی رحلت کے بعد خود بھی تحقیق کا ایک اچھوتا موضوع بن گئے ہیں ۔

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لئے دو نسخے ارسال فرمایئے)

محاسن الشعر

مرتب : محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی علیگ

ناشر : ملتزم النشر والتوزیع ۔ مکتبۃ الاصلاح ۔ سرائے میر ۔ اعظم گڑھ ۔ یوپی ۔ انڈیا

طابع : مطبع کوثر ۔ سرائے میر ۔ اعظم گڑھ ۔ یوپی ۔ انڈیا

سال اشاعت : ۱۹۷۸ء ۔ تعداد صفحات : ۴۴ ۔ قیمت : چار روپے

زیر تبصرہ کتاب کے مولف، محمد اجمل، مدرسۃ الاصلاح میں میرے ہم جماعت برادرم مولوی محمد ایوب اصلاحی استاذ مدرسۃ الاصلاح کے لائق فرزند ہیں۔ انہوں نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے لے کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تک میں ایک ہونہار طالب علم کی حیثیت سے وقت گذارا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح میں کچھ عرصہ ادب عربی کے استاذ بھی رہ چکے ہیں۔ سال گذشتہ انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ عربی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ان دنوں لکھنؤ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مولانا حمید الدین فراہی کی کتاب مفردات القرآن کو تعلیقات وحواشی اور بعض اضافوں کے ساتھ از سر نو مرتب کر رہے ہیں جس کا بڑا حصہ وہ مکمل کر چکے ہیں۔ ہندوستان کے مطالعاتی سفروں میں وہ اکثر میرے ساتھ رہے اور مجھے اپنے ریسرچ پروجیکٹ "مولانا حمید الدین فراہی" پر مواد کی فراہمی کے سلسلے میں ان سے بہت مدد ملی۔ ان کی نشاندہی پر بہت سے نئے مآخذ تک میری رسائی ہوئی۔ بہت سے نوٹس اور یادداشتیں جو انہیں اپنے کام کے دوران ہاتھ آئے تھے وہ بلا اخفا تامل میرے حوالہ کر دیئے جیسے وہ میرے ہی لئے جمع کئے ہوں۔ ایسے مخلص اور ایثار پیشہ دوستوں اور عزیزوں کے تعاون ہی کی بدولت میں ابھی تک حوصلہ نہیں ہارا اور ہمت شکن حالات کے باوجود پروجیکٹ کی تکمیل کے لئے کوشاں ہوں۔

مجھے یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی کہ محمد اجمل سلمہ عربی میں تقریر و تحریر کے علاوہ عربی ادب بالخصوص

عربی نظم و شعر پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ علمی اور ادبی ذوق کے علاوہ وہ سیرت و کردار کے اعتبار سے بھی حقیقی معنوں میں ایک مسلم نوجوان کی جملہ صفات حسنہ سے متصف ہیں۔ انہوں نے کم عمری کے باوجود تعلیمی میدان میں جو مدارج طے کرلئے ہیں وہ آج کل کے نوجوانوں کے لئے قابل رشک ہے۔ وہ ایک ایسے جوان صالح ہیں جنہیں مسلم معاشرہ میں بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

ان کا مرتب کردہ پیش نظر شعری مجموعہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی اپنی شخصیت اور سیرت و کردار کا آئینہ دار ہے جس میں علم و ادب کے ساتھ پاکیزگی اور صالحیت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

یہ مجموعہ جیسا کہ انہوں نے خود تقدیم میں صراحت کردی ہے عربی کی دوسری جماعت کے طالبعلموں کی درسی ضروریات کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ اعلیٰ جماعتوں کے لئے تو مجامیع انتخاب بہت ملیں گے لیکن ابتدائی جماعتوں میں شعر و ادب پڑھانے کا چونکہ زیادہ رواج نہیں رہا ہے اس لئے اس طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اس مجموعے کے انتخاب میں طالب علم کی ذہنی سطح کے علاوہ جس بات کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے وہ مسلمان طلبہ کے اذہان و قلوب کی فکری اور ایمانی تربیت ہے۔ عربی شاعری اخلاقی اعتبار سے بلند و پست دونوں طرح کے اشعار پر مشتمل ہے۔ خام طبائع کو محض زبان اور اسلوب بیان کی خاطر مخرب اخلاق اشعار پڑھانا مناسب نہیں ہوتا۔ اس انتخاب میں یہی خوبی ہے کہ ایک ایک شعر کو اچھی طرح پرکھ کر شامل کیا گیا ہے۔ اس کی ابتداء حماسہ اور معلقات کے شارح اور فراہی کے استاذ مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے کلام سے ہوتی ہے۔

اعوذ باللہ العظیم — من کل شیطان رجیم

واللہ یہدی من یشاء — الی صراط مستقیم

اس مجموعے میں تقریباً پچاس شعراء کے ۸۰ اقتباسات درج کئے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ معروف شعراء کے نام یہ ہیں۔ حسان بن ثابت، ابوالعتاہیہ، متنبی، لبید بن ربیعہ نابغہ شیبانی، ابونواس۔ اس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو دین و اخلاق سے ہٹا ہوا ہے۔ مرتب کے پیش نظر معیار انتخاب کی حیثیت سے حضرت عمر کا یہ قول رہا ہے۔

"محاسن الشعر تدل علی مکارم الاخلاق و تنہی عن مساویہا۔"

اور کتاب کا نام بھی یہیں سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول کتاب کے نام اور کتاب کے مشمولات کے لئے مقیاس کا درجہ رکھتا ہے۔

یہ کتاب کا جزو اول ہے۔ جزو ثانی جو تیسری جماعت کے طلبہ کے لئے ہوگا نہیں معلوم کس مرحلے میں ہے۔ کتاب کے آخری صفحے پر درج اس کا ذکر اور تعارف یہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ جزو بھی مرتب ہو کر تیار ہو چکا ہے۔

خوبصورت ٹائپ میں اسے صوری محاسن سے آراستہ کرنے کا سہرا مطبع کوثر سرائے میر کے مالک احمد محمود صاحب کے سر ہے جن کا ذکر اس سے بیشتر فکر و نظر کے صفحات میں "الادب الجمیل" اور "المدیح النبوی" پر تبصرہ کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔

(شرف الدین اصلاحی)

ماہنامہ

ذوالقعدہ ۱۴۰۰ھ ☐ اکتوبر ۱۹۸۰ء

ادارہ تحقیقات اسلامی ○ اسلام آباد

(پاکستان)

فکر و نظر اسلامی حدود کے اندر آزادی اظہار رائے کا حامی ہے۔ فکر و نظر میں کسی مضمون کی اشاعت کا یہ مطلب نہیں کہ ادارہ ان افکار و خیالات سے لازماً متفق ہے جو اس میں پیش کئے گئے ہیں۔ مضمون نگار اپنے خیالات کا خود ذمہ دار ہوتا ہے

سالانہ چندہ پندرہ روپئے ششماہی آٹھ روپئے فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

طابع و ناشر: **محمد سمیع اللہ** سکرٹری ادارہ تحقیقات اسلامی۔ اسلام آباد

مطبع: اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پریس۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵۔ اسلام آباد

سکولوں، کالجوں اور لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

ماھنامہ **فکر و نظر** اسلام آباد

جلد ــــ ۱۸	ذی قعدہ ۱۴۰۰ھ ۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء	شمارہ ــــ ۴

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

ربع مسکوں میں شرق تا غرب مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھ کر ملت اسلامیہ کا ہر وہ شخص پریشان ہوتا ہے جس کے دل میں احساس زیاں باقی ہے۔ لیکن مسلم معاشرے میں ایسے اشخاص کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ ان کے دل سے احساس زیاں کب کا مٹ چکا ہے اور وہ جس حال میں ہیں مست اور مگن ہیں۔ ان کے امیر مال مست ہیں تو ان کے فقیر حال مست۔ اس بے حسی کا سبب دریافت کریں تو ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان من حیث القوم اپنے نصب العین سے دور ہو چکے ہیں، بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کے پیش نظر اب سرے سے کوئی نصب العین رہا ہی نہیں۔ کسی نصب العین کا نہ ہونا آج کل کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا نصب العین ہے کیا۔ اور اس نصب العین کی طرف انہیں کس طرح مائل کیا جا سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس ملت کے نام ہی میں مضمر ہے۔ البتہ امتداد زمانہ اور ناواقفیت کی وجہ سے اس حقیقت کے چہرے پر جو پردہ پڑ گیا ہے اسے ہٹانے کے لئے یک گونہ شعوری کوشش کی ضرورت ہے۔ سو یہ کام اس قوم کے علماء، دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کا ہے کہ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں سے اس پردے کو ہٹانے کی سعی کریں۔ اور مسلمانوں میں یہ شعور زندہ کریں کہ مسلمان کے نام سے ان کا موسوم ہونا امر

اتفاقی نہیں بلکہ ان کے نام کا ان کی زندگی سے گہرا تعلق ہے ۔
یہ کوئی فلسفے کے اسرار و رموز نہیں ، بلکہ پیش پا افتادہ ایک عام سی اور معمولی، مگر مبنی بر حقیقت بات ہے کہ معمورہ ارض میں مسلمان نام کی ایک جداگانہ قوم یا ملت اس وقت وجود میں آئی جب اسلام ایک تحریک کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ اسلام نے اسی زمین کے بسنے والوں میں سے کچھ لوگوں کو ان کی خاص صفات اور امتیازی صلاحیتوں کے پیش نظر چن کر ایک قومی وحدت کی تشکیل کی۔ ظاہر ہے وہ قوت جامعہ جس نے اس نوخیز جماعت کو اکٹھا کر کے قومی تشخص عطا کیا یہی اسلام تھا جو ہمیشہ کے لئے اس ملت کا نصب العین قرار پایا۔ آج اس نصب العین کو خیر باد کہہ کر مسلمان ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں۔ نہیں معلوم وہ بنی اسرائیل کی طرح عصر حاضر کے "میدانِ تیہ" میں کب تک بھٹکتے رہیں گے ، اور یوں ہی ذلت و خواری سے کب تک دوچار رہیں گے ۔ مسلمانوں کو ان کے چھوڑے ہوئے نصب العین کی طرف واپس لانے کے لئے وہی تدبیر اختیار کرنی ہوگی جس کے نقوش ہمیں صدر اول کے مسلمانوں کی ابتدائی زندگی میں ملتے ہیں ۔ اس کے علاوہ کوئی اور تدبیر اختیار کی جائے گی تو وہ کارگر نہیں ہوگی اور اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے ۔

تازہ صورت حالات کا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں نے کروٹ بدلی ہے۔ ان میں زندگی حرکت اور حرارت کے آثار ہویدا ہو رہے ہیں۔ خدا کرے یہ تبدیلی ایک مستقل تحریک بن کر مسلمانوں کے درخشاں مستقبل کا نشان بن جائے اور مسلمان دنیا کے اسٹیج پر ایک بار پھر اپنا وہ کردار ادا کر سکیں جس کے لئے ان کی ملت کو برپا کیا گیا تھا۔

(مدیر)

زکوٰۃ کی معاشرتی و اقتصادی اہمیت

● ———— اعجاز اسلم قریشی

(یہ مضمون از اول تا آخر اخذ و التقاط ہے۔ مآخذ کی نشاندہی آخر میں کر دی گئی ہے۔ زکوٰۃ کا مسئلہ آج کل کے رواں موضوعات میں سے ہے۔ مضمون نگار کی یہ کاوش لائق التفات ہو گی)۔ (مدیر)

موجودہ دور میں اجتماعی عدل پر اظہار خیال کرتے وقت سب سے زیادہ اہمیت کسی ملک کے اقتصادی نظام اور اس کی اقتصادی پالیسی کو دی جاتی ہے۔ لیکن اسلام میں جس چیز کو ہم اجتماعی عدل کہتے ہیں وہ اقتصادی پالیسی سے کہیں زیادہ وسیع اور بلند تر چیز ہے۔ موجودہ مادی نظاموں کا خاصہ یہ ہے کہ وہ صرف اقتصاد کو مقدم رکھتے ہیں جو معاشی قدروں کے سوا زندگی کی دوسری قدروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اسلام اقتصاد کے ضمن میں جو پالیسی اختیار کرتا ہے وہ اس کے بنیادی فکر اور فلسفہ کے عین مطابق ہے۔ وہ فرد اور معاشرہ دونوں کے مصالح کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے اس سلسلے میں ایک موزوں اور مناسب درمیانی راہ اختیار کرتا ہے جس میں نہ تو فرد کی کوئی حق تلفی ہوتی ہے اور نہ ہی معاشرہ کے مفاد کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ وہ نہ تو فطرت کی راہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور نہ ہی زندگی کے حقیقی اصول و ضوابط یا اس کے اعلیٰ مقاصد کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔

اس پالیسی کو کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچانے کے لئے اسلام دو بنیادی طریقے اختیار

کرتا ہے۔ اوّل قانونی ضابطہ بندی اور دوم ہدایت و تلقین۔ قانون کے ذریعے وہ ایسے عملی مقاصد حاصل کرتا ہے جو اپنی جگہ ایک صالح ترقی پذیر سماج کی تعمیر کے لئے کافی ہیں اور ہدایت و تلقین کے ذریعہ وہ حاجات کی غلامی سے بلند ہونے، زندگی کے بلند تر تصور کی طرف متوجہ ہونے اور بحیثیت مجموعی زندگی کو مثالی حد تک بلند کر دینے جیسے اعلیٰ مقاصد کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔

حقِ ملکیت

اسلام دولت کی انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن حصول ملکیت کی ان مخصوص شکلوں کے ساتھ جن کو قانون جائز قرار دیتا ہو، ایسا نہیں کہ اسلام نے ذاتی ملکیت کے حق کو حدود و قیود عائد کئے بغیر لونہی چھوڑ دیا ہو۔ وہ اس حق کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو کچھ دوسرے اصول و ضوابط بھی دیتا ہے جو اس حق کو ایک عملی حق کے بجائے قریب قریب نظری بنا دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب مال کی ضروریات پوری ہو جانے کے بعد بقیہ مال کو خلق خدا کی بھلائی میں خرچ کرنا چاہتا ہے۔ حق ملکیت کے سلسلہ میں اسلام کا پہلا اصول یہ ہے کہ اپنے اموال و املاک کے سلسلہ میں فرد کی حیثیت معاشرہ کے نمائندہ اور نائب کی ہے۔ اس پر اس کا قبضہ ملکیت سے کہیں زیادہ ایک ذمہ داری ہے۔

اسلام میں ملکیت کا حق پانے کا واحد ذریعہ "عمل" ہے۔ دولت کے حاصل کرنے اور اس کا مالک قرار پانے کی جن شکلوں کو اسلام درست تسلیم کرتا ہے وہ یہ ہیں: اوّل شکار، دوم جن افتادہ زمینوں کا کوئی مالک نہ ہو ان کو کسی طریقہ سے کارآمد بنا لینا، سوم زمین کے اندر جو معدنیات ہیں انہیں نکالنا، چہارم جنگ، پنجم اجرت کے عوض کسی دوسرے کی خاطر محنت کرنا، ششم سلطان کا ان زمینوں میں سے کسی کو کچھ عطیہ کے طور پر دے دینا جن کا کوئی مالک نہ ہو، اور ہفتم بقائے حیات کی خاطر مال کا محتاج ہونا۔ ان کے علاوہ جو بھی طریقے ہیں اسلام

ان کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ چوری، ڈاکہ، اور لوٹ مار ملکیت کا باعث نہیں بن سکتے ہیں۔ یہی حال جوئے کا بھی ہے کہ اسے حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کی حکمت "محنت میں عظمت" پر مبنی ہے۔ محنت بہر حال جزا کی مستحق ہے اسی پر زندگی کی فلاح و بقا منحصر ہے۔ زمین کو آباد اور کارآمد بنانا، سوسائٹی کو فائدہ پہنچانا، جسم کو تقویت پہنچانا، سستی، کاہلی اور گمنامی کے عوامل سے انسان کو بچائے رکھنا، یہ امور جس حسن و خوبی کے ساتھ محنت کے ذریعہ انجام پاتے ہیں، کسی دوسرے ذریعہ سے ممکن نہیں۔ جب تک حصول ملکیت کا واحد ذریعہ عمل ہو، انفرادی ملکیت کا ان حدود کے اندر تسلیم کیا جانا کسی کے لئے ضرر رساں نہیں ہو سکتا۔ ملکیت کے اسی نظریہ کا نتیجہ ہے کہ اسلام انتقال ملکیت کے طریقوں میں مداخلت کرتا ہے اور فرد کو اس سلسلہ میں بالکل آزاد نہیں چھوڑتا۔ وراثت اور وصیت کے ضابطوں سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

ملکیت دولت کے بارے میں اسلام جس نظریہ کا قائل ہے اس کے تحت اس نے مال کے ذریعہ مال حاصل کرنے اور اسے استعمال کرنے کے طریقوں میں بھی مداخلت کی ہے۔ وہ مالک کو اس بات کی کھلی چھٹی نہیں دیتا کہ وہ اس سلسلہ میں من مانی کرتا رہے۔ کیونکہ فرد کی ذاتی مصلحت کے پہلو بہ پہلو اس سوسائٹی کی مصلحت بھی قابل لحاظ ہے جس سے فرد معاملہ کرتا ہے۔ چنانچہ ہر فرد کو مال کے ذریعہ نفع کمانے کی پوری آزادی ہے۔ اسے پوری آزادی ہے کہ زمین کاشت کرے، خام مال کے ذریعہ مصنوعات تیار کرے، تجارت کرے وغیرہ وغیرہ، لیکن اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ دھوکہ دہی پر اتر آئے۔ یا عام ضرورت کی اشیاء کو قیمت چڑھنے کے انتظار میں ذخیرہ کئے رکھے یا اپنی دولت کو سود پر دے یا مزدور کی اجرت کے سلسلہ میں ظلم و زیادتی سے کام لے کر خود اپنے نفع میں اضافہ کرے۔ یہ سب کچھ حرام کر دیا گیا ہے۔

اسلام افزائش دولت کے لئے صرف پاکیزہ اور ستھرے ذرائع ہی کو روا رکھتا ہے اور پاکیزہ ذرائع کی خصوصیت

یہ ہے کہ وہ سرمایہ کو اس حد تک بڑھنے کا موقع نہیں دیتے کہ طبقاتی فرق میں اضافہ ہوتا چلا جائے آج ہم سرمایہ میں جو بے تحاشہ اضافہ دیکھتے ہیں اس کی وجہ دراصل، دھوکہ، فریب، سود، مزدور کی حق تلفی، احتکار، عوام کی ضروریات سے بے جا فائدہ اٹھانا، چوری، غصب وغیرہ جیسے وہ جرائم ہیں جو آج کل کے معروف طریق ہائے استحصال میں مضمر ہیں۔ اسلام ان کی اجازت کبھی نہیں دیتا۔ افزائش دولت کے سلسلہ میں احکام یہ ہیں کہ اوّل اسلام کاروبار میں بددیانتی کو حرام قرار دیتا ہے، دوم اشیائے ضرورت کی ذخیرہ اندوزی کو اسلام دولت کمانے اور اس میں اضافہ چاہنے کا جائز طریقہ تسلیم نہیں کرتا۔ حدیث نبوی ہے کہ "جس نے احتکار کیا وہ غلط کار ہے"۔ درحقیقت احتکار صنعت و تجارت کی آزادی کا خون ہے۔ کیونکہ اجارہ دار یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس جیسا مال یا اس جیسی مصنوعات کوئی اور تیار کرے۔ وہ تو منڈی پر پورا کنٹرول چاہتا ہے۔ تاکہ لوگوں سے من مانی قیمتیں وصول کر سکے اور لوگوں کو ہر طرح کی شدت اور تنگی کا شکار کر کے ان کا جینا دوبھر کر دے۔ بعض اوقات احتکار کرنے والا زائد پیداوار کو تلف کر دیتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح ایک خاص قیمت کو لوگوں پر مسلط کر سکے۔ اب تو ادویات کی منڈی کا بھی یہ حال ہے کہ یہودی اور یہود صفت افراد ان کا احتکار کرتے رہتے ہیں اور لاکھوں انسان بغیر دواؤں کے تڑپتے رہتے ہیں گویا زبردستی دھکیل کر موت کے منہ میں لے جائے جاتے ہیں صرف اس لئے کہ ذخیرہ اندوز تاجر زیادہ سے زیادہ نفع کما سکیں اور اس طرح اپنی حرام کمائی میں اضافہ کر سکیں۔ کسب مال کے اس ذریعہ کا سدباب کرنے کو اسلام نے اتنی اہمیت دی کہ احتکار کو دائرہ دین سے خارج کرنے والا جرم قرار دے دیا۔ حدیث نبوی ہے کہ جس نے چالیس روز تک سامانِ غذا کو ذخیرہ کئے رکھا اس کو اللہ سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ ہی اللہ کو اس کی کوئی پروا ہے۔ میرے خیال میں ایسے شخص کو مسلمان تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا جو سوسائٹی کی دشمنی میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ اپنی ذاتی نفع اندوزی اور اس طرح اپنی دولت

میں اضافہ کی خاطر اجتماعی مصالح کو دانستہ مجروح کرتے ہوئے سماج میں مصنوعی طور پر خوف اور احتیاج پیدا کر دیتا ہے، سوم سُودی کاروبار بھی افزائش دولت کا ایک حرام ذریعہ ہے جسے اسلام واضح طور پر قابل نفرت قرار دیتا ہے۔ وہ اس کی خباثت واضح کرتے ہوئے اسے اپنانے والوں کو بدترین انجام کی خبر سناتا ہے۔

خرچ کی راہیں۔

جہاں اسلام نے کسب مال کے لئے حدود متعین کر دی ہیں وہیں وہ مال کے صرف کو بھی یونہی بلا کسی ضابطہ کے نہیں چھوڑ دیتا۔ چنانچہ صاحب دولت کو کھلی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ جس حد تک چاہے مال کو نہ صرف کرے اور روکے رکھے یا جہاں جس طرح چاہے اسے خرچ کرتا رہے۔ اسلام میں فرد کی یہ حیثیت تسلیم نہیں کی گئی کہ وہ اپنے شخصی معاملات میں من مانی کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ بلاشبہ اسے چند متعین حدود کے اندر رہتے ہوئے یک گونہ آزادی حاصل ہے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شائد ہی کوئی انفرادی فعل ایسا ہو جس کا تعلق دوسروں سے کچھ بھی نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ تعلق بالکل واضح اور قریبی نہ ہو۔ اسلام کو نہ تو اسراف کی حد تک بڑھا ہوا خرچ کرنا پسند ہے اور نہ ہی کنجوسی کی حد تک ہاتھ روکنے کو وہ صحیح سمجھتا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ہی طریقے بالآخر اس فرد اور پوری سوسائٹی کے حق میں نقصان کا باعث بنتے ہیں۔

اسلام چاہتا ہے کہ تمام لوگ، بڑے چھوٹے اور امیر و غریب سب زندگی کو خوشگوار بنانے والی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اسی لئے مال کے گردش میں نہ آنے اور صرف کئے جانے سے روکنے کو اسلام ایک الگ زاویہ سے دیکھتا ہے۔ یعنی یہ کہ مال و دولت کا اس طرح روکے رہنا اس کے حقیقی عمل کو معطل کر دیتا ہے۔ سوسائٹی کا مفاد اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کی دولت ہمیشہ گردش کرتی رہے تاکہ زندگی ہر طرح پھلے پھولے، پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو، محنت کاروں کے لئے کام کے وسائل مہیا ہوں اور انسانیت عامہ کو تعمیری سرگرمیوں کے پورے پورے مواقع میسر آئیں۔ مال کا روکے رکھنا اس پورے نظام کو معطل کر دیتا ہے اس لئے اسلام کے نزدیک یہ حرام ہے۔

اس سے مال دار فرد کے مخصوص مفادات اور سماج کے عام مصالح دونوں کا خون ہوتا ہے۔

اسراف دوسری انتہا کا نام ہے اور وہ بھی فرد اور سوسائٹی دونوں کے لئے مہلک ہے۔ لیکن اللہ کی راہ میں مال صرف کرنا خواہ سارے کا سارا مال اس مصرف میں کام آجائے اسراف نہیں کہلاتا۔ اسراف کا اطلاق اس فضول خرچی پر ہوتا ہے جو اپنے نفس کی خاطر کی جائے۔ ان معنوں میں اسراف عیش پرستی کا نام ہے جسے اسلام سخت ناپسند کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ بات بہت بڑی ہے کہ مال امیروں کے درمیان گردش کرتا رہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ کثرتِ مال لوگوں کو عیش و عشرت میں مبتلا کر دے۔ اسلام عیش پرستی کو فرد اور معاشرہ دونوں کے لئے شر و فساد کا منبع قرار دیتا ہے۔

ایک طرف سوسائٹی میں عیش پرستوں کا وجود اور اسے بخوشی گوارا کر لینا اور اپنی خاموشی کے ذریعہ گویا اس کی اجازت دے دینا، عیش و عشرت کے اسباب کا ازالہ کی طرف توجہ نہ کرنا اور عیش پرستوں کو فساد پھیلانے کے لئے آزاد چھوڑ دینا وغیرہ، ایسے اسباب و عوامل ہیں جو بالآخر سوسائٹی کو تباہی اور بربادی کے گڑھے میں گرا دیتے ہیں۔ دوسری طرف نفع اندوزوں اور استحصال کرنے والوں کا گروہ ہوتا ہے جس میں بردہ فروش، مسخرے اور ان عیش پرستوں کے حاشیہ نشین اور خدمت گذار شامل ہوتے ہیں جو اپنے قول و عمل سے بے حیائی، فحاشی، عیش پرستی اور سہل پسندی کی اشاعت میں ہمہ تن مشغول رہتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کی ان تمام اعلیٰ قدروں کی توہین کرتے رہتے ہیں جو شرفاء کے گروہ کے مفاد و مذاق سے ٹکراتی ہیں، رفتہ رفتہ یہ مرض زندگی کے تمام شعبوں میں پھیل جاتا ہے اور یہ خرابیاں بالآخر ایک ایسی فضا بنا دیتی ہیں کہ فحاشی اور بے حیائی پوری قوم میں عام ہو جاتی ہے۔ لوگوں کے نہ صرف جسم بلکہ دماغ بھی ناکارہ ہو جاتے ہیں اور روحانی اور معنوی اقدار کا چراغ ٹمٹمانے لگتا ہے۔ جب سماج ان پستیوں میں جا گرتا ہے تو اللہ کے نزدیک وہ تخریب و ہلاکت کا مستحق قرار پاتا ہے اور اللہ کا عذاب اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیتا ہے۔

فریضۂ زکوٰۃ

زکوٰۃ ارکان اسلام میں ایک ایسا رکن ہے جو واضح طور پر اجتماعی تصور رکھتا ہے۔ اسلام کے اقتصادی نظام پر گفتگو میں زکوٰۃ پر بحث مرکزی حیثیت کی حامل ہے۔ نماز کے بعد اسلام کا سب سے بڑا رکن زکوٰۃ ہے۔ نماز اور زکوٰۃ دو بڑے ستون ہیں جن پر اسلام کی عمارت کھڑی ہوتی ہے ان کے ہٹنے کے بعد اسلام قائم نہیں رہ سکتا۔ بہت سے مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ نماز نہ پڑھ کر اور زکوٰۃ نہ دے کر بھی وہ مسلمان رہتے ہیں۔ مگر اسلامی تعلیمات صاف الفاظ میں اس کی تردید کرتی ہیں۔ ان کی رُو سے کلمہ طیبہ کا اقرار ہی بے معنی ہے اگر آدمی اس کے ثبوت میں نماز اور زکوٰۃ کا پابند نہ ہو۔ اسی بنا پر حضرت ابوبکرؓ نے زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں کو کافر سمجھ کر ان کے خلاف تلوار اٹھائی تھی۔

زکوٰۃ کے معنی

عربی زبان میں زکوٰۃ دو معنوں سے مرکب ہے۔ ایک پاکیزگی دوسرے نشو ونما یعنی کسی چیز کی ترقی میں جو چیزیں مانع ہوں ان کو دور کرنا اور اس کے اصل جوہر کو پروان چڑھانا۔ یہ دو مفہوم مل کر زکوٰۃ کا پورا تصور بناتے ہیں۔ پھر یہ لفظ جب اسلامی اصطلاح بنتا ہے تو اس کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔ ایک وہ مال جو تزکیہ کے لئے نکالا جائے۔ دوسرے بجائے خود تزکیہ کا عمل ــ يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ تزکیہ کی غرض سے اپنے مال کا ایک حصہ دیتے یا ادا کرتے ہیں۔ اس طرح بات صرف مال دینے تک محدود ہو جاتی ہے۔ لیکن لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُونَ کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تزکیہ کا عمل کرتے ہیں اور اس صورت میں بات صرف مال زکوٰۃ ادا کرنے تک محدود نہیں رہے گی بلکہ تزکیہ نفس، تزکیہ اخلاق، تزکیہ مال، تزکیہ حیات غرض زندگی کے ہر پہلو کے تزکیہ تک پھیل جائے گی۔ گویا وہ جو زکوٰۃ دیتے ہیں تزکیہ کا کام کرنے والے لوگ ہیں یعنی اپنے آپ کو بھی پاک کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی پاک کرنے کی خدمت انجام دیتے ہیں، اپنے اندر بھی جوہر انسانیت کو نشو ونما دیتے ہیں اور باہر کی زندگی میں بھی اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ وہ زکوٰۃ دیتے ہیں جس سے ایثار و قربانی کا جذبہ ان کے اندر مستحکم ہوتا ہے۔ متاعِ دنیا کی محبت دبتی ہے اور رضائے الٰہی کی طلب ابھرتی ہے۔

زکوٰۃ کی معاشرتی اہمیت

یہ کروڑوں انسان جو زمین پہ پھیلے ہوئے ہیں جن میں ہر قسم کے آدمی پائے جاتے ہیں اچھے اور بُرے سب کے سب اس قابل نہیں ہو سکتے کہ اللہ کی اس پارٹی میں شامل کرلئے جائیں جسے اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنی خلافت کا مرتبہ اور آخرت میں تقرب کا مقام عطا کرنا چاہتا ہے۔ اللہ نے کمال درجہ کی حکمت کے ساتھ چند امتحان، چند آزمائشیں، چند معیار جانچنے اور پرکھنے کے لئے مقرر کر دیئے ہیں، انسانوں میں سے جو کوئی ان پر پورا اُترے وہ تو اللہ کی پارٹی میں آجائے اور جو ان پہ پورا نہ اُترے وہ خود بخود اس پارٹی سے الگ ہو کر رہ جائے اور خود بھی جان لے کہ میں اس پارٹی میں شامل ہونے کے قابل نہیں ہوں۔ یہ معیار کیا ہیں؟ اللہ تعالیٰ چونکہ حکیم و دانا ہے اس لئے سب سے پہلا امتحان وہ آدمی کی حکمت و دانائی کا ہی لیتا ہے۔ دوسرے امتحان میں آدمی کی عقل کے ساتھ اس کی اخلاقی طاقت کو بھی پرکھا جاتا ہے۔ تیسرے درجے میں اطاعت اور فرمانبرداری کا امتحان ہے اور چوتھا امتحان مال کی قربانی کا لیا جاتا ہے، کیونکہ ابھی یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کہیں وہ چھوٹے دل کے، پست ہمت، کم حوصلہ، تنگ ظرف تو نہیں ہیں۔

زکوٰۃ دراصل اسلام کی روح اور اس کی جان ہے۔ یہ حقیقت میں ایمان کا امتحان ہے جس طرح رسمی تعلیم میں درجہ بدرجہ امتحانات دے کر آدمی ترقی کرتا ہے یہاں تک کہ آخری امتحان دے کر سند یافتہ کہلاتا ہے اسی طرح خدا کے ہاں بھی کئی امتحان ہیں جن سے آدمی کو گذرنا پڑتا ہے۔ اور جب وہ چوتھا امتحان یعنی مال کی قربانی کا امتحان کامیابی کے ساتھ دے دیتا ہے تب وہ پورا مسلمان بنتا ہے۔

زکوٰۃ اور صدقات حقیقت میں ہماری معاشرتی زندگی کی جان ہیں اور ان میں ہمارے لئے آخرت ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی بھی ساری نعمتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ لیکن انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے ظالم اور جاہل واقع ہوا ہے۔ وہ تنگ نظر ہے۔ اس کا دل چھوٹا ہے۔ وہ خود غرض ہے۔ اور جلد باز بھی ہے۔ وہ ہر چیز کا نتیجہ اور فائدہ جلد دیکھنا چاہتا ہے، اور اسی فائدے کو

فائدہ سمجھتا ہے جو فوراً اس کو حاصل ہو جائے۔ انسان صرف اپنے ذاتی فائدے کو دیکھتا ہے۔ قریب میں کوئی یتیم بھوکا مر رہا ہو یا آوارہ پھر رہا ہو تو وہ کہتا ہے کہ میں کیوں اس کی خبر گیری کروں؟ کوئی بیوہ اگر محلے میں مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے تو مجھے کیا! کوئی مسافر اگر بھٹکتا پھر رہا ہے تو مجھ سے کیا تعلق! کوئی شخص اگر پریشان حال ہے تو ہوا کرے اُسے بھی اللہ نے میری ہی طرح ہاتھ پاؤں دیئے ہیں۔ اپنی ضرورتیں اسے خود پوری کرنی چاہئیں میں اس کی کیوں مدد کروں؟ اگر کسی قومی کام میں حصہ لے گا تو سب سے پہلے یہ دیکھے گا کہ اس میں میرا ذاتی فائدہ کیا ہے! جن کاموں میں اس کی اپنی ذات کا کوئی فائدہ نہ ہو وہ سب اس کی مدد سے محروم رہ جائیں گے۔ جب لوگوں میں یہ ذہنیت کام کر رہی ہو تو تھوڑے سے لوگوں کے پاس دولت سمٹ سمٹ کر اکٹھی ہوتی چلی جاتی ہے اور بے شمار اشخاص بے وسیلہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دولت مند لوگ روپے کے زور سے روپیہ کھینچتے رہتے ہیں اور غریب لوگوں کی زندگی روز بروز تنگ ہوتی جاتی ہے۔ جس سوسائٹی میں افلاس عام ہو وہ طرح طرح کی خرابیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی جسمانی صحت خراب ہوتی ہے اُس میں بیماریاں پھیلتی ہیں، اس میں کام کرنے اور دولت پیدا کرنے کی قوت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس میں جہالت بڑھتی ہے۔ اس کے اخلاق گرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے جرائم کا ارتکاب کرنے لگتی ہے اور آخر کار نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ لوٹ مار، بلوے ڈاکہ اور قتل جیسے بھیانک اور مکروہ جرائم کی مرتکب ہوتی ہے۔ درحقیقت ہر شخص کی بھلائی اس سوسائٹی کی بھلائی کے ساتھ وابستہ ہے جس کے دائرہ میں وہ رہتا ہے۔ جو شخص خود غرضی اور تنگ نظری کے ساتھ روپے کو اپنے پاس روک رکھتا ہے اور معاشرہ کی بھلائی پر خرچ نہیں کرتا وہ ظاہر میں تو اپنا روپیہ محفوظ رکھتا ہے یا سود کھا کر اسے اور بڑھاتا ہے مگر حقیقت میں وہ اپنی حماقت سے اپنی دولت گھٹاتا ہے اور اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا سامان کرتا ہے۔ آج تک انسان اپنی عقل اور کوشش سے اس جہالت کے بند کو نہیں کھول سکا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورہ روم آیت ۳۹ میں اسی راز کو یوں بیان فرمایا ہے۔ تم جو سُود دیتے ہو اس غرض کے لئے کہ یہ لوگوں کی دولت بڑھائے تو دراصل اللہ کے نزدیک اس سے دولت نہیں بڑھتی، البتہ جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے

سے دیتے ہو اس کے دینے والے درحقیقت اپنے مال کو بڑھاتے ہیں"۔ سود وہ چیز نہیں جس سے دولت کی افزائش ہوتی ہو بلکہ حقیقی افزائش زکوٰۃ سے ہوتی ہے۔ اس افزائش یا بڑھوتری کے لئے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ جتنی خالص نیت اور جتنے گہرے جذبہ ایثار اور جس قدر شدید طلب رضائے الٰہی کے ساتھ کوئی شخص راہ خدا میں مال صرف کرے گا اسی قدر اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ سے زیادہ اجر دے گا۔

تمام دنیا میں یہی حال ہے۔ ایک طرف سرمایہ داروں کی دنیا ہے جہاں سارے کام سودخواری پر چل رہے ہیں اور دولت کی کثرت کے باوجود روز بروز مصیبتوں اور پریشانیوں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ دوسری طرف ایک ایسا گروہ پیدا ہو چکا ہے اور بڑھتا چلا جا رہا ہے جس کے دل میں حسد کی آگ جل رہی ہے اور جو سرمایہ داروں کے خزانوں پر ڈاکہ مارنے کے ساتھ انسانی تہذیب و تمدن کی ساری بساط بھی الٹ دینا چاہتا ہے۔ اس سے بچنے کا واحد حل زکوٰۃ کی باقاعدہ ادائیگی اور اس کی بہترین منصفانہ اور جائز تقسیم میں ہے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ معاشرے کی حالت کس طرح تیزی سے تبدیل ہوتی ہے اور ایسی تبدیلی جس کا بڑی سے بڑی فلاحی ریاست بھی تصور نہیں کر سکتی۔

مصارف زکوٰۃ

قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ حق دار بیان کئے گئے ہیں جن کی تفصیل سورۂ توبہ آیت ۶۰ میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لئے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہ خدا اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لئے ہیں، ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔

صلح حدیبیہ تک چھ سال کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ اس شکل میں رونما ہوا کہ عرب کے تقریباً ایک تہائی حصہ میں اسلام ایک منظم سوسائٹی کا دین، ایک مکمل تہذیب و تمدن اور ایک کامل بااختیار ریاست بن گیا تھا۔ اس آیت کے نزول کے بعد عرب میں یہ پہلا موقع تھا کہ ملک کے تمام امن

باشندوں پر جو ایک مقررہ مقدار سے زائد مال رکھتے تھے باقاعدہ زکوٰۃ عائد کی گئی تھی۔ زکوٰۃ کی تنظیم نے عرب کی زندگی میں وہ انقلاب برپا کیا جس کی تاریخ عالم میں مثال نہیں ملتی۔ زکوٰۃ ان کی زرعی پیداوار سے، ان کے مویشیوں سے، ان کے اموال تجارت سے، ان کے معدنیات سے اور ان کے سونے چاندی کے ذخائر سے ۲½ فی صدی، ۵ فی صدی، ۱۰ فی صدی اور ۲۰ فی صدی کی مختلف شرحوں کے مطابق وصول کی جاتی تھی۔ یہ سب اموال زکوٰۃ ایک منظم طریقہ سے وصول کئے جاتے اور ایک مرکز پر جمع ہو کر منظم طریقہ سے خرچ کئے جاتے۔ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ملک کے اطراف سے آتنی دولت سمٹ کر آتی اور آپ کے ہاتھوں سے خرچ ہوتی جو عرب کے لوگوں نے کبھی اس سے پہلے کسی ایک شخص کے ہاتھوں جمع اور تقسیم ہوتے نہیں دیکھی تھی۔

مذکورہ آیت میں زکوٰۃ کے مصارف بیان کئے گئے ہیں نیز جو دوسرے کام اس سے لئے جاتے ہیں ان کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے اس طرح یہ آیت دراصل اسلامی ریاست کی معاشی اصلاح کی پالیسی کے مقاصد پر روشنی ڈالتی ہے۔ جن مدات کا اس میں ذکر ہے ان کی مختصر تشریح یہ ہے۔

۱۔ فقیر سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی معیشت کے لئے دوسروں کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ لفظ تمام حاجت مندوں کے لئے عام ہے خواہ وہ جسمانی نقص یا بڑھاپے کی وجہ سے مستقل طور پر محتاج اعانت ہو گئے ہوں یا کسی عارضی سبب سے سردست مدد کے محتاج ہوں اور اگر انہیں سہارا مل جائے تو آگے چل کر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہوں۔ مثلاً یتیم بچے، بیوہ عورتیں، بے روزگار لوگ اور وہ لوگ جو وقتی حوادث کے شکار ہو گئے ہوں۔

۲۔ مساکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہوں۔ نبی کریمؐ نے اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ایسے لوگوں کو مستحق امداد ٹھہرایا ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق ذرائع نہ پا رہے ہوں اور سخت تنگ حال ہوں، مگر نہ تو ان کی خودداری کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت دیتی ہو اور نہ ان کی ظاہری پوزیشن ایسی ہو کہ کوئی انہیں حاجت مند سمجھ کر ان کی مدد کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ گویا وہ ایک ایسا شریف آدمی ہے جو غریب ہو۔

۳. وہ لوگ جو صدقات وصول کرنے اور وصول شدہ مال کی حفاظت کرنے اور ان کا حساب کتاب رکھنے اور انہیں تقسیم کرنے میں حکومت کی طرف سے استعمال کئے جائیں۔ ایسے لوگ خواہ فقیر و مسکین نہ ہوں ان کی تنخواہیں بہرحال صدقات ہی کی مد سے دی جائیں گی۔

۴۔ تالیف قلب کے معنی ہیں دل موہنا۔ اس حکم سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوش عداوت کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہو یا جو لوگ کفار کے کیمپ میں ایسے ہوں کہ اگر مال سے انہیں توڑا جائے تو ٹوٹ کر مسلمانوں کے مددگار بن سکتے ہوں، یا جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہوں اور ان کی سابقہ عداوت یا ان کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہو کہ اگر مال سے ان کی استمالت نہ کی گئی تو پھر کفر کی طرف پلٹ جائیں گے، ایسے لوگوں کو مستقل وظائف یا وقتی عطیے دے کر اسلام کا حامی و مددگار یا مطیع و فرماں بردار، کم از کم بے ضرر دشمن بنا لیا جائے۔ اس مد پر غنائم اور دوسرے ذرائع آمدنی سے بھی مال خرچ کیا جا سکتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو زکوٰۃ کی مد سے بھی۔ اور ایسے لوگوں کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ فقیر و مسکین یا مسافر ہوں تب ہی ان کی مدد زکوٰۃ سے کی جا سکتی ہے بلکہ وہ مال دار اور رئیس ہونے پر بھی زکوٰۃ دیئے جانے کے مستحق ہیں۔

۵۔ گردنیں چھڑانے سے مراد یہ ہے کہ غلاموں کی آزادی میں زکوٰۃ کا مال صرف کیا جائے۔ اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ جس غلام نے اپنے مالک سے یہ معاہدہ کیا ہو کہ اگر میں اتنی رقم تمہیں ادا کر دوں گا تو تم مجھے آزاد کر دو گے، اسے آزادی کی قیمت ادا کرنے میں مدد دی جائے۔ دوسرے یہ کہ خود زکوٰۃ کی مد سے غلام خرید کر آزاد کئے جائیں۔

۶۔ ایسے قرض دار جو اگر اپنے مال سے اپنا پورا قرض چکا دیں تو ان کے پاس قدر نصاب سے کم مال بچ سکتا ہو۔ وہ خواہ کمانے والے ہوں یا بے روزگار، اور خواہ عرفِ عام میں فقیر سمجھے جاتے ہوں یا غنی، دونوں صورتوں میں ان کی اعانت زکوٰۃ کی مد سے کی جا سکتی ہے، مگر متعدد فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جس شخص نے بداعمالیوں اور فضول خرچیوں میں اپنا مال اڑا کر اپنے آپ کو قرض میں مبتلا کیا ہو اس کی مدد نہ کی جائے جب تک وہ توبہ نہ کرے۔

۷۔ راہِ خدا کا لفظ عام ہے۔ تمام وہ نیکی کے کام جن میں اللہ کی رضا ہو اس لفظ کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس حکم کی رُو سے زکوٰۃ کا مال ہر قسم کے نیک کاموں میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ بڑی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی وہ جدوجہد جس سے مقصود نظام کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ نظام اسلامی کو قائم کرنا ہو۔ اس جدوجہد میں جو لوگ کام کریں ان کو سفر خرچ کے لئے، سواری کے لئے، آلات و اسلحہ اور دیگر سروسامان کی فراہمی کے لئے زکوٰۃ سے مدد دی جا سکتی ہے۔ خواہ وہ بذاتِ خود کھاتے پیتے لوگ ہوں اور اپنی ذاتی ضروریات کے لئے ان کو مدد کی ضرورت نہ ہو۔ اسی طرح جو لوگ رضا کارانہ اپنی تمام خدمات اور اپنا تمام وقت عارضی طور پر یا مستقل طور پر اس کام کے لئے دے دیں ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی زکوٰۃ سے وقتی اعانتیں دی جا سکتی ہیں۔

۸۔ مسافر خواہ اپنے گھر میں غنی ہو لیکن حالتِ سفر میں اگر وہ مدد کا محتاج ہو جائے تو اس کی مدد زکوٰۃ کی مد سے کی جائے گی۔ دین کی اصولی تعلیمات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مدد کا محتاج ہو اس کی دست گیری کرنے میں اس کی گناہ گاری مانع نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ فی الواقع گناہ گاروں اور اخلاقی پستی میں گرے ہوئے لوگوں کی اصلاح کا بہت بڑا ذریعہ یہ ہے کہ مصیبت کے وقت ان کو سہارا دیا جائے اور حسن سلوک سے ان کے نفس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے۔

زکوٰۃ ایمان کی لازمی صفت

زکوٰۃ کا ادا کرنا ایمان لانے والوں کی لازمی صفت ہے۔ سورۃ النمل آیت ۲ میں ارشاد ہوا ہے

"ہدایت اور بشارت ان ایمان لانے والوں کیلئے ہے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اور پھر وہ ایسے لوگ ہیں جو آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں۔"

یہ آیت صرف انہی لوگوں کی رہنمائی کرتی ہے اور صرف انہی لوگوں کو نیک انجام کی خوشخبری دیتی ہے جن میں دو خصوصیات پائی جائیں ؛ اوّل یہ کہ وہ ایمان لائیں اور دوم یہ کہ وہ ان چیزوں کو محض مان کر نہ رہ جائیں بلکہ عملاً اتباع و اطاعت کے لئے آمادہ ہوں اور اس آمادگی کی اولین علامت یہ ہے کہ وہ نماز قائم

کریں اور زکوٰۃ دیں یہ دونوں شرطیں جو لوگ پوری کریں گے انہی کو قرآن کی آیات دنیا میں زندگی کا سیدھا راستہ بتائیں گی، اس راستہ کے ہر مرحلہ میں ان کو صحیح اور غلط کا فرق سمجھائیں گی، اس کے علاوہ ہر موڑ پر انہیں غلط راہوں کی طرف جانے سے بچائیں گی اور ان کو یہ اطمینان بخشیں گی کہ راست روی کے نتائج دنیا میں خواہ کچھ بھی ہوں آخر کار ابدی اور دائمی فلاح اسی کی بدولت انہیں حاصل ہوگی اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے سرفراز ہوں گے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک معلم کی تعلیم سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اس پر اعتماد کر کے واقعی اس کی شاگردی قبول کر لے اور پھر اس کی ہدایات کے مطابق کام بھی کرے۔ ایک ڈاکٹر سے استفادہ وہی مریض کر سکتا ہے جو اُسے اپنا معالج بنائے اور دوا اور پرہیز وغیرہ کے معاملہ میں اس کی ہدایات پر عمل کرے۔ اسی صورت میں معلم اور ڈاکٹر یہ اطمینان دلا سکتے ہیں کہ آدمی کو نتائج مطلوبہ حاصل ہوں گے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی۔

زکوٰۃ ہر اس مال پر واجب ہوتی ہے جو خود بڑھتا ہو یا کام کر کے بڑھایا جا سکتا ہو تاکہ اس سے ایک طرف زکوٰۃ دینے والا اور اس کا مال پاک ہو جائے اور دوسری طرف ضرورت مندوں کی احتیاجات پوری ہو جائیں۔ قابلِ زکوٰۃ مال کی دو اقسام ہیں: ایک ظاہر مال جو چھپایا نہ جا سکتا ہو جیسے، کھیتی، گائے، بکری اونٹ اور دیگر مویشی، دوسرا باطن مال جس کا چھپانا ممکن ہو جیسے سونا، چاندی، زرِ نقد اور سامانِ تجارت وغیرہ۔ عشر ان پیداواروں پر ہے جو لوگوں کے پاس ذخیرہ ہو کر رہتی ہیں۔ اس کی شرح پانچ فیصد ہے زکوٰۃ صرف ایسے مویشیوں پر واجب ہے جو افزائش نسل کے لئے پالے جاتے ہیں۔ مختلف مویشیوں کا نصاب مختلف ہے مثلاً پانچ اونٹوں پر، چالیس بکریوں پر اور تیس گائیوں پر۔ اس کے علاوہ مال باطن کی زکوٰۃ مثلاً سونے، چاندی، زر نقد اور مال تجارت پر اس وقت واجب ہوتی ہے جب کسی کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا ہو یا اس کی مالیت کے برابر زر نقد یا مال تجارت محفوظ ہو اور جس کے جمع کئے جانے پر ایک سال سے زائد عرصہ گذر چکا ہو۔

زکوٰۃ کا انتظام

زکوٰۃ کا انتظام اسلامی ریاست کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔ سورۃ الحج آیت ۴۱ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین پر اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔" اس آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ کے مددگار اور اس کی تائید و نصرت کے مستحق لوگوں کی صفات یہ ہیں کہ اگر دنیا میں انہیں حکومت و فرماں روائی بخشی جائے تو ان کا ذاتی کردار فسق و فجور اور کبر و غرور کے بجائے اقامت صلوٰۃ ہو ان کی دولت عیاشیوں اور نفس پرستیوں کے بجائے ایتائے زکوٰۃ میں صرف ہو۔ ان کی حکومت نیکی کو دبانے کی بجائے اسے فروغ دینے کی خدمت انجام دے اور ان کی طاقت بدیوں کو پھیلانے کے بجائے ان کے دبانے میں استعمال ہو۔ اس آیت میں اسلامی حکومت کے نصب العین اور اس کے کارکنوں اور کارفرماؤں کی خصوصیات کا جوہر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ کوئی سمجھنا چاہے تو اسی ایک فقرے سے سمجھ سکتا ہے کہ اسلامی حکومت فی الواقع کس چیز کا نام ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر جو اوپر بیان کیا گیا ہے پاکستان کی موجودہ حکومت کے سربراہ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے ۱۰ شعبان ۱۴۰۰ ہجری بروز جمعۃ المبارک زکوٰۃ و عشر کے قانون کے نفاذ کا تاریخی اعلان کیا۔ یہ دن کوئی معمولی دن نہیں۔ یہ بڑی باسعادت گھڑی تھی جس کے لئے اس علاقے کے مسلمان صدیوں سے منتظر تھے یہ وہ یادگار لمحہ تھا جس کی راہ فرزندانِ توحید ایک عرصہ سے دیکھ رہے تھے۔ یہ لمحہ اجتماعی طور پر اس عہد کے ایفاء کا وقت تھا جو ہمارے ایمان کا اہم جزو ہے اور ہماری نجات کی لازمی شرط ہے۔ ہماری یہ دعا ہے کہ جو تاریخی اعلان جاری کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اسے کامیابی سے چلانے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے اور ہمیں اس کا اہل بنائے کہ ہم اس کے ذریعے اپنی حیثیت کے مطابق مستحقین کی صحیح معنوں میں مدد کریں اور سچے اسلامی معاشرہ کی تکمیل کر سکیں جس میں زکوٰۃ دینے والے تو ہوں لیکن زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ حکومت اور عوام کی کوششوں میں برکت دے آمین۔

زکوٰۃ وعشر کے قانون کا نفاذ ایک اسلامی فلاحی ریاست کے قیام کی طرف بہت بڑا اہم اور بنیادی قدم ہے۔ پاکستان میں اس قانون کے نفاذ کے لئے زکوٰۃ کے اس بنیادی فلسفہ کو مدنظر رکھا گیا ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے۔ کیونکہ دولت کا چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جانا معاشرے کے لئے انتہائی نقصان دہ ہوتا ہے۔ یہ قانون ملک کی معاشرتی اور اقتصادی ناہمواریوں کو دور کرنے کے لئے نافذ کیا گیا ہے تاکہ طبقاتی ناانصافی اور غیر مساویانہ تقسیم دولت سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کیا جا سکے۔ زکوٰۃ وعشر کے نظام ہی کی مدد سے اسلام نے صدیوں پہلے ایک فلاحی ریاست کی بنیاد ڈالی جسے موجودہ دور کے معاشرتی مفکرین اور فلسفیوں نے تسلیم کیا اور اس نظام کو بڑی اہمیت دی۔ اس قانون کا صحیح عملی نمونہ پوری دنیا کو یہ ثابت کر دکھائے گا کہ اسلام کا فلاحی ریاست کا تصور دنیا کے موجودہ تمام نظاموں سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ یہ نظام نہ تو ضرورت سے زیادہ آزادی کا قائل ہے اور نہ ہی غیر ضروری بندشوں اور پابندیوں کا روادار ہے۔ بلکہ یہ تو انسانی صلاحیتوں کے لئے ایک متوازن مثالی نظام ہے۔

بلاشبہ اس قانون کا نفاذ ایک مبارک اور خوش آئند قدم ہے لیکن انفرادی معاملات سے قطع نظر جن امور پر اجتماعی طور سے زور دینا چاہیئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نظام کو صحیح خطوط پر نافذ کرنے والی مشینری بھی مستعد، ذمہ دار، دیانتدار اور اسلامی جذبہ و شعور سے سرشار ہونی چاہیئے تاکہ وہ نہ صرف لوگوں کے اعتماد پر پوری اُتر سکے بلکہ معاشرے کے جو نادار، معذور اور محتاج افراد اس نظام سے فیضیاب ہونے کے مستحق ہیں ان کی آبرومندانہ کفالت کا سلسلہ بھی جلد از جلد شروع کر دیا جائے تاکہ اسلام کے فلاحی نظام کے وہ بنیادی پہلو عملی طور پر سب لوگوں کے سامنے آجائیں جن پر سب مسلمانوں کا ایمان و اعتقاد ہے اور جن کا ذکر وہ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں سالہا سال سے پڑھتے اور سنتے آرہے ہیں۔ بے شک زکوٰۃ وعشر کا نظام نیا یا غیر معروف نہیں۔ بے شمار لوگ اپنے طور پر بھی زکوٰۃ ادا کرتے رہے ہیں لیکن ایک نظام کے طور پر پاکستان میں اس کا نفاذ ایک نیا تجربہ ضرور ہے۔ جس کا اصل اور بنیادی مسئلہ اس پر عمل کا ہے۔ زکوٰۃ جیسے اہم نظام کے نفاذ کے ابتدائی مراحل میں کچھ انتظامی دشواریاں یقیناً پیش آئیں گی لیکن عزم پختہ اور ارادہ نیک ہو تو پھر یہ دشواریاں سدِراہ نہیں

بن سکیں حسن عمل سے جذبہ اور زیادہ ابھرنا چاہیئے۔ لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والی مختلف بدگمانیوں اور شکوک و شبہات کا ازالہ کرنے کی کوشش ایک اہم قدم ضرور ہے لیکن ایسے معاملات میں دلیل اور تاویل سے کہیں زیادہ مؤثر اور مثبت عمل ہی نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے، موجودہ حکومت نے جس اراد ے سے اس کار خیر کی بنیاد رکھی ہے وہ یقیناً بڑا بلند اور نیک ہے لیکن اس نے ایک منفرد عزت و سعادت حاصل کرنے کے ساتھ خدا اور خلق خدا کے سامنے بڑی بھاری ذمہ داری بھی قبول کی ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مستحق افراد کی آبرومندانہ کفالت کا سلسلہ صحیح خطوط پر قائم کیا جائے۔

ایک اندازے کے مطابق بنکوں کے بچت کھاتوں سے جو کٹوتیاں کی گئی ہیں ان سے ابتدائی طور پر پچاس کروڑ روپے کی رقم زکوٰۃ فنڈ میں جمع ہوئی ہے۔ مستحق افراد کی نوعیت اور تعداد کے پیش نظر غریبوں، بیواؤں، یتیموں، ناداروں وغیرہ کی اوسط امداد کا تعین اگر کم از کم ایک ہزار روپیہ فی کس بھی کیا جائے تو اس رقم سے پانچ لاکھ افراد کی کفالت کا بندوبست ممکن ہو سکتا ہے۔ آپ ذرا سوچیے کہ جب یہ پانچ لاکھ افراد اپنی ضروریات کے لئے اس رقم کو خرچ کریں گے تو ضروریات فراہم کرنے والے افراد کے وسائل میں کس قدر اضافہ ہوگا۔ وہ اس سے اپنی پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ کریں گے۔ ملک کی پیداوار بڑھے گی۔ بے شمار لوگوں کو روزگار میسر آئے گا۔ لوگوں کی آمدنیاں بڑھیں گی۔ بچت کی شرح میں اضافہ ہوگا۔ سرمایہ کاری کے مواقع بڑھیں گے اور تشکیل سرمایہ کی رفتار تیز ہوگی۔ اور یہ سب باہم مل کر قومی آمدنی میں کئی گنا اضافہ کا سبب بنیں گے۔ اس طرح عمومی طور پر معیشت میں اور انفرادی طور پر معیشت کے ہر شعبہ میں ایک ایسا زبردست انقلاب برپا ہوگا کہ ساری دنیا محو حیرت ہو جائے گی۔ ایک دوسرے اندازے کے مطابق سالانہ پانچ یا چھ ارب روپے کی رقم اس فنڈ میں جمع ہوا کرے گی۔ اگر اسی اوسط کو معیار بنا لیا جائے تو یہ رقم پچاس لاکھ سے ساٹھ لاکھ افراد کے ہاتھوں میں گردش کرے گی۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے ان لوگوں کے خلاف جہاد کیا جو نماز کی پابندی قبول کرتے تھے لیکن زکوٰۃ

ادا کرنے سے منکر تھے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ ہر مسلم صاحب نصاب سے زکوٰۃ وصول کرے اور اس کی ادائیگی اس کی مرضی پہ نہ چھوڑے۔ نہ جانے بعض لوگ کیوں یہ کہتے ہیں کہ حکومت زبردستی زکوٰۃ وصول نہیں کر سکتی۔ دراصل بات یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد سے اس براعظم میں مضبوط اسلامی حکومت قائم نہ رہنے اور بعد میں انگریزوں کی غلامی کے دوران یہاں کے مسلمانوں کو ارکان شریعت اپنی مرضی سے ادا کرنے یا نہ کرنے کی عادت پڑ گئی۔ اس لئے اب انہیں یہ پابندی عجیب اور ناگوار محسوس ہوتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور مثالی دور تھا۔ اس دور میں اسلامی مملکت کا قیام حضور اکرمؐ کے مبارک ہاتھوں سے اور حضورؐ کے صحابہؓ کرام کے ذریعے عمل میں آیا تھا۔ اب اسلامی مملکت میں اسلامی نظام کا قیام ہم جیسے خطاکاروں کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔ ہم سے غلطیاں بھی ہوں گی، کوتاہیاں بھی ہوں گی لیکن کوئی بات نہیں وہ ساتھ ساتھ دور ہوتی جائیں گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم نظام اسلام کے قیام کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کر دیں۔

حکومت کے ذرائع آمدنی

اسلامی حکومت کے ذرائع آمدنی میں جنگ سے حاصل ہونے والا مال غنیمت، غیر مسلموں سے حاصل ہونے والا جزیہ اور خراج، باہر کے ملکوں سے درآمد ہونے والے سامان پر درآمدی محصول معدنی کانوں سے حاصل ہونے والی رائیلٹی، جنگلات سے حاصل ہونے والی پیداواریں اور زکوٰۃ و عشر شامل ہیں۔ موجودہ دور کی حکومتوں کی ذمہ داریوں میں آبادی میں کئی گنا اضافہ، تہذیب و تمدن کی ترقی اور جدید سائنسی و تکنیکی تحقیق کی وجہ سے اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ وہ مذکورہ ذرائع آمدنی سے کسی صورت بھی اپنی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتیں۔ جبکہ عہد حاضر میں جنگ سے حاصل ہونے والے مال غنیمت اور غیر مسلموں سے جزیہ اور خراج کا تصور بالکل مفقود ہو کر رہ گیا ہے۔ جدید تقاضوں کے پیش نظر موجودہ دور میں ہر ملک کی حکومت معاشی ترقی اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے کوشش کرتی ہے۔ بیرونی دشمنوں سے بچاؤ کے لئے جدید ترین اسلحہ اور ایٹمی ہتھیاروں سے لیس فوج رکھتی ہے۔ ملک کے اندر امن و امان

برقرار رکھنے کے لئے پولیس اور عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے عدالتیں قائم کرتی ہے۔ ریلیں، سڑکیں، بندرگاہیں اور ہوائی اڈے تعمیر کرتی ہے۔ اسکول، کالج اور ہسپتال بناتی ہے۔ آبپاشی کے لئے ڈیم، نہریں اور بیراج تعمیر کرتی ہے۔ بجلی کی پیداوار اور تقسیم کا انتظام کرتی ہے۔ معیشت کے مختلف شعبوں مثلاً زراعت، صنعت، تجارت، مواصلات اور بینکاری وغیرہ کی ترقی کے لئے مناسب اقدام کرتی ہے۔ ملک کے مادی اور انسانی ذرائع سے بھرپور فائدہ اٹھانے اور مکمل روزگار کی سطح برقرار رکھنے کے لئے منصوبہ بندی کرتی ہے۔ ان تمام مقاصد کے لئے حکومت کو روپے یعنی مالیات کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا وہ مختلف قسم کے ٹیکس نافذ کرتی ہے اور ملک کے اندر و باہر سے قرضہ حاصل کرتی ہے۔

زکوٰۃ اور ٹیکس میں فرق

جہاں تک حکومت کے ذرائع آمدنی میں زکوٰۃ کا تعلق ہے تو اس بارے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ زکوٰۃ ٹیکس نہیں ہے بلکہ ایک عبادت اور رکن اسلام ہے، اس لئے اس کو ٹیکس سمجھنا اور ٹیکس کی طرح اس سے معاملہ کرنا ایک بنیادی غلطی ہے۔ ایک اسلامی حکومت جس طرح اپنے ملازموں سے دفتری کام اور دوسری خدمات لے کر یہ نہیں کہہ سکتی کہ اب نماز کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ انہوں نے سرکاری ڈیوٹی ادا کر دی ہے اسی طرح وہ لوگوں سے ٹیکس لے کر یہ نہیں کہہ سکتی کہ اب زکوٰۃ کی ضرورت باقی نہیں کیونکہ ان سے ٹیکس وصول کر لیا گیا ہے۔ اسلامی حکومت کو اپنے نظام اوقات اس طرح مقرر کرنے چاہئیں کہ اس کے ملازمین نماز وقت پر ادا کر سکیں۔ اسی طرح حکومت کو اپنے محصولاتی نظام میں بھی زکوٰۃ کی جگہ نکالنے کے لئے مناسب ترمیمات کرنی چاہئیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ حکومت کے موجودہ ٹیکسوں میں کوئی ٹیکس نہ تو ان مقاصد کے لئے لگایا جاتا ہے اور نہ ہی ان طریقوں سے صرف کیا جاتا ہے جو قرآن میں زکوٰۃ کے متعلق مقرر کئے گئے ہیں، اس لئے زکوٰۃ کو حکومت کے ٹیکسوں کے ساتھ ملانا ہر لحاظ سے غلط ہے۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام میں زکوٰۃ وصول کرنے کے ساتھ ساتھ ٹیکس عائد کرنا بھی جائز ہے؟ اس کا جواب اثبات میں ہے۔ اسلامی ریاست میں یہ دونوں چیزیں جائز ہو سکتی ہیں۔

زکوٰۃ کے مصارف بالکل متعین ہیں۔ اسی طرح اس کا نصاب اور اس کی شرح بھی متعین فرما دی گئی ہے۔ ان امور میں کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ کی نہ تو کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی وہ جائز سمجھی جائے گی۔ اب ظاہر ہے کہ ریاست کو اگر دوسری ضروریات کے لئے مزید مالیات درکار ہو تو وہ ان ضروریات کے لئے قوم سے مالی مدد حاصل کر سکتی ہے۔ اگر یہ وصولی لازمی ہو تو ٹیکس ہے، اگر رضاکارانہ ہو تو چندہ ہے اور اگر واپسی کی شرط پر ہو تو قرض ہے۔ زکوٰۃ اور دیگر وصولیاں نہ ایک دوسرے کی جگہ لے سکتی ہیں۔ اور نہ ہی ایک دوسرے کو ساقط کر سکتی ہیں۔

اگر ہمارے ملک میں مکمل اسلامی حکومت قائم ہو جائے اور دیانت داری سے اس کا نظام چلایا جائے تو اتنے ٹیکسوں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی جتنے آج موجود ہیں۔ موجودہ زمانے میں ٹیکسوں کے معاملہ میں جتنی بدعنوانیاں اور بددیانتیاں ہوتی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، ایک طرف تو جس مقصد کے لئے ٹیکس لگایا جاتا ہے اس کا بمشکل دس فی صد اس مقصد کے لئے صرف ہوتا ہے۔ دوسری طرف ٹیکس سے بچنے کی ایک ذہنیت پیدا ہو گئی ہے۔ اگر نظام حکومت درست ہو جائے تو موجودہ ٹیکسوں کا ایک چوتھائی حصہ بھی کافی ہوگا اور ان کی افادیت چار پانچ گنا زیادہ ہو جائے گی۔

اصولی اور عملی اعتبار سے زکوٰۃ اور ٹیکس میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اس فرق کے چند پہلو یہ ہیں۔

۱۔ زکوٰۃ ایک مالی عبادت ہے جو مسلمانوں پر فرض ہے اور وہ اسے محض اللہ کی خوشنودی کے لئے ادا کرتے ہیں۔ جبکہ ٹیکس حکومت نافذ کرتی ہے جس سے وہ اپنی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی ذمہ داریاں پوری کرتی ہے۔

۲۔ زکوٰۃ کا فریضہ ساقط نہیں ہو سکتا جبکہ ٹیکس کبھی نافذ ہوتا ہے اور کبھی معاف کر دیا جاتا ہے

۳۔ زکوٰۃ کا نصاب اور شرح ہمیشہ کے لئے معین ہے اور اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں جبکہ ٹیکس کی حد اور شرحوں میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

۴۔ زکوٰۃ صرف مخصوص مقاصد کے لئے خرچ کی جا سکتی ہے لیکن ٹیکس کی رقم خرچ کرنے کے مقاصد مخصوص نہیں بلکہ حکومت اپنی مرضی سے خرچ کرتی رہتی ہے۔

۵۔ ٹیکس لوگ رضا و رغبت سے نہیں دیتے بلکہ اپنے اوپر بڑا جبر کر کے با دل نخواستہ ادا کرتے ہیں اور اکثر بچالے جانے کی کوشش کرتے ہیں، جبکہ زکوٰۃ ان تمام باتوں سے پاک ہے۔ سچے مسلمان اسے خوشی سے ادا کرتے ہیں

۶۔ ٹیکس حکومت کے خزانے میں جمع ہوتے ہیں لیکن اگر زکوٰۃ کا حکومت کی جانب سے اکٹھا کرنے کا بندوبست نہ بھی ہو تب بھی لوگ انفرادی طور پر حاجت مندوں اور مستحق افراد میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۷۔ ٹیکس لوگوں کی آمدنیوں پر لگایا جاتا ہے۔ لوگوں کی جمع شدہ دولت اور بچتوں پر نہیں لگتا خواہ انہوں نے دولت کے انبار لگا رکھے ہوں جبکہ زکوٰۃ خرچ سے بچ کر جمع ہونے والی دولت پر نافذ ہوتی ہے۔

۸۔ ٹیکس لوگوں کے اخراجات کو مدنظر نہیں رکھتا۔ اگر ایک شخص کی آمدنی بہت زیادہ ہو لیکن وہ تنہا بہت سے افراد کی کفالت کرتا ہو تو اسے ٹیکس معاف نہیں کیا جاتا خواہ زیادہ آمدنی کے باوجود اس کا گزارہ مشکل سے ہوتا ہو دوسری طرف اس شخص پر ٹیکس نہیں عائد کیا جاتا جس کی آمدنی ایک حد سے کم ہو خواہ وہ کم آمدنی بھی اس کی ضرورت سے زائد ہو۔ اس کے برعکس زکوٰۃ آمدنی کی بجائے بچت پر عائد ہوتی ہے۔ گویا یہ اس شخص پر واجب ہوتی ہے جس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد روپیہ ہو اس طرح ایک خاص طبقہ کی دولت میں بے تحاشا اضافہ کو روکتی ہے اور دوسرے طبقہ کو ناداری اور مفلسی سے بچاتی ہے۔

زکوٰۃ کی معاشی اہمیت

زکوٰۃ مسلمانوں کی مالی عبادت ہے۔ اس فریضہ کی پابندی کئے بغیر وہ اپنی عبدیت اور ایمان کا پورا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اس لئے اگرچہ یہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضاجوئی کے لئے ادا کی جاتی ہے لیکن اس کی برکتیں ہماری دنیاوی زندگی میں بھی ظاہر ہوتی ہیں اور اس کے طفیل ہمیں بہت سے معاشی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ اس وقت ہم مختلف قسم کے معاشی مسائل سے دوچار ہیں جن میں سے نہایت اہم مسئلہ غیر مساوی تقسیم دولت کا ہے۔ جس کے باعث ہمارا معاشرہ اقتصادی اعتبار سے دو مختلف گروہ

میں منقسم ہو چکا ہے۔ ایک نہایت امیر اور دوسرا نہایت غریب۔ ان دونوں گروہوں کی آمدنی اور دولت میں بڑا وسیع فرق ہے۔ پہلا طبقہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے اور مختلف قسم کی عیاشیوں میں غرق ہے، دوسرا طبقہ بھوک و افلاس میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس وجہ سے باہمی منافرت حسد، کینہ اور انتقام جیسے مکروہ جذبات ابھرتے ہیں۔ امیر و غریب کی اس وسیع خلیج کو کم کرنے کا زکوٰۃ بہترین ذریعہ ہے، زکوٰۃ کی بدولت دولت خود بخود امیر لوگوں کے ہاتھوں سے نکل کر غریب گھرانوں کی طرف جاتی رہتی ہے۔ اور یوں زکوٰۃ کی بدولت کبھی بھی اسلامی معاشرہ میں ایسے دو گروہ پیدا نہیں ہو سکتے جن کی آمدنی میں اتنا زیادہ فرق ہو جتنا سرمایہ داری نظام میں پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ سرمایہ داری نظام کے تحت عموماً دولت مند طبقہ معاشرہ کے ایسے افراد کی کفالت کا ذمہ نہیں لیتا جو اپاہج، بوڑھے، ضعیف، نادار، یتیم، بے روزگار، مسکین اور بیوہ ہوں، مقروض، مسافر یا قیدی ہوں۔ اس لئے یہ لوگ انتہائی بدنصیبی اور محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں، اور سسکیوں کے سائے میں دُکھوں بھری زندگی گذارتے ہیں لیکن زکوٰۃ کی بدولت ان لوگوں کی محرومیاں خوشیوں میں بدل جاتی ہیں کیونکہ زکوٰۃ سے ان سب کی پرورش اور کفالت ہوتی رہتی ہے۔

۳۔ زکوٰۃ کی بدولت بے روزگاروں کو روزگار مل جاتا ہے، جو لوگ کام کرنا چاہتے ہیں اور کام کرنا جانتے ہیں، کوئی ہنر یا دستکاری جانتے ہوں لیکن سرمایہ نہ ہونے کے باعث ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں انہیں اگر زکوٰۃ مل جائے تو وہ اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ملک سے بے روزگاری ختم ہو سکتی ہے۔ اس وقت پاکستان میں کام کرنے کے اہل افراد کا پانچواں حصہ بے کار ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس سرمایہ نہیں جس سے وہ کوئی کاروبار، دستکاری یا کھیتی باڑی کر سکیں۔ اس لئے اگر انہیں زکوٰۃ دی جائے تو وہ بے کاری کی لعنت سے بچ سکتے ہیں۔

۴۔ عام طور پر لوگ اپنی دولت کو زیورات یا نقد دفینوں کی صورت میں سنبھال کر رکھتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روپیہ استعمال میں نہیں آتا اور کساد بازاری پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اسلامی

معاشرہ میں لوگ کثیر مقدار میں روپے کو یوں دفینوں اور زیورات کی شکل میں بے کار بناکر نہیں رکھیں گے کیونکہ اس طرح ہر سال زکوٰۃ دینے سے اس کی مالیت گھٹتی چلی جائے گی۔ چنانچہ لوگ اپنی دولت کو کسی نہ کسی کاروبار میں لگائیں گے، کارخانے قائم کریں گے، کسی کو شرکت و مضاربت پر تجارت کے لئے دے دیں گے اور اس سے خاص شرح سے منافع حاصل کرتے رہیں گے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ نہ صرف خود ان لوگوں کی دولت کارآمد ہو جائے گی اور بڑھے گی بلکہ عام لوگوں کو بھی فائدہ پہنچے گا اور روزگار بڑھے گا۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا: "آگاہ ہو جاؤ تم میں سے جو کوئی کسی یتیم کا ولی ہو اور اس کے پاس مال و دولت ہو تو وہ اس سے تجارت کرے اور اس دولت کو یونہی نہ ڈال رکھے ایسا نہ ہو کہ زکوٰۃ اسے ختم کر ڈالے۔

۵۔ پاکستان میں ارتکاز دولت کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ملک کی بیشتر دولت چند لوگوں کے قبضہ میں جمع ہو جائے۔ ایک اندازے کے مطابق ملک کی اسی فی صد دولت بیس فیصد افراد کے قبضہ میں ہے جبکہ اسی فی صد افراد کے حصہ میں صرف بیس فی صد دولت آتی ہے۔ اس طرح سرمایہ دار اپنے سرمایہ کی مدد سے ڈھیروں دولت کماتے اور جمع کرتے چلے جاتے ہیں۔ جس کا کچھ حصہ کاروبار میں لگاتے ہیں اور باقی عیش و عشرت میں اڑا دیتے ہیں، دوسری طرف غرباء اپنی زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اس طرح ملک کے قدرتی اور انسانی وسائل سے بھرپور استفادہ حاصل نہیں کیا جا سکتا اور معیشت عدم توازن کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس مسئلہ کا حل زکوٰۃ میں مضمر ہے کیونکہ سرمایہ داروں کو ہر سال اپنی تمام جمع شدہ دولت، سرمائے، زیورات اور مال تجارت کا چالیسواں حصہ نکال کر غریبوں میں تقسیم کرنا ہوگا جس کے باعث ان کے پاس بے تحاشا دولت جمع نہیں ہو سکے گی۔ اگر ہو گی بھی تو اس کا ایک مخصوص حصہ خود بخود باقاعدگی سے حاجت مندوں کے پاس پہنچتا رہے گا اور معیشت میں اعتدال و توازن برقرار رہے گا۔

۶۔ زکوٰۃ کی بدولت یہ مقصد بھی حاصل کیا جاتا ہے کہ دولت تمام افراد کے درمیان گردش

کرتی رہے تاکہ پیداوار، محنت اور صرف کے درمیان سرمایہ کی گردش موزوں طریقہ پر انجام پاتی رہے۔
زکوٰۃ تعاون اور باہمی کفالت پر مبنی اس معاشرہ کی بنیاد ہے جسے اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی سودی نظام کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ ایک مسلم ریاست زکوٰۃ کو لازمی حق کے طور پر وصول کرے گی، خیرات کے طور پر نہیں اور اس کی مدد سے ہر اس فرد کی کفالت کرے گی جس کے ذاتی وسائل اس کے لئے کافی نہ ہوں۔ یوں ہر شخص کو یہ اطمینان حاصل ہوگا کہ اس کی اپنی اور اس کی اولاد کی ضروریات زندگی کی تکمیل بہرحال یقینی ہے۔ ساتھ ہی ریاست نادار، مقروض افراد کی جانب سے ان کے قرضے زکوٰۃ کی مدد سے ادا کرے گی خواہ یہ قرض کاروباری اغراض کے لئے ہوں[1] یا غیر کاروباری اغراض کے لئے۔

مختصراً زکوٰۃ کا نظام ایمانی تصور، ایمانی تربیت اور ایمانی اخلاق پر قائم ہوتا ہے جو نفسِ انسانی کو ایک مخصوص سانچہ میں ڈھال دیتا ہے۔ پھر اس نظام کی بدولت ہر شعبہ میں صحیح افکار و تصورات، پاکیزہ اخلاق و عادات اور اعلیٰ طور طریقے جاری ہوتے ہیں۔ جاہلی نظام کے بالمقابل جس کی بنیاد سود پر ہے اسلام اپنے نظامِ حیات میں زکوٰۃ کو بنیادی حیثیت دیتا ہے۔ اس نظام میں انفرادی سعی و جہد اور باہمی تعاون کے ذریعہ زندگی نمو پاتی ہے اور معیشت کی ہمہ گیر ترقی عمل میں آتی ہے جو صحت مند اور خوشگوار معاشرہ کے قیام کے لئے ازبس ضروری ہے۔

مآخذ

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا:

(۱) اسلام کا نظامِ عدل۔ استاد سید قطب۔ مترجمہ محمد نجات اللہ صدیقی۔

(۲) تفہیم القرآن۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

(۳) معاشیاتِ اسلام۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

---

[1] یہ نکتہ تشریح طلب ہے اور اس میں بحث و نظر کی ضرورت ہے (مدیر)

اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ کا تصوّر

(ایک تقابلی جائزہ)

● ——— سلیم طارق خان ایم اے

جہاں تک علم و حکمت اور آداب زندگی کا تعلق ہے ما قبل مسیح کا یونان آج کے تہذیب یافتہ یورپ سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ ۲۰۰۰ قبل مسیح کا جزیرہ کریٹ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا گہوارہ تھا۔ ایتھنز کی تہذیب نے سولن جیسا مدبر تاریخ کو دیا۔ چوتھی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان کی تہذیب اپنے عروج پر تھی اور یونان علم و حکمت، فہم و فراست سیادت و سروری اور ادب و فن کا مرکز تھا۔ یہی زمانہ ہے جب سقراط، ارسطو اور افلاطون جیسے یکتائے روزگار فلسفی پیدا ہوئے جو آج بھی مغربی تہذیب کو فکری بنیاد فراہم کرنے کے باعث زندہ ہیں۔ انہوں نے ہی قانون کی حاکمیت کا نظریہ پیش کیا۔ اسی یونانی تہذیب نے مصر کو یونان ثانی اور روم کو رومۃ الکبریٰ کی عظمت عطا کی اور عالمگیر قیادت و سیادت کا شعور بخشا۔ اس مادی اور فلسفیانہ تہذیب میں مذہب کے خلا کو عیسائیت نے پہلی صدی عیسوی میں پر کیا۔ خود یونان بھی مذہبی ہدایت سے محروم ہونے کے باوجود اخلاق کے تصور سے یکسر بیگانہ نہ تھا۔ بلکہ یہیں سے زینو جیسا فلاسفر پیدا ہوا جس نے رواقی فلسفۂ اخلاق کو جنم دیا۔ یہ فلسفہ تیسری صدی قبل مسیح سے دوسری صدی عیسوی تک مقبول مکتب فکر رہا۔

لیکن یہ تمام تر تہذیبی ارتقاء اس عروج کو پہنچ جانے کے باوجود رومۃ الکبریٰ کی تہذیب کو اپنے ہی ایک مورخ اور فلسفی گبن" کے اس تبصرے سے نہ بچا سکا کہ "تاریخ کے اتنے عرصہ میں

قباحتوں کی کثرت اور محاسن کی کمی کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی"۔ آخر اس کا سبب کیا تھا۔ ہم اس کا باعث اس تہذیب کی، ابدی حقیقتوں سے روگردانی، کو قرار دیتے ہیں۔

بعد ازاں اس تہذیب کا قاتل قیصر روم "ہرقل" قرار پاتا ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط موصول ہو جانے، آپ کے پیغام حقانیت کی تصدیق کرنے، آپ کے ساتھ اظہار نیازمندی کرنے اور یہ کہنے کے باوجود کہ

"اگر یہ باتیں سچ ہیں تو خدا کی قسم! میرے پاؤں تلے کی مٹی تک وہ قابض ہو جائے گا۔
کاش میں اس وقت اس کے پاس جا سکتا اور اس کے پاؤں دھوتا"۔

اس کے بعد بھی وہ قبول حق سے محروم رہا۔ یہ تاریخ کا نہایت اندوہناک موڑ تھا جس نے روم کے نام نہاد تہذیب یافتہ تمدن کو DARK AGE کی طرف دھکیل دیا۔ قیصر اس ذات برحق کے بارے میں حقیقت کے ادراک کے باوجود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جگہ مغربی اور یورپی تہذیب کے فرزند کو اس منصب جلیلہ پر فائز دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ نیشنلزم مغرب کے تہذیبی ارتقاء میں مستقل بالذات فلسفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغرب کی "DARK AGE" کا ذمہ دار قیصر ہے جس نے صرف اور صرف ذاتی اقتدار، خودغرضی اور درباریوں کی خوشنودی کی خاطر حق کو قبول نہ کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خط اور پیغام میں واضح طور پر فرمایا تھا۔

"دین اسلام کو قبول کر لو، تم اور تمہاری ملت فلاح پا جاؤ گے اور اگر اس دعوت کو قبول نہیں کرو گے تو اپنا اور ساری عیسائی ملت کا وبال تم پر ہوگا"۔ آپ نے قیصر کو عیسائی دنیا کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے مخاطب فرمایا کیونکہ اس وقت کے دستور کے مطابق بادشاہ کا مذہب ہی عوام کا مذہب ہوتا تھا۔ اس لئے قیصر کا دین کی دعوت کو ٹھکرانا، لاکھوں افراد کو ہدایت سے محروم کر دینے کے علاوہ ان کے تہذیبی زوال کا پیش خیمہ تھا۔

آپ کی دعوت اس حاکمیتِ الٰہیہ کی طرف تھی جس کا اقرار عیسائی بھی کرتے تھے۔ لیکن مرور ایام

اور نفسانی خواہشات کے سبب تثلیث کے عقیدے نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی حقیقی ہیئت کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اسی لئے قرآن پاک نے اہل کتاب کو دعوت دی تھی۔

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواءٍ بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ و لا نشرک بہ شیئاً و لا یتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللہ۔ (آل عمران)

اے اہل کتاب! آؤ کیوں نہ ہم ایک ایسے کلمہ پہ جمع ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔ یعنی ہم اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں نہ ہی اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہی ہم میں سے کوئی کسی کو اپنا رب بنائے۔

لیکن اس دعوت کو قبول کرنے میں ان کی ذاتی قیادت و سیادت معرض خطر میں تھی۔ ان کی وہ حیثیت برقرار نہیں رہ سکتی تھی جس کے تحت ان کا ہر قول قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ ان کی نفسانی خواہشات کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی جن کے وہ بندے اور غلام بنے ہوئے تھے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ خط قیصر کو اس وقت دیا گیا جب وہ ایران سے جنگ کے بعد فتح کا جشن منا رہا تھا اس نے راہ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اسی دن سے یونانی فلسفے اور عیسائی عقیدے کی بنیاد پہ اٹھائی گئی تہذیب اپنے زوال کی طرف تیزی سے بڑھنا شروع ہو گئی۔

کسی بھی تہذیب کے عروج و زوال میں سیاسی نظم و ضبط، اور افکار و خیالات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور حکمرانی و اقتدار کا بنیادی فلسفہ ہی ان کے تہذیبی خطوط متعین کرتا ہے۔

یونانی تہذیب میں ریاست کا تصور:۔ ریاست کی فلسفیانہ توجیہات سب سے پہلے یونانی افکار میں ملتی ہیں، جہاں ریاست اپنے دور کے مطابق جدید ترین خطوط پہ استوار رہی اس وقت کے نامور مفکرین میں سقراط، افلاطون، ارسطو اور گلاکون وغیرہ شامل ہیں جنہیں آج بھی مغرب میں بابائے فلسفہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے ریاست کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔

افلاطون نے ایک ایسی مثالی مملکت کا تصور پیش کیا جہاں اچھائیاں ہی اچھائیاں ہوں، الف

کے تقاضے مکمل طور پر پورے ہوں۔ اس کی نظر میں ریاست کا سب سے بڑا منصب، یعنی حکمرانی و اقتدار، فلسفی کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے کیونکہ فلسفی "فہم و ادراک، عقل سلیم اور وجدان کے نہایت اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے۔ وہ فکر صحیح پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک فلسفی مکمل جوش اور جذبے سے سچائی کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اس کی وسعت نظر اس کو فکر تو سے نوازتی ہے"۔ لیکن وہ اس بات کی ضمانت دینے سے قاصر ہے کہ فلسفی واقعی راست فکر ہوگا۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک فلسفی عوام کے مکمل مسائل کی تہہ تک پہنچ کر ان کا حل ڈھونڈ سکتا ہے۔ یہی اس کی ریاست کا "اقتدار اعلیٰ" ہے۔

افلاطون اخلاق کا زبردست حامی ہے اور تعلیم و اخلاق کے بارے میں اپنا مخصوص نظریہ رکھتا ہے جس میں وہ حکمران اور محکوم دونوں طبقوں کے لئے مختلف نظام ہائے تعلیم تجویز کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انصاف، طاقتور کے مفاد کا نام ہے۔ اس کی ریاست میں عورت اور بچے اسٹیٹ کی میراث ہیں۔

ارسطو کے نزدیک ریاست محض ایک معاشرتی معاہدہ ہی نہیں بلکہ یہ سب سے اعلیٰ و ارفع قدرتی وابستگی ہے۔ اس کی ریاست کی ذمہ داری میں عوام کو انصاف مہیا کرنا، ان کی ضروریات کا خیال رکھنا، ذہنی و جسمانی نشوونما کے مواقع فراہم کرنا، اور ان کے اخلاق سدھارنا شامل ہے۔ اس کے نزدیک ریاست پر افراد کے انفرادی افکار و اعمال اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ وہ نظم حکومت کے لئے مختلف نظاموں کی تجویز پیش کرتا ہے۔

۱۔ ملوکیت (MONARCHY) شخصی حکومت

۲۔ اشرافیہ (ARISTOCRACY) چند منتخب افراد کی حکومت

۳۔ نظم دستوری (POLITY) جمہوری حکومت

ارسطو، حصول اقتدار اور ریاست دونوں کے لئے پیدائش، دولت، محاسن اور آزادی کو بنیاد قرار دیتا ہے۔

ارسطو اپنی کتاب "سیاست" میں اہل یونان کی تکریم کا دعویدار ہے۔ اور تمام دنیا پر حکومت کو

انہی کا حق تصور کرتا ہے۔ اس کے نزدیک باقی تمام دنیا اہل یونان کی غلام ہے۔ اس نظریہ کو
ہ دور کا نازی ازم یا اپنی انتہا میں نیشنلزم بھی کہا جا سکتا ہے۔
افلاطون کے اخراف جن کا حق حکومت محفوظ ہے آج دارالامراء اور دارالعوام کی شکل میں
ان میں دیکھے جا سکتے ہیں، جو قانونی گرفت سے بالاتر قرار دیئے گئے ہیں، کیونکہ وہ ملک کے
انون بناتے ہیں۔ ان کی روایت کے مطابق کوئی عدالت ان کے نام نوٹس جاری نہیں کر سکتی۔
ن اور بچے کی ریاستی ملکیت آج سوشلزم کی صورت میں رائج بھی ہے۔ انہی نظام ہائے حکومت
رباب اختیار ان کو جدید ترین فلاسفی کہہ کر دنیا کے سامنے قیادت کا سکہ جمانے کی فکر کرتے ہیں،
لہ انہی افکار وخیالات کی حامل سلطنتیں ان کو اپنا کر اپنے ہی خنجر سے خودکشی کر چکی ہیں۔
روم کے افکار ونظریات :- اہل یونان جدید فکر پیش کرنے میں اہل روم کے پیش رو
اور اہل روم نے انہی افکار وخیالات کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کی۔ یہیں یونانی افکار اور عیسائیت
یدۂ اخلاق ایک دوسرے سے گلے ملے، اور اسی جگہ سلطنت میں عیسائیت کے راستے عقیدۂ
بھی داخل ہوا جو آگے چل کر تثلیث میں بدل گیا۔
اہل روم کی اس سلطنت کا آغاز پہلی صدی عیسوی میں اٹلی سے ہوا۔ اور اسی صدی کے
م تک یہ لوگ شمالی اور مغربی بربریوں پر قبضہ کرنے کے بعد دریائے فرات تک اپنی سرحدیں
ا چکے تھے۔ ان کے فلسفہ حیات اور تصور سیاست میں یونانی اور رواقی اثرات داخل
ئے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں غیر رواقی نظریات کے لئے جگہ نہ تھی، اہل روم ریاست
یک قانونی حاکمیت سمجھتے تھے۔ سیاسی حاکمیت عوام کے ہاتھ میں تھی۔ بادشاہ عوامی نمائندہ ہوتا
ا۔ اس پر اعتماد کرتے ہوئے وہ اسے سرچشمہ قانون قرار دیتے تھے۔ اس کی اطاعت قانون کی
عت تھی۔ عوام کی اعلیٰ حاکمیت کی حامل تنظیم سینیٹ اور اسمبلی نے اسے مکمل اختیارات سونپ
یئے تھے۔ اس اقتدار کو ایک دفعہ تفویض کرنے کے بعد چھینا نہیں جا سکتا تھا۔ ان کے نزدیک
ملاب کا کوئی جواز نہ تھا۔ کیونکہ بادشاہ کی حیثیت عوامی نمائندے کی سی تھی۔

بعدازاں بادشاہ کو عوامی نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ کیونکہ تاجداری اور بادشاہت کو خدائی عنایت قرار دے کر بادشاہ ظل اللہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ رومی حکومت میں عیسائیت کے در آنے کے بعد نظریہ الوصیت نے اپنی حیثیت منوالی ۔ اور یہ الوصیت تخت و تاج کے لئے ڈھال قرار پائی، اس کے باوجود سلطنت روم کا ایک ہی نعرہ رہا۔

ریاست کا منشاء ——— اس کے عوام کا منشا ہے ۔

رفتہ رفتہ نظریہ بادشاہت اس قدر ترقی کر گیا کہ بادشاہ کے لئے یہ تصور پیدا ہو گیا کہ وہ (۱) ریاست کا مختار کل ہے۔ (۲) سب سے بڑا دینی پیشوا ہے۔ (۳) جنگ اور امن کا مختار ہے۔ (۴) اور قوت اس کے لئے ایک عنایت مطلق ہے۔

رومی ریاست کے ڈھانچے میں مذہب کی حیثیت کو سب سے پہلے رومی سینٹ آگسٹائن نے پیش کیا۔ اس کے نزدیک ریاستوں اور سلطنتوں کی تباہی ان کی برائیوں کے سبب ہوتی ہے۔ اس نے تمام دنیا کو عیسائیت کے جھنڈے تلے جمع کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے نزدیک عیسائی دولت مشترکہ قائم کر کے تباہی و بربادی کی پیش بندی کی جا سکتی تھی، اس سینٹ کے نظریہ ریاست کی بنیاد خالصتاً الوصیت پر تھی جس میں انصاف کا دور دورہ ہو اور ایسی سلطنت امن کی علمبردار ہو۔ اس نے کلیسا اور سلطنت کے دو اصولوں پر مشتمل نظریہ دیا۔ اس کے نزدیک کلیسا، ریاست کے تابع نہیں ہو سکتا۔ اس کے افکار کو ازمنہ وسطیٰ میں بنیادی حیثیت حاصل رہی۔ گیلاشش GALASIUS کا دو شمشیری نظریہ (TWO SWORDS) اور عالمگیریت UNIVERSALISM بھی آگسٹائن کے خیالات کا ہی پرتو تھے۔

مذہبی حکومت :- مذہبی حکومت کے لئے انگریزی زبان میں THEOCRACY کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ (PRIEST CLASS) خدا کے نام پر اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے۔ ایسے ہی گروہوں کے بارے میں قرآن میں آتا ہے کہ

انّ الّذین یشترون بعہد اللہ و ایمٰنہم ثمناً قلیلاً

اور وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ کھاتے ہیں۔

اس تصور کی بنیاد گیلاشس کا دو شمشیری نظریہ ہے جس کے مطابق "اللہ نے پیٹر کو دو تلواریں دیں ان میں سے ایک تلوار روحانی تھی دوسری لادینی ، اور پیٹر نے یہ دونوں تلواریں پوپ کو عطا کر دیں۔ اس لئے پوپ زمین پر خدا کا نائب ہے۔"

اس مذہبی حکومت کا آغاز ۴۷۶ء سے ہوا اور یہ حکومت نظریاتی اعتبار سے ایک ہزار سال تک یورپ میں برسرِ اقتدار رہی۔ اس دور کو یورپ کا تاریک دور "DARK AGE" کہا جاتا ہے ، اس دور کی تہذیب یونان و روم کے سیاسی افکار اور عیسائیت کے مذہبی و اخلاقی نظریات اور رہبانیت کے تمدن کا آمیزہ تھی۔ یہ دور غیر علمی اور مذہبی اداروں کی سیادت کا دور تھا۔ فکر اور نظریات کی بجائے عبادات نے اہمیت پائی ، علوم و افکار پر مذہبی عقیدے کی حکمرانی تھی۔ اس دور کا سیاسی فلسفہ عیسائیت کے مذہبی صحیفوں ، ٹیوٹانی عمل ، رومن قانون اور یونانی مفکرین کے افکار پر مشتمل تھا جس وقت یہ دور اپنی انتہا کو پہنچا عالمگیر عیسائی شہنشاہیت پر پوپ کا اقتدار مسلط ہو چکا تھا۔ اس دور حکمرانی میں پاپائیت کا ظلم و تشدد قرونِ اولیٰ کی شہنشاہیت سے کہیں زیادہ تھا۔

مذہبی سیادت نے محکمۂ احتساب کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد لوگوں کو عیسائیت کے افکار سے روگردانی کرنے اور اس کے خلاف سوچنے سے روکنا تھا۔ اس محکمہ کی کارروائیاں آج بھی رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہیں۔ ریاست پر کلیسا کی گرفت جس قدر مضبوط ہوتی گئی اہل کلیسا کی خود مختاری میں اسی قدر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پندرھویں صدی عیسوی تک ان کلیساؤں کے راز دورن خانہ کی نقاب کشائی نہ ہو سکی تھی۔ ۱۲۰۹ء میں کلیسا کے ارباب حل و عقد کی ایک کانفرنس ایوگنون منعقد ہوئی ، جس میں کلیسا اور لشپ سے اختلاف رکھنے والوں کی سزاؤں کے بارے میں پوپ کے احکامات کا پابند کیا گیا۔ بعد ازاں ۱۲۱۵ء میں عیسائی حکمران بھی اس حلف میں شریک کر لئے گئے۔ اس اقدام سے پوپ نے بیک قلم عوام کو ان کی آزادی اور حکمرانوں کو ان کے اختیارات سے محروم کر دیا۔ مونٹانو نے سب سے پہلے انکوزیشن کا پردہ چاک کیا۔ اس کی کتاب ۱۵۶۷ء

میں ہائیڈل برگ سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ لیگرانو جو کہ اس محکمہ احتساب کا جنرل سیکرٹری رہ چکا تھا اس کے گھناؤنے اقدامات کو منظر عام پر لانے میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے یورپی ادب میں اس محکمہ کی کارگزاریوں کی مکمل روداد دیکھی جا سکتی ہے۔ محکمہ احتساب کے کارندوں کے لئے یہ اطلاع کافی تھی کہ ایک فرد دل سے عیسائی نہیں جادوگر ہے یا اس نے واجبات مکمل ادا نہیں کئے ہیں۔ اس کے لئے خفیہ اطلاع کافی سمجھی جاتی تھی، کسی فرد کا گھر سے اچانک غائب ہو جانا اہل خانہ کی اطلاع کے لئے کافی تھا کہ ان کا آدمی انکوزیشن کی زد میں آگیا ہے۔ اقرار جرم کے لئے سزاؤں کی چودہ اقسام تھیں اور اقرار جرم کے بعد زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ صرف سپین میں زندہ جلائے جانے والوں کی تعداد ۳۱۲۱۲ تھی۔ ایک اندازے کے مطابق مغربی یورپ اور برطانیہ میں زندہ جلائے جانے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ یہی وہ تھیاکریسی ہے جس سے آج کا یورپ خوف زدہ ہے۔

انسان، انسانیت کے نام پر عوام الناس کا مقتدر اعلیٰ بنے یا خدا کا نام لے کر خود قوانین وضع کرنے کا اختیار حاصل کر لے، بے چارے عوام کے لئے تباہی و بربادی ہی مقدر بنتی ہے۔ کیونکہ انسان قانون سازی کے اختیار سنبھال لینے کے باوجود، خودغرضی، محبت نفرت اور عصبیت کے جذبات کو اپنی فطرت سے خارج نہیں کر سکتا۔ اور انسانی فطرت کے ان مظاہر کے پس منظر میں تیار ہونے والا کوئی قانونی ڈھانچہ تمام انسانوں کے لئے فلاح و بہبود بھائی چارے اور مساوات انسانی کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

قدیم یونان، روم یا مصر ہو، ازمنہ وسطیٰ کی مذہبی سیادت ہو، یا جدید دور کا نیشنلزم اور سوشلزم، اپنی بنیادی فکر میں یہ سب ایک ہی ہیں۔ فرعون خدائی و ربوبیت کا دعویدار بن کر قانون سازی کے اختیار سنبھال لے، جمہور کی سیادت کے نام پر قانون بنائے جائیں یا خود ساختہ مذہبی اقدار قانون سازی کا منبع بنیں ان میں سے کوئی انسانیت کی فلاح کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نظریاتی طور پر "الکفر ملۃ واحدۃ" فقط ان کے طریق کار کا اختلاف ان کو "شعوب و قبائل" میں بانٹے ہوئے ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ پارلیمنٹ یا پارلیمان کو ملک کے انسانی سروں کی گنتی

ون سازی کا حق دے دیتی ہے، جس کے باعث وہ کبھی ہم جنسیت (HOMO SEXUALITY) کی
ازت دے دیتی ہے۔ اور کبھی وہ شراب کی تمام تر خرابیوں کو نظر انداز کر کے اس کی بندش کا حکم نافذ
نے کے باوجود پھر اس کی اجازت دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ عوام الناس یہی چاہتے ہیں۔ اور نفسانی
ہش کے تابع ان لوگوں سے کوئی بھی قانون بنوایا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ اس کے
ہیں افراد کی تعداد دوسرے گروہ کی نسبت زیادہ ہو۔ ایک فرد یا چند افراد کی زیادتی و اکثریت ہی
ے قانون بنانے کے لئے کافی ہے۔

ریک احیائے علوم :۔ تحریک احیائے علوم کا آغاز صلیبی جنگوں سے ہوا، یورپ میں ان
گوں نے نہایت دور رس اثرات پیدا کئے۔ قرون وسطیٰ کا یورپ جہالت اور پس ماندگی کا شکار
ا۔ صلیبی جب اسلامی ممالک میں آئے تو یہاں کے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے
ات قبول کئے۔ جب وہ واپس گئے تو اس نعمت سے تہی دامن نہ تھے، صلیبی جنگوں (۱۰۹۷-
۱۲) سے یورپ کی آنکھیں کھلیں اور پس ماندہ مغرب کے تاریک افق پر احیائے علوم کی سحر
ٹ نکلی۔ اس تحریک کو فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) سے مہمیز لگی، اور یہ تحریک آگے بڑھتی چلی گئی۔
د ازاں مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ - ۱۵۴۶) کی پروٹسٹنٹ تحریک سے اس کو تقویت ملی، کیونکہ
ی کے نزدیک صرف "انجیل مقدس" تمام قوانین کا منبع تھا۔ اس نے روم کے پوپ کی مطلق العنانیت
تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور واضح طور پر کہا کہ ریاست اور کلیسا اپنا علیحدہ علیحدہ وجود
ھتے ہیں۔ اور انہیں ایک دوسرے کے دائرہ اختیار میں مداخلت کا حق نہیں ہے اور مطلقیت
یاست کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے بعد کالفن نے بھی اس نظریہ کو پروان چڑھایا۔ اسی دوران میکاولی
سیاسی نظریات نے یورپ کے ریاستی نظام میں بحران پیدا کر دیا۔ اگرچہ تحریک اصلاح کے
ریعے اس کا سد باب کرنے کی کوشش کی گئی اس کے باوجود جمہوری اور انسانی حقوق کا مطالبہ زور
ر شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ عقلیت نے راہ پائی تو PRIEST CLASS نے اسے اپنے خلاف
ا۔ فلسفے اور تعقل کو اپنے دلائل کی بنیاد بنانے والا ہر شخص گردن زدنی قرار دیا گیا۔ اور

محکمہ احتساب کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب دونوں کو ایک دوسرے سے صلح کئے بغیر چارہ کار نظر نہ آیا تو انہوں نے بقائے باہمی اور عدم مداخلت کے اصولوں کے تحت آپس میں ذہنی و نظریاتی سمجھوتہ کر لیا۔ یہاں پاپائیت کے مذہبی قدم رک گئے اور جدید بے دین سیاست آگے بڑھ کر زمام اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینے میں کامیاب ہو گئی۔

مغربی علوم و فلسفہ کی تاریخ میں ڈیکارٹ المتوفی سنہ ۱۶۵۰ء کو بہت اہم مقام حاصل ہے جو فلسفۂ تشکیک پیش کر کے جدید عقلیت پسندی کا باوا آدم قرار پایا۔ اس کے نزدیک کسی شے کے وجود کے لئے خالص مادی شہادتیں اور دلائل ضروری ہیں۔ وہ عرفان حقیقت کے لئے تجربی اور مشاہداتی علم کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد ہوبز نے اس کے افکار کو ترقی دے کر مادیت کے نظریہ میں پیش رفت کی۔ ان دونوں زعماء کے نزدیک مادیت اور ماوراءالطبیعات دونوں علیحدہ اور جدا مقام رکھتے تھے، لیکن اسپی نوزا خالص عقلیت کا علمبردار بنا، یہاں تک کہ مادہ، روح اور خدائی وجود سب خلط ملط ہو کر رہ گئے۔ اس تحریک کے باوجود سترھویں صدی عیسوی میں خدا کا تصور کسی نہ کسی حیثیت میں موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گیلیلیو اور نیوٹن جیسے سائنس دان خدا کے وجود کے منکر نہ تھے۔ لیکن ان کے سائنسی اکتشافات کو خدائی تصور سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں فکری تحریک مکمل طور پر مادیت اور لادینیت کے گرد گھومتی رہی۔ اگرچہ ملحدانہ نظریات نے بہت زیادہ اثر و نفوذ قائم کر لیا تھا لیکن فلاسفر خدا کے وجود کا رسمی اقرار کرنے کے باوجود اس کو عملی زندگی کے دائرے سے باہر ہی رکھنا مناسب سمجھتے تھے اور دستوری حاکمیت کی حدود میں در آنے کی اجازت نہ تھی۔ حق اور باطل کا معیار مادیت قرار پایا اور علوم کی تحقیق کے لئے معیار خالصتاً تجربی بن کر رہ گیا۔

ہیگل نے مثالی مادیت کا نظریہ پیش کیا۔ کانٹ نے مادہ و روح کے درمیان اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ خدا کا وجود، روح کی بقا اور ارادے کی آزادی انسانی علم سے ماوراء ہیں۔ اس پر ہم یا تو غائبانہ ایمان رکھیں یا اس کو (PRACTICAL WISDOM) قرار دادیں

اسی کے مطابق دائرہ کار متعین کرنا چاہئیے، خدا اور مادی نظریہ کے درمیان اتحاد و اتفاق کی یہ آخری کوشش تھی، لیکن عقل، اپنی خواہشات پر پابندی اور اخلاقی قیود کے لئے خود کو تیار نہ پاکر ان تمام اقدار و روایات سے آزاد ہو گئی۔

انیسویں صدی عیسوی میں علم الحیاتیات و عضویات اور طبقات الارض میں پیش رفت کے باعث خالص مادی نقطۂ نظر نے راہ پائی۔ مادی وسائل کی زیادتی، نئے نئے سائنسی انکشافات، تجربات و مشاہدات اور ایجادات کے سائے میں ملحدانہ نظریات نے ترقی کی، اور یہ کائنات مکمل طور پر بے خدا و خالق بن کر رہ گئی۔ بلکہ خدا اور خالق کے بارے میں تمام نظریات و اعتقادات کو گمراہ کن قرار دے دیا گیا۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے اس کو مکمل طور پر جڑ سے اکھاڑ پھینکا جس کے مطابق بے خدا و بے خالق کائنات کے نظریہ کے ساتھ ساتھ انسان کی خالص "مادی اور حیوانی" توجیہہ نے اہل مغرب کو تمام اخلاقی حدود و قیود سے آزاد کر دیا۔ اس نظریہ نے مغربی تہذیب کو مادیت، حیوانیت اور لادینیت کی بنیادیں فراہم کیں۔ انسان اور اس کی خواہشات اس کی قوت حاکمہ اور الٰہ کی حیثیت سے ابھریں۔ مغرب کا جمہوری تصور اپنی انتہا کو پہنچا۔ اس جمہوری تصور میں عوام اور ان کی خواہشات مقتدر اعلیٰ ہیں، عوام ہی ہئیت حاکمہ ہیں اور انہی کے ہاتھ میں قانونی حاکمیت ہے۔ یہ ہے مغرب میں نظریہ اقتدار اعلیٰ کا ارتقاء اور یہی ان کی انتہا ہے۔

اقتدار اعلیٰ:۔ فلسفۂ مغرب کے ارتقائی عمل کو پیش نظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قبل مسیح کا یونان ہی نہیں ازمنہ وسطیٰ، قرون وسطیٰ اور دور جدید میں بھی یہ خطہ سیاسی لحاظ سے مکمل طور پر خواہش نفسانی کے چنگل میں رہا ہے اور اسی نے ان پر حکمرانی کی ہے۔ یورپ میں تصور حاکمیت منطقی نقطۂ نظر سے ایک ہی رہا ہے۔ بادشاہت تھی تو اس نے اپنی مرضی سے قانون بنائے اور نافذ کئے۔ مذہبی حکومت آئی تو خدا کے نام پر چند سر برآوردہ مذہبی زعماء نے اپنے اصول و قوانین وضع کئے، اور آج کا دور تو انسان کی خدائی کا دور ہے اور یہی جمہوریت

ہے، یہی ان کا اقتدار اعلیٰ رہا ہے۔ اس نے سو شکلیں بدلی ہوں روح ایک ہی کارفرما ہے۔

دراصل اقتدار اعلیٰ وہ قوت ہوتی ہے جس کے لئے مکمل اطاعت و فرمانبرداری کا رویہ اپنایا جاتا ہے اور اسی پر اخلاق و تمدن اور سیاست و حکومت کا پورا نظام قائم ہوتا ہے۔

جدید علم سیاسیات کے ماہرین نے حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کے تین شعبے قائم کئے ہیں۔

۱۔ حقیقی حاکمیت۔ PARAMOUNTCY

۲۔ قانونی حاکمیت۔ LEGAL SOVEREIGNTY

۳۔ سیاسی حاکمیت۔ POLITICAL SOVEREIGNTY

اگر ہم ان تینوں شعبوں کو ان الفاظ میں بیان کریں تو ان کا مفہوم ادا کرنے میں آسانی ہوگی کہ حقیقی حاکمیت کے نام اور اس کی منظوری سے قانونی حاکمیت کا ادارہ۔ قانون سازی کرے گا، سیاسی حاکمیت اس کو ریاست میں نافذ کرنے کا فریضہ سرانجام دے گی۔

مغرب میں مجموعی طور پر اقتدار اعلیٰ کا جو تصور رہا ہے اس کو انہی الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے جو ہیوگو گروٹیس نے اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ

۱۔ انسان نے خدا کی رہنمائی یا اس کے احکام کے تحت نہیں بلکہ قطعی طور پر اپنی مرضی اور منشاء کے ساتھ حکومت کی منزل کا تعین کیا ہے۔ کیونکہ انسان نے اپنے تجربے سے یہ سیکھا کہ منتشر کنبے اور بکھرے ہوئے خاندان کسی جارحیت سے خود کو اس وقت تک محفوظ نہیں رکھ سکتے جب تک وہ اکٹھے نہ ہو جائیں۔ لہٰذا وہ ایک معاشرے کی صورت میں متحد ہو گئے اور طاقت کے جواز کے بعد حکومت وجود میں آئی۔

۲۔ ایک حاکمیت یا اقتدار اعلیٰ، کسی بھی اعلیٰ قوی اقتدار، پاپائیت سے آزاد ہے۔

۳۔ ایک حاکمیت دوسری حاکمیت سے بالکل آزاد ہے۔

۴۔ ہر حاکمیت یا اقتدار اعلیٰ تمام امور میں مطلقاً آزاد ہے خواہ یہ امور مذہبی ہوں یا غیر مذہبی۔

۵۔ ہر حاکمیت کو اپنے علاقے کے تمام لوگوں پر مکمل اختیارات حاصل ہیں۔

اقتدار اعلیٰ کے اختیارات :۔ ہوبز نے ریاست کے اقتدار اعلیٰ کو جو اختیارات دیئے ہیں کم و بیش آج بھی وہی ہیں۔ اس نے ریاست معاشرے اور حکومت کے درمیان کوئی تخصیص نہیں کی۔ وہ واقع الامری DEFACTO اور قانونی DEJURE حکومت کو ایک ہی سطح پر رکھتا ہے اور ان میں امتیاز نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک ریاست کی تشکیل انسان کو خطرات سے بچانے کے لئے کی جاتی ہے۔ وہ مقتدر اعلیٰ کو اس قدر اختیارات تفویض کرتا ہے کہ یہ معاہدہ آزادی کی بجائے غلامی کا مظہر بن جاتا ہے۔ وہ اقتدار اعلیٰ کے لئے لیویاتھن LAVIATHAN کا نام استعمال کرتا ہے جس کے معنی دیو پیکر عفریت کے ہیں۔ اس حاکم اور مقتدر اعلیٰ کے اختیارات درج ذیل ہیں۔

۱۔ مقتدر اعلیٰ لامحدود اختیارات کا مالک ہوتا ہے جس پر کوئی شرط عائد نہیں کی جا سکتی ہے

۲۔ مقتدر اعلیٰ کو اختیارات عوام تفویض کرتے ہیں، لیکن چھین نہیں سکتے۔ اس کا کوئی فعل بھی غیر قانونی نہیں ہوتا۔

۳۔ مقتدر اعلیٰ کو قانون بنانے، ٹیکس لگانے اور جنگ کا اعلان کرنے کا اختیار حاصل ہے، وہ منصف ہے۔ اور فیصلہ صادر کرنے کے تمام تر اختیارات اسی کے پاس ہوتے ہیں۔ عوام قیام امن کے لئے اس کو اختیارات دیتے ہیں۔ اسی لئے وہ عوام کو اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ کرنے کا ذمہ دار ہے۔

۴۔ رعایا کو اس کے خلاف احتجاج کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر رعایا عدم اطاعت کا اظہار کرے تو اس کا یہ اقدام نامناسب تصور کیا جائے گا۔

۵۔ اقتدار اعلیٰ اپنے اختیارات کسی دوسرے کو منتقل نہیں کر سکتا۔

مغرب کی لادین سیاست، ملحدانہ فکر اور اس کے اقتدار اعلیٰ کے اختیارات کی جھلک انگلستان کی شاہی جمہوریت، امریکہ کی صدارتی جمہوریت، اور سوشلسٹ ممالک کی سوشلسٹ جمہوریت میں بدرجۂ اتم دیکھی جا سکتی ہے۔ ان سب ممالک میں طریق کار کا اختلاف ہے، ان میں فلسفہ اور نظریہ ایک ہی کارفرما ہے۔ ان تمام ممالک کو ان کی نظریاتی ہم آہنگی کے پیش نظر اگر الکفر ملتہ

واحدہ" کہدیا جائے تو یہ غلط نہ ہوگا۔

اسلام دنیا کے تمام نظام ہائے زندگی۔ سے مختلف ہے، کیونکہ اسلام اور دوسرے نظاموں میں بنیادی اختلاف نظریہ کا ہے، اسلام، اقتدار اعلیٰ، ریاست، کائنات کی "تاریخی توجیہہ" اور "نظریہ ارتقاء" کے متعلق اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتا ہے جو کسی صورت بھی دوسرے نظاموں سے مطابقت نہیں رکھتا، اس وقت اسلام کے صرف ریاستی نظام کی بنیاد اقتدار اعلیٰ یا حاکمیت حقیقی کے بارے میں بحث کی جائے گی۔ تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اسلام نے دوسرے مختلف ازموں کے مقابلے میں جو اہم نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ اس کی اہمیت وافادیت کیا ہے۔

اسلامی ریاست کے مقاصد و فرائض:۔ قرآن پاک میں مختلف مقامات پر اسلامی ریاست کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔ مثلاً سورۃ الحج میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

الذین إن مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر

جنہیں ہم زمین میں اقتدار عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روک سکیں گے۔

سورۃ الحدید میں ریاست کے فرائض اس انداز میں ادا کئے گئے ہیں۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنٰت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید ومنافع للناس۔

ہم نے اپنے رسول روشن دلائل کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے فولاد اتارا جس میں قوت اور لوگوں کے لئے منافع ہیں۔

یہاں پر لوہے سے مراد سیاسی قوت ہے یعنی لوگ اگر بغاوت و نافرمانی اختیار کریں تو بزور قوت دبا دیا جائے امام ابن تیمیہؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

بالقسط فی حقوق اللہ و حقوق خلقہ، وانزلنا الحدید ..... فمن عدل عن الکتاب قوّم بالحدید۔

جو کتاب سے روگردانی کرے تو آہنی ہاتھ سے درست کر دیا جائے۔ ان آیات سے یہ بات

واضح ہے کہ اسلام میں ریاست کے قیام کا مقصد صرف اور صرف حقوق اللہ اور حقوق العباد کی حفاظت ہے، اللہ تعالیٰ نے انہی کا شعور بخشنے کے لئے قرآن پاک کو اتارا اور نظام عدل کو نافذ کرنے کا حکم دیا تاکہ لوگ حق اور انصاف کا ساتھ دیں اور اس پر کاربند ہوں۔

اصول اور ہدایات اتارنے کے بعد ان کے نفاذ کی ضرورت تھی، اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وان اللہ لیزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن" (یہ حدیث ابن قیمؒ نے اپنی کتاب الطرق الحکمیہ فی السیاستہ الشرعیۃ میں بیان کی ہے)۔ یعنی اللہ تعالیٰ حکومت و اقتدار کے ذریعے ان چیزوں کا سد باب کرتا ہے کہ جن کا سد باب قرآن سے نہیں کرتا" یعنی جو برائیاں قرآن کی نصیحت اور فہمائش سے دُور نہ کی جا سکیں ان کو ختم کرنے کے لئے حکومت کی طاقت درکار ہوتی ہے،

اسلامی ریاست کے قیام کے مقاصد پر امت کا اجماع ہے۔ تمام ائمہ کرام نے اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد اعلاء کلمتہ اللہ، خدا کی حاکمیت کا اقرار، اس کی اطاعت و فرمانبرداری، مسجد اور معاشرے سے لے کر اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ایوانوں تک ضروری قرار دی ہے، اسی لئے حکومت کا فرض ہے کہ ریاست میں خدا کی مرضی کے احکامات کو نافذ کرنے کا فریضہ ادا کرے۔

امام ابن تیمیہؒ اپنی کتاب منہاج السنۃ (جس کی تلخیص امام ذہبی نے "المنتقیٰ" کے نام سے کی ہے) میں رقمطراز ہیں۔

" فاصلاح الدین والدنیا وقیام الناس بالقسط فی حقوق اللہ والعباد واعلاء کلمتہ اللہ، وھی تعالیم کتابہ والامر بالمعروف والنھی عن المنکر، تلک ھی غایات الدولۃ ومقاصد الولایۃ فی الاسلام"

دین و دنیا کی اصلاح، حقوق اللہ اور حقوق العباد میں لوگوں کو انصاف اور عدل پر قائم رکھنا، اعلاء کلمتہ اللہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، یہ کتاب اللہ کا منشا ہے اور یہی اسلامی ریاست و حکومت کے قیام کے مقاصد ہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں :۔

"اوّل لما کان الامام منصوباً لنوعین من مصالح الدین بھما انتظام الملۃ والمدن وانما بعث نبی صلی اللہ علیہ وسلم لأجلھما والامام نائبہ" (جلد دوم - ۴۲۸)

شاہ ولی اللہ کے نزدیک امامت کا قیام دو مقاصد کے لئے ہے اوّل دینی مصلحتوں کے لئے اور دوم ملت و تمدن کی تنظیم کے لئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی غرض کے لئے مبعوث کئے گئے تھے اور امام آپ کی نیابت کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔"

دینی مصلحت، صرف خدا تعالیٰ کی حاکمیت کو منوانے میں ہے! اور انتظام و تنظیم ملت و عدل اس کے احکام کو نافذ کرنے کے لئے ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے بگڑے ہوئے غیر مہذب، غیر متمدن، معاشرے کو تنظیم و ترتیب کی لڑی میں پرو دیا، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پہلے خطاب خلافت میں واضح طور پر فرمایا کہ وہ سربراہ حکومت کے فرائض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے ادا کریں گے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی "اسلامی ریاست" میں رقمطراز ہیں۔ "اسلامی ریاست کے قیام کا اصل مقصد، اس اصلاحی پروگرام کو مملکت کے تمام ذرائع سے عمل میں لانا ہے جو اسلام نے انسانیت کی بہتری کے لئے پیش کیا ہے۔ محض امن کا قیام، محض قومی سرحدوں کی حفاظت، محض عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنا، اس کا آخری اور انتہائی مقصود نہیں، اس کی امتیازی خصوصیت جو اسے غیر مسلم ریاستوں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ ہے کہ وہ ان بھلائیوں کو فروغ دینے کی کوشش کرے جن سے اسلام انسانیت کو آراستہ کرنا چاہتا ہے۔ اور ان برائیوں کو مٹانے اور دبانے میں ساری طاقت خرچ کر دے جن سے اسلام انسانیت کو پاک کرنا چاہتا ہے۔" (ص ۲۱۲)

پس ثابت ہوا کہ اسلام میں ریاست کے قیام کا مقصد اللہ کی حاکمیت کا اقرار، اس کے احکامات کی بالاتری اور ان کا نفاذ ہے۔ تاکہ اس دنیا سے ظلم و جور ختم ہو، طاغوت کی سرکوبی ہو اور عدل و انصاف کا بول بالا ہو، اس کے لئے ریاست کا قیام ضروری ہے۔ جس کے انتظام و انصرام کے لئے انتظامیہ مقرر کی جائے گی۔ فن سیاست کے ماہرین نے حاکمیت کو جن تین شعبوں

میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی حقیقی حاکمیت، قانونی حاکمیت اور سیاسی حاکمیت۔ ان تینوں شعبوں میں خدا اور صرف خدا کے قانون کی پابندی ضروری ہے۔ حقیقی اور قانونی حاکمیت اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھی ہے اور سیاسی حاکمیت کو مسلمانوں کے سپرد کیا گیا ہے۔ تاکہ دنیاوی نظم وضبط کے لئے انسانی کارندے احکام الہٰی کی رہنمائی میں کام کر سکیں۔ قرآن پاک نے ان تینوں حاکمیتوں کے بارے میں کیا نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔ اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

حقیقی حاکمیت :۔ قرآن پاک نے حاکیت کے لئے اِلہٰ، ملک، سلطان، حکم، اور امر کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

"اِلہٰ" اِلہٰ اور رب کے مفہوم میں عبودیت، بندگی، غلامی، اطاعت گذاری اور تابع فرمانی کے لئے ایسی ہستی اور ذات کا اقرار شامل ہے جس کے لئے عبادت وعبودیت اور غلامی وبندگی بجالائی جاتی ہے، یہی قانون ساز، مالک ومختار ہستی ہے۔ بزعم خود قانون ساز اور مالک مختار ہونے کے ناطے ہی فرعون نے "انا ربکم الاعلیٰ" (میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں) اور ما علمت لکم من اِلہٰ غیری" (میں نہیں جانتا کہ میرے علاوہ بھی تمہارا کوئی اِلہٰ ہے) کے الفاظ کہے تھے، کیونکہ ایک حکمران ہی قانون کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ اور جس وقت اسے کسی اور ہستی کا اقرار کرنے کو کہا گیا جو کہ اس کے لئے قانون کی بنیادیں فراہم کرنے والی تھی تو وہ بگڑ گیا۔ قرآن کے یہ الفاظ اپنے وسیع تر مفہوم میں کائنات کے انتظام وانصرام اور اس کے خلق کی ذمہ دار ہستی کا اظہار کرتے ہیں جو قانون سازی پر قادر ومطلق ہے۔

"ملک" عربی زبان میں بادشاہی، اقتدار، اور حاکمیت اعلیٰ کے لئے ملک کا استعمال کیا گیا ہے، اسی لئے فرمایا گیا۔

۱۔ تبارک الّذی بیدہ الملک وھو علیٰ کلّ شئی قدیر (الملک - ۱)

پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور جو ہر چیز پہ قادر ہے۔

۲۔ الم تعلم انّ اللہ لہٗ ملک السمٰوات والارض (البقرہ - ۱۰۷)

کیا تم نہیں جانتے کہ زمین و آسمان کی بادشاہی صرف خدا کے لئے ہے۔

۳۔ لہٗ ملک السمٰوات والارض و إلی اللہ ترجع الامور (الحدید۔ ۵)

وہی زمین و آسمان کا مالک ہے اور تمام معاملات اس کی طرف لوٹتے ہیں۔

۴ بیدہ ملکوت کل شیٔ والیہ ترجعون (یٰس۔ ۸۳)

اس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اس کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔

۵۔ قل فمن یملک لکم من اللہ شیأً ان اراد بکم ضرًا او اراد بکم نفعاً (الفتح۔ ۱۱)

کہو اگر اللہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو کون ہے جو اس سے تمہیں بچا سکے، یا اگر وہ تمہیں نفع پہنچانا چاہے (تو اسے کون روک سکتا ہے)۔

۶۔ قل اللھم مالک الملک، تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء، وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علیٰ کل شیٔ قدیر۔

کہو، خدایا، ملک کے مالک، تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کردے ساری بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

قانونی حاکمیت: ۔ قرآن پاک میں حکم، امر، سلطان، یہ ایسے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ قانونی اختیار اوامر و نواہی کی حدود متعین کرنے کا اختیار، انتظام و انصرام کا اختیار صرف اور صرف خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے۔

۱۔ ان الحکم الا للہ (الانعام۔ ۵۷)

اللہ کے سوا کسی کو فیصلے کا اختیار نہیں۔

۲۔ مالھم من دونہ من ولی ولا یشرک فی حکمہ احداً (الکہف۔ ۲۶)

بندوں کے لئے اس کے سوا کوئی ولی اور سرپرست نہیں، اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

۳۔ للہ الامر من قبل و من بعد (الروم - ۴)

اللہ ہی کے ہاتھ میں اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔

۴۔ یدبّر الامر من السماء إلی الارض (السجدہ - ۵)

آسمان سے زمین تک دنیا کا انتظام وہی کرتا ہے۔

۵۔ یقولون ھل لنا من الامر من شیٔ، قل إن الامر کلہ للہ۔

وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اختیار میں بھی کچھ ہے؟ کہو سارا کا سارا اختیار اللہ ہی کا ہے۔

۶۔ ابصر بہ واسمع مالھم من دونہ من ولیّ ولا یشرک فی حکمہ احداً

کمال درجے کا دیکھنے اور سننے والا ہے۔ اس کے سوا بندوں کا کوئی ولی اور سرپرست نہیں۔
وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

۷۔ ان اللہ یحکم ما یرید (المائدہ - ۱)

بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے۔

۸۔ واللہ یحکم لا معقّب لحکمہ۔

اللہ فیصلہ کرتا ہے اور کوئی اس کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے۔

انسانوں کی اس بستی کے لئے ایسی ہستی ہی حقیقی و قانونی حاکمیت کے کام سرانجام دے سکتی ہے۔ جو علیم و خبیر ہو، خالق و رازق ہو، مالک و حاکم ہو، حکیم و مختار ہو۔ تاکہ اپنی مخلوقات کی جبلتوں اور صلاحیتوں کے مکمل علم کے بعد ان کے لئے ضابطہ اور قانون بنا سکے۔ ایسی ہستی کا قانون حقیقی اور اٹل ہوگا کیونکہ اسے ابدی حقیقتوں کا علم ہے۔ اور خالق ہونے کے سبب وہ اپنی مخلوقات کی پیدائش میں مضمر حکمتوں سے آگاہ ہے، اور یہ وہی ذات ہو سکتی ہے جو ہر چیز پر قادر ہو۔

انسانی فکر نے حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کو خدائی اختیارات دے دیئے۔ یہی اختیارات انسانوں کے ہاتھوں میں آئے تو دنیا شر اور فساد کی آماجگاہ بن گئی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب

یہ اختیار صرف اور صرف خدا تعالیٰ کا حق تسلیم کیا جائے تاکہ خود غرضی اور نفسانی خواہشات سے
پاک انسانی مساوات کا علمبردار معاشرہ تعمیر کیا جائے جہاں انسان انسان کا خدا بننے کا دعویدار نہ ہو،
اور اس پوری کائنات سے ہم آہنگ ہو کر اسی بارگاہ میں سر نیاز جھکا دیا جائے تاکہ کائنات
کی ابدی حقیقتوں میں خلل واقع نہ ہو، اور یہ کرہ ارض اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتوں سے بہرہ ور ہو سکے۔

گذارش

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، جو کہ ایک عرصہ سے اسلامی تحقیق کے سلسلہ میں
پیرس (فرانس) میں مقیم ہیں، حدیث قدسی سے متعلق مطبوعہ کتابوں اور مقالات
کے (بزبان انگریزی، جرمن۔ اُردو وغیرہ) متلاشی ہیں۔ قارئین میں سے کسی کو اس ضمن
میں کچھ معلومات ہوں تو از راہ کرم پروفیسر موصوف کو پتہ ذیل پر براہ راست مطلع
کریں یا مدیر فکر و نظر سے رابطہ قائم کریں۔

DR MUHAMMAD HAMEEDULLAH 4 RUE DE
TOURNON 75006 PARIS, FRANCE

الجزائر میں شادی اور طلاق کے قوانین

یلل ردسی اے
ترجمہ کرنل محمد نواز

گذشتہ سال اسی مجلہ" میں ایک مقالہ سپرد قلم کیا گیا تھا۔ جس کا مقصد شمالی افریقہ میں شرع کے اطلاق کے متعلق مروجہ صورت حال پر روشنی ڈالنا تھا۔ اس مقالہ میں وہ قوانین وضوابط خاص طور پر پیش نظر تھے جو حال میں تیونس، مراکش اور الجزائر میں نافذ کئے گئے ہیں۔ شخصی قوانین کے عنوان کے تحت ہم نے ۴ فروری ۱۹۵۹ء کے اس قانون کا بھی ذکر کیا تھا جس کا تعلق ایسی شادیوں سے تھا جو الجزائر کے اضلاع "نخلستان" اور "ساعورہ" میں عمل میں آئی تھیں۔ اس میں ان نہایت اہم انتظامات کا بھی ذکر کیا گیا تھا جو اس قانون کے تحت رشتۂ ازدواج کو کالعدم کرنے کے سلسلہ میں فراہم کئے گئے ہیں۔

ہمارا یہ مقالہ ابھی زیر طبع ہی تھا کہ ان قواعد پر مشتمل ایک حکم جاری ہوا جن کا تعلق قانون متعلقہ کے اطلاق سے تھا۔ یہ قواعد جو ۱۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کو جاری کئے گئے اپنے اندر خاصی وسعت رکھتے ہیں۔ ان میں بالخصوص ان امور کی تصریح کردی گئی ہے جن کا تعلق طلاق سے ہے۔ علاوہ ازیں اس میں نئے قاعدوں کے اطلاق کی تاریخ بھی متعین کی گئی ہے۔ (یعنی طلاق کی صورت میں حکم نامہ کی تاریخ اشاعت سے لے کر پندرہ دن، اور شادی کے لئے دو ماہ)۔

ان نئے انتظامات پر نومبر ۱۹۵۹ء کے آخری عشرہ سے عملدرآمد ہو رہا ہے۔ ایک وزارتی حکم بھی جاری کیا جا چکا ہے جس میں ان تمام دستاویزات کی تصریح کردی گئی ہے جو اس سرکاری افسر کے سامنے پیش کرنی ہوں گی جو شادی کے معاہدہ کو ضبط تحریر میں لائے گا۔

ہم اپنے تأثرات کو دو فصلوں میں تقسیم کریں گے۔ پہلی فصل کا تعلق شادی سے ہوگا اور دوسری

فصل طلاق پر مشتمل ہوگی۔

فصل اول : شادی کی تشکیل اور اس کا ثبوت

یہ عنوان جس کے تحت ہم نے اس فصل کو رکھا ہے اپنا جواز آپ ہے۔ مقننوں نے شادی کی ان بنیادی شرائط کو بالکل نہیں چھوا جن کی تصریح مقامی قوانین یعنی مسلمانوں کے حقوق اور قبائلی رسم و رواج کے مطابق ہوتی ہے۔ تاہم چند ایسے قاعدے مرتب کئے گئے ہیں جو کسی حد تک بنیادی امور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً شادی میں فریقین کی رضامندی کی شرط۔ ظاہر ہے کہ یہ شرط بیٹی پر باپ کی مرضی ٹھونسنے کو روکتی ہے۔ اسی طرح شادی کے وقت خاوند کے لئے ۱۸ سال کی عمر اور بیوی کے لئے ۱۵ کی عمر مقرر کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نابالغوں کی شادی کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

جیسا کہ بیشتر اسلامی ممالک نے اپنے ہاں انتظام کر رکھا ہے فرانسیسی مقننین نے بھی ۱۹۵۹ء میں یہ فیصلہ کیا کہ عقد نکاح کو ضبط تحریر میں لانا لازمی قرار دیا جائے اور تیونس میں مروج قانون کے مطابق فریقین کو اس امر کی اجازت دی جائے کہ اس غرض کے لئے خواہ وہ رجسٹرار سے رجوع کریں (الجیریا میں رجسٹرار کے فرائض قاضی انجام دیتا ہے۔ اور اس وجہ سے وہاں عدول کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے۔ البتہ تیونس اور مراکش میں عدول ہی رجسٹرار بنا دیئے گئے ہیں) یا براہ راست شہری حکومت سے رابطہ قائم کریں جس نے یہ انتظامات بلدیات کو سونپ رکھے ہیں۔

۱۔ مقامی افسر مجاز

مقامی افسر مجاز اس مقام کا قاضی یا شہری حکومت کا افسر ہوگا جس کا کم سے کم ایک فریق باشندہ ہو یا ایک ماہ سے وہاں باقاعدہ رہائش پذیر ہو۔ رہائش کا ثبوت بڑا سہل ہے۔ کوئی اور ثبوت نہ ہونے کی صورت میں صرف حلفیہ بیان کافی سمجھا گیا ہے۔

۲۔ شادی کے لئے دستاویزوں کی فراہمی

شادی کے لئے دستاویزوں کی فہرست وزارتی حکم مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۵۹ء میں معین کی گئی ہے۔ یہ دستاویزیں مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہوں گی ؛۔

فریقین کی شہری حیثیت کی تعیین، شہریت یا رہائش کا ثبوت، نیز یہ ثبوت کہ عورت کسی پہلے رشتہ زدواج میں منسلک نہیں ہے۔

۲. شادی کے معاہدہ میں کن امور کا ذکر ضروری ہے۔

شادی کے معاہدہ میں فریقین کی رضا مندی کے حصول کا ذکر انتہائی ضروری ہے۔ رضامندی کا اظہار واضح اور معین طور پر افسر متعلقہ (شہری حکومت کے افسر یا قاضی) کے روبرو کرنا ہوگا۔ اس میں یہ بھی مذکور ہونا چاہیئے کہ یہ رضامندی قانون کے تحت مقرر کردہ شرائط کے مطابق حاصل کی گئی ہے یعنی یہ کہ یہ رضامندی افسر متعلقہ سے بہ اقرار لسان، برسرعام، دو گواہوں کی موجودگی میں حاصل کی گئی ہے، اور یہ کہ وہ کسی طرح بھی مشروط نہیں ہے، اور بالکل واضح اور معین طور پر کسی قسم کے ابہام کے بغیر حاصل کی گئی ہے۔ اس میں کسی قسم کی غلطی یا کسی دباؤ کے شائبہ کو رضامندی کے منافی سمجھا جائیگا علاوہ ازیں شادی کے معاہدہ میں فریقین کے نام، تاریخ پیدائش، جائے پیدائش، نیز والدین اور گواہوں کے اسی قسم کے کوائف درج ہوں گے۔ نیز سرپرست کی اجازت اور عمر کا سرٹیفکیٹ بھی شامل ہوگا۔ البتہ صداق (مہر) کا اس میں ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ لیکن تیونس کے قانون مجریہ یکم اگست ۱۹۵۱ء (دفعہ ۳۲) اور مراکش کے شخصی قانون کے ضابطہ (دفعہ ۴۳۵) میں اس کے برعکس فیصلہ کیا گیا ہے۔

۳. شہری حکومت کے فرائض

الجیریا میں شہری حکومت سے متعلق جو قوانین رائج ہیں (قانون مورخہ ۲۳ مارچ ۱۸۸۲ء، ۲ اپریل ۱۹۳۰ء اور قانون ۵۷ - ۷۷۷، مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۵۷ء) ان کی رو سے شادی کا درج رجسٹر کرنا ضروری ہے۔ مگر ان قوانین کا تعلق صرف ایسے معاہدوں سے تھا جو قاضی کے توسط سے یا اس کے بغیر درج رجسٹر ہونے سے قبل طے پائے تھے۔ آئندہ کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ باہمی رضامندی کا اقرار شہری حکومت کے افسر یا قاضی کے روبرو کیا جائے۔ اول الذکر صورت میں شادی کا عمل بلدیہ میں تکمیل پذیر ہوگا اور موخر الذکر صورت میں "محکمہ" میں۔ بعد میں ایسے معاہدہ کو بھی جو قاضی کے سامنے عمل ہوا ہو شہری حکومت کے رجسٹروں میں منتقل کر دیا جاتا ہے لیکن یہ پابندی ان شادیوں پر عائد

نہیں ہوتی جو گزشتہ مروج طریق سے قبل عمل میں آئیں۔

مقننین کے پیش نظر جو مقصد تھا وہ ظاہر ہے۔ یہ پابندی عائد کرنے سے کہ معاہدہ تحریری ہو اور سرکاری افسر کے سامنے کیا گیا ہو ان کی غرض یہ تھی کہ ایک طرف شادی ایسے اہم معاملہ کو نجی سطح سے بلند کر کے ضابطہ میں لایا جائے (گو پہلے کی طرح یہ نجی دائرہ کسی ایک گروہ کی صوابدید یا منشا تک محدود نہیں تھا) تو دوسری طرف شادی کے ثبوت کو نہ صرف سہل بلکہ ناقابل تردید بنایا جائے۔ یہ نئی پابندیاں کسی اعتبار سے بھی مسلمانوں کی روایات سے روگشتی کے مترادف نہیں ہیں۔ اس امر کا ابلتہی ثبوت یہ ہے کہ جو مسلمان قاضی کے روبرو پیش ہونے کو ترجیح دیں گے انہیں ایسا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ لیکن جو لوگ شہری حکام کی خدمات سے فائدہ اٹھانا پسند کریں گے انہیں بھی اس بات سے روکا نہیں جا سکے گا۔ ایسی صورت میں وہ یہ مطالبہ ضرور کر سکتے ہیں کہ بلدیہ کا حاکم متعلقہ مسلمان ہونا چاہیئے۔ طریق انتخاب کی حالیہ اصلاحات کے بعد اس مطالبہ کا پورا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ جو شہری حکام یا قاضی ان متفرق پابندیوں کا جو قانون نے عائد کی ہیں لحاظ نہیں رکھیں گے وہ قابل مواخذہ سمجھے جائیں گے۔

۵۔ شادی کا ثبوت

مسلمانوں کے روایتی قانون میں شادی کے ثبوت کے لئے کوئی خاص طریق کار مقرر نہیں کیا گیا۔ تاہم اس کا تقاضا یہ ہے کہ شادی اعلان کے ذریعہ سے ہو اور اس کے لئے دو بالغ مرد بقائمی ہوش وحواس گواہی دیں۔ ایک سیدھے سادے، غیر پیچیدہ سماجی نظام میں اس قسم کے طریق کار کو ناکافی قرار نہیں دیا جائے گا۔ مصر میں ایک لمبے عرصہ سے "قانونی سرٹیفکیٹ" کی پابندی عاید ہے۔ طولنسی ضابطہ قانون کی رو سے بھی ضروری ہے کہ شادی کا اعلان سرکاری سند (حجۃ رسمیہ) کے ذریعہ ہو۔ قانون مجریہ یکم اگست ۱۹۵۷ء میں اسی بات کی معین طور پر تصریح کر دی گئی ہے (دفعہ ۲۱)۔ مراکش کے ضابطہ قانون کی رو سے شادی کا معاہدہ سرکاری اسٹامپ پر بشمول تصدیق رجسٹرار ہونا چاہیئے۔ اور اس پر دو "عدول" کے دستخط ثبت ہونے چاہئیں۔ (دفعہ ۵)

۱۱ جولائی ۱۹۵۰ء کے قانون کا منشا یہ ہے کہ جن مقدمات میں ثبوت کی ضرورت شخصی قانون کے

تفویض کردہ حقوق کی بحالی کے لئے ہو، نیز ایسے نزاعات میں جو بلا اطلاق دیگر قوانین مقامی قانون کے تحت آتے ہوں، پیش آئی ہو، انہیں ان مقدمات سے تمیز کیا جائے، جن میں ایک فریق پر مروجہ قانون کا اطلاق ہوتا ہو، اور جن میں متنازعہ فیہ امر اس مطالبہ پر مبنی ہو کہ اس کے لئے غیر ملکی قانون کو مقامی قانون پر ترجیح دی جائے۔ اول الذکر مقدمات میں ثبوت پر کوئی پابندی عاید نہیں ہے۔ لیکن موخر الذکر صورتوں میں یہ ضروری ہے کہ ثبوت سول قانون کے تحت دیا جائے۔ مقدمات کے جلد تصفیہ کے لئے اس امر کی اجازت دی گئی ہے کہ جن معاہدات میں شادی کی تاریخیں درج ہونے سے رہ گئی ہوں ان کا عدالتی کارروائی کے ذریعہ اندراج کروالیا جائے۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کے حکم کی رو سے یہ ضروری ہے کہ ہر مقدمہ میں ثبوت کی فراہمی سول قانون کے تحت ہو۔ (دفعہ ۹) مستثنیات ایسی صورتوں میں رکھی گئی ہیں جن میں رجسٹر گم یا ضائع ہو جائے یا اس میں سے اقتباسات حاصل کرنا مشکل ہو (دفعہ ۱۰)

فصل دوم۔ تعلق ازدواج کا انقطاع

فرانسیسی مقننین کا موقف اس بارے میں بالکل واضح ہے۔ وفات کی صورتوں کے علاوہ نکاح صرف عدالت کے فیصلہ سے ہی فسخ ہو سکتا ہے۔ (حکم مجریہ ۴ فروری ۱۹۵۹ء دفعہ ۶) ۱۷ ستمبر کے حکم میں جو تصریحات کی گئی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ طلاق کا فیصلہ ہوگا۔

اس حکم کی دفعہ ۱۱ کی رو سے چار صورتوں میں طلاق کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ اول۔ اس صورت میں کہ زوجین میں سے کسی ایک کو دوسرے کے خلاف مندرجہ ذیل میں سے کوئی ایک شکایت ہو۔ زنا۔ ایسی سزا جو موت، سلب آزادی یا شہری حقوق کے اتلاف پر مشتمل ہو۔ یا بے اعتدالی بدسلوکی، ضرب شدید۔

دوم۔ باہم رضامندی سے۔

سوم : اس صورت میں کہ خاوند بیوی کو بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہو۔ اور یہ علم نہ ہو کہ وہ کہاں ہے۔ نیز اگر یہ علم بھی ہو کہ وہ کہاں ہے تو اس دن سے لے کر جبکہ اس کے متعلق کسی خبر کا ملنا بند ہو گیا ہو، چار سال کا عرصہ گذر جائے۔

چہارم۔ اگر خاوند نے شادی کے انقطاع کی خواہش ظاہر کی ہو۔ یعنی بالفاظ دیگر طلاق کا اعلان

کیا ہو۔ اگر مذکورہ بالا صورتوں میں تیسری صورت کو نظر انداز کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تصریحات تیونس کے ضابطہ قانون کی دفعہ ۳۱ سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ چند باتیں مختلف بھی ہیں۔ جن میں سے اہم بات یہ ہے کہ ضابطہ مذکورہ میں مرد کی طرح عورت کو بھی طلاق (خلع) کا مطالبہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ان شکایات کا ثبوت پیش کرے جو خاوند سے متعلق شہری فرائض کی عدم ادائیگی کے بارے میں کی گئی ہوں۔ اگر اقدام عورت کی طرف سے ہو تو اسے معاوضہ (التعویض العزاری) ادا کرنا ہوگا۔ اگر اقدام مرد کی جانب سے ہو تو اس کے ذمہ تمتع کی ادائیگی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ فرانسیسی ضابطہ قانون میں پہل کرنے کی اجازت صرف خاوند کو دی گئی ہے۔

خواہ کچھ بھی ہو معلوم ہوتا ہے مقننین کا منشا صاف طور پر یہ تھا کہ تمام امور کو جن میں طلاق بھی شامل ہے عدالتی فیصلہ کا پابند بنایا جائے۔ اور اس کے ساتھ اس بات کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ شرع کے مبادیات پر کوئی زد نہ پڑے۔ عدالت کی مداخلت نہ صرف اس وجہ سے ضروری ہے کہ اسے زوجین کے باہمی تصفیہ (طلاق۔ خلع) یا ضابطہ طلاق کی صحت و عدم صحت کو جانچنا ہے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ ازدواجی تعلق کے "انقطاع" سے بعض ایسے نتائج ظاہر ہوتے ہیں جن سے نہ صرف زوجین کو بلکہ بچوں کو بھی گہری دلچسپی ہوتی ہے۔ (حرجانہ مثلاً حضانہ، نفقہ وغیرہ)

جہاں تک عدالتی کارروائی کا تعلق ہے اس میں تصفیہ کا طریق کار (سوائے اس صورت کے کہ خاوند نے اپنے متعلق خبر دینا بند کر دیا ہو۔ یا یہ بات غیر ضروری سمجھی گئی کہ اس کا پتہ لگایا جائے) اور یہ امر کہ زوجین کا اصالتاً حاضر ہونا ضروری ہے، شامل ہیں۔ عدالتی کارروائی کی رفتار خاصی تیز ہے۔ یعنی تصفیہ کے لئے ایک ماہ کی میعاد مقرر کی گئی ہے، اور فیصلہ کے لئے تصفیہ کی کوشش کی ناکامی سے لے کر تین ماہ۔ بحث سننے کی عوام کو اجازت نہیں دی گئی۔ البتہ فیصلہ کھلی عدالت میں کیا جاتا ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ عدالت مجاز مقام متعلقہ کے قاضی پر مشتمل ہوتی ہے۔ سوائے اس کے کہ پیشی کے جج کو خاص طور پر یہ اختیار دے دیا گیا ہو۔ قبائلی علاقے اس شرط سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ وہاں صرف ایک ہی یعنی پیشی کا جج ہی ہوتا ہے۔ اگر عدالت طلاق کا فیصلہ کر دے تو اس میں بچوں کی تحویل کی "بحق فلاں" تصریح

کر دی جاتی ہے ۔ اور ان کے لئے گزارہ کی رقم مقرر کی جاتی ہے ۔ حرجانہ انجام کار اس فریق کو ادا کرنا پڑتا ہے جو مجرم ثابت ہو ۔ عدالت کو یہ بھی اختیار ہے کہ شادی کو فسخ قرار دینے کے باوجود نا دار زوج کے نان و نفقہ کی ذمہ داری دوسرے فریق پر ڈال دے (دفعہ ۲۱)

۱۷ ستمبر ۱۹۵۷ء کے حکم میں یہ ضروری قرار نہیں دیا گیا ہے کہ طلاق کے فیصلہ کو اخباروں میں شائع کیا جائے یا نوٹس بورڈ پر چسپاں کیا جائے ۔ لیکن عدالت کے رجسٹرار کے لئے ضروری ہے کہ فیصلہ صادر ہونے کی تاریخ سے تین دن کے اندر وہ اسے شہری حاکم تک پہنچا دے ۔ حاکم متعلقہ ولادت اور شادی کے رجسٹروں کے حاشیوں میں اس فیصلہ کا ذکر کرے گا ۔

ان نئے قاعدوں کا اطلاق جس طرح الجیریا کے دوسرے سب علاقوں میں ہوتا ہے اسی طرح صحرا میں ان علاقوں میں جہاں قبائلی رسم و رواج متداول ہیں اور ان خطوں میں بھی ہوتا ہے جہاں قرآنی قانون رائج ہے ۔ یعنی جہاں مالکی فقہ کے مطابق مسلمان اپنی زندگی بسر کرتے ہیں ۔ صرف مقاب کے اصل باشندے اس قانون سے مستثنٰی ہیں ۔

حوالہ جات

۱۔ مجلہ دی ورلڈ آف اسلام لائیڈن ۔

۲ ۔ جہاں کثرت ازدواج کو روکنے کے لئے تیونس نے پہل کی ہے وہاں فرانسیسی مقننین نے عورت پر صرف یہ پابندی عائد کی ہے کہ نئے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے وقت وہ یہ ثابت کرے کہ وہ طلاق کے ذریعہ یا پہلے خاوند کے فوت ہو جانے کی وجہ سے آزاد ہے ۔ حال کی ایک تحقیقات میں جو اعداد و شمار جمع کئے گئے ہیں ان کے مطابق الجیریا میں تقریباً چھ فیصدی گھرانوں میں کثرت ازدواج رائج ہے (ان میں اکثریت ان گھرانوں کی ہے ۔ جہاں دو بیویاں ہیں) اس کے برعکس قبائلی علاقوں میں یہ تناسب مشکل سے ایک فیصدی ہے بخانہ بدوشوں کے علاقوں میں کثرت ازدواج کا رواج زیادہ ہے ۔

محمد اعلیٰ تھانوی اور کشاف الاصطلاحات والفنون

زاہدہ نسرین سلہری

مولانا محمد اعلیٰ بن حامد بن صابر الحنفی العمری التھانوی کے نام میں اختلاف ہے۔ کشاف الاصطلاحات والفنون کے سرورق پر نام "اعلیٰ" لکھا ہے مگر کتاب کے اندر "علی" لکھا ہوا ہے۔ اس طرف ڈاکٹر زبید احمد نے بھی اپنی کتاب "عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ" میں قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔[1] غالب خیال یہی ہے کہ یہ طباعت کی غلطی ہے۔ بروکلمان نے مولینا کا نام اعلیٰ ہی لکھا ہے لیکن کتاب کے نام میں کشاف کی جگہ کشف درج کیا ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد کے مطابق کتب خانہ بانکی پور پٹنہ کی فہرست کے مرتب نے مصنف کا نام علی لکھا ہے۔ لبستانی نے بھی دائرہ معارف میں آپ کا نام علی ہی لکھا ہے۔[2]

"نزہت الخواطر" میں "شیخ فاضل محمد اعلیٰ بن علی بن حامد بن صابر الحنفی العمری التھانوی" پورا نام لکھا ہے[3] جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علی ان کے والد بزرگوار کا نام تھا جن کو مولینا اپنا استاذ بھی بتاتے ہیں اور جن سے نحو و ادب کی کتابیں پڑھیں۔ اعلیٰ ان کا اپنا اصل نام ہے۔

مولینا محمد اعلیٰ تھانوی تھانہ بھون ضلع مظفر گڑھ (انڈیا) کے رہنے والے تھے اور اپنے زمانے کے بڑے فاضل اور جید عالم تھے۔[4] مولینا عالمگیر کے عہد میں تھانہ بھون کے قاضی تھے۔ ان کی انگشتری کا نقش یہ تھا۔

"خادم شرع والا محمد اعلیٰ"

اور وہ تھانہ بھون ہی میں مدفون ہیں۔[5]

"مولینا رجال العلم میں سے تھے۔ انہوں نے نحو اور عربی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور اس میں گہری نظر اور مہارت پیدا کی۔ پھر ذخائر علوم حکمیہ کے حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وہ اساتذہ سے تحصیل

پر انحصار نہ کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے خود بہت سی کتابیں جمع کیں اور ایک مدت ان کتب کے مطالعے میں جو ان کے پاس موجود تھیں صرف کی۔ آپ نے جگہ جگہ سے مصطلحات کو اکٹھا کیا اور ایک جامع تصنیف میں ان کو مرتب کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی قبر کے پاس بیٹھ کر مطالعہ کرنے سے دقیق معانی کا کشف ہوتا ہے۔"(۶)

مولینا تھانوی اپنی کتاب کشاف الاصطلاحات و الفنون کے مقدمہ میں یوں رقمطراز ہیں ۔

"جب میں اپنے استاد اور والد ماجد کی خدمت سے تمام علوم پڑھ کر فارغ ہوا تو میں نے تمام فلسفیانہ علوم اور ریاضی، علم حساب، ہندسہ، اصطرلاب، ہیئت، طبیعات اور الہیات جیسے علوم کے ذخائر کی جانب ان کے حصول کے لئے جدوجہد کی۔ مجھے ان تمام علوم میں اپنے اساتذہ سے کوئی مدد نہ ملی۔ تو پھر میں نے اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ ان کتابوں کے مطالعے میں صرف کرنا شروع کر دیا جو میرے پاس موجود تھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میرے ذہن کو کشادہ فرمایا اور میں نے ایک مصطلحات پر مشتمل کتاب کو دوران مطالعہ اقتباس کی شکل دے دی۔"(۷)

مولینا کی دو تصانیف کا پتہ چل سکا ہے۔

۱۔ کشاف الاصطلاحات والفنون ۔

۲۔ دوسری قابل قدر تصنیف اراضی ہند سے متعلق ہے۔ جس کا مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانے میں ہے۔"(۸)

کشاف الاصطلاحات والفنون ۔

مولینا محمد اعلیٰ تھانوی صاحب کی کتاب کشاف الاصطلاحات والفنون چار ضخیم جلدوں میں ایک قسم کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ یہ کتاب ۱۷۴۵ء/۱۱۵۸ھ میں عربی زبان میں لکھی گئی۔ یہ چاروں جلدیں کلکتہ سے ۱۸۴۸ء میں چھپ گئی ہیں جس کا اہتمام ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے کیا۔(۹)

اس کتاب کو انہوں نے دو فنون میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا فن الفاظ عربیہ پر مشتمل ہے اور دوسرا فن الفاظ عجمیہ پر۔ تھانوی صاحب نے علوم مدونہ کا ذکر علیحدہ ایک مقدمے

یں کیا ہے۔ مدرسۂ عالیہ کے ایک فاضل مدرس وجیہ صاحب نے اس کی تصحیح کی اور اس میں کچھ اضافے بھی کئے۔[10]

شیخ محمد اعلیٰ کی یہ کتاب اگرچہ تمام اصطلاحات کا احاطہ نہیں کرتی تاہم اس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کتاب بلاشبہ علمی مصطلحات کا ایک عظیم دائرہ معارف ہے۔ شیخ صاحب کو جیسا کہ مقدمہ میں انہوں نے ذکر کیا ہے یہ شدید احساس تھا کہ مختلف علوم وفنون کی فنی اصطلاحات کے بارے میں کوئی جامع کتاب موجود نہیں۔ پھر ایک ہی اصطلاح دو یا اس سے زائد فنون میں مستعمل ہے اور ہر جگہ اس کا مفہوم جدا ہے۔ اس لئے انہوں نے ایک ایسی کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا جس میں تمام فنی اصطلاحات کا ہر علم کے اعتبار سے احاطہ کیا جائے تاکہ طالبان علم ودانش جب فارغ التحصیل ہوکر درس وتدریس یا تصنیف وتالیف میں مشغول ہوں تو انہیں شیوخ واساتذہ کی بار بار ضرورت نہ پڑے۔[11]

مولانا شیخ محمد اعلیٰ تھانوی اپنی کتاب کشاف الاصطلاحات والفنون کے مقدمہ میں ذکر کرتے ہیں:
"میں نے ایک مصطلحات پر مشتمل کتاب کو دوران مطالعہ اقتباس کی شکل دے دی اور اس کے بعد میں نے اس کو علیحدہ علیحدہ مختلف ابواب میں ترتیب دے کر حروف تہجی کے ساتھ لکھا تاکہ ہر فن کی اصطلاح کا نکالنا آسان ہو جائے۔ پس اس طرح میں نے ایک جامع کتاب کو ترتیب دے دیا۔ اور جب میں اس کی نظر ثانی سے ۱۱۵۸ھ میں فارغ ہوا تو میں نے اس کا نام کشاف الاصطلاحات والفنون رکھا۔"[12]

اس کتاب کی طباعت ۴ محرم ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۳ جولائی ۱۸۶۱ء کو مکمل ہوئی۔[13]

کشاف اور دیگر کتب مصطلحات کا موازنہ

زیر نظر کتاب اپنی ترتیب کے لحاظ سے اور تصنیفی اسلوب کے اعتبار سے بقیہ کتب مصطلحات اور کشافات سے مختلف ہے۔ دیگر کتب کے ساتھ اس کا موازنہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے اپنے مقدمہ میں جو دعویٰ کیا ہے کہ ان کی کتاب کشاف کے طرز پر لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے پہلی کتاب ہے جو کہ تمام علوم مدونہ وغیر مدونہ، آلیہ وعالیہ، عقلیہ ونقلیہ، حقیقیہ وغیرہ حقیقیہ کی

اصطلاحات پر مشتمل جامع اور حاوی کتاب ہے تو ان کا یہ دعویٰ دیگر کتب مصطلحات کے مطالعے کے بعد صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مولینا کی اس تصنیف سے پہلے ہر علم و فن سے متعلق علیحدہ علیحدہ کشاف اور مصطلحات الفنون کی کتابیں لکھی جاتی رہی تھیں۔ مثلاً طب میں بحر الجواہر یا حدود الامراض اور تصوف میں لطائف اشرفیہ جیسی کتابیں۔ دراصل مولینا تھانوی کی اس تصنیف سے پہلے تمام مصطلحات علم لغت کے ذیل میں آیا کرتی تھیں اور علم لغت کا ایک شعبہ سمجھی جاتی تھیں۔ یا پھر کتب طبقات حکماء و فلاسفہ، کتب تاریخ علوم و فنون، علماء و فلاسفہ کی سوانح اور مختلف علوم و فنون کی تعریفات کے ذیل میں اصطلاحات کا ذکر کیا جاتا تھا۔ جیسے ابن ندیم کی کتاب الفہرست، ابن اصیبعہ کی طبقات الاطباء والحکماء، قفطی کی اخبار الحکماء، ابوالمعشر البلخی کی کتاب الالوف وغیرہ وغیرہ۔ بعد میں بعض اصحاب علم نے متذکرہ مآخذ سے علیحدہ کر کے کچھ ایسی کتابیں تالیف کیں جن میں ہر فن اور ہر علم کی مصطلحات کو علیحدہ علیحدہ کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ مولینا تھانوی صاحب نے سب سے پہلے مصطلحات علوم و فنون کی ایک جامع کتاب کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے تمام علوم کی مصطلحات پر مشتمل ایک جامع کتاب تصنیف کی۔ اس لئے مولینا کی اس کتاب کو تمام کشافات اور انسائیکلو پیڈیک کتابوں میں ایک بڑا مقام اور اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

مولینا کی اس کتاب کشاف الاصطلاحات کے بعد تمام علوم و فنون کی جامع مصطلحات پر مشتمل کتابوں کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مثلاً مفتاح السعادۃ، دستور العلماء، مطلع العلوم فی بحر الفنون وغیرہ وغیرہ۔ ان کتابوں میں تمام علوم و فنون کی جامعیت کا لحاظ رکھا گیا۔ لیکن مفتاح السعادہ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مقابلے میں کشاف کی ترتیب زیادہ اچھی ہے۔ مثلاً کشاف میں اصطلاحات کی تخریج کا اسلوب دو طریقوں پر رکھا گیا ہے۔

۱۔ الالفاظ العربیہ۔ ۲۔ الالفاظ العجمیۃ۔ اس کے علاوہ ایک نہایت مبسوط مقدمہ بھی ہے جو کم و بیش اٹھاون صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ جس میں تدوین علوم، تقسیم علوم، تشریح علوم اور آداب تشریح علوم جیسے ضروری موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے

کہ فاضل مصنف نے مطالعہ اور عرق ریزی کے بعد اپنی کتاب شائقین علم کے لئے مفید سے مفید تر بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس کے برعکس مفتاح السعادۃ کی ترتیب اگرچہ نہایت مبسوط ہے، یعنی تخویج مصطلحات کے لئے ہر فن کے کئی درجے ہیں، ان کے ذیل میں مختلف شعبے اور پھر ان کے ماتحت مختلف فصول، مقدمات اور ذیلی عنوانات ہیں۔ لیکن اس کی افادیت کشاف کے اعتبار سے بدرجہا کم ہے۔ اس لئے کہ اس کتاب میں مصطلحات کے علاوہ جو کم وبیش مواد کے اعتبار سے کشاف جتنا ہی ہے کوئی علمی مقدمہ شامل نہیں کیا گیا۔ کشاف کے طریق پر لکھی گئی کتابوں میں دستور العلماء بھی ایک قابل ذکر کتاب ہے جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے مقابلے میں علمی توازن کے اعتبار سے کمزور ہے۔ کیونکہ اس کی ترتیب جو حروف تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے اس میں لغت کی عام کتابوں کے طرز پر مواد کو جمع کر دیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ : ڈاکٹر زبید احمد مترجم شاہد حسین، ۴۰۵۔

۲۔ ایضاً۔ نزہت الخواطر، ۶ : ۲۷۸۔

۳۔ نزہت الخواطر، ۶ : ۲۷۸۔

۴۔ تذکرہ علمائے ہند، مولوی رحمان علی : ۵۸۸۔ نزہت الخواطر، ۶ : ۲۷۸

۵۔ تاریخ ادبیات عربی جلد دوم مقالہ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، ۳۲۰۔

۶۔ نزہت الخواطر، ۶ : ۲۷۸۔

۷۔ کشاف الاصطلاحات والفنون : محمد اعلیٰ تھانوی، مقدمہ۔

۸۔ تذکرہ علمائے ہند : مولوی رحمان علی ۵۸۸۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰- نزہت الخواطر، ۶ : ۲۶۸ -

۱۱- تاریخ ادبیات عربی جلد دوم : مقالہ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، ۳۳۰ -

۱۲- کشاف الاصطلاحات والفنون : محمد اعلیٰ تھانوی ، ۱ : مقدمہ -

۱۳- کشاف الاصطلاحات والفنون : محمد اعلیٰ تھانوی ، ۴ : صفحہ آخر -

---

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لئے دو نسخے ارسال فرمائیے)

امثال آصف الحکیم

حکمت آموز اور نصیحت آمیز امثال وحکایات پر مشتمل یہ کتاب عربی سیکھنے کے شائقین کے لئے بڑی دلچسپ اور کارآمد کتاب ہے۔ عربی قواعد کی ابتدائی باتیں سیکھنے کے بعد عربی عبارت کو پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت بہم پہنچانے کے لئے یہ کتاب عمدہ مشق کا کام دیتی ہے۔ ۵۶ صفحات کی کتاب میں چھوٹی بڑی کل ۱۳۶ حکایتیں ہیں۔ تمثیل کے پیرائے میں مفید باتیں ہیں۔ ان کے مضامین دلچسپ اور عام فہم ہیں۔ ان کی زبان رواں اور سلیس ہے۔ یہ حکایتیں اصلاً انگریزی میں تھیں مولانا فراہی نے ان کو عربی کا جامہ پہنایا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ ترجمہ مولانا نے اوائل عمر میں اس وقت کیا تھا جبکہ وہ ابھی خود عربی سیکھ رہے تھے[1]۔ یہ کسی اور کی نسبت تعجب کی بات ہو سکتی ہے مگر ایک ایسے شخص کی نسبت تعجب کی بات نہیں ہو سکتی جس نے فارسی کے شعرائے متقدمین کے تتبع میں اس وقت قصیدے لکھے جب وہ ہنوز فارسی زبان کا طالب علم تھا اور عربی سیکھتے ہوئے عربی زبان میں شاعری کی۔

یہ کتاب مولانا کے مسودات میں ان کی وفات کے بعد ملی۔ نہیں معلوم انہوں نے کس ارادے سے اس کا ترجمہ کیا تھا اور اسے طبع کیوں نہیں کرایا۔ یہ کتاب ان کی وفات کے بعد پہلی بار (دریافت طلب) شائع ہوئی۔ اس وقت ہمارے پیش نظر اس کا تیسرا ایڈیشن ہے جو ۱۳۹۲ھ کا چھپا ہوا ہے۔ اس کے پہلے دو ایڈیشن کب شائع ہوئے معلوم نہیں ہو سکا۔ دائرہ حمیدیہ کی مطبوعات میں اس کا سلسلہ نمبر ۴ ہے۔

یہ کتاب مدرستہ الاصلاح اور غالباً بعض دوسرے عربی مدارس میں بھی داخل نصاب ہے۔ مدرستہ الاصلاح میں یہ کتاب عربی کی پہلی جماعت میں اسباق النحو پڑھانے کے بعد پڑھائی جاتی ہے۔ راقم الحروف نے "عالم

۱۔ دیباجۃ الکتاب۔

بے خبری" میں مولانا فراہی کی جو چند کتابیں پڑھیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اس زمانے کے پڑھے ہوئے فقرے اور جملے خال خال اب بھی یاد ہیں۔ "کان اسدٌ . نائماً فدبّت علی وجھہ فارۃ وایقظتہ" یہ کتاب کی پہلی حکایت کا پہلا جملہ ہے۔ ایک اور حکایت کا پہلا جملہ یوں یاد ہے" کانت سلحفاۃ تشمس کسلانۃ"۔ مولانا نے کتاب کے عنوان میں ان حکایات کے اصل مصنف کے نام کا ذکر کرکے اپنی علمی دیانت کا جو ثبوت دیا ہے وہ قابل رشک و تقلید ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں مولانا کا ایمانی شعور اس قدر بالغ تھا اور امانت و دیانت کا احساس اس قدر غالب تھا کہ انہوں نے نہ صرف نام باقی رکھا بلکہ آغاز کتاب میں بھی ضمناً اس کی تصریح کر دی ہے۔ میں نے صغر سنی میں جب یہ کتاب پڑھی تھی تو یہی سمجھ کر پڑھی تھی کہ آصف الحکیم کی کتاب ہے۔ یہ حقیقت مجھ پر اب منکشف ہوئی کہ اس کتاب کا مولانا فراہی سے بھی کوئی تعلق ہے۔

آغاز کتاب میں مولانا نے "خصائص امثال آصف" کے عنوان سے بعض نکات درج فرمائے ہیں۔ انہی میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ حکیم آصف نے جب یہ حکایات بیان کی تھیں تو وہ طرز ادا اور اسلوب بیان اور موقع محل کی رعایت کے محاسن سے آراستہ تھیں۔ لیکن بعد کے راویوں نے ان میں سے اکثر باتیں ضائع کر دیں اور مولانا نے بقدر امکان اپنے اجتہاد سے ان کو دوبارہ شامل کیا۔ اسی طرح حکیم نے ان حکایات میں مخفی حکمت کو الفاظ میں ظاہر نہیں کیا تھا تاکہ لوگ خود اسے نکالیں اور سمجھیں لیکن راویوں نے ذکر کرکے اصل پر اس کا اضافہ کر دیا۔ مولانا نے راویوں کی پیروی نہیں کی اور ترجمے میں ان کو حذف کر دیا۔ یہ دیکھ کر ایک بار پھر حیرت و استعجاب کی کیفیت ابھرتی ہے کہ مولانا کم عمری میں بھی اتنے بالغ النظر، نکتہ سنج، باریک بیں اور دقیقہ رس تھے کہ نہ صرف ان امتیازات کو سمجھ سکے بلکہ ان کی بازیافت کی کامیاب کوشش کی۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا کے پاس اپنے ذوق، بصیرت اور حکیمانہ نظر کے سوا ان حکایات کو پرکھنے کا ذریعہ کیا تھا۔ جیسا کہ مولانا کی تصریحات سے مترشح ہوتا ہے یہ حکایتیں رواۃ کا تختۂ مشق بننے کے بعد اپنی اصل سے بہت کچھ مختلف ہو گئی تھیں۔ کیا اصل حکایات کسی زبان میں محفوظ ہیں؟ ۔

مولانا نے کس حد تک اصلاح و ترمیم کی ؟ اگر انگریزی کتاب جس سے ترجمہ کیا گیا ہے بھی سامنے ہو تو یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہو سکتا ہے۔ مولانا نے امثال و حکایات کی خصوصیات سے متعلق جو فنی نکات بیان کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اوائل عمر میں بھی ان کی طبیعت دراک تھی اور ان میں نقد کا گہرا شعور اور اعلیٰ مذاق پیدا ہو چکا تھا۔ ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ مبتدیوں کی ایک ریڈر میں وہ بھی بشکل ترجمہ ایسی کونسی خاص بات ہو سکتی ہے جو اس طول کلام کی مقتضی ہو۔ جب تک محض کتاب اور اس کی حکایات نظر میں تھیں میں نے بھی چنداں توجہ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن جب اس کی کیفیت پر نظر گئی تو عجائبات کا عالم نظر آیا۔ جس کو دیکھنے کے بعد عقل یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ یہ مولانا کے زمانۂ طالب علمی کا کارنامہ ہے۔ اس کتاب کی ابتدائی سطور میں اس کا ذکر موجود نہ ہوتا تو اسے تسلیم کرنا مشکل تھا۔ نہیں معلوم مرتب یا ناشر کے اس بیان کی بنیاد کیا ہے مسودے میں ایسی کوئی شہادت تھی یا کسی دوسرے ذریعے سے یہ معلوم ہوا۔ بہر حال یہ کتاب اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے معمولی اور غیر اہم سہی مولانا کے علمی سفر کی غالباً پہلی منزل ہونے کے ناطے اسے یوں نظر انداز کرنا شاید درست نہ ہو۔ اس کتاب میں ایک نقاد کو ایسی بہت سی باتیں مل سکتی ہیں جن سے مولانا فراہی کے ذہنی ارتقا کی کڑیاں ملائی جا سکتی ہیں۔ فکر فراہی کے بام بلند کی یہ پہلی سیڑھی ہے۔ المعلم عبدالحمید الفراہی کے امیال و عواطف اگر شروع ہی سے ایسے نہ ہوتے تو ان کا راستہ اور ہوتا۔

(شرف الدین اصلاحی)

ذوالحجہ ۱۴۰۰ھ □ نومبر ۱۹۸۰ء

نگران

ڈاکٹر عبدالواحد ھالے پوتا

ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد

مدیر

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی

فکر و نظر اسلامی حدود کے اندر آزادی اظہار رائے کی حامل ہے۔ فکر و نظر میں کسی مضمون کی اشاعت کا یہ مطلب نہیں کہ ادارہ ان تمام خیالات سے لازماً متفق ہے جو اس میں پیش کیے گئے ہیں۔ مضمون نگار اپنے خیالات کا خود ذمہ دار ہوتا ہے

سالانہ چندہ پندرہ روپئے	ششماہی آٹھ روپئے	فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

طابع و ناشر: **محمد سمیع اللہ** سکریٹری ادارۂ تحقیقات اسلامی۔ اسلام آباد

مطبع: اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پریس۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۵۔ اسلام آباد

سکولوں، کالجوں اور لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

ماہنامہ فکر و نظر اسلام آباد

جلد ــــ ۱۸ | ذوالحجہ ۱۴۰۰ھ ــــ نومبر ۱۹۸۰ | ــــ ۵

فہرست

مجلس ادارت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

عید قرباں

عید قرباں آئی تو یاد آیا کہ مدتوں پہلے روئے زمین پر قربانی کا ایک فقید المثال واقعہ رونما ہوا تھا، جس کی یادگار مسلمانوں کا یہ دن ہے، جس میں مسلمان آج بھی اس رسم کو دھرا کر اپنا ایمان تازہ کرتے ہیں اور اس اقرار کی تجدید کرتے ہیں "قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین" (قرآن) کہ بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت جہانوں کے پروردگار اللہ کے لئے ہے۔ اسی نسبت سے اس تقریب کا نام عید قرباں موزوں قرار پایا کہ اس میں قربانی کا رسمی عمل انجام دے کر تقرب الی اللہ کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اس واقعے کو مسلمانوں کا قومی دن قرار دے کر رب العزت نے جہاں اس قصے کی دو واجب الاحترام شخصیتوں کو اپنے انعام سے نوازا وہاں امت مسلمہ کو بھی، جو مذھباً انہی کی ملت سے ہیں، یہ اعزاز بخشا کہ خلیل اللہ اور ذبیح اللہ کی سنت کے وارث اور امین یہی ہوں گے۔ تاکہ شہادت حق کے مشن کی تکمیل کی راہ میں جب کبھی اور جہاں کہیں ضرورت داعی ہو بے دریغ، جانور کا نہیں، بلکہ جان کا نذرانہ دے کر یہ فریضہ انجام دے سکیں اور اللہ کے لئے تن من دھن کی قربانی پیش کر کے سنت ابراہیمی کی یاد تازہ کرتے رہیں۔ اس لئے کہ سنت ابراہیمی حقیقتاً جانور کی نہیں، جان ہی کی قربانی سے عبارت ہے۔ جانور کی قربانی تو ایک وقتی فدیہ ہوتا ہے۔ اور اس فدیہ کی اپنی حکمت اور مصلحت ہے۔ قربانی کے اُس عظیم یادگار واقعے کے تمام پہلوؤں پر غور کریں تو یہ حکمت و مصلحت بخوبی سمجھ میں آتی ہے۔

عید قرباں خوشی کے اظہار سے زیادہ فرض کی پکار ہے ۔ وہ فرض جو ایمان لانے کے بعد ایک مسلمان پر عائد ہوتا ہے ۔ مسلمان کی جان مال کا سودا اس کے اللہ سے ہوچکا ہے ۔ ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ (قرآن) "بے شک اللہ نے مومنین سے ان کے جان و مال کو خرید لیا ہے اس کے بدلے ان کے لئے جنت ہے" ۔ جو چیز اپنی نہیں پرائی ہو وہ جس دم بھی مانگنے والا مانگے اس کے حوالہ کر دینی ہوتی ہے ۔ ایمانداری کا تقاضا یہی ہے ۔ انسان زود فراموش ہے ۔ مبادا وہ اللہ سے کیا ہوا عہد بھول جائے اللہ نے محض اپنی مہربانی اور کمال رحمت سے یاد دہانی کا سامان کر دیا ہے ۔ یہ جانور کی قربانی جو عید قرباں کی ایک دینی رسم اور عبادت قرار دی گئی ہے اس کا اصل مقصد یہی ہے کہ وہ عہد فراموش نہ ہونے پائے ۔ حق کی راہ میں جان و مال کو قربان کر دینے کا جذبہ پیدا کرنے اور اسے زندہ رکھنے کے لئے ہی امت مسلمہ پر قربانی فرض کی گئی ۔ جان سپاری کے جذبے کو پروان چڑھانے میں رسم قربانی بڑا موثر کردار ادا کرتی ہے بشرطیکہ یہ رسم شعور و آگہی کے ساتھ انجام دی جائے ۔ یہیں سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ قربانی اور جہاد میں گہرا تعلق ہے ، بلکہ جہاد جس میں جان کو ہتھیلی پر رکھ کر نکلنا ہوتا ہے قربانی کی معراج ہے ۔ جان کی قربانی پیش کرنے کا موقع جو شریعت حقۂ اسلامیہ اپنے پیرو کاروں کو فراہم کرتی ہے وہ یہی جہاد ہے جو ایک اہم رکن دین ہے ۔ لیکن آج کیفیت یہ ہے کہ ہم نے اس کی فرضیت کو ساقط کر رکھا ہے ۔ رسم جہاد مسلمانوں میں عرصہ سے موقوف ہے ۔ ہر حال میں پُر امن رہنا اور بقائے باہمی مسلمانوں کا شعار ہو گیا ہے ۔ باطل آگے پیچھے دائیں بائیں سے یورش کر کے آئے پھر بھی ہم اپنی جگہ سے نہ ہلیں ۔ عملاً جہاد متروک تھا ہی رفتہ رفتہ ہم نے فکر و خیال سے بھی اسے خارج کر دیا ہے ۔ ارکان اسلام کا ذکر آتا ہے تو جہاد کا نام تک نہیں لیا جاتا ۔ مسلمان صرف دفاعی جنگ کر سکتے ہیں ۔ حالانکہ حق کے علمبردار اگر آگے قدم بڑھانے کی اہلیت نہیں رکھتے تو وہ دفاعی جنگ بھی نہیں لڑ سکتے ۔ کاش مسلمان اس نکتے کو سمجھتے !

(مدیر)

اُردو زبان میں اسلامی علوم ٭

• ــــــــــــ پروفیسر نذیر احمد

اُردو زبان اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر جس درجہ ممتاز ہے ، اس کی مثال ہندوستان کی کوئی دوسری زبان پیش نہیں کر سکتی۔ اولاً اس زبان کی تشکیل ایک مخصوص نہج پر ہوئی۔ اس کے بنیادی اصول یعنی افعال، ضمائر اور حروف تو خالص ہندی ہیں ، لیکن اسماء اکثر عربی، فارسی، ترکی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے ہیں ۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عربی فارسی کے اسماء اکثر وہی ہیں جو ہندوستانی فارسی میں رائج تھے اور اپنی اصل سے خاصے متغائر ہو چکے تھے اور جو متغائر نہیں ہوئے تھے عرصے سے یہاں رائج ہونے کی وجہ سے وہ بھی ہندوستانی عنصر ہی شمار ہوتے ہیں ۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہندوستان کے کسی مخصوص علاقے سے متعلق ہو کر نہیں رہ گئی ۔ شمال، جنوب، مشرق اور مغرب ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ جو لوگ اس زبان کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ چودھویں صدی کے ربع اوّل میں بعض سیاسی مصالح کی بنا پر شمالی اور جنوبی ہند کے باشندوں کے مل جل کر رہنے کی صورت پیدا ہوئی تو یہ مشترکہ زبان وجود میں آئی اور تقریباً تین صدی تک دکن میں ترقی کے مدارج طے کرتی رہی ۔ اس کے بعد اس کا مرکز شمالی ہند قرار پایا۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو سے زیادہ کوئی دوسری زبان اتنے وسیع علاقے میں بولی یا سمجھی نہیں جاتی ۔

اُردو زبان کی ترویج و ترقی میں مختلف مذاہب اور مختلف علاقوں کے لوگوں کا حصہ

ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ ان میں ہندو، سکھ، عیسائی سبھی شامل ہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ جو لوگ اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لئے ڈاکٹر محمد عزیز صاحب کی محققانہ تصنیف "اردو کی ترویج میں اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کا حصہ" بڑی دلچسپ ثابت ہوگی۔

اردو کے ایک مابہ الامتیاز وصف کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔ اس زبان نے ہندوستان کی ملکی اور قومی ضرورت کو جس خوبی کے ساتھ پورا کیا ہے وہ کسی اور زبان کے حصہ میں نہیں آئی لیکن اس سلسلے کی تفاصیل ہماری موجودہ گفتگو کے دائرے سے باہر ہیں۔ فی الحال اس ملک کی مذہبی ضرورت کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی ضرورت دراصل اس گفتگو کا اصل موضوع ہے لیکن اس سے قطع نظر اس زبان کے ذریعے دوسرے مذاہب کی ضرورتیں جتنی پوری ہوئیں وہ بڑی حیرت انگیز ہے۔ مثلاً اس زبان میں ہندو، بدھ، جین، عیسائی، مجوسی وغیرہ مذاہب پر جتنا وافر لٹریچر موجود ہے وہ قابل توجہ ہے اس موقع پر ڈاکٹر محمد عزیز صاحب کی قابل قدر کتاب کے ساتھ ڈاکٹر عبدالحق کی زیر نگرانی ترتیب دی گئی کتاب "قاموس الکتب اُردو" کا حوالہ ضروری ہے جس کے آخری سو صفحات میں اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب سے متعلق اُردو کتابوں کی فہرست شامل ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :

<u>عیسائیت و یہودیت :</u>

تراجم توریت مقدس : ۱۸۔ تفاسیر : ۷۔ یہودیت : ۶۔ تراجم انجیل : ۱۱۔ تفسیر : ۹۔ عیسویت : ۵۰۔ جغرافیہ بائبل : ۳۔ عبادات : ۵۔ مزامیر : ۳۔ مذہبی نظمیں : ۴ تعلیمات : ۱۹۔ تبلیغ و وعظ : ۱۸۔ مسیحی اخلاق : ۱۳۔ سوانح مسیح : ۱۶۔ حواریین : ۷ میزان ۱۸۹ کتب۔

<u>ہندو، جین اور بدھ مذہب :</u>

تراجم وید مقدس : ۸۔ تعلیمات وید : ۱۷۔ فلسفہ ویدانت : ۱۰۔ پران : ۱۲۔ بھگتی : ۱۵

شاستر: ۴۔ اپنشد: ۹۔ اخلاق: ۱۴۔ ساگر: ۱۴۔ پرکاش: ۷۔ ہندو تصوف: ۷۔ سمرتی: ۸۔ یوگ: ۱۲۔ گیامہاتم: ۹۔ اپدیش: ۸۔ گیتا: ۵۸۔ ہندومت: ۱۲۹۔ دھرم: ۱۹۔ برہم چاریہ: ۲۔ مہابھارت: ۱۸۔ گیان: ۱۴۔ کتھا: ۹۔ رامائن: ۳۶۔ آریہ مت: ۷۲۔ بدھ مت: ۱۵۔ جین مت: ۲۷۔ چرتر: ۱۰۔ کبیر پنتھ۔ سکھ مت: ۲۸۔ برہمو سماج: ۱۲۔ دیوسماج: ۲۔ رادھا سوامی مت: ۴ ———— میزان ۶۲۸ کتب

ظاہر ہے کہ یہ دونوں فہرستیں اس لحاظ سے مکمل نہیں ہیں کہ ان میں وہ کتابیں شامل نہیں جو ایک دوسرے کی تائید اور رد میں لکھی گئی ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح وہ منتشر مقالے اور مضامین بھی اس فہرست سے خارج ہیں جو مختلف رسالوں اور مجلوں میں ہر زمانے میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود یہ فہرستیں کیا بلحاظ کمیت اور کیا باعتبار کیفیت موجودہ ہندوستان میں اردو کے اپنے مقام پہ اگر نوحہ خواں ہوں تو موجب حیرت نہ ہوگی۔

اردو زبان کی منجملہ اور خصائص کے ایک قابل توجہ خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جتنا اسلامی ادب موجود ہے اتنا عربی و فارسی میں بھی مشکل سے مل سکے گا۔ عربی زبان میں چونکہ بنیادی مآخذ ہیں اس لئے اس کو نظرانداز کر سکتے ہیں مگر فارسی کے ادب کا پلہ اُردو کے مقابلے میں یقیناً ہلکا رہے گا۔ گویا اُردو واضح طور پہ اس مقام پہ پہنچ چکی ہے جہاں وہ عربی فارسی کی حلیف قرار دی جا سکتی ہے۔ اگر عربی و فارسی کی تحصیل قدیم اسلامی علوم کے مآخذ تک رسائی کی ضامن ہے اور ترکی سے ان علوم کے ذخائر کی کلید حاصل ہو جاتی ہے جو صدیوں سے ترکی کے کتاب خانوں کی زینت ہیں تو اُردو کی تحصیل علوم اسلامی کے ایسے ایسے موضوعات سے روشناس کرائے گی جو سوائے ہندوستان اور اردو زبان کے اور کہیں نہیں مل سکتے۔ اُردو کے علوم اسلامی کی یہ بڑی اہم خصوصیت ہے۔

علوم اسلامی کے علاوہ عربی و فارسی ادبیات سے متعلق اُردو زبان میں گزشتہ ۴۰۔۵۰ برسوں میں جو کچھ لکھا گیا وہ بھی قابل توجہ ہے۔ فارسی زبان وادب کے بارے میں خصوصاً اتنا لکھا گیا ہے کہ خود ایران میں اتنا کام نہیں ہوا۔ اگر گزشتہ زمانے میں اہل ہند نے فارسی تذکرے، تاریخیں، فرہنگیں اور کتبِ قواعد لکھ کر فارسی کو مضبوط ستون پر قائم کیا تھا تو موجودہ دور میں اردو کے ذریعے ایسا وقیع تحقیقی اور تنقیدی مواد فراہم کر دیا گیا ہے جو اہل ایران کے لئے رہنمائی کا کام دے سکتا ہے۔ کتابوں اور مستقل تصانیف کا کیا ذکر محض "اورینٹل کالج میگزین" میں فارسی زبان و ادب سے متعلق جو مواد پیش کیا گیا ہے وہ موجب صد افتخار ہے۔

لیکن افسوس اس کا ہے کہ یہ کارنامے دنیا کی نظروں سے اوجھل ہیں اس لئے کہ ابھی اُردو بین الاقوامی حیثیت حاصل نہیں کر سکی ہے۔ اس کی وجہ سے یورپی مستشرقین اور عربی و فارسی فضلاء اُردو کے ان ذخیروں سے بے خبر ہیں۔ یہ لاعلمی جو تمام تر نادانستگی کی بنا پر ہے عام تحقیقی و علمی معیار کو پست کرتی ہے۔ ممکن ہے جس موضوع پر یورپ یا کسی اور ملک میں تحقیق ہو رہی ہو اس پر ہندوستان میں پہلے ہی تحقیق ہو چکی ہو۔ اس طرح موجودہ تحقیق تضییع وقت کے مترادف ہوگی۔ تحقیق کا اصول یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں جہاں تک تحقیق ہو چکی ہے، دوسرا محقق کو وہاں سے شروع کرنا چاہئے۔ اگر ہم اُردو کی اس حیثیت کو صحیح طور پہ پیش کر سکیں تو ایک بڑی جماعت کو اردو کی تحصیل پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ یورپی محقق جب علوم اسلامی کے شوق میں عربی فارسی کی تحصیل میں اپنی عمر کا قیمتی حصہ صرف کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اُردو زبان کی تحصیل پہ مائل نہ ہو۔ اس طرح کا اقدام ایک طرف تو علمی معیار کی بلندی کا ضامن ہوگا، دوسری طرف اُردو کی مقبولیت کی صورت پیدا ہوگی۔ یورپ اور دوسرے ممالک میں جہاں علوم اسلامی کے شائقین ہیں، اُردو مقبول ہوگی اور کچھ ہی دنوں میں یہ زبان عربی و فارسی کے دوش بدوش یورپی درس گاہوں میں اپنا مقام پیدا کر لے گی۔

اُردو سے بیرونِ ہند کے لوگ کتنے ناواقف ہیں اس کا اندازہ ایک واقعے سے ہوسکے گا
یہ بات عرض کی جاچکی ہے کہ فارسی ادب و زبان سے متعلق جتنا تحقیقی اور تنقیدی مواد گزشتہ ۴۰۔۵۰
برسوں میں اُردو میں جمع ہوچکا ہے اس کا پلہ شاید فارسی سے بھاری ہوگا۔ اس کے باوجود اسی دور
کے سب سے نامور ایرانی محقق مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے جنکی زندگی کا بیشتر حصہ یورپ
میں فارسی کے مسائل کی تحقیق و تدقیق میں بسر ہوا حسب ذیل بیان میں اُردو زبان کے بارے میں
جس طرح اظہار خیال کیا ہے وہ عبرت خیز نہیں تو مضحکہ انگیز ضرور ہے :

" اگر فساد اور بربادی کے اس یاجوج و ماجوج کے خلاف ایک سد نہ تیار کیا گیا تو
زیادہ عرصہ نہ گزرنے پائے گا کہ سعدی و حافظ کی زبان فارسی ایک ایسی مخلوط زبان سے بدل جائے
گی جو مختلفۃ الحقائق اور غیر متناسب الاجزا سے مرکب ہوگی جیسے کہ ہندوستان کی اُردو اور
الجزائر کی عربی ہے۔"

ظاہر ہے جو شخص اُردو کو مختلف الحقائق اور غیر متناسب الاجزا سے مرکب بتاتا ہے وہ
اس کی حقیقت سے کتنا واقف ہوگا اور اس سے اس زبان میں فارسی کے مواد سے شناسائی
کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کا واضح نتیجہ ان کے علمی کاموں کے معیار کی پستی کے علاوہ کیا ہو
گا۔ اس سلسلے میں بھی دو مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔

ڈاکٹر عبدالعظیم قریب اور دوسرے فضلا رتے ادھر چند سالوں میں بڑے شد و مد سے
یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مثنوی "یوسف زلیخا" فردوسی کی تصنیف نہیں ہے۔ ان
بزرگوں سے بہت پہلے ہمارے ملک کے مایہ ناز محقق پروفیسر محمود شیرانی اس موضوع پر ایسا
محققانہ اور عالمانہ مقالہ لکھ چکے تھے جس کے سامنے ایرانیوں کے استدلال کمزور اور
غیر ضروری ہیں۔ پروفیسر شیرانی ہی نے دیوان انوری میں تاج الدین ریزہ کے کلام کے الحاق
کی طرف سب سے پہلے لوگوں کو آج سے مدتوں پہلے متوجہ کیا۔ انہوں نے جو کچھ لکھا اُردو
میں لکھا۔ ایرانی ادیبوں کو خبر نہیں اور آج دیوان انوری کا جو نسخہ پروفیسر نفیسی جیسے فاضل

کے اعتناء سے شائع ہوا اس میں تاج الدین ریزہ کا خاصا کلام شامل ہے ۔ غرض اُردو سے واقفیت کی بدولت تحقیق کا معیار یقیناً بلند ہوگا ۔

ہندوستان میں اُردو میں جو کچھ مواد اسلامی علوم اور عربی فارسی ادب و زبان سے متعلق موجود ہے اس کی تہ میں آپ کو ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب کے معتبر شواہد ملیں گے ۔ مسلمانوں کے قیام حکومت کے ساتھ ہی ہندوستان اسلامی علوم کا بڑا مرکز بھی ہو گیا ۔ لاہور، ملتان، دہلی، گجرات، لکھنوتی وغیرہ مراکز ایسے تھے جہاں ہندوستان اور بیرون ہند کے علماء فضلاء علوم کی تحقیق و تدقیق میں مصروف ہوئے ۔ یہ روایت صدیوں تک قائم رہی ۔ اسی وجہ سے دہلی جو دارالسلطنت تھا ، اس نے علمی اور تہذیبی ترقی کے اعتبار سے بغداد اور قرطبہ کو بھی دھندلا کر دیا ۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں نئے مراکز قائم ہوتے گئے ۔ مثلاً شمالی ہند میں آگرہ، پٹنہ، لکھنؤ وغیرہ اور جنوبی ہند میں بیدر، گلبرگہ، بیجاپور، احمد نگر، گول کنڈہ اور حیدر آباد وغیرہ ۔ ظاہر ہے علوم اسلامی سے متعلق ان مقامات پر جو کام ہوتا تھا اس کی زبان فارسی تھی ۔

ہندوستان میں گذشتہ چھ سو سال میں تصنیف کا تمام تر کام فارسی میں ہوتا رہا ۔ اسلامی علوم اس سے مستثنیٰ نہ تھے ۔ جب فارسی کا زوال ہونا شروع ہوا اور اس کی جگہ ایک نئی زبان اُردو وجود میں آنے لگی تو علوم اسلامی کی اجارہ داری اسی کے حصے میں آئی ۔ ابتدا میں یہ نوزائیدہ زبان اس قابل نہ تھی کہ اس میں علمی مسائل بیان ہوتے لیکن رفتہ رفتہ یہ اس قابل ہو گئی کہ اس میں ہر طرح کے مسائل اسی صفائی، زور اور جوش کے ساتھ ادا ہونے لگے جس طرح فارسی میں ہوتے تھے ۔ اب ہندوستانی علماء نے اسی زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ قرار دیا ۔ پرانے تہذیبی اور علمی مراکز بھی بدل گئے اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ہندوستانی مسلمانوں نے نئے نئے ادارے قائم کئے جن میں دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، جامعہ ملیہ اسلامیہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان اداروں میں سوائے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سب میں ذریعہ تعلیم اُردو تھا۔ مسلم یونیورسٹی میں بھی علوم اسلامی کی زبان بڑی حد تک اُردو ہی رہی۔ بہرحال اب ہندوستان میں علوم اسلامی کی واحد اجارہ دار اُردو ہے۔ اس نے فارسی کی ساری قدیم روایتیں برقرار رکھی ہیں اور اسی بنا پر ان علوم کے خزائن کی کلید اسی کے پاس ہے۔

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے جس میں مختلف مذاہب، السنہ اور رنگ و نسل کے لوگ آباد ہیں۔ یہاں کی مخصوص ملکی خصوصیت کا اثر مسلمانوں کے طرز فکر پر بہت گہرا پڑا۔ اس فرق کے باوجود یہ بات واضح ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تفکیر اسلام بیرون ہند کے مسلمانوں سے کسی طرح کم تر نہ تھی مسلمانوں کی ذہنی سطح کو بلند رکھنے کے بھی متعدد اسباب موجود تھے۔ منجملہ اور اسباب کے ایک بڑی بات یہ تھی کہ ہندوستان خود ایک بڑی تہذیب اور قدیم علوم کا گہوارہ تھا جس میں علوم عقلی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ مسلمان جب اس سرزمین میں آباد ہوئے تو انہیں ہندوستان کی اس امتیازی خصوصیت کا کچھ نہ کچھ حصہ ملا۔ علاوہ بریں ہندوستان دوسرے اسلامی ممالک سے پہلے یورپ سے آشنا ہوا اور یورپی علوم اور افکار کی شناسائی اس کے فکر و فہم کو بلند اور وسیع تر کرنے میں نہایت درجہ معین ہوئی۔ کون نہیں جانتا کہ ڈاکٹر محمد اقبال جو فکری اعتبار سے تمام عالم میں منفرد تھے یورپی افکار و علوم کے کیسے رمز شناس تھے۔ ان کی تحریروں میں ہندی اور یورپی افکار کا ایسا حسین امتزاج ہے جو شاید اس دور کے کسی اور مفکر میں نہیں مل سکتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے تفہیم اسلامی میں علمائے عرب و ایران سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں بڑا وزن ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے کچھ مخصوص مسائل تھے جو بیرون ہند کے مسلمانوں سے بڑی

حد تک الگ تھے۔ مثلاً اتنی بڑی تعداد کہیں اور نہ تھی۔ ان میں مختلف عقائد اور فرقوں کے لوگ تھے جن میں اختلاف اور اتحاد تھا۔ ان دونوں کے گرد ہندوؤں کی بڑی اکثریت تھی۔ ان کا اپنا مذہب اور اپنی تہذیب تھی۔ چنانچہ اکثر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف اور جھگڑے بھی ہوتے۔ ویسے یہ اختلاف خواہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان ہوں یا ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان، ہر زمانے میں کم و بیش موجود تھے۔ لیکن جب برطانیہ نے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کی تو حکومت کے استحکام کے لئے اس نے اختلاف کو ہوا دی۔ جس کے نتیجے میں ایک طرف تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں اور دوسری طرف مسلمانوں کے اپنے فرقوں کے درمیان شدید قسم کے نزاع اٹھ کھڑے ہوئے۔ شیعہ سنی ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ حنفیت اور وہابیت کا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا، دیوبندی اور بریلوی جھگڑے کی بنیاد پڑی، قادیانی اور غیر قادیانی دست و گریبان ہونے لگے، مسلمانوں اور عیسائیوں کے مناظرے چھڑ گئے، آریہ سماجی اور مسلمان ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ غرض ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان ہر قسم کے مذہبی اختلافات کی آماجگاہ بن گیا۔ یہی اختلافات تقسیم کے بعد کے روح فرسا واقعات کی شکل میں نمودار ہوئے۔

ان مذہبی اختلافات سے متعلق اُردو میں خاصا مواد موجود ہے۔ ظاہر ہے اختلافی مسائل پر لکھنے والوں میں عموماً توازن کم ہوتا ہے وہ فریق ثانی کے جذبات کا بمشکل احترام کرتے ہیں، اور نہ اس کے دلائل کے وزن کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن انہی میں کبھی کبھی کوئی معقول آدمی بھی نکل آتا ہے جس کی تحریر میں سنجیدگی، معقولیت اور وزن ہوتا ہے۔ اس لئے اردو کے ان مختلف فیہ مواد میں وقیع اور قابل توجہ باتیں بھی مل جائیں گی۔ علاوہ بریں اس ضمن میں جو موضوعات زیر بحث آئے ہیں وہ اہم اور فلسفیانہ و عالمانہ ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان موضوعات پر ہندوستان کے علاوہ شاید اور کہیں کچھ نہ مل سکے۔ اگر کچھ دستیاب ہوا تو وہ معیاری اور قابل توجہ نہ ہوگا۔ اردو کے اسلامی علوم کی یہی

خصوصیت اس کو فارسی و عربی ادب سے ممتاز کرتی ہے۔ ذیل میں بعض اختلافی مسائل و موضوعات کا ذکر کیا جاتا ہے:

شیعہ سنی آویزش:-

مسلمانوں کے دو بڑے فرقے سنی اور شیعہ ہیں۔ ہندوستان میں شیعوں کا غلبہ مغلیہ دور سے شروع ہوتا ہے۔ شیعہ باوجود قلت تعداد کے تہذیبی اور سیاسی برتری کی وجہ سے خاصے ممتاز اور اثر انداز رہے ہیں۔ اسی بنا پر ان دونوں فرقوں میں برابر آویزش بھی رہی۔ نواب اودھ نے جب لکھنؤ میں ایک آزاد حکومت قائم کر لی تو اس سے شیعوں کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ لکھنؤ اس کا بڑا مرکز قرار پایا۔ اُردو کا بھی یہ بڑا اہم مرکز تھا۔ چنانچہ شیعوں سنیوں کے اختلافات سے متعلق وافر مواد اردو میں جمع ہو گیا۔ اور اس سلسلے میں جن موضوعات پر کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں خلافت، امامت، نبوت و امامت، عظمت صحابہ، خلفائے چہارگانہ، مقام اہل بیت اطہار، خلافت حضرت علی، حضرت علی وصی اللہ، شہادت حضرت عثمان، اختلاف حضرت علی وحضرت معاویہ، باغ فدک، عثمان ذوالنورین، واقعہ کربلا وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان موضوعات اور دوسرے متعلقہ مباحث پر اردو میں جتنا مواد ہے اتنا کسی اور زبان میں نہیں، حتیٰ کہ ایران بھی اس سے پیچھے ہے۔ وہاں سنی تقریباً مفقود ہو چکے تھے، آویزش اور مقابلے کا کوئی سوال نہیں تھا، اس بنا پر وہاں یک طرفہ نظریہ پیش ہوا ہے جس میں شدت اور تلخی ملتی ہے۔ ہندوستان میں خواہ شیعہ کی طرف سے کوئی چیز لکھی گئی یا سنی کی طرف سے دونوں میں زور استدلال موجود ہے۔ ان کو خوف تھا کہ اگر ان کے دلائل کمزور ہوں گے تو فریق ثانی اس تحریر کے پرخچے اڑا دے گا۔ اس اندیشے نے مصنفین کے معیار تحریر کو برقرار رکھا۔ اگرچہ بعض تحریروں میں اعتدال سے انحراف ملتا ہے لیکن معقول اور معتدل ادب کی بھی کمی نہیں۔ مختصر یہ کہ ان تحریروں کے مطالعے کے بغیر کوئی جامع کتاب ان موضوعات پر لکھی نہیں جا سکتی۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی فہرست میں اس سلسلے کی ۴۰۰ کتابوں کا نام درج ہے۔

قادیانی وغیر قادیانی اختلاف :

مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرو قادیانی اور احمدی کہلاتے ہیں۔ مرزا صاحب خود بڑے پائے کے مصنف تھے، انہوں نے اپنے دعویٰ کی تائید میں متعدد کتابیں لکھیں۔ ان کے خلفاء میں مرزا بشیر الدین محمود احمد نے بھی بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ "قاموس الکتب" میں ان کی ۵۴ کتابیں اور مرزا غلام احمد کی ۸۰ کتابیں مذکور ہیں۔ کتابوں کی تعداد اور ان کے موضوعات سے ان دونوں حضرات کے مرتبے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک طرف مرزا صاحب اور ان کے پیرو قادیانیت کی تصدیق میں زور قلم دکھا رہے تھے تو دوسری طرف عام علمائے اسلام نے ان کی رد میں بڑا محاذ قائم کر رکھا تھا اور ان کی طرف سے متعدد کتابیں شائع ہو رہی تھیں۔ ان کے موضوعات حقیقت نبوت، مسئلہ ختم نبوت، نبی تشریعی و غیر تشریعی، مسیح موعود، تصلیب مسیح قسم کے نازک اور بنیادی مسائل تھے۔ ان سے متعلق قدیم زمانے میں بھی یکجا مواد نہیں ملے گا۔ اس لئے اردو کے اس سلسلے کے مواد کی بڑی اہمیت ہے اور جو کام ان مواد کو نظر انداز کر کے ہوگا وہ یقیناً تشنہ رہے گا۔ ظاہر ہے ہندوستان کے علاوہ جہاں بھی ان موضوعات پر کام ہوگا وہاں کے لوگوں کو اردو سے ناواقف ہونے کی بنا پر اس مواد سے استفادہ کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ "قاموس الکتب" میں اس سلسلے کی ۲۱۱ کتابیں درج ہیں۔

فرقہ وہابی وغیر وہابی :

وہابی دو طرح کے ہیں ایک سیاسی دوسرے مذہبی۔ سیاسی وہابی وہ ہیں جنہوں نے انگریزوں کے خلاف انیسویں صدی کے اوائل کے بعد بڑا محاذ قائم کر لیا تھا۔ ان میں سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی شخصیتیں نہایت ممتاز ہیں۔ یہ بزرگ تحریک آزادی کے بڑے علمبردار اور مجاہد تھے اور ۱۸۵۷ء کی تحریک سے قبل انہوں نے انگریزوں سے جس طرح ٹکر لی وہ تحریک آزادی کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ ان حضرات کو عوام میں بدنام اور ان سے عوام کو بدظن کرنے کی غرض سے اس تحریک کو انگریزوں نے وہابی تحریک کے نام سے موسوم کر دیا۔ اس تحریک سے متعلق کئی نہایت بڑی عالمانہ اور محققانہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں

لرا سے صرف اس لحاظ سے اسلامی ادب میں جگہ مل سکے گی کہ ان بزرگوں کا مقصد ہندوستان
یں ایک عادل مسلم حکومت کا قیام تھا۔ ان میں بیشتر وہی تھے جو تقلید شخصی کے قائل نہ ہونے کی
وجہ سے غیر مقلد کہلاتے تھے۔ مگر چونکہ ان کا رجحان سیاست کی طرف تھا اس لئے ان کو مذہبی
وہابی یا غیر مقلد سے الگ سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ آخر الذکر جماعت صرف تقلید شخصی کی نفی کرتی
ہے۔ چونکہ ہندوستان میں مقلدین کی بھاری اکثریت ہے اس لئے دونوں میں اختلاف ناگزیر
ہوگیا۔ چنانچہ دونوں فریق نے اپنے اپنے دعوؤں کی تصدیق میں کتابیں تصنیف کیں۔ غیر وہابی،
وہابیوں یعنی غیر مقلدوں پر صرف یہ الزام رکھتا کہ یہ لوگ ائمہ اربعہ کی اتنی تعظیم نہیں کرتے
جتنی کے وہ مستحق تھے۔ غیر مقلدین ان کے متعلق کہتے کہ ان میں بدعت پیدا ہوگئی ہے۔ غرض تقلید شخصی
جیسے نازک مسائل پر طرفین کے بڑے بڑے لوگوں نے اظہار خیال کیا ہے جو نہایت وقیع اور
قابل مطالعہ ہے۔ یہ سارے کا سارا مواد اردو ہی میں ہے۔ ان موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے
لو اردو کے ان ذخائر سے استفادہ ناگزیر ہوگا۔ "قاموس الکتب" میں اس سلسلے کی ۲۱۶ کتابیں
درج ہیں۔

دیوبندی و بریلوی فرقے:

حنفیوں کے دو بڑے فرقے بھی ہیں۔ دونوں میں کوئی بنیادی اور اصولی اختلاف نہیں۔ صرف
چند فروعی اختلاف ہیں جن کو اتنا طول دیا گیا ہے کہ انہیں اصولی اختلاف قرار دے دیا ہے۔
موضوعات: بدعت، میلاد یا قیام میلاد، زیارت، فاتحہ اور دوسرے رسوم ہیں۔ چونکہ
ان کے موضوعات اتنے اہم نہ تھے اس لئے ان کتابوں کا انداز سخن عالمانہ و محققانہ نہیں ہے۔
اس سلسلے میں بڑی کتابیں بھی کم ہیں۔ چھوٹے چھوٹے رسالوں کی بہتات ہے جن میں فریق ثانی
پر رکیک حملے کئے گئے ہیں۔ اس تحریک کا تعلق خواص سے زیادہ عوام سے ہوگیا تھا اس لئے
اکثر کتابیں عوامی اور عامیانہ جذبات سے پر ہیں۔ البتہ بعض کتابیں جو مستند علماء کی ہیں
جن کی تعداد کم ہے، بہت مفید اور درخور توجہ ہیں۔ بہر حال وہی چند تصانیف ہیں جن پر اردو

ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے اور وہی مطالعہ کے لائق بھی ہیں۔

فرقہ مہدویہ :

سید محمد جون پوری جو اس فرقے کے بانی ہیں، جون پور کے رہنے والے تھے لیکن ان کا مذہب دکن میں بہت رائج ہوا۔ چنانچہ کچھ دنوں تو احمد نگر کا سرکاری مذہب بھی رہ چکا تھا۔ ویسے دکن کے مختلف حصوں میں اس فرقے کے لوگ مل جائیں گے۔ بعد میں اس مذہب کی بعض اصولی کتابیں اردو میں بھی لکھی گئیں۔ اس فرقہ کے خلاف اردو میں تصانیف بہت کم ہیں۔ مہدوی ادب جو اردو میں ہے اس میں دوسرے اسلامی فرقوں سے چھیڑ چھاڑ نہیں ہے۔ اس سلسلے کی بعض کتابیں ابھی قلمی شکل میں ہیں جو اس کے ماننے والوں کے پاس محفوظ ہیں۔ مہدویوں نے سید محمد جون پوری کو مہدی موعود قرار دیا تھا، اس لئے ان کی تحریروں میں "مہدی موعود"، "مسیح موعود" وغیرہ مسائل کی بحث ملتی ہے۔ بہرحال مختصر ادب ہوتے کے باوجود نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں۔

ارباب عقل یعنی متکلمین :

اس جماعت کو کسی نام سے یاد کیجئے، متکلمین کہئے، معتزلہ کہئے، ارباب عقل وارباب فلسفہ کہئے، مسلمانوں میں یہ لوگ ابتدا ہی سے موجود تھے۔ جو مذہبی امور میں عقل کی برتری کے قائل تھے۔ وہ ہر اسلامی معاملے کو عقل سے پرکھتے۔ اس لئے ان کے یہاں فلسفیانہ موشگافی اور معنی آفرینی پائی جاتی ہے۔ ان کا موضوع فکر عرب کے مذاق کے موافق نہ تھا، یہ بیشتر عجمی ذہن ہے، عربوں کا میدان عمل اور ان حضرات کا فکر، بہرحال خالص علمی اعتبار سے ان موضوعات کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ موضوعات اس طرح کے تھے :

تجسیم خداوندی، صفت و ذات خداوندی، عدل، جبر و اختیار، خلق قرآن امکان کذب، معراج جسمانی و روحانی، تصور بہشت و دوزخ وغیرہ۔

فی نفسہ یہ بڑے جاذب توجہ موضوعات ہیں۔ اردو میں ان پر کافی لکھا گیا

ہے ۔ اگرچہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اُردو کی کتابیں عربی و فارسی کے مقابلے میں کس پائے کی ہیں، لیکن ان کتابوں کی کثرت، ان موضوعات کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ بہرحال اگرچہ یہ خالص ہندوستانی موضوع نہیں پھر بھی علمائے ہند کی اس سلسلے کی کوشش نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔ "قاموس الکتب" میں اس موضوع پر ۴۵۵ کتابیں درج ہیں۔

ارباب حدیث و منکرین حدیث :

حدیث کی تحقیق و تلقین جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غیر معمولی شغف کا نتیجہ ہے ، مختلف فنون کی موجد ہے۔ رواۃ کا سلسلہ اور علم اسماء الرجال صرف حدیث کی تحقیق کے جذبے سے پیدا ہوا اور یہ علم ایسا مہتم بالشان ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی ۔ میرے نزدیک کمزور سے کمزور حدیث کے سلسلے میں جو حقائق ملتے ہیں وہ دنیا کے بڑے بڑے مستند واقعات میں نظر نہیں آتے ۔ میری مراد یہ ہے کہ جو حدیث بیان ہوئی ہے اس کا کوئی نہ کوئی راوی ضرور ہے اور وہ راوی ایسا ہے جس کا حال آج بھی محفوظ ہے۔ بعض اوقات کمزور حدیث بھی کئی رواۃ سے نقل ہوئی ہے ۔ آپ ذرا آج سے ہزار ڈیڑھ ہزار سال کے کسی واقعے کو لیں ، ہمعصر اور معتبر شہادت جو اس وقت تک کسی نہ کسی شکل میں باقی ہو، اس کے ملنے کا کیا ذکر، سو دو سو برس بعد کی کوئی معتبر شہادت میسر نہیں آتی اور ہم محض شہرت عام کی بنا پر اس واقعے پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کمزور ترین حدیث سے اس واقعے کا مقابلہ دیانت داری سے کریں تو آپ جس بات پہ یقین قطعی رکھتے ہیں وہ اس حدیث کے پیش نظر بے حقیقت نظر آئے گی۔ لیکن اس کے باوجود خود مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا ہے جو حدیث کی حقانیت کا منکر ہے ۔ یہاں اہل حدیث کی حمایت میں کچھ نہیں کہنا ہے لیکن یہ بات قابل ذکر ضرور ہے کہ یہ حضرات حدیث کے متعلق ایک ایسا قطعی معیار قائم کرنا چاہتے ہیں جو حقیقت

کاملہ کو بتا سکے۔ بہر حال منکرین حدیث نے حدیث کے ابطال میں اور ارباب حدیث نے اس کے احقاق میں بڑے بڑے کمال دکھلائے ہیں۔ چونکہ موضوع نہایت عالمانہ ہے اس لئے اس سلسلے کی کتابوں میں استدلال کا طرز بھی عالمانہ اور محققانہ ہے۔ یہی وجہ ہے یہ کتابیں بڑی معیاری ہیں۔ موجودہ دور میں خصوصاً پنجاب میں اس سلسلے میں کافی لکھا گیا ہے اور جو لکھا گیا ہے وہ سب اردو میں ہے۔ اس اعتبار سے اُردو کا دامن وسیع ہو گیا ہے۔ جو ان موضوعات سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس سلسلے کی اُردو کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اردو میں جو مواد ہے وہ یقیناً عربی و فارسی سے زیادہ ہے گو عربی میں اس سلسلے کے بعض وقیع مآخذ ہیں۔

آریائی مناظرے:

ہندوستان کے آریہ سماجیوں اور مسلمانوں کے بڑے مذہبی مناظرے ہوئے اور دونوں نے اپنے نقطہ ہائے نظر اردو میں پیش کئے۔ آریہ سماجیوں کا مرکز لاہور تھا جہاں اردو کا بڑا چرچا تھا۔ اس بنا پر مناظرے اور مقابلے کی زبان اُردو ہی قرار پائی۔ اُردو میں اس سلسلے کا کافی مواد ملتا ہے۔ لیکن اس میں انتہا پسندی ضرور ہے۔ اس طرح کے مناظروں کے اہم موضوعات وحدانیت و رسالت، تنزیل قرآن، ختم نبوت، عقیدہ قیامت، مسئلہ تناسخ وغیرہ تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ موضوعات نہایت فلسفیانہ تھے اور اس بنا پر بہت اہم ہیں۔ اور لکھنے والوں نے بھی مضبوط استدلال سے اپنے نقطۂ نظر کی تصدیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ "قاموس الکتب" میں اس سلسلے کی ۱۱۱ کتابوں کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے اس سلسلے کا کوئی مطالعہ ان کتابوں کو غائر نظر سے دیکھے بغیر مکمل اور اطمینان بخش نہیں ہو سکتا۔ یہ موضوع خالص ہندوستانی ہے اور اس میں ہندوستانی نقطۂ نظر دونوں فریق کی کتابوں میں موجود ہے۔

عیسائی اور مسلمان :

ہندوستان میں عیسائی مذہب کی تبلیغ و ترویج مشنریوں کے ذریعے بڑے ضبط و نظم کے تحت ہوتی رہی۔ جب ان کی تبلیغ کا رخ مسلمانوں کی طرف ہوا تو علماء نے روک ٹوک کی۔ اس نتیجے میں فریقین میں مناظرے ہوئے۔ ان تحریری اور تقریری مناظروں اور مقابلوں کے موضوعات مسئلہ ختم نبوت۔ تنزیلِ قرآن، تحریف انجیل استشہاد نبوت خاتم المرسلین از توراۃ و انجیل، تصلیب و تثلیث وغیرہ تھے۔ موضوعات کی اہمیت کی وجہ سے اس سلسلے کی کتابیں کافی قابل توجہ ہیں۔ انگریزی اور دوسری زبانوں میں عیسائیت اور اسلام کے بارے میں کافی ذخیرہ مل جائے گا مگر ان اختلافی مسائل پر جتنا مواد اُردو میں موجود ہے کسی زبان میں نہ ہوگا۔ اور عربی و فارسی تو ان موضوعات سے یکسر خالی ہیں۔ یہ ہندوستان کا خاص مسئلہ تھا، اس لئے یہاں اس سلسلے کی کتابیں لکھی گئیں۔ "قاموس الکتب" میں ۲۲۲ کتابوں کا نام درج ہے جو متعلقہ موضوعات پر تحریر ہوئی ہیں۔

تصوف :

اسلام کی تبلیغ میں جو طریقہ کار سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوا وہ تصوف کا تھا۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ صوفیوں کی وجہ سے اسلامی پیغام عام ہوا۔ تصوف ہندوستانی مزاج کے لئے نہایت سازگار تھا اس لئے کہ ہندو مذہب میں ترک دنیا ایک اہم مذہبی فریضہ تھا اور صوفیوں کی زندگی تارک الدنیا کی سی ہوتی تھی۔ اس لئے ہندوستان کے باشندے ان کی طرف کھنچ کھنچ کر چلے آتے۔ ان صوفیوں کی زندگی میں جو کشش تھی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ بنی نوع کی خدمت اور ان سے محبت ان کا اہم مشغلہ تھا۔ اپنی زندگی اور طریقہ تعلیم سے حضرات صوفیہ اسلامی پیغام ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلا رہے تھے۔ ظاہر ہے ان حضرات کے مخاطب خواص سے زیادہ

عوام تھے اس لئے انہوں نے اپنے وعظ یہاں کی زبانوں میں دیئے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے ابتدائی نمونے انہی صوفی بزرگوں کے مکالمات میں مل جاتے ہیں۔ ہندوستان کے جس حصہ میں یہ بزرگ گئے وہاں کی زبان سے ان کی شناسائی کا پتا چلتا ہے۔ بعض صوفی بزرگوں کا خیال ہے کہ مقامی بولی یا ہندی تصوف کی تعلیمات کے لئے نہایت سازگار ہے۔ ہم یہاں پر حضرت سید گیسو دراز کا ایک قول نقل کرنے پر اکتفا کریں گے :

بروز جمعہ ۱۹ رمضان ۸۰۲ھ کو ایک مرید نے عرضداشت کی: "چہ سبب است کہ البتہ ذوق صوفیاں در ہندوی بیشتر باشد، و در صوت و غزل و قول آن چناں نیست" آپ نے فرمایا: درھریکی خاصہ از آن اوست کہ در دیگری نیست اما ہندوی بیشتر نرم و مروق می باشد و سخن کشادہ گفتہ می شود و آہنگ بر وفق او نرم مروق می باشد و گریہ کناندو اشارت بخرابی و عجز و انکساری کند بضرورت مرد صوفی" از آنجا بیشتر میلی باشد...... تازکی و لطافت و اشارت بمعاملتی دیگر باشد کہ جز بہ ہندوی نتواں گفت و ایں تجربہ معلوم گردد"۔

ان وجوہ سے اردو کی ابتدائی نشو و نما میں ان بزرگوں کا خاص ہاتھ رہا ہے۔ جس کا بین ثبوت ڈاکٹر عبدالحق کا اسی عنوان کا رسالہ فراہم کرتا ہے۔ بعد کے صوفیوں نے اُردو ہی کو اپنے وعظ و نصائح کے لئے منتخب کیا اور اسی میں تصنیف و تالیف کرنے لگے۔ ابتدائی صوفیانہ رنگ کی نظم و نثر کی سینکڑوں مثالیں دکنی اُردو میں ملتی ہیں جن میں سے اکثر چھپ بھی گئی ہیں۔ یہ بھی تاریخ ادب اُردو کا ایک اہم واقعہ ہے کہ اس کی پہلی نثری تصنیف "معراج العاشقین" ہے جو سید گیسو دراز کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ انتساب کافی مضبوط قرائن کی بنیاد پر نہیں پھر بھی چونکہ سید صاحب کا میلان اردو کی طرف تھا، یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں کہ ان کی کوئی تصنیف اُردو زبان میں مل جائے۔

اُردو کی زندگی کی ایک بڑی مدت دکن میں گذر جانے کے بعد اس کا مستقر شمالی ہند قرار پاتا ہے۔ یہاں بھی اس زبان نے اپنی روایت قائم رکھی اور صوفی بزرگوں کے ہاتھوں پروان چڑھتی رہی۔ یہ ضرور ہے کہ یہاں صوفیوں کے علاوہ اور دوسرے حضرات نے بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ اسی زبان میں جاری کیا برخلاف دکن کے جہاں کی بیشتر ابتدائی تصانیف صوفیانہ اور اخلاقی رنگ کی ہیں۔

ان اسباب کی بنا پر اردو کی ترقی کی ایک اور صورت صوفیہ کی کوشش کی شکل میں نکل آئی اور رفتہ رفتہ اس میں سینکڑوں صوفیانہ کتابیں لکھی گئیں جن میں سے بعض میں تصوف کے متعلق یقیناً نئی اور قابل توجہ باتیں مل جائیں گی۔ اور ادھر چند برسوں میں تصوف پر بعض فضلاء نے ایسی معرکہ آرا کتابیں لکھی ہیں جن کی مثال فارسی میں نہ ملے گی۔ میرے دوست پروفیسر خلیق احمد نظامی کی "تاریخ مشائخ چشت" بعض اعتبار سے شاید اس موضوع پر سب سے بہتر کتاب ثابت ہو جس کی مثال کسی اور زبان میں مشکل ہی سے دستیاب ہو سکے گی۔ "قاموس الکتب" میں ۱۹۵ صوفیانہ کتابوں کی فہرست درج ہے۔

اس کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا ناگزیر ہے کہ قدیم زمانے سے تصوف کا جو سرمایہ اُردو میں ہے اس میں کوئی بڑا امتیازی کارنامہ شامل نہیں۔ دراصل یہ سارے پند و نصائح اور وعظ و تبلیغ کے مجموعے ہیں جن میں بڑے مسائل اور عالمانہ طرز استدلال کا فقدان ہے۔ اس اعتبار سے اردو کا صوفیانہ سرمایہ فارسی کے مقابلے میں ہلکا ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے تنقیدی اور تحقیقی سرمائے میں جن میں بیشتر طویل مقالات اور چند کتابیں ہیں کافی محققانہ اور قابل توجہ مواد فراہم ہو گیا ہے۔

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہندوستان کا اسلامی اردو ادب بعض خصائص کے اعتبار سے بیرونِ ہند کے اسلامی ادب سے منفرد ہے۔ اولاً اس ادب کا یہ امتیاز اس کے اپنے ملک کے جغرافی، سیاسی اور مذہبی

حالات کا مرہون منت ہے۔ یہ حالات کسی دوسرے اسلامی ملک میں نہ تھے، اس بنا پر وہاں کے اسلامی ادب میں یہ خصائص نہ پیدا ہو سکے۔ چنانچہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اسلامی ادب کے ساتھ ہمارا یہ ادب خالص ہندوستان کی پیداوار ہے اور اس ملک کی گہری چھاپ اس پر موجود ہے۔ قادیانی مذہب سے متعلق کوئی کتاب ہو یا مہدوی فرقہ سے، آریہ سماج کے رد میں کوئی کتاب ہو یا عیسائیت کے، سب ہندوستان سے متعلق تھے اور یہ سب ہندوستانی ادب ہوگا۔

اوپر جن عوامل کا ذکر ہوا ہے ان میں سے بیشتر اختلافی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ اردو کا سارا سرمایہ اختلافی امور سے پر ہے۔ ان اختلافی مسائل کے ذکر سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اردو ادب میں جو اسلامی علوم ہیں ان کی چند ایسی خصوصیات ہیں جو اور کہیں نہیں پائی جاتیں۔ اور اسی امتیاز کی بنیاد پر وہ ادب نہایت وقیع اور درخور توجہ ہے۔ ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ ہندوستان صدیوں تک اسلامی علوم کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ ان مراکز میں ایشیا کے مختلف ممالک کے چوٹی کے علمار رہ چکے ہیں۔ اس روایت کا سلسلہ مدتوں تک باقی رہا۔ اس کے نتیجے میں ہمارے علمار کا اسلامی علوم میں درک بیرونِ ہند کے علمار سے حقیر نہ تھا۔ اور آخر انیسویں صدی سے دیوبند، ندوۃ العلمار اور دوسرے بڑے عربی مدارس نے تمام اسلامی ممالک کی مذہبی ضرورت کی کفالت کی۔ سمرقند، بخارا، ترکی، عراق، شام، عرب، مصر، انڈونیشیا، افغانستان، چین، تبت اور دوسرے ممالک کے سینکڑوں تشنگان علم انہی سرچشموں سے سیراب ہوتے رہے ہیں۔ اگر ان مدارس کی علمی روایات یا معیار میں انحطاط ہوتا تو ان کی یہ عالمگیر شہرت باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ ان عربی اور دینی مدارس کے ساتھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اگرچہ یہ دونوں ادارے علوم

اسلامی کے بڑے مراکز نہیں ہیں، یہاں اسلامی علوم کے ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی اور دوسرے فنون کی تعلیم دی جاتی ہے، لیکن یہاں کے سارے طلبہ کو اسلامی روایات و خصوصیات سے آشنا اور مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ان اداروں کی یہی خصوصیت بیرون ہند کے تشنگان علم کو یہاں کھینچ کر لاتی رہی ہے۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی علوم کا پایہ مقابلتاً کبھی فروتر نہیں رہا۔ ادھر چند برسوں سے ہمارے معیار میں کچھ فرق نظر آرہا ہے۔ مگر یہ بات صرف انہی علوم سے مخصوص نہیں۔ یہ عالمگیر صورت حال ہے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے پناہ اور ناگزیر کشش سے پیدا ہورہی ہے۔

یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ہمارے علمار کی تصنیف کا معیار دوسرے ممالک کی تصانیف سے پست نہیں۔ اگر کسی طرح یہاں کے متبحر علمار کے افکار کا مقابلہ بیرون ہند علمار کے افکار سے کرسکتے تو ہمارا دعویٰ بہت قوی ہوجاتا۔ ظاہر ہے کہ ایک تعارفی مقالے میں اس کا موقع نہیں۔ البتہ گزشتہ دور کے چند صاحب فکر بزرگوں جن میں مولانا قاسم، سرسید احمد خاں، مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر اقبال، مولانا اشرف علی، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، ابوالاعلیٰ مودودی۔ ابوالحسن علی ندوی وغیرہ ممتاز ہیں، ان کی تصانیف کا مقابلہ اسلامی ممالک کے کسی عالم کی تصانیف سے کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی اسلامی تفکیر کا کیا مرتبہ ہے۔

ہندوستان کی بڑی بدقسمتی ہے کہ ہمارے یہاں ایسے تحقیقی ادارے جہاں کسی اسکیم کے تحت بڑے کام اجتماعی طور پر انجام پاسکیں، وجود نہیں رکھتے۔ اس میں کسی اور کا قصور نہیں، تقصیر صرف کام کرنے والوں کی ہے کہ ہندوستان کے تحقیقی اداروں کی طرف سے جتنے کام انجام پاسکتے ہیں، ان سے کہیں زیادہ کام انفرادی طور پر نجی کاوشوں سے ہوسکا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کام جس معیار کا ہوسکتا تھا ناگزیر کوتاہیوں کی وجہ سے نہیں

ہو سکا۔ بالکل یہی صورت اسلامی علوم سے متعلق اداروں کی ہے۔ ہندوستان میں ان علوم سے متعلق جو ادارے ہیں، یہاں کے کام انہی کے رہین منت نہیں بلکہ اشخاص نے انفرادی طور پر اعلیٰ کتابیں لکھی ہیں۔ اس کے باوجود چند قابل توجہ ادارے ایسے ہیں جن کے ذریعے اہم کتابیں معرض وجود میں آئیں۔ ان میں میرے نزدیک سب سے مشہور ادارہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کا ہے۔ اس ادارے کے بانی مولانا شبلی تھے۔ ان کی توجہ سے ادارے نے بڑی ترقی کی۔ ادارے کے اغراض میں اسلامی علوم کے ریسرچ اسکالر کی نگرانی، اسلامی تاریخ سے متعلق کتابیں لکھنا اور چھاپنا اور "معارف" نام کا ایک علمی و ادبی رسالہ شائع کرنا تھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ یہ ادارہ کم و بیش ۴۶ سال سے اپنے مقاصد نہایت کامیابی کے ساتھ پورا کر رہا ہے۔ "معارف" کی ۹۲ جلد کا آخری شمارہ اس وقت پیش نظر ہے۔ نہایت مسرت کا مقام ہے یہ رسالہ مولانا شبلی کے خواب کی عملی تعبیر ہے اور جس اعلیٰ معیار کے ساتھ ان کے زمانے میں نکلتا تھا اور جس کو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے بڑی تابناکی بخشی تھی، اب شاہ معین الدین احمد ندوی کی ادارت میں اس کی وہی روایت برقرار ہے۔

دارالمصنفین نے تاریخ اسلامی کی جتنی خدمت کی ہے اس سے ہندوستان اچھی طرح متعارف ہے۔ اس ادارے نے آغاز قیام سے اس وقت تک ۹۲ کتابیں شائع کی ہیں ان میں سلسلۂ سیرۃ النبی، سلسلۂ سیر الصحابہ و سیر الصحابیات، سلسلہ تاریخ اسلام جن میں ہر ایک متعدد جلدوں پر مشتمل ہے، بے حد مقبول ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے نہ جانے کتنے ایڈیشن نکل چکے ہیں اور "سیرۃ النبی" کی بعض جلدوں کے ترکی، فارسی اور دوسری زبانوں میں ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ "شعر العجم" اور "عمر خیام" بھی فارسی ترجمہ ہو چکی ہیں۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ جن موضوعات پر یہ کتابیں ہیں، ان پر ان سے زیادہ جامع کتاب نہیں مل سکتی۔ "سیرۃ النبی" کے چھ حصے ہیں جن کی ضخامت

کئی ہزار صفحوں کی ہے۔ دراصل ان کے مطالعے سے مصنفین کے تبحر علمی اور طرز استدلال کی داد دی جا سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ دارالمصنفین کی نہ تاریخ بیان کرنے کا موقع ہے اور نہ اس کی قصیدہ خوانی مقصود ہے۔ دراصل یہ عرض کرنا ہے کہ اس ادارے نے اسلامی تاریخ اور متعلقہ علوم کی جو خدمت انجام دی ہے اس کی مثال کسی ایک ادارے کے ذریعے پیش نہیں کی جا سکتی۔

ہندوستان کا ایک دوسرا ادارہ جس کی خدمات بہت وقیع ہیں ندوۃالمصنفین دہلی ہے۔ اس کے مقاصد تقریباً وہی ہیں جو دارالمصنفین کے ہیں۔ اس نے تاریخ اور علوم سے متعلق متعدد معرکہ آرا کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کا ایک بلند پایہ ماہوار مجلہ "برھان" کے نام سے شائع ہوتا ہے جس میں نہایت معیاری تحقیقی اور تنقیدی مضامین تاریخ اسلام وغیرہ سے متعلق نکلتے ہیں۔ ندوۃ المصنفین البتہ ریسرچ اسکالر کی اس طرح نگرانی نہیں کرتا جس طرح دارالمصنفین میں ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اوالذکر کی بعض کتابیں خود ادارے کے لوگوں کی نہیں ہیں۔ لیکن ملک کے مستند مصنفوں کا تعاون اس ادارے کو حاصل ہے اس بنا پر اس کی شائع کردہ کتابیں بڑی معیاری ہیں۔ پروفیسر نظامی کی "تاریخ مشائخ چشت" اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی کئی کتابیں اسی ادارے نے چھاپی ہیں۔

ایک تیسرا اہم ادارہ جس نے اردو میں اسلام پر بڑی وقیع کتابیں چھاپی ہیں ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ہے۔ اس ادارے نے بارہ سال میں بڑی اہم کتابیں چھاپی ہیں جو اپنے معیار کے اعتبار سے ہر جگہ وقعت کی نظر سے دیکھی جائیں گی۔ ان اہم مطبوعات میں حکمت رومی، تشبیہات رومی، اسلام کا نظریہ حیات، مسئلہ اجتہاد، افکار غزالی، سرگذشت غزالی، افکار ابن خلدون، مقام سنت، پیغمبر انسانیت، اسلام اور موسیقی، مسئلہ تعدد ازدواج، تحدید نسل، اجتہادی

مسائل، حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق، تاریخ تصوف، اسلام اور رواداری، سیاست شرعیہ، اسلام میں عدل و احسان، تاریخ جمہوریت، سرسید اور اصلاح معاشرہ، اسلام کی بنیادی حقیقتیں، اسلام اور مذاہب عالم، اسلام میں حقیقت نسواں، اسلام کا نظریہ تاریخ، دین فطرت، مقام انسانیت، قرآن اور علم جدید، تہذیب و تمدن اسلامی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ یہ ادارہ ایک ماہوار رسالہ بھی شائع کرتا ہے جس میں اسلام سے متعلق تحقیقی مضامین شامل ہوتے ہیں۔ اس رسالے کی بارھویں جلد سامنے ہے۔ جن موضوعات پر یہ کتابیں ہیں، ان پر میرے خیال میں سب سے مستند مواد انہی کتابوں میں ہے۔

ان چند اداروں کے ذکر کے بعد اُردو زبان میں اسلامی علوم و مذہب سے متعلق جو سرمایہ ہے اس کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ جائزہ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی مرتبہ "قاموس الکتب" پر مبنی ہے جس میں مذہب اسلام سے متعلق ۱۰۹۱۲ کتابوں کی فہرست درج ہے۔ کتابوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھنے کے بعد ڈاکٹر موصوف نے بالکل صحیح لکھا :

"فہرست کے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوگا کہ ہماری زبان و ادب کا دامن کتنا وسیع ہے اور یہ بھی کہ اس زبان میں خاص طور پر مذہب اسلام کے بارے میں اب تک جو ذخیرہ فراہم ہوا ہے، شاید دنیا کی کسی زبان میں ہو۔

باایںہمہ اس زبان کو عربی و فارسی و ترکی کے برابر کا درجہ نہ ملنا افسوس اور تعجب کی بات ہے۔ اس کی ذمہ داری اردو داں حضرات کے سر ہے۔ جو اردو ادب کی اس حیرت انگیز خصوصیت کو عام کرنے کی صورت نہیں نکالتے۔"

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے مواد کو ۱۲۰ عنوان کے تحت پیش کیا ہے۔ ذیل میں

کتاب کے سارے عنوان مع تعداد کتب کے پیش کئے جاتے ہیں۔ اس سے آپ اردو ادب کے اس سرمائے کی وسعت، ہمہ گیری اور افادیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ رہا یہ کہ ان کتابوں میں اسلامی تفکیر کتنی ہے تو اس کے متعلق تو صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب ہندوستانی علماء عربی میں کچھ لکھتے ہیں تو وہ عرب اور ایران اور دوسرے ممالک میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں، اس لئے ان کی اُردو کی تحریریں اور بھی زیادہ وقیع ہوں گی۔ اپنی مادری زبان میں اظہار خیال میں زیادہ پختگی، سنجیدگی اور وقار ہوتا ہے۔ ورنہ جا ئیے ہمارے ملک کے نوجوان عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ عرب اور دوسرے اسلامی ممالک میں کتنے مقبول ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ ان کا مرتب کردہ سفرنامہ عرب ممالک میں چھپ چکا ہے اور مکہ یونیورسٹی کے (VISITING) پروفیسر اور یونیورسٹی کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔ ان کا جتنا احترام ہو رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے ان کی مقبولیت کا راز ان کے علم کی پختگی اور افکار کی گہرائی میں مضمر ہے، جس کا اندازہ اہل عرب نے ان کی بعض کتابوں کے مطالعے اور زبانی گفتگو سننے سے کیا ہوگا۔ اگر وہ مولانا کی اپنی زبان میں تصنیف کی ہوئی کتابیں پڑھ سکتے تو انہیں مولانا کے علم کی وسعت کا صحیح اندازہ ہوتا۔ دوسری مثال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ہے۔ وہ عالم اسلام میں اپنی اسلامی فکر و مطالعہ کی وجہ سے بہت قابل احترام مانے جاتے ہیں۔ ان کی بعض کتابیں عرصہ ہوا فارسی اور عربی میں منتقل ہو چکی ہیں۔ انھوں نے اسلام کو جس طرح موجودہ دور کے مسائل کی روشنی میں سمجھا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ اس اعتبار سے عالم اسلام میں ان کی مثال آج کل مشکل ہی سے مل سکے گی۔

ظاہر ہے یہ بحث صرف دو عالموں کے ذکر پر ختم نہیں ہو سکتی۔ اس کا سلسلہ کافی دور تک چلا گیا ہے۔ فی الحال یہ گفتگو صرف اردو زبان کے علوم اسلامی کی اجمالی فہرست پر ختم کر دی جاتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے مقرر کئے ہوئے عنوان یہ ہیں ۔

عنوان	تعداد	عنوان	تعداد
تراجم قرآن	۵۹	تفاسیر سور	۲۱۴
تجوید	۸۶	تفاسیر الآیات	۲۰
تفاسیر قرآن	۱۴۳	مقدمہ تفاسیر	۱۷
اصول تفسیر	۷	کتب حدیث شیعہ	۱۳
تعلیمات قرآن	۳۹	اصول حدیث	۱۷
احکام القرآن	۲۳	اسمار رجال	۱۹
قصص القرآن	۹۹	تاریخ تدوین حدیث	۲۱
سرزمین قرآن	۶	متعلقات حدیث	۲۷
علوم القرآن	۱۷	عقائد	۲۲۲
اعجاز القرآن	۱۹	عقائد امامیہ	۲۳
وحی اور الہام	۱۱	فقہ	۱۳۵۳
اسباب النزول	۳	صلوٰۃ	۱۵۴
ناسخ و منسوخ	۵	صیام	۵۰
خواص القرآن	۱۰	زکوٰۃ	۲۴
فضائل قرآن	۱۰	حج	۶۲
ادعیہ قرآن	۱۷	خطبات جمعہ وعیدین	۲۷
لغات القرآن	۲۷	فرائض، مسائل میراث	۵۴
تخریج آیات القرآن	۱۱	نکاح و طلاق	۵۹
فہرست مضامین قرآن	۱۵۷	ربا	۲۳
مباحث قرآن	۱۵	سماع	۲۵

معارف قرآن	۱۱	فتاوی	۹۴
تاریخ جمع و ترتیب قرآن	۱۹	فتاوی جواز میلاد و فاتحہ	۱۴
تاریخ مفسرین	۳	فقہ شافعی	۱۰
احادیث	۲۵۶	فقہ امامیہ	۲۱۳
چہل حدیث	۹۰	اصول فقہ	۱۴
علم فقہ	۱۰	دروس قرآن	۲۹
تاریخ فقہ و فقہا	۹	سیرت النبی	۴۰۸
الکلام	۴۵۵	میلاد النبی	۲۳۵
مسئلہ علم غیب	۱۵	نور نامہ	۲۶
حشر و نشر	۵۸	مبشرات	۱۸
اسلامی اخلاق	۸۶	نسب نامہ آنحضرت	۶
اسلامی معاشرت	۲۴	معراج نامے	۵۳
اسلامی تہذیب و تمدن	۳۶	شمائل	۳۰
اسلامی معاشیات	۳۰	خصائص محمدیہ و فضائل	۱۴
نسائیات	۱۰۶	اخلاق النبی	۱۶
تصوف	۱۱۹۵	معجزات	۴۵
وعظ	۱۸۵	وفات نامہ	۲۶
تقاریر و خطبات	۵۸	صلوٰۃ و سلام	۱۳
اسلامی سیاسیات	۱۲۳	سیر	۱۵۱
اسلام اور اشتراکیت	۱۴	مناظرہ نصاریٰ	۵۶ } ۳۳۲
جہاد	۳۵	رد مناظرہ نصاریٰ	۲۷۶

موضوع	تعداد	میزان
اسلامی قانون	۶۱	
تبلیغ اسلام	۱۷۲	
مواعظ	۱۰۴	
دینی مقالات	۵۱	
دینی مکاتیب	۲۹	
اسلامی تعلیم	۴۰	
احمدیت	۱۷۱	۳۱۱
رد احمدیت	۱۴۰	
جدلیات	۲۷۳	
رد بدعات	۲۴	
امامیات	۱۹۹	
مصائب	۲۶۳	
ادعیہ امامیہ	۴۲	
اسلامی فرقے	۹	
باطنیہ اسماعیلیہ	۵	
مہدویہ فرقہ	۱۲	
بہائی مذہب	۱۷	
نیچریت	۱۱	
دواوین نعتیہ	۸۲	

موضوع	تعداد	میزان
مناظرہ آریہ	۲۸	۱۱۱
رد مناظرہ آریہ	۸۳	
شیعی مناظرہ	۲۶۶	۴۰۷
رد شیعی مناظرہ	۱۴۱	
مناظرہ غیر مقلد	۸۲	۲۱۶
مناظرہ مقلد	۱۳۴	
علم جفر	۲۲	
تکسیر	۴۵	
عملیات	۸۴	
اوراد و وظائف	۱۳۵	
مناجات	۱۹	
مدحیہ و نعتیہ قصائد	۲۷	
نعتیہ کلام	۱۲۹	
نظمیات	۲۴	
مناقب	۴۲	
مذہبی مثنویات	۷۰	
منظوم دینی قصے	۴۶	
تعبیرات	۳۱	
فالنامے	۲۹	

یہ فہرست اس لحاظ سے نامکمل ہے کہ اس میں ادھر کے تین سال کی مطبوعات شامل نہیں ہیں۔ دوم بہت سی ایسی کتابیں اور قلمی نسخے ہیں جو مرتب کی دسترس سے باہر تھیں۔ تیسرے

یہ ان مفید علمی مقالوں کو حاوی نہیں جو اُردو کے مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں جو بسا اوقات کتابوں سے بھی زیادہ وقیع اور درخورِ اعتنا ثابت ہوں گے۔ اگر یہ ساری چیزیں اس میں شامل ہو جاتیں تو یہ فہرست اور وقیع نظر آتی۔ لیکن باوجود اس تشنگی کے محض اس فہرست کی بنا پر اردو کو دنیا کی بڑی زبانوں کی صف میں جگہ مل سکتی ہے۔ اگر اس کا مقابلہ دوسری زبانوں کے اسلامی لٹریچر کی فہرست سے کیا جائے تو اردو کی برتری کے واضح پہلو نظر آئیں گے۔ اس موضوع سے شغف رکھنے والے حضرات کے لئے براکلمان اور اسٹوری کی فہرستیں موجود ہیں جن سے وہ حقیقت کا پتا لگا سکتے ہیں۔

گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ اردو زبان نے ہندوستان کی عام اجتماعی وقومی ضرورت کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کیا۔ لیکن ملک کے مذہبی تقاضے اس زبان کے ذریعے جس طرح پورے ہوئے وہ کسی ایک زبان کے حصے میں نہیں آئے۔ یہ تقاضے کسی ایک مذہب کے ساتھ مخصوص نہ تھے اس زبان نے جتنی اسلام کی خدمت کی ہے اتنی ہی دوسرے مذاہب کی کی ہے۔ اردو کی فراخدلی اور ہمہ گیری کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے۔ دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اُردو زبان میں جو اسلامی علوم سے متعلق ادب ہے، وہ اپنی کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے عربی و فارسی ادب سے حقیر نہیں اور یہاں کے اسلامی ادب میں جو ہندوستانی عناصر ہیں اس کی وجہ سے یہ ادب نہایت درجہ ممتاز ہو جاتا ہے۔ اردو میں علوم اسلامیہ کا سرمایہ دیکھتے ہوئے یہ حکم لگانا بے جا نہ ہوگا کہ اس کو بین الاقوامی درجہ حاصل ہے۔

★ یہ مقالہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سہ ماہی مجلہ "فکر ونظر" سے ماخوذ ہے ایڈیٹنگ میں بعض مقامات پر

معمولی سا تصرف کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ بھارت کے ایک رسالے کے لئے بھارت میں رہ کر لکھا گیا ہے اس لئے پاکستانی قارئین کو ممکن ہے اس کے ماحول میں کہیں کہیں اجنبیت محسوس ہو۔

اسی طرح فرقوں اور مذہبی گروہوں کے متعلق گفتگو میں بھی بعض نکات سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ مباحث مقالے میں ضمناً آئے ہیں موضوع زیر بحث کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو مقالہ بحیثیت مجموعی مفید اور پُر از معلومات ہے ——— (مدیر)

ذکرِ فراہی

ایک قطعہ تاریخ وفات

شرف الدین اصلاحی

"ذکر فراہیؒ" کے تحت وقتاً فوقتاً مولانا فراہی سے متعلق ایسی باتیں پیش کی جائیں گی جو دوسروں نے کہیں یا لکھیں۔ بالفعل اس کا آغاز ایک قطعہ تاریخ سے کیا جاتا ہے۔ یہ قطعہ تاریخ مجھے مدرستہ الاصلاح سرائے میر کے دفتر سے ملا جب میں فروری ۷۹ء کے سفر ہند میں وہاں کا ریکارڈ اور پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے لئے مدرستہ الاصلاح کے موجودہ ناظم ابوالحسن علی صاحب عرف علی میاں کا ممنون ہوں۔ جنہوں نے از راہ علم دوستی مجھے دفتری ریکارڈ اور پرانے کاغذات دیکھنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ دفتر کے عملہ کو ہدایت کی کہ وہ میری ہر طرح مدد کریں۔ ریکارڈ اور کاغذات میں اگر کوئی چیز مجھے مفید مطلب نظر آئی تو وہ میں نے علی میاں اور دفتر کے کارکنوں کے علم و اجازت سے بصورت نقل یا اصل اپنے پاس رکھ لی۔ چونکہ میرا یہ سفر مولانا فراہی پر کام کے سلسلے میں تھا اس لئے بلا استثناء سب نے میرے ساتھ تعاون کیا جس کے لئے میں چھوٹے بڑے ان تمام افراد و اشخاص کا دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اس سلسلے میں میری کسی طرح کی مدد کی۔ علی میاں کا ذکر بطور خاص اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ مولانا فراہی کے سب سے بڑے پوتے ہیں اور مدرستہ الاصلاح کی نظامت میں حاجی رشید الدین اور مولانا بدر الدین اصلاحی کے بعد مولانا فراہی کے جانشین ہیں۔ ان کی پیدائش ۷ اکتوبر ۱۹۲۳ء کی ہے۔ مولانا فراہی کا انتقال ہوا تو ان کی عمر ۷ برس کی تھی۔ وہ پہلے اور اس وقت اکلوتے بچے ہونے کے سبب خاندان کے دوسرے افراد کی طرح مولانا فراہی کو بھی بہت عزیز تھے۔ مولانا فراہی اکثر انہیں اپنے ساتھ رکھتے

تھے۔ صغرسنی کے باوجود اس وقت کی بہت سی باتیں علی میاں کو یاد ہیں۔ یہ باتیں میں نے ان سے معلوم کرکے قلمبند کرلی ہیں جن کا ذکر اصل مقالے میں اپنے مقام پر آئے گا۔ علی میاں اور سجاد صاحب کے بیان کے مطابق ان کا نام ابوالحسن علی مولانا فراہی نے رکھا تھا۔ مدرسۃ الاصلاح اور کالج کے ریکارڈ میں یہی اصل نام درج ہے۔ لیکن سرکاری کاغذات میں عبدالعلی ہے۔ چونکہ چھوٹے بھائی کا نام عبدالولی رکھا گیا اس لئے اس کی مناسبت سے بعد میں ان کا نام بھی بدل کر عبدالعلی کر دیا گیا۔

زیرنظر قطعۂ تاریخ کی اصل میرے پاس محفوظ ہے۔ گمان غالب بلکہ یقین کامل ہے کہ یہ قطعہ تاریخ جو منشی عطا بیگ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، کاغذ روشنائی اور خط کی کیفیت سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہی ہے جو عبدالرحمٰن صاحب نے خوشخط لکھوا کر ارسال کیا۔ چونکہ اس قطعہ کا ذکر اور فکر و نظر میں اس کی اشاعت مولانا فراہی کی نسبت سے ہے اس لئے اس قطعے کا تنقیدی جائزہ وغیرہ بے محل ہوگا۔ رہا مولانا فراہی کی نسبت سے اس کا جائزہ تو وہ بھی اس لئے غیرضروری ہے کہ قطعہ بجنسہ خود موجود ہے۔ تاریخ گوئی کے فن سے میں واقف نہیں اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ جو اعداد نکالے گئے ہیں وہ صحیح ہیں یا نہیں۔ سردست مقصد اس قطعے کو محفوظ کرنا ہے۔ اس کی افادیت مسلّم ہے۔ اگر کوئی اور ذریعہ موجود نہ ہو تو اس قطعے کی مدد سے مولانا فراہی کے سوانح و حالات زندگی سے متعلق کئی باتیں معلوم کی جاسکتی ہیں

نقل مطابق اصل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قطعہ تاریخ انتقال پر ملال جناب مولانا مولوی حمیدالدین صاحب بی۔اے
ناظم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڑھ
از عبدالرحمٰن ابن ابراہیم سیٹھ صاحب فیتوالے رئیس کورلا۔ متصل بمبئی

عالم دیں، متقی پرہیزگار | جن کو سب کہتے حمیدالدین ہیں
جو مفسر ہیں کلام اللہ کے | جو مصنف قابل تحسین ہیں
جنکے علم و فضل کے قائل ہیں سب | جو ہمارے رہنمائے دین ہیں
آہ۔ وہ دنیا سے رحلت کر گئے | اسلئے ہم لوگ سب غمگین ہیں
یاد میں احباب روتے ہیں لہو | سب کے دامن خون میں رنگین ہیں
عالمان عصر ہیں سب بیقرار | عابدان دہر سب غمگین ہیں
دیکھ کر یہ حال ہاتف نے کہا | کس لئے مغموم اہل دین ہیں
مولوی صاحب بفضل کردگار | خلد میں باعزت و تمکین ہیں
ہے شہیدوں کی جماعت ہمرکاب | ہمنشیں زہاد و صدیقین ہیں
ہاں اگر ہے فکر تاریخ وفات | ہم کئے دیتے تجھے تلقین ہیں

تو یہ کہہ دے جنت الفردوس میں | مولوی صاحب حمیدالدین ہیں

۹۳۴   ۴۱۵

۴۹   ۱۳۴۹ھ

منشی عطا بیگ از ابراہیم پورہ کورلا

ڈاکٹر صابر آفاقی

انشاء، مکتوب، رسالہ، کتاب، نوشتہ، ورقہ، دستور اور نامہ خط کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ انشاء عربی لغت ہے جس کے معنی غیاث اللغات نے "پیدا کرنا اور اپنی طرف سے کچھ کہنا" دیئے ہیں۔ اشرف اللغات لکھتا ہے "فارسیاں ایں را بمعنی عبارت و طرز تحریر استعمال کنند۔ در فرہنگہای زبان اردو انشاء بمعنی لکھا جانا، کسی کے احوال لکھنا، پیدا کرنا، قائم کرنا آمدہ است"۔

سبھی جانتے ہیں کہ خط کے لئے عام مروجہ لفظ نامہ ہے اور نامہ فارسی میں اس کاغذ کو کہتے ہیں جو کسی کو لکھا جائے۔ مگر اس وقت ہمارا موضوع گفتگو وہ خط اور نامہ ہے جو مسلم سلاطین کے عہد میں عموماً اور سلاطین ہند کے دور میں خصوصاً مروّج تھا۔ اسلام میں نامہ نگاری کا آغاز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان مکاتیب سے ہوا جو آپ نے بعثت کے بعد جزیرہ نمائے عرب کے ہمسایہ غیر مسلم بادشاہوں کو بھیجے۔ یہ مکاتیب فصاحت و بلاغت، اختصار، جامعیت اور اثر آفرینی کے اعتبار سے بے نظیر سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں قلم اور اس کی تحریر کی قسم کھائی گئی ہے اس سے نامہ نویسی و انشاء پردازی کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جب اسلامی قلمرو کی حدود وسیع ہوئیں تو فرماں روایان اسلام دور دراز کی ولایات اسلامیہ میں متعین گورنروں اور نائبوں کو وقتاً فوقتاً تحریری ہدایات بھیجنے لگے، اس

طرح اسلامی سیکرٹریٹ وجود میں آیا جس میں منشی اور قاصد وغیرہ کے عہدے قائم کئے گئے۔ اب اسلامی دفاتر میں قلم، قرطاس، مداد، مہر، دفتر، کی اصطلاحیں برتی جانے لگیں۔ اور یوں نامہ نگاری نے ایک مستقل ادارہ کی حیثیت اختیار کر لی۔

ایران میں نامہ نگاری و نامہ رسانی کا رواج ظہور اسلام سے پہلے موجود تھا جب پرچم اسلام سرزمین کیانی پر لہرانے لگا تو یہاں کے سلاطین نے سامانی دور سے لے کر قاچاری دور کے آخر تک نامہ نگاری کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ ایرانی ادیبوں اور عالموں نے فن نامہ نویسی و دبیری پر بیسیوں کتابیں تالیف کیں۔ ان تالیفات میں منشی و دبیر کے اوصاف اور نامہ نویسی کے شرائط و آداب درج ہوئے۔ اب نامہ نگار کے لئے منشی، دبیر، کاتب، نویسندہ اور مستوفی کے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ فارسی کتابوں میں ایک مستقل باب دبیری پر مخصوص ہونے لگا۔

فن نامہ نویسی پر ایرانی مصنفین کی جو تصانیف ہمیں ملتی ہیں ان میں سے چند اہم کتابیں یہ ہیں۔

۱۔ چہار مقالہ۔ نامہ نویسی کے فن پر یہ پہلی فارسی کتاب ہے جسے نظامی عروضی (متوفی ۵۵۱ھ) نے تالیف کیا اس کا ایک مقالہ فن دبیری پر ہے۔

۲۔ قابوس نامہ۔ اس کا مؤلف عنصر المعالی کیکاؤس ہے۔ قابوس نامہ کا انتالیسواں باب دبیری و نامہ نویسی کے قواعد و ضوابط کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

۳۔ سیاست نامہ۔ نظام الملک کی اس تالیف کا پندرھواں باب آئین دبیری سے متعلق ہے۔

۴۔ التوسل الی الرسل۔ یہ کتاب بہائی بغدادی کی تالیف ہے اس کے شروع میں نامہ نویسی پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

۵۔ نفائس الفنون۔ محمد بن محمود آملی (متوفی ۷۲۵ھ) اس کا مؤلف ہے۔ کتاب کا ایک باب فن نامہ نویسی سے مخصوص ہے۔

۶۔ دستور الکاتب۔ اس کا مؤلف محمد بن ہندو شاہ ہے اور یہ ۷۵۵ھ۔۷۶۰ھ کے درمیانی عرصہ میں قلم بند ہوئی۔

۷۔ صحیفۂ شاہی۔ حسین واعظ کاشفی (متوفی ۸۸۶ھ) کی اس تالیف میں خط لکھنے کے فن پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

۸۔ مخزن الانشاء۔ یہ بھی مؤلف مذکور ہی کی تالیف ہے۔ اس میں ادبی انشاء پر تفصیل ملتی ہے۔

فن نامہ نگاری کی مقبولیت و رونق کا زیادہ تر انحصار حکومت کے استحکام، علم و ادب کی فراوانی، منشیوں کی حوصلہ افزائی اور روابط کی رنگا رنگی پر ہوتا ہے۔ جب برصغیر پاک و ہند میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو یہاں کے مسلم سلاطین کو خط و کتابت اور مراسلت کی ضرورت پیش آئی۔ اس کے بعد مغل بادشاہوں کے عہد میں مکاتبت کو اور فروغ حاصل ہوا۔ ان حکومتوں نے مستقل سیکرٹریٹ قائم کیا جسے ادارۂ دیوان کہا جانے لگا۔ زیر نظر ادوار میں سرکاری زبان فارسی تھی۔ لہٰذا دربار سے وابستہ مسلم و غیر مسلم منشیوں نے اس فن پر فارسی میں متعدد بلند پایہ کتب یادگار چھوڑیں۔ ہم یہاں ان تصانیف میں سے چند ایک کا مختصر تعارف ضروری سمجھتے ہیں۔

۱۔ اعجاز خسروی۔ اس کے مؤلف مشہور شاعر حضرت امیر خسرو (متوفی ۷۲۵ھ) ہیں۔ کتاب کے ابتدائی چار ابواب میں دبیری و انشاء پردازی پر بحث کی گئی ہے۔

۲۔ مناظر الانشاء۔ یہ عماد الدین محمود گاواں (متوفی ۸۸۶ھ) کی تالیف ہے۔ جس میں مکتوب نگاری پر مفصل اور مفید بحث کی گئی ہے۔

۳۔ خود کاشت۔ ملا طغرائے مشہدی نے اس تالیف میں کتابت و نامہ نویسی

کے اسرار و رموز اور قواعد و ضوابط سمجھائے ہیں۔

۴۔ داد سخن۔ یہ خان آرزو (متوفی ۸۰۹ ھ) کا رسالہ ہے۔ اور اس میں خط لکھنے کے طریقے لکھے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں حکیم یوسی کی بدیع الانشاء، ابوالقاسم خان تمکین الحسینی کی منشات، ہرکرن ملتانی کی انشائے ہرکرن، محمد صالح کنبوہ لاہوری کی بہار سخن، چندر بھان برہمن کی منشات برہمن، شاہ فخر قنوجی کی جامع القوانین، شیر علی لاہوری کی انشائے فیض بخش، محمد امین کی مجمع الانشاء، مولانا کمال الدین محمد کی رقعات خاتم الکلام، اور منشی شیخ یار محمد قلندر کی دستور الانشاء مکتوب نگاری کے فن پر مشہور تالیفات ہیں۔ جن دبیروں نے مستقل تالیفات یادگار نہیں چھوڑیں اُن کے مکاتیب موجود ہیں۔ اس سلسلے میں اکبر کے چیف سیکرٹری ابوالفضل علامی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ "مکاتبات علامی" اور "رقعات ابوالفضل" نامہ نویسی میں اس کی قابلیت و مہارت پر شاہد عادل ہیں۔ اس ضمن میں ملاّ عبدالکریم کشمیری کی مثال بھی دی جا سکتی ہے جو نادر شاہ کا سیکرٹری اور پھر وزیر اعظم رہا۔ مندرجہ بالا تالیفات میں دبیر و نامہ نویس کی جو خصوصیات درج کی گئی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ چاہیئے کہ دبیر کریم الاصل دقیق النظر، عمیق الفکر اور صائب الرائی ہو، اسے ادب سے حصّہ وافر ملا ہو۔ وہ قیاسات منطقی سے بیگانہ نہ ہو اور وہ ابنائے زمانہ کے مراتب جانتا ہو۔

۲۔ نامہ نگار کو چاہیئے کہ وہ استعمال لغات کے قواعد اور ترکیب کلمات کے طرز سے آشنا ہو۔

۳۔ کاتب نگارش کی اغلاط سے پرہیز کرے اور ادراک معانی کے لئے کسی پیچیدہ و مشکل روش کو نہ اپنائے۔

۴۔ خط میں منطقی ترتیب موجود ہو۔ مقدمات و نتائج میں علت و معلول کا تعلق

برقرار رکھا جائے۔

۵۔ منشی کا خیال مرتکز ہو، تاکہ خط میں پراگندگی راہ نہ پائے۔

۶۔ نویسندہ معانی بکر اور ترکیبات نو کا استعمال خوب جانتا ہو۔

۷۔ مکتوب کے الفاظ کم ہوں اور معانی زیادہ۔ چونکہ خط اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے ہوتا ہے لہذا سخن غامض سے احتراز کیا جائے۔

۸۔ خط کو استعارات، آیات قرآنی اور احادیث رسولؐ سے مزین کیا جائے۔

اب آئیے اسلامی عہد کے خطوط کی اقسام پر ایک نظر ڈالیں۔ سبھی ممالک اسلامی کے خطوط کا جائزہ پیش کرنا ممکن نہیں۔ اس وقت ہم انہی مکاتیب پر گفتگو کریں گے جو سلاطین ہند اور ان کے منشیوں کی طرف سے لکھے گئے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مغل بادشاہ خود شاعر، ڈائری نویس، علم کے دلدادہ اور عالموں کے سرپرست تھے۔ ان کے عہد حکومت میں درجنوں بلند پایہ کاتب و نامہ نویس پیدا ہوئے۔ اور بیسیوں کتابیں اس فن پر لکھی گئیں۔

مسلم شاہان ہند کے مکاتیب کو سلطانیات اور اخوانیات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سلطانیات سے مراد ایسے خطوط ہیں جو سلاطین و امرا کی طرف سے ان کے ہم پایہ یا ماتحت شخصیتوں کو بھیجے جاتے تھے۔ اخوانیات میں وہ خطوط آتے ہیں جو لوگوں کے مختلف طبقات آپس میں ایک دوسرے کو لکھتے تھے۔

سلطانیات میں خطوط کی یہ دس اقسام شامل ہیں:۔

۱۔ فرمان ۔ وہ خط جو بادشاہ کی طرف سے شاہزادے یا کسی بڑے مرتبہ کے کسی افسر کو لکھا جاتا۔

۲۔ نشان ۔ ایسا خط، نشان کہلاتا تھا جو خاندان سلطنت کے کسی فرد کی طرف سے بادشاہ کے علاوہ کسی اور کو لکھا جاتا۔

۳۔ عرضداشت ۔ ایسا خط جسے شاہزادہ یا کوئی اور آدمی بادشاہ کے حضور بھیجتا یا شخصاً پیش کرتا ۔

۴۔ فتح نامہ ۔ گورنر کی طرف سے بادشاہ کو بھیجا جانے والا خط فتح نامہ کہلاتا تھا ۔

۵۔ حسب الحکم ۔ یہ وہ خط ہے جسے وزیر اپنی طرف سے مگر بادشاہ کے حکم سے تحریر کرتا ۔

۶۔ رمز ۔ ایسی عبارت یا جملہ جسے بادشاہ کاغذ پر لکھ کر اپنے سیکرٹری کو دے دیتا پھر سیکرٹری اس رمز کی روشنی میں خط مکمل کر کے متعلقہ آدمی کو ارسال کر دیتا ۔

۷۔ سند ۔ گورنر وغیرہ کی تقرری کا آرڈر سند کہلاتا تھا ۔

۸۔ دستک ۔ تجار کو سامان تجارت لانے لے جانے کے لئے جو پروانہ راہداری دیا جاتا ۔ اسے دستک کہتے تھے ۔ دربار یا فوجی چھاؤنی میں کسی کے وارد ہونے کے اجازت نامہ کو بھی دستک ہی کہا جاتا تھا ۔

۹۔ رقعہ ۔ سبھی سرکاری خطوط خاص طور سے مختصر خط کو رقعہ کہتے تھے ۔

۱۰۔ محضر ۔ کسی مقدمہ کی وہ مفصل رپورٹ جو بادشاہ یا گورنر کو پیش کی جاتی ۔

ان دس اقسام کے علاوہ اسلامی عہد میں عہد نامہ، تہنیت نامہ اور تعزیت نامہ وغیرہ کا رواج بھی رہا ہے ۔ مغلوں کے عہد میں منشیوں نے خط اور فرمان حکومت کو ایک مشکل اور پیچیدہ فن بنا دیا تھا ۔ اس دور کے فرامین تقرری میں جن باتوں کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا اس کے اعتبار سے خط کے چھ اجزا ہوتے تھے ۔

(الف) ۔ خدا کی حمد و ثناء

(ب) ۔ نبی اکرمؐ پر درود و سلام ۔

(ج) ۔ کسی خاص ہنر کی اہمیت کا اظہار ۔

(د) ۔ ان افراد کی تعریف جو کسی خاص ہنر و فن میں مہارت رکھتے ہوں ۔

(ھ) ۔ اس آدمی کا ذکر جس کے نام فرمان جاری کیا جا رہا ہو ۔

(و)۔ ہنرمند کے لئے سفارش۔

جب ۱۸۵۷ء میں آخری مغل حکمران کے سر سے تاج سلطنت برطانیہ کے اٹھائی گیروں نے اچک لیا تو پھر نہ وہ دربار رہا نہ وہ دبیر، نہ جلال بادشاہی رہا نہ انشا پردازوں کا ٹھاٹھ باٹھ۔ اب خط کون لکھتا اور کسے لکھا جاتا۔ انگریزی کے آنے سے خط وکتابت کا نیا نظام شروع ہوا جو آج تک ہمارے سرکاری و نیم سرکاری دفتروں اور محکموں میں جاری ہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد خط لکھنے کی صدیوں پرانی اسلامی روایت ختم ہوگئی۔ مگر برصغیر کے درجنوں مسلم والیان ریاست کے ہاں قدیم مراسلت کا سکّہ ہی رواں رہا۔ مسلم بادشاہت کا پرچم سرنگوں ہوا تو مرزا غالب جیسے آزادہ و خود بیں درویشوں نے اپنے دوستوں کو حکایات خوں چکاں لکھنے کی غرض سے خط لکھنے کی نئی طرح ڈالی۔ پھر تو برصغیر پاک و ہند کے ہر بڑے شاعر و ادیب اور مؤلف و محقق نے اُردو میں ہزاروں مکاتیب لکھے جو ہمیشہ ادب کی جان اور ہمارے ماضی کے ترجمان رہیں گے۔

کسبِ حلال

عبدالرحیم اشرف بلوچ

آج ہمارا معاشرہ جس اخلاقی انحطاط کا شکار ہے اس کا اگر فوری سدباب نہ کیا گیا تو ایک دن ہمیں ناقابل حل مشکلات کا سامنا کرنے پڑے گا اور اس وقت اصلاح احوال کے لئے بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک لمحہ ضائع کئے بغیر نہایت سنجیدگی سے معاشرتی خرابیوں کا جائزہ لیں اور ان کو دور کرنے کی دیانت دارانہ کوشش کریں۔ ان معاشرتی اور سماجی برائیوں میں سے ایک راتوں رات دولت مند بن جانے کی ہوس ہے اور وہ بھی بغیر کسی محنت اور مشقت کے۔ معیار زندگی کو بلند کرنے کی دھن ہر شخص کے ذہن پر اس طرح سوار ہے کہ وہ بلا امتیاز حلال وحرام ہر جائز و ناجائز ذریعے سے حصول مال و زر میں مگن ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے قومی و ملی مفادات تک کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ آج کا انسان جس فضا میں سانس لے رہا ہے وہ خود غرضی، حرص و ہوس اور زر پرستی جیسی، برائیوں سے آلودہ ہے جو اس کے کردار کو بگاڑنے کے ساتھ ساتھ قوم کو مجموعی طور پر بھی ناکارہ بنا رہا ہے۔

یہ درست ہے کہ اسلام نے حصول رزق اور مال و دولت جمع کر کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوئی ممانعت نہیں کی اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی ناروا پابندی لگائی ہے بلکہ

اس کے برعکس ہر شخص کو اس کرۂ ارض پر وسائل رزق سے پورا پورا استفادہ کرنے کا حق دیا ہے۔
قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هو الذي جعل لكم الارض ذلولاً فامشوا في مناكبها وكلوا من رزقه۔ (الملك: ١٥)

وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو نرم بنا دیا پس تم اس کے اطراف میں چلو پھرو اور خدا کی دی ہوئی رزق سے کھاؤ۔

اگر غور کیا جائے تو اسلام نے جہاں ایک طرف ہر فرد کو بنیادی ضروریات زندگی حاصل کرنے کا نہ صرف حق دیا ہے بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی بجائے محنت وجدوجہد سے رزق حاصل کر کے خود بھی کھاؤ اور دوسروں کو بھی کھلاؤ۔ اسلام نے انسانوں کے لئے ایک ایسا معاشی نظام بھی پیش کیا ہے کہ جس میں ہر فرد کے لئے معاشی تحفظات کے قواعد و ضوابط واضح طور پر موجود ہیں۔

اس معاشی نظام کو صحیح طور پر اپنایا جائے تو معاشرہ کا کوئی فرد فقر و فاقہ میں مبتلا نہیں رہ سکتا۔ اس نظام میں اصحاب ثروت سے زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات کے ذریعے مال لے کر فقراء و مساکین پر خرچ کیا جاتا ہے جس سے معاشرہ میں دولت پرستی کی لعنت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ زر پرستی اور ہوس مال و دولت تب پیدا ہوتی ہے جب کچھ لوگ دولت کو گردش سے روک کر دوسروں کو اس سے محروم کر دیں۔ یہ احساس محرومی ضرورت مند کو پھر ناجائز ذرائع اپنانے پر اکساتی ہے جس سے خود بخود معاشرہ میں خرابیاں جنم لینے لگتی ہیں۔

ہمارے معاشرے میں جو خرابیاں ہیں ان کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہم نے اسلامی نظام حیات کو کہ اسلامی معاشی نظام جس کا ایک جزو ہے اختیار کرنے میں بہت سے قیمتی سال ضائع کر دیئے ہیں اور اب جبکہ اس طرف کچھ پیش رفت ہو رہی ہے کچھ لوگ ابھی تک ہچکچا رہے ہیں حالانکہ اب مزید انتظار اور پس و پیش کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اسلامی تعلیمات کا ایک اہم جزو ہے کسب حلال اور اکل حلال یعنی حلال کمانا

اور حلال کھانا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

یا ایھا الناس کلوا مما فی الارض حلالا طیباً۔ (بقرۃ: ۱۶۸)

اے لوگو زمین میں سے حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔

اسلام اپنے پیروکاروں کو حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم دیتا ہے اور حرام خوری سے منع کرتا ہے۔ حلال چیزوں سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ جو چیزیں حلال قرار دی گئی ہیں وہ اب ہمارے لئے ہر لحاظ سے حلال ہیں چاہے ہم انہیں جس طرح بھی حاصل کریں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حلال اور پاکیزہ چیزیں بھی ہمارے لئے تب ہی حلال ہوں گی جب ہم جائز طریقے سے انہیں حاصل کریں۔ ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ چیز بھی حرام ہو جاتی ہے۔ اسلام ہمیں کسب حلال اور اکل حلال کا حکم دیتا ہے اور حرام کمائی سے سختی سے منع کرتا ہے۔ ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ مال و دولت اسی طرح حرام ہے جس طرح شراب۔ لحم خنزیر اور دوسری ناپاک چیزیں حرام اور ممنوع ہیں۔

آئیے آئندہ سطور میں حصول رزق کے چند ایک ناجائز ذرائع کا جائزہ لیتے ہیں جس سے حلال اور پاکیزہ چیزیں بھی حرام ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارا معاشرہ جن برائیوں میں مبتلا ہے ان میں ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، کم تولنا۔ رشوت خوری، کام چوری اور اپنے اختیارات کا بے محل استعمال چند ایک ہیں۔ اسلام ان ذرائع سے حاصل شدہ رزق کو نہ صرف ناجائز قرار دیتا ہے بلکہ ان برائیوں کے مرتکب افراد کے لئے سخت وعیدیں اور سزائیں بھی بیان کرتا ہے۔

ملاوٹ: کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کر کے اپنی تجوریاں بھرنا ایک انتہائی خطرناک خودغرضانہ فعل ہے یہ فعل خطرناک اس طرح ہے کہ ملاوٹ شدہ اشیاء کے استعمال سے انسانی صحت پر برے اور بعض اوقات مہلک اثرات پڑتے ہیں۔ لوگ ملاوٹ والی چیزیں استعمال کر کے کئی طرح کی جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی مر بھی جاتے ہیں

اکثر اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں جگہ کچھ لوگ زہریلی غذا کھانے یا مشروب پینے سے ہلاک ہوگئے۔ اس طرح صرف ایک شخص کی خودغرضی سے کئی قیمتی انسانی جانیں ضائع ہو جاتیں ہیں۔ یہ فعل ملاوٹ کرنے والے کی گھٹیا ذہنیت اور خودغرضانہ کردار پہ دلالت کرتا ہے ایسا شخص حقیقت میں ایک قاتل سے کسی طرح کم مجرم نہیں ہے۔ رسول اللہ نے ایسے شخص کو مسلمانوں کی جماعت سے خارج قرار دیا ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال مر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برجل یبیع طعامًا فأدخل یدہ فاذا ھو مغشوش فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس منا من غش ۔

(سنن ابن ماجہ۔ کتاب التجارات باب ۳۶)

حضرت ابوہریرۃ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک شخص کے پاس ہوا جو طعام فروخت کر رہا تھا۔ آپ نے اپنا ہاتھ اس میں داخل کیا تو وہ غذا ملاوٹ والی نکلی اس پر آپ نے فرمایا "ہم میں سے نہیں جو ملاوٹ کرتا ہے"۔

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر علی صبرۃ من طعام فأدخل یدہ فیھا فنالت اصابعہ بللا فقال یا صاحب الطعام ما ھذا ؟ قال اصابتہ السماء یا رسول اللہ قال افلا جعلتہ فوق الطعام حتی یراہ الناس ثم قال من غش فلیس منا ۔

سنن ترمذی، کتاب البیوع باب ۷۲

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غذا کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے اور آپ نے اپنا ہاتھ اس میں داخل کیا تو آپ کی انگلیوں کو نمی محسوس ہوئی آپ نے اس کے مالک سے پوچھا کہ یہ کیا ہے اس نے جواب دیا یا رسول اللہ یہ نمی بارش میں بھیگنے کی وجہ سے ہے۔ آپ نے فرمایا پھر تو نے اسے اوپر کیوں نہ رکھا کہ (خریدنے سے پہلے) لوگ اسے دیکھ لیتے۔ پھر آپ نے فرمایا جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اس دوسری حدیث سے تو یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اپنی طرف سے ملاوٹ تو دور کی بات ہے اگر کسی آسمانی یا ناگہانی آفت کی وجہ سے غلہ وغیرہ خراب ہو جائے تو غلے کے مالک کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اوپر اوپر تو صاف ستھرا مال رکھ دے اور اس کی آڑ میں نیچے خراب مال رکھ کر فروخت کرے۔

<u>ذخیرہ اندوزی</u> :۔ ناجائز طریقے سے دولت کمانے کا ایک ذریعہ ذخیرہ اندوزی ہے۔ یہ ایک

سنگدلانہ اور مبنی بر خود غرضی فعل ہے جو ایک صحت مند معاشرے کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔ اس سے معاشرے میں بے چینی پھیلتی ہے اور فتنہ و فساد کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ کیونکہ اس طرح ایک طرف تو اشیاء کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں اور دوسری طرف لوگوں کے لئے سہولت سے اشیاء ضروریہ کا حصول ناممکن بن جاتا ہے۔ لوگوں کو جب ضروریاتِ زندگی میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ان میں بغاوت و سرکشی کے جذبات پروان چڑھنے لگتے ہیں جن کا اگر تدارک نہ کیا جائے تو یہ جذبات آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح نکل کر ملک کا امن و چین غارت کر دیتے ہیں۔

ذخیرہ اندوزی کرنے والا انتہائی سنگدل اور بے رحم ہوتا ہے۔ اس کی بے رحمی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو کہ وہ لوگوں کو بنیادی ضروریات کی چیزوں کے لئے سرگرداں دیکھے اور اپنے پاس ان اشیاء کو ذخیرہ کر کے خزانے کے روایتی سانپ کی طرح ان پر پہرہ لگائے بیٹھا رہے رسول اللہ نے ایسے شخص کے لئے دنیا و آخرت میں سزا و عذاب کی وعید سنائی ہے۔

عن معمر بن عبداللہ بن نضلۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یحتکر الا الخاطئ۔ (سنن ابن ماجہ۔ کتاب التجارات باب ۶)

معمر بن عبداللہ بن نضلہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ذخیرہ اندوزی خطاکار ہی کرتا ہے۔"

عن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من احتکر علی المسلمین طعاماً ضربہ اللہ بالجذام والافلاس (سنن ابن ماجہ کتاب التجارات باب ۶)

حضرت عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا آپ فرما رہے تھے کہ جس نے کھانے پینے کی اشیاء ذخیرہ کر کے مسلمانوں سے روک لیئے اللہ تعالیٰ اسے کوڑھ اور تنگدستی میں مبتلا کر دے گا

<u>کم تولنا</u>:۔ ایک شخص جب اپنی چیز کی پوری قیمت وصول کر لیتا ہے تو پھر اسے کسی طرح بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس چیز کو پورا پورا خریدنے والے کے حوالے کرنے سے گریز کرے بلکہ اسے چاہیئے کہ جس طرح اس نے اس چیز کا معاوضہ پورا کا پورا لے لیا ہے اسی طرح اب وہ اس چیز کو دوسرے کی

امانت سمجھے اور کسی قسم کے خیانت کا ارتکاب کئے بغیر دوسرے کے حوالے کر دے جواب اس کا حقیقی مالک ہے۔ جو شخص کم تولتا ہے یا ناپتا ہے وہ حقیقت میں بد دیانتی کا مرتکب ہوتا ہے اور اس طرح ناجائز ذریعے سے اپنی کمائی میں حرام کی آمیزش کر کے اپنے اوپر برکتوں کا دروازہ خود ہی بند کر دیتا ہے ایسے شخص کے لئے قرآن کریم نے ہلاکت و بربادی کی وعید سنائی ہے۔

ویل للمطففین○ الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون ○ واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون○ الا یظن اولٰئک انھم مبعوثون ○ لیوم عظیم○ یوم یقوم الناس لرب العالمین ○ (مطففین: ۱-۶)	خرابی ہے گھٹانے والوں کی جب خود ماپ لیں لوگوں سے تو پورا بھر لیں اور جب لوگوں کو ماپ دیں یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ اٹھائے نہیں جائیں گے ایک بڑے دن کے لئے کہ جس دن لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے تمام جہانوں کے رب کے سامنے جوابدہی کے لئے)

ایسے لوگ کیوں نہ ہلاکت و بربادی کو دعوت دیں جبکہ ان کے افعال دوسروں کے لئے خرابی و پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے لوگوں نے درحقیقت انصاف کا دوہرا معیار قائم کیا ہوتا ہے۔ وہ خود تو ناپ تول کے وقت پورا پورا تولتے اور ناپتے ہیں جبکہ دوسروں کے لئے کم تولتے اور ناپتے ہیں۔ یہ لوگ ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں قیامت کے دن خدا کے حضور پیش ہو کر جوابدہی کا یقین نہیں ہوتا ورنہ اگر وہ صحیح مسلمان ہوں اور انہیں یہ احساس ہو کہ انہیں ایک دن رب العالمین کے دربار میں پیش ہونا ہے تو وہ کبھی ایسا نہ کریں۔

<u>رشوت خوری</u> :۔ ہوس زر کی تسکین کی ایک صورت رشوت خوری ہے مگر یہ ایک ایسی قبیح اور شنیع برائی ہے کہ اس کی عادت سے تسکین حاصل ہونے کے بجائے خواہشات کی آگ مزید بھڑکتی چلی جاتی ہے۔ اس لعنت سے معاشرہ میں سے اعتماد و بھروسہ اور اخوت و مودت جیسی بیش بہا صفات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور معاشرے میں خود غرضی اور زر طلبی کی وبا بڑی تیزی سے پھیل کر اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ ایسا معاشرہ کسی وقت بھی ہلاکت و بربادی سے دوچار ہو سکتا ہے۔
رشوت بہت سے جرائم کا مجموعہ ہے یہ بد دیانتی، حق تلفی، ناانصافی، خود غرضی اور بدامنی

پھیلانے جیسے ناقابل معافی جرائم پر مشتمل ہوتا ہے۔ عام طور پر رشوت دو صورتوں میں لیا جاتا ہے ایک یہ کہ کسی شخص کا ناجائز کام کر دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ کسی شخص کا جائز کام روک دیا جائے تاکہ وہ مجبور ہو کر رشوت دے اور اپنا کام جلدی کرائے پہلی صورت میں ایک آدمی کو ناجائز فائدہ پہنچانے کا مطلب کسی دوسرے شخص کے جائز مفاد کو زک پہنچا کر اس کی حق تلفی کرنا ہے۔ اس ناانصافی سے معاشرے میں نفرت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں جو قومی وحدت کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔ دوسری صورت میں کسی کا جائز کام روک دیا جاتا ہے اور اس میں بلاوجہ تاخیر کی جاتی ہے یا اس پر ناروا اور لایعنی اعتراضات کر کے اس آدمی کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ کچھ دے دلا کر اپنا کام کروائے۔ سرکاری دفاتر میں عموماً یہی ہوتا ہے۔ یہ دوہرے قسم کا جرم ہے اس لئے کہ ایک طرف تو ایسا شخص بددیانتی کا مرتکب ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ انہی امور کی انجام دہی کے لئے ہی تو گورنمنٹ یا کسی ادارہ سے تنخواہ لیتا ہے اب اگر وہ بلاوجہ تاخیر کر دیتا ہے تو وہ حقیقت میں ادھورا کام کر کے اس کا معاوضہ پورا لیتا ہے دوسری طرف وہ ایک شخص کے جائز کام میں مداخلت کر کے اور رکاوٹ پیدا کر کے اخلاقی اور قانونی جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ لبعض اوقات تو اس سے بڑے بڑے ملکی مفادات تک کو نقصان پہنچتا ہے۔ کیونکہ ایسی رکاوٹوں سے پیدا شدہ تاخیر کی وجہ سے قومی اور ملکی ترقی کے لئے شروع کئے گئے منصوبے ناقابل تلافی نقصان کی نذر ہو جاتے ہیں

ہمارا معاشرہ اس وقت تک اسلامی نہیں کہلا سکتا جب تک کہ رشوت کا مکمل طور پر خاتمہ نہ کر دیا جائے اور ہم اس وقت تک سچے مسلمان نہیں بن سکتے جب تک کہ ہم رشوت دینے اور لینے سے باز نہ آ جائیں۔ اللہ اور اس کے رسول نے رشوت کے کاروبار سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

ولا تأكلوا اموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها الى الحكام لتأكلوا فريقاً من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون۔

(بقرۃ : ۱۸۸)

اور نہ کھاؤ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق اور (بطور رشوت) نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک کہ (اس کے ذریعے) تم ناجائز طور پر لوگوں کا کچھ مال ہڑپ کر جاؤ اور تم جانتے ہو۔

رسول اکرمؐ فداہ روحی صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

عن عبداللہ بن عمرو قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی

(مسند احمد بن حنبل ج ۲: ۱۶۴)

حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے اور لینے والے پر لعنت کی ہے۔

عن عمرو بن العاص قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ما من قوم یظھر فیھم الربا الا اخذوا بالسنة وما من قوم یظھر فیه الرشا الا اخذوا بالرعب۔

(مسند احمد بن حنبل ج ۴: ۲۰۵)

حضرت عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس قوم میں سود رواج پا جائے گا اللہ تعالیٰ اسے قحط میں مبتلا کر دیں گے اور جس قوم میں رشوت عام ہو جائے اللہ تعالیٰ اس پر رعب طاری کر دیتا ہے۔

رشوت چاہے کسی بھی نام سے لی یا دی جائے وہ رشوت ہی ہے نام بدلنے سے وہ حلال نہیں ہو سکتا۔ چاہے اسے تحفہ کہہ کر پیش کیا جائے یا مٹھائی کہہ کر لی جائے ہر حالت میں وہ رشوت ہے۔ بخاری شریف میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا قول منقول ہے۔ وقال عمر بن عبدالعزیز کانت الھدیة فی زمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھدیة والیوم رشوة۔ (صحیح بخاری کتاب الھبة باب ۱۱) حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تحفہ، تحفہ ہی ہوا کرتا تھا مگر آج کے دور میں یہ رشوت ہی ہے۔ (اس تحفہ سے مراد وہ تحفہ ہے جسے کسی غرض سے کسی صاحب اختیار کو پیش کیا جائے)۔

اختیارات کا غلط استعمال:۔ ملازم پیشہ طبقہ میں جو لوگ کچھ نہ کچھ اختیار رکھتے ہیں وہ عموماً اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے قوم و ملک کے قیمتی سرمائے کو گھن کی طرح چاٹ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے منصوبے اکثر اوقات اسی وجہ سے ناکام ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے لئے فراہم کردہ عطیہ افسران کی آرام و آسائش پر خرچ ہو جاتا ہے۔ اگر کسی افسر کو یہ سہولت ملی ہوئی ہے کہ وہ سرکاری یا دفتری امور کی انجام دہی کے لئے حکومت کی طرف سے فراہم کردہ گاڑی استعمال کر سکتا ہے تو

دیکھا یہ گیا ہے اسے وہ صاحب اپنی نجی ضرورتوں کے لئے بھی استعمال کرتا ہے۔ بیگم کو شاپنگ کرانی ہو یا دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح یا اور کوئی خالصتاً ذاتی نوعیت کا کام ہو سرکاری گاڑی استعمال کی جاتی ہے۔

اسی طرح اگر کسی کو کوئی اور سہولت حاصل ہے تو وہ ہر طرح سے کوشش کرتا ہے کہ اس سے جائز و ناجائز مفاد حاصل کرے۔ یہ قطعاً ناجائز اور حرام ہے ملک و قوم کے سرمائے کو اس طرح ضائع کرنے کی کسی کو اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے دوسروں میں بھی مفاد پرستانہ خیالات جنم لیتے ہیں اور دیکھا دیکھی میں دوسرے لوگ بھی اسی راہ پر چل نکلتے ہیں۔

کام چوری :- محنت و مشقت سے جو قومیں جی چراتی اور سہل پسند بن جاتی ہیں وقت کی تلوار انہیں نیست و نابود کر دیتی ہے یہی قانون فطرت ہے اور تاریخ سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔ لگن اور محنت سے کام نہ کرکے وقت ضائع کرنا نہ صرف فرد کے لئے نقصان دہ ہے بلکہ اس سے قوم و وطن کو بھی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ دفتروں میں عموماً یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اہل کار بیٹھے گپیں ہانک رہے ہیں۔ چائے نوشی کی جا رہی ہے۔ یا کسی اور طرح وقت برباد کیا جا رہا ہے جبکہ اصل کام جو کرنے کا ہے یونہی پڑا ہوا ہے۔ اس سے جہاں خود ایسے افراد کی صلاحیتوں کو زنگ لگ جاتا ہے وہیں ملکی و ملی مفادات سستی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرہ میں اس کی قطعاً اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جب ایک شخص اپنے وقت کا جو چھ سات گھنٹے ہیں پورا معاوضہ لیتا ہے اور کام صرف دو ایک گھنٹے کا کرتا ہے اور بعض اوقات کچھ بھی نہیں کرتا تو ایسے شخص کی کمائی کو کیونکر جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ معاشرے کی اصلاح تب ممکن ہو سکتی ہے جب ہر آدمی چاہے وہ مزدور ہو یا کارخانہ دار، افسر ہو یا ماتحت ملازم، اپنے فرائض دیانت داری سے انجام دیں اور اس میں کسی قسم کی سستی اور تساہل کا مظاہرہ نہ کریں۔

ہم اپنے اپنے حقوق کے لئے تو ہر وقت چلاتے رہتے ہیں اور ہماری زبان پر ہر وقت یہ شکوہ

رہتا ہے کہ ہمارے حقوق غصب کیے جا رہے ہیں۔ ہمارے حقوق پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے جبکہ اپنے فرائض سے ہر شخص لاپرواہی برتتا اور کوتاہی کرتا نظر آتا ہے۔ حالانکہ حقوق و فرائض کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فرائض ادا کئے بغیر حقوق نہیں مل سکتے اور حقوق دیئے بغیر فرائض کی صحیح انجام دہی ناممکن ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم ہر وقت اس کلیہ کو مدنظر رکھیں اور فرائض با حسن طریقے سے انجام دیں تاکہ حقوق کا حصول آسان بن جائے۔

اسلام ہمیں محنت اور اپنے ہاتھ سے کمانے کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام نے کام کی عظمت کا درجہ بہت بلند رکھا ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کی کمائی کو سب سے افضل قرار دیا ہے۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال خیر الکسب کسب العامل اذا نصح
(مسند احمد بن حنبل ج ۲ : ۳۳۴)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا بہترین کمائی کمانے والے ہاتھ کی ہے جبکہ کام خلوص سے کیا جائے۔

اس حدیث میں کام کی اور محنت کی عظمت کے ساتھ ساتھ خلوص سے کام کرنے کی تلقین ہے یعنی کام کرنے والا اپنا کام انتہائی دیانت داری سے انجام دے اور سستی سے کام کرکے کام چوری کا مظاہرہ نہ کرے۔

عن رافع بن خدیج قال قیل یا رسول اللہ ای الکسب اطیب قال عمل الرجل بیدہ و کل بیع مبرور۔
(مسند احمد بن حنبل ج ۴ : ۱۴۰)

رافع رضی اللہ عنہ بن خدیج سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا یا رسول اللہ کونسی کمائی سب سے پاکیزہ ہے تو آپ نے فرمایا آدمی کا اپنے ہاتھ سے کمانا اور ہر جائز تجارت۔

عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اطیب ما اکل الرجل من کسبہ
(سنن ابن ماجۃ کتاب التجارات باب اول)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے پاکیزہ کھانا جو آدمی کھاتا ہے وہ اس کی اپنی کمائی ہے۔

عن المقدام بن معدیکرب الزبیدی عن

حضرت مقدام بن معدیکرب روایت کرتے ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ماکسب	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ نے فرمایا
رجل کسبًا اطیب من عمل یدہ	سب سے پاکیزہ کمائی جو ایک شخص کماتا ہے وہ اس کے
(سنن ابن ماجہ کتاب التجارات باب اول)	ہاتھ کی کمائی ہے۔

ان احادیث سے کام کی عظمت اور محنت کا درجہ واضح ہو جاتا ہے۔ دراصل اسلام نہیں چاہتا کہ کوئی شخص بغیر کسی مجبوری کے کام نہ کر کے معاشرہ پر بوجھ بن جائے۔ ایک خوشحال اور فلاحی معاشرہ تب ہی تشکیل پا سکتا ہے جب ہر فرد محنت کرے اور مفت خوری سے دور رہے۔

<u>گداگری</u>:۔ کام سے جی چرانا اور مانگے تانگے پر گذارہ کرنے کی ایک صورت بھیک مانگنا بھی ہے۔ ہمارے ملک میں گداگری کا کاروبار بڑے زوروں پر ہے اور بعض لوگ اسے انتہائی منظم طور پر چلا رہے ہیں۔ گداگری مسلم معاشرے پر ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتی ہے اس سلسلہ میں جہاں حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس لعنت کے خاتمہ کے لئے مؤثر اقدامات کرے وہیں عوام کی طرف سے بھی پیشہ ور بھکاریوں کی مکمل حوصلہ شکنی ہونی چاہیئے۔

اسلام میں اپنی ہاتھ کی کمائی سے اپنی ضروریات پوری کرنے اور اللہ کے راہ میں خرچ کرنے کی بڑی فضیلت اور اہمیت بیان کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگنے اور دست سوال دراز کرنے سے منع فرمایا ہے۔ صدقات و خیرات کے مستحق افراد کی نشانی اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ باوجود احتیاج اور ضرورت کے لوگوں سے لپٹ لپٹ کر نہیں مانگتے۔ ارشاد ہے

یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف تعرفھم بسیماھم، لا یسئلون الناس الحافاً

(البقرہ: ۲۷۳) بلکہ ناواقف شخص انہیں نہ مانگنے کی وجہ سے غنی سمجھ بیٹھتا ہے حالانکہ ان کے چہرے سے پتہ چل جاتا ہے کہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔

اللہ تعالیٰ اغنیاء اور صاحب ثروت لوگوں کو خیرات و صدقات کی تلقین کرتا ہے اور ان کے مستحق انہی لوگوں کو قرار دیتا ہے جو کسی مجبوری کی وجہ سے کما نہیں سکتے یا اس قدر نہیں کما پاتے کہ اپنے اہل و عیال کی ضروریات کو صحیح معنوں میں پوری کر سکیں ایسے لوگ شرم و حیا اور خودداری کی بناء

پر مانگ بھی نہیں سکتے۔ مگر ان کی حالت ان کے چہرے مہرے سے ظاہر ہو جاتی ہے جبکہ پیشہ ور
گداگر صرف مانگنے کی غرض سے مانگتا ہے اور بھیک مانگنا اس کی عادت بن جاتی ہے۔ بہت سے
بھکاری تو بہت مالدار ہوتے ہیں اور بعض کے پس پردہ کئی ایک دولت مند اور با اثر افراد کاروبار
چلا رہے ہوتے ہیں۔ اور ان بھکاریوں کی کمائی اچھی لوگوں کی جیبوں میں چلی جاتی ہے جس سے وہ
عیاشیاں کرتے اور رنگ رلیاں مناتے ہیں اور مال حرام بود درکار حرام رفت کے مصداق اسے
ناجائز جگہوں پر خرچ کر کے معاشرے میں برائی پھیلانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دینے والے ہاتھ کو لینے والے ہاتھ سے افضل قرار دیا ہے
اور کسی مسلمان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ بغیر کسی مجبوری کے دست سوال دراز کر کے لینے
والوں میں خود کو شامل کرے گا۔ بلا ضرورت مانگنے والے کے لئے رسول اللہ نے سخت وعید سنائی ہے

عن عبد اللہ بن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال وھو یخطب الید العلیا خیر من الید السفلی الید العلیا المعطیہ والید السفلی ید السائل (مسند احمد بن حنبل ج ۲: ۹۸)

حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اوپر والا ہاتھ دینے والے اور نیچے والا ہاتھ مانگنے والے کا ہاتھ ہوتا ہے۔

عن ابی ھریرة قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لأن یغدو احدکم فیحتطب علی ظھرہ فیتصدق منه ویستغنی به عن الناس خیر له من أن یسأل رجلاً اعطاہ او منعه ذلک فان الید العلیا خیر من الید السفلی وابدأ بمن تعول۔

(سنن ترمذی کتاب الزکاة باب ۳۸)

حضرت ابو ہریرۃ فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ یہ بہتر ہے کہ ایک شخص جا کر لکڑیاں اپنی پیٹھ پر لاد کر بیچے اور پھر اس میں سے خرچ کرے اور لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے بچ جائے اس سے کہ وہ کسی سے کچھ مانگے اور وہ اسے دے یا نہ دے کیونکہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور اپنے زیر کفالت افراد پر خرچ کرنے میں پہل کرو۔

مفت خوری ایک ایسی عادت ہے کہ اس سے انسانی صلاحیتیں مردہ ہو جاتی ہیں یہ ان کے لئے سم قاتل ہے کیونکہ اس سے تمام اچھے اوصاف رفتہ رفتہ مٹ جاتے ہیں دل مردہ ہو جاتا ہے شرم و حیا ختم ہو جاتی ہے اور آدمی اپنے ماحول کے لئے وبال جان بن جاتا ہے۔ اس لئے بھیک سے حاصل شدہ خوراک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دہکتا ہوا انگارہ قرار دیا ہے۔ جو تمام اوصاف حمیدہ کو جلا کر بھسم کر دیتا ہے۔

عن حبشی بن جنادۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من سأل من غیر فقر فکانما یأکل الجمرۃ۔

(مسند احمد بن حنبل ج ۴ : ۱۶۵)

حضرت حبشی بن جنادہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے بغیر احتیاج اور ضرورت کے سوال کیا گویا وہ دہکتے ہوئے انگارے کھا رہا ہے۔

اسلام صرف اشد ضرورت کہ آدمی کے لئے اور کوئی چارہ کار نہ رہ گیا ہو مانگنے کی اجازت دیتا ہے بغیر مجبوری اور فقر و فاقہ کے مانگنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

عن انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال ان المسئلۃ لا تحل الا لثلاثۃ لذی فقر مدقع او لذی غرم مفظع او لذی دم موجع۔

(مسند احمد بن حنبل ج ۳ : ۱۲۷)

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین آدمیوں کے سوا اور کسی کے لئے مانگنا جائز نہیں ہے ایک وہ آدمی جو شدید فقر و فاقہ میں مبتلا ہو دوسرا وہ آدمی جو قرض کی وجہ سے ذلیل ہو رہا ہو اور تیسرا وہ شخص جس پر خون بہا دینا لازم ہو۔

ان ناگزیر حالات کے سوا کسی بھی ایسے شخص کے لئے مانگنا جائز نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر یقین رکھتا ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی و رہبر تسلیم کرتا ہو۔

عن ابی سعید الخدری عن ابیہ قال سرحتنی امی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابو سعید خدری اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہیں انکی والدہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ مانگنے کے لئے بھیجا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں آپ کے پاس

أسأله فاتيته فقعدت قال فاستقبلني فقال من استغنى اغناه الله ومن استعف اعفه الله ومن استكف كفاه الله ومن سأل وله قيمة اوقية فقد الحف الخ

(مسند احمد بن حنبل ج ۳ : ۹)

آکر بیٹھ گیا تو آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا جس شخص نے خود کو (مال و دولت سے) بے نیاز کردیا اللہ تعالیٰ اسے بے نیاز کردیں گے اور جو شخص خود کو سوال کرنے سے باز رکھے اللہ تعالیٰ اسے (ایسی صورت حال میں مبتلا ہونے سے) بچالیں گے اور جو شخص خود کفیل بننا چاہے گا اللہ اسے خود کفیل بنا دیں گے اور جس نے ایک اوقیہ چاندی کے برابر رقم ہوتے ہوئے سوال کیا تو گویا اس نے الحاف سے کام لیا۔

الحاف کے معنی ہیں کسی سے اصرار کرکے اور لپٹ لپٹ کر مانگنا کہ دوسرا آدمی مانگنے والے کے اصرار سے شرمندہ ہوکر اپنی جان چھڑانے کی خاطر کچھ دے ہی دے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خوبصورت اور حسین بنایا ہے۔ اور اس کے چہرے پر ایک ایسی رونق و تابانی رکھ دی کہ جس کے ذریعے وہ دوسری مخلوقات کو اپنا تابع فرمان بنائے ہوئے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انسانی چہرہ میں ایک طرح کا رعب بھی رکھدیا ہے۔ لیکن جب اسی چہرہ کو دوسروں کے سامنے ذلیل وخوار کرنا شروع کردیا جائے تو اس کی رونق تازگی اور رعب ختم ہوجاتا ہے۔ بھیک مانگنے سے چہرے پر لعنت و پھٹکار برستی رہتی ہے

عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من سأل الناس وله ما يغنيه جاء يوم القيامة ومسألته في وجهه خموش او خدوش او كدوح قيل يارسول اللہ وما يغنيه، قال خمسون درهما او قيمتها من الذهب۔

(سنن ترمذی کتاب الزکاۃ باب ۲۲)

حضرت عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے لوگوں سے سوال کیا اور اس کے پاس اتنا مال ہے جو اسے کافی ہو تو قیامت کے دن اس کا چہرہ مانگنے کی وجہ سے خراش زدہ ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا یارسول اللہ اسے کتنا کفایت کرے گا تو آپ نے فرمایا پچاس درہم یا ان کی قیمت سونے سے

عن سمرة بن جندب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان المسئلة کد یکد بها الرجل وجهه الا ان یسأل سلطاناً او فی امر لا بد منه (سنن ترمذی کتاب الزکاۃ باب)

حضرت سمرۃ بن جندب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ سوال کرنا زخم ہے آدمی اس کے ذریعے اپنے چہرے پر زخم لگاتا ہے الا یہ کہ آدمی حاکم سے سوال کرے یا ایسی حالت میں کہ جس سے چارہ نہ ہو۔

مجبوری کی حالت میں مانگنے کی اجازت ہے یا پھر آدمی اپنے سرپرست اور حاکم وقت سے سوال کر سکتا ہے کیونکہ حاکم وقت بھی ایک طرح سرپرست ہوتا ہے اور اس سے سوال کرنا جائز ہے

حرام کمائی کی مذمت :- ہوس زر اور دولت کی خواہش نے اس معاشرہ کے ہر فرد کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے جس کی وجہ سے آج ہم نے مال و دولت ہی کو ہر مشکل کا حل سمجھ لیا ہے اور اس کے حصول کے لئے تمام اخلاقی اقدار کو بالائے طاق رکھ دیا ہے حالانکہ اسلام کے نقطۂ نظر سے دولت کی حیثیت اخلاق کے مقابلے میں ثانوی ہے۔

ایک حدیث شریف میں تو یہاں تک آتا ہے حب الدنیا رأس کل خطیئة (مشکوۃ شریف) دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔ کیونکہ جسے دنیا اور اس کی زیب و زینت سے محبت ہوگی وہ یقیناً لوگوں کے حقوق دبا کر اور اللہ کے حقوق فراموش کر کے اپنی آخرت بگاڑ لے گا۔ طلب دنیا اور دولت پرستی انہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جو اس دنیا کو دائمی اور ابدی سمجھتے ہیں یا انہیں آخرت کا کوئی فکر نہیں ہوتا۔

عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ قسم بینکم اخلاقکم کما قسم بینکم ارزاقکم وان اللہ عزوجل یعطی الدنیا من یحب ومن لا یحب ولا یعطی الدین الا لمن

حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بے شک اللہ نے تمہارے درمیان اخلاق کو تقسیم کر دیا ہے جس طرح اس نے تمہارے لئے تمہارا رزق بانٹ دیا ہے اور اللہ تعالیٰ دنیا جسے پسند کرتا ہے اسے بھی دیتا ہے اور جسے ناپسند کرتا ہے اسے بھی دیتا ہے لیکن دین اسے ہی دیتا ہے جسے پسند کرتا ہے پس جس کو اللہ تعالیٰ نے دین دیا گویا اسے پسند کر لیا

احب فمن اعطاه الله الدین فقد احبه
والذی نفسی بیده لا یسلم عبد
حتی یسلم قلبه ولسانه ولا یؤمن
حتی یأمن جاره بوائقه، قالوا وما
بوائقه یا نبی الله قال غشمه وظلمه
ولا یکسب عبد مالاً من حرام
فینفق منه فیبارك له فیه
ولا یتصدق به فیقبل منه
ولا یترك خلف ظهره الا کان
زاده الی النار، ان الله عزوجل
لا یمحو السئ بالسئ ولکن یمحو السئ
بالحسن ان الخبیث لا یمحو الخبیث
(مسند احمد بن حنبل ج ۱: ۳۸۷)

اور قسم ہے مجھے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے
کوئی بندہ اس وقت تک مسلمان نہیں بن سکتا جب
تک کہ اس کا دل اور زبان اسلام نہ لے آئیں اور
کوئی مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کا پڑوسی
اس کی شرارتوں سے محفوظ نہ ہو۔ صحابہ نے پوچھا
یا رسول اللہ اس کی شرارتیں کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا
اس کی ظلم اور زیادتی۔ اور ایسا کبھی نہیں ہو سکتا
کہ ایک آدمی حرام کمائی سے خرچ کرے اور اللہ
اس میں برکت دے، وہ اس میں خیرات کرے اور
اللہ اُسے قبول فرمالیں اور اگر وہ اس کو چھوڑ کر مر
جائے گا تو یہ اس کے لئے جہنم کی آگ کا زادِ راہ ہوگا
بیشک اللہ تعالےٰ برائی کو برائی سے نہیں بلکہ برائی کو
اچھائی سے مٹاتے ہیں کیونکہ گندگی سے گندگی کو دور
نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن کریم میں حلال کمائی سے خرچ کرنے کا حکم آیا ہے اور حرام کمائی سے خرچ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

یاایها الذین امنوا انفقوا من
طیبات ما کسبتم ومما اخرجنا
لکم من الارض ولا تیمموا الخبیث
منه تنفقون ولستم بآخذیه الا
اَن تغمضوا فیه (بقره: ۲۶۷)

اے ایمان والو اپنی پاکیزہ چیزوں میں سے جو
تم نے (اپنے ہاتھ سے) کمائی ہیں اور جو ہم نے تمہارے
لئے زمین سے پیدا کی ہیں اللہ کی راہ میں خرچ
کرو اور ناپاک مال خرچ کرنے کا مت سوچو کہ خود
اسے لیتے وقت منہ بناتے لگتے ہو۔

حرام کمائی نہ صرف خود اپنے لئے روحانی اور مادی طور پہ نقصان دہ ہوتی ہے بلکہ اس سے معاشرے میں بھی برائیاں جنم لیتی ہیں ایک مسلمان کو یہ شایان نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان اور مؤمن کہلانے کے ساتھ ساتھ حلال اور حرام میں کوئی تمیز روا نہ رکھے اور جو چیز جہاں سے اور جس طرح ملے اسے لے لے۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال یأتی علی الناس زمان لا یبالی المرء ما اخذ منہ أمن الحلال أم من الحرام۔	حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لوگوں پہ ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی مال لیتے وقت یہ نہیں دیکھے گا کہ آیا وہ حلال میں سے ہے یا حرام میں سے۔

(بخاری کتاب البیوع باب)

ایسا وقت یقیناً عذاب الٰہی کو دعوت دینے والا ہوگا اور اس وقت خدا کے عذاب سے بچنے کا کوئی چارہ نہ ہوگا۔

حرام مال میں کسی طور بھی برکت نہیں ہوتی اور وہ اکثر حرام جگہ ہی خرچ ہوتی ہے ہم غور نہیں کرتے ورنہ اگر دیکھا جائے تو حرام کمائی باعث پریشانی ہی بنتی ہے۔ اس سے آدمی کا سکون و چین ختم اور اطمینان قلبی رخصت ہو جاتا ہے۔ آج کے انسان کو ہر وقت جو ذہنی تفکرات بے چین رکھتے ہیں ان کی بنیادی وجہ مال حرام ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں حلال کمائی میں اللہ تعالیٰ بہت ہی برکت عطا فرماتے ہیں۔ حلال کمائی سے اگر آدمی کھائے پیئے اور پہنے تو اس سے اسے روحانی مسرت و شادمانی کا احساس ہوتا ہے اس کی عمر میں برکت ہوتی ہے اور نیکیوں کو بارگاہ ایزدی میں قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ حلال مال آدمی کو پکا اور سچا مسلمان و مؤمن بنانے میں اپنا پورا کردار ادا کر کے اسے معاشرے کا ایک اہم اور قیمتی سرمایہ بنا دیتا ہے۔

اس کے مقابلے حرام تو حرام ایک مشتبہ چیز یعنی ایک ایسی چیز کہ جس کے حلال

یا حرام ہونے میں شبہ ہے۔ ایسی چیز بھی انسان کو کسی وقت بھی برائی میں مبتلا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔

حدیث شریف میں ہے۔

عن ابی عبد اللہ النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان الحلال بیّن وان الحرام بیّن وبینہما مشتبہات لا یعلمھن کثیر من الناس فمن اتقی الشبہات استبرأ لدینہ وعرضہ ومن وقع فی الشبہات وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمیٰ یوشک أن یرتع فیہ الاوان لکل ملک حمی الاوان حمی اللہ محارمہ الاوان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الاوھی القلب۔

(بخاری شریف)

حضرت نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا بلاشبہ حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور دونوں کے درمیان مشکوک چیزیں ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے پس جو شخص ان مشتبہ چیزوں سے بچ گیا اس نے اپنا دین اور آبرو بچا لیا اور جو شخص مشتبہ چیزوں میں پڑ گیا وہ حرام میں مبتلا ہوگا جیسا کہ چرواہا جو اپنا ریوڑ کھیت کے باڑ کے پاس چرائے گا تو اس کی بکریاں کھیت میں بھی چرنے لگیں گی خبردار بلاشبہ ہر بادشاہ کی ایک باڑ ہوتی ہے اور بلاشبہ اللہ کی باڑ وہ چیزیں ہیں جو حرام ہیں خبردار جسم میں ایک ایسا ٹکڑا ہے جو درست ہو تو سارا جسم درست ہوتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے بیشک وہ ٹکڑا دل ہے

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے دو نسخے ارسال فرمائیے)

تاریخ مزار شریف واقع بلخ

خلیفۂ راشد چہارم امیر المومنین سیدنا حضرت علی رضی اللہ تعالے عنہ کی شہادت کے بعد ان کی تدفین کے مقام اور مزار کے بارے میں مختلف روایات کتابوں میں ملتی ہیں۔ لیکن عام طور سے مشہور یہ ہے کہ آپ کا مزار نجف اشرف عراق میں ہے۔ اختلاف کی تفصیلات معلوم کرنے کے شائق حضرات تاریخ البدایہ والنہایہ مولفہ امام ابن کثیر جلد ۷ کا صفحہ ۳۰ - ۳۲۹ مطالعہ کریں۔

حال ہی میں فارسی زبان کی ایک کتاب دفتر "فکر و نظر" میں تبصرہ کے لئے موصول ہوئی ہے جس کا نام "تاریخ مزار شریف واقع بلخ" ہے۔ یہ ۱۳۶ صفحات، بڑی تقطیع، کی کتاب ہے۔ اس کی ابتدا میں مزار شریف کے متعدد فوٹو بھی ہیں۔ اس کے مولف مولانا حافظ نور محمد صاحب کاہ گدائی افغانستانی نے ۵۴ مشہور تاریخی مطبوعہ اور نایاب قلمی کتابوں کے حوالوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت علی کا مزار مبارک بلخ میں ہے۔

افغانستان خراسان اور ماوراء النہر کے مسلمانوں کا عقیدہ بھی عام طور سے یہی ہے کہ حضرت علی کا اصل مزار بلخ میں ہے۔ آج کل یہ جگہ افغانستان کا ایک صوبائی دار الحکومت ہے۔

چند سال قبل مولانا قاضی محمد شمس الدین مجددی بلخ تشریف لے گئے تھے اور مزار مبارک پر حاضری دی تھی۔ وہاں ان کو کتاب زیر تبصرہ کا ایک نسخہ دستیاب ہوا۔ موصوف نے افغانستان میں بہت تلاش کیا لیکن کوئی دوسرا نسخہ نہ مل سکا۔ موصوف نے فوٹو اسٹیٹ مشین کے ذریعے اس کتاب کے ایک سو نسخے نکلوا لئے۔ اس طرح یہ کتاب دوبارہ "زندہ" ہو گئی۔

کتاب علمی فارسی زبان میں ہے اور تحقیق کے خواہاں حضرات کے کام کی چیز ہے۔ قاضی محمد شمس الدین صاحب کو موضع درویش ڈاک خانہ ہری پور ہزارہ صوبہ سرحد کے پتہ پر سترہ (۱۷) روپے کا منی آرڈر بھیج کر منگوائی جا سکتی ہے۔

(شرف الدین اصلاحی)

موصولہ کتب

تبصرہ کے لئے مدیر فکر و نظر کو وقتاً فوقتاً جو کتب یا رسائل موصول ہوتے رہتے ہیں ان کے بارے میں اکثر یہ شکایت پیدا ہوتی ہے، جو بالکل بجا ہے، کہ ان کے متعلق بھیجنے والوں کو اس وقت تک کچھ معلوم نہیں ہوتا جب تک کہ تبصرہ شائع نہ ہو جائے۔ اس قسم کی شکایات کے ازالہ کے لئے یہ صورت اختیار کی جا رہی ہے کہ رسالے میں فوری طور پر ان کتب و رسائل کا ذکر دیا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ موصول ہونے والی ہر کتاب پر باقاعدہ تبصرہ کیا جائے ایسی کتابوں کے لئے اس فہرست میں اندراج تبصرے کا نعم البدل نہیں تو بدل یقیناً ثابت ہو گا۔

۱۔ اقبال اور مسئلہ تعلیم مصنفہ محمد احمد خان ایم اے ایل ایل بی۔ ۹ ۲۴ بہادر آباد نمبر ۲ کراچی نمبر ۵۔ شائع کردہ اقبال اکیڈمی پاکستان، ۹۰۔ بی ۲ گلبرگ نمبر ۲ لاہور۔ تعداد صفحات ۶۲۵ قیمت ۱۷ روپے۔

۲۔ اسلام یا سوشلزم از سید اسعد گیلانی۔ اسلامی اکادمی، منصورہ لاہور تعداد صفحات ۱۹۲ قیمت پانچ روپے۔

۳۔ اے اسٹڈی آف دی گاسپل آف برنابا س از بشیر محمود اختر۔ شائع کردہ اسلامی مشن سنت نگر لاہور۔

۴۔ ابوالکلام کی تاریخی شکست مرتبہ محمد جلال الدین قادری۔ مکتبہ رضویہ لاہور صفحات ۱۲۸ قیمت ساڑھے چھ روپے۔

۵۔ خلاصہ فقہ اسلامی از قاضی محمد زاہد الحسینی شائع کردہ دارالارشاد اٹک شہر کیمبل پور۔ صفحات ۱۲۸ قیمت پانچ روپے۔

۶۔ مغربی جمہوریت اور پاکستان میں موجودہ انتخابات مولفہ عبدالرحمٰن گیلانی

شائع کردہ ادارہ الاعتصام شیش محل روڈ لاہور صفحات ۹۶ قیمت ۲ روپے ۲۵ پیسے۔

۷۔ قرآن اور حدیث کا ادبی رخ از محمد محسن و احمد حسن ٹونکی۔ لیاقت آباد کراچی

۸۔ شان صحابہ از قاضی محمد زاہد الحسینی شائع کردہ دارالارشاد اٹک شہر کیمبل پور صفحات

قیمت ۳ روپے

۹۔ تاریخ مزار شریف واقع بلخ مولف حافظ نور محمد کہگدائی نعمانی کتب خانہ بازار کتاب فروشی کابل افغانستان صفحات ۱۳۵۔

۱۰۔ عوامی حکومت کا خاکہ۔ اسد اللہ خاں بی ایس سی علیگ۔ اکبر روڈ کراچی۔
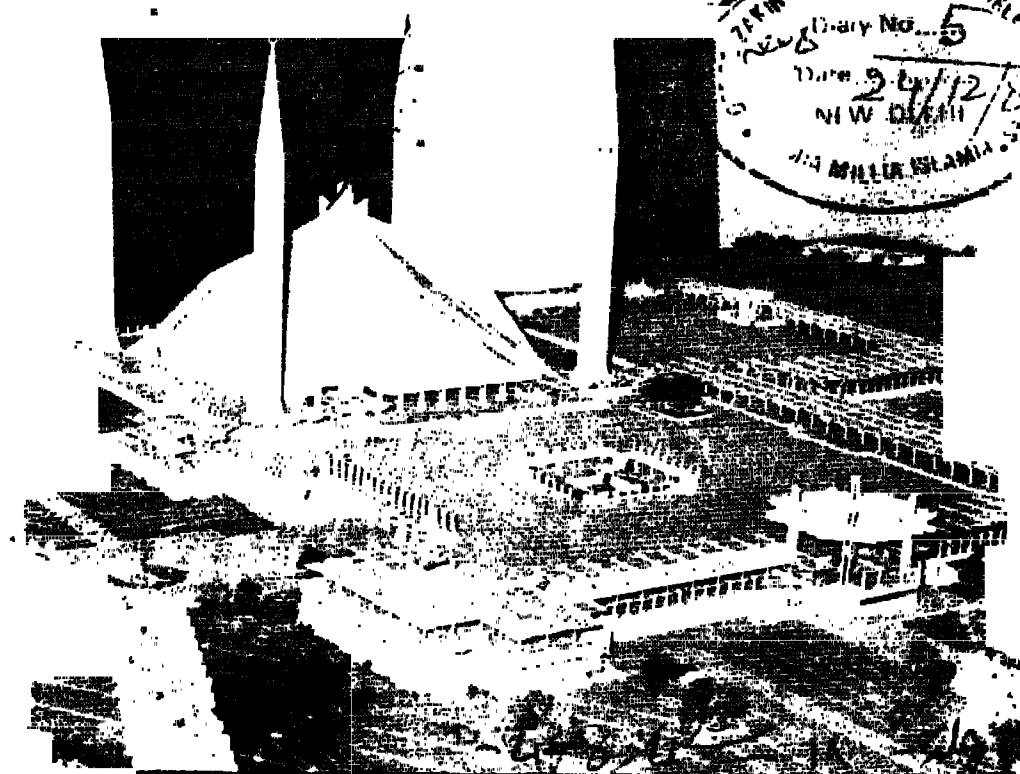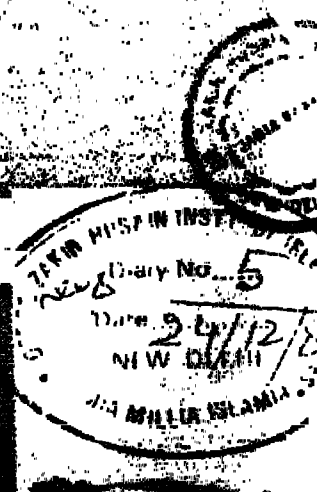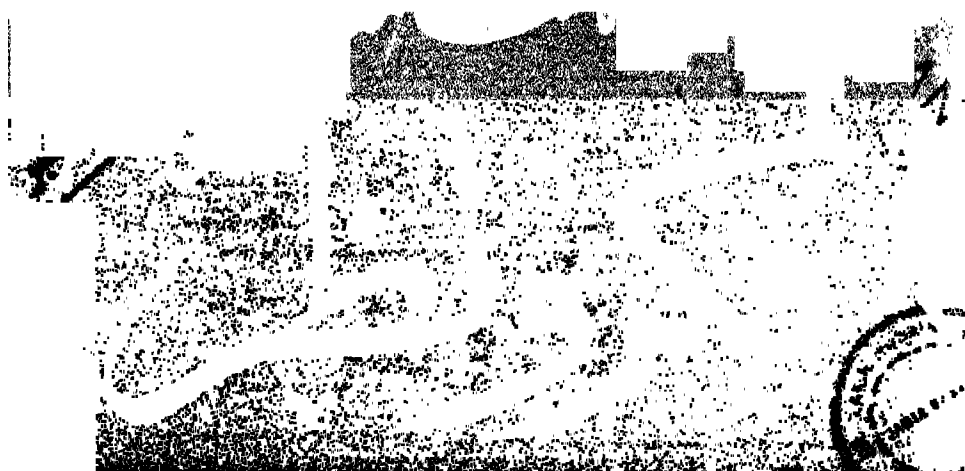
نگراں

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا

ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد

مدیر

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی

فکر و نظر اسلامی تحقیقات کے لئے آزادانہ اظہار رائے کا حامی ہے۔ فکر و نظر میں کسی مضمون کی اشاعت
کا یہ مطلب نہیں کہ ادارہ [illegible] لازماً متفق ہے جو اس میں پیش
کی گئی ہیں [illegible] مضمون نگار [illegible] ذمہ دار ہوتا ہے

سالانہ چندہ پندرہ روپئے	ششماہی آٹھ روپئے	فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

طابع و ناشر: محمد سمیع اللہ سکرٹری ادارۂ تحقیقات اسلامی۔ اسلام آباد

مطبع: اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ پریس۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵۔ اسلام آباد

سکولوں ، کالجوں اور لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

ماھنامہ

فکر و نظر

اسلام آباد

جلد - ۱۸ | محرم الحرام ۱۴۰۱ھ ▢ دسمبر ۱۹۸۰ | شمارہ - ٦

فہرست

سرورق : زیر تعمیر مسجد شاہ فیصل شہید ـ اسلام آباد

مسجد کے گرد ادارہ تحقیقات اسلامی ، اسلامیہ یونیورسٹی کی عمارات

مجلس ادارت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

قمری حساب سے ھجری سال کا یہ پہلا مہینہ ھے ۔ اسلامی کیلنڈر میں اس سے نئے سال کا آغاز ھوتا ھے ۔ نوروز یا سال نو کی مبارکباد کی اگر کوئی وجہ جواز ھے تو بحیثیت مسلمان اس کے لئے یہی میہنہ موزوں اور مناسب ھو سکتا ھے ۔ یوں تو محرم کا مہینہ ھر سال آتا ھے مگر اس محرم کو یہ امتیاز حاصل ھے کہ اس سے مسلمانوں کی تقویم میں سال نو ھی کا نہیں نئی صدی کا آغاز ھوتا ھے ۔ گزشتہ مہینے ذوالحجہ کی آخری تاریخ کو چودھویں صدی ھجری اختتام پذیر ھوئی اور اس ماہ یکم محرم کو کاروان حیات نے پندرھویں صدی ھجری میں قدم رکھا ۔ پلٹ کر پیچھے دیکھیں تو گزشتہ صدی کے سو سال کیسے کیسے واقعات، حوادث اور سانحات اپنے دامن میں سمیٹے ھوئے ھیں ۔ ان کا احاطہ تو کجا سرسری اشارے پر اکتفا کریں تو بھی دفتر کا دفتر درکار ھو۔

ع ۔ سفینہ چاھیئے اس بحر بیکراں کے لئے

صدی ھجری تقریبات کا سلسلہ جاری ھے ۔ تقاریر، مباحثے اور مذاکرے ھوں گے، مقالے اور مضامین لکھے جائیں گے ، جن میں اھل علم گزشتہ صدی کا تنقیدی جائزہ پیش کریں گے اور آئندہ صدی کے منصوبے عزائم، امکانات و مضمرات پر روشنی ڈالیں گے ۔ اس موقع پر میرا ذھن ایک گرہ کی عقدہ کشائی میں ناخن تدبیر کا سارا زور صرف کر چکا ھے پھر بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ۔ بچپن سے سنتے چلے آئے ھیں کہ چودھویں صدی قیامت کی صدی ھے ۔ اس صدی

کے اختتام تک قیامت آجائے گی اور دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ بات مسلمانوں میں قصے کہانی کے طور پر نہیں امر مسلمہ کے طور پر رائج اور مشہور تھی۔ بچپن میں بزرگوں سے سنتے تھے اور ہمارا معصوم ذہن اسے اذعان کے ساتھ قبول کر لیتا تھا۔ بڑے بوڑھے اسے یوں بیان کرتے تھے جیسے وحی الہی کے ذریعے انہیں بتادیا گیا ہو کہ چودھویں صدی دنیا کی آخری صدی ہوگی۔ چودھویں صدی ختم ہو گئی اور دنیا جوں کی توں باقی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ بات کس نے پھیلائی اور کیوں پھیلائی۔ اس کے پیچھے کیا عوامل کارفرما تھے۔ اس سے پھیلانے والوں کا مقصد کیا تھا۔ اگر کوئی صاحب اس موضوع پر تحقیق اور غور و فکر کے بعد لکھ کر اس عقدے کو حل کر سکیں یا اس پر روشنی ڈال سکیں تو میں اور میری طرح بہت سے دوسرے لوگ بھی اس کا خیرمقدم کریں گے۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا سوال ہے۔ لیکن بعض چھوٹی باتیں بڑے نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔

مسلمانوں کی تاریخ میں بلاشبہہ یہ ایک اہم موقع ہے۔ اس موقع کی مناسبت سے شایان شان تقریبات کا انعقاد دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس تقریب سے میرے ذہن میں ایک اور سوال یہ آتا ہے کہ مسلمانوں کی اپنی تقویم ہوتے ہوئے جو محض ایک تقویم ہی نہیں، بلکہ اس کے پیچھے دینی روایات کا ایک سلسلہ ہے اور اسے مذہبی تقدس کا درجہ حاصل ہے، مسلمانوں میں عملاً عیسوی کیلنڈر کیوں اور کیسے رائج ہو گیا۔ ہمارے کسی مضمون نگار نے اپنے مضمون میں اس مسئلے کو چھیڑا ہے۔ لیکن سیر حاصل بحث نہیں کر سکے جو کسی نتیجے پر پہنچا سکتی۔ آج کیفیت یہ ہے کہ سنہ ہجری کی حیثیت متاع گم گشتہ کی ہے۔

•

تلاش گم‌شدہ کے اشتہار تو وقتاً فوقتاً نظر سے گزرتے ہیں مگر کہیں یوسف گم گشتہ کا سراغ نہیں ملتا - اس کی کیا وجہ ہے - آجکل احیائے اسلام، اسلامی نشاۃ ثانیہ، ملی تشخص، مسلمانوں میں بیداری کی لہر، یہ اور اس جیسے بے شمار دوسرے خوش آئند فقرے اور الفاظ بکثرت نظر سے گزرتے ہیں، اور ان کے مصداق کو تلاش کیا جائے تو ناکامی نہ ہوگی، لیکن کیا اس کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا یہ نہیں کہ مسلم حکومتیں، اور مسلمان عوام عیسوی کیلنڈر کو ترک کرکے ہجری کیلنڈر کو اپنا لیں - جس وقت حضرت عمر کے زمانے میں سنہ ہجری کا فیصلہ کیا گیا آخر اس وقت بھی تو ماہ و سال کے حساب کے لئے متعدد کیلنڈر پہلے سے موجود اور مروج تھے - اس وقت کے مسلمانوں نے اپنا کیلنڈر بنانے کی بجائے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کیوں نہیں کر لیا - پاکستان کی نظریاتی مملکت میں جو مسلمانوں کا ملک ہے اور جہاں اسلام کو ریاست کے مذہب کی حیثیت ملی ہوئی ہے، اگر یہاں فوری طور پر سن ہجری رائج کر دیا جائے تو پندرھویں صدی ہجری کا یہ ایک یادگار کارنامہ ہوگا اور تاریخ کے صفحات میں اس کا ذکر یقیناً سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا - کشمیر کے پہلے نو مسلم حکمراں کی مثال ہمارے سامنے ہے - راجہ رینچن جس کا اسلامی نام سلطان صدر الدین ہے مسلمان ہوتے ہی اس نے رائج الوقت تقویم کو موقوف کرکے ہجری سن کو نافذ کیا -

---

قارئین فکر و نظر جن کی قوت فکر کے ساتھ ذوق نظر کی آزمائش بھی خاصی ہو چکی ہے یہ دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے کہ اس مہینہ سے فکر و نظر ٹائپ میں چھپنے لگا ہے - ٹائپ کی بات آتی ہے تو مجھے لسان العصر حضرت اکبر کا یہ

شعر یاد آنے لگتا ھے ۔

حرف پڑھنا پڑا ھے ٹائپ کا　　　پانی پینا پڑا ھے پائپ کا

اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ھے کہ

ع ۔ اگلے وقتوں کے ھیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

یہ گزشتہ صدی کی بات ھے ۔ زمانہ بہت آگے نکل چکا ھے ۔ صحیح یا غلط، اچھا یا خراب یہی آج کا چلن ھے ۔ پانی تو فقط پائپ ھی کا ھے البتہ حرف ابھی تک دونوں طرح کے چل رھے ھیں ۔ پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا ۔ کتابت اور ٹائپ کے مسئلے پر قارئین فکر و نظر میں اختلاف رائے بایا جاتا ھے ۔ عرصہ ھوا ایک مرتبہ ان کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس کا کوئی فیصلہ کن نتیجہ غالباً برآمد نہیں ھوا تھا ۔ اس کے باوجود ماضی میں مدتوں پرچہ ٹائپ ھی میں چھپتا رھا ۔ ٹائپ بہت اچھا نہیں تھا پھر بھی ا سے کتابت کے مقابلہ میں پسند کیا جاتا تھا ۔ اس کی وجہ شاید کتابت کے معیار کی پستی ھو ۔ اچھے ٹائپ اور اچھی کتابت میں انتخاب کا سوال ھو تو میں خود بھی ذاتی طور پر کتابت کو ھی ترجیح دوں گا ۔ مگر کاتب ھو کوئی زریں رقم، پرویں قلم ۔ پھر پڑھا لکھا بھی ھو جس کی کتابت میں غلطیوں کی بھرمار نہ ھو ۔ ظاھر ھے ایسے کاتبوں کا وجود آجکل عنقا ھے ۔ کتابت کی نزاکتوں کو نبھانا ھر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ۔ ٹائپ میں کم سے کم نفاست اور صفائی تو برقرار رھتی ھے ۔ میرا اپنا خط بہت اچھا نہیں مگر بدخطی سے الجھن اور بیزاری سی ھونے لگتی ھے ۔ بات اگر ذوق جمال کی ھو تو دوسرے یا تیسرے درجے کی چیز پر نگاہ نہیں ٹکتی ۔

فرش سے مطمئن نہیں پست ہے ناپسند ہے عرش بہت بلند ہے ذوق نظر کو کیا کروں

ہم نے مژدہ سنایا تھا کہ آئندہ پرچہ خوبصورت ٹائپ میں پیش کیا جائے گا ۔ مگر ابھی اس میں تھوڑی سی دیر ہے ۔ نئی مشین جس کے آسرے پر خوشخبری دی گئی تھی ابھی تک تجرباتی الٹ پھیر کے گرداب سے باھر نہیں آئی ۔ علاوہ ازیں کچھ انتظامی دشواریاں بھی حائل رھیں ۔ محرم اور صفر کے پرچے اسی پرانے ٹائپ میں پیش کئے جارہے ھیں ۔ ربیع الاول کا شمارہ نئی مشین کے نئے ٹائپ میں ھوگا ۔ جس کے بعد امید ہے کہ کتابت اور نستعلیق کے گرویدہ حضرات کو بھی اپنے ذوق کی تسکین کا سامان مل جائےگا ۔ اس لئے کہ نیا ٹائپ پرانے ٹائپ سے تراش خراش اور طرز و ادا میں کہیں بہتر ہے اور وضع میں نستعلیق سے قریب تر ہے ۔

ھجری صدی تقریبات کا بڑا چرچا ہے ۔ لیکن یہ قوم نشستند و گفتند و برخاستند سے آگے نہیں بڑھے گی ۔ ادارے میں نئے سیکریٹری محمد سمیع اللہ صاحب کی آمد سے یہ خوشگوار تبدیلی آئی ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے دفاتر میں عیسوی کیلنڈر کی بجائے ھجری کیلنڈر کو اصل قرار دےکر تاریخ کے اندراجات کئے جاتے ھیں ۔ لیکن ظاھر ہے یہ عمل اختیاری ہے اس کے پیچھے کوئی قوت نافذہ موجود نہیں ۔ فکر و نظر پہلے ھی سے یہ التزام کر رھا ہے کہ پہلے قمری حساب سے اسلامی تاریخ درج کی جاتی ہے پھر عیسوی ۔ مگر ملک کے اندر چونکہ ابھی تک تمام کاروبار عیسوی کیلنڈر سے چلتا ہے اس لئے مجبوراً پرچہ اسی حساب سے شائع ھوتا رھا ۔ طے کیا گیا ہے کہ آئندہ رسالے کی اشاعت میں عیسوی کیلنڈر کی بجائے ھجری کیلنڈر کو پیش نظر رکھا جائے ۔ ڈاکخانے سے گفت و شنید

کی جارہی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ پرچہ قمری مہینوں کے مطابق حوالہ ڈاک کیا جائے گا۔ یعنی محرم کا پرچہ یکم محرم کو صفر کا پرچہ یکم صفر کو شائع ہوگا۔ قارئین اسے نوٹ کرلیں اور پرچے کے ساتھ معاملت میں اسی حساب کو ملحوظ رکھیں۔

(مدیر)

قمری تقویم هجری

عبد القدوس ہاشمی

ہم اوقات کی تعیین کے لئے زمانہ ما قبل التاریخ یا نایادگار زمانہ سے چار پیمانے رکھتے ہیں۔ یہ کب سے ہیں اور انسان نے کب سے یہ پیمانے مقرر کر رکھے ہیں، اس کے لئے کوئی تاریخ ہم مقرر نہیں کر سکتے۔ منضبط تاریخ تو کجا افسانوی اور آثاری تاریخ بھی موجود نہیں ہے۔ چار پیمانے یہ ہیں۔

(۱) طلوع آفتاب سے دوسرے طلوع آفتاب تک کو ہم دن کہتے ہیں۔

(۲) ایسے سات دنوں کو ہم ہفتہ کہتے ہیں۔

(۳) اور ایک ہلال سے دوسرے ہلال یعنی پہلی کے چاند کو ہم مہینہ کہتے ہیں۔

(۴) ایسے بارہ مہینوں کو ہم سال، سنہ یا سمت کا نام دیتے ہیں۔

یہ سب کب سے مقرر ہے؟ ہمیں نہیں معلوم۔ ہاں آسمانی کتابوں میں ان پیمانوں کا ذکر موجود ہے۔ حضرت موسی کلیم اللہ پر نازل ہونے والی کتاب تورات مقدس اپنی اصلی عبرانی زبان میں تو ایک لفظ بھی موجود نہیں ہے البتہ جس صورت میں وہ آج تحریف کے بعد اور ترجمہ سے ترجمہ کی صورت میں موجود ہے، اس کے پانچ حصے ہیں۔ پیدائش، خروج، احبار، شمار اور استثنا۔ ان میں

دن مہینہ اور سال کا ذکر بار بار ملتا ہے ۔ پہلے حصہ یعنی کتاب پیدائش میں بالکل ابتدائی فقروں میں یہ موجود ہے کہ ''اور خدا نے کہا کہ روشنی ہوجا اور روشنی ہوگئی، خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات اور شام ہوئی اور صبح ہوئی، سو پہلا دن ہوا،،

اسی طرح تورات کے دوسرے حصوں میں اتنے سال کے فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو یہ ہوا، متعدد فقروں میں بیان کیا گیا ہے ۔

اور قرآن مجید میں ہے:

یسئلونك عن الاھلة قل ھی مواقیت للناس والحج . . (سورة البقرہ آیت ۱۸۹)

آپ سے لوگ ہلال (پہلی کے چاندوں) کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہدیجئے کہ یہ آدمی کے لئے اور حج کے لئے وقت کی تعیین کا ذریعہ ہے ۔

ایک دوسری آیت میں ہے :

و جعلنا اللیل والنہار آیتین فمحونا آیة اللیل و جعلنا آیة النہار مبصرة لتبتغوا فضلا من ربکم و لتعلموا عدد السنین و الحساب و کل شی فصلناہ تفصیلا . (سورة الاسراء آیت ۱۲)

اور ہم نے رات اور دن کو نشانیاں بنایا ہے، تو رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کو روشن بنا دیا تاکہ تم اللہ کا فضل (روزی) تلاش کر سکو، اور سالوں اور حساب کے اعداد معلوم کر سکو اور ہم نے ہر چیز کو ایک دوسرے سے الگ الگ بنایا ہے ۔

ایک اور آیت قرآنی ہے :

هوالذی جعل الشمس ضیاء والقمر نورا و قدره منازل لتعلموا عدد السنین والحساب . (سوره یونس آیت ٥)

وہ اللہ ھی ہے جس نے آفتاب کو روشنی اور چاند کو نور بنایا ہے اور اس کے لئے منزلیں مقرر کی ھیں تا کہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کر سکو

قرآن مجید میں سال کے بارہ مہینوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے :

ان عدة الشهور عندالله اثنا عشر شهرا فی کتاب الله یوم خلق السموات والارض . . . (سورة التوبة آیت ۳۷)

بے شک مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ھیں اللہ کی کتاب میں اسی دن سے جب کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ۔

دن اور ہفتہ :

آسمانی کتابوں کی ان شہادتوں سے یہ تو واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ اوقات کی تعیین ابتدائے عہد ھی سے اس طرح ہو رہی ہے ۔ قیاس بھی یہی چاہتا ہے کہ انسان نے فاصلہ زمانی کو ناپنے کا یہی طریقہ اختیار کیا ہوگا ۔ آفتاب کے طلوع سے دن شروع ہوا، اور ڈوبنے سے رات شروع ہوگئی ۔ ہر روز آفتاب ایک ھی طرح کا دکھائی دیتا ہے اس میں کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے ۔ ۳۱ دسمبر کی صبح کا آفتاب ہو یا ٥ جنوری کی صبح کا، اس میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، اس لئے اس سے شمار کرکے مدتوں کی تعیین بغیر حساب کے نہیں ہو سکتی، اس کے بر خلاف پہلی شب کا چاند پانچویں شب کے چاند سے اتنا

مختلف ھوتا ھے کہ اس کے سمجھنے کے لئے کسی شمار یا حساب کی ضرورت نہیں۔ اس وجہ سے پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ھے کہ آدمی نے چاند ھی کے ذریعہ مہینوں اور سالوں کا شمار پہلے پہل شروع کیا ھوگا۔ اور رات دن کے شمار میں بھی رات کو دن سے مقدم ھی شمار کرتا ھوگا کیونکہ چاند رات کی ابتداء ھی میں نظر آتا ھے۔

آفتاب کی صورت و سیرت میں تو کوئی فرق محسوس نہیں ھوتا لیکن چاند کی صورت میں تو ھر روز تبدیلی ھوتی رھتی ھے، وہ پہلی رات سے دوسری رات میں اور دوسری سے تیسری رات میں زیادہ موٹا نمایاں اور چمکیلا نظر آتا ھے۔ اسی طرح بڑھتے بڑھتے چودہ راتوں میں پورا ھو جاتا ھے۔ پھر ھر رات کو گھٹتا رھتا ھے اور اس کے ظہور کی مدت بھی کم ھوتی رھتی ھے، یہاں تک کہ اٹھائیسویں رات کو بالکل غایب ھو جاتا ھے۔ پھر ساٹھ گھنٹے غائب رھنے کے بعد باریک سا نکلتا ھے۔

اب اس ۲۸ راتوں کو لوگوں نے پہلے دو پر اور پھر چار پر تقسیم کیا۔ اسے ھندی میں پکھ کہتے ھیں اور ان کے نام بدی، اور سدی ھیں۔ یہ حسابی اعتبار سے بالکل صحیح تقسیم ھے۔ محاق کی مدت یعنی ان راتوں کو جب کہ چاند ھماری آنکھوں سے نظر نہیں آتا ھے خارج کر دینے کے بعد ھمیں ۲۸ راتیں ملتی ھیں، عروج ماہ کی چودہ راتیں، یعنی مبیضہ یا بدی۔ اور زوال ماہ کی چودہ راتیں یعنی مظلمہ یا سدی۔ اب پھر ان چودہ راتوں کو دو پر تقسیم کیا تو سات سات راتوں کے دو حصے پیدا ھوگئے۔ انھیں ھفتہ یعنی سات راتیں کہا جاتا ھے۔ ۲۸ کے عدد کو اگر ھم برابر حصوں میں تقسیم کرنا چاھیں تو صرف ایک ھی

تقسیم ہو سکتی ہے - ۲ - اور پھر - ۲ = جملہ چار ہی برابر حصے پیدا ہو سکتے ہیں - ان سات راتوں کے مجموعہ کو دنیا کی مختلف زبانوں میں مختلف ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے - خدا جانے کہ ابتداءً اسے کیا کہا جاتا تھا - ہفتہ کو سنسکرت میں سپتم کہتے ہیں - عبرانی قدیم میں سبت، پرانی ایرانی زبان میں سفتہ جو بعد کو ہفتہ ہو گیا - شاید بہت سی قدیم زبانوں میں اسی طرح کے ملتے جلتے الفاظ ہوں گے -

تمدن کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفتہ کے سات دنوں کے نام پہلے بابلی تمدن میں آسمان پر دکھائی دینے والے سات ستاروں کے نام پر رکھے گئے تھے - ان سیاروں کی بابل میں پرستش ہوتی تھی اور ان ہی کے نام پر ان سات دنوں کے نام رکھے گئے تھے -

۱) آدیتہ - آدیتوار - اتوار - سن ڈے - - یعنی سورج‌مان دیوتا کا دن
۲) سومو - سوموار - سوموار - مون ڈے - (منڈے) - چندرمان دیوتا کا دن
۳) منگل - منگل‌وار - منگلوار - ٹیوس ڈے - یعنی عطارد کا دن
۴) وینس - ناھید - وینس ڈے - یعنی زھرہ دیوی کا دن
۵) برہپتی - برھسپت - تھرسا ڈے - یعنی مریخ جلاد فلک کا دن
۶) - شکروار - فریجاڈے - یعنی مشتری دیوی کا دن
۷) - سنیچروار - سٹرن ڈے - یعنی زحل دیوتا کا دن

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ دیوی دیوتا کے ناموں پر رکھے ہوئے ان ناموں کو عام طور سے ترجمہ یا ادنی تغیر کے ساتھ سب جگہ قبول کرلیا گیا حتی کہ ایرانی حکومت میں بھی جہاں مہینہ کے تیس دنوں کے لئے الگ الگ

نام موجود تھے - اور تیس دنوں میں آتش پرستی کے لئے الگ الگ آتشکدے بھی تھے لیکن عام گفتگو میں بابلیوں کے رکھے ہوئے نام وھاں بھی چلا کرتے تھے -

قمری سال :

قیاس چاھتا ھے کہ ابتدا میں لوگوں نے قمری ھی سال حساب میں لیا ھوگا - شمسی حساب کے سال کا خیال زمانہ ما بعد کی پیداوار ھے - اس لئے کہ ھم دنیا کے تمام مذاھب اور تمدنوں میں ابتداءً قمری ھی سال دیکھتے ھیں اور بہت سے تہوار آج تک قمری ھی حساب سے منائے جاتے ھیں - مثلاً یہود کا تہوار صوم کبود، عیسائیوں کا تہوار ایسٹر، ھندوؤں کے تہوار شنکرات، پونم اور مسلمانوں کی عیدین وغیرہ - دنیا کی بڑی بڑی مشہور زبانوں میں مہینہ کے لئے جو لفظ ھے وہ اس زبان کے اسی لفظ سے بنا ھے جو چاند کے لئے تھا مثلاً عربی میں شھر پہلی رات کا چاند یعنی ھلال اور بالکل یہی لفظ مہینہ کے لئے ھے- یہی حال فارسی کا ھے لفظ ماہ چاند اور مہینہ دونوں معنی کے لئے مستعمل ھے - ھندی اور سنسکرت میں ماس دونوں کے لئے موجود ھے - مون سے منتھ بالکل اسی طرح بنا ھے جیسے ٹن سے ٹنتھ اور سیون سے سیونتھ بن کر تیار ھوئے ھیں - ترکی میں مہینہ کے لئے آئے ٹھیک وھی لفظ ھےجو چاند کے لئے اس زبان میں ھے - اردو اور ھندی میں تو چاند کرۂ قمر کے لئے اور مہینہ کے لئے بولا ھی جاتا ھے -

شمسی سال :

دنیا اسی طریقہ پر چل رھی تھی اور ایک چاند سے دوسرے چاند کو ایک مہینہ اور بارہ ایسے مہینوں کو سال شمار کیا جاتا تھا کہ ذھین اور چالاک

برھمنوں نے اور ھوشیار حاخاموں نے مٹھ، اور صومعات بنائے ۔ عبادتخانے بن کر تیار ھوئے تو ھر سال ایک تاریخ مقرر پروھاں پہلی فصل کا نذرانہ اور بھیڑ بکریوں کی قربانی بھی ضروری قراردی گئی ۔ اب دو چار سال کے بعد ھی یہ محسوس ھوا کہ جو تاریخ مقرر کی گئی تھی اس میں نہ تو نئی فصل تیار ھوئی اور نہ بھیڑ بکریوں کے بچے پیدا ھوئے ۔ لیجئے اب حاخاموں اور پروھتوں کے لئے ایک بڑا سوال پیدا ھوگیا ۔ کسان کے کھیت میں فصل ھی تیار نہ ھوگی اور اس کے باڑوں میں بھیڑ بکریاں نہ ھوں گی تو وہ برھمنوں اور حاخاموں کے لئے نذرانے کہاں سے لائے گا ۔

اس وقت دانشمند عالموں نے شمسی سال کا حساب تیار کیا ۔ اس لئے کہ موسم حرارت شمسی ھی سے بدلتے ھیں اور فصلیں اسی سے پکتی ھیں ۔ ھر قوم نے اس کے لئے حسابی عمل شروع کیا ۔ چاند کے حسابی سال اور سورج کے حسابی سال میں جو فرق تھا اسے برابر کرنے کے لئے کبیسہ کا طریقہ اپنایا گیا ۔ کبیسہ کے طریقہ کو ھر قوم نے الگ الگ حسابی قاعدوں سے اپنایا ۔ ھندی میں اس کو لوند کہتے ھیں ۔ انگریزی میں لیپ، عربی فارسی، ترکی اور اردو میں کبیسہ کہتے ھیں جو عربی مادہ کبس بمعنی اوپر سے دبا دینا سے مشتق ھے ۔

قمری مہینہ یعنی چاند کا زمین کے گرد ایک مکمل دورہ مہینہ کہلاتا ھے، اس کی مدت کبھی ۳۰ دن اور کبھی ۲۹ دن ھوتی ھے ۔ ایسے بارہ دوروں کی پوری مدت ۳۵۴ / ۴۸/۳۴ ھوتی ھے ۔ اس کا مفہوم یہ ھوا کہ کسی ایک مقام کے افق پر پہلی رات کا چاند تیرھویں بار اس مدت سے کم میں نہیں دکھائی

دے سکتا ۔ اور ظاهر هے کہ یہ مدت بارہ برابر برابر حصوں میں تقسیم نہیں هو سکتی، اس لئے قمری سال کا هر مہینہ ایک دوسرے کے برابر نہیں هو سکتا هے ۔

شمسی سال یعنی زمین کے سورج کے گرد بیضوی دائرہ پر حرکت کرتے ہوئے ایک دورہ کی پوری مدت ٣٦٥/٥/٤٨/٤٦ هوتی هے ۔ یہ مدت بھی برابر برابر کے بارہ حصوں پر تقسیم نہیں هو سکتی، اس لئے هر چوتھے سال کو ٣٦٥ کی بجائے ٣٦٦ دن کا بنا لیا جاتا هے ۔ جس کو لیپ ایر کہا جاتا هے ۔ اب موجودہ گریگوری کیلنڈر میں ایک دن کا یہ اضافہ ماہ فروری کے آخر میں کر کے اسے ٢٩ دن کا مہینہ بنا لیا جاتا هے ۔ پہلے یہ اضافہ جون میں اور اس کے پہلے ستمبر میں کیا جاتا تھا ۔

اس اضافہ سے بھی کسور کا معاملہ باقی هی رہ گیا ۔ اس لئے هر چارسو آٹھ سال کے بعد کیلنڈر کو پھر سے درست کرنا پڑتا هے، پچھلی ترمیم تقدس مآب پاپائے اعظم گریگوری سیزدهم نے اکتوبر ١٥٨٢ء میں کی تھی اور ماہ اکتوبر سے دس دن خارج کردے گئے تھے ۔ اسی لئے موجودہ کیلنڈر کو گریگوری کیلنڈر کہتے هیں ۔ ورنہ حقیقتاً یہ قدیم جولین کیلنڈر هے ایک عیسائی راهب ڈینس ایگزیگوس نے غلط حساب کر کے حضرت عیسی مسیح علیہ‌السلام کی طرف منسوب کردیا هے حالانکہ حضرت عیسی مسیح علیہ لسلام چارسال پہلے پیدا هوئے تھے ۔

١٩٢٣ء میں مجلس اقوام جنیوا نے ماهروں کی ایک خاص کمیٹی اس کیلنڈر کو صحیح کرنے کے لئے بنائی تھی ۔ کمیٹی نے طویل عرصہ تک کام

کرکے ایک ضخیم رپورٹ بھی پیش کی مگر ثابت یہ ہوا کہ ایسا کیلنڈر بنانا ممکن نہیں ہے جو دوامی طور پر موسم کا ساتھ دے سکے ۔

سنہ ھجری :

عرب میں زمانہ نایادگار سے قمری سال رائج تھے ۔ اور مہینوں کے نام بھی یہی تھے ۔ محرم، صفر، ربیع‌اول وغیرہ، آخری مہینہ میں کعبہ کا حج ہوا کرتا تھا ۔ اسی لئے عرب عام طور پر لفظ حج بول کر مجازاً سال بھی بولتے تھے قرآن مجید میں لفظ حج بمعنی سال استعمال ہوا ہے ۔ حضرت موسی علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کے ما بین حضرت بی‌بی صفورہ کے نکاح کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں کہا گیا ہے ۔

قال انی ارید ان انکحك احدی ابنتی هاتین علی ان تاجرنی ثمانی حجج فان اتممت عشرا فمن عندك وما ارید ان اشق علیك ستجدنی انشاءالله من الصالحین ۔ (سورۃ القصص آیت ۲۷)

(حضرت شعیب نے) کہا کہ میں تم سے اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح اس مہر پر کر دینا چاھتا ہوں کہ تم آٹھ سال تک میرے پاس مزدوری کرو، پھر اگر تم نے دس سال پورے کر دئے تو یہ تمہاری طرف سے ہوں گے ۔ میں تم پر جبر کرنا نہیں چاھتا انشاءاللہ تم مجھ کو نیکوکار ھی پاؤگے ۔

حج کا اجتماع اگرچہ ایک مذھبی فریضہ کی ادائیگی کے لئے ہوتا تھا لیکن عرب کے لوگ اس اجتماع سے تجارتی و ثقافتی فائدے بھی اٹھاتے تھے ۔ بڑے پیمانے پر تجارت ہوتی تھی اور شعر و شاعری کے مقابلے بھی ہوا کرتے تھے ۔ عربوں نے یہ محسوس کیا کہ قمری مہینے موسم کا ساتھ نہیں دیتے اس لئے انھوں

نے غالباً یہودیوں سے سیکھ کر اپنے قمری سال میں بھی کبیسہ کا طریقہ رائج کردیا ۔ لیکن نہایت غیر علمی انداز میں اور صحیح معنوں میں پھوھڑ پن کے ساتھ ۔ ہر تین سال کے بعد وہ ایک زاید تیرھواں مہینہ کسی مہینہ کے ساتھ بڑھا دیتے تھے ۔ اس طرح تین سال تک حج آخری مہینہ یعنی ذی‌الحجہ میں ہوتا، اور اس کے بعد تین سال تک محرم میں پھر تین سال تک صفر میں، اس طرح گھوم کر پھر ذی‌الحجہ میں آجاتا ۔ لیکن اس طرح ہر چھتیس سال میں ایک سال کا حج ساقط ہوکر گم ہوجاتا ۔ سنہ ۱۰ھ کا حج جو تاریخ اسلام میں حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے، اس دورہ کے بموجب پھر ذی الحجہ میں آگیا تھا ۔ دو ماہ سے مکہ اور مدینہ کے مابین رویت ہلال کا فرق آرہا تھا اس لئے مکہ میں جو حج ہوا وہ ۹ ذی الحجۃ کو جمعہ کے دن ہوا اور اسی روز وقوف عرفات کی تاریخی پڑی لیکن مدینہ منورہ میں جو رویت ہلال ہوئی تھی اس کے اعتبار سے مدینہ منورہ میں ذی‌الحجہ سنہ ۱۰ ہجری کی آٹھویں تاریخ تھی ۔

ہمارے سامنے ایسی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں جس کی بنا پر ہم قمری تقویم میں کبیسہ کے وقت کی تعیین کر سکیں لیکن عرب قصہ کہانیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ عمل ہجرت سے ڈیڑھ سو سال پہلے ہوا ہوگا ۔ پہلے پہلے جس شخص نے حج کے موقع پر کبیسہ کا اعلان کیا تھا وہ بنی کنانہ کا ایک حساب دان قلمس نامی تھا ۔ اس کے بعد یہ رواج ہو گیا کہ بنی کنانہ کا سردار ہی ہر سال اعلان کیا کرتا تھا ۔ اور اسی کے ساتھ وہ یہ بھی اعلان کرتا تھا کہ آئندہ سال میں حرمت کے چار مہینے کون سے ہوں گے ۔ اس عمل کو

اصطلاحاً النسئی کا نام دیا گیا تھا ـ یه دونوں قسم کے اعلان، اول یه که آینده سال کس ماہ کے ساتھ زاید مہینه ہوگا اور دوم یه که حرمت والے مہینوں کون سے ہوں گے، جو سردار یه اعلان کرتا تھا اس کو قلمس کا لقب دیدیا گیا تھا ـ اسی لئے اس کی جمع قلامسه بھی بن گئی ـ اب یه نام شخصی نام کے بجائے ایک عہدہ کا نام ہو گیا ـ چونکه حج مذہبی رسم اور تجارتی اجتماع دونوں کی حیثیت رکھتا تھا اس لئے عربوں نے تجارتی نقل و حرکت کو پر امن رکھنے کے لئے چار مہینوں کو حرمت کے پر امن مہینے قرار دے لیا تھا جس میں لوٹ مار اور رہزنی سے احتراز کیا جاتا تھا ـ ان مہینوں کو الشہر الحرام کہا کرتے تھے ـ اور جناب قلمس ان میں حسب منشاء تبدیلیاں کیا کرتے تھے ـ ـ قرآن مجید کی سورہ التوبه آیت نمبر ۳۷ میں جہاں النسی کو حرام کیا گیا ہے قلامسه کے اس عمل کا ذکر موجود ہے ـ

دو تقویم :

قلامسه کے عمل کبیسه کو مکه مکرمه اور اس کے قریب کے چند مقامات کے سوا اور کہیں قبول نہیں کیا گیا ـ بالکل اسی طرح جیسے ۱۵۸۲ء میں پاپائے گریگوری کے بنوائے ہوئے کیلنڈر کو سارے یورپ نے فوراً قبول نہیں کیا تھا، انگلستان اور روس نے تو کئی سو سال کے بعد قبول کیا ـ بالکل اسی طرح عربوں نے کیا ـ اور اب دو تقویمیں عرب میں پیدا ہوگئیں ـ ایک بغیر کبیسه کے قمری سال والی تقویم جو مکه اور نواح مکه کے سوا سارے عرب میں رائج تھی، اسے ہم بدوی یا مدنی تقویم کہتے ہیں ـ اور دوسری تقویم کبیسه والی قمری تقویم جس کے بموجب حج ہوتا تھا ـ اور اہل مکه اسی طرح سال کا حساب کرتے

تھے ، اسے ہم حضری یا مکی تقویم کہتے ہیں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ کسی واقعہ کو ایک راوی ماہ شعبان کا واقعہ بتاتا ہے تو دوسرا اسی واقعہ کو ماہ شوال کا واقعہ قرار دیتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایک مکی تقویم کے بموجب بیان کرتا ہے اور دوسرا مدنی تقویم کے بموجب۔

یہ صورت حال ذی الحجہ ۱۰ھ تک باقی رہی جب کہ آیت قرآنی نے کبیسہ اور نسئی کی ممانعت کردی، اور حجة الوداع کے خطبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نسئی کے ممنوع ہونے کا اعلان فرما دیا۔ اس کے بعد سے بغیر کبیسہ کا قمری سال بارہ مہینوں کا رائج ہوگیا جو آج بھی قائم ہے۔ اگرچہ پچھلے چودہ سو سال کے عرصہ میں ملکی ضروریات کے لئے مختلف ملکوں میں شمسی سال رائج ہوئے اور بار بار تقویمیں بنتی رہیں لیکن ھجری سنہ میں کوئی ترمیم نہیں ہو سکی۔ یہ ہمیشہ بارہ قمری مہینوں کا ہی رہا۔ ایران میں شمسی ھجری سال بنایا گیا لیکن یہ قمری ھجری سال کو مٹا نہ سکا، عمر خیام نے تقویم بنائی جلال الدین خوارزم شاہ نے تقویم بنائی، ہندوستان کے شہنشاہ اکبر نے تقویم بنائی، فرمارویان بنگال نے فصلی تقویم بنوائی، اور ان کے علاوہ بہت سی تقویمیں شمسی حساب سے بنیں، اور مقامی طور پر رائج بھی رہیں، حیدرآباد دکن میں متعدد زمانوں میں ترمیم کے ساتھ شہنشاہ اکبر کی تقویم جلالی ۱۹۴۸ء تک رائج تھی، افغانستان میں بھی شمسی تقویم رائج تھی، ایران میں بھی شمسی تقویم رائج ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی تقویم بھی قمری تقویم ھجری کو فراموش نہ کراسکی، عیدین رمضان وغیرہ سب مدنی تقویم کے بموجب ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر حصہ میں ایک ارب مسلمان مدنی تقویم کو یاد رکھتے ہیں اور اسی کے بموجب مذہبی اور معاشرتی تقریبات شادی وغیرہ انجام پاتی ہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قمری سال میں موسموں سے ہم آہنگی کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ موسموں کے بدلنے کا دار و مدار زمین کی آفتاب سے قربت اور بعد پر ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ قمری سال کا سمجھنا عام آدمی کے لئے شمسی سال یا کسی دوسرے حسابی سال سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دنیا کی تمام اقوام نے فصلی ضروریات کے لئے شمسی حساب کو اختیار کرنے کے باوجود بغیر کسی حساب یا آلہ کے محسوس ہونے والے بارہ قمری مہینوں کے سال کو قایم رکھا۔ ظاہر ہے کہ عوام کسی جگہ کے ہوں دھنوتری اور خیام جیسے حسابی یا ماہر فلکیات نہیں ہو سکتے ہیں۔ اور یہ کسی طرح ایک عام آدمی کی سمجھ میں آنے والی بات ھی نہیں ہے کہ ۳۱ دسمبر کا آفتاب یکم جنوری کے آفتاب سے زیادہ روشن یا زیادہ گرم ہوتا ہے۔

مہینوں کے نام :

غرض یہ کہ ہماری ہجری تقویم بھی وھی قمری تقویم ہے جو زمانہ قبل از تاریخ سے سمیری، بابلی اشوری تہذیبوں میں موجود تھی، عرب میں اس کے بارہ مہینوں کے نام بھی نزول قرآن سے بہت پہلے رکھے جا چکے تھے۔ ان ناموں کے لغوی معنی پر غور کرنے سے یہ قیاس قائم ہوتا ہے کہ شاید پہلی بار انھیں موسموں کی رعایت کے ساتھ موسوم کیا گیا ہوگا۔ اور بعض ناموں میں عرب کے عقاید و رواج کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہوگا۔ ان ناموں کے لفظی معنی یہ ہیں۔ ہمارے پاس اس کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ مہینوں کے یہ نام کب رکھے گئے اور ان ناموں سے پہلے ان کے نام کیا تھے۔

(۱) محرم ۔ جنگ و جدال کے حرام ہونے کا زمانہ

(۲) صفر ۔ خالی (بے کاری کا زمانہ)

(۳ - ۴) ربیع ۔ بہار ۔ ربیع الاول و ربیع آخر

(۵ - ٦) جمادی ۔ خزاں، جم جانے والا ۔ جمادی اولی و جمادی اخری

(۷) رجب ۔ تعظیم، کھجور میں تھمی لگانا

(۸) شعبان ۔ پھیلانا اور متفرق ہونا

(۹) رمضان ۔ تپش

(۱۰) شوال ۔ اونٹنی کا گابھن ہونا

(۱۱) ذوقعدہ ۔ برائے آرام بیٹھنے والا

(۱۲) ذوالحجۃ ۔ حج والا

موسموں کے ساتھ ہم آہنگی قایم نہیں رہ سکتی تھی، اور قایم نہیں رہی ہوگی، لیکن یہ نام باقی رہ گئے ۔ حتی کہ جب عرب والوں نے اپنے حج کو موسم کے ساتھ ہم آہنگ رکھنے کے لئے کبیسہ یا لوند کا طریقہ رائج کیا، اور اس سے بھی کام نہ چل سکا تو نسئی کا طریقہ اختیار کرلیا ۔ اس کے بعد بھی مہینوں کے نام یہی رہے ۔ مکی یا حضری تقویم میں بھی یہی نام مستعمل تھے ۔ اور مدنی یا بدوی تقویم میں بھی مہینوں کے نام یہی تھے ۔

نقطہ آغاز :

کسی واقعہ کے لئے وقت واقعہ اور اس سے پہلے واقع ہونے والے واقعہ کے درمیانی فاصلوں کو بیان کرنے کا طریقہ زمانہ قبل از تاریخ سے رائج ہے ۔ مثلاً یہ واقعہ طوفان نوح کے اتنے سال بعد ہوا یا یہ واقعہ فلاں بادشاہ کی تخت نشینی

کے پانچویں سال میں ہوا۔ فلاں بزرگ کی ولادت کے اتنے سال بعد یہ واقعہ ہوا۔ جس پہلے واقعہ سے زمانہ کی یہ پیمایش شروع کی جاتی ہے اس کو سنہ کا نقطہ آغاز کہتے ہیں۔ واقعہ کی توقیت کا یہ طریقہ خدا جانے کب سے رائج ہے۔ کتاب مقدس بائبل کے عہد نامہ عتیق میں بار بار یہ طریقہ بیان ملتا ہے مثلاً رحبعام بادشاہ کے پانچویں برس میں ایسا ہوا کہ مصر کا بادشاہ سیسق یروشلم پر چڑھ آیا۔ (۲۔ تواریخ باب ۱۲۔ فقرہ ۲)

اسی طرح دوسرے ممالک میں بھی بادشاہوں کی تخت نشینی، یا آتش فشاں کے پھوٹ پڑنے کے سال سے یا سیلاب یا کسی مشہور جنگ سے شمار قایم کر لیتے ہیں۔ جس کی ایک مثال سنہ بکرمی ہے یہ اوجین کے راجہ بکرماجیت کے راج گدی پر بیٹھنے سے شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح قبطی سنہ شاکا شالباھن وغیرہ کی ابتدا ہوتی ہے۔

عرب کے مختلف علاقوں میں بھی اسی طرح سنین کے شمار کا طریقہ موجود تھا۔ یمن میں سدمارب کی شکست سے، اس کے بعد ملک الیمن سیف بن ذی یزن کی جنگ میں کامیابی سے سال شمار ہوتا تھا۔ حجاز میں سب سے زیادہ مشہور اور اہم واقعہ ابرھہ کا کعبہ پر حملہ اور تباھی کا واقعہ تھا۔ اس لئے حجاز میں سنہ کی ابتدا وھیں سے کی جاتی تھی۔

ھجری سنہ کی ابتداء یوں ہوئی کہ ھجرت مدینہ کے چھٹے سال جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ‌وسلم نے تبلیغی خطوط لکھوائے تو صحابہ میں سے بعض نے تاریخ تحریر لکھوانے کی رائے دی۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اس پر لکھ دو کہ ھجرت کے چھٹے سال میں یہ خط لکھا گیا۔ اس روایت کو ابن عساکر نے

تاریخ دمشق جلد اول میں نقل کیا ہے ۔ اور امام السخاوی نے رسالہ الشماریخ میں بھی یہ روایت لکھی ہے ۔ عام طور سے ارباب تاریخ یہ بیان کرتے ھیں کہ ۱۷ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دفاتر حکومت کی تنظیم کی تو تمام سرکاری مراسلات اور کاغذات میں سنہ هجری کی تعیین کے ساتھ تاریخ کا اندراج لازمی قرار دیا اور اس وقت سے سنہ هجری چل پڑا ۔ غالباً پہلی روایت بھی غلط نہ ہوگی ۔ البتہ اس وقت کوئی دفتر نہیں تھا اس لئے جب حضرت فاروق اعظم نے سرکاری طور پر بذریعہ فرمان سرکاری مکاتبات میں تاریخ هجری کا اندراج ضروری قراردیا تو لوگوں نے اسی کو ابتداء سمجھ کر بیان کر دیا ۔ اس لئے میرے خیال میں یہ دونوں روایتیں صحیح ھیں اور ان کے مابین کوئی تخالف نہیں ہے ۔

جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے مسلمانوں نے مفتوحہ ممالک میں مقامی رسم و رواج کے صرف اسی حصہ کو بدلا تھا جو شریعت اسلامی کے خلاف تھا ۔ عام طور پر مفتوحہ ممالک میں وهی سنین اور تاریخیں رائج تھیں جو فتح اسلامی سے پہلے سے رائج تھیں ۔ مثلاً مصر میں قبطی سنہ باقی رہا ۔ شام و فلسطین میں روم کا جولیانی سنہ باقی رہا ۔ اور ایران و افغانستان میں سنہ کیخسرو اور سنہ لقائی موجود رہا ۔ اور سنہ و تاریخ ھی کیا دفاتر کی زبان بھی مقامی ھی رھی ۔ مصر میں قبطی، شام وفلسطین میں آرامی، ایران میں فارسی، اور افغانستان و بلوچستان میں اوزبکی اور پشتو، بلوچی وغیرہ ۔ مالگزاری کے دفاتر میں اگرچہ مقامی زبانیں اور مقامی سنیں باقی رہے مگر عدالتوں میں اور والی ملک کے دفاتر میں عربی زبان ھی مستعمل تھی ۔ اور مرکز خلافت سے خط و کتابت بھی عربی زبان ھی میں ہوتی تھی، اور ان مراسلات پر تاریخیں بھی هجری سنہ کے بموجب ھی درج کی جاتی تھیں ۔

۷۶ھ - ۶۹۵ء میں امیر المومنین خلیفہ عبدالملک بن مروان نے یہ حکم دیا کہ مقامی دفاتر کو عربی میں منتقل کر دیا جائے - اس وقت پہلی بار یہ سوال پیدا ہوا کہ محکمہ عشر و خراج میں تاریخیں کیا درج ہوں، قمری مہینے تو موسم کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور عشر و خراج وغیرہ مالگزاریوں کی وصولی موسم کے بموجب ھی ھوسکتی ھے - اس کا حل یہ نکالا گیا کہ یکم محرم سنہ ۱ھ کو نقطہ آغاز قرار دے کر شمسی سال شمار کرلئے جائیں، لیکن اس طرح کے شمسی ھجری سال ھر ملک میں نہیں بنائے گئے - مصر نے مالگزاری اور دیگر ملکی ضروریات کے لئے قبطی شمسی سال قایم رکھا، البتہ یہ طریقہ جاری کردیا کہ قمری ھجری سال بھی ساتھ ساتھ لکھدیا جاتا تھا - یہ صورت حال فاطمی خلیفہ المستنصر ۴۲۷ھ - ۱۰۳۵ء تا ۴۸۷ھ - ۱۰۹۴ءکے زمانہ تک قایم رھی، اس وقت ایک ھجری قمری تقویم بنائی گئی جس کی بنیاد قاھرہ میں پیدائش قمر پر قایم کی گئی اور آج تک داؤدی بوھروں اور آغاخانیوں کے نزدیک مذھبی تقدس کے ساتھ مقبول ھے - مگر مصری عوام نے جیسے فاطمی فقہ کو رد کردیا تھا اس تقویم کو بھی قبول نہیں کیا -

ایران میں شمسی ھجری سنہ بنایا گیا لیکن اس وقت تو مقبول نہ ھوا البتہ سامانی دور حکومت میں یعنی ۲۷۹ھ - ۸۹۲ءکے بعد سرکاری طور پر رائج ھوسکا - اور قاچاری دور میں چند ترمیموں کےساتھ جاری ھو گیا - ھندوستان میں اکبر کا ماہ جلالی بھی اسی اصول پر بنا تھا - ۹۰۰ھ کے قمری سال کے اختتام کو نقطہ آغاز قرار دے کر شمسی سال شمار کرلئے گئے - اور مہینوں کے نام مجوسی تقویم سے لے لئے گئے تھے - یہ جلالی تقویم کہلاتی ھے - افغانستان میں بھی اسی طریقہ سے تیرھویں صدی ھجری قمری میں ایک شمسی تقویم تیار کی گئی - اس میں مہینوں کے

نام بارہ آسمانی برجوں کے نام ھی رہے ۔ اور اس کی ابتداء بھی ۲۱ مارچ یعنی تحویل شمسی در برج حمل سے رکھی گئی ۔ باقی مہینوں کے نام بھی بارہ برجوں ھی کے نام رہے ۔ لیکن سرکاری دفاتر سے باھر یہ تقویم مقبول نہ ھوئی ۔ سنہ ھجری قمری ھی قایم رھا ۔

ریاست حیدرآباد دکن میں یہ رواج تھا کہ عام ملکی ضروریات اور دفتری مراسلات کے لئے اکبر کی تقویم جلالی، فصلی سنہ کے نام سے جاری تھی ۔ مگر فرامین شاھی اور دفتر حضور میں تاریخوں کا اندراج سنہ ھجری شمسی سے ھوتا تھا ۔

سنہ ھجری کا آغاز :

مسلمانوں نے اپنی تقویم کا نقطہ آغاز ھجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں قرار دیا، اس کا جواب آپ کو تفصیلی طورپر تاریخ اسلام میں ھجرت کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی اثرات کے مطالعہ میں ملے گا ۔ اور یہ نظر آئے گا کہ ھجرت سے پہلے مسلمان کوئی قوم نہ تھے ۔ مخلص خدا پرستوں کا ایک گروہ تھا، گھر میں دو بھائی دو مذھب رکھتے تھے ۔ باپ بیٹا اور میاں بیوی دو الگ الگ مذاھب کے پیرو کار تھے ۔ اسی طرح خیر وشر کا معیار میاں کے نزدیک اور تھا اور بیوی کے نزدیک اور، باپ کے نزدیک اور تھا اور بیٹے کے نزدیک اور، اسی طرح مسلمانوں کو مکہ میں کوئی سیاسی اقتدار بھی حاصل نہ تھا ، وہ دارالندوہ کے فیصلوں اور ابوجہل کے اقتداراعلی کے ماتحت زندگی بسر کر رہے تھے ۔

اگرچہ تقویم کا نقطہ آغاز بنانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ، ۶۱۰ء میں نزول قرآن مجید کی ابتداء اور واقعہ اسراء وغیرہ متعدد یادگار واقعات موجود تھے مگر ان سب پر غور کرنے کے بعد ھر شخص بڑی آسانی کے

ساتھ یہ سمجھ سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی واقعہ ہجرت سے زیادہ اثر انداز اور عہد آفریں نہیں تھا۔ اور نہ قرآن مجید نے مسلمانوں کو شخصیت پرست ہونے کی تعلیم دی تھی۔ اس لئے یہی ہوسکتا تھا اور یہی ہوا کہ مسلمانوں نے اپنی تقویم کا نقطہ آغاز سال ہجرت کی پہلی محرم کو قرار دیا۔ پہلی محرم سنہ ۱ ہجری قمری، مطابق ہے جمعہ ۱۶ جولائی ۶۲۲ء گریگوری اور سنہ ۴۳۸۳ خلیقہ یہودی تقویم کے۔

اگرچہ اسی تطابق سے کام چلانے کے لئے تقابلی جدولوں میں حساب کرلیا جاتا ہے، لیکن حقیقتاً یہ صحیح نہیں ہے۔ شمسی تقویموں میں بار بار ترمیمیں ہوتی رہی ہیں۔ اور ہم یقین کے ساتھ کسی تطابق کو بالکل صحیح قرار نہیں دے سکتے۔ البتہ یہ پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یکم محرم ۱ھ سے بارہ قمری مہینوں کے سال بغیر کبیسہ و ترمیم شمار ہوں تو موجودہ سال ۱۳۰۰ھ ہے۔ شمسی سال سے کوئی جس طرح حساب کرنا چاہے، کرلے ہجری قمری سال پر اس حساب کا کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔ اس صدی کے ماہرین میں سے مسٹر وسٹنفیلڈ، مسٹر گرین فیل، مسٹر ہیزارڈ، منشی دیبی پرشاد بدایونی، منشی دوارکا ناتھ بنارسی، محمد مختار پاشا الفلکی، ڈاکٹر حسام محی الدین اور سید ابراہیم وغیر ہم نے جمعہ ۱۶ جولائی سنہ ۶۲۲ء گریگوری کو یکم محرم سنہ ۱ھ قرار دیا ہے۔ اور اسی بنیاد پر تقابلی جدولیں تیار کی ہیں۔ دوسرا کوئی ماہر ریاضی دان دنوں کے شمار سے ۱۶ جولائی کی بجائے ۱۵ یا ۱۷ جولائی بھی بتا سکتا ہے۔ لیکن اس سے عملی طور پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ حقیقت بہر حال قایم رہے گی کہ قمری سال

اور هجری تقویم حقیقی فاصله زمانی کو ظاهر کرتی هے اور شمسی تقویمیں حسابی اور ریاضیاتی فاصله کو بتاتی هیں - یه طویل اور دقیق عمل حسابی کی محتاج هیں -

---

سن ھجری اور قمری حساب

پروفیسر سید حسین شاہ فدا

سن عیسوی کے رواج نے سن ھجری سے ھمیں بیگانہ کر دیا ھے حالانکہ ھجرت کا واقعہ انسانی تاریخ کا زندہ جاوید واقعہ ھے اور اسلامی تاریخ میں ھجرت مدینہ کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ھے ۔ مدینے میں اسلامی ریاست کی تاسیس کا فوری سبب ھجرت ھی ھے ۔ سن ھجری کا شمار شمسی کے بجائے قمری حساب پر رکھنے کی کچھ وجوہ تھیں ۔

سن ھجری کا آغاز معلوم کرنے کے لئے اسلامی تاریخ کو کھنگالئے ۔ حضرت عمر کے زمانے میں فتوحات کا دائرہ روز بروز وسیع ھوتا جارھا تھا ۔ حکومت کے کاروبار اور دفتری کاغذات، حوالہ جات کے بغیر نا مکمل صورت میں چل رھے تھے اور ھر طرف سے اجرائے سن کا مطالبہ ھو رھا تھا ۔ بلکہ ایک مرتبہ یمن کے ایک گورنر نے حضرت عمر کو شکایت کے طور پر لکھا کہ آپ کے فرامین میں تاریخ اور سن کا حوالہ نہیں ھوتا ۔ حضرت میمون بن مہران کے پاس ایک چیک ایسا آیا جس پر صرف ''شعبان،، لکھا تھا ۔ ابو موسی اشعری بھی شاکی تھے ۔ اھل عجم ھمیشہ تاریخ اور سن لکھا کرتے تھے ۔ جس قوم کو ''خیر امت،، کا لقب عطا ھوا ھو وہ اس ضمن میں کیوں پیچھے رھتی ۔ بیت‌المال میں زمانے کی قید کے بغیر زر و مال رکھنا بھی ایک مسئلہ تھا اس لئے ضرورت کے احساس نے مجبور کیا کہ دیگر سنین کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لئے کوئی منفرد سن رائج کیا جائے ۔ چنانچہ حضرت عمر کے زمانہ میں اس مسئلے کا حل تلاش کیا گیا ۔ بعضوں نے

ذوالقرنین کے زمانے سے تاریخ لکھنے کا مشورہ دیا - کسی نے ایرانیوں کی تاریخ پسند کی - لیکن بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ اسلامی واقعات میں سے کسی مشہور واقعہ کو بنیاد بنایا جائے - بعضوں نے نبی صلعم کی تاریخ ولادت سے آغاز کا مشورہ دیا - کسی نے تاریخ بعثت سے اور کسی نے عام الحزن سے شروع کرنے کی رائے دی - حضرت علی نے ہجرت کے سال سے آغاز کار کا مشورہ دیا - اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ ابتداء کس مہینے سے کی جائے - کسی نے رمضان شریف تجویز کیا کہ قرآن اسی مبارک مہینے میں نازل ہوا - کسی نے محرم الحرام کو نقطہ آغاز قرار دینے کا مشورہ دیا کہ لوگ حج سے فارغ ہو کر نئے سرے سے کاروبار وغیرہ شروع کرتے ہیں - چونکہ محرم کا مہینہ اہل عرب کے نزدیک ویسے بھی متبرک متصور ہوتا تھا - ''شہر حرام'' ہونے کی وجہ سے جنگ و جدال بھی اس مہینے میں ممنوع تھی - لہذا سب نے بالاتفاق اسے پسند کیا -

ہجرت کے واقعہ نے تاریخ کا رخ موڑ کر رکھ دیا تھا - یہ ایک تاریخی سفر تھا - کفار مکہ نے رسول اللہ صلعم کو (خاکم بدھن) قتل کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا - اس وقت اللہ تعالی کی طرف سے آپ کو ہجرت کرکے مدینہ چلے جانے کا حکم ہوا - آپ نے ہجرت سے دو ہفتہ قبل مدینہ کے دو مخالف قبائل اوس اور خزرج کے سرداروں سے ایک معاہدہ طے کیا اور اسلامی احکام کے اتباع کا ان سے عہد لیا - ان سرداروں نے بھی آپ سے عہد لیا کہ آپ واپس مکہ نہیں جائیں گے - یہ معاہدہ ''بیعت عقبہ'' کے نام سے مشہور ہے - ہجرت کے وقت حضرت علی رات کو آپ کے بستر پر سوئے - حضرت ابوبکر کو آپ نے ساتھ لیا اور پوشیدہ طریقے سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے - بارہ ربیع الاول کو آپ مدینہ میں فروکش ہوئے - یہ سفر مکہ سے ۲۷ صفر کو شروع ہوا تھا - غار ثور میں کچھ

وقت گزارنے کے بعد یکم ربیع الاول کو آپ وھاں سے نکلے تھے ۔ ھجرت کا واقعہ ماہ ربیع الاول میں پیش آیا ۔ لیکن چونکہ سب کا اتفاق محرم کے مہینہ سے ابتدا کرنے پر ھوا اس لئے دو مہینے اور آٹھ دن جو گزر چکے تھے اس مدت کو کم کرکے یکم محرم ۱ ھ سے اسلامی تقویم کی ابتداء کر دی گئی ۔ علماء اور مورخین کا اس پر اتفاق ھے کہ واقعہ ھجرت کے ۱۷ سال بعد ھجری سن کا نفاذ ھوا ۔

سن ھجری کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت یہ ھے کہ اس کے تمام مہینے موسم کے اعتبار سے بدلتے رھتے ھیں ۔ رمضان کا مہینہ کبھی کسی موسم میں آتا ھے تو کبھی کسی موسم میں ۔ اسی طرح یوم الحج بھی مختلف موسموں میں آتا ھے ۔ اور اس طرح مسلمانوں کو ھر موسم کا تجربہ ھوتا رھتا ھے ۔ مختلف ممالک کے موسم بھی مختلف ھوتے ھیں اس لئے تمام دنیا کے مسلمان اس تبدیلی کو پسند کرتے ھیں ۔

جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ھے کہ ایک صدی کا اختتام اور دوسری صدی کا آغاز اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی سانحہ لے کر آتا ھے ۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے دلیل کے طور پر آٹھویں صدی ھجری تک کے واقعات بھی لکھے ھیں ۔ اکثر علماء نے اس قسم کی باتوں کو توھم پرستی ھی قرار دیا ھے ۔ اور یہ مفروضہ کہ اب چودھویں صدی ھجری کے اختتام پر قیامت آنے والی ھے انھی اوھام کی بنیاد پر قائم ھے ۔ اسلام جیسے دین حق میں ایسے توھمات کی کوئی گنجائش نہیں ۔ ویسے تو امت مسلمہ ھمیشہ ھی آزمائش اور ابتلا میں رھتی ھے ۔ ''الدنیا سجن للمومنین،، دنیا مومنین کے لئے قید خانہ ھے ۔ عصر رواں کی فکری اور نظریاتی یلغار نے ھمارے دینی اصول و ضوابط کو خدشات کی نذر کرکے ھمیں صراط مستقیم سے ھٹانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا ۔

ہم بصارت اور بصیرت دونوں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں ۔ سورج گرہن اور چاند گرہن جو اپنے معمول کے مطابق آتے ہیں ان سے بھی ہم نے طرح طرح کے توہمات وابستہ کر رکھے ہیں ۔ قیامت کا موہوم تصور پیدا کرنے میں کئی سائنسدان بھی ملوث ہیں ۔ ان کے اخذ کردہ نتائج اور بعض اہل نجوم کی پیشگوئیاں حیرت انگیز تو ضرور ہیں، لیکن ''علم الساعت،، جسے صرف خداوند عالم ہی جانتا ہے، اس نظریہ کے خلاف ہے ۔ یہ باتیں ہمارے عقیدے اور ایمان کو ضعف پہنچا رہی ہیں ۔ مسلمانوں کی مخالف طاقتوں نے پروپیگنڈے کا جال پھیلا رکھا ہے ۔ ماہرین فلکیات عالم الغیب نہیں ہیں ۔ نظام شمسی کو ۱۸۰۰ء اور ۱۸۳۵ء میں بھی تبدیلی سے دوچار ہونا پڑا تھا ۔ لیکن قیامت اس وقت بھی نہیں آئی تھی ۔ سورج کی کشش ثقل باقی تمام اجرام سماوی کی کشش ثقل سے زیادہ ہے ۔ اس لئے نظام شمسی کے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ الا ماشاء اللہ ۔ یعنی جب خدا چاہے ۔ اور وہ وقت کسی کو معلوم نہیں ۔ اس کا علم صرف خدا کے پاس ہے ۔

مسلمانوں کے عقائد سے متعلق توہمات کی بحث ضمناً آگئی ۔ آمدم بر سر مطلب ۔ سن عیسوی حضرت عیسی کی وفات سے شروع ہوتا ہے ۔ سن فصلی جلال الدین اکبر کے دور کی یادگار ہے ۔ اسی طرح اور بھی سنین رائج ہیں ۔ لیکن شرعی احکام کا دارومدار قمری حساب پر ہوتا ہے ۔ مثلاً رمضان، حج، زکوۃ، عیدین، عدت طلاق، مدت حمل، ایام رضاعت وغیرہ، گویا بقول قرآن چاند وقتوں کی پہچان کا ذریعہ ہے، اس لئے قمری حساب کو محفوظ کر لینا ہمارے لئے فرض کفایہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سن ہجری کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ۔ قرآن

کے مطابق چاند کے لئے منزلیں مقرر ھیں ۔ اصحاب کہف اپنے کتے سمیت جو تین سو نو سال تک غار میں زندہ رہے وہ عرصہ بھی قمری حساب ھی سے شمار ھوا ۔

ھجرت کے بعد سے مسلمانوں پر اللہ تعالے کی طرف سے فتح و نصرت کے دروازے کھل گئے تھے اور اسلام روز بروز ترقی کرنے لگا اس لئے ھجرت کے واقعہ سے ھی حضرت علی کے مشورہ کے مطابق حضرت عمر نے ھجری سن کا آغاز کیا ۔ ھند و پاک میں ھمیشہ سن ھجری ھی رائج رھا ۔ انگریزوں نے آکر اسے مٹایا اور ھندو قوم نے اس اقدام کا سب سے زیادہ خیر مقدم کیا ۔ ھندو قوم ایک ھزار سال تک مسلمانوں کے زیر نگیں رھنے کے باعث مسلمانوں کے تمام آثار سے متنفر تھی ۔ حالانکہ مسلمان حکمرانوں نے ھمیشہ اس قوم کے افراد کو، شاھان لودھی کے وقت سے لے کر مغلوں کے آخری دور تک، کاروبار حکومت میں شریک رکھا ۔ ھندوؤں نے مسلمان بادشاھوں کی قدر دانی سے متاثر ھوکر ھی فارسی زبان میں مہارت حاصل کی تھی، اعلے اور مستند کتابیں تصنیف کیں، اور بلند مراتب پر فائز ھوتے رھے ۔ انھوں نے سن ھجری کے مٹانے اور سن عیسوی کی ترویج میں معاونت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے قومی سن ھندی (سن بکرمی) کا دامن بھی نہ چھوڑا ۔ اور مسلمانوں نے فوراً ھی سن عیسوی کی پیشوائی کی اور اس کے ساتھ ایسے چمٹے کہ اب تک سن عیسوی پر فدا ھیں ۔ ھندی سن کی تقویم (کیلنڈر) اور جنتریاں اب بھی شائع ھوتی ھیں لیکن مسلمانوں کا طرز عمل اس کے خلاف ھے ۔ یہ انگریزی زبان اور سن عیسوی کے والہ و شیدا ھیں ۔ یہانتک کہ تاریخ ولادت اور تاریخ وفات بھی سن عیسوی ھی میں نکالتے ھیں ۔ عہد حاضر کے مشاھیر اور بزرگان دین کے عرس وغیرہ بھی سن عیسوی کی تاریخوں سے منائے جاتے ھیں ۔

دور کیوں جائیں ہمارے اخبارات اور رسائل بھی سال نو کی مبارک باد کے لئے یکم جنوری کا دن مقرر کرتے ہیں۔ اسلامی مہینوں کے نام تک ہمیں یاد نہیں ہوتے۔ دعویٰ مہذب اور مسلمان قوم ہونے کا ہے۔

ع ۔ بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

سن ہجری ہمارے دینی شعائر میں سے ہے اور ہم نے اسے نظر انداز کر دیا ہے۔ خطوط اور حوالہ جات میں انگریزی تاریخیں ہوں گی۔ اس پر فتن دور میں ہم اپنے سن سے جو قطب ملی ہے سراسر غافل ہیں۔ سن عیسوی سے متعلق یہ بات سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس مسیحی سن کا آغاز (معاذاللہ، نقل کفر کفر نباشد) حضرت عیسی علیہ السلام کی وفات سے ہوتا ہے۔ سن عیسوی کے آگے اے ڈی (A. D.) لکھا جاتا ہے۔ جس کا مطلب ہوتا ہے After the Death یعنی عیسی علیہ السلام کی وفات کے بعد، حالانکہ قرآن کریم کو پڑھنے والے خوب جانتے ہیں کہ عیسے علیہ السلام نہ تو فوت ہوئے تھے نہ انھیں سولی دی گئی تھی، یعنی انھیں قتل نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ ان کے حواری شک و شبہہ میں پڑ گئے تھے کہ اللہ تعالی نے عیسی کو آسمان کی طرف اٹھا لیا ہے۔

سن ہجری کی ابتداء واقعہ ہجرت سے ہوتی ہے اور واقعہ ہجرت اسلامی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔ رسول اکرم نے مدینہ پہنچتے ہی سب سے پہلے وہاں مسجد نبوی کی بنیاد رکھی۔ ایک اعلی طرز کی نظریاتی ریاست کو چلانے کے لئے مستحکم مرکز کی ضرورت تھی۔ اسی مسجد میں مہاجرین اور انصار کے باھمی تعلقات کو فروغ دے کر تبلیغ اسلام کے خوشگوار فرض کو سر انجام

دینے کا کام شروع کر دیا گیا ۔ اور رشتہ مواخات کو حقیقی رشتوں میں تبدیل کر دیا گیا ۔ مہاجرین بھی آسودہ اور خوشحال ہوگئے ۔ آبادکاری کا مسئلہ بھی آسانی سے حل ہو گیا ۔ اتحاد اور سالمیت کی کوششیں رنگ لائیں ۔ ایک خدا، ایک قبلہ اور ایک قانون کی حکمرانی تھی ۔ ''منشور مدینہ،، تیار کرکے مدینہ منورہ کو مکمل شہری ریاست کا درجہ دے دیا گیا ۔ یہ ایک انقلابی اقدام تھا ۔ اس سے قبائل کی طوائف الملوکی کا خاتمہ ہو گیا اور صحیح معنوں میں اسلامی ریاست کی بنیاد پڑگئی

واقعہ ھجرت نے گویا ضعیف مسلمانوں کو قوی بنانے میں اھم کردار ادا کیا ۔ انفرادیت کی جگہ اجتماعیت کو فوقیت حاصل ہوئی ۔ اسلامی تہذیب و تمدن نے اسلامی نظام کو استوار کیا ۔ افادیت، اثرات اور نتائج کے لحاظ سے ھجرت کا واقعہ دین الٰہی کا بول بالا کرنے کا نقطہ آغاز ثابت ہوا ۔ آج کے دور میں جبکہ ہر جگہ مغرب کے اثرات غالب ھیں، عادات، اطوار، کردار، لباس، تہذیب و تمدن، غرض کہ پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آچکا ھے ، سن ھجری سے راہ فرار اختیار کرنا ھمارے لئے مزید تباھی کا پیش خیمہ ثابت ھو سکتا ھے ۔

سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی دوربین نگاہ نے چاند سے مخاطب ہوکر کہا تھا''اے چاند میرا اور تیرا رب صرف اللہ تعالٰے ھے،، (ترمذی) وہ رب جس کا کوئی شریک نہیں اور جو تمام کائنات کا مالک ھے ۔ حضرت ابراھیم نے گہرا مطالعہ کرنے کے بعد چاند سے کہا تھا ۔ ''لا احب الافلین،، یعنی میں غائب ہونے والی چیزوں کو دوست نہیں رکھتا ۔ چاند اللہ تعالی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ھے جو انسان کو فکر و تدبر کی دعوت دیتا ھے ۔ چاند سے خدا کی یاد

تازہ ہوتی ہے ۔ یعنی چاند کے گھٹنے اور بڑھنے سے انسان اپنے عجز اور اپنی کوتاہ دستی پر متنبہ ہوتا ہے ۔ اسی لئے تو ہمیں یہ دعا سکھائی گئی ہے ''اے اللہ یہ چاند ہم پر امن و سلامتی اور ایمان و اسلام کا ابھار ثابت ہو،، (مشکوۃ و ترمذی) یہ وہ دعا ہے جسے رسول اکرم فداہ امی و ابی اسوقت پڑھا کرتے تھے جب وہ پہلی تاریخ کے چاند (ھلال) کو دیکھتے تھے ۔ (بحوالہ شیخ عبدالحق محدث دھلوی ۔)

قرآن حکیم کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ قمری حساب کا آغاز خداوند قدوس کی کتاب ''لوح محفوظ،، سے ہوا ہے ۔ اس سے سن ہجری کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ تاریخی، جغرافیائی اور اقتصادی اعتبار سے بھی قمری حساب میں بہت سے افادی پہلو موجود ہیں ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی ہم مسلمانوں کو اسلامی شعائر اپنانے کی توفیق عطا فرمائے ۔

سن ہجری بھر ملت پھر سے ہو وجہ عروج
یا الٰہی ہو فدا کی یہ دعا اب مستجاب

فدا

گذشتہ صدی ھجری میں مسلم معاشرہ کے فکری رجحانات

پروفیسر محمد رفیق چوھان

مذھبی جذبہ کا اظہار مختلف ادوار میں مختلف انداز کا ھوتا ھے ۔ ھر مذھب میں مختلف النوع نکات اثر کی گنجائش ھوتی ھے اور اس کے ماننے والے کبھی ایک قسم کے نکات اثر کے تحت اپنے مذھب کی تعلیمات کی تعبیر کرتے ھیں تو کبھی دوسری قسم کے نکات اثر کے تحت ۔ مذھبی عقائد و اصطلاحات کی تعبیر و تفسیر کے اس اختلاف کی وجہ سے مختلف ادوار میں ایک ھی مذھب کے ماننے والوں کے میلانات، رجحانات اور رویوں میں بہت کچھ فرق واقع ھو جاتا ھے جس کا مشاھدہ زندگی کے متعلق ان کے عمومی رد عمل سے لگایا جا سکتا ھے ۔ چنانچہ ھم دیکھتے ھیں کہ کبھی تو مذھب کے زیر اثر ترک خودی، خود شکنی، فنا، تقدیر پرستی، بے عملی، جمود، رھبانیت اور توھم پرستی جیسے خیالات کو تقویت ملتی ھے تو کبھی مذھب کے زیر اثر ھی قوموں میں خودداری، عزت نفس، حرکت و عمل اور حقیقت پسندی جیسے رجحانات اپنے کمال کو پہنچتے ھیں، وہ حقیقت کے حرکی اور عملی پہلوؤں کو اپنے پیش نظر رکھتی ھیں، تقلید پرستی کی بجائے اجتہاد کو اپنا شعار بناتی ھیں اور فنا فی ذات باری کی بجائے فنا فی احکام باری کو اپنا مقصود بنا لیتی ھیں ۔

آج مسلم معاشرہ میں ایک خاص قسم کی بیداری اور خودشعوری کا مظاھرہ

دیکھنے میں آتا ہے ۔ مسلمان بحیثیت مجموعی اپنے نظریاتی تشخص کی بقا اور فروغ کے لئے کوشاں ہیں ۔ ان میں خود شناسی کا جذبہ اس طرح بیدار ہو گیا ہے کہ وہ وقت کی بڑی سے بڑی طاقت کو للکارنے کا حوصلہ رکھتے ہیں ۔ اس صورت حال کا موازنہ بیسوی صدی کے اوائل کے حالات سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک بڑی اور بنیادی تبدیلی ہے ۔ یہ تبدیلی اچانک یا کسی شعوری کوشش کے بغیر محض تاریخی حادثات کے نتیجے میں رونما نہیں ہو گئی بلکہ اس کی بنیادی وجہ مسلمانوں کے اپنے عقائد و تصورات کی وہ تعبیر و تفسیر ہے جس کے نتیجہ میں زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں ان کا رد عمل اپنی پیشرو نسلوں سے بہت کچھ مختلف ہو گیا ہے ۔ وہ اپنے مذہب کو محض خدا اور بندے کے نجی تعلق تک محدود رکھنے کی بجائے اسے ایک دین یا نظام حیات کے طور پر معاشرے میں جاری و ساری کرنا چاہتے ہیں ۔ ایک طرف تو وہ ان تصورات اور تعبیرات کو ترک کر رہے ہیں یا ان کی اصلاح کر رہے ہیں جو ان کی اجتماعی زندگی کی پستی اور زبوں حالی کا سبب بنتے تھے اور دوسری طرف وہ ان تصورات اور تعبیرات کو اپنا رہے ہیں جن کی بدولت زندگی کے اجتماعی مسائل کے بارے میں ان کا رد عمل زیادہ مربوط اور موثر ہوتا جا رہا ہے ۔ اس تبدیلی کے لئے درد دل اور چشم بصیرت رکھنے والے علماء اور مفکرین ایک طویل عرصے تک جہاد کرتے رہے ہیں اور جہاد کا یہ عمل ابھی تک جاری ہے ۔ شروع میں یہ ہوا کہ ان حکماء نے ملت کے اجتماعی امراض کی جو تشخیص کی اور ان کے علاج کے لئے جو تجاویزپیش کیں وہ ایک طویل عرصے تک مسلمانوں سے بالعموم شرف قبولیت حاصل نہ کر سکیں ۔ لیکن جہد مسلسل اور پیہم کاوش کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہی باتیں جو کبھی انوکھی اور عجیب سی محسوس ہوتی تھیں اب بڑی

عام فہم اور مقبول عام ہو گئی ہیں ۔ اس ضمن میں بہترین مثال غالباً شاہ ولی اللہ کی دی جا سکتی ہے ۔ شاہ صاحب نے مسلمانوں میں تنگ نظری، فرقہوارانہ عصبیتوں اور تقلید جامد کی خرابیوں کو محسوس کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان خامیوں کا بنیادی سبب فقہی احکام کی تفسیر و تعبیر میں بے جا سختی اور شدت ہے ۔ کیونکہ مسلمان اجتہاد سے بے گانہ ہو چکے ہیں ۔ اپنی کتاب ''مصفی،، میں وہ لکھتے ہیں ''ہمارے زمانے کے سادہ لوگ اجتہاد سے بالکل برگشتہ ہیں ۔ اونٹ کی طرح ناک میں نکیل پڑی ہے اور کچھ نہیں جانتے کہ کدھر جارہے ہیں۔،، تنگ نظری اور فرقہ وارانہ عصبیتوں سے بچنے کے لئے شاہ صاحب نے ضروری سمجھا کہ فقہی احکام کی تعبیر میں سختی اور شدت اختیار نہ کی جائے ۔ انہوں نے تجویز کیا کہ مذہبی احکام کی تفسیر میں نرمی اختیار کی جانی چاہئے اور اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اسلامی احکام خدا کی بے قاعدہ مرضی پر مبنی نہیں ہیں بلکہ اللہ نے وہی کچھ حکم دیا ہے جو انسانوں کے لئے مفید ہے ۔ وہ تعلیمات اسلامی کو عام کرنا بہت ضروری سمجھتے تھے ۔ چنانچہ اس غرض سے کہ قرآنی تعلیمات اس دور کے عام خواندہ افراد تک پہنچیں انہوں نے بذات خود قرآن کا فارسی ترجمہ کیا جو غالباً برصغیر کی تاریخ میں قرآن کا پہلا فارسی ترجمہ تھا ۔ یہ ایک جرأت مندانہ اقدام تھا ۔ جسکے بڑے دور رس اثرات مترتب ہوئے ۔ کیونکہ قرآن سے زیادہ انقلاب آفرین دنیا میں کوئی کتاب نہیں ہے ۔ مشہور الجزائری لیڈر فرحت عباس نے اپنی کتاب '' The Night of Imperialism ،، میں واضح طور پر لکھا ہے کہ شمالی افریقہ کے ممالک مثلاً مراکش، الجزائر وغیرہ میں سماجی بیداری کا عمل صحیح معنوں میں اس دن سے شروع ہوا جب محمد عبدہ شمالی افریقہ آئے اور انہوں نے تفسیر قرآن کی تعلیم کو عام کیا ۔۱۔ شاہ

ولی اللہ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف حجۃ اللہ البالغۃ میں بڑی وضاحت اور تفصیل سے اپنے دور کے معاشرے کے معاشی عدم توازن کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی ۔ وہ ایسے تمام لوگوں کو استحصالی گروہ میں شمار کرتے ھیں جو معاشرہ کی کوئی خدمت انجام نہیں دیتے لیکن نام نہاد پیدائشی یا طبقاتی مراعات کی بنا پر مالیات عامہ پر بوجھ بنے ھوں ۔ معاشرہ کی یہ حالت نہایت نقصان دہ ھے کہ کچھ لوگ تو عیش و عشرت کے تمام وسائل پر متصرف ھوں جبکہ دوسرے لوگ جسم و روح کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے بھی جانوروں کی طرح مشقت کرنے پر مجبور ھوں جس کی وجہ سے ان کی بہت سی معاشرتی خوبیاں ختم ھوجاتی ھیں۔ شاہ صاحب نے حکام کی ذمہ داریاں بھی گنوائی ھیں ۔ حکام اور باختیار افراد کا کام یہ نہیں ھے کہ رعیت کی خون پسینے کی کمائی پر عیش کریں اور لذائذ دنیا میں گم ھو جائیں ۔ ان کا فرض اس کے برعکس یہ ھے کہ شریعت کو نافذ کریں، اور اوامر و نواھی کی ترویج کریں، اور سچے اسلامی جذبہ جہاد کو عام کریں ۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں مسلم معاشرے کے ھمہ پہلو انحطاط کے پس منظر میں شاہ صاحب کے یہ خیالات اور ارشادات نہایت انقلابی، حیات افروز اور ترقی پسندانہ تھے ۔ بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ''انھوں نے قوم کے اندر ایسی امنگیں پیدا کر دیں جنھوں نے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے اخلاقی ذوق و شوق میں سے کچھ دوبارہ واپس لے لے اور اپنے عقائد کی پاکی کو باقی رکھ سکے ۔ قوم کے ضمیر، اس کے عقائد اور اس کے اخلاقی مقصد پر اس کے ایقان کو اٹھارویں صدی کے ملبے میں سے باھر نکال لینا بذات خود کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا، مگر شاہ ولی اللہ نے اس سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی ۔ اپنی تصانیف کے ذریعے انھوں نے مسلم فکر کے بہت سے میدانوں میں بڑے دیرپا اضافے کئے''[۲] ۔ شاہ ولی اللہ

کے مشن کو ان کے بعد آنے والوں نے آگے بڑھایا اور آج صورت حال یہ ہے کہ ملت اسلامیہ بحیثیت مجموعی معاشی مسئلہ کو جائز اہمیت دے رہی ہے ، ذمہ دار حکومتوں کے قیام کے لئے کوشاں ہے، اور فرقہ وارانہ تعصبات اور تنگ نظری اگرچہ اب بھی ختم تو نہیں ہوئی تاہم اتنا زور بھی اب اس کا نہیں رہا جتنا کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔

مسلمانوں کی اجتماعی پستی اور زبوں حالی کے بے شمار اسباب میں سے اکثر و بیشتر کو ایک عنوان کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے وحدت الوجودی تصوف۔ وہی نظریہ وحدت الوجود جسے ولیم جیمز اخلاقی تعطل قرار دیتا ہے اور شوپنہار جسے الحاد کی شاعری کہتا ہے، جب مسلمانوں میں تصوف کے نام سے در آیا تو اس کے نتیجہ میں بالکل غیر اسلامی بلکہ بہت سے خلاف اسلام نظریات و خیالات اور میلانات نے مسلمانوں میں جڑ پکڑ لی۔ خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں کہ بعض صوفیوں نے اپنا کلمہ بھی عام مسلمانوں سے الگ کرلیا۔ مسلمان کہتے تھے ''لا الہ الا اللہ،، بعض صوفی کہنے لگے ''لا موجود الا اللہ،، یا ''لا موثر فی الوجود الا اللہ،، اللہ کے سوا کچھ موجود نہیں اور ہر وجود میں جو موثر حقیقت ہے وہ خدا ہی ہے ۳۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کے سوا اور کوئی موجود نہیں تو عابد و معبود، خالق و مخلوق کا فرق ختم ہو جاتا ہے اور عبادت و پرستش اور اطاعت کے مفہوم کو ضعف پہنچنا لازمی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بے شمار صوفیوں نے واضح طور پر اور کھلم کھلا شریعت کے مقرر کردہ اوامر و نواہی کی نفی کی ہے۔ شریعت کے مقابلے میں طریقت کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ بہت سوں نے طریقت کے مقابلے میں شریعت کو سرے

سے فضول اور غیر ضروری قرار دیا اور دینی احکام کو عملاً منسوخ کر دیا۔ اور جواز اس کا یہ پیش کیا کہ فنا فی ذات باری تعالی ہی سب سے بڑی سعادت اور نیکی ہے۔ حالانکہ جیسا کہ اقبال کہتے ہیں اسلام کا مطالبہ اپنے ماننے والوں سے فنا فی احکام باری تعالی ہے نہ کہ فنا فی ذات باری تعالی۔ ویسے بھی غور طلب بات یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کو بطریق احسن گزارنے، اس میں نظم و ترتیب پیدا کرنے، اور معاشرے کی اجتماعی قوت کو نیکی کی سر بلندی اور بدی کی بیخ کنی کے لئے صرف کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ملت کسی آئین اجتماعی کی پابند ہو اور یہ آئین اجتماعی ہمیں شریعت سے ہی مل سکتا ہے، صوفیانہ طریقت سے نہیں۔

راسخ العقیدگی کو اس طور نقصان پہنچانے کے علاوہ اس تصوف نے مسلمانوں کو ایک بڑا نقصان یہ پہنچایا کہ اس دنیا کو اور اس دنیا میں گزرنے والی زندگی کو ناقابل اعتنا قرار دیا۔ سائنسی اور حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کی بجائے لوگوں کو صرف مراقبوں، مکاشفوں اور نام نہاد چلہ کشی اور وظائف و عملیات کا گرویدہ بنا دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم نہ صرف بے عملی کا شکار ہوگئی بلکہ بقول مولانا مودودی اس دنیا کو دارالعمل یا دارالامتحان کی بجائے دارالعذاب اور ''مایا،، کا جال تصور کرنے لگ گئی۔ مسلمان اس بات کو بھول گئے کہ وہ دنیا میں خدا کے نائب کی حیثیت سے مامور ہیں۔ ۴ ۔ اور انہیں اس دنیا میں خدا کے پسندیدہ دین اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر نافذ کرنا ہے۔ اس تصوف نے مسلمانوں میں دین و دنیا کی علیحدگی کا تصور پیدا کیا۔ جس کا نقصان مسلم معاشرہ کو یہ پہنچا

کہ معاشرتی معاملات میں شریر اور شر پسند افراد کو من مانی کرنے اور فتنہ و فساد پھیلانے کی کھلی چھٹی مل گئی ۔ اسی نظریہ کی بدولت عوام پر یہ اثر پڑا کہ وہ حکام کے جبر و تشدد اور ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنے کے قابل نہ رہے ۔ ان کے ذہنوں میں یہ غلط خیال بیٹھ گیا کہ اگر وہ معاشی یا معاشرتی ناانصافی کا شکار ہو بھی رہے ہیں تو یہ اس لئے ہے کہ خدا ایسا چاہتا ہے اور یہ کہ انھیں اس ظلم و ناانصافی کے خلاف جدوجہد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس ظلم و ناانصافی کو سہنے کے صلے میں خدا آخرت میں ان کے مرتبے بلند کرے گا اور جنت کی نعمتوں سے سرفراز کرے گا ۔ مذہب کا یہی وہ غلط تصور ہے جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے مذہب کے مخالفین مذہب کو افیون قرار دیتے ہیں ۔ قابل افسوس ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بات شاید قدرے باعث تفنن بھی ہو کہ اس تصور کو مزید تقویت دینے کے لئے چودھویں صدی ھجری کے اوائل میں یہ خیال بھی لوگوں کے ذہن میں بیٹھ گیا تھا کہ ان ظالم اور بدکار لوگوں کو جتنا بھی یہ ظلم و استحصال کرنا چاھیں کر لینے دو، اس لئے کہ بس اب قیامت تو آنے ھی والی ہے، چودھویں صدی ھجری قیامت کی صدی ہے، اس کے بعد اگلی صدی تو کوئی ہے ھی نہیں ۔ ترک دنیا اور عزلت نشینی کا رجحان بھی مسلمانوں میں مقبول ھوا حالانکہ پیغمبر اسلام اور ان کے صحابہ کرام اپنی تمامتر روحانی رفعتوں کے باوجود کبھی اپنے دنیاوی فرائض سے غافل نہ ھوئے تھے ۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ھوتا ہے کہ شاید مسلمانوں میں رھبانیت کے رجحانات اور میلانات کو انھی لوگوں نے فروغ دیا جنھیں دین اسلام اور مسلمانوں کی سر بلندی ناگوار گزرتی تھی ۔

تصوف کے پردے میں درآمد شدہ غیر اسلامی نظریات و میلانات کی تردید اگرچہ ہر دور میں راسخ العقیدہ صوفیا کرتے رہے ہیں لیکن واضح اور قاطع علمی انداز میں سب سے پہلے شیخ احمد سر ہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی نے وحدت الوجود کو رد کیا۔ انھوں نے اپنے باطنی شعور اور مشاہدے کی بنا پر یہ حقیقت جان لی کہ وحدت الوجود کا وجدان روحانی ''سکر،، کی حالت میں ہوتا ہے مگر حقیقت کا عکاس نہیں ہوتا۔ اسلامی تعلیمات کے نقطہ نگاہ سے مجدد الف ثانی کی یہ ایک نہایت عظیم اورقابل قدر خدمت ہے کہ انھوں نے وجدانی یا صوفیانہ مشاہدہ کو فی نفسہ معیار حقیقت تسلیم کرنے کو ایک غلطی قرار دیا کیونکہ وجدانی مشاہدہ تو غلط بھی ہو سکتا ہے، صرف وحی الہی غلطیوں کے امکان سے مبرا ہو سکتی ہے۔ چونکہ رسول اکرمؐ وحی سے ہدایت۔ یافتہ تھے اور خدا باطل سے ان کی حفاظت کرتا تھا لہذا جو مشاہدہ آنحضرت کی ہدایت و تعلیمات کے خلاف ہو اسے ''سکر،، کا نتیجہ قرار دیا جانا چاہئے-۵ - اقبال نے بھی وحدت الوجود کے نظریہ پر اپنی تحریروں میں بارہا تنقید کی ہے۔ امرتسر کے اخبار ''وکیل،، میں ''اسرار خودی اور تصوف،، کے زیر عنوان وہ لکھتے ہیں ''میرا مذہب یہ ہے کہ خدائے تعالی نظام عالم میں جاری و ساری نہیں بلکہ نظام عالم کا خالق ہے اور اس کی ربوبیت کی وجہ سے یہ نظام قائم ہے جب وہ چاہے گا اس کا خاتمہ ہو جائے گا،، اقبال شریعت و طریقت اور ظاہر و باطن کے امتیاز کو بنیاد بنا کر شرعی حدود سے بے نیازی برتنے کے رجحان کے بھی مخالف تھے۔ مولوی سراج الدین پال ایڈوکیٹ کو ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ ''حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معنی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو منسوخ

کرنا ہے،، ۔

اسی طرح مسلمانوں نے دین و دنیا کی علیحدگی کے اس تصور سے بھی بالعموم نجات حاصل کرلی ہے جس کے ماتحت دنیاوی معاملات کو ہیچ اور گھٹیا سمجھا جاتا تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ دنیاوی معاملات سے دین دار افراد کا کوئی تعلق نہیں ۔ آج صورت حال یہ ہے کہ روز بروز مسلم عوام کے ذہن میں یہ تصور تقویت حاصل کرتا جا رہا ہے کہ اسلام دین و دنیا کی علیحدگی ہرگز نہیں چاہتا بلکہ وہ ایک ایسا مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسان کے روحانی اور دنیاوی دونوں پہلوؤں کے بارےمیں ہدایات فراہم کرتا ہے اور اپنے پیرو کاروں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ صرف اپنی نجی زندگی ھی میں نہیں بلکہ اجتماعی زندگی میں بھی اسلام کے نفاذ کے لئے مقدور بھر کوشش کریں گے ''اسلام کا نظریہ حیات،، نامی کتاب میں خلیفہ عبدالحکیم کہتے ھیں ''باطن کی آسمانی سلطنت کو خارج کی آسمانی سلطنت میں متشکل کرنا چاہئے تاکہ انسان کی منظم زندگی محبت، اخوت اور انصاف پر مبنی ھو سکے ۔ اگر خدا کے نیک بندے انسان کی معاشری اور سیاسی زندگی کو اپنے حال پر تنہا چھوڑدیں تو معاشری اور معاشی خرابیوں کے سبب نیک افراد کی زندگی بھی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ چنانچہ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ ''اگر معاشرہ میں چند آدمی برائی کرتے ھوں اور دوسرے ان کو روکنے کے لئے کچھ نہ کرتے ھوں تو نیک اور بد سب کے سب تباھی میں گھر جائیں گے کیونکہ نیکوکار محض خاموش تماشائی بنے رہے اور برائی کو روکنے کے لئےکوئی عملی قدم نہیں اٹھایا،،۶ ۔ دین اسلام صرف فرد اور خدا کے مابین نجی تعلق کا نام ھی نہیں ہے بلکہ اجتماعی اور معاشرتی

سطح پر بھی زندگی بسر کرنے کا لائحہ عمل تجویز کرتا ہے ۔ اور اسلام کے معاشرتی نظام کو اپنائے بغیر ہم دین اسلام کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا نہیں کر سکتے ۔ ''قرآن نے حیات اور حق کی معرفت کو اس مبارک درخت کے مثل قرار دیا جس کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہوں اور جس کی شاخیں آسمان سے ہمکنار ہوں ۔ کشجرة طيبة اصلها ثابت و فرعها فی السماء ۔ تصوریت اور حقائق پسندی کا امتزاج اس سے بہتر ممکن نہیں ہے ۔ اس امتزاج میں کائنات کے ٹھوس اور محسوس حقائق اور انسانی ذہن و روح کے لطائف و تصرفات دونوں کی سمائی ہوگئی،، ۷۔ ڈاکٹر علی شریعتی کہتے ہیں کہ اسلام کے نقطہ نظر سے مثالی انسان وہ ہے جو ''فطرت کی طرف سے بے اعتنائی نہیں برتتا اور نہ ہی بنی نوع انسان سے منہ موڑتا ہے ۔ وہ اپنے ہاتھ میں قیصر کی تلوار اور سینے میں مسیح کا دل رکھتا ہے ۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو سائنس کے حسن کو بھی سمجھتا ہے اور خدا کے حسن کو بھی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جس کا فلسفیانہ خیال اسے نوع انسانی کی قسمت سے بے پروا نہیں کرتا،، ۔۸

اسلام کا سب سے اہم تصور توحید خداوندی کا تصور ہے ۔ اسلام کے دور آغاز اور دور عروج میں مسلمانوں کی سر بلندی اور سرفرازی میں سب سے بڑا ہاتھ اسی تصورتوحید کا تھا ۔ بدقسمتی سے جب مسلمانوں میں حرکت و ترقی کی قوتوں کو ضعف پہنچنا شروع ہوا تو اس تصور توحید نے بھی آہستہ آہستہ اپنا رنگ تبدیل کرنا شروع کیا یہاں تک کہ تصور توحید کو نظریہ وحدت الوجود کے مترادف سمجھ لیا گیا ۔ اقبال نے اسی صورت حال کا ماتم کرتے ہوئے کہا ہے ۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم کلام ۹

مولانا حنیف ندوی نے اپنی کتاب اساسیات اسلام میں خوب کہا ہے کہ ''اسلامی نقطہ نظر سے یہ عقیدہ (توحید) نہ خشک منطقی اذعان کا نام ہے اور نہ اسے کسی بھی صورت میں محض تحکم ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک فعال اور حد درجہ انقلابی عنصر ہے جس کو مان لینے کے بعد عمل و سیرت کا نقشہ بالکل بدل جاتا ہے۔ یہ ایک قوت کا نام ہے''۔ ۱ ۔ تصور توحید کی تفسیر و تعبیر اور اس کے معانی و مفاہیم کے تعین کے لئے ماضی قریب میں بہت سے لوگوں نے کام کیا ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اصطلاحاً فلسفی کہلاتے ہیں اور وہ بھی جنہیں اصطلاحاً فلسفی تو نہیں کہا جاتا البتہ وہ علمائے دین کے طبقے میں شامل ہوتے ہیں۔ یوں فلسفہ اور مذہب کے تعلق کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس تعلق کے چار ادوار رہے ہیں۔ پہلے دور میں فلسفہ اور مذہب ہم معنی تھے۔ دوسرے دور میں مذہب نے فلسفہ کو اپنے خادم کے طور پر استعمال کیا، یعنی فلسفے نے مذہب کے دفاع کا فریضہ انجام دیا۔ تیسرے دور میں مذہب اور فلسفہ ایک دوسرے کی ضد بن گئے۔ اور اب چوتھے دور میں فلسفہ کا کام نہ تو مذہب تراشی ہے، نہ یہ کہ مذہب کے حق میں دلائل پیش کرے، اور نہ ہی یہ کہ فلسفہ مذہبی حقائق اور تصورات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرے، بلکہ فلسفہ کا کام یہ ہے کہ مذہبی عقائد و تصورات کا تجزیہ کرے اور ان کے مفاہیم کا تعین کرے۔ اس آخری نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو تصور توحید سے متعلق فلسفی اور غیر فلسفی دونوں قسم کے علماء نے ماضی قریب میں خاصی پیش رفت کی ہے جس کے نتیجہ میں اب مسلمان توحید کی اس تعبیر کو زیادہ اپنا رہے ہیں کہ چونکہ فطرت اور انسان ایک ہی نظام ربوبیت کا حصہ ہیں لہذا انسان کا کام یہ ہے کہ وہ مظاہر فطرت کا حقیقت

پسندانہ مطالعہ کرے، توہم پرستی کو ترک کرے، اور سائنسی اور علمی رجحان و اسلوب فکر و عمل کو اختیار کرے ۔ اجتماعی زندگی کے نقطہ نگاہ سے توحید کا سب سے قابل قدر اور مفید تصور جو روز بروز مسلم دنیا میں قوت پکڑتا جا رہا ہے یہ ہے کہ حاکمیت اعلی کسی حاکم وقت یا بادشاہ کو نہیں بلکہ خدا کو حاصل ہے ۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی حاکمیت کا تصور بعض مذہبی جماعتوں نے اپنی بالادستی کی خاطر وضع کیا ہے ۔ کیونکہ خدا کسی حاکم فانی کی طرح بذات خود تو محسوس طور پر انسانوں کے اجتماعی معاملات پر اثر انداز ہوتا بظاہر نظر نہیں آتا ۔ تاہم اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو دراصل یہ قانون شریعت کی بالادستی کا تصور ہے ۔ اگر قانون و سیاسیات کی جدید اصطلاح میں بات کریں تو اسکا مطلب یہ ہے کہ انتظامیہ قانون یعنی شریعت سے ماورا نہیں ہے ۔ شریعت کا اطلاق حکام اور رعایا دونوں پر یکساں ہوتا ہے ۔ اور حکام کسی طور غیر منصفانہ اور شریعت سے متصادم قوانین کو معاشرے میں نافذ کرنے کے مجاز نہیں ہیں ۔ یہ تصور ظلم کو برداشت کرنے اور اس سے مصالحت پر آمادہ ہونے کے رجحان کی بھی حوصلہ شکنی کرتا ہے ۔ کیونکہ ''بلاتعرض شر کو برداشت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ خود شر کا ارتکاب کرنا ۔ غلامانہ طور پر ظلم کو برداشت کرنے والے ہی ظالموں کی پرورش کرتے ہیں،، ۱۱ ۔ اس تصور کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو مسلمان معاشی، سیاسی اور ہر قسم کے سماجی استحصال اور ظلم و نا انصافی کے خلاف اب عملی طور پر جدوجہد کر رہے ہیں ۔ اخوت، مساوات اور آزادی کے لئے کوشاں ہیں ۔ اور اس سلسلے میں وہ ہر قسم کے استعمار اور سامراج سے نبرد آزما ہو رہے ہیں ۔ اور دوسری طرف ان کے دلوں میں یہ آرزو بڑی شدت سے فروغ پارہی ہے کہ ان کے اجتماعی معاملات میں

قوانین شرعیه کا نفاذ ہو۔ اللہ تعالی کی حاکمیت مطلق کے تصور کو مولانا مودودی کی بلند پایہ تصنیف ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں،، میں بڑے واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ مصنف نے قرآن پاک میں استعمال ہونے والی چار اصطلاحوں یعنی الہ، رب، دین اور عبادت کی لغوی تحقیق کی ہے ۔ عربی زبان میں ان الفاظ کے استعمال کے مختلف انداز بیان کئے ہیں ۔ پھر قرآن پاک میں مختلف مقامات پر جس جس سیاق و سباق میں انہیں استعمال کیا گیا ہے اس کی تاریخ اور تفسیری تشریح کے بعد قاری کو ان نتائج تک پہنچایا ہے کہ خدا ہی وہ واحد مقتدر مطلق ہے جو ہر قسم کی حاجت روائی، مشکل کشائی، پناہ دہندگی امداد و اعانت، خبر گیری اور حفاظت کرتا ہے ۔ اصل حاکم اور شارع وہی ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے کا مستقل بالذات حاکم اور آزاد و خود مختار قانون ساز ہونا غلط ہے ۔ اس کے حکم کی سند کے بغیر کسی دوسرے کا حکم واجب الاطاعت نہیں۔۱۲ - وہی کائنات کا سلطان مطلق اور تمام جہان کا پروردگار اور مربی ہے ۔ ہر چیز کا مالک آقا اور فرماں روا وہی ہے ۔ اور تمام مخلوقات کی بندگی اطاعت اور پرستش کا وہی مستحق ہے۔ ۱۳ ۔ طاغوت سے مراد ہر وہ ریاست و اقتدار اور ہر وہ رہنمائی و پیشوائی ہے جو خدا سے باغی ہو کر خدا کی زمین پر اپنا حکم چلائے اور اس کے بندوں کو زور و جبر سے یا تحریص و اطماع سے یا گمراہ کن تعلیمات سے اپنا تابع امر بنائے ۔ ایسے ہر اقتدار اور ایسی ہر پیشوائی کے آگے سر تسلیم خم کرنا اور اس کی بندگی اختیار کر کے اس کا حکم بجالانا دراصل طاغوت کی عبادت ہے ۔ اور یہ کہ دین سے پورا نظام زندگی اپنے اعتقادی، نظری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سمیت مراد ہے ۔ اور یہ کہ مسلمانوں کو اس وقت تک باطل سے نبرد آزما رہنا ہے جب تک فتنہ یعنی ان نظامات کا وجود دنیا سے نہ مٹ جائے جن کی بنیاد خدا

سے بغاوت پر قائم ہے ۔ اور جب تک کہ پورا نظام اطاعت و بندگی اللہ کے لئے خالص نہ ہوجائے ۔۴۰۱

مغربی استعمار کے رد عمل میں جدید علوم سے مخاصمت محض کا جو رجحان ابتداءً مسلمانوں میں پیدا ہوا تھا، اب وہ ختم ہورہا ہے ۔ نہ صرف سائنسی اور تکنیکی علوم بلکہ جدید نفسیات، قانون، معاشیات، سیاسیات غرض تمام علوم عقلیہ میں مہارت کو اسلامی نہضت کے لئے باعث تقویت سمجھا جاتا ہے ۔ ایک لحاظ سے تو انہی جدید علوم کے حامل افراد سے قیادت کی بھی توقع کی جاتی ہے ۔ مولانا مودودی کہتے ہیں ''اس وقت کام کا اصل موقع ان لوگوں کے کے لئے ہے جنہوں نے ایک طرف مغربی تعلیم پائی ہے اور دوسری طرف جن کے دلوں میں خدا اور رسول اور قرآن اور آخرت پر ایمان محفوظ ہے ۔ قدیم طرز کی دینی تعلیم پائے ہوئے لوگ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اور علم دین کے لحاظ سے ان کے بہترین مددگار بن سکتے ہیں، مگر بدقسمتی سے وہ ان صلاحیتوں کے حامل نہیں ہیں جو قیادت اور زمام کار سنبھالنے کے لئے درکار ہیں، یہ صلاحیتیں فی‌الحال صرف مقدم الذکر گروہ ہی میں پائی جاتی ہیں، اور ضرورت ہے کہ اس وقت یہی گروہ آگے بڑھ کر کام کرے''۱۰۵ ۔ علمائے دین کی سوچ میں یہ تبدیلی نہایت خوش آئند ہے اور اس کا مسلم معاشرہ پر یہ مثبت اثر پڑا ہے کہ احیائے اسلامی کی تحریکوں کے کارکن اب کسی مخصوص شعبے سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد ان تحریکوں کے دست و بازو کا کردار انجام دے رہے ہیں ۔

حوالہ جات

۱ - Ali Shariati ; On the Sociology of Islam; Berkeley, 1979 p. 63

۲ - ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی - برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، اردو ترجمہ از ہلال احمد زبیری، کراچی، ۱۹۶۷ - ص ۳۴۷

۳ - ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم - حکمت رومی - لاہور، ۱۹۵۵، ص ۱۰۷

۴ - مودودی، ابوالاعلی، تجدید و احیائے دین، لاہور، ۱۹۶۶ء ص ۲۵

۵ - سر ہندی، شیخ احمد، مکتوبات امام ربانی، لکھنو ۱۹۱۳ء جلد اول ص ۳۷۵

۶ - ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم - اسلام کا نظریہ حیات - اردو ترجمہ از قطب الدین احمد - لاہور ۱۹۵۷ء ص ۲۹۵

۷ - ڈاکٹر یوسف حسین - روح اقبال - طبع پنجم ۱۹۶۲، ص ۱۷۶

۸ - Ali Shariati: op. cit., p. 122

۹ - اقبال - ضرب کلیم - لاہور، ص ۱۸

۱۰ - محمد حنیف ندوی - اساسیات اسلام - لاہور، ۱۹۷۳، ص ۵۷

۱۱ - ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم - اسلام کا نظریہ حیات - ص ۲۹۴

۱۲ - مودودی - قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، لاہور، ۱۹۶۱، ص ۳۸، ۴۱

۱۳ - ایضاً - ص ۱۱۵

۱۴ - ایضاً - ص ۱۵۹

۱۵ - مودودی، تفہیمات حصہ سوم، لاہور ۱۹۶۹، ص ۳۶۰

اسلامک فاونڈیشن ڈھاکہ

دارالعلوم کراچی کے ترجمان اردو مجلہ ماھنامہ البلاغ کی حالیہ اشاعت بابت نومبر ۱۹۸۰ء میں ''ذکر و فکر'' کے ذیل میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کی ایک تحریر ''بنگلہ دیش میں چند روز'' کے عنوان سے شائع ہوئی ھے - درج ذیل اقتباس وھیں سے ماخوذ ھے - خوشی کی بات ھے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد جیسا ایک ادارہ ڈھاکہ میں قائم ھوکر گرانقدر علمی و دینی خدمات انجام دے رھا ھے- جیسا کہ تقی عثمانی صاحب نے تحریر فرمایا ھے اتنے مختصر عرصے میں چار سو کتابوں کی اشاعت باعتبار کمیت واقعی اس ادارے کا حیرت انگیز کارنامہ ھے - اسلامک فاؤنڈیشن ڈھاکہ کو ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد پر اس اعتبار سے فوقیت حاصل ھے کہ اس کی شاخیں مختلف شہروں میں پھیلی ھوئی ھیں جبکہ یہ ادارہ ایک شہر میں بند ھوکر رہ گیا ھے - مشرقی پاکستان جب تک بنگلہ دیش نہیں بنا تھا ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد سے فکر و نظر کی طرح ایک بنگالی رسالہ سندھان بھی نکلا کرتا تھا - نہیں معلوم اسلامک فاؤنڈیشن ڈھاکہ نے اس کی تلافی کا سامان بھی کیا ھے یا نہیں -

(مدیر)

''سرکاری سطح پر دینی سرگرمیاں اگرچہ ابھی برائے نام ھی ھیں لیکن قیام بنگلہ دیش کے ابتدائی دور کے مقابلے میں صورت حال بہت غنیمت ھے، حکومت کی طرف سے ایک اشاعتی ادارہ ''اسلامک فاؤنڈیشن،، کے نام سے قائم ھے جس کا مرکزی دفتر ڈھاکہ میں مسجد بیت‌المکرم کے قریب واقع ھے اور شاخیں مختلف شہروں میں پھیلی ھوئی ھیں۔ یہ ادارہ پاکستان کے ادارہ تحقیقات اسلامی سے مشابہت رکھتا ھے۔ لیکن گذشتہ ایک سال کے دوران اس نے حیرت انگیز رفتار کے ساتھ اشاعتی کام کیا ھے، صرف اس ایک سال میں اس ادارے نے اسلامی موضوعات پر چارسو (۴۰۰) سے زائد کتابیں بنگلہ اور انگریزی میں شائع کی ھیں۔ جو سرکاری اداروں کی عام رفتار کار کے لحاظ سے محیرالعقول تعداد ھے۔

اسی ادارے نے ایک گراں قدر کام یہ کیا ھے کہ معارف القرآن کا بنگلہ ترجمہ شائع کرنا شروع کردیا ھے۔ ھمارے محترم دوست اور بھائی مولانا محی‌الدین خاں صاحب ایڈیٹر ''مدینہ،، بڑی لگن اور محنت، مستعدی اور قابلیت کے ساتھ یہ ترجمہ کر رھے ھیں۔ اور اس کراماتی رفتار سے کر رھے ھیں کہ سال بھر کی مختصر مدت میں پانچ جلدوں کا ترجمہ مکمل ھو چکا ھے، ان میں ایک جلد چھپ کر تیار ھو چکی ھے، اور دوسری جلد زیر طبع ھے ، ڈھاکہ ایرپورٹ پر اترنے کے بعد پہلا تحفہ جو احقر کو ملا وہ بنگلہ معارف القرآن کی پہلی جلد تھی۔

اسلامک فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر جنرل بڑے جذبے کے پر جوش مسلمان ھیں، انھوں نے احقر کے قیام ڈھاکہ کے دوران اسلامک فاؤنڈیشن کے ھال میں بنگلہ معارف القرآن جلد اول کی تقریب رونمائی منعقد کی، اس تقریب میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر سراج‌الحق صاحب کو بطور صدر اور احقر کو بطور مہمان خصوصی

مدعو کیا، شہر کے علماء، دانشور اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب خاصی تعداد میں موجود تھے، سات آٹھ مقررین نے معارف القرآن کے تعارف میں تقریریں کیں، جن میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر سراج الحق صاحب، مدرسہ عالیہ کے حضرت مولانا عبیدالحق صاحب اور دوسرے اہل علم و فکر شامل تھے، احقر نے بھی تقریباً ایک گھنٹہ اس محفل سے خطاب کیا، اس تقریر کا کچھ حصہ ڈھاکہ ریڈیو سے بھی نشر ہوا۔ اور بعض دوستوں کا کہنا تھا کہ قیام بنگلہ دیش کے بعد شاید یہ پہلی اردو تقریر تھی جو ڈھاکہ ریڈیو سے نشر ہوئی۔

تصحیح و استدراک

ایک طالب علم کا ایک علمی خط

آزاد بھون نئی دھلی

۳۰ ستمبر ۱۹۸۰ء

مکرمی و محترمی زید مجدکم !

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے ۔

آپ کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوگی کہ میں نے ۱۵ ستمبر سے I. C. C. R کے عربی مجلہ ''ثقافۃ الہند،، کے نائب مدیر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا ہے اور دھلی آگیا ہوں ۔ یہ ملازمت قابل ذکر ہو تو ہو مگر قابل فخر ہرگز نہیں ۔ میرا طبعی رجحان ۔ جیسا کہ آپ کو بخوبی علم ہے ۔ اکیڈمی اور لائبریری کی جانب ہے ۔ اور میں قرآن اور قرآن کی زبان کی خدمت کرنا چاھتا ہوں ۔

صوفی صومعہ عالم قدسم لیکن حالیا دیر مغانست حوالت گاھم

دعا کیجئے میری حقیر صلاحیتوں کو صحیح مصرف مل جائے ۔

آپ کی پاکستان روانگی کے بعد ھی سے خط لکھنا چاھتا تھا مگر اس کے ساتھ ھی فکر و نظر کے لئے ایک مقالہ بھی بھیجنے کی خواھش تھی ۔ دمشق کی مجمع اللغۃ العربیۃ کے نائب صدر ڈاکٹر شاکر فحام کا ایک طویل مقالہ ''الدلائل

فی غریب الحدیث للعوفی السرقسطی،، کے عنوان سے مجمع کے مجلہ میں شائع ہوا تھا ۔ غریب الحدیث کے موضوع پر عوفی کی یہ کتاب بہت اهمیت رکھتی ہے ۔ اس وقت تک دنیا میں اس کے کسی مکمل نسخہ کا سراغ نہیں لگ سکا ہے ۔ کتاب کے جو تین نسخے ظاہریہ، استانبول اور رباط میں موجود ہیں ان سب کا پہلا حصہ غائب ہے، صرف دوسرا اور تیسرا حصہ موجود ہے ۔ مولانا عبد العزیز میمنی مرحوم کی نگاہ سے ظاہریہ کا نسخہ گزرا تھا اور انہوں نے کتاب کی اهمیت کے پیش نظر ہی عزالدین تنوخی کو اس کی تحقیق و اشاعت کی جانب توجہ دلائی تھی ۔ تنوخی نے کام بھی شروع کردیا تھا مگر اسی دوران ان کا انتقال ہوگیا ۔ ان کے بعد ڈاکٹر شاکر فحام نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور بطور مقدمہ ۱۰۰ صفحات میں چوتھی صدی ہجری کے نصف تک علم غریب الحدیث کے ارتقاء کا جائزہ اور کتاب کے مخطوطات کا مفصل تعارف پیش کیا ۔ یہ مقدمہ نہایت محققانہ ہے ۔ پروفیسر مختار الدین احمد صدر شعبہ عربی کی فرمائش پر میں نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا مگر ابھی تک اشاعت کی نوبت نہیں آئی ۔ مقدمہ کے نصف ثانی میں جو مخطوطات کے تعارف پر مشتمل ہے چونکہ کثرت سے عربی عبارتیں ہیں اس لئے باوجود مفید ہونے کے اردو رسالہ کے لئے شائد موزوں نہ ہو ۔ لیکن نصف اول جو غریب الحدیث کے ارتقا پر ہے اگر شائع ہوجائے تو خاصے کی چیز ہے اور اس سے ہمارے علمی حلقوں کو (خاص طور پر پاکستان میں جہاں علمی کتابیں بڑی دھوم دھام سے شائع ہو رہی ہیں) اندازہ ہوگا کہ بحث و تحقیق کا کیا معیار ہونا چاہئے ۔ اب تک میں اس مقالہ کو فکر و نظر کے لئے مناسب طور پر نقل نہ کر سکا اس لئے خط لکھنے میں بھی تاخیر ہوتی گئی ۔

پچھلے دنوں دھلی آیا تو فکر و نظر کے جولائی کے شمارہ میں مولانا فراھی کا خط اور اس پر آپ کا نوٹ نظر سے گزرا۔ پھر تازہ شمارہ میں ''منظومہ صرف،، کا تحفہ ملا اور محاسن الشعر پر تبصرہ بھی۔ باقیات فراھی کی اشاعت پر جو مسرت ھوئی ا سے بیان نہیں کر سکتا۔ یہ سلسلہ جاری رھنا چاھئے۔ ھم سب اللہ تعالی سے دعا کرتے ھیں کہ آپ نے جس عظیم الشان مہم کو سر کرنے کا عزم کیا ھے وہ بخیر خوبی تمام ھو۔

منظومہ صرف کے تعارف میں اور پھر محاسن الشعر پر تبصرہ کے ضمن میں آپ نے ایک طالب علم کی حوصلہ افزائی کے لئے جو غیر معمولی تعریفی کلمات لکھے ھیں انہیں پڑھتا ھوں اور خود پر نظر ڈالتا ھوں تو بڑی شرمندگی ھوتی ھے۔

محاسن الشعر کا دوسرا حصہ کئی سال پہلے مرتب ھو چکا تھا اور زیر درس بھی ھے لیکن طباعت کی نوبت اب آئی ھے۔ خدا کرے جلد منظر عام پر آجائے۔

منظومہ صرف کے متن میں چند بظاھر طباعت کی غلطیاں(۱) راہ پا گئی ھیں۔ ان کی تصحیح ضروری ھے۔ مولانا کے مسودہ سے جو نقل آپ نے تیار کی ھے اگر خدا نخواستہ اس میں بھی ایسا ھی ھے تو ا سے سہو قلم سمجھنا چاھیئے۔

۱۔ نسبت فعل از بفاعل ھست معروفش بخواں   وزسوی مفعول، مجھولش بخواں زیں انتما

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں ''بفاعل،، سے پہلے ''از،، کی بجائے

---

(۱) یہ کتابت کی بوالعجبیاں ھیں جو پہلے ایڈیٹر کے لئے بعد میں قارئین کے لئے سوھان روح ھیں۔ ''غلط الکاتب و خبط المصنف،، لیکن دونوں صورتوں میں مورد الزام ایڈیٹر ھی ٹھہرتا ھے۔ میں خود کو فکر و نظر کی ان فروگزاشتوں کی ذمہ داری سے بری نہیں سمجھتا مگر اپنے آپ کو بے بس پاتا ھوں۔ (مدیر)

''ار،، (رائے مہملہ) اسی طرح دوسرے مصرعہ میں بھی ''سوی،، سے پہلے ''وز،، کی بجائے ''ور،، (رائے مہملہ) ہونا چاھئیے -

۲ - شعر نمبر ۲۰ اور ۲۸ میں مزارع،، چھپ گیا ھے ''مضارع،، ھونا چاھئیے -

۳ - داں بود تقسیم درسه سطر از روئے عدد باز در ھر سطر غائب و حاضر و قائل جدا

شعر کے دوسرے مصرعه میں ''غائب کے بعد'' و،، زائد ھے جس کی وجه سے مصرعه وزن سے گر گیا ھے -

۴ - ھفده است الفاظ شرط ان، ما، و، ای، من، متی این، ایان، و ان انچه منضم شد بما

''ایان،، کے بعد ''ان،، کی بجائے ''انی،، ھونا چاھئیے- ''ان،، کا ذکر پہلے مصرعه میں گزر چکا ھے -

۵ - آخری شعر میں ''منضم،، کی ''ض،، پر کسرہ چھپا ھے فتحه ھونا چا ھئیے -

فکر و نظر کے اسی شمارہ میں مولانا عبدالعزیز میمن مرحوم کے صاحبزادے محترم جناب محمد محمود میمن کا ایک مضمون ''علامه میمنی کا علمی مرتبه،، کے عنوان سے شائع ھوا ھے - مولانا میمن کے انتقال کے بعد ان پر جو مقالات اردو اور عربی میں شائع ھوئے ھیں جہاں تک ممکن ھو سکا انہیں حاصل کرکے پڑھنے کی کوشش کی، ان میں سب سے مفصل اور مرتب مجمع اللغة العربیه دمشق کے نائب صدر ڈاکٹر شاکر فحام کا مقاله ھے جو ۳۴ صفحات پر مشتمل ھے اور مجلة المجمع کے جنوری ۱۹۷۹ء (المجلد ۵۴ الجزء الاول) کے شمارہ میں شائع ھوا - عربی ادب کے ایک ادنی طالبعلم ھونے کے تعلق سے مولانا میمن مرحوم سے مجھے

بھی گہری عقیدت ہے۔ فکر و نظر کے تازہ شمارہ کی فہرست میں محمد محمود میمن صاحب کے مضمون پر نظر پڑی تو بڑی خوشی ھوئی۔ اس لئے کہ ان کو میمن صاحب سے جو نسبت حاصل ہے اس کی وجہ سے وہ ان کی شخصیت کے بہت سے ایسے گوشوں پر روشنی ڈال سکتے ھیں جن سے واقف ھونا دوسروں کے لئے مشکل ہے۔ لیکن مضمون پڑھ کر سخت مایوسی ھوئی۔ بڑا سرسری مضمون انھوں نے لکھا۔ خصوصاً میمن صاحب کی تصانیف کے سلسلہ میں جو معلومات انھوں نے فراھم کی ھیں وہ ناقص بھی ھیں اور غیر مرتب بھی۔ ان میں متعدد فروگزاشتیں ھیں جن کی تصحیح ضروری ہے۔ مثلاً :۔

۱ ۔ فاضل مضمون نگار علامہ میمن کی تصنیفات کا ذکر کرتے ھوئے لکھتے ھیں۔ ''ان کا تیسرا نمایاں تحقیقی کام ''الوحشیات'' ہے۔ وہ پہلے شخص ھیں جنھوں نے شاعر ابو تمام کے کلام کی ضروری تصحیح کی۔ اور اسے مرتب کرکے شائع کرایا''۔

''الوحشیات'' ابو تمام کا کلام نہیں ہے جیسا کہ مضمون نگار نے لکھا ہے بلکہ عربی شاعری کے ان متعدد انتخابی مجموعوں میں سے ایک ہے جو ابوتمام نے مرتب کئے تھے۔ ان میں ''حماسہ'' کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ھوئی۔ ''الوحشیات'' کو ''حماسہ'' سے ممیز کرنے کے لئے ''الحماسة الصغری'' بھی کہتے ھیں۔

۲ ۔ کتاب الوحشیات کے ھی سلسلہ میں رقمطراز ھیں :۔

''ان کا یہ کام کراچی میں پایہ تکمیل کو پہنچا،

یہ بھی خلاف واقعہ ہے ۔ کتاب ''الوحشیات،، کی تحقیق کا کام علی گڑھ کے زمانہ قیام میں مکمل ہوا ۔ علامہ نے مقدمہ میں ۳ مئی ۱۹۴۰ء کی تاریخ لکھی ہے ۔ بعد میں الاستاذ محمود محمد شاکر نے اس پر نظر ثانی کی ۔ حواشی میں اضافہ کیا ۔ اور آخر میں ص ۳۰۷ سے ص ۳۲٦ تک ''استدراک،، بھی شامل کیا ۔ دارالمعارف مصر نے ۱۹٦۳ء میں یہ کتاب شائع کی ۔

۳ ۔ اسی سلسلہ میں فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں ۔

''امام عبد القاهر الجرجانی نے ابو تمام اور متنبی کے دواوین کا انتخاب ''الطرائف الادبة،، کے نام سے کیا تھا، اسے بھی انھوں نے حواشی اور ضروری تشریحات کے ساتھ المختار من شعر المتنبی و البحتری وابی تمام للامام عبدالقاهر الجرجانی کے نام سے شائع کرایا،، ۔

اس میں بھی مضمون نگار کو دھوکا ہوا ۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ میمن نے چند دواوین اور نوادر جمع کئے تھے اور انہیں تحقیق سے مرتب کیا تھا ۔ انھی کا مجموعہ ''الطرائف الادبیة،، کے نام سے ''لجنة التالیف و الترجمة و النشر،، نے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا ۔ یہ مجموعہ دو حصوں میں ہے ۔ قسم اول، (۱) دیوان الافوه الاودی (۲) دیوان الشنفری الازدی اور (۳) و نادر قصائد پر، اور قسم دوم، (۱) دیوان ابراهیم بن العباس الصولی اور (۲) المختار من شعر المتنبی و البحتری و ابی تمام للجرجانی پر مشتمل ہے ۔

اس سے واضح ہوگیا کہ جرجانی نے متنبی ،بحتری اور ابو تمام کا جو انتخاب کیا ہے وہ اس مجموعہ کا صرف ایک جزء ہے ، نیز اس انتخاب کا نام

''الطرائف الادبية،، نہیں ہے بلکہ خود میمن صاحب نے اس مجموعہ کا نام ''الطرائف الادبية،، رکھا ہے ۔

۴ ۔ سمط اللآلی، ابو العلاء ومااليه، الوحشيات، اقليد الخزانة اور الطرائف الادبية کے بعد لکھتے ہیں :

''ابو تمام کا دیوان الحماسة الصغری اور علی حمزہ بصری کی التنبیہات علی اغالیط الرواة شائع کیں،،

گویا مضمون نگار کے نزدیک دیوان ''الحماسة الصغری،، مذکورہ ''الوحشيات،، کے علاوہ کوئی اور کتاب ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے ۔ وضاحت گزر چکی ہے ۔

٥ ۔ ان کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں : ۔

''ان چھ کتابوں کے علاوہ ان کی دیگر تالیفات جن کا مجھے علم ہو سکا۔ الخ،، جب کہ سات کتابوں کا ذکر گزر چکا ہے ۔ الوحشيات اور الحماسة الصغری کو دو علیحدہ کتابوں کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے ۔

٦ ۔ اس کے بعد ۲۳ کتابوں کے نام گنائے گئے ہیں جن میں سب سے پہلے ''زیادات دیوان شعر المتنبی،، کا ذکر کیا ہے ۔ اور سات کتابوں کے بعد پندرھویں(١٥) نمبر پر ''الفائت من شعر المتنبی،، کے نام سے ایک کتاب کا ذکر ہے ۔ حالانکہ دونوں کا مفہوم ایک ہے ۔ مضمون نگار کو غالباً غلط فہمی ہوئی ۔ الفائت من شعر المتبنی،، کی بجائے ان کو فائت شعر ابی العلاء،، لکھنا تھا ۔ یہ کتابچہ ابو العلاء وما اليه کے ساتھ ہی شائع ہوا تھا ۔

٧ ۔ تیرھویں (١٣) نمبر پر ''ثلاث رسائل نادرہ،، کا ذکر ہے اور انتیسویں (٢٩) پر کتاب ''لحن العامہ،، کا ۔ ''ثلاث رسائل نادرہ،، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے تین رسائل کا مجموعہ ہے ۔

یعنی :

١ - مقالة کلا لابن فارس

٢ - ما تلحن فیه العوام للکسائی

٣ - رسالة ابن عربی الی الفخر الرازی

معلوم ہوا کہ ''لحن العامہ'' ثلاث رسائل نادرہ میں شامل ایک رسالہ ہے۔ اگر اس کو علیحدہ سے ذکر کرنا ضروری تھا تو ''ثلاث رسائل نادرہ'' کی بجائے تینوں رسائل کو علیحدہ علیحدہ ذکر کرنا چاہئیے تھا۔

٨ - آخر میں لکھتے ہیں :-

''ان کا ایک مضمون بعنوان ابو عمر الزاہد مجلة المجمع العلمی الہندی علی گڑھ (ہندوستان) میں ١٩٧٦ء میں شائع ہوا۔ شاید یہ والد محترم کا طبع شدہ آخری مضمون ہو''

مجمع اللغة العربیة دمشق میں، قاعدہ ہے کہ جس کو وہ رکن کی حیثیت سے منتخب کرتے ہیں اسے کوئی مقالہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ علامہ میمن کا جب انتخاب ہوا تو ابتدا میں ان کا ارادہ تھا کہ وہ نعمان بن بشیر الانصاری کے دیوان کا تحقیقی ایڈیشن تیار کریں گے۔ مگر بعد میں انہوں نے ابو عمر الزاہد کی کتاب المداخل مرتب کی اور ابو عمر الزاہد کے مفصل حالات تحریر فرمائے۔ کتاب المداخل کی تحقیق ذوالقعدہ ١٣٤٦ھ مطابق مئی ١٩٢١ء میں علی گڑھ کے زمانہ قیام میں مکمل ہوئی۔ مجمع اللغة نے کتابی شکل میں تو ابھی یہ کتاب شائع نہیں کی لیکن مجلہ میں ١٩٢٩ء ہی میں قسط وار شائع کردی تھی۔ (١)

---

١ - ملاحظہ ہو مجلة المجمع مجلد ٩ ٪ ٣٣٩ - ٣٦٠، ٥٣٢ - ٥٤٤، ٦٠١ - ٦١٦

مجلة المجمع العلمی الهندی نے اپنے اولیں شمارہ جون ۱۹۷۶ء میں ابو عمر الزاهد کے حالات زندگی کو جو مجلة المجمع العلمی دمشق میں شائع هو چکے تھے دوباره شائع کیا ۔ اس سے معلوم هوا که جسے محمد محمود میمن صاحب اپنے والد محترم کا آخری مضمون سمجھ رهے هیں وہ ۱۹۲۹ء میں شائع هو چکا هے ۔

علامه میمن کا آخری طبع شده مضمون ''من نسب الی امه من الشعراء'' هے جسے ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر سید محمد یوسف مرحوم نے میمن صاحب کے کاغذات سے مرتب کیا تھا ۔ یه مضمون مجلة المجمع میں ۱۹۷۷ء میں شائع هوا هے ۔[۱]

۹ ۔ فاضل مضمون نگار نے روزنامه جنگ سے جمیل الدین عالی کے حواله سے ایک اقتباس نقل کیا هے جس میں شیخ الازهر محمود شلتوت کا نام محمد شلطوت لکھا هے یعنی ''محمود'' کی بجائے ''محمد'' اور شلتوت کی املا ''ت'' کی بجائے ''ط'' لکھی هے جو صحیح نہیں هے ۔

حق تو یه تھا که هندوپاک کے علمی رسائل خصوصاً اورینٹیل کالج میگزین لاهور اور الدراسات الاسلامیه اسلام آباد مولانا میمن کی حیات و خدمات پر خصوصی نمبر شائع کرتے لیکن ابھی تک میری محدود اطلاع کے مطابق کوئی ایسا جامع مقاله بھی شائع نہیں هو سکا جس میں ان کی زندگی اور کارناموں پر مکمل تحقیق سے روشنی ڈالی گئی هو ۔ ڈاکٹر شاکر فحام کو اردو سے ناواقفیت کی وجه سے علامه کے ان مقالات کا علم نہیں هوسکا جو اردو رسائل میں شائع هوئے

---

۲ ۔ ملاحظه هو مجلة المجمع مجلد ۵۲ / ۵۸۱ - ۶۱۲، ۷۵۵ - ۷۸۳

هیں - چنانچہ انھوں نے اپنے مقالہ کے آخر میں معذرت ظاہر کی ہے - پھر علامہ کی زندگی کے حالات اور معمولات و ملفوظات سے جو واقفیت ان کے تلامذہ ، عزیزوں اور دوستوں کو ہو سکتی ہے وہ دوسروں کے لئے ممکن نہیں اس لئے ان کا فرض ہے کہ وہ یہ خدمت انجام دیں -

مجھے احساس ہے کہ یہ خط خاصا طویل ہو گیا، ذاتی حصہ کو علیحدہ کرکے ''تصحیح و استدراک،، سے متعلق حصہ فکر و نظر کے آئندہ شمارے میں شامل فرمائیں - فکر و نظر نائب میں کب سے آرہا ہے ؟ آپ کا کام کس مرحلہ میں ہے ؟ علی گڑھ میں لوگ خصوصاً فرخ جلالی صاحب(۱) آپ سے بہت متاثر ہیں ، آپ کی سادگی اور پتہ ماری کو دیکھ کر انہیں تعجب ہوا - عام طور پر جن محققین سے ان کا سابقہ پڑتا ہے آپ کو ان سے بہت مختلف پایا -

والسلام

محمد اجمل اصلاحی

اصلاحی کاٹیج، جامعہ نگر، نئی دھلی، ۱۱۰۰۲۵

---

(۱) - کلکتے کا جو ذکر کیا تونے همنشیں اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

علی گڑھ کی زیارت اور اس سے وابستہ بہت سی یادیں اور باتیں، بھولی تو نہیں تھیں، ہاں دنیوی مکروہات، روز افزوں مصروفیات اور استداد وقت کے غبار میں ان کے نقوش دھندلا ضرور گئے تھے - اچھا ہوا یاد دلا کر آپ نے انہیں اجاگر کر دیا - دل منت گزار یوں تو بہتوں کا ممنون ہے مگر جلالی صاحب کا ملنا تو میرے حق میں ملاقات مسیحا و خضر سے بہتر ثابت ہوا - باقی صفحہ ۶۵ پر

یہ واقعہ ہے کہ فرخ جلالی کی رہنمائی اور مدد مجھے حاصل نہ ہوتی تو میرے لئے کام کا سمیٹنا مشکل ہوجاتا۔ انھوں نے ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے مجھے بے نیاز کر دیا اور جس کام کے لئے مہینوں کی مدت درکار ہوتی اس سے میں پندرہ دن میں فارغ ہو گیا۔ میں خود ان کی سادگی، ذوق جستجو اور وسعت نظر سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اور اس سے زیادہ ان کے ایثار و خلوص اور بے لوث جذبہ خدمت سے۔ دوسروں کے کام آنا شاید ان کا من بھاتا دلپسند مشغلہ ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنا باصلاحیت آدمی اس طرح ناقدری کا شکار ہے۔ وہ ان دنوں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں کسی معمولی خدمت پر مامور ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری میں سر سید روم کو انھوں نے کھنگال ڈالا ہے جس میں زیادہ تر پرانا ریکارڈ اور نوادرات محفوظ ہیں۔ مجھے زیادہ تر کام کی باتیں اسی میں ملیں۔ اور ان کے لئے میں فرخ جلالی کا مرہون منت ہوں۔ سر سید روم کے بعد اپنے کام کے سلسلے میں میری دلچسپی کی دوسری جگہ سرسید ہاؤس تھی جس میں آرکائیوز محفوظ کئے گئے ہیں اور جس کا نام اب غالباً سرسید اکیڈمی رکھا گیا ہے۔ اسے سرسید کے رہائشی بنگلے میں قائم کیا گیا ہے۔ پروفیسر خلیق نظامی صدر شعبہ تاریخ اس کے ڈائرکٹر ہیں۔ اور اسی شعبے کے ایک دوسرے استاذ ڈاکٹر وصی کو اکیڈمی کا انچارج بنایا گیا ہے۔ میں نے یہاں بھی کچھ وقت گذارا۔ لیکن مجھے یہاں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جو کچھ یہاں ہے انبار کی صورت میں ہے۔ درجہ بندی اور ترتیب کا کام ابھی باقی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہاں مجھے کوئی فرخ جلالی نہیں ملا۔ ہزاروں صفحات کی مجلدات کو کھنگالنے کے بعد بمشکل دو چار سطریں ملیں۔ اس تجربہ

باقی صفحہ ٦٦ پر

سے گزرنے کے بعد جلالی صاحب کی صحیح قدر معلوم ہوئی۔ وہ نہ ہوتے تو میں شاید علی گڑھ سے بے نیل مرام واپس آتا یا زیادہ سے زیادہ چند کلیوں پر قناعت کرکے بیٹھ رہتا۔

علی گڑھ میں میرا کام کوہ کندن کاہ بر آوردن کے مصداق تھا۔ جو ملا وہ بہت ہے لیکن جو رہ گیا وہ بھی کم نہیں۔ کاش پابندیوں سے آزاد ہو کر کام کرنے کا موقع ملتا۔ قیام علی گڑھ کے زمانے کا فرخ جلالی کے علاوہ بھی بے شمار بزرگوں اور دوستوں کا قرض ہنوز واجب الادا ہے۔ اس وقت جو نام آسانی سے یاد آرہے ہیں ان میں علی اختر خاں، انتیاق ظلی، اشتیاق اعظمی، اقبال انصاری اور احمد سورتی برادر خورد مولانا عبدالرحمان طاہر سورتی ریڈر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کی کرم فرمائیوں کا ذکر ابھی باقی ہے۔ لیکن یہ اس کا محل نہیں۔ یوں بات بہت طویل ہو جائے گی۔ (اصلاحی)
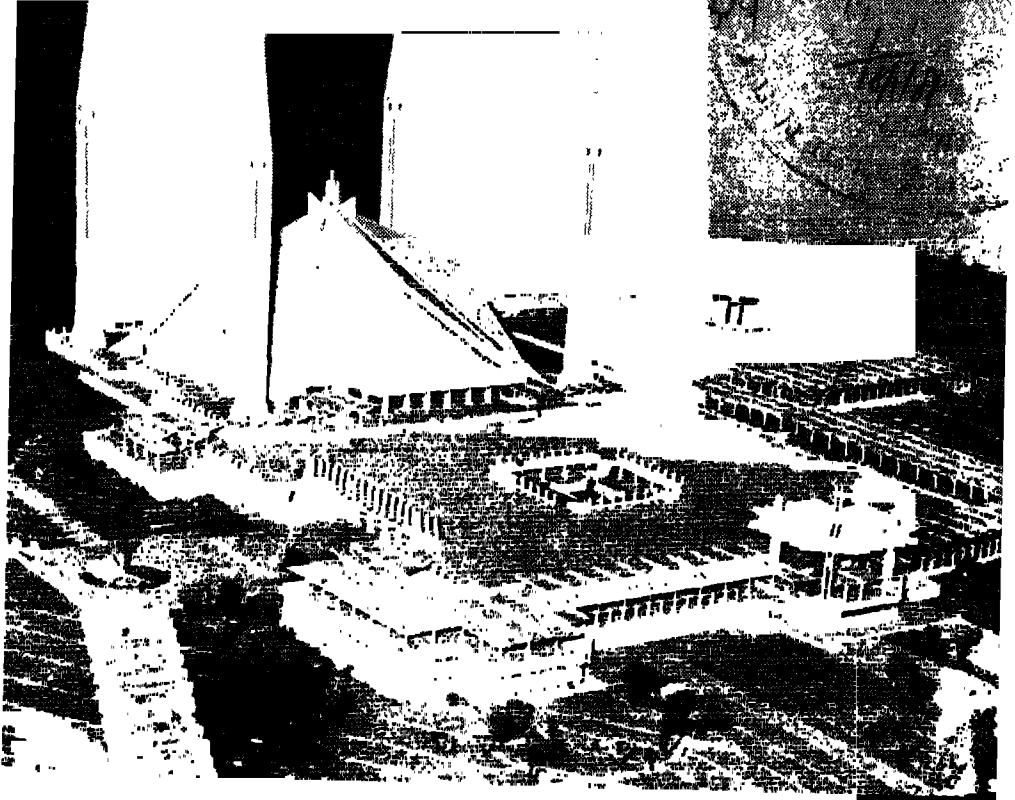
ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی ○ اسلام آباد

نگراں

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا

ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد

مدیر

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی

فکر و نظر اسلامی حدود کے اندر آزادی اظہار رائے کا حامی ہے۔ لیکن [illegible] کسی مضمون کی اشاعت
کا یہ مطلب نہیں کہ ادارہ [illegible] ان سے لازماً متفق ہے جو اس میں پیش
کئے گئے ہیں۔ مضمون نگار اپنے خیالات کا خود ذمہ دار ہوتا ہے

سالانہ چندہ دس روپے	ششماہی پانچ روپے	فی پرچہ ایک روپیہ پچیس پیسے

طابع و ناشر: **محمد سمیع اللہ** سکریٹری ادارۂ تحقیقات اسلامی - اسلام آباد

مطبع: اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پریس - پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵ - اسلام آباد

ماهنامه

فکر و نظر

اسلام آباد

جلد - ۱۸ | صفر المظفر ۱۴۰۱ھ □ جنوری ۱۹۸۱ | شمارہ - ۷

فہرست

سرورق : زیر تعمیر مسجد شاہ فیصل شہید - اسلام آباد

مسجد کے گرد ادارہ تحقیقات اسلامی ، اسلامیہ یونیورسٹی کی عمارات

مجلس ادارت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

محرم کے نظرات میں اس ارادے کا اظہار کیا گیا تھا کہ فکرونظر قمری تقویم کے مطابق ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو حوالہ ڈاک کیا جائے گا۔ یہ اعلان اس اعتماد پر کیا گیا تھا کہ، کیسی ہی تاخیر ہو، رسالہ اس وقت تک لازماً چھپ کر آجائے گا، اس لئے کہ اس کا سواد تہذیب و ترتیب کے مراحل طے کرکے ۱۱ اکتوبر ۸۰ مطابق ۳۰ ذوالقعدہ کو پریس چلا گیا تھا، پریس ادارے کا اپنا ہے اور جدید ترین مشینوں کے علاوہ تربیت یافتہ ہنر مند عملے کی سہولتوں سے بہرہ ور ہے، ہم نے عزم مصمم کر رکھا تھا کہ پندرھویں صدی ہجری کا پہلا شمارہ مقررہ وقت پر شائع کریں گے، لیکن افسوس کہ ہمارا یہ عزم گفتنی اور ناگفتنی اسباب کی بنا پر پورا نہ ہوا۔ عرفت ربی بفسخ العزائم ایسے ہی مواقع پر کہا کرتے ہیں۔ اس میں میری کوتاہی عمل یا سوء تدبیر و تدبر کو دخل مطلق نہیں ہے۔ پھر بھی معذرت خواہ ہوں۔ اور یہ معذرت خواہی اپنے عجز و بے بسی پر اظہار ندامت سے زیادہ خفت مٹانے کے مترادف ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ آئندہ اس کی نوبت نہ آئے۔

چودھویں صدی ہجری کے اختتام اور پندرھویں صدی کے آغاز کی تقریب سے منصوبہ یہ تھا کہ پہلی محرم کو خصوصی شمارہ شائع کیا جائے جس کے لئے ڈیڑھ سو سے زائد صفحات کا سواد مرتب کیا گیا۔ مگر تاخیر سے بچنے کے لئے یہ تدبیر کی گئی کہ اس کو حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ تاخیر پھر بھی ہوئی اور وقت پر محرم کا شمارہ نہ آسکا۔ اب خصوصی شمارہ محرم، صفر اور ربیع الاول

کے حصہ اول حصہ دوم اور حصہ سوم کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ شاید اس طرح اس وقت نہیں تو آئندہ ہم اس قابل ہوجائیں کہ باقاعدگی اور پابندی وقت کی روایت اور ریت کو نبھا سکیں۔

محکمہ ڈاک نے از راہ مہربانی فکرونظر کو قمری مہینوں کے مطابق حوالہ ڈاک کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس کی اطلاع ادارے کو پوسٹ ماسٹر جنرل کے مراسلہ نمبر بی-آر- 045 مورخہ 30 اکتوبر 80ء کے ذریعے موصول ہوچکی ہے۔ ضابطے کی کارروائی کے بعد یہ رکاوٹ بھی دور ہوگئی ہے۔ داخلی سطح پر کچھ انتظامی دشواریاں رہتی ہیں ان پر بھی قابو پا لیا جائے گا۔ وباللہ التوفیق!

(مدیر)

چودھویں صدی ھجری کی ایک دینی درسگاہ

دارالعلوم دیوبند

مولانا محبوب الرحمان

دارالعلوم دیوبند کا ذکر آتا ہے، تو ھمارے سر عظمت و وقار کی اس فلک بوس عمارت کا تصور کرکے نیاز مندانہ جھک جاتے ھیں۔ اس مادر علمی سے ھزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مسلمانوں نے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ برصغیر کے مشرقی کونہ اور مغربی حدود سے نکل کر ترکستان بلکہ مشرق وسطی تک کے علاقوں میں یہیں سے دینی علوم کی نہریں جاری ھوئیں ان میں جزائر شرق‌الہند کو بھی شامل کر لیجئیے تو نصف کرۂ ارض پر ابنائے دارالعلوم کی عملی ترکتازیاں نظر آئیں گی۔ اگر ھم یہ دعوی کریں کہ ابنائے دارالعلوم فریضہ قال اللہ و قال الرسول کا علم تھام کر دیارمغرب تک جا پہنچے تو یہ مبالغہ ھرگز نہیں ھوگا۔ ھمارے علم میں یہ بات بھی آئی کہ اس مادر علمی سے فیض یافتہ حاملین علم وسط ایشیاء کی مسلم ریاستوں میں بھی پہنچے جو اس وقت سوشلزم کے پنجہ تسلط میں ھیں۔ اور افغانستان جو آج کمیونزم کا شکار ھوا ہے اس میں کسی وقت تحریک آزادی ھند کا کیمپ قائم تھا۔ میری مراد تحریک ریشمی رومال سے ہے جس کے روح و رواں اس مادر علمی کے سب سے اول متعلم اور بعد میں صدر مدرس شیخ الہند مولانا محمود حسن رح تھے۔

راقم کا نظریہ ہے کہ برصغیر میں تین تحریکیں جو مختلف اوقات میں اٹھیں ان میں سے ایک بھی اگر اپنے منطقی انجام کو پہنچ پاتی تو پورے برصغیر کا نقشہ اس نقشہ سے مختلف ھوتا جو اس وقت ھمارے سامنے ہے۔ پہلی تحریک

سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی احیائے خلافت کی تحریک ہے جسے ٹھوس منصوبہ بندی کے تحت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقرر کردہ خطوط پر اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی رهنمائی میں شروع کیا گیا ۔ اس کا آغاز هی جہاد بالسیف کی صورت میں اعلائے کلمۃ الحق سے هوا ۔ اگرچه اسے ابتداء میں خاصی کامیابی هوئی لیکن بالآخر غداروں کی غداری نے اسے ناکامی سے دوچار کیا ۔ مجاهدین سر زمین بالاکوٹ کو اپنے خون سے رنگین کرکے آئنده کسی دوسرے هاتھ کے لئے ذمه داری چھوڑ کر خود پرده خاک میں روپوش هو گئے ۔ اسلام کے یه جانباز جو پہاڑی دروں سے گزر کر وطن سے دور اس بیابان میں پہنچے تھے، سکھوں کے هاتھوں شہید هو گئے ۔ اور جو باقی ره گئے وه کسی طرح جان بچا کر هندوستان پہنچے اور اپنی قوت کو مرتکز کرنے میں مصروف هو گئے ۔ اگرچه انهیں مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن انهوں نے کسی نه کسی صورت میں اپنا کام جاری رکھا تا آنکه ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کا پرچم بلند هوا ۔ اصل میں ۱۸۵۷ء کی یه تحریک آزادی هند پورے برصغیر کے مسلمانوں کی انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ایک اجتماعی کوشش تھی ۔ لیکن افسوس که یه تحریک بھی پروان نه چڑھ سکی ۔ یہاں بھی غداروں کی غداری نے بچھی هوئی بساط الٹ دی اور مسلمان جیتی هوئی بازی هار گئے ۔

عین اس وقت جبکه انگریزی لشکر هر طرف سے بڑھ رها تھا، شاملی کے میدان میں اللہ تعالی کے ان سرفروش سپاهیوں نے ان کا راسته روکا ۔ اس معرکه میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح امام مقرر هوئے ۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی رح سپه سالار افواج مقرر هوئے ۔ مولانا رشید احمد گنگوهی رح قاضی مقرر هوئے ۔ مولانا محمد منیر اور حافظ ضامن تھانوی میمنه اور میسره کے افسر مقرر هوئے ۔ اعلان جہاد هوا ۔ تھوڑی مدت میں مسلمان جوق درجوق سر پر کفن باندھے جمع هو گئے ۔ اگرچه هتھیار پرانی وضع کے تھے ۔ مسلمانوں نے تھانه بھون میں اسلامی

حکومت قائم کرلی ۔ انگریز کو خبر ہوئی تو اس نے فوراً توپ خانہ سہارنپور سے شاملی بھیجدیا ۔ ایک پلٹن اس توپخانہ کے ہمراہ تھی ۔ لوگوں کو تشویش ہوئی ۔ حضرت گنگوھی رح نے فرمایا ”فکر مت کرو“ سڑک باغ کے کنارہ سے گزرتی تھی ۔ حضرت گنگوھی رح نے تیس چالیس آدمی اپنے ہمراہ لئے اور گھات لگا کر بیٹھ گئے ۔ جب پلٹن قریب سے گزری تو سب نے یکدم فائر کیا ۔ پلٹن گھبرا گئی ۔ اور توپ خانہ چھوڑ کر بھاگ گئی ۔ شاملی اس زمانہ میں مرکزی مقام تھا اور ضلع سہارنپور کی ایک تحصیل شمار ہوتا تھا ۔ فیصلہ ہوا کہ اس پر حملہ کرکے قبضہ کیا جائے ۔ چنانچہ حملہ کیا گیا اور قبضہ کر لیا گیا ۔ جو پولیس اور فوج تھی مغلوب ہو گئی ۔ لیکن اس موقع پر حافظ ضامن شہید ہو گئے ۔ ان کی شہادت کے ساتھ ہی معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا ۔ پھر خبریں آنے لگیں، آج انگریزوں نے فلاں مقام پر قبضہ کر لیا اور آج فلاں مقام پر ۔ پہلے تو یہ بات تھی کہ گورے سپاہی مسلمانوں سے چھپتے پھرتے تھے ۔ اور اب معاملہ اس کے برعکس ہوگیا ۔ بالآخر انگریزوں نے تھانہ بھون پر قبضہ کرلیا ۔ اور وہ قیامت ڈھائی جس کی مثال ملنی مشکل ہے ۔

اس کے بعد مسلمان ہمیں منتشر نظر آتے ہیں ۔ حضرت حاجی امداد اللہ ہجرت کرکے مکہ تشریف لے جاتے ہیں ۔ حضرت گنگوھی رح پکڑے جاتے ہیں حضرت نانوتوی انگریزوں کے ہاتھ نہیں لگتے ۔ انگریزوں کا ہندوستان پر قبضہ ایک مصیبت سے کم نہ تھا ۔ انگریز فاتح تھا۔ پھر حاکم بن گیا ۔ اس نے یہاں کی تہذیب بدلنے کی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ عدالتی نظام بدلا ۔ پھر تعلیم کی باری آئی ۔ اس کے لئے انگریز نے مساجد سے مدارس و مکاتب علیحدہ کئے ۔ اسکولوں اور کالجوں کی بنیاد رکھی۔ بدیسی زبان یعنی انگریزی کی حوصلہ افزائی شروع ہوئی۔ نئی تعلیم کے دلدادہ اور فارغ التحصیل اشخاص کو اختیارات تفویض کئے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کا نقشہ بدلنے لگا ۔ اس وقت اللہ تعالی کے ان بندوں

کا دل کڑھنے لگا - بوریہ نشین تھے- ظاهری مال و دولت سوائے ایمان کے کچھ نہ تھا - بهرحال اللہ تعالی کا نام لےکر ایک جگہ جمع هوئے - مقصد یہ تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک احیائے دین اور احیائے خلافت زمانہ کے حوادث میں کہیں گم نہ هو جائے- وهی تحریک جس کے لئے سید احمد شہید رحمۃ اللہ، شاہ اسماعیل رحمۃاللہ اور ان کے رفقائے کار نے اپنا خون دیکر آبیاری کی تھی - جس کی خاطر اس تحریک کے علمبرداروں نے مصائب جھیلے - قیدیں کاٹیں - جلاوطن هوئے - بے آبرو هوئے - اب وقت آگیا تھا کہ اس کا نئے سرے سے احیاء کیا جائے - تحریک احیائے اسلام جب هم بولتے هیں تو اس کا مقصد یہ هرگز نہیں هوتا کہ یہ کوئی نئی تحریک هے - جس کا سهرا ان حضرات کے سر هے - بلکہ اس کا ایک سرا تو حضرت ابراهیم علیہ السلام کے زمانہ تک چلا جاتا هے - جبکہ باپ نے چاها کہ اپنے لخت جگر کو اسلام کی راہ میں قربان کردے - اور فرزند دلبند نے چاها کہ اللہ کے حکم کے آگے گردن جھکا دے - اسے قرآن نے ''اسلما،، سے تعبیر کیا هے - یعنی دونوں باپ اور بیٹا اللہ کے حکم کے آگے جھک گئے -

یہی وجوہ و اسباب تھے جن کے پیش‌نظر اب اللہ تعالی کے ان بندوں نے فیصلہ کیا کہ مدرسہ کی صورت میں ایک مرکز کی بنیاد رکھی جائے - یہی مرکز تحریک کی اساس هوگا اور اسی سے احیائے اسلام کا کام لیا جائے گا - اس موقع پر حاجی سید محمد عابد صاحب رح کا نام خصوصیت سے قابل ذکر هے- آپ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح کے خلفائے عظام میں سے هیں - حد درجہ کے عابد و زاهد اور متقی تھے- ان کو مدرسہ کی لگن لگی هوئی تھی - اس وجہ سے آپ نے اور مولانا مہتاب علی صاحب (عم بزرگ شیخ الهند) نے ۱۰ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸٦۸ء بروز پنجشنبہ مدرسہ مذکور کی ابتدا کی- فراهمی چندہ کے لئے آپ نے رومال پھیلایا - اور پانچ روپیہ سب سے پہلے اپنی جیب

سے ڈالے۔ اگلے روز حاجی عابد حسین رحمۃاللہ نے مولانا محمد قاسم نانوتوی کو میرٹھ خط لکھا کہ آپ پڑھانے کے لئے دیوبند تشریف لائیے۔ مولانا نے جواب میں لکھا :-

"میں بہت خوش ہوا۔ خدا بہتر کرے۔ مولوی ملا محمود صاحب کو پندرہ روپے ماھوار مقرر کرکے بھیجتا ھوں۔ وہ پڑھا دیں گے۔ اور میں مدرسہ مذکور کے لئے مساعی رھوں گا"۔

چنانچہ زیر درخت انار مسجد چھتہ دیوبند میں مدرسہ مذکور کا افتتاح ھوا۔ سب سے پہلے متعلم محمود حسن (شیخ الہند) سب سے پہلے معلم ملا محمود، ساعت محمود یوم محمود (پنجشنبہ) ماہ محمود (محرم الحرام) تھا۔ پہلے سال یعنی ۱۲۸۳ھ کے اختتام پر مندرجہ ذیل کتب پڑھائی گئیں۔

شرح جامی، شرح وقایہ، میبذی، قطبی، اصول الشاشی، سراجی۔

سب سے پہلی مجلس شوری کے ارکان یہ ھیں :

(۱) مولانا محمد قاسم

(۲) حاجی عابد حسین

(۳) مولانا مہتاب علی

(۴) مولانا فضل الرحمان

(۵) مولانا ذوالفقار علی

(۶) شیخ نہال احمد

(۷) منشی فضل حق

تعلیم کا دور سب سے پہلے ۱۲۸۹ھ میں مکمل ھوا۔ سب سے پہلے پانچ طالبعلم یہاں سے فارغ ھوئے۔ جن کے اسمائے گرامی یہ ھیں :

(۱) مولانا محمود حسن (شیخ الهند)

(۲) مولانا عبدالحق

(۳) مولانا فخر الحسن گنگوهی

(۴) مولانا فتح محمد تهانوی

(۵) مولانا عبداللہ جلال آبادی

اول اول تو مدرسه اسی چهته والی مسجد میں رها - پهر طلبه کی تعداد میں اضافه هوا تو دوسرے مکانات میں تبدیل هوتا رها - پهر ضرورت هوئی که اسے کسی کشاده جگه منتقل کیا جائے - اور اس کے محرک مولانا قاسم نانوتوی تهے - ان کی انتهک کوششوں سے ابتداءً ایک چهوٹے سے دارالعلوم کی صورت گری هوئی - اس وجه سے مولانا قاسم نانوتوی رح دارالعلوم کے بانی هیں -

روایت هے که سب سے پہلی اینٹ میاں منے شاه رحمة الله نے رکھی - دوسری اینٹ حاجی عابد حسین نے اور تیسری گنگوهی رحمة الله نے اور اس کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتوی نے -

سنگ بنیاد کے وقت مندرجه ذیل حضرات موجود تهے :

(۱) مولانا رشید احمد گنگوهی

(۲) مولانا محمد قاسم نانوتوی

(۳) مولانا شاه رفیع الدین

(۴) شاه منے صاحب

(۵) سید محمد عابد

(۶) شاه عبدالرحیم صاحب رامپوری

(۷) مولانا محمد یعقوب

(۸) مولانا محمود حسن (شیخ الهند)

(۹) مولانا اشرف علی تھانوی
(۱۰) مولانا فضل الرحمن
(۱۱) شیخ نہال احمد
(۱۲) مولانا ذوالفقار علی

یہ دارالعلوم دیوبند کی ابتدائی مختصر تاریخ ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا قیام دارالعلوم کا اصل مقصد اس تحریک کو زندہ کرنا تھا جس کا نقشہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تیار کیا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ انگریز اپنے قدم ہندوستان میں جما چکا تھا۔ اب ان سب کی نظریں اس بات پر مرکوز ہو گئیں۔کہ انگریز کو برصغیر سے نکالا جائے۔ اس دوران ہم مولانا قاسم نانوتویؒ کے تذکرہ میں دیکھتے ہیں کہ آپ انگریز پادریوں کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ انگریز نے یہ کوشش کی کہ اپنے ہمراہ انگلستان سے پادری بر صغیر میں درآمد کرے۔ وہ کھلے بندوں سارے برصغیر میں گھومتے پھرتے اور مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرتے۔ مقصد یہ تھا کہ اسلام کے بارے میں لوگوں کے ذہن مشکوک کئے جائیں۔ مولانا قاسم نانوتوی کو اللہ نے ظاہری و باطنی کمالات سے نوازا تھا۔ علم بھی بلا کا تھا۔ نانوتوی رحمۃ اللہ نے عیسائی پادریوں سے مناظرے کئے۔ چنانچہ شاھجہاں پور کا مناظرہ مشہور ہے جس میں عیسائی پادری کو بری طرح شکست ہوئی۔ اسی طرح رڑکی کا مناظرہ مولانا کی کتاب ''قبلہ نما'' اس سلسلہ کی اہم دستاویز ہے۔

شروع میں میں نے ہندوستان کی تین تحریکوں کا حوالہ دیا تھا۔ دو تحریکوں کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ ورنہ ہر تحریک کے لئے مستقل کتابیں موجود ہیں۔ اب تیسری تحریک کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔ جسے ''تحریک ریشمی رومال'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کے بانی شیخ الہند مولانا محمود حسن ہیں۔

جو اس وقت دارالعلوم دیو بند کے صدر مدرس تھے -

اس تحریک کا مقصد خلیفہ ترکی کو آمادہ کرنا تھا کہ وہ اپنی فوجیں افغانستان کے راستہ ہندوستان میں داخل کرے - دراصل یہ تحریک مسلح جہاد کی مانند تھی - اس تحریک کے لئے شیخ الہند نے ھی خطوط متعین کئے تھے - اس تحریک کو بہت ھی خفیہ رکھا گیا - اور اس کے لئے ایک جماعت ''نظارۃ المعارف،، کے نام سے بنائی گئی - اس میں شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک شریک تھے - پھر ڈاکٹر انصاری بھی شامل ھوگئے - مولانا عبیداللہ سندھی دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھے - انھیں دارالعلوم سے الگ کیا گیا - ظاھر یہ کیا گیا کہ مولانا سندھی اور دیگر علماء کا بعض علمی مسائل میں اختلاف ھو گیا ھے - اور اسی اختلاف کی بنیاد پر مولانا سندھی کو علیحدہ کرنا ضروری سمجھا گیا - بعد میں مولانا سندھی کو شیخ الہند نے کابل بھیجدیا - یہ کسی طرح چھپتے چھپاتے کابل پہنچ گئے - اس کے بعد کا حال مولانا سندھی کے اپنے الفاظ میں یوں ھے -:

''کابل جا کر مجھے معلوم ھوا کہ حضرت شیخ الہند جس جماعت کے نمائندے تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لئے تیار ھے - اس کو میرے جیسے ایک خادم کی اشد ضرورت ھے - اب مجھے اس ھجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ھونے لگا - میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ھندوستانی کام کرتا رھا،، -

ان حالات میں جب کہ حکومت کی سی آئی ڈی شدت سے اپنا کام کررھی تھی، بالخصوص اس زمانے میں جبکہ ذرائع نقل و حمل اور رسل و رسائل بڑے محدود تھے - پیغامات مختلف کوارٹرز تک پہنچانے کے لئے بہت زیادہ احتیاط کی

ضرورت تھی۔ مثلاً ایک شخص پشاور سے شیخ الہند کے پاس حاضر ہوتا ۔ وہ کاغذ کے پھول اور گلدان بنانا جانتا تھا ۔ حضرت اسے کابل کے لئے خط دیتے ۔ وہ اسے پھول کی شکل میں بدلتا اور دیگر پھولوں کے ھمراہ گلدان کی صورت میں پشاور لیجاتا ۔ کسی کو گمان تک بھی نہ ہوتا کہ کسی پھول میں خط بھی ہو سکتا ھے ۔ اس طرح وہ شخص باقی پھول تو مقامی طور پر فروخت کر دیتا ۔ لیکن اصل پھول کسی کابل والے کے ھاتھ میں تھما دیتا ۔ جو اس غرض سے پشاور میں موجود ھوتا ۔ اب دیکھئے کس قدر احتیاط برتی گئی ۔ انھی ذرائع میں ایک ریشمی رومال بھی تھا ۔ اگرچہ ریشمی رومال کی اھمیت بہت زیادہ ھے۔ اس لئے کہ اس پر فوجوں کی نقل و حرکت کے بارہ میں عبارت کاڑھی گئی تھی ۔ گورنر حجاز کے دستخط غالباً حاصل کئے جا چکے تھے۔ اور اب اس پر کابل کے دستخطوں کی ضرورت تھی ۔ اوریہ رومال کابل پہنچانا مقصود تھا ۔ تاکہ وقت مقررہ پر ترکی کی فوجیں افغانستان کے راستہ ھندوستان میں داخل ھوں ۔ لیکن وائے افسوس مخبروں کو خبر ھوگئی۔ اور یہ ریشمی رومال پکڑا گیا ۔ ساری اسکیم بظاھر ناکام ھوگئی ۔ عبارت دریافت کی گئی ۔ شیخ الہند مع اپنے رفقاء گرفتار ھوگئے اور مالٹا پہنچا دئے گئے۔ اور وھاں پانچ سال تک مع اپنے رفقاء مولانا سید احمد مدنی، مولانا عزیر گل جو اب بھی بقید حیات ھیں اور حکیم نصرت حسین مصائب برداشت کر کے واپس ھوئے ۔ موخرالذکر وھیں فوت ھوئے ۔ ریشمی رومال پر بھی کتابیں لکھی گئی ھیں ۔ جو حضرات اس تحریک کے متعلق جاننا چاھتے ھوں وہ ضرور مطالعہ کریں ۔

یہ ان تین تحریکوں کا اجمالی تعارف تھا ۔ جن کے بارے میں میرا نظریہ یہ ھے کہ اگر ان میں سے ایک بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتی تو برصغیر کا نقشہ آج کے نقشہ سے مختلف ھوتا ۔ غرض یہ کہ دارالعلوم دیوبند ایک عظیم

دینی درسگاہ سے زیادہ ایک تحریک کا نام ہے۔ جس نے تحریک ولی اللہی کو زندہ رکھا۔ اور آج تک اس کے علم کو تھامے ہوئے ہے۔

آزادی ہند کے دوران ہمیں اس دارالعلوم سے وابستہ اکابر دو محاذوں پر لڑتے نظر آتے ہیں۔ ان دونوں کا مقصد ایک ہی تھا کہ بدیسی حکمران کو برصغیر سے نکالا جائے۔ اور بالآخر انگریز نکلنے پر مجبور ہوئے۔ اس کے بعد برصغیر دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ تو پاکستان کا جھنڈا حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی لہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور مشرقی بازو میں یہی جھنڈا مولانا ظفر احمد عثمانی نے لہرایا۔ پھر جب پاکستان کا دستور اساسی تیار ہوتا ہے تو اسمیں بھی مولانا عثمانی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ برصغیر کے دوسرے حصہ میں مولانا حسین احمد مدنی اس مادر علمی کے تحفظ میں سر گرم رہے۔ اور کسی موقع پر جب ان سے پاکستان کے بارے میں پوچھا گیا تو برجستہ فرمایا کہ پاکستان بن گیا ہے۔ اور اس کی حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے۔ حقیقت میں دارالعلوم دیوبند بحیثیت مادرعلمی اور بحیثیت ایک مرکز تحریک احیائے اسلام وسیع و عریض مضمون کا حامل ہے۔ جس پر ایک مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ ان مختصر اوراق میں ان تمام پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش بذات خود بر صغیر کی اس عظیم درسگاہ سے ناانصافی ہے۔ تاہم اس مادر علمی کے متعلق نذرانہ عقیدت کے طور پر چند اوراق لکھنے کی سعی کی ہے۔ کیونکہ میں بھی ایک ایسے بزرگ اور عالم سے فیض یافتہ ہوں جنہوں نے اس مادر علمی میں درسیات کی تکمیل کی۔ اور گزشتہ سال دینی کام ہی کے دوران اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔

دارالعلوم دیوبند نے گزشتہ ایک صدی کے دوران ملت اسلامیہ کے لئے کیا خدمات سر انجام دیں۔ اس کا ایک مختصر گوشوارہ ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۸۲ھ درج ذیل ہے۔

اس صدی کے	دوران اس	مادر علمی نے	۵۳۶	مشائخ	پیدا کئے
"	"	"	۵۸۸۸	مدرسین	" "
"	"	"	۱۱٦۴	مصنفین	" "
"	"	"	۱۷۸۴	مفتی	" "
"	"	"	۱۵۴۰	مناظر	" "
"	"	"	٦۸۴	صحافی	" "
"	"	"	۴۲۸۸	خطیب و مبلغ	" "
"	"	"	۲۸۸	طبیب	" "

طلبائے قدیم درالعلوم نے ۹۰۰۰ مدارس و مکاتب قائم کئے۔

(ماهنامه الحق جون ۷۱ء)

اس مادر علمی سے فیض یافته اهل علم نے علم کی مشعل برابر روشن رکھی۔ جدید اور قدیم دارالعلوم، مدارس اور مکاتب اس وقت ملک میں برابر تشنگان علوم کو سیراب کر رہے هیں۔ ان سب درسگاهوں کا اصل سر چشمه وه مادر علمی هے جس نے اپنی زندگی کے سو سال پورے کر لئے هیں۔

آخر میں میں مناسب سمجھتا هوں که مسلک دیوبند کے متعلق مختصراً عرض کروں سو اس کے لئے میں نے دارالعلوم کے موجوده مهتمم مولانا قاری محمد طیب صاحب کے الفاظ کا انتخاب کیا هے۔

''علمائے دیوبند اپنے مسلک اور دینی رخ کے لحاظ سے اهلسنت والجماعت هیں۔ اور اهل سنت کا بھی اصل هیں۔ هندوستان میں یه سلسله قوت کے ساتھ اجتماعی رنگ میں حضرت الامام حضرت شاه ولی الله دهلوی رحمة الله علیه سے زیاده پھیلا اور چمکا۔ اس سلسله کی وه کڑی آج هندوستان میں اهلسنت والجماعت کے مسلک کی ترجمان اور رواں دواں هے۔ علماء

دیوبند ھیں جنھوں نے تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس سلسلہ کو مشرق سے مغرب تک پہنچایا اور پھیلایا . . . . .

پس مسلک علماء دیوبند محض اصول پسندی کا نام ھے ۔ نہ شخصیت پرستی کا ۔ نہ ان کے یہاں دین اور دینی تربیت کے لئے تنہا لٹریچر کافی ھے ۔ نہ تنہا شخصیت، نہ تنہا مطالعہ، نہ اپنا ذاتی ذھن غور و فکر کے لئے کافی ھے، نہ تنہا شخصیتوں کے اقوال و افعال پر اتکال اور بھروسہ ۔ بلکہ احوال و قانون اور ذوات و شخصیات اور بالفاظ مختصر لٹریچر بشرط معیت و ملازمت صدیقین سے اس مسلک کا مزاج بنا ۔ جس میں کسی ایک کے احترام سے قطع نظر جائز نہیں اور جبکہ جامعیت اور اعتدال اور احتیاط و میانہ روی ھی مسلک کا جوھر ھے تو دین کے ان تمام شعبوں اور علمی اصول میں قرآن و حدیث سے لے کر فقہ و کلام اور تصوف و اصول وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی جزئی پر جمنا اور حکمت و اعتدال کے ساتھ اسے مشعل راہ بنانا ھی اس مسلک کا امتیاز ھے ۔ اور ادھر ذوات اور شخصیات کی لائن میں حضرات انبیائے کرام علیھم الصلواۃ و السلام سے لے کر ائمہ، اولیاء، صلحاء، علماء مشائخ، صوفیاء اور حکماء کی ذوات قدسیہ تک کے بارے میں افراط و تفریط سے الگ رہ کر ان کی عظمت، متابعت پر قائم رھنا ھی اس مسلک کی امتیازی شان ھے ،، ۔

سیرت نبوی کی بعض اہم ضروری تاریخیں

شرف الدین اصلاحی

کسی اہم واقعہ سے تاریخ کی تعیین کا طریقہ عربوں میں بھی اسی طرح رائج تھا جیسا کہ دنیا کے دیگر ممالک میں تھا۔ سنہ ھجری کی ابتداء سے پہلے قریش کے لوگ عام طور پر واقعات کی تاریخ عام الفیل یعنی اس سال سے شروع کرتے تھے جبکہ ابرھۃ الاشرم حاکم یمن نے ھاتھیوں کا ایک دستہ لے کر خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کے لئے حملہ کیا تھا اور آسمانی عذاب سے اس کی فوج ملیامیٹ ہوگئی تھی۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ الفیل میں ھے۔

سنہ عیسوی سے مطابقت بعد میں کر لی گئی ھے۔ موجودہ سنہ عیسوی حقیقۃً حضرت عیسی علیہ السلام کی ولادت یا آسمان پر اٹھائے جانے کی تاریخ سے نہیں شروع ھوتا ھے۔ بلکہ محض فرضی طور پر راھب اگزیگوس نے حضرت عیسی علیہ السلام سے بہت دنوں بعد بنا لیا ھے۔ اور آج جو سنہ عیسوی ھے وہ تو حضرت مسیح سے تقریباً بارہ سو سال بعد بنایا گیا ھے۔ مگر عام طور سے یہ سنہ اب متعارف ھوگیا ھے۔ اب اسی سے مطابقت کرکے تاریخیں بتائی جاتی ھیں۔

عربوں میں سال کے ۱۲ قمری مہینے شمار ھوتے تھے۔ اس وقت بھی مہینوں کے نام یہی رائج تھے جو آج ھیں۔ یعنی محرم۔ صفر۔ ربیع الاول وغیرہ، اور ترتیب بھی یہی تھی۔ اسی لئے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں جب کوئی تاریخ بتائی جائے تو وہ قمری تاریخ ھوتی ھے۔ البتہ یہ اختلاف دکھائی دیتا ھے کہ کبھی مکہ کے کبیسہ والے حضری کیلنڈر سے راوی بیان کرتا ھے اور کبھی بغیر کبیسہ کے بدوی کیلنڈر سے جو سنہ ۹ ھجری کی ابتداء تک مدینہ میں بھی

عام طور پر مروج تھا۔ شمسی تاریخیں بہت بعد کو علماء ہیئت نے متعین کی ہیں ۔ تاریخی روایتوں میں اس کا ذکر موجود نہیں ہے ۔

سنہ ۱ عام الفیل — ذی قعدہ ۔ آنحضرت کے والد جناب عبداللہ شام سے واپس آتے ہوئے مدینہ میں انتقال کر گئے ۔ اس وقت آپ تقریباً چھ ماہ کے بطن مادر میں تھے۔

سنہ ۲ عام الفیل — ۱۲ ربیع الاول روز دوشنبہ بوقت صبح صادق ولادت با سعادت۔

سنہ ۷ عام الفیل — آنحضرت کی والدہ ماجدہ حضرت بی‌بی آمنہ مدینہ سے واپس آتی ہوئی مقام ابواء میں ٹھہریں اور یہیں انتقال کر گئیں۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چھ سال تھی ۔

سنہ ۱۰ عام الفیل — جناب عبدالمطلب آنحضرت کے دادا کا مکہ مکرمہ میں بعمر ۸۲ سال انتقال ہوا ۔ اس وقت آنحضرت کی عمر آٹھ سال سے کچھ زیادہ تھی ۔ اس کے بعد آنحضرت اپنے چچا جناب زبیر بن عبدالمطلب کے ساتھ رہنے لگے ۔ اور جناب ابو طالب جو سب بھائیوں میں بڑے ہونے کی وجہ سے بزرگ خاندان تھے، آپ کے سرپرست قرار پائے ۔

سنہ ۲۰ عام الفیل — تمام قریش نے چندہ کرکے کعبہ کی تعمیر جدید کی اور حجر اسود کے نصب کرنے میں اس قدر سخت جھگڑا ہوا کہ خونریزی کا خطرہ پیدا ہو گیا ۔ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حسن تدبیر سے ختم کیا۔ اس وقت آنحضرت کی عمر اٹھارہ سال تھی۔

سنہ ۲۷ عام الفیل — ام المومنین حضرت بی‌بی خدیجہ سے آنحضرت کا نکاح ہوا ۔ اس وقت آنحضرت کی عمر ۲۵ سال اور ام المومنین کی عمر تقریباً ۴۰

سال تھی۔ اس وقت آنحضرت اپنے پاکیزہ اخلاق، صدق مقال اور دیانتداری کی بنا پر ''الامین،، کے لقب سے مشہور ہو چکے تھے۔

سنہ ۴۲ عام الفیل — (مطابق ۶۱۰ء) مکہ معظمہ سے تقریباً تین میل دور غار حرا میں جہاں آپ یاد الٰہی کے لئے کبھی کبھی جانے لگے تھے پہلی وحی نازل ہوئی ۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہو گئی۔

اس کے بعد کے زمانہ کو ہماری تاریخ میں سنہ نبوت لکھتے ہیں ۔ اور تاریخ کی تعیین عام الفیل سے نہیں کی جاتی بلکہ نزول وحی سے کی جاتی ہے۔

سنہ ۳ نبوت — تبلیغ و ارشاد کی ابتداء بالاعلان دعوت توحید ۔

اس سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر سارے قریش کو بلایا اور دعوت ایمان دی۔ اسی واقعہ کی طرف مولانا حالی نے اپنے ان اشعار میں اشارہ کیا ہے ۔

وہ فخر عرب زیب محراب و منبر
تمام اہل مکہ کو ہمراہ لے کر
گیا ایک دن حسب فرمان داور
سوئے دشت اور چڑھ کے کوہ صفا پر (الخ)

سنہ ۵ نبوت — مسلمانوں نے حبشہ کو پہلی ہجرت کی (ماہ رجب میں)

سنہ ۶ نبوت — حضرت حمزہ بن عبدالمطلب (سید الشہداء) اور حضرت عمر ابن الخطاب — (فاروق اعظم) ایمان لائے۔

سنہ ۷ نبوت — مسلمانوں کو کفار کے مقاطعہ کی وجہ سے شعب بنی ہاشم میں محصور ہونا پڑا ۔ کافروں نے مسلمانوں کا مکمل اور شدید مقاطعہ کر دیا ۔

سنہ ۱۰ نبوت — کفار کا مقاطعہ ختم ہوا ۔ اسی سال میں جناب ابو طالب کا انتقال ہوا اور ام المومنین حضرت خدیجہ وفات پا گئیں ۔ ام المومنین حضرت خدیجہ کی عمر وفات کے وقت تقریباً ۶۵ سال تھی ۔ (ماہ رمضان)

اسی سال آنحضرت نے قبائل عرب کے سرداروں کو ان کے ہاں جا جاکر دعوت اسلام دی۔ اسی سال آنحضرت تبلیغ کے لئے طائف بھی تشریف لے گئے اور طائف والوں نے قبول اسلام سے نہ صرف انکار کیا بلکہ آنحضرت کو دکھ بھی پہنچایا ۔

اسی سال مدینہ منورہ کے اولین چھ حضرات جو عمرہ کے لئے مکہ معظمہ آئے تھے مسلمان ہوئے ۔ یہ واقعہ ماہ رجب کا ہے۔ اور جہاں پر یہ لوگ مشرف باسلام ہوئے تھے اب وہاں مسجدالعقبہ ہے ۔ یہ لوگ قبیلہ خزرج کے تھے ۔

مدینہ منورہ معمولی کاروانی راستہ سے ۲۸۷ میل مکہ سے شمال مشرق کی طرف واقع ہے۔ اس کا پرانا نام یثرب تھا ۔ یہ ایک قصبہ تھا جہاں متعدد عرب قبائل الگ الگ محلوں میں آباد تھے۔ تین چھوٹے چھوٹے قبیلے یہودیوں کے بھی تھے ۔ مدینہ میں سب سے بڑا حصہ دو عرب قبیلوں کا تھا ۔ اوس اور خزرج ۔ ان میں اوس کی آبادی کم تھی اور خزرج کی زیادہ ۔ یہی دو قبیلے انصاری قبائل میں اولین ایمان لانے والے ہیں ۔ پیشہ کے اعتبار سے یہ دونوں قبائل کاشتکار تھے ۔ اور یہودیوں کے سودی قرضوں میں گرفتار تھے ۔ ھجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس قصبہ کا نام مدینہ" النبی یعنی نبی کا شہر ہوگیا اور اس کے بعد صرف المدینہ کہلانے لگا ۔ یہی المدینہ المنورہ کہلاتا ہے ۔

سنہ ۱۱ نبوت ۔ بارہ اشخاص مدینہ سے آئے اور آپ‌ص سے بیعت کی۔ ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب بن عمیر رض کو تبلیغ کے لئےمدینہ منورہ بھیجا ۔ اسی واقعہ کو بیعة العقبة الاولی کہتے ہیں ۔

سنه ۱۲ نبوت — ۷۲ آدمی مدینه سے آئے اور بیعت کی۔ اسے بیعة العقبة الثانیه کہتے ہیں۔ اسی سال میں بماہ رجب حضور صلی اللہ علیه وسلم کو معراج ہوئی۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم عرش اعظم پر گئے۔ اور خود اپنی آنکھوں سے جنت و دوزخ کا معائنه کیا۔

سنه ۱۳ نبوت — ۲۷ صفر کو رات کے وقت آپ مکه مکرمه سے ہجرت فرما کر به قصد مدینه منوره روانه ہوئے۔ اور ۸ ربیع الاول (مطابق ۲۰ ستمبر ۶۶۲۲ء) آپ قبا میں پہنچے۔ یه مقام مدینه سے تقریباً چھ میل دوری پر واقع ہے۔ اس دن یہودی سال کے پہلے مہینه تشرین کی دسویں تاریخ تھی اور یہودی یوم الکبود کا روزہ رکھے ہوئے تھے۔

۱۲ ربیع الاول۔ آپ نے مدینه میں پہلی بار نماز جمعه پڑھائی اور سب سے پہلا خطبه جمعه دیا۔ بمقام محله بنی سالم۔ اسی سال سے مقام یثرب مدینه" النبی (نبی کا شہر) کہلانے لگا۔ جو بعد کو صرف المدینه" المنوره مشہور ہوگیا۔

اسی سال سے سنه ہجری شروع ہوتا ہے۔ اس لئے آئنده سے توقیت سنه ہجری سے ہوگی۔ اس وقت آنحضرت کی عمر ۵۳ سال تھی۔ اور عام الفیل کو ۵۴ سال ہونے آئے تھے۔ موجوده عیسوی (گریگوری) کیلنڈر سے ۱۶ جولائی ۶۲۲ جمعه یکم محرم سنه ایک کے مطابق ہے لیکن یه تطابق بعض حسابی وجوه کی بنا پر محل نظر ہے۔

سنه ۱ ہجری — تعمیر مسجد نبوی۔ اذان کی ابتداء۔ ام المومنین حضرت عائشه کی ہجرت۔ سعد بن ابی وقاص کی پہلی مہم اور معاهدهٔ ابواء۔ عبدالله بن الزبیر کی ولادت۔

سنه ۲ ہجری — ۱۲ صفر، جہاد فرض ہوا۔ اس کے بعد تاریخ ۱۷ شعبان کو تحویل قبله۔ حکم صوم رمضان۔ غزوات کی ابتداء۔ شوال میں غزوه بدر،

غزوہ بنی قینقاع ، غزوہ سویق ـ وجوب صدقۃ الفطر ـ نماز عید الفطر ـ
حضرت بی‌بی فاطمۃ الزہرا رض کی شادی، (ذی‌الحجہ)

سنہ۳ ہجری — ۱۵ رمضان ولادت حضرت حسن السبط رضی اللہ تعالی عنہ۔ شوال — غزوہ احد ـ حضرت عثمان کا نکاح حضرت ام کلثوم (بنت رسول اللہ) سے ـ اللہ کا حکم نازل ہوا کہ مومن یا مومنہ کا نکاح کافر یا کافرہ سے جائز نہیں۔ قانون وراثت نازل ہوا۔

سنہ ۴ ہجری — ربیع الاول غزوہ بنو نضیر۔ شعبان میں ولادت حضرت حسین السبط رضی اللہ عنہ۔ شراب کی تحریم کا حکم نازل ہوا ـ تیمم کا حکم نازل ہوا ـ

سنہ ۵ ہجری — غزوۂ دومۃ الجندل اور شعبان میں غزوہ بنی المصطلق، غزوہ احزاب۔ صلح حدیبیہ، بیعت الرضوان ـ آیات حجاب نازل ہوئیں ـ حکم طلاق نازل ہوا ـ

سنہ ۶ ہجری — محرم میں غزوۂ خیبر، جمادی الاولی میں غزوۂ بنی لحیان، شعبان میں غزوۂ ذی‌قرد، بادشاہوں کو تبلیغ اسلام کے دعوت نامے بھیجے گئے ـ حضرت خالد بن ولیدرض اور حضرت عمرو بن العاص‌رض اور حضرت معاویہ رض مسلمان ہوئے۔ اول دونوں حضرات نے ہجرت کی۔ اس وقت معاویہ مکہ ہی میں مقیم رہے۔

سنہ ۷ ہجری — آنحضرت‌ص نے صحابہ کے ساتھ عمرہ ادا فرمایا۔ ام‌المومنین بی‌بی ماریہ قبطیہ مصر سے آئیں۔

سنہ۸ ہجری — جمادی‌الاولی ـ غزوہ موتہ ـ ۲۰ رمضان، فتح مکہ ـ شوال ، غزوہ حنین ـ اوطاس ـ طائف ـ ولادت ابراھیم ابن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

سنہ۹ ہجری — عام الوفود، رجب غزوہ تبوک۔ رمضان میں حرمت سود کا حکم نازل ہوا ـ حضرت ابوبکررض کو امیر الحج بنا کر بھیجا گیا۔ اور مسلمانوں

نے پہلا باقاعدہ حج ادا کیا ۔ اسی حج میں مسلمانوں اور کافروں کے مابین تمام روابط نسلی کے اختتام کا اعلان کیا گیا ۔

سنہ ۱۰ ہجری — یمنی قبائل کا اسلام، بنو غطفان کا ایمان۔ حجۃ الوداع ۔ تکمیل دین اسلامی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حج ارشاد فرمایا ۔

سنہ ۱۱ ہجری — ۲۹ صفر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے۔ اور دو شنبہ کے دن ۱۲ ربیع الاول کو ۶۳ سال کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور ام المومنین بی بی عائشہؓ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں جو مسجد نبوی کے مشرق میں متصل ھی واقع ھے دفن کئے گئے صلی اللہ علیہ وسلم ۔ اس حجرے کا دروازہ عہد صدیقی ، عہد فاروقی اور ابتدائے عہد عثمانی تک کھلا ہوا تھا ۔

حضرت ابوبکررضؓ اور حضرت عمررضؓ کی قبریں بھی اسی حجرے میں ھیں ۔ حضرت عثمانرضؓ نے ایک بار کسی نو مسلم کو قبر رسول پر سر جھکائے دیکھا تو اس خوف سے کہ تعظیم میں تعبد کی شان نہ پیدا ھو جائے دروازہ کو پتھر سے چنوا دیا ۔ اور اس کے بعد سے کسی نے اس دروازہ کو کھولنے کی جرأت نہیں کی ۔ بعد کی تعمیر میں اس کی دیواروں سے ملا کر چاروں طرف بے دروازے کی دیواریں کھینچ دی گئیں ۔ اس کے بعد سے دیوار کے بیرونی حصہ ھی کی زیارت ھوتی رھی ۔ اور آج کل جالی مبارک سے جو دیوار اندر کو نظر آتی ھے وہ وھی بیرونی دیوار ھے جو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ۹۱ ھ میں بہ زمانہ ولایت مدینہ بنوائی تھی ۔

اسلامی قانون کی تدوین جدید، اصول اور طریق کار

سید سیاح الدین کاکاخیل

اسلامی قانون کی تدوین جدید، اس کے اصول اور طریق کار کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار سے قبل میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک غلط فہمی کا ازالہ کردوں جو اس عنوان کے پڑھتے ہی بعض قارئین کے ذہن میں پیدا ہو سکتی ہے ۔ ہمارے ملک میں کچھ علماء کرام اور وہ حضرات جو واقعی دین‌دار ہیں اور اسلام کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتے ہیں جب ''اسلامی قانون کی تدوین جدید،، کا ذکر سنتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں ۔ اور فی الواقع ان کی اس پریشانی کے لئے ایک منشاء موجود ہے ۔ کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا ابھر آیا ہے جس کا دین اسلام کے ساتھ نہ تو اس درجے میں اعتقادی رابطہ ہوتا ہے جو ایک مومن کے لئے ضروری ہے اور نہ عملی طور پر وہ لوگ اسلامی احکام و قوانین کے پابند ہوتے ہیں ۔ مگر شب و روز مضامین و مقالات اور تقاریر و خطابات میں بڑے زور و شور کے ساتھ نئے اجتہاد اور نئے سرے سے قوانین اسلامی کی تدوین کی باتیں کرتے رہتے ہیں ۔ اور یہ یا تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو قرآن مجید کو اسلامی قانون کا ماخذ مانتے ہیں لیکن سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حجت شرعی یا ماخذ قانون اسلامی تسلیم نہیں کرتے ۔ اور قرآن مجید کی تفسیر و تشریح کے لئے بھی وہ اپنے آپ کو کسی حدیث یا تعامل و اقوال صحابہ کرام یا اجماع امت یا ائمہ ھدی سلف صالحین کی تفسیر و توضیح کا پابند

نہیں سمجھتے بلکہ وہ صرف اپنی فہم و بصیرت یا اپنی ''لغات القرآن،، ھی کو
قرآن فہمی کا واحد ذریعہ یقین کرتے ھیں - اور یا پھر وہ لوگ ھوتے ھیں جو
زبان سے تو یہ اقرار کر لیتے ھیں کہ کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول اللہ بھی
حجت شرعی اور ماخذ قانون ھے لیکن قرآن مجید کی طرح احادیث رسول اللہ کی تشریح
و توضیح بھی وہ اپنی آزاد رائے سے کرتے ھیں - استنباط و استخراج کے لئے بھی
ان کے ھاں مقررہ اصول و ضوابط نہیں ھیں بلکہ مغربی تعلیم، مغربی سیاست
اور مغرب کے فلاسفہ و حکماء اور مستشرقین سے متاثر ھونے کی وجہ سے ان کا
اجتہاد و استنباط در حقیقت مغربی افکار و خیالات اور مغربی قوانین کا آئینہ دار ھوتا
ھے - یعنی وھی صورت حال ھوتی ھے جس کا ذکر اکبر الہ آبادی نے یوں کیا ھے -

کھل گیا مصحف رخسار بتان مغرب   شیخ حاضر بھی ھوئے ھیں نئی تفسیر کے ساتھ

ان حضرات کی علمی تحقیق اور ان کا نیا اجتہاد عموماً یوں ھوتا ھے کہ
احادیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو بھی قول و فعل منقول
ھوتا ھے اس کو صرف وقتی اور عرب کے مخصوص حالات اور مخصوص زمانہ کے ساتھ
مختص ثابت کرکے عملاً اس کی پابندی سے اپنے آپ کو آزاد کر دیا جائے -
اور پیش آمدہ واقعہ میں خود اپنا ''اجتہاد،، کرکے کوئی نیا حکم مستنبط
کر دیا جائے اور اس کو اصل اسلامی قانون قرار دیا جائے - اور لازماً اس قسم کے
اجتہاد میں مغرب سے مرعوبیت، اور مغرب کی نقالی کی جھلک نظر آتی ھے - ان
حضرات کا معاملہ جب خود حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں
اس قسم کا ھے تو ظاھر ھے کہ خلفائے راشدین کے دور کے تعامل، مسائل اور
فیصل شدہ قوانین، یا ائمہ مجتہدین اور بعد کے فقہاء کرام کے بارے میں
تو اور بھی جرأت کی جا سکتی ھے ، اور بڑی آسانی کے ساتھ کہا جا سکتا ھے کہ
وہ تو ایک خاص دور کا اجتہاد تھا، وہ دور گزر گیا، وہ اجتہاد بھی ختم ھوا،

اب اس نئے دور میں نئے تقاضے ھیں، نئے حالات ھیں، لہذا ہم ان حضرات کے اجتہادات یا ان کی تفسیر و تشریح کی پابندی کیوں کریں ۔ سلف صالحین کے تمام ذخیرۂ قوانین و احکام پر نظرثانی کرکے بلاتمیز سب پر وہ پانی پھیر دینا چاھتے ھیں اور نئے اسلامی قوانین کا مجموعہ تیار کرنا چاھتے ھیں ۔

الغرض جب چاروں طرف ایسی فضا موجود ھو اور اس فضا میں جب دین دار اور مخلص مسلمان یہ سنتے یا پڑھتے ھیں کہ کسی مجلس میں ''اسلامی قانون کی تدوین جدید،، پر مقالہ پڑھا جا رھا ھے یا کسی رسالے یا اخبار میں اس موضوع پر مضمون شائع کیا جا رھا ھے تو بجا طور پر وہ گھبرا جاتے ھیں ۔ اس لئے میں ان سب حضرات کو مطمئن کرنے کے لئے اپنے اس مضمون کے شروع ھی میں اس غلط فہمی کا ازالہ کرتا ھوں اور میرے اس مضمون کے عنوان کو پڑھ کر ان کو ہرگز متوحش نہیں ھونا چاھئے ۔

میرا نظریہ اور عقیدہ یہ ھے کہ قرآن مجید کے جو نصوص قطعی الدلالۃ ھیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو احادیث متواتر و مشہور ھیں اور جو قطعی الدلالۃ ھیں، یا آیات قرآنی اگرچہ ظنی‌الدلالۃ ھوں یا اخبار احاد ظنی الثبوت ھوں، مگر قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر کے ارباب حل و عقد اور اھل علم نے کسی معنی پر اجماع کیا ھو، تو ایسے احکام و قوانین بالکل ابدی ھیں ۔ ان میں کسی تغیر و تبدل، کمی بیشی، التواء و تاخیر اور کسی نئے اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ۔ نصوص کی کسی تعبیر پر مفسرین و شارحین اور ائمہ مجتہدین کا اتفاق ھوچکا ھو تو اس تعبیر و تشریح کے سوا محض اپنی فہم و بصیرت یا کسی خودساختہ لغات القرآن اور لغات الحدیث کا سہارا لے کر کوئی اور تعبیر کرنا یا کوئی اور تشریح و تفسیر اختیار کرنا ضلال مبین اور موجب ھلاکت و خسران دارین ھے ۔ اعاذنا اللہ منہ ۔

جو اسلامی قوانین و احکام اس نوعیت کے ہیں ان کی تدوین جدید سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ موجودہ دور میں جس طرح قوانین کی دفعہ وار ترتیب ہوتی ہے اسی طرح ان قوانین کو خاص سلیس اور عام فہم انداز کے ساتھ اور نمبر دے کر لکھا جائے تاکہ کسی کو کتب فقہ میں ادھر ادھر تلاش کرنے کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے بلکہ ہر شخص بڑی آسانی کے ساتھ متعلقہ دفعہ نکال کر مطلوبہ قانون اور مسئلہ معلوم کر سکے۔ ہر مسئلہ کسی دشواری اور زیادہ وقت صرف کئے بغیر بہ سہولت نکالا جا سکے۔ اس قسم کی تدوین جدید کی افادیت میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی بلکہ یہ ایک نہایت مفید علمی خدمت ہے۔

اسلامی قوانین کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے کہ کسی ظنی الدلالۃ آیت کی تفسیر میں، یا کسی خبر واحد کے مفہوم و مراد کی تعیین میں حضرات ائمہ مجتہدین کا آپس میں علمی اور اجتہادی اختلاف رہا، مثلاً چاروں ائمہ مجتہدین یعنی حضرت امام ابو حنیفہ، حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد کا آپس میں اتفاق نہیں ہوا، ایک نے تو اپنے علم و تفقہ اور قوت اجتہاد کی بنا پر یا دوسرے نظائر کو سامنے رکھ کر کوئی ایک تفسیر کی ہے یا ایک مفہوم متعین کر دیا ہے، اور دوسرے نے دوسری تفسیر کی ہے اور دوسرا مفہوم بتایا ہے۔ یہ ان حضرات کا آپس میں اجتہادی اور علمی اختلاف تھا جو بالکل فطری ہے۔ ایسے مسائل و قوانین کو ہم اجتہادی قوانین کہیں گے۔ یا کسی خاص صورت میں خبر واحد بھی کسی مجتہد کے سامنے نہیں، بلکہ قیاس یا استحسان کی بناء پر ایک مجتہد نے اس خاص صورت کا حکم ایک طرح بیان کیا ہے جبکہ دوسرے مجتہد نے اور طرح بیان کیا ہے۔ یہ مسائل اجتہادی کہلاتے ہیں۔

چونکہ ہمارے ملک پاکستان میں غالب اکثریت ان مسلمانوں کی ہے جو حنفی کہلاتے ہیں۔ یعنی وہ اہل السنت والجماعت مسلمان جو قرآن و حدیث

کی تفسیر و تشریح اور ان سے اسلامی قوانین و احکام کے استنباط و استخراج کے سلسلہ میں حضرت امام ابو حنیفہرحہ پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں، عزت و احترام تو وہ سب ائمہ مجتہدین و محدثین کا کرتے ہیں، سب سے عقیدت و ارادت کا تعلق رکھتے ہیں، ان سب کو ائمہ ہدی اور قابل اقتداء سمجھتے ہیں، دین کے خیر خواہ متقی اور اولیاءاللہ یقین کرتے ہیں، مگر وہ عام طور پر عملی زندگی میں ان قوانین و احکام پر عمل کرنا زیادہ بہتر اور راجح سمجھتے ہیں جو امام ابو حنیفہرحہ نے اپنے اجتہاد سے نصوص شرعیہ کو سامنے رکھ کر مستنبط کئے ہیں۔ اور قانون سازی کے دائرہ میں جس کی ایک شاندار اور بے نظیر تاریخ ہے، جب یہاں اکثریت حنفیوں کی ہے، دین و دانش کا بھی تقاضا یہ ہے اور موجودہ دور جمہوریت میں بھی ملکی قوانین کے سلسلہ میں اکثریت کے معتقدات و رجحانات کو اصل قرار دے کر ان قوانین کو پبلک لاء (قوانین عامہ) کے طور پر نافذ کیا جاتا ہے جو اکثر آبادی کے قوانین ہوں، بلکہ ہماری سابقہ تاریخ بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جن ممالک میں شافعی حضرات کی اکثریت تھی وہاں امام شافعی کی فقہ کے قوانین جاری رہے، جہاں مالکیہ کی تعداد زیادہ تھی مثلاً اندلس اور مغربی افریقہ میں وہاں امام مالک اور ان کے تلامذہ کی مدون کی ہوئی کتابوں کے قوانین نافذ تھے اور ان کے مطابق فیصلے ہوتے تھے، اور یہی حال حنابلہ کا تھا، سلطنت عثمانیہ کے زیرنگیں ممالک میں احناف کی اکثریت تھی، ترکستان، افغانستان اور ہندوستان میں حنفی حضرات کی تعداد زیادہ تھی اس لئے صدیوں تک ان ممالک میں فقہ حنفی سرکاری فقہ کے طور پر نافذ رہی، اور حنفی اجتہاد کے مطابق سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ضخیم کتابیں فتاوی کی اور متون و شروح اور حواشی و منہیات کی اسی فقہ حنفی میں تصنیف ہوتی رہیں، الغرض پاکستان میں بھی بنیادی طور پر حنفی فقہ کے مطابق اسلامی قوانین و احکام کا پبلک لاء (قوانین عامہ) کے طور پر نافذہونا بالکل عقلی، دینی، علمی، فطری اور تاریخی

تقاضا ہے - لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلامی قوانین لاکھوں کی تعداد میں فقہ حنفی کی کتابوں میں منتشر موجود ہیں - گذشتہ ادوار کے علماء کرام اور فقہائے عظام شاید اپنی قوت حافظہ، ذہانت، ادراک اور تجربہ کاری و مہارت کی بنا پر عندالضرورت اپنا مطلوب مسئلہ اور قانون اور شرعی حکم آسانی کے ساتھ ڈھونڈ کر نکال سکتے ہوں گے - ان کو ہر ہر مسئلہ کے مظان کا اندازہ تھا وہ کسی دشواری کے بغیر اپنا مقصد حاصل کر سکتے تھے - اب یہ واقعہ ہے کہ اس دور میں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ زیادہ ترقی کا دور ہے، نہ وہ قوی رہے، اور نہ اہل علم اور قانون دانوں میں وہ ادراک و ابصار رہا، اور نہ وہ وقت زیادہ خرچ کر سکتے ہیں، اس لئے اب یہ انتہائی ضروری ہے کہ نئے دور کے تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق ان اسلامی قوانین کو نئی ترتیب دی جائے اور ان کو دفعہ وار لکھا جائے - آج کل تمام مہذب و متمدن ممالک میں ملکی قوانین کو جس طرح ایک بل کی صورت میں خاص انداز کے ساتھ مرتب و مدون کرکے کتاب قانون کا ایک حصہ بنایا جاتا ہے اسی طرح ان اسلامی قوانین کو بھی مدون و مرتب کر دیا جائے، تو تدوین جدید سے مراد یہ بھی ہے - اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی افادیت اور نفع بخشی سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا - اور نہ اس سے کسی توحش کی عقلاً اور شرعاً گنجائش ہے -

اب اس سے آگے ایک اور مرحلہ آتا ہے - چونکہ وہ قدرے نازک سا مسئلہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اہل علم ذرا غور سے سن کر پھر اس کے بارے میں فیصلہ فرمائیں - حنفی فقہ کے قوانین و احکام میں سے بعض قوانین ایسے ہیں کہ وہ محض اجتہادی ہیں - ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قطعی ہیں اور دوسرے ائمہ مجتہدین نے اگر اس سے مخالف یا تھوڑے بہت فرق کے ساتھ دوسرا

قانون بیان کیا ہے تو وہ بالکل غلط اور قطعی ناجائز ہے ۔ اس قسم کے مسائل کے بارے میں خود ہمارے ائمہ احناف کا یہ مقولہ مشہور ہے ۔ هذا صواب یحتمل الخطا و القول الاخر خطا یحتمل الصواب ۔

موجودہ دور میں اس قسم کے بعض قوانین کی تنفیذ و اجراء میں کچھ عملی مشکلات نظر آتی ہیں ۔ میری مراد مشکلات سے محض وہمی اور فرضی مشکلات نہیں بلکہ وہ حقیقی مشکلات اور موانع ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ کیونکہ جس دور میں وہ اجتہاد کیا گیا تھا اس دور کا عرف کچھ اور تھا ۔ تجارتی روابط کچھ اور نوعیت کے تھے ۔ قوی کا فرق تھا ۔ ماحول کا فرق تھا ۔ اس دور کا عرف جب بدل گیا ۔ تجارتی کاروبار کے طریقے کچھ مختلف ہو گئے ۔ نئی تہذیب اور نئے تمدن نے ماحول کو بالکل بدل دیا ۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی عالمگیر اور بے نظیر ترقی کی وجہ سے نئے نئے ایجادات نے ایک نئی دنیا بسادی ۔ اگر سابقہ ادوار کے قیاسی اور اجتہادی قوانین کسی قسم کے غور و فکر اور نظر ثانی کے بغیر جوں کے توں نافذ کئے جائیں تو بعض دفعہ یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ تو نافذ نہ ہو سکیں ۔ عملی دشواریاں اور طرح طرح کی واقعی رکاوٹیں ان کو تو چلنے نہ دیں ۔ اور کچھ قطعی اور غیر متبدل قوانین بھی ان کی لپیٹ میں آکر نافذ ہونے سے رہ جائینگے ۔ تو اس وقت اجتہاد مطلق کی ضرورت تو نہیں ۔ قطعیات اور اجماعی مسائل اور ممکن العمل اجتہادی مسائل کے بارے میں کسی نئی تحقیق یا اجتہاد کی نہ ضرورت ہے نہ شرعی گنجائش (البتہ ان بعض خالص اجتہادی مسائل کے بارے میں نئی تحقیق اور نئے اجتہاد کی ضرورت بھی ہے اور گنجائش بھی) اس وقت اسلامی نظام کے مکمل اور حقیقی اجراء و تنفیذ کے لئے ان امور پر از سرنو غور کرکے قابل عمل راستہ نکالنے کی واقعی ضرورت ہے ۔ اور اس سے اغماض یا غفلت کا نتیجہ ہرگز اچھا نہیں نکلے گا ۔ اسی طرح بہت سی

نئی نئی صورتیں پیدا ہو رہی ہیں اور نئے نئے واقعات سامنے آرہے ہیں، جن کا صاف و صریح حکم تلاش و جستجو کے باوجود قدیم فقہی کتابوں میں نہیں مل سکتا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعینہ اسی قسم کی صورت ان فقہاء کرام کے زمانوں میں پیدا نہیں ہوئی تھی، تو ظاہر ہے کہ وہ اس بارے میں کوئی خاص قانون کس طرح بنا سکتے تھے۔ یہ تو امر واقعہ ہے کہ ہر زمانہ میں ایسے نئے واقعات پیش آتے ہیں کہ ان کا تصور تک بھی ان حضرات کے ذہن میں نہیں تھا۔ سلطان اورنگزیب عالمگیر رح نے اپنے وقت کے جید علماء اور فضلاء کو بلا کر اور عظیم الشان کتب خانہ مہیا کر کے ان کو فتاوی عالمگیری کی تدوین پر لگایا۔ اور اس کی وجہ یہی تھی کہ باوجودیکہ قدیم فقہاء، کی بے نظیر علمی کتابیں اور ضخیم فتاوی اور مسائل و واقعات کا ذخیرہ موجود تھا مگر اپنے دور میں ایک منظم اور قانونی حکومت چلانے کے لئے انہوں نے نئی تدوین کی ضرورت محسوس کی تھی اور انہوں نے اس دور کے اعتبار سے ایک معیاری کام کیا۔ اسلامی قوانین کا مجموعہ مرتب کیا جو قابل قدر کارنامہ ہے۔ اور اس کی قدر و قیمت اور عظمت و اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ جزاہم اللہ احسن الجزاء۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے، اور اس میں ان کے کارنامہ کی تنقیص کا شائبہ بھی نہیں، کہ بہت سی نئی صورتوں اور نئے واقعات کے قانونی حکم معلوم کرنے کے لئے ہمیں عالمگیری میں بھی صاف و صریح فقہی جزئیے مل نہیں سکتے۔ اس لئے بعینہ فتاوی عالمگیری کو نافذ کرنے کا مطالبہ محض ایک جذباتی نعرہ ہے۔ ہاں اس وقت زیر تجویز تدوین جدید میں عالمگیری سے بھی فایدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور اس کی روشنی میں ہم جادہ پیما ہو کر اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

ایسے نئے واقعات کے لئے شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے یہ محدود و مشروط اجتہاد اس دور کی ایک واقعی ضرورت ہے ۔ علامہ عبدالکریم شہرستانی نے الملل و النحل میں لکھا ہے کہ ''معاملات میں اور انسانی تصرفات کے ذریعہ جو حوادث اور نئے نئے واقعات پیش آتے رہتے ہیں ان کی تعیین و تحدید ناممکن ہے اور یہ بات قطعی طور پر ہم جانتے ہیں کہ ہر نئے حادثہ کے لئے شریعت کا صریحی حکم موجود نہیں ہے اور نہ اس کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے ۔ اور جب واقعات اور حوادث غیر متناہی اور کتاب و سنت کے احکام محدود ہیں تو جو خود محدود ہو وہ غیر محدود کو اپنے قابو میں کیسے لا سکتا ہے ۔ اسلئے قطعاً یہ بات معلوم ہوگئی کہ اجتہاد اور قیاس اس وقت تک قابل لحاظ چیز ہے جب تک کہ ایسے واقعات پیش آتے رہیں گے ۔ اسلئے ہر حادثہ کے لئے اجتہاد کرنا پڑے گا،، ۔ حضرت فاروق اعظم نے جب حضرت ابو موسی اشعریؓ کو عراق کا والی مقرر کرکے بھیجا تھا تو ان کو ایک خط لکھا تھا، یہ خط قضا کی انتظامی اور فقہی رہنمائی کے لئے ایک زبردست دستور ہے ۔ اس کا ہر ہر جملہ نہایت قیمتی ہے اور اس سے اسلامی قانون کی دفعات کا استنباط کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا ہے ۔ اس خط میں ایک حصہ یہ بھی ہے ۔

الفهم الفهم فی ما تلجلج فی صدرك مما ليس فی كتاب الله ولا سنة النبی صلی الله عليه وسلم ثم اعرف الاشباه والامثال فقس الامور عند ذالك بنظائرها و اعمد الی اقربها الی الله و اشبهها بالحق ۔ (جمهرة رسائل العرب رساله م ۲ ۱ اعلام الموقعين ج ۱ ص ۹۹)

الغرض اس وقت ہمارے سامنے فقہ حنفی کے کچھ ایسے قیاسی اور اجتہادی قوانین و احکام ہیں کہ موجودہ دور میں عملاً ان کی تنفیذ و اجراء میں واقعی

مشکلات ھیں ۔ اور ان پر اصرار، زمانه اور معاشرہ کے بدلنے کی وجه سے بہت سی
عملی پیچیدگیاں، دشواریاں، اور نظم مملکت میں اختلال اور موجودہ معاشرہ میں
انتشار پیدا کرتا ھے ۔ تو ضرورت ھے که ان اجتہادی مسائل پر از سر نو غور
کر لیا جائے ۔ اور حضرات ائمه اربعه میں سے باقی تین حضرات کے ھاں اس معامله
میں ان کا کوئی اجتہادی قانون اگر ایسا ھے که اس کی تنفیذ به آسانی ھو سکتی
ھے اور وہ ارفق بالناس ھے، عرف عام یا عرف خاص کے ساتھ زیادہ موافقت رکھتا
ھے، مصالح مرسله کا تقاضا اس سے پورا ھوتا ھے ، یا قیاس کے مقابله میں وہ اجتہاد
و استحسان کی بنا پر ھے، تو اس قانون کو لیا جائے اور ترجیح دی جائے، اور اسلامی
قانون کے نئے مدون مجموعه میں بهحیثیت قانون کے اس کو درج کر دیا جائے،
اور ایسا کرنا نه تو حنفیت سے انحراف ھے اور نه فقہاء کرام کے ھاں ناجائز
ھے ۔ خود ھمارے فقہاء حنفیهرحـ نے اس کی اجازت دی ھے ۔ مثالیں تو بہت ھیں
میں صرف اجمالی اشارے پر اکتفا کرتا ھوں ۔ مسئله مفقودالخبر میں تمام فقہاء
حنفیه نے بالاتفاق امام مالک کے مسلک کو ترجیح دی ھے اور اس پر فتوی دیا
ھے ۔ تفصیل ردالمحتار لابن عابدین شامیرحـ میں دیکھی جائے ۔ بہت سے
مسائل میں امام ابو حنیفهرحـ اور صاحبین کے اقوال کو چھوڑ کر امام زفررحـ کے
اجتہادی قول پر فتوی انھی وجوھات کی بنا پر دیا گیا ھے ۔ اگر کوئی بالغه عورت
اپنی مرضی سے غیرکفو میں نکاح کرلے اور اس کے والدین اور دوسرے اولیاء
اس کو عرفاً عار سمجھتے ھوں تو ظاھر الروایه" تو یه ھے که نکاح تو ھو چکا ھے
البته اولیاء کو یه حق حاصل ھے که وہ قاضی کے ھاں دعوی دائر کریں اور اپنی
ناراضگی اور عرفاً خاندان کے لئے اس کا موجب عار ھونا ثابت کریں، تو قاضی نکاح
فسخ کردے گا ۔ ظاھرالروایه" تو یہی ھے لیکن حسن بن زیاد رحـ کا اجتہاد یه ھے که
ایسی صورت میں نکاح ھوتا ھی نہیں ۔ فسخ قاضی کے بغیر بھی وہ نکاح اصلاً ھی

نہیں ہوا۔ فقہاء متأخرین نے اس صورت میں حسن بن زیادرح کی اس روایت کو قبول کرکے اس پر فتوی دیا ہے چنانچہ در مختار میں ہے و یفتی فی غیر الکفو بعدم جوازہ اصلاً وھو المختار للفتوی لفساد الزمان۔ اور شامیرح نے یفتی بعدم الجواز پر لکھا ہے ''ھذہ روایۃ الحسن عن ابی حنیفۃرح و وجہ عدم الصحۃ علی ھذہ الروایۃ دفع الضرر عن الاولیاء،، اور وھو المختار للفتوی پر لکھا ہے قال ''شمس الائمہ و ھذا اقرب الی الاحتیاط کذا فی تصحیح العلامۃ قاسم لانہ لیس کل ولی یحسن المرافعۃ والخصومۃ ولا کل قاضی یعدل ولو احسن الولی و عدل القاضی فقد یترک انفۃ للتردد علی ابواب الحکام و استثقالاً لنفس الخصومات فیتقرر الضرر فکان منعہ دفعا لہ فتح،، (شامی ج ۲ ص ۳۰۵) اسی طرح علامہ ابن عابدین شامیرح نے ایک پورا رسالہ اسی موضوع پر لکھا ہے جس کا نام ہے نشر العرف فی بناء الاحکام علی العرف۔ اور اس میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ یہ مسئلہ کہ احکام تبدل زمان سے بدلتے ھیں با دلائل تحریر فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ھیں۔

المسائل الفقھیۃ اما ان تکون ثابتۃ بضرب اجتھاد ورأی و کثیر منھا ما یبنیہ المجتھد علی ما کان فی عرف زمانہ بحیث لو کان فی زمان العرف الحادث لقال بخلاف ماقالہ اولا ولھذا قالوا فی شروط الاجتھاد انہ لا بد فیہ من معرفۃ عادات الناس فکثیر من الاحکام تختلف باختلاف الزمان لتغیر عرف اھلہ اولحدوث ضرورۃ او فساد اھل الزمان بحیث لو بقی الحکم علی ما کان علیہ اولا للزم منہ المشقۃ و الضرر و الفساد لبقاء العالم علی اتم نظام و احسن احکام ولھذا تری مشائخ المذھب خالفوا ما نص علیہ المجتھد فی مواضع کثیرۃ بناھا علی ما کان فی زمنہ لعلمہ بانہ لو کان فی زمنھم لقال بما قالوا بہ اخذا من قواعد مذھبہ۔ ص ۱۲۵

(ترجمہ) فقہی مسائل یا تو صرف اجتہاد اور رائے مجتہد سے ثابت ھوں گے اور بہت سے مسائل تو ایسے ھیں کہ ایک مجتہد اپنے زمانے کے عرف کو سامنے رکھ کر

ان مسائل کی بنیاد رکھتا ہے اس طور پر کہ اگر وہ مجتہد اس موجودہ نئے عرف کے زمانے میں ہوتے تو یقیناً جو کچھ پہلے کہا ہے اس کے خلاف کہتے اور اسی لئے تو علماء نے کہا ہے کہ اجتہاد کی شروط میں سے یہ شرط بھی ہے کہ مجتہد کو لوگوں کی عادات اور عرف کی بھی پہچان اور علم ہو کیونکہ بہت سے احکام زمانہ کے اختلاف سے بدل جایا کرتے ہیں کیونکہ اس دور کے لوگوں کا عرف بدل جاتا ہے یا کوئی خاص ضرورت پیش آتی ہے یا زمانہ والوں میں کچھ ایسا بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر حکم کو اسی پہلے انداز پر باقی رکھا جائے تو اس سے مشقت ضرر اور فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ضروری ہے کہ عالم کو کامل نظام اور خوب مضبوطی کے ساتھ باقی رکھا جائے اور فساد سے بچایا جائے۔ اور اس لئے آپ دیکھیں گے کہ مشائخ کرام نے بہت سے مسائل میں مجتہد کی تصریحات سے مخالفت کی ہے جہاں مجتہد نے وہ مسئلہ اپنے زمانے کے عرف پر مبنی کر کے کہا ہےکیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ اگر وہ مجتہد اس زمانے میں ہوتا تو وہ بھی وہی کچھ کہتا جو اب یہ مشائخ کہہ رہے ہیں اور جو اس مجتہد کے قواعد سے اخذ کرکے کہا جا رہا ہے۔

پھر علامہ شامی رحہ نے بہت سی مثالیں دی ہیں۔ جہاں اصل مذہب اور ظاہر الروایۃ کو چھوڑ کر دوسرا قول اختیار کیا گیا ہے اور اس پر فقہاء متأخرین نے فتوی دیا ہے۔ بطور نمونہ ان میں سے چندمثالیں میں بھی ذکر کرتا ہوں۔

(۱) امام ابو حنیفہ رحہ اور صاحبین رحہ اس پر متفق ہیں کہ تعلیم قرآن مجید یا امامت و اذان پر اجرت لینا جائز نہیں، کیونکہ یہ طاعات ہیں، جیسا کہ نماز، روزہ، حج اور قرأت قرآن طاعات ہیں، اور ادائے طاعات پر اجرت لینا صحیح نہیں لیکن متاخرین نے تعلیم قرآن مجید اور امامت و اذان پر تنخواہ لینا جائز قرار دیا،

اور وجہ یہ بیان کی کہ لانقطاع عطایا المعلمین التی کانت فی الصدرالاول، یعنی ابتدائی زمانوں میں بیت المال سے معلمین قرآن مجید اور ائمہ مساجد و موذنین کے لئے ضروریات زندگی کی کفالت کے واسطے وظائف مقرر ہوتے تھے اور وہ فراغ خاطر کے ساتھ یہ دینی کام سر انجام دے سکتے تھے۔ جب بیت المال سے ان عطایا کا سلسلہ کٹ گیا، اب اگر یہ حضرات سراسر ان دینی کاموں میں مشغول ہوں، یلزم ضیاعهم و ضیاع عیالهم، تو اس کے نتیجہ میں ان کے اور ان کے اهل و عیال کے اخراجات اور ضروریات زندگی کی کیا صورت ہوگی، اور اگر وہ کسی صنعت و حرفت یا دوسری ملازمت میں مشغول ہوں تو تعلیم قرآن کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور نئی نسلیں قرآن مجید سے بالکل محروم ہو جائیں گی اور مسجدوں میں جماعت کا نظام درهم برهم ہوگا۔ تو اس مجبوری اور ضرورت کی بنا پر انهوں نے فتوی دے دیا کہ ان امور کے سر انجام دینے والے کے لئے تنخواہ لینا جائز ہے۔ اور اس میں درحقیقت زمانہ کے حالات کے تبدل اور ضرورت دینی کی بناء پر حنفی مسلک کو چھوڑ کر امام شافعیرح کے مسلک کو اختیار کیا گیا ہے، جو تعلیم قرآن اور امامت و اذان پر اجرت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ تو حنفیہ نے بھی امام شافعیرح کا مسلک لے کر شرعی اور دینی ضرورت پوری کردی۔

۲ ۔ امام ابو حنیفہرح کا مسلک یہ ہے کہ گواہ کے بارے میں اس کی ظاہری عدالت کافی ہے، اندرونی حالات کی تحقیق و تفتیش ضروری نہیں۔ مگر امام ابو یوسفرح اور امام محمدرح نے شہادت کے بارے میں ظاہر عدالت کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ عادل قرار دینے اور قابل شہادت ہونے کے لئے تحقیق ضروری ہے۔ چونکہ امام ابو حنیفہرح کے دور میں عدالت کا غلبہ تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر ہونے کی خبر دی ہے۔ خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم، اور صاحبین کا زمانہ وہ تھا جس

کے بارے میں ثم یفشو الکذب فرمایا تھا، اس لئے علماء کرام نے اس اختلاف کے بارے میں یہ تصریح کی ہے ، ان ہذا الاختلاف اختلاف عصر و اوان الاختلاف حجة و برہان۔

۳ - امام ابو حنیفہرح کے ہاں سلطان کے سوا دوسرے کسی کا اکراہ معتبر نہیں، اور امام محمدرح نے غیر سلطان کا اکراہ بھی متحقق مان لیا ہے اور اس کا اعتبار کیا کرتے ہیں۔ امام ابو حنیفہرح کا قول ان کے اس زمانہ کے حالات پر مبنی ہے پھر جب فساد بڑھ گیا اور غیر سلطان کی طرف سے بھی اکراہ کے واقعات پیش آتے رہے تو امام محمدرح نے اس کو مان لیا اور متاخرین احناف نے اس پر فتوی دے دیا ۔ اور اب اسی بنیاد پر جزئیات کا حکم بیان کیا جاتا ہے ۔

علامہ شامیرح نے اور بھی بہت سی مثالیں دی ہیں جہاں ظاہر الروایة اور اصل مذہب کو عرف کی بنا پر یا دفع حرج یا اور اصول کی بنا پر چھوڑ کر دوسرا قول اختیار کرکے فتوی دیا گیا ہے ۔ اور اس سلسلہ میں فرمایا ہے کہ بہت سے عقود جو شرعاً ممنوع ہیں ان سب کی وجہ یہ ہے کہ وہ موجب نزاع ہوتے ہیں ۔ لیکن اگر عرف کی وجہ سے باہمی نزاع کا اندیشہ نہ رہے تو پھر بہت سے ایسے عقود کو شرعاً ممنوع نہیں قرار دیا جائے گا چنانچہ اسی رسالہ میں علامہ شامیرح لکھتے ہیں :

و یدل علی ذلك انهم صرحوا بفساد البیع بشرط لایقتضیه العقد وفیه نفع لاحد العاقدین واستدلوا علی ذلك بنهیه صلی الله تعالی علیه وسلم عن بیع و شرط و بالقیاس و استثنوا من ذلك ما جری به العرف کبیع نعل علی ان یحذوها البائع قال فی منح الغفار فان قلت اذا لم یفسد الشرط المتعارف العقد یلزم ان یکون العرف قاضیا علی الحدیث قلت لیس بقاض علیه بل علی القیاس لان الحدیث معلول بوقوع النزاع المخرج للعقد عن المقصود به وهو قطع المنازعة و العرف

ینفی النزاع فکان موافقا لمعنی الحدیث ولم یبق من الموانع الاالقیاس و العرف قاض علیه انتهی۔

''اور یه بات یہاں سے ثابت ہوتی ہے که ائمه مجتہدین نے یه تصریح کی ہے که جو شرط عقد کا مقتضی نه ہو اور اس میں بائع یا مشتری کا فائدہ ہو تو ایسی شرط لگانے سے بیع فاسد ہوجاتی ہے اور اس کی دلیل یه دی ہے که حضور صلی اللہ علیه وسلم نے بیع کے ساتھ شرط لگانے کو منع فرمایاہے اور قیاس بھی یہی ہے لیکن فقہاء نے اس مسئله میں ایسی شرط کا لگانا جو عرف کے مطابق ہو موجب فساد قرار نہیں دیا۔ مثلاً ایک جوتا اس شرط پر فروخت کرنا که بائع اس کو تلوا لگائے گا۔ منح الغفار میں کہا ہے که اگر آپ اس پر یه اعتراض کریں که شرط متعارف جب عقد کو فاسد نہیں کرتی اور حدیث میں تو مطلقاً شرط لگانے کو منع کیا ہے تو اس سے لازم آتا ہے که آپ نے عرف کو حدیث پر غالب اور راجح کر دیا اس کے جواب میں کہتا ہوں که یہاں عرف حدیث پر غالب نہیں بلکه عرف کو قیاس پر غالب کیا ہے کیونکه حدیث میں ممانعت کی اصل وجه یه ہے که شرط لگانے سے باہمی جھگڑا پیدا ہوتا ہے جو مقصود عقد کے خلاف ہے اور عرف اگر ہو تو نزاع واقع نہیں ہوتا۔ تو عرف یہاں معنیٔ حدیث کے موافق ہوگیا۔ اب مانع صرف قیاس رہ گیا اور عرف قیاس پر غالب ہو سکتا ہے۔''

اور پھر اپنی اسی عبارت پر علامه شامی رح نے مزید حاشیه لگایا ہے:

و هذا و ان کان فیه تکلف و خروج عن الظاهر و لکن دعی الیه الاحتراز عن تضلیل الامة و تفسیقها بامر لامحیص عن الخروج عنه الا بذلك قال الشاعر

اذا لم تکن الا الاسنة مرکبا   فما حیلة المضطر الارکوبها

علی ان قواعد الشریعة تقتضیه فانها مبنیهٔ علی التیسیر لا علی التشدید و التعسیر

وما خیر صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الااختار ایسرھما علی امتہ و من القواعد الفقیھہ" اذا ضاق الامراتسع (منہ ص ۱۲۱)

(ترجمہ) ''اور اس میں اگرچہ تکلف بھی ھے اور ظاہر سے خروج بھی لیکن یہ اس لئے اختیار کیا گیا ھے کہ پوری امت کو گمراہ اور فاسق قرار دینے سے احتراز کیا جائے اور یہی ایک صورت ھے کہ تضلیل و تفسیق سے بچا جا سکتا ھے ایک شاعر نے کہا ھے کہ جب نیزوں کے علاوہ کوئی اور سواری میسر نہ ھو اور کوئی صورت ممکن نہ ھو تو ایک مجبور آدمی کے لئے اس پر سوار ھوئے بغیر اور کوئی طریق کار باقی نہیں رھتا ۔ علاوہ ازیں شریعت کے قواعد کلیہ اسی کا تقاضا کرتے ھیں کیونکہ شریعت آسانی اختیار کرنے پر مبنی ھے سختی اور تنگی برتنے پر نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو باتوں میں سے کسی ایک کا اختیار دیا جاتا تو آپ اسی کو پسند فرماتے جو امت کے لئے آسان بات ھوتی اور فقہی قاعدہ بھی ھے کہ جب کوئی معاملہ تنگ پڑنے لگ جائے تو اس میں کشادگی کی جاتی ھے ۔،، (ناتمام)

خلافت ارض اور علم الاسماء کی نسبت سے

پندرھویں صدی ھجری میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں

محمد شہاب الدین ندوی

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ھے کہ عرفان ذات باری کے بعد بارگاہ ایزدی سے انسان کو سب سے پہلا جو علم دیا گیا وہ ''علم الاسماء،، (علم اشیائے عالم) تھا۔ انسان کو اس علم سے سرفراز کئے جانے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انسان مظاہر کائنات اور ان کے خواص سے بخوبی آگاہ ہوکر ان سے فائدہ اٹھائے اور ''خلافت ارض،، (زمین میں جانشینی) کے تقاضوں کو پورا کرے۔

علم اشیاء اور خلافت ارضی بظاہر دو الگ چیزیں معلوم ہوتی ہیں اور ان میں باہم کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ مگر غور کرنے سے واضح ہوجاتا ھے کہ ان دونوں میں بہت گہرا ربط و تعلق ھے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم میں خلافت اور''تعلیم اسماء،، کا بیان ساتھ ساتھ آیا ھے :

و اذ قال ربك للملئكة انی جاعل فی الارض خليفة ؕ قالوا أتجعل فيها من يفسد فيها و يسفك الدماء ج و نحن نسبح بحمدك ونقدس لك ؕ قال انیاعلم مالا تعلمون . و علم آدم الاسماء كلها ثمعرضهم علی الملئكة فقال انبئونی باسماء هؤلآءان كنتم صادقين . قالوا سبحنك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العليم الحكيم. قال يآادم انبئهم باسماءهم فلما انبأهم باسمائهم قال الم اقل لكم انی اعلم غيب السموات والارض و اعلم ما تبدون وما كنتم تكتمون .

ترجمہ : اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ تو انہوں نے کہا کیا تو اس میں ایسی ہستی کو بنائے گا

جو اس میں فساد اور خون ریزی برپا کرے، حالانکہ ہم برابر تیری تسبیح وتقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ میں وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اس نے آدم کو تمام اسماء (ناموں) کا علم دے دیا، پھر ان (اسماء) کو فرشتوں کے سامنے (مجسم شکل میں) پیش کرکے کہا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو (کہ ہمارے علاوہ کسی اور کو خلیفہ بنانے کی کیا ضرورت ہے) تو ذرا مجھے ان چیزوں کے نام تو بتادو۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ تو پاک ہے ہم کو (ان چیزوں کا) کوئی علم نہیں، سوائے اس کے جتنا کہ تو نے ہم کو سکھا دیا ہے۔ یقیناً تو بڑا ہمہ دان اور حکمت والا ہے۔ (تب) ارشاد ہوا اے آدم! ان کو ان (چیزوں) کے نام بتا دو تو آدم نے ان کو تمام چیزوں کے نام بتادئے۔ اللہ نے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں ہی زمین اور آسمانوں کی تمام پوشیدگیوں سے واقف ہوں، اور ان باتوں کو بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم (اپنے دلوں میں) چھپاتے ہو۔ (بقرہ: ۳۰ - ۳۳)

ان آیات کریمہ میں سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ''وعلم آدم الاسماء کلھا،، (اور اس نے آدم کو تمام اسماء کا علم دے دیا یا تمام نام بتادیے) سے کون سا علم مراد ہے یا اس کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے؟ اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس علم کا خلافت ارض سے کیا تعلق ہے اور موجودہ دور میں اس کی اہمیت کیا ہے؟ انہی دو مسئلوں کی تنقیح اس وقت مطلوب ہے۔

''الاسماء کلھا،، (تمام ناموں) سے مراد مفسرین کی تصریحات کے مطابق تمام موجودات عالم اور تمام مخلوقات کے نام اور ان کے آثار و خواص کا علم ہے۔ یہ ایک بہت وسیع علم ہے۔ جس کو ہم مختصر طور پر بطور ایک اصطلاح ''علم الاسماء،، (علم کائنات) کہہ سکتے ہیں۔ اس ضمن میں چند تفسیری اقتباسات ملاحظہ ہوں:

اسماء (واحد اسم) : اسم کا مفہوم عربی زبان میں اردو کے ''نام،، سے کہیں زیادہ وسیع ہے ۔ اسم وہ ہے جس کے ذریعہ کوئی چیز جانی پہچانی جائے (تفسیر ماجدی، ۱/ ۷۰، طبع ثانی)

کسی چیز کا اسم اس کی علامت ہوتی ہے، اسم‌الشئی علامته (قاموس بحواله ماجدی) .

اسم کے اصل معنی ہیں جس سے کسی شے کی ذات معلوم کی جاسکے ۔ الاسم ما یعرف به ذات الشئی (مفردات راغب) .

''اور یہ شناخت ممکن نہیں جب تک کہ اعراض، خواص، آثار کا علم بھی ساتھ ساتھ نہ ہو---- یہ تو لفظی معنی ہوئے، آیت کی تفسیر میں محققین نے مراد معلومات اشیاء سے لی ہیں اور اسماء کے ساتھ مسمیات اور ذوات و خواص اشیاء کو شامل کیا ہے ۔ اور اشیاء کے اسماء سے مراد ان کے آثار و خواص کا علم لیا گیا ہے ۔ گویا سارے علوم تکوینی آدم و بنی آدم کو ودیعت کر دئے گئے ،، (تفسیر ماجدی) ۔

یہ گویا تمام تفاسیر کا حاصل اور خلاصہ مطالب ہے ۔ مگر میں اس بیان کو مزید مدلل کرنے کی غرض سے اس سلسلے میں چند مستند تفسیروں سے کچھ مزید تفصیلات پیش کروں گا ۔ چنانچہ علامہ شہاب الدین آلوسی بغدادیؒ اپنی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ اس سے علوی و سفلی اور جوہری و عرضی ہر اعتبار سے تمام موجودات عالم مراد ہیں :

و قیل المراد بها اسماء ما كان وما یكون الی یوم القیامة، و عزی الی ابن عباس رضی الله تعالی عنهما۔ و قیل اللغات، و قیل اسماء الملئكة و قیل اسماء النجوم، و قال الحكیم الترمذی : اسماؤه تعالی، و قیل وقیل وقیل ۔ والحق عندی ما علیه اهل الله تعالی، وهو الذی یقتضیه منصب الخلافة الذی علمت، وهو انها اسماء الاشیاء علوية

او سفلية جوهرية او عرضية ـ و يقال لها اسماء الله تعالى عندهم باعتبار دلالتها عليه و ظهوره فيها غير متقيدبها ـ ولهذا قالوا ان اسماء الله تعالى غير متناهية ـ

ترجمہ : اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان تمام چیزوں کے نام ھیں جو واقع ھو چکی ھیں اور جو قیامت تک واقع ھونے والی ھیں ـ اور اس قول کی نسبت حضرت ابن عباسرض کی طرف کی گئی ہے ـ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد زبانیں ھیں ـ ایک قول ہے کہ مراد فرشتوں کے نام ھیں ـ ایک قول ہے مراد ستاروں کے نام ھیں ـ اور حکیم ترمذی نے کہا ہے کہ اس سے مراد اسماء الٰہی ھیں ـ اسی طرح کے اور اقوال بھی مروی ھیں ـ اور میرے نزدیک حق بات وھی ہے جس پر اھل اللہ قائم ھیں ـ اور وہ وھی (علم) ہے جو منصب خلافت کا مقتضی ہے، اور وہ ہے تمام چیزوں کے نام، خواہ وہ علوی ھوں یا سفلی، جوھری ھوں یا عرضی ـ اور انہی چیزوں کو دیگر اقوال کے مطابق اسمائے الٰہی بھی کہا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ چیزیں اس (کے وجود و صفات) پر دلالت کر رھی ھیں، اور اسماء و صفات ان میں ظاھر ھو رھی ھیں، مگر انہی میں مقید نہیں ھیں ـ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اسمائے الٰہی بے پایاں ھیں ـ (تفسیر روح المعانی، ۱ / ۲۲۴)

تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عباس رض کا ایک قول مروی ہے :

قال هی هذه الاسماء التی یتعارف بها الناس : انسان و دواب وسماء و ارض و سهل و بحر و خیل و حمار و اشباه ذلك من الامم و غیرها : فرمایا کہ یہ وہ نام ھیں جن سے لوگ متعارف ھیں (جیسے) انسان، چوپائے، آسمان، زمین، میدان، سمندر، گھوڑا، گدھا اور انہی جیسے دیگر انواع و اقسام ـ (جلد ۱، ص ۷۳)

و قال مجاهد : اسم کل دابة و کل طیر و کل شئی : مجاھد نے کہا کہ اس سے مراد ھر چوپایہ، ھر پرندہ اور ھر چیز کا نام ہے ـ (حوالہ مذکور)

والصحیح انه علمه اسماء الاشیاء کلها ذواتها و صفاتها وافعالها کما قال ابن العباس حتی الفسوة والفسیة : صحیح بات یه هے که الله تعالی نے آدمء کو تمام چیزوں کے نام، ان کے ذوات (هستیاں) ان کی صفات اور ان کے افعال کا علم دے دیا تھا، جیسا که ابن عباسرض نے فرمایا هے، یہاں تک که گوز اور پھسکی تک کا علم (تفسیر ابن کثیر)

اس کے بعد علامه ابن کثیررح نے اس قول کی مزید تائید کے طور پر بخاری شریف کی ایک حدیث سے بھی استدلال کیا هے (جو ایک طویل حدیث هے اور اس کا وہ ٹکڑا ذیل میں نقل کیا جا رها هے جس پر مدار استدلال هے) ۔ اس حدیث کے مطابق لوگ قیامت کے دن کی هولناکیوں سے پریشان هوکر سب سے پہلے حضرت آدم علیه السلام کے پاس جائیں گے اور ان سے اس طرح مخاطب هوں گے : . . . . . انت ابو الناس، خلقك الله بیده، واسجدلك ملائکته، و علمك اسماء کل شئی، فاشفع لنا عند ربك . . . آپ تمام لوگوں کے باپ هیں، الله نے آپ کو اپنے هاتھ سے پیدا کیا، اور آپ کو تمام فرشتوں سے سجده کرایا، اور آپ کو تمام چیزوں کے نام بتادئے ۔ پس آپ اپنے رب کے پاس هماری سفارش کیجئے ۔ (بخاری کتاب التفسیر، بحواله تفسیر ابن کثیر)

اس حدیث کی تائید میں ابن کثیر نے مسلم، نسائی اور ابن ماجه کی روایت بھی پیش کی هے ۔ پھر اس کے بعد فرماتے هیں :-

فدل هذا علی انه علمه اسماء جمیع المخلوقات، یه اس بات کی دلیل هے که الله تعالی نے آدم علیه السلام کو تمام مخلوقات کے اسماء بتادئے تھے (تفسیر ابن کثیر، ۱/۷۳)

علامه ابن کثیررح نے جو کچھ تحریر فرمایا هے وہ بہت مدلل هے اور حدیث شریف کی تصریح کے بعد تو اس میں مزید کلام کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ۔

اسی بنا پر اکثر مفسرین نے اسماء سے یہی مفہوم مراد لیا ہے اور اس کے متعدد پہلوؤں پر بحث کی ہے -

علامہ زمخشری رح اس آیت کی تحقیق میں فرماتے ہیں کہ یہاں پر مضاف الیہ کو حذف کر کے مضاف کو اس کا قائم مقام بنا دیا گیا ہے :

(وعلم آدم الاسماء کلها) أی اسماء المسمیات، فحذف المضاف الیه لکونه معلوماً مدلولاً علیه بذکر الاسماء لان الاسم لابد له من مسمی : ناموں سے مراد چیزوں کے نام ہیں - تو یہاں پر مضاف الیہ (مسمیات) کو، اسماء کے مذکور ہونے کی وجہ سے معلوم و مدلول ہونے کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہے - کیونکہ اسم کے لئے اس کا مسمی ہونا ضروری ہے -

پھر فرماتے ہیں :-

فان قلت فما معنی تعلیمه اسماء المسمیات ؟ قلت : أراه الأجناس التی خلقها، و علمه ان هذا اسمه فرس، و هذا اسمه بعیر، و هذا اسمه کذا و هذا اسمه کذا، و علمه احوالها ومایتعلق بها من المنافع الدینیة والدنیویة : اگر تم کہو کہ آدمؑ کو چیزوں کے نام سکھانے کے کیا معنی ہیں ؟ تو میں کہوں گا کہ اللہ تعالی نے اپنی تخلیق کردہ تمام اجناس آدمؑ کو دکھا دیں اور انہیں بتایا کہ یہ گھوڑا ہے، یہ اونٹ ہے اور یہ فلاں چیز ہے اور یہ فلاں - اور پھر اس نے ان تمام چیزوں کے حالات، ان کے متعلقات اور دینی و دنیوی تمام منافع بھی بتا دئے - (تفسیر کشاف، ۱ / ۲۷۲)

علامہ جصاص رازی رح فرماتے ہیں کہ اس لفظ (الاسماء) کے عموم میں اس کے تمام معانی داخل سمجھے جائیں گے (اصول فقہ کی رو سے)

يدل على انه علم الاسماء كلها لآدم، اعنى الاجناس بمعانيها لعموم اللفظ فى ذكر الاسماء : یه بیان اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو تمام اسماء سکھا دئے تھے - یعنی لفظ کے عموم کی بنا پر اپنے تمام معانی و مفہومات سمیت اجناس (موجودات عالم کی) مراد ہیں - (احکام القرآن، ۱/ ۳۱)

پھر اس کے بعد بطور دلیل تحریر فرماتے ہیں :

و انه علمه اياها بمعانيها اذ لا فضيلة فى معرفة الاسماء دون المعانى، وهى دلالة على شرف العلم و فضيلته : اور اس نے یہ تمام اسماء اپنے معانی و مفہومات کی ساتھ سکھائے ہیں - کیونکہ بغیر معانی کے محض اسماء کی پہچان فضیلت کی کوئی بات نہیں ہے - اور یہ چیز علم کے شرف اور اس کی فضیلت پر دلالت کر رہی ہے - (حوالہ مذکور)

امام رازیؒ اس لفظ (الاسماء) کے اشتقاق اور اس کے لغوی مفہوم پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

من الناس من قال قوله و علم آدم الاسماء كلها اى علمه صفات الاشياء و نعوتها و خواصها - والدليل عليه ان الاسم اشتقاقه اما من السمة او من السمو فان كان من السمة كان الاسم هو العلامة - و صفات الاشياء و نعوتها و خواصها دالة على ماهياتها - فصح ان يكون المراد من الاسماء الصفات - و ان كان من السمو فكذالك، لان دليل الشئى كالمرتفع على ذلك الشئى - فان العلم بالدليل حاصل قبل العلم بالمدلول - فكان الدليل اسمى فى الحقيقة - فثبت انه لامتناع فى اللغة ان يكون المراد من الاسم الصفة :

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ارشاد باری ”و علم آدم الاسماء کلہا“ سے مراد چیزوں کی صفات، ان کی تعریفیں اور ان کے خواص ہیں - اور اس پر دلیل

یہ ہے کہ اسم یا تو ''سمۃ،، سے مشتق ہوگا یا ''سمو،، سے۔ اگر اس کو سمۃ سے مشتق قرار دیا جائے تو وہ ''علامت،، کے معنی میں ہوگا۔ چونکہ چیزوں کی صفات، ان کی تعریفیں اور ان کے خواص ان کی ماہیات پر دلالت کرتے ہیں اس لئے اشیاء سے مراد ان کی صفتیں لینا درست ہوگا۔ اور اگر اس کو ''سمو،، سے مشتق قرار دیا جائے تب بھی اس سے یہی مراد ہوگا۔ کیونکہ کسی چیز کی دلیل اس چیز سے بلند ہوتی ہے۔ اس لئے کہ دلیل کا علم مدلول سے پہلے حاصل ہوتا ہے۔ لہذا دلیل حقیقتاً زیادہ بلند ٹھہری۔ اس طرح ثابت ہوا کہ لغت کی رو سے اسم سے مراد (اس کی) صفت لینا ممنوع نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر، ۱ / ۲۰۸)

علامہ رشید رضارح نے اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے اس کا فلسفہ اس طرح سمجھایا ہے:

(و علم آدم الاسماء کلھا) ای اودع فی نفسہ جمیع الاشیاء من غیر تحدید ولا تعیین، فالمراد بالاسماء المسمیات عبر عن المدلول بالدلیل، لشدۃ الصلۃ بین المعنی و اللفظ الموضوع لہ، و سرعۃ الانتقال من احدھما الی الآخر، والعلم الحقیقی انما ھو ادراك المعلومات انفسھا، والالفاظ الدالۃ علیھا تختلف باختلاف اللغات التی تجری بالمواضعۃ والاصطلاح فھی تتغیر و تختلف والمعنی لا تغییر فیہ ولا اختلاف۔

یعنی: اللہ تعالی نے آدم کی ذات میں تمام چیزوں کا علم بے حد و بلا تعین ودیعت کر دیا۔ لہذا اسماء سے مراد مسمیات ہیں، مدلول کو دلیل سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ ایک تو لفظ موضوع لہ اور معنی کے درمیان قوی تعلق پایا جاتا ہے اور دوسرے ایک کے ذکر کے ساتھ ہی ذہن فوراً دوسرے کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ علم حقیقی دراصل بجائے خود معلومات کا ادراک کرنا ہے۔ اور وہ الفاظ جو ان معلومات پر دلالت کرنے والے ہوتے ہیں وہ موقع و محل اور

اصطلاح کے اعتبار سے مختلف و متغیر ہوتے ہیں، مگر نفس معنی میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ (تفسیر المنار، ۱ / ۲٦۲)

حاصل یہ کہ ''اسماء،، سے مراد ان کے مسمیات (اس عالم آب گل کی تمام ہستیاں اور کل موجودات) اور ان کے تمام آثار و خواص اپنے تمام معانی و مفہومات کے ساتھ ہیں۔ بعض مفسرین نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر تمام علوم و فنون کو بھی اس لفظ کے عموم میں داخل کر دیا ہے۔ مثلاً قاضی بیضاوی رح تحریر فرماتے ہیں :

الهمه معرفة ذوات الاشياء و خواصها واسماء ها و اصول العلم و قوانين الصناعات و كيفية آلاتها : آدمء کو اس نے چیزوں کی ہستیاں ،ان کے خواص، ان کے نام، علم کے اصول، صنعتوں کے قوانین اور صنعتوں میں استعمال ہونے والے آلات کی کیفیت (غرض سب کچھ) الہام کر دیا۔ (تفسیر بیضاوی)

صاحب روح المعانی نے بھی اپنی تفسیر میں اس عبارت کو دہرایا ہے۔ گویا انہیں بھی اس نظریہ سے اتفاق ہے۔

شیخ طنطاوی جوہری رح نے لکھا ہے :

و الهمه المعرفة والاختراع وسائر الصناعات : اور اس نے (اشیاء کی) معرفت ایجاد و اختراع اور تمام صنعتیں الہام کردیں۔ (تفسیر الجواہر، ۱ / ۵۲)

پھر موصوف دوسری جگہ اس کی حکمت اور اس کا فلسفہ اس طرح بیان کرتے ہیں :

سخرت له السموات والارضون والبر و البحر و الروض والقفر والجبل و السهل، فعلم الاسماء و الصفات و خواص المخلوقات ليعرفها و تنفعه، ولذلك يقول (و علم آدم الاسماء كلها) و حرى بمن سخرت له الافلاك و قاست بنظامها الاسلاك و من سجدت له

العوالم بسجود تسخیر و قامت له تعظیما بالتدبیر ان یتحلی بالعرفان لیفهمها و ینطق باللغات و ینظمها دعت حاجته الی العوالم فعر فها له مبدعه،؛

آدم علیه السلام کے لئے ارض و سماء، بر و بحر، چٹیل میدان و مرغزار، بیابان و کہسار سب مسخر کر دئیے گئے۔ پس اس نے مخلوقات کے تمام اسماء اور خواص و صفات کا علم آدم کو دے دیا، تاکہ وہ ان اشیاء کو اچھی طرح پہچان لے اور ان سے فائدہ اٹھائے۔ اس لئے ارشاد ہوا (اور اس نے آدم کو تمام اسماء کا علم دے دیا) اور اس ہستی کے لئے — جس کی خاطر تمام افلاک و اجرام مسخر کر دئیے گئے ہوں ، تمام خطہ ہائے ارضی کو اپنے نظاموں کے ساتھ آراستہ کر دیا گیا ہو، اور تمام عوالم اس کو تسخیری سجدہ کرکے اس کی تعظیم و تکریم پر کمربستہ ہو چکے ہوں — بہتر و مناسب تھا کہ وہ ان سب کا عرفان حاصل کرلے، تاکہ وہ ان کو اچھی طرح سمجھ کر اپنی زبان میں ان کا نطق کرے اور انھیں منظم کرے۔ اسی وجہ سے اس کو ان موجودات کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ لہذا خلاق عالم نے ان تمام چیزوں کا تعارف آدمؑ سے بخوبی کرادیا۔ (ایضاً، ۱/ ۵۳)

چند حقائق و معارف :

یوں تو سورۂ بقرہ کی ان آیات میں ہمارے لئے بہت سے اسباق و بصائر ودیعت کر دئیے گئے ہیں، مگر میں اس موقع پر خلافت ارض کے تعلق سے صرف چند حقائق کے بیان و استنباط پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ انسان کو سب سے پہلا جو علم دیا گیا وہ علم اشیاء ہے۔ یعنی تمام موجودات عالم اور ان کی خصوصیات و امتیازات کا علم۔ اس کو ہم مختصر طور پر ''علم الاسماء،، یا ''علم کائنات،، کہہ سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں سائنس جن چیزوں سے بحث کرتی ہے وہ یہی موجودات عالم ہیں، اور جو باتیں

بیان کرتی ھے وہ یہی ''اشیاء کے آثار و خواص،، ھیں ۔ طبیعیات (فیزکس) کیمیا (کیمسٹری) حیاتیات (بایولوجی) ارضیات (جیولوجی) اور فلکیات (اسٹرونومی) وغیرہ تمام سائنسی علوم کا دائرہ مادی چیزوں (مسمیات) اور ان کے خصوصیات و امتیازات یا ''آثار و خواص (اسماء) ھی کے گرد گھومتا ھے ۔ لہذا ''الاسماء،، کو علی وجہ‌البصیرت سمجھنا سائنسی علوم کے وقوف پر موقوف ھے ۔ سائنس نام ھے دنیا میں پائی جانے والی مادی اشیاء اور ان کی ساخت و پرداخت کے مطالعہ کا ۔

۲ ۔ ''تعلیم اسماء،، کا تعلق ''خلافت ارض،، سے ھے ۔ ان دونوں کا بیان ان آیات میں ساتھ ساتھ آیا ھے اور ان دونوں کا آپس میں بہت گہرا ربط و تعلق ھے، جیسا کہ شیخ طنطاوی جوھری کے اوپر نقل کردہ اقتباس سے ظاھر ھورھا ھے ۔ ظاھر ھے کہ جب تک انسان اشیائے عالم کی حقیقت، ان کی ساخت و پرداخت ان کے اعمال و وظائف اور ان کی طبعی و نوعی خصوصیات سے بخوبی واقف نہ ھوجائے ان سے مستفید نہیں ھو سکتا اور انہیں مسخر کرکے ان میں ودیعت شدہ قوتوں کو کام میں نہیں لا سکتا ۔ جب وہ موجودات عالم سے مستفید نہیں ھوگا اور ان کی قوتوں کو زیر نہیں کرے گا تو اس کا خلیفہ ھونا ایک بے معنی بات ھوگی اور خلافت کے دیگر تمام مقاصد فوت ھو جائیں گے ۔ (تفصیل آگے آرھی ھے) چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رح اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ھیں :

''پھر دوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر ترجیح، اور مقام علم میں آدمء کے تفوق کا ذکر کر کے دیا گیا، اور بتلایا گیا کہ خلافت ارضی کے لیئے زمینی مخلوقات کے نام اور ان کے خواص و آثار کا جاننا ضروری ھے اور فرشتوں کی استعداد اس کی متحمل نہیں،، ۔ (معارف القرآن، ۱ / ۱۸۷)

صاحب تفسیرالجواھر تحریر فرماتے ھیں :

فمن لم یقدر علی معرفة مراتب الاشیاء لا یستحق ان یکون خلیفة علیھا :

جو ہستی اشیائے عالم کے مراتب سے ناواقف ہو وہ ان اشیاء پر خلیفہ ہونے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

۳۔ حضرت آدمؑ کو تمام اشیاء کا علم سکھانے والا خود اللہ تعالیٰ ہے، جو بنص قرآنی معلم اول ہے (و علم آدم الاسماء کلھا)۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے منصوبے کے مطابق اولاد آدم میں یہ صلاحیت رکھ دی ہے کہ وہ ''اشیائے عالم اور ان کے خواص،، کا علم حاصل کریں۔ اس لحاظ سے اولاد آدم مظاہر کائنات کا علم بتدریج حاصل کرکے گویا ''تعلیم الہی،، کی تصدیق کر رہے ہیں۔

صاحب تفسیر المنار تحریر فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام باتیں بتادیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اللہ نے ان کو یہ تمام باتیں خواہ ایک ہی وقت میں یا متعدد مرتبہ بتائی ہوں۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ علمی قوت و استعداد ہر آدمی میں عام ہے۔ اس لئے یہ لازم نہیں آتا کہ آدم کی اولاد اشیائے کائنات کو پہلے ہی دن جان لیں۔ انسانوں میں اس قوت کے اثبات کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ ان کو بحث و استدلال کے ذریعہ اشیاء کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے،،۔

۴۔ حسب بالا بیان کے مطابق آدمؑ اور اولاد آدم کے علم میں بین فرق یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کا علم ''لدنی،، تھا۔ یعنی وہ علم جو کسی کو بارگاہ الہی کی جانب سے بغیر کسب یا مشقت عطا کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اولاد آدم کا علم کسبی ہے۔ یعنی وہ علم جو محنت و مشقت کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ مگر اس کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے تمام اولاد آدم میں روز ازل ہی میں رکھ دی تھی تاکہ اولاد آدم اشیائے کائنات کی تسخیر کرکے خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہو سکیں۔

۵ ۔ مظاهر فطرت اور ان کے نظاموں کا علم حاصل کرنا غیر اسلامی، یا ناجائز، یا غیر ضروری یا بےکار و بے فائدہ نہیں، بلکه وہ عین ''تعلیم الہی،، اور منشائے خلافت کے مطابق ھے ۔

۶ ۔ تفسیر بیضاوی اور تفسیر الجواهر کی تصریحات کے مطابق (و علم آدم الاسماء کلها) کی وسعت اور اس کے اقتضاء میں تمام علوم و فنون بھی داخل ھیں، جن کو موجودہ زبان میں سائنس اور ٹکنالوجی کہا جا سکتا ھے ۔

سائنس اور ٹکنالوجی کیا ھے ؟ مادہ اور اس کی قوتوں سے استفادہ ۔ مثلاً مختلف مصنوعات، کیمیائی مرکبات، انواع و اقسام کے سامان تمدن کی تیاری اور برق و بھاپ کو قابو میں کرکے مختلف میدانوں میں بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانا ۔ چنانچه آج دنیا میں جتنی بھی صنعتیں کام کر رھی ھیں اور ان سے جو معاشی و تمدنی فوائد حاصل ھو رھے ھیں وہ انھی علوم کی ترقی کی بدولت ھیں ۔

۷ ۔ علم الاسماء یا دوسرے لفظوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کیئے بغیر موجودہ دور میں خلافت ارض کے تقاضے پورے نہیں ھوسکتے ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ھے ۔ (مزید تفصیل آگے آرھی ھے)

۸ ۔ اس سے علم کی فضیلت تو ثابت ھوتی ھی ھے ، مگر خصوصیت کے ساتھ علم تکوین کی اھمیت بھی ۔ اس علمی برتری ھی کی بدولت انسان مسجود ملائکه بنایا گیا ۔

۹ ۔ مادہ پرست اور خدا بیزار لوگ کہتے ھیں که مذھب و اخلاق ماحول کی پیداوار ھیں۔ ابتداءً انسان نے جب جنم لیا تو اپنے چاروں طرف ایک عجیب و غریب ماحول اور خوفناک مظاھر دیکھ کر ڈر گیا ۔ اور انھیں رام کرنے اور ان کے شر سے محفوظ رھنے کے لئے انھیں پوجنا شروع کر دیا ۔ اس طرح بزعم

خود مذھب کی ابتداء ھوئی اور رفتہ رفتہ خدا کا تصور پیدا ھوا۔

مگر آدمؑ کو علم الاسماء دیا جانا اس بات کی تردید ھے۔ دنیا کا پہلا انسان جہل و دھشت کے تاریک اور ھیبتناک ماحول میں نہیں بلکہ علم و معرفت کے اجالے اور اس کی تیز روشنی میں نمودار ھوا۔ اس کے ایک ھاتھ میں ''علم الاسماء،، کی مشعل تھمادی گئی تو دوسرے ھاتھ میں ''تسخیر اشیاء،، کے آلات دے دئے گئے۔ تاکہ وہ ان دونوں کی مدد سے خلافت کے میدان کو سر کرے۔

غرض آدمؑ کو ابتداء ھی میں تمام اشیاء کا علم دے دینے کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ وہ ان مظاھر سے کسی قسم کا خوف یا دھشت محسوس نہ کرے۔ گویا کہ ھر چیز کا تعارف شروع ھی میں کراکے شرک اور مظاھر پرستی کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔

۱۰ - ''علم الاسماء،، کی تحقیق کرنا دراصل ''خدا کے کاموں،، یا خدا کی پیدا کردہ مخلوقات کو سمجھنے کی کوشش کرنا ھے جو بطور ''ربوبیت،، اس کائنات اور اس کے حیرت انگیز نظاموں میں جاری و ساری ھیں۔ اس لحاظ سے ''خلیفہ،، کا ایک کام اور اس کا ایک فریضہ یہ بھی ھے کہ وہ علم الاسماء یا ''نظام ربوبیت،، کی تحقیق اور ان کے اسرار سر بستہ کی نقاب کشائی کرکے مشرک اور بے دین لوگوں کی رھنمائی کرے، جن کو مظاھر کائنات کے سمجھنے میں دھوکا ھوا ھے یا جن سے وہ غلط نتائج اخذ کرتے ھیں۔

۱۱ - علم الاسماء کی تحقیق کا سب سے اھم مقصد معرفت الٰہی کا حصول ھے۔ یعنی نظام ربوبیت کی تحقیق کے نتیجے میں خدائے تعالی کی بے مثال صفات مثلاً اس کی وحدانیت، قدرت، ھمہ دانی (علم ازلی)، حکمت و مصلحت، مخلوق پروری، رحمت و رأفت اور اس کی عجیب و غریب منصوبہ بندی کا بھرپور نظارہ و مشاھدہ ھو جاتا ھے، جو وحدت الشھود کی منزل ھے۔ اور اس منزل تک پہنچ جانے کے

بعد انسان کو فکری اعتبار سے کسی بھی طرح بھٹکنے کا موقع باقی نہیں رھتا۔

۱۲ - اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ھوجاتی ھے کہ اللہ تعالی کو کائنات کی تمام اشیاء اور اس کی تمام جزئیات کا علم — ان کے خالق و ناظم اور مدبر و مربی ھونے کی حیثیت سے — حاصل ھے، ورنہ یہ تعلیم (تمام اسماء کی) ممکن نہ ھوتی۔ اس سے بہت سے فلاسفہ اور ان کے متبعین کی باطل خیال آرائیوں کی تردید بھی مقصود ھے کہ اللہ تعالی کو جزئیات عالم کا علم نہیں ھے۔

۱۳ - اس سے یہ بھی مترشح ھوتا ھے کہ پوری کائنات اور اس کے تمام مظاھر ایک نظم و ضبط کے پابند ھیں اور ان کے اصولوں میں کوئی تغیر و تبدل نہ ھورھا ھے اور نہ ھو سکتا ھے۔ یعنی روز ازل میں اللہ تعالی نے ان مظاھر کے جو ضوابط مقرر کر دئے تھے ان میں مرور ایام کے باعث کوئی رد و بدل ممکن نہیں ھے۔ جن مظاھر یا موجودات کے جو آثار و خواص دور آدم (یا اس سے پہلے) متعین کر دئے گئے تھے وھی اب تک برابر چلے آرھے ھیں، جن سے موجودہ انسان بتدریج آگاھی حاصل کر رھا ھے۔

۱۴ - یہیں سے یہ اصول بھی نکلتا ھے کہ علم دین اور علم فطرت میں اصلاً کوئی تعارض و تضاد نہیں ھو سکتا۔ کیونکہ دونوں ایک ھی سر چشمہ سے نکلے ھوئے اور ھر دو ایک ھی مبدء فیض کی جانب سے تعلیم کئے ھوئے ھیں۔

۱۵ - ان آیات کریمہ کا منشا اور تقاضا یہ معلوم ھوتا ھے کہ اولاد آدم خصوصاً ''مسلمان،، دنیا کی تمام چیزوں اور کل موجودات عالم کا علم حاصل کریں اور عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق دینی و دنیوی ھر حیثیت سے عالم انسانی کی رھنمائی کریں۔

۱۶ - حیرت کی بات ھے کہ جب ھم قرآن کریم میں ان آیات کو پڑھتے ھیں تو بہت خوش ھوتے ھیں اور اس بات پر فخر کرتے ھیں کہ ھمارے ''باپ،،

نے فرشتوں کے سامنے تمام اسماء گنوا کر اپنی برتری ظاہر کردی اور اپنی فضیلت کا سکہ بٹھا دیا ۔ مگر یہ کبھی کوشش نہیں کرتے کہ اپنے باپ کا یہ علم حاصل کرکے صحیح معنی میں اس کے ''وارث،، بنیں اور اس میدان میں اقوام عالم پر اپنی فضیلت و برتری ثابت کریں ۔ جب کہ دوسری قومیں یہ علم صحیح طور پر حاصل کرکے نہ صرف آفاق عالم پر اپنی برتری کا جھنڈا لہرائے ہوئے ھیں بلکہ زندگی کے ہر میدان میں ہم کو نیچا دکھا رہی ھیں ۔

۱۷ ۔ جب حضرت آدمؑ سے کہا گیا کہ ''تم ان کو تمام موجودات عالم کے نام بتادو،، تو انھوں نے یہ تمام نام بتا دئیے ۔ مگر آج مسلمانوں کے سامنے جب ''چیزوں کے نام،، آتے ھیں تو وہ یا تو وحشت زدہ ہوجاتے ھیں یا ان کو ''غیر اسلامی،، یا ''علم غیر،، کہہ کر آنکھیں بند کر لیتے ھیں (محنت و مشقت کے ذریعہ ان اشیاء کے آثار و خواص کو خود سے دریافت کرنا تو بہت دور کی بات ھے) ۔ حالانکہ ان تمام اشیاء، ان کے خواص، ان کے اعمال اور ان کی کارکردگیاں انہیں ازبر ہونا چاھئے تھا ۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ سے مترشح ہو رہا ھے :

قال یا آدم انبئھم باسمائھم فلما انبأھم باسمائھم : ارشاد ہوا کہ اے آدمؑ تم ان کو تمام چیزوں کے نام بتادو تو انھوں نے ان کے نام فرشتوں کو بتادئیے

۱۸ ۔ خلاصہ یہ کہ روئے زمین پر ''خلیفہ،، وھی ہو سکتا ھے جو ''علم الاسماء،، یا ''علم آدم،، کا صحیح معنی میں وارث ہو ۔ یہ ان آیات کریمہ کا عقلی و منطقی نتیجہ ھے ۔ اب مسلمان غور کریں کہ وہ اپنے باپ کے اس علم سے کہاں تک بہرہور ھیں اور خلافت ارض کے تقاضوں کو کہاں تک پورا کر رہے ھیں ؟ (۱)

---

۱ ۔ مضمون نگار کا یہ بیان مجمل ہونے کے باعث محل نظر ھے اور اس کے اخذ کردہ نتیجے سے اختلاف کیا جا سکتا ھے ۔ لیکن آئندہ صفحات سے جہاں تفصیل ھے وضاحت ہو جاتی ھے ۔ (مدیر)

علم‌الاسماء کی تفصیل:

زمانہ قدیم کا انسان صرف زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، ھوا ،پانی حجر، شجر، مٹی، حشرات الارض، گائے، بیل، بکری، اونٹ، گھوڑا، گدھا، ھاتھی، کتا، بلی،، شیر، لومڑی، جنگل، پہاڑ، لوھا، ،تانبا، پیتل، سونا، چاندی، دریا، سمندر، مچھلی، پرندے، چاول، گیہوں، دال، سبزی، گوشت، انڈا، دودھ اور دھی وغیرہ وغیرہ ھی سے واقف تھا یا چند زراعتی، تمدنی اور جنگی آلات و اوزار وغیرہ سے -

مگر آج کا انسان ایٹم، الکٹرون، پروٹان، نیوٹران، پوزیٹران، ڈیوٹران، فوٹان، ھائڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن، کاربن، پوٹاشیم، میگنیشیم، ریڈیم، یورینیم (تمام ۹۲ قدرتی عناصر)، برق، بھاپ، ایٹمی قوت، ایٹمی شعائیں، لا شعائیں کائناتی شعائیں، پروٹوپلازم، امیبا، پروٹوزوا، جینز کروموسوم، کلوروفل، کلوروپلاسٹ، انزائم، مائٹوکانڈریا، ھیمو گلوبین، پروٹین، کاربو ھائڈریٹ، وٹامن، آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ، گلوکوز، پینسلین، مختلف قسم کی کیمیائی ایسڈ اور ان کے مرکبات، ربر اور اس کی مصنوعات، پلاسٹک اور اس کی مصنوعات، مختلف کیمیائی کھادیں اور اودیات، نئی نئی دھاتوں اور ان کی مصنوعات، الکٹرانک اشیاء و آلات، پٹرول اور اس کی مصنوعات، بے شمار قسم کے مشینوں اور کل پرزے، تھرمامیٹر، بیرومیٹر، فلاسک، ریفریجیریٹر، ٹرین، موٹر، ھوائی جہاز، ریڈیو، ٹیلی فون، برقی و لاسلکی آلات، ٹیلیکس، ٹیلی پرنٹر، راکٹ، اور خلائی جہاز وغیرہ وغیرہ سے بھی واقف ھے -

آج کا انسان روئے زمین پر سوا ملین (ساڑھے بارہ لاکھ) کے قریب حیوانات و نباتات کے وجود کا پتہ لگا کر ان کے آثار و خواص کا مطالعہ کر رھا ھے ، جو

''حیاتیات،، کے دائرہ میں آتے ھیں(۱) - اس طرح آج کرہ ارض پر پائے جانے والے دو لاکھ کے قریب ''غیر نامیاتی مرکبات،، اور چالیس لاکھ کے لگ بھگ ''نامیاتی مرکبات،، سے واقف ہو چکا ھے،(۲) جن کا مطالعہ علم کیمیا کے تحت کیا جاتا ھے - اسی طرح سمائے دنیا میں پائے جانے والے لاتعداد ستارے اور سیارے اور اربوں کہکشاؤں کے نظاموں اور ان کی خصوصیات کا مطالعہ علم فلکیات کے تحت کیا جاتا ھے -

اس لحاظ سے تحقیقات کا دائرہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا ھے موجودات عالم یا خدا کی مخلوقات کی تعداد میں بھی برابر اضافہ ہوتا جا رہا ھے - دوربین اور خورد بین کی ایجاد کے بعد تو ہمارے سامنے نئے نئے جہانوں کے ظہور کا ایک تانتا سا بندھ گیا ھے اور ایسے ایسے حقائق منظر عام پر آرھے ھیں، جن کے ملاحظہ سے حیرت ہوتی ھے -

جس طرح قدیم چیزوں سے واقفیت ''علم الاسماء،، میں داخل تھی اسی طرح جدید سے جدید تر تمام چیزوں سے واقفیت بھی علم الاسماء میں داخل ھے - بلکہ قیامت تک جتنی بھی نئی نئی چیزیں اور ان کے خواص دریافت ہوتے جائیں گے وہ سب کے سب علم الاسماء ھی کے دائرہ میں ہوں گے، جن کے دریافت کی صلاحیت خلاق فطرت نے روز ازل ھی میں حضرت آدمؑ کے توسط سے بالقوۃ تمام انسانوں میں رکھ دی تھی -

---

۱ - ملاحظہ ہو کتاب :

Asimov's guide to Science, vol. 2, pp. 304, 1978, London.

۱۸۰۰ء میں حیوانات و نباتات کی دریافت شدہ تعداد صرف ستر ہزار تھی، جب کہ یہ تعداد آج بارہ لاکھ سے تجاوز کر چکی ھے - کھوج برابر جاری ھے- اور دن بدن نئے نئے انواع حیات علم انسانی میں آرھے ھیں- اس لحاظ سے مخلوقات الٰہی کی صحیح تعداد کا علم صرف خالق ارض و سما ھی کو ہو سکتا ھے -

۲ - علم کیمیا، حصہ دوم، ص ۱۰۸

آج کا مسلمان چند وجوهات کی بنا پر ان جدید علوم و فنون یا علم الاسماء سے بچھڑا هوا ھے :

۱ ۔ آزاد اور علم دوست مسلم حکومتوں کے زوال کے باعث ان علوم میں تحقیق و تفتیش اور طالع آزمائی کا ذوق و جذبہ دلوں سے جاتا رہا ۔

۲ ۔ بعض تاریخی اسباب کی بنا پر دین اور دنیا کی تقسیم عمل میں آئی تو علماء نے دین کی حفاظت کے خیال سے دنیوی علوم سے کنارہ کشی ھی میں اپنی عافیت سمجھی ۔

۳ ۔ دین اور دنیا کی اس غلط تقسیم کا نتیجہ یہ هوا کہ ''علم الاسماء،، کا دیپ اپنوں کے بجائے غیروں کے آستانوں پر جلنے لگا ۔ نتیجہ یہ هوا کہ هم اس کی روشنی سے بھی بدکنے اور دور بھاگنے لگے ۔ اس طرح یہ علم اب همارے لئے بالکل اجنبی اور ''علم غیر،، هو کر رہ گیا ۔

۴ ۔ جدید علوم سے بیگانگی کی بدولت ان علوم سے پیدا هونے والے علمی، معاشرتی اور تمدنی مسائل سے بھی بیگانگی عمل میں آئی ۔ جس کا نتیجہ یہ هوا کہ اسلام بھی ماضی کی نشانی اور فرسودگی کی علامت سمجھا جانے لگا حالانکہ وہ ایک زندہ اور ابدی مذهب ھے اور هر دور میں زندگی کے تمام مسائل حل کر سکتا ھے ۔ کوتاهی جو کچھ ھے وہ هماری اپنی ھے اسلام کی نہیں ۔

بہر حال ان اصطلاحات کی وسعت یا ''ناموں کی کثرت،، کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے هیں کہ سائنسی علوم کی بے انتہاء ترقی اور پھیلاؤ کی بدولت خود ان علوم (طبیعیات، کیمیا، حیاتیات اور ارضیات وغیرہ) میں سے اب هر علم و فن

کی لغات تک الگ الگ تیار ہونے لگی ہیں ۔ مثال کے طور پر ادارہ Penguin Books London کی تیار کردہ مختلف سائنسی لغات ملاحظہ ہوں، جن میں سے ہر ایک کئی کئی ہزارالفاظ و اصطلاحات پر مشتمل ہے ۔

پھر اسی طرح ان علوم میں سے ہر علم کثرت مباحث کے باعث مزید شاخ در شاخ تقسیم ہوتا جا رہا ہے، مثلاً حیاتیات ہی کو لے لیجئے جسکی بیسیوں شاخیں وجود میں آچکی ہیں ۔

علم الاسماء ، حقیقت الاسماء نہیں :

اس موقع پر ایک علمی حقیقت کا سمجھ لینا بھی بہت ضروری ہے ۔ عصر جدید کی بے مثال علمی ترقی، جدید سے جدید تر بے شمار علوم و فنون کی تحقیق و تدوین اور مادی اشیاء کے ہزاروں جزئیات و خصوصیات اور ان کی باریکیوں کا علم حاصل کر لینے کے باوجود انسان اب تک ان چیزوں کی اصل حقیقت و ماہیت یا ان کے باطنی اسرار و احوال کا ادراک نہیں کر سکا ہے ۔ بلکہ اس کا علم محض ان چیزوں کے ''ظاہری آثار و خواص،، ہی تک محدود ہے ۔

چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی رح نے اس آیت کریمہ ''و علم آدم الاسماء کلھا،، سے خوب استنباط فرمایا کہ آدم کو صرف اسماء کا علم دیا گیا تھا اصل حقائق کا نہیں ۔ اور انسان کا علم آج بھی وہی ہے جہاں وہ روز اول تھا ۔

(ماخوذ بقدر تغیر از سیرت النبی، ۴ / ۹۰۴)

مطلب یہ کہ انسان کو پہلے ہی دن جو نام بتادئے گئے تھے (خواہ وہ مسمیات کے ہوں یا آثار و خواص کے) آج کا انسان باوجود اپنی ہمہ جہتی علمی ترقی کے اس پر ایک تنکے کے برابر بھی اضافہ نہیں کر سکا ہے ۔ انسان اشیائے عالم کا جس باریک بینی اور دقت نظر سے تجزیہ کرتا جارہا ہے اس کے سامنے نئی نئی چیزیں (مختلف اجزاء و عناصر کے روپ میں) جلوہ گر ہوتی جارہی ہیں، جن کے

ظاهری افعال و خواص سے تو وہ مستفید ہورہا ہے مگر ان کے باطنی حقیقت و کیفیت سے وہ نا آشنائے محض ہے۔

مثلاً انسان مادہ کی سب سے چھوٹی اکائی جوہر (ایٹم) اور اس کے اجزاء (الکٹران، پروٹان اور نیوٹران) اور مختلف ایٹمی مرکزوں سے خارج ہونے والی شعاعیں : الفا شعاعیں بیٹا شعاعیں اور گاما شعاعیں وغیرہ سب کا علم نہایت درجہ مشقت اور باریک بینی کے ساتھ حاصل کر چکا ہے۔ اور اس حقیقت کا بھی پتہ لگا چکا ہے کہ الکٹران میں منفی برقی چارج اور پروٹان میں مثبت برقی چارج ہوتا ہے۔ مگر وہ اس راز پر سے پردہ نہ اٹھا سکا کہ یہ برقی چارج آخر ہے کیا اور وہ کس طرح کام کرتا ہے ؟ مثبت اور منفی چارج کی کیا خصوصیات ہیں اور ان کی تعریف کیا ہے ؟ واضح رہے کہ مثبت اور منفی کے ''نام،، محض ان کی باہمی کشش و دفع کرنے کے ایک ''ظاہری خاصیت،، کی بنا پر رکھا گیا ہے ورنہ ان کی صحیح منطقی تعریف ممکن نہیں۔ اور نہ ہی ان برق پاروں کی اصلیت معلوم ہے۔

یہ تو ان برق پاروں کا حال ہوا جن سے دنیا کے تمام عناصر کی تشکیل ہوئی ہے۔ اب خود ان عناصر اور ان کے ''کیمیائی تغیرات،، کو دیکھئے تو اور زیادہ حیرت ہوتی ہے۔ عناصر کی دنیا طلسم ہوشربا سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔

غرض اب تک جتنے بھی عناصر اور ان کے اجزاء دریافت ہو چکے ہیں وہ سب محض ''نام ہی نام،، ہیں(۱)۔ اس عالم میں آب و گل میں جتنی بھی چیزیں

۱۔ مثلاً ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن، کاربن، سوڈیم، کیلشیم، میگنیشیم وغیرہ۔ ان عناصر کی خصوصیات مفرد طور پر کچھ ہوتی ہیں تو مرکب ہونے کے بعد کچھ اور ہو جاتی ہیں۔ اور انسان یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایسا کیوں اور کس طرح ہو جاتا ہے۔

اور جتنے بھی ''کیمیائی تغیرات،، (مختلف عناصر کے باھمی ملاپ سے وجود میں آنے والے سالمات) پائے جاتے ھیں، ان کی صحیح تعلیل و توجیہہ نہیں ھوسکتی اور کوئی قطعی و یقینی علم حاصل نہیں ھوتا ۔ اس حقیقت عظمی کا اظہار صحیفہ ابدی میں اس طرح کیا گیا ھے :

وما اوتیتم من العلم الا قلیلا : اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ھے ۔

جن چیزوں کو ھم سائنسی ادب یا اپنی بول چال میں ''حقائق اشیاء،، یا ''اسرار سربستہ کی جستجو،، وغیرہ کہتے ھیں، وہ دراصل مادی اشیاء کے محض چند ظاھری پہلو ھوتے ھیں، جن کو دریافت کر کے انسان خوش ھوجاتا ھے کہ اس نے ''حقائق،، پر سے پردہ اٹھا دیا ۔ حالانکہ اصل حقائق کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ھوتی ۔ اس کو قرآن حکیم اپنے بلیغ اسلوب میں ''علم قلیل،، سے تعبیر کرتا ھے ۔ یہ بھی محض انسان کی دلداری اور اس کی ھمت افزائی کے طور پر ھے کہ کہیں وہ اپنی تحقیق و تفتیش سے بددل نہ ھوجائے ۔

حقیقت یہ ھے کہ انسان صرف اشیاء کے ''ناموں،، (الاسماء) اور ان کی ''ظاھری کارکردگیوں،، (علم قلیل) ھی سے واقف ھے، ان کی اصل حقیقت و ماھیت (وہ باطنی اسرار جو امور غیب میں داخل ھیں) سے واقف نہیں ۔ اور اس میں راز یہ ھے کہ تمام چیزوں کی حقیقت سے واقف ھوکر کہیں یہ ذرہ خاک خودسر نہ بن جائے یا خدا کی برابری کا دعوی نہ کرنے لگ جائے ۔ بلکہ اس کو اپنی کمزوری اور بے بسی کا شدید احساس ھوتا رھے ۔ تاکہ وہ اپنے سے ایک برتر ھمہ دان و ھمہ بین ھستی کے وجود کا اعتراف کرکے (جس کا مشاھدہ اس عالم مادی میں قدم قدم پر ھو رھا ھے) اس کے حضور میں سجدہ ریز ھوسکے ۔ یہی وجہ ھے کہ وہ ''مادہ،، میں ودیعت شدہ فوائد سے تو مستفید ھو سکتا ھے مگر وہ کسی بھی طرح مادہ کی ''آخری حقیقت،، معلوم نہیں کر سکتا ۔ یہ علم اصلی و حقیقی

صرف اس کے خالق و مالک (جل جلالہ) ھی کو ھو سکتا ھے۔

و عندہ مفاتح الغیب لایعلمھا الا ھو: اور اسی کے پاس ھیں مخفی چیزوں کی (تمام) کنجیاں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (انعام ٥٩)

یہ اس عالم مادی کی ایک عظیم ترین حقیقت اور سر الہی ھے، جس کے اعتراف سے کسی بھی وسیع النظر عالم، محقق اور فلسفی کو چارۂ کار نہیں ھے۔ مثال کے طور پر ھربرٹ اسپنسر کہتا ھے:

''علم طبیعی ھم کو ایک محدود دائرہ تک لے جاتا ھے، جس سے ھم آگے جا نہیں سکتے اور سبب اول اور اس کی حقیقت کا ادراک کر نہیں سکتے''۔
(منقول از تفسیر الجواھر، ١ / ٣٥)

دور جدید کے سب سے بڑے فلسفی اور مادہ پرست برٹرنڈرسل تک کو اقرار و اعتراف ھے کہ مادی علوم کی ترقی جس رفتار سے ھو رھی ھے اسی نسبت سے جہل میں بھی اضافہ ھوتا جا رھا ھے۔ چنانچہ وہ کہتا ھے:

''سائنس کی حالیہ ترقیوں نے ایک بہت بڑی تکلیف دہ صورت حال سے دو چار کر دیا ھے کہ ھر ترقی ھمارے علم کو اس سے بھی کم کر دیتی ھے جتنا ھم پہلے حاصل سمجھتے تھے'' (١)۔

مختصر تاریخ سائنس کا مولف سر ڈبلو، سی، ڈامپیرس لکھتا ھے:

''علم کا دائرہ جتنا وسیع ھوتا جا رھا ھے اتنا ھی عدم علم یا نامعلوم کا رقبہ بھی وسیع تر ھوتا جا رھا ھے۔ اور جتنا زیادہ ھم نامعلوم میں گھستے ھیں اتناھی جو کچھ ھم کو وھاں ملتا ھے اس کو صاف و سادہ، قابل فہم الفاظ

١۔ (بحوالہ مذھب اور سائنس ص ١٤٦)

1. Will to Doubt,

میں بیان کرنا دشوار ہوتا ہے'' (۱) -

حاصل یہ کہ انسان کا علم روز اول ہی سے ''علم الاسماء'' تک محدود ہے، وہ ''حقیقة الاسماء'' تک نہیں پہنچ سکا اور نہ کبھی پہنچ سکتا ہے - (جاری)

۱ - (بحوالہ مذہب اور سائنس) A short History of Science, by sir W. E. Dampiers.

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی ○ اسلام آباد

نگراں

ڈاکٹر عبدالواحد ھالے پوتا

ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد

مدیر

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی

فکر و نظر اسلامی حدود کے اندر آزادی اظہار رائے کا حامی ہے۔ فکر و نظر میں کسی مضمون کی اشاعت کا یہ مطلب نہیں کہ ادارہ ان افکار و خیالات سے لازماً متفق ہے جو اس میں پیش کئے گئے ھیں - مضمون نگار اپنے خیالات کا خود ذمہ دار ھوتا ہے

سالانہ چندہ پندرہ روپئے	ششماھی آٹھ روپئے	فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

طابع و ناشر: محمد سمیع اللہ سکرٹری ادارۂ تحقیقات اسلامی - اسلام آباد

مطبع: اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پریس - پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵ - اسلام آباد

سکولوں ، کالجوں اور لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

ماہنامہ **فکرونظر** اسلام آباد

جلد - ۱۸ | ربیع الاول ۱۴۰۱ھ ☐ فروری ۱۹۸۱ | شمارہ - ۸

فہرست

سرورق : زیر تعمیر مسجد شاہ فیصل شہید - اسلام آباد

مسجد کے گرد ادارہ تحقیقات اسلامی ، اسلامیہ یونیورسٹی کی عمارات

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

پنجشنبہ ۲۲ جنوری ۱۹۸۱ء کی صبح پولی کلینک اسلام آباد میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ۷۸ سال کا سفر حیات ختم کرکے راھی ملک عدم ہوئے انا للہ و انا الیہ راجعون! مرحوم کی میت اسلام آباد سے کراچی لے جائی گئی ۔ جہاں دوسرے روز نماز جمعہ کے بعد انہیں سپرد خاک کردیا گیا ۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ادارہ تحقیقات اسلامی کے پہلے باقاعدہ ڈائرکٹر تھے ۔ ادارے کی داغ بیل یوں تو مولانا عبدالعزیز میمنی کے ھاتھوں پڑی جنہوں نے ابتدائی طور پر کتب خانے کے لئے کتابیں جمع کرنے سے اس کام کا آغاز کیا مگر اس کو باضابطہ ایک ادارے کی شکل اس وقت حاصل ہوئی جب ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو اس کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ انھوں نے ادارے کا جو خاکہ تیار کیا اور جن خطوط پر اسکی بنیادیں استوار کیں اسے آگے چل کر یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہونا تھا۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک دو سال وہ ادارے کے ڈائرکٹر رھے۔ اسکے بعد ان کی خدمات کراچی یونیورسٹی کو دے دی گئیں اور ادارے کی سربراھی ڈاکٹر فضل الرحمان کو تفویض ہوئی۔ مرحوم پاکستان میں ممتاز مناصب پر فائز رھے۔ ان کا تعلق زیادہ تر تعلیم سے رہا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ھیں۔ حال ھی میں انھیں مقتدرہ قومی زبان کا چیئرمین مقرر کیا گیا تھا۔ معیاری "اردو کی بورڈ" کی تیاری میں ان کی کوششوں کا بڑا دخل ھے۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (مدیر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظـــرات

مجھے افسوس ہے اور میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں کہ صفر کا رسالہ بھی ارادہ کے مطابق مقررہ وقت پر یعنی تاریخ موعود یکم صفر کو پیش نہ کیا جا سکا ۔ اور یکم صفر کی بجائے رسالہ ۲۸ ۔ ۲۹ صفر کو حوالہ ڈاک کیا گیا ۔ جبکہ اس میں شامل مواد اسی کُل کا ایک جز تھا جو ۱۱ اکتوبر/۳۰ ذوالقعدہ کو پریس بھیج دیا گیا تھا اور جسے ابتدائی پروگرام کے مطابق یکم محرم کو شائع ہو جانا تھا ۔ ربیع الاول کا یہ شمارہ بھی اسی کل کا ایک جز ہے جسے نمبر کی صورت میں یکم محرم کو شائع ہونا تھا ۔ دیکھئے اس پر کیا گذرتی ہے اور یہ کب شائع ہوتا ہے ۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ربیع الاول کا شمارہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے جس کو صدی ھجری کی تقریب سے خصوصی شمارے کا درجہ دیا گیا تھا ۔ لیکن اس مہینے کی ایک خصوصی بات یہ بھی ہے کہ یہ ظہور قدسی کا مہینہ ہے ۔ اس مہینے میں وہ ہستی پیدا ہوئی تھی جس کے ذریعے اس زمین پر خدا کے دین ، اسلام کی تکمیل ہوئی ۔ جس کی زندگی اھل جہاں کے لئے اسوہ حسنہ قرار پائی ۔ جس نے دنیا کو جینے کا قرینہ سکھایا اور انسان کو اشرف المخلوقات کے شایان شان زیست کے آداب بتائے ۔ جس کی تعلیم رھتی دنیا تک حق و صداقت کی پہچان کے لئے معیار ہے ۔ اور جو عصر حاضر میں اعلی اخلاقی اقدار کا واحد سرچشمہ ہے ۔ جس کے پیغام میں عرب اور عجم کی وسعتیں گم ہو گئیں ۔ جس کی تعلیم مشرق و مغرب میں ایک نئے دور کا آغاز بنی ۔ جس کے

فرماں ہے اسود و احمر کے امتیاز کو مٹایا ۔ جس نے اس زمین پر آسمان کی بادشاہت قائم کی ۔ جس نے اللہ کی کتاب قرآن کو دستور حیات بنا کر اس کی اساس پر ایک ایسی امت کھڑی کی ، اس دنیا سے شر و فساد کو مٹا کر خیر و صلاح اور امن و سلامتی کا احیاء جس کا نصب العین ہے ۔ یہ امت گزشتہ ۱۴ سو سال سے بلا انقطاع تسلسل ہاتھ میں چراغ مصطفوی لیکر شرار بولہبی سے ستیزہ کار ہے ۔ اگر اس کے ہاتھ میں یہ چراغ نہ ہوتا تو وہ خود کب کی مٹ چکی ہوتی ۔ اس امت کو اپنے وجود کے لئے قیامت تک اس ہستی کی ضرورت رہے گی ۔ اس ہستی سے قطع تعلق اس امت کے لئے پیغام اجل ثابت ہو گا ۔ امت مسلمہ کو اپنی بقا کی جنگ میں جہاں سے تازہ بتازہ مدد مل سکتی ہے وہ اپنے قائد و پیشوا ، رہبر و رہنما ، ہادی و مقتدی ، احمد مجتبی ، محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً کے دئیے ہوئے اسلحہ خانے سے مل سکتی ہے ، جس کے ذخائر لا محدود ہیں ۔ اور جس کے گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

اس شمارے میں صدی ہجری تقریبات کا عکس بھی ہے اور عید میلادالنبی ﷺ کی روایت کا پر تو بھی ۔ ان دونوں کا تعلق چونکہ ایک ہی ذات سے ہے اس لئے ان میں باہم کوئی مغائرت نہیں ۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں ۔ اس لحاظ سے فکر و نظر کا یہ شمارہ صدی ہجری نمبر کا حصہ سوم بھی ہے اور سیرۃ النبی صلعم کی اشاعت خاص بھی ۔ اس شمارے کے دو مضامین ''کامل و کامیاب رہنما'' اور ''ختمی مرتبت کی سیرت کا معاشی پہلو'' اس اشاعت خاص سے راست تعلق رکھتے ہیں ۔

* * * * *

اسلامیہ یونیورسٹی ۔ اسلام آباد

گزشتہ دنوں صدر پاکستان جناب جنرل محمد ضیاء الحق نے اسلام آباد میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کا اعلان فرمایا تھا ۔ صدارتی حکم مجریہ ۱۰ نومبر ۱۹۸۰ء کے ذریعے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کو اور قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں پہلے سے قائم شریعہ فیکلٹی کو اسلامیہ یونیورسٹی کا حصہ قرار دے کر کام کا آغاز کر دیا گیا ہے۔

ابتدائی نقشے کے مطابق زیر تعمیر مسجد شاہ فیصل شہید مرحوم کے گرد کی عمارات کو ، جو کہ شروع ھی سے ادارۂ تحقیقات اسلامی کے لئے نشان زد کر دی گئی تھیں ، اسلامی یونیورسٹی کا مستقر قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ یہ عمارات ابھی تکمیل کے ابتدائی مرحلے میں ھیں اس لئے ادارہ بدستور اپنی پرانی جگہ پر اس وقت تک کام کرتا رہے گا جب تک کہ کیمپس کی تعمیر کا کام مکمل نہیں ہو جاتا ۔ البتہ شریعہ فیکلٹی کے بعض تدریسی شعبوں نے نئے مستقر میں کام شروع کر دیا ہے۔ ۳ جنوری ۱۹۸۱ء کو اسلامیہ یونیورسٹی کے ریکٹر جناب اے کے بروھی نے ایک سادہ اور پروقار تقریب میں نئے کیمپس میں ، اغراض و مقاصد کے اعتبار سے اپنی نوعیت کی اس منفرد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جس کی کارروائی اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔

اسلامیہ یونیورسٹی کے قیام سے ادارۂ تحقیقات اسلامی کی حیثیت میں جو ظاھراً تبدیلی آئی ہے اس پر ادارے کے اسکالروں اور دوسرے کارکنوں میں ملے جلے رد عمل کا اظہار کیا جا رہا ہے جو امید و بیم کی اس ابتدائی منزل میں

بالکل فطری بات ہے۔ اس تبدیلی کے بعد ادارے اور یونیورسٹی کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہوگی ۔ اس سوال کا جواب صدارتی حکمنامے میں موجود ہے ۔ یونیورسٹی میں شامل ہونے کے بعد بھی ادارے کا تشخص اور اس کی مستقل بالذات حیثیت برقرار رہیگی جسکا واضح مطلب یہ نکلتاہےکہ ادارےکے اصل کام کی نوعیت بھی بدستور باقی رہے گی ۔ ادارہ حسب دستور علمی اور تحقیقی مشاغل میں مصروف رہے گا ۔ البتہ بوقت ضرورت ، بقدر ضرورت اور بطور تعاون ادارہ کے جملہ وسائل یونیورسٹی کے تدریسی مقاصد کی تکمیل کے لئے وقف ہوں گے ۔

ہر چند کہ اسلامیہ یونیورسٹی اور ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے تعلق کی نوعیت کا ذکر اجمالاً صدر پاکستان کی طرف سے جاری شدہ آرڈیننس میں آ گیا ہے تاہم ضرورت ہے کہ تفصیلات کے لئے الگ سے قواعد و ضوابط مرتب کئے جائیں ۔ تاکہ حدود ، دائرہ کار ، حقوق ، فرائض اور اختیارات کے بارے میں کوئی ابہام نہ رہے ۔ غلام صدیق گھانگھرو مشیر قانون و افسر بکار خاص ، یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر این اے بلوچ اور ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے ڈائرکٹر ، ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا کے مشورہ سے اس سلسلے میں ایک اسٹیچیوٹ (Statute) تیار کر رہے ہیں ۔ جس میں اس تبدیلی کے بعد ادارے کی حیثیت ، اس کے کام کی نوعیت اور یونیورسٹی کے ساتھ اس کے تعلق کی صورتوں کا تعین کیا جائے گا ۔ ادارے کے قیام کا ایک مقصد تھا، وہ مقصد آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ پہلے تھا، اور ضرورت ہے کہ ادارہ اس مقصد کے لئے پہلے سے زیادہ تندھی اور مستعدی سے کام کرے ۔ ادارے کا ایک ماضی ہے ، اس کی اپنی تاریخ ہے ، اس کا حال اور مستقبل جبھی تابناک کہلا سکتا ہے کہ ماضی سے اس کا رشتہ منقطع نہ ہونے پائے ۔ صدارتی حکمنامہ ، جناب اے کے بروھی ، ڈاکٹر این اے بلوچ اور ڈاکٹر ہالے پوتا کی باتوں سے یہی مترشح ہوتا ہے

کہ اسلامیہ یونیورسٹی کے قیام سے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے اصل مقاصد کو تقویت ملے گی ۔ اس لئے ہم سمجھتے ھیں کہ یہ تبدیلی خود ادارے کے حق میں فال نیک ہے ۔

ادارے کے عام ملازمین کے سامنے اس تبدیلی کے بعد بالعموم ایک ھی سوال ہے اور وہ یہ کہ اس تبدیلی سے انہیں کوئی مالی فائدہ پہنچے گا یا نہیں، انہیں کچھ بہتر سہولتیں زیادہ حقوق و مراعات حاصل ھوں گی یا نہیں ، ان کی ملازمت محفوظ ھوگی یا نہیں ، ان کی شرائط ملازمت پر آئندہ اس تبدیلی کے کیا اثرات مرتب ھوں گے ۔ ادارہ اپنی تاریخ تاسیس سے لیکر اب تک کسی نہ کسی وجہ سے مسلسل بے یقینی کا شکار چلا آیا ہے جو نہ صرف ادارے کے کارکنوں کے لئے الجھن کا باعث تھا بلکہ اس سے ادارے کی کارکردگی بھی ھمیشہ متاثر ھوتی رھی ہے ۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ قناعت کی بجائے خوب سے خوب تر کی جستجو جاری رکھی جائے ۔ اس لحاظ سے ادارے کے عام ملازمین کا یہ رجحان کچھ بے جا نہیں ہے ۔ لیکن اسکالروں میں سینئر اور سنجیدہ ارکان کی سوچ اس سے قدرے مختلف ہے ۔ تحفظ اور بہتر شرائط ملازمت کے علاوہ انہیں جس بات کی زیادہ فکر ہے وہ یہ ہے کہ ادارہ کو علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کے لئے آئندہ بہتر ماحول اور زیادہ ساز گار فضا میسر آتی ہے یا نہیں ۔ اب تک ادارے کی شہرت اندرون ملک اور بیرونی ممالک میں اس کے علمی مزاج کی وجہ سے ھی رھی ہے ۔ اور اس کے اکیڈمک اسٹاف کی اکثریت ، جو نہ صرف یہ کہ اعلی تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل ہے بلکہ اس اختصاص کی بھی حامل ہے کہ اسکی اکثریت کو مجمع البحرین ھونے کا امتیاز حاصل ہے ، یعنی وہ بیک وقت تعلیم کے قدیم و جدید سرچشموں سے سیراب ھیں ، انہوں نے دونوں طرح کے تعلیمی اداروں سے جرعہ کشی کی ہے ، وہ ادارے کو ایک یونیورسٹی سے بہتر جگہہ سمجھ کر اس کے ساتھ وابستہ تھے ، قدرتی طور

پر ان کی یہ خواهش هوگی کہ اس تبدیلی کے بعد نئے سیٹ اپ میں انہیں مناسب اور شایان شان مقام حاصل هو۔

جہاں تک کہ عام حیثیت اور شرائط ملازمت کا تعلق ہے تو ادارے کو پہلے بھی یونیورسٹی کا درجہ حاصل تھا ۔ اصولی طور پر یہ بات طے شدہ سمجھی جاتی تھی کہ ادارہ اپنے معاملات میں قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے برابر ہے ۔ یہی نہیں اس کے مطابق عمل بھی هوتا رہا ہے ۔ ادارے کے عملے کو وهی تنخواهیں اور الاؤنس وغیرہ ملتا تھا جو قائداعظم یونیورسٹی میں رائج ہے ۔ بلکہ اب سے کچھ دنوں پہلے ان خطوط پر سوچا جا رہا تھا کہ ادارے کو سوپر یونیورسٹی کا درجہ دے کر پورے پاکستان بلکہ دنیائے اسلام کے لئے عصبی مرکز (Nerve centre) کی حیثیت دے دی جائے ۔ ادارے کو اس درجے تک پہنچانے میں ادارے کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر عبدالواحد هالے پوتا کی ان تھک محنت اور بے لوث خدمت کا بڑا دخل ہے ۔

جناب اے کے بروهی نے ۳ جنوری کی افتتاحی تقریب میں اسلامیہ یونیورسٹی کا جو تصور پیش کیا اور پاکستان میں موجود عام یونیورسٹیوں سے مختلف ، ممتاز اور منفرد نوعیت کی حامل جن خصوصیات کا ذکر اس کی نسبت کیا اس سے بجا طور پر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کو سوپر یونیورسٹی بنانے کا جو خواب اب سے کچھ عرصہ پہلے دیکھا گیا تھا اس کی تعبیر کا وقت آ گیا ہے ۔ هماری دعا ہے کہ اللہ تعالی حالات کو سازگار بنائے اور سوپر یونیورسٹی کے دیرینہ خواب کی تعبیر میں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اور اسکے وسائل اپنا بھرپور کردار ادا کریں ادارے کی افرادی قوت ،بیمثال لائبریری، شاندار پریس اور دوسرے شعبے سوپر یونیورسٹی کے لئے بنیاد کا کام دیں گے ۔ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے اس کے لئے سردست ایک کروڑ روپے

کی خطیر رقم کا فیاضانہ عطیہ دے کر اس یونیورسٹی کے قیام و استحکام کے امکانات کو مزید روشن کر دیا ہے۔ جناب اے کے بروھی جیسے اعلی دماغ کی رہنمائی ، ڈاکٹر این اے بلوچ جیسے تجربہ کار استاد اور فعال سربراہ کار کی سرکردگی میں امید واثق ہے کہ نہ صرف مجوزہ یونیورسٹی کا عظیم الشان منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا بلکہ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کو بھی اپنی بے پایاں صلاحیتوں کے لئے بہتر مصرف مل جائے گا ۔ اور ان صلاحیتوں کے بھرپور استعمال سے مجوزہ یونیورسٹی کے لئے علمی اور فکری غذا کا سامان مہیا ہو سکے گا ۔

(شرف الدین اصلاحی)

* * * * *

کامل و کامیاب رهنما

سید عبدالقدوس هاشمی

هم مسلمانوں کا ایمان تو یہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اللہ تعالی کے سچے رسول ، عبدِ کامل اور آخری نبی تھے ، اگر ان کی صدق دل سے اتباع نہ کی جائے تو نہ بندہ کی اللہ سے محبت معتبر ہے اور نہ کسی بڑے سے بڑے عابد و زاهد کو اللہ تعالی کی محبت حاصل ہو سکتی ہے۔ قرآن حکیم نے واضح طور پر اعلان کر دیا ہے کہ :

قل ان کنتم تحبّون اللہ فاتّبعونی یحببکم اللہ و یغفرلکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم ہ

سورة آل عمران آیة ۳۱

اے نبی لوگوں سے یہ کہہ دیجئے کہ اگر آپ لوگ اللہ تعالی سے محبت رکھتے ہیں تو صرف میری اتباع کیجئے ۔ اللہ تعالی بھی آپ سے محبت کرے گا اور آپ کے گناھوں کو بخش دے گا ۔ اور اللہ بڑا مغفرت کرنے والا اور بڑی رحمت والا ہے۔

اس آیت میں صیغۂ امر « فاتبعوا » کے ساتھ یائے متکلم واحد « نی » ہے اس لئے عربی زبان کے اعتبار سے کسی اور کی شرکت کا تصور باقی نہیں رهتا ۔

اسی لئے ہم سارے مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اتباع صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ہونی چاہئے ۔ ان کے سوا کسی کی اتباع سے اللہ کی محبت حاصل نہیں ہو سکتی ۔ ہم اللہ کے سارے ہی انبیاء علیہم السلام کی صداقت اور نبوت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اتباع کے لئے نمونہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس ہے جن پر نبوت کا سلسلہ تکمیل و اختتام کو پہنچ گیا ۔ اب ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں ہوگا ۔

یہ تو ہے ہم مسلمانوں کا یقین و ایمان لیکن جو لوگ مسلمان نہیں ہیں ان کے لئے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالی کی ایک رحمت کاملہ اور مکمل نمونہ زندگی ہیں ۔ ایسا مکمل نمونہ جس کی نظیر دنیا کی معلوم تاریخ میں کوئی دوسری نہیں ملے گی ۔ ہر انسان انپی زندگی کے ہر موقع پر آپ کی ذات کو اپنے لئے بہترین نمونہ مانے گا ۔ اگر وہ بے کسی اور کمزوری میں مبتلاء ہے تو اس حالت میں آپ کو طائف کے بازار میں دیکھ سکتا ہے ، اگر اسے اپنوں سے دکھ پہنچ رہا ہے تو وہ آپ کو مکہ مکرمہ میں خود اپنے ہی قبیلہ قریش اور چچا ابولہب کے ہاتھوں دکھ اٹھاتے دیکھ سکتا ہے ، اگر اسے حوصلہ شکن صورت حال سے گزرنا ہے تو وہ آپ کی مکی زندگی کا مطالعہ کرے ، اگر وہ مفلس و فاقہ کش ہے تو آپ کو مدینہ منورہ میں اور خصوصاً غزوۂ احزاب میں فاقہ کی حالت میں دیکھ سکتا ہے ، اگر وہ صاحب مال و متاع ہے تو سن ۹ ہجری میں مسجد نبوی میں مال و متاع کے ساتھ دیکھ سکتا ہے ، اگر وہ دشمنوں میں گھرا ہوا ہے تو آپ کو غزوۂ خندق میں دیکھ سکتا ہے ، اور اگر وہ شاہانہ جاہ و جلال رکھتا ہے تو آپ کو حجۃ الوداع میں دیکھ سکتا ہے کہ ایک لاکھ سے زیادہ افراد اشاروں پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار ہیں ، اگر کوئی فوجی سپہ سالار ہے تو آپ کو غزوۂ بدر میں دیکھ سکتا ہے ، غزوۂ احد اور غزوۂ حنین میں دیکھ سکتا ہے ، اگر وہ عدالت کا عہدہ دار ہے تو مدینہ منورہ میں

آپ کو انصاف کرتے اور عدل گستری فرماتے ہوئے دیکھ سکتا ہے ، اگر وہ فرماں روا ہے تو سن ۹ ھ و سن ۱۰ ھ میں مدینہ منورہ کے بے تاج بادشاہ کو نمونہ بنائے اور دیکھے کہ نو لاکھ ۲۷ ہزار مربع میل سے زیادہ رقبہ کا یہ فرمان روائے مطلق کس عاجزی اور فروتنی کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔

گھریلو زندگی میں بھی آپ نمونۂ کامل ہیں ۔ ازواجِ مطہرات ، بناتِ صالحات اور نواسے نواسیوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ دنیا کے ہر انسان کے لئے بہترین نمونہ ہے۔ دوستوں کے ساتھ احترام اور ہمدردی ، عزیزوں سے محبت اور صلہ رحمی ، کاروبار میں صداقت و دیانت ، یقین کی پختگی ، مقصد کے ساتھ بے پناہ وابستگی ، لب و لہجہ کی نرمی ، صاف گوئی اور بے رو رعایت عدل و انصاف ، غرض یہ کہ دنیا کے کسی آدمی کو کبھی ایسی کوئی صورت حال پیش نہیں آ سکتی جس میں راہ عمل کی تعیین کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ بہترین نمونہ ثابت نہ ہو سکے ۔ ہر اس وقت جب کہ ایک آدمی رہنمائی کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس وقت کیا کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں اسی طرح کا ایک واقعہ مل جاتا ہے اور آپ کے عمل سے رہنمائی حاصل ہو جاتی ہے۔

کسی شخص کی زندگی پر غور کیجئے ، آپ دیکھیں گے کہ اس کی زندگی اگر ایک رخ سے کامیاب ہے تو دوسرے رخ سے ناکام ہے ، آدمی کو کسی ایک رخ سے کامیاب ہونے کے لئے اپنے دوسرے رخ کو قربان کر دینا پڑتا ہے ، مثلاً ایک آدمی ہے جو سیاسی لیڈر ہونے کی حیثیت سے بڑا کامیاب نظر آتا ہے ، لیکن وہ اپنی سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے اپنے خاندان اور اپنے بال بچوں کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے ، وہ سیاسی لیڈر تو بہت کامیاب ہوتا ہے مگر اپنے بچوں کے

لئے اتنا ھی اچھا باپ اور اپنے ھمسایوں کے لئے اتنا ھی اچھا ھمسایہ نہیں ھوتا، اسی طرح ایک بہت بڑا فاتح اور جنگ آزما اتنا ھی اچھا عادل نہیں ھوتا ، ایک اعلی درجہ کا کامیاب تاجر اتنا ھی اعلی درجہ کا معلم اور عابد و زاھد نہیں ھوتا ، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی عجیب اور بے مثال زندگی ہے ، اسے جس پہلو سے دیکھو کامل و اکمل نظر آتی ہے ۔ غزوۂ بدر میں شاندار فتح حاصل ھوتی ہے ، ایسی شاندار فتح جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا ، لیکن اس فتح مبین کے بعد جب لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کو تلاش کیا تو وہ زمین پر سجدہ ریز اللہ تعالی کے شکر اور عاجزانہ دعاؤں میں مشغول ملے ۔ تاریخ میں فاتح تو جلوس ، اکرام ، اور اظہار جلال میں مشغول ملتا ہے ، اظہار عبودیت اور بندگی میں کہاں مشغول ھوتا ہے ۔

دنیا میں ھزاروں بڑے بڑے لوگ پیدا ھوئے ھیں جنھوں نے اپنے نفوس قدسیہ سے انسانوں کی رھنمائی فرمائی ہے لیکن سب کی سیرتوں میں یہ بات نمایاں نظر آتی ہے کہ انھوں نے دوسرے امور سے غفلت کی ۔ مثال کے لئے ایک مہاتما گوتم بُدھ کو لیجئے ، یقیناً یہ کوئی آسان کام نہیں کہ تلاش حق میں کوئی شخص راج گدی ، آرام و آسائش اور گھربار کو چھوڑ کر ویرانوں کی راہ لے ۔ لیکن سوال یہ پیدا ھوتا ہے کہ ماں باپ کا حق ، جوان بیوی کے حقوق اور معصوم بچے کی طرف توجہ کدھر چلی گئی ، ان کے حقوق سب ضائع ھو گئے ۔ یہ ایک مثال ہے ، دنیا کے سارے بڑے لوگوں کے احوال کو دیکھئے ، ایک طرف توجہ ھوئی تو دوسری طرف سے غفلت ھو گئی ۔ لیکن کمال ہے حضور صلی اللہ علیہ و سلم کی سیرت میں کہ آپ بڑے عبادت گزار بھی تھے اور بڑے ھی اچھے باپ اور نانا بھی ، بڑے کامل واکمل مذھبی پیشوا بھی تھے اور بڑے ھی کامیاب فاتح و منتظم بھی ، وہ مدینہ منورہ کے بے تاج فرماں روائے مطلق بھی تھے ۔ اور غریب بوڑھی بیوہ کے لئے جلانے کی لکڑیاں کاٹ کر اور اپنے سرمبارک پر اٹھاکر

بھی لے آتے تھے ۔ کیسی عجیب اور کتنی تابناک تھی یہ زندگی ؟

اب ذرا کامیابی کو دیکھئے ، آپ نے اپنے ممشن میں کیسی کامیابی حاصل فرمائی ۔ آپ نے جب دین اسلام کی طرف لوگوں کو بلایا تو سب سے بڑی مخالفت خود اپنے ھی قبیلہ سے دیکھی ۔ آپ کے پاس اپنی ذات ستودہ صفات کے سوا جاذب توجہہ کوئی چیز نہ تھی ، نہ آپ کوئی عظیم المرتبت فلسفی تھے ، نہ چابک دست صناع ، نہ کوئی شاہ زادے تھے اور نہ امیر ززادے ، نہ بڑی دولت آپ کے پاس تھی ، نہ خاندانی سپاہ ، حتی کہ گھرانے میں شاھی و شہنشاھی کی کوئی روایت بھی نہ تھی ۔ آخر کوئی آپ سے وابستہ ھوتا تو کیوں ھوتا ، وہ تمام اسباب جو دنیا والوں کو کھینچتے ھیں کوئی بھی تو موجود نہ تھے ۔ نہ آپ مہاتما بدھ کی طرح شاھزادے تھے اور نہ مہابیرجی کی طرح کوئی زورآور پہلوان اور راجکمار تھے ۔ نہ آپ کو حضرت موسی علیہ السلام کی طرح نسلی روابط سے مربوط بنی اسرائیل کی ایک بنی بنائی قوم ملی تھی اور نہ کسی قیصر و کسری کی حکومت آپ کی مدد کے لئے کبھی تیار ھوئی ، جو تھا وہ مخالف تھا ، اپنا قبیلہ مخالف تھا ، چچا ابولہب خون کا پیاسا ۔ خاندانی رشتہ و ناطہ کے لوگوں نے جنھیں ھم بنی کنانہ کے نام سے جانتے ھیں ، طایف میں جیسی پذیرائی کی وہ بھی ظاھر ہے ۔ بے کسی و بے بسی کا یہ عالم کہ آبائی شہر مکہ کو راتوں رات چھپ کر چھوڑنا پڑا ۔ بے زری کا یہ عالم کہ سفر ھجرت میں پہننے کے لئے ایک کرتا بھی پھوپھی کے بیٹے حضرت زبیر بن العوام نے دیا ۔ اس طرح وہ مدینہ منورہ میں جو اس وقت یثرب کہلاتا تھا ، آپ اپنے ایک رفیق حضرت ابوبکر الصدیقؓ کے ساتھ داخل ھوئے ۔ فاتح اور شہنشاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ستم زدہ اور مظلوم پناہ گیر کی حیثیت سے داخل ھوئے بھلا یہ کوئی تصور کر سکتا تھا کہ صرف نو دس سال کی مدت میں یہ سارے عرب کے نو لاکھ ۲۷ ھزار مربع میل سے زیادہ رقبۂ زمین اور بیس لاکھ سے

زیادہ آبادی کے فرماں روائے مطلق ہوں گے ـ اور اس اتنے بڑے رقبہ میں سے صرف چھ سات ہزار مربع میل رقبہ فوجی قوت کے ذریعہ آیا ہوگا باقی سارا ملک بغیر فوج کشی کے زیر نگیں آجائے گا ـ کیسی عجیب بات ہے کہ عروج و کامیابی کے جتنے اسباب دنیا میں ہوتے ہیں وہ بالکلیہ مفقود ہیں پھر بھی کامیابی و کامرانی ایسی بے مثال کہ تاریخ عالم اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے ـ معمولی بادشاہوں اور قسمت آزماؤں کو چھوڑیے ، بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبروں ، بانیان مذاہب اور فاتحین عالم کو لیجئے ـ کہیں کوئی نظیر نہیں ملتی ـ تاریخ انسانی کے عظیم الشان پیغمبر حضرت موسی علیہ السلام کو دیکھئے ، حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیاوی عمر صرف ٦٣ سال ملی اور حضرت موسی علیہ السلام ١٢٠ سال اس دنیا میں رہے ـ نبوت کے بعد حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ٢٢ سال اور تین ماہ زندہ رہے اور حضرت موسی علیہ السلام نے نبوت کے بعد ٦١ سال ، اور مصر سے بنی اسرائیل کو لے کر سینائی میں آنے کے بعد سے ٤١ سال تک فریضۂ تبلیغ و ارشاد ادا کرنے کے بعد ایک سو بیس سال کی عمر میں جب کہ جسمانی صحت سے پوری طرح بہرہ اندوز تھے ، موآب کی پہاڑی پر وفات پائی ـ حضرت موسی علیہ السلام کو نسلی مضبوط رابطہ میں مربوط ایک بنی بنائی قوم ملی ـ آسمان سے بادلوں کا سایہ اور زمین پر منّ و سلوی عطا ہوا ـ جاں نثاروں کی تعداد بھی بہ روایت کتاب مقدس چار لاکھ کے قریب تھی ـ لیکن اس طویل مدت میں بھی اوروشلم کی بیرونی چہار دیواری تک بھی بنی اسرائیل کے لوگ نہ پہنچ سکے ـ اس کے برخلاف سن ٦٢٢ء میں مکہ سے مدینہ کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی ـ صحابہ کی تعداد اتنی تھوڑی تھی کہ دو سال کے بعد میدان بدر میں صرف ٣١٣ جاں نثار جمع ہو سکے ، ہجرت کے بعد سے آٹھ سال کے عرصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ١٠٣ بار ہتھیار بدن مبارک پر سجا کر

تیار ہونا پڑا ۔ مخالفت ایسی شدید تھی کہ ۳۳ بار فوجی دستے بھیجنے پڑے جنہیں اسلامی تاریخ میں سرایا کہا جاتا ہے۔ ۱۷ غزوات میں خود بنفس نفیس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت فرمائی ۔ زخمی ہوئے اور تکلیفیں اٹھائیں ۔ اپنوں سے مخالفتیں ملیں اور غیروں سے عداوتیں ۔ بے زری اور افلاس کا یہ عالم کہ فاقے سہے ، پیٹ پر پتھر باندھ کر غزوۂ خندق میں اپنے سر مبارک پر مٹی کے ٹوکرے اٹھائے ۔ بنی بنائی ، مربوط و مطیع قوم تو کیا ملتی لٹیرے ، لڑاکو ، کینہ توز اوربدکردارلوگوں سے واسطہ پڑا ۔ اور ان ھی میں سے انسانیت کے جواھر پارے بنائے ۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ جیسے رھنما پیدا کئے ۔ خالدؓ اور عمروؓ جیسے مجاھد تیار کئے ، نسل و قبیلہ کے فرق مٹائے ، اور عرب کے ۳۷۳ آزاد قبیلوں کی آزاد و باھم دیگر متحارب حکومتوں کو توڑ کر مدینہ منورہ کی ایک وحدانی حکومت پیدا کر دی ۔ اور اس شان کی حکومت پیدا کر دی کہ اس حکومت نے آئندہ کے صرف ۲۵ سال کے اندر دنیا کے ۳۵ لاکھ مربع میل رقبہ کو امن و امان عطا کر دیا ۔

اسلامی تحریک نہ صرف ایک سیاسی تحریک تھی ، نہ صرف معاشی اور نہ صرف اخلاقی بلکہ یہ ایک ایسی تحریک تھی جو انسانی زندگی کے ھر پہلو پر اثرانداز تھی ، اخلاق ، قوانین خاصہ ، قوانین عامہ ، نسل و وطن سے وابستگی اور ایمان و یقین ھر چیز کو بالکلیہ بدل رھی تھی ۔ اس لئے ھر طرف سے اس کی مخالفت ھوئی ، عرب بت پرستوں کی طرف سے ، اھل کتاب کی طرف سے ، اھل حکومت اور تاجداروں کی طرف سے ، پروھتوں اور راھبوں کی طرف سے، مدعیان علم و ھنر کی طرف سے ، اور ان ساری مخالفتوں سے نبٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نو لاکھ ۲۷ ھزار مربع میل سے زیادہ رقبہ پر ایک منصفانہ نظام قایم کر دیا ۔ انسان کو ھر مروجہ مذھب کے خلاف یہ یقین عطا کیا کہ انسان پیدائشی گناھگار نہیں بلکہ پیدائشی معصوم ہے وہ خود اپنے ارادہ

سے بلوغ کے بعد اپنے آپ کو گناھگار بنا لیتا ہے۔ وہ اللہ کا پیارا ہے۔ اس کو اپنے خالق سے رابطہ قایم کرنے کے لئے کسی پاپا و پروھت کی ضرورت نہیں ۔ یہ پیغام اس قدر انقلابی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ھاتھ سب کے خلاف اور سب کے ھاتھ ان کے خلاف اٹھے ، جنگیں ھوئیں ، لیکن اس شان کی جنگیں جن میں نہ کسی راھب کو دکھ دیا گیا ، نہ کسی عورت کی آبرو لوٹی گئی ، نہ کسی بوڑھے کو ستایا گیا اور نہ کسی بچہ کو ذبح کیا گیا ۔ پھر بھی اتنا بڑا رقبہ فتح ھو گیا اور اس کی قیمت صرف ایک ھزار کے قریب جانوں کی شکل میں ادا ھوئی ، اس تعداد میں کافر مقتولین بھی داخل ھیں اور مسلمان شہداء بھی ۔ عمل کی دنیا میں دیکھئے صرف دو آزاد حکومتوں کو توڑ کر ایک بنانے میں کیا تباھی آتی ہے ، کیسا قتل عام ھوتا ہے ، اور کیا کیا نہیں ھوتا ، لیکن یہاں ایک نئی قوم پیدا ھوئی ، وحدانی حکومت بنی ، ۳۷۳ آزاد حکومتیں مٹ گئیں اور نقصان صرف ایک ھزار جانوں کا ھوا ۔ ایسی کامیابی قیصر و کسری ، دارا و سکندر ، اور گپتا واسوکا کی دنیا میں کون پا سکتا ہے ؟ حق یہ ہے کہ محمد رسول اللہ، اللہ کے کامل عبد ، اور کامیاب ترین رھنما تھے ، صلی اللہ علیہ و سلم ابداً ۔

ختمی مرتبت کی سیرت کا معاشی پہلو

محمد اختر مسلم

رمضان کے مہینہ کا تعارف کراتے ہوئے اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں صرف اتنا فرمایا کہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جسمیں قرآن حکیم نازل ہوا۔ ۔ عظمت و احترام کے تمام گوشے ان تین چار لفظوں میں یوں سمٹ کر آ گئے ہیں جیسے آسمان کی لامحدود وسعتیں آنکھ کے تل میں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ اسی طرح ربیع الاول کے مہینہ کا تعارف کرانا مقصود ہو تو صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ وہ مبارک مہینہ ہے جس میں انسانیت کاملہ کی مظہر وہ ذات قدسی صفات دنیا میں تشریف لائی جس کے سینۂ پُرنور کو قرآن حکیم کا مہبط بننا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور ربیع الاوّل ایک ھی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ھی تصویر کے دو رخ ھیں۔ اس لئے کہ نہ تو قرآن حکیم کو ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم سے الگ کیا جا سکتا ہے اور نہ ھی رسالت محمدیہ ھی کسی طرح قرآن سے جدا ہو سکتی ہے۔ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے تذکار جلیلہ کی اھمیت ایسی ہے کہ سال کے ہر مہینہ اور ہر مہینہ کے ہر دن اور ہر دن کے ہر لمحہ میں اس کے مختلف پہلوؤں کو اقوام عالم کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے اور پیش کیا جانا چاھئے۔ کیونکہ حضور پُرنور نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ انسانیت کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بالکل ایک عام انسان کی طرح گزارا۔ بہر حال یہ بھی غنیمت ہے

کہ سال میں ایک مرتبہ تو اس تذکرہ مقدسہ کے لئے محفلیں منعقد کی جاتی ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ اس ذات اقدس کا پیغام دنیا کے کونے کونے تک پہنچ جائے ۔ مگر ان میں سے بیشتر محفلیں اس نوعیت کی ہوتی ہیں جن میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ میاں نے کس طرح حضرت آدم کا پتلا تیار کیا اور پھر کس طرح نور محمدی مختلف انبیاء میں منتقل ہوتے ہوتے بطن آمنہ تک پہنچا ۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد سلسلہ کلام ختم کر دیا جاتا ہے ۔ یعنی جہاں سے سلسلہ کلام کا آغاز ہونا چاہئے تھا وہاں اس کا اختتام ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ نور محمدی کی ضوفشانیوں اور ضیا سامانیوں کی بدولت ہی ساری کی ساری انسانیت قرون مظلمہ کی تاریکیوں سے نکل کر علم و عرفان کی روشنی حاصل کر سکی ۔ اس کے برعکس دوسری قسم کی محفلیں وہ ہیں جن میں دنیا بھر کی عجائب پرستیوں کو اس ذات گرامی سے منسوب کیا جاتا ہے جو علم و بصیرت کی انتہائی بلندیوں پر فائز تھی اور جس کی بعثت کا ایک عظیم مقصد دنیا سے جہالت و توہم پرستی کو ختم کرنا تھا ۔ بہت کم محفلیں ایسی دیکھنے میں آئیں گی جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ وہ بھٹکی ہوئی انسانیت کے لئے مشعل راہ کا کام دے سکے ۔ حالانکہ یہی وہ مقصد عظیم تھا جس کی خاطر قرآن حکیم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو بین الدفتین محفوظ کر دیا ۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح بعض کم شناسوں نے یہ سمجھ لیا کہ نبی اکرمؐ محض ایک چٹھی رساں تھے جن کا فریضۂ منصبی یہ تھا کہ خدا کا مراسلہ طویل و قصیر کی قید سے قطع نظر بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیں، اسی طرح دوسرے گروہ نے اسی چیز کو باعث عز و شرف سمجھ لیا کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ حضور نے جو کچھ کیا وہ ان مافوق الفطرت قوتوں کی وجہ سے کیا جو حضور کے لئے مختص تھیں اور اس میں ان کی ذاتی جد و جہد

اور شخصی کاوشوں کا کوئی دخل نہ تھا ۔ حالانکہ حضور ختمی مرتبتؐ کا ایک
عام انسان کی طرح تلاش حق میں سرگرداں رہنا اور اس جد و جہد میں اس
ذات گرامی کا شغف و انہماک ھی اللہ تعالی کی طرف سے ان کی پسندیدگی و
انتخاب کا باعث ہوا ۔ و وجدک ضالاً فھدی (القرآن الحکیم) ھم نے تجھے تلاش
حق میں سرگرداں پایا تو تجھے راستہ دکھایا ۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ختمی
مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی امت کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ)
بننے کی بجائے ایک ایسی دل فریب وادی نظر آنے لگی جو بظاھر حسین ہے مگر
اس میں کسی انسان کا گزر بسر ناممکن ھی نہیں بلکہ محال ہے ۔ سیرت
محمدیہ کے ساتھ امت مسلمہ کی یہ ناانصافی ناقابل معافی ہے ۔

حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو دو ادوار
میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ ایک مکی زندگی کا دور ہے دوسرا مدنی زندگی کا ۔
مکی زندگی ترجمان ہے ان تکلیفوں ، صعوبتوں اور مشکلات کی جو پیغامبر حق کو
خدا کا پیغام پہنچانے اور اسلامی خطوط پر ایک انسانی معاشرہ قائم کرنے کے
سلسلے میں پیش آئیں ۔ اسی طرح مدنی زندگی اس دور کی ترجمان ہے جب آپ
ایک معاشرہ کے سربراہ تھے ۔ یہ نسبتاً خوشحالی و فراغت کا دور تھا ۔ مگر اس
آزادی کی نعمت کی حفاظت کی جد و جہد میں کچھ کم مصائب حائل نہیں
ہوئے ۔ چنانچہ حضور کو حفاظت خوداختیاری کے لئے بہت کچھ کرنا پڑا ۔
جنگیں پیش آئیں ۔ جینے کے لالے پڑ گئے ۔ محاصروں اور ناکہ بندیوں اور
اندرونی سازشوں کے طوفان اٹھ کھڑے ہوئے ۔ اور اس کے ساتھ ایک زندہ
سوسائٹی کے نت نئے مسائل ۔ ایک لمحہ کے لئے فرصت میسر نہ ہوتی تھی ۔ اور
آپ ہر لمحہ کسی نہ کسی الجھن کو سلجھانے میں مصروف نظر آتے ھیں ۔
چنانچہ مدنی دور میں بھی آپ نے جس انداز کی زندگی بسر کی ہے کتب تاریخ
و سیر اس پر کافی روشنی ڈالتی ھیں ۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم سیرت النبی

میں لکھتے ھیں کہ :۔

مصنفین یورپ کا عام خیال ہے کہ آنحضرت جب تک مکہ معظمہ میں تھے تو پیغمبر تھے مدینہ پہنچ کر پیغمبر سے بادشاہ بن گئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ تمام عرب کے زیر نگین ہو جانے پر بھی فاقہ کش رہے۔ صحیح بخاری باب الجہاد میں یہ روایت ہے کہ وفات کے وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس ۳۰ صاع جَو پر گروی تھی۔ جن کپڑوں میں آپ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تمام عرب حدود شام سے لیکر عدن تک فتح ہو چکا تھا۔ اور مدینہ کی سرزمین میں زر و سیم کا سیلاب آ چکا تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ھیں۔

"ولا یطوی له ثوب" کبھی آپ کا کوئی کپڑا (یا جوڑا) تہہ کرکے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جوڑا کپڑا ہوتا تھا دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہہ کرکے رکھا جا سکتا۔ گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا اور رات کو تو اکثر آپ اور سارا گھر بھوکا سوتا تھا۔ کان یبیت اللیالی المتتابعة طاویاً ھو و اھله لا یجدون عَشاءً۔ آپ اور آپ کے اھل و عیال مسلسل کئی رات بھوکے رہ جاتے کیونکہ رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔ پیہم دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ حضرت عائشہ نے جب ایک موقعہ پر یہ واقعہ بیان کیا تو عروہ بن الزبیر نے پوچھا کہ آخر گزارہ کس چیز پر تھا۔ بولیں پانی اور کھجور پر۔ البتہ ہمسائے کبھی کبھی بکری کا دودھ بھیج دیتے تھے تو پی

لیتے تھے ۔ آپ نے تمام عمر کبھی چپاتی کی صورت نہیں دیکھی

میدہ کبھی نظر سے نہیں گذارا ۔ سہیل بن جواس واقعہ کے راوی ہیں ان سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا آنحضرت کے زمانے میں چھلنیاں نہیں تھیں ۔ بولے نہیں ۔ لوگوں نے کہا پھر کس چیز سے آٹا چھانتے تھے ۔ بولے منہ سے پھونک کر بھوسی اڑا دیتے تھے جو رہ جاتا تھا اسے گوندھ کر پکا لیتے تھے ۔

ام المومنین حضرت عائشہ فرماتی ھیں کہ تمام عمر یعنی مدینہ کے قیام سے لیکر وفات تک آپ نے کبھی دو وقت سیر ھو کر روٹی نہیں کھائی ۔ ایک دفعہ ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ھوا کہ سخت بھوکا ھوں ۔ آپ نے ازواج مطہرات میں سے کسی کے ھاں کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو بھیج دو ۔ جواب آیا گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں ۔ آپ نے دوسرے گھر کہلا بھیجا ۔ وھاں سے بھی یہی جواب آیا ۔ مختصر یہ کہ کسی گھر میں پانی کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی ۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ھوا تو دیکھا کہ آپ نے شکم کو کپڑے سے کس کر باندھا ہے ۔ سبب پوچھا تو حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ بھوک کی وجہ سے ۔ غزوۂ خندق میں کفار کی ناکہ بندی کے باعث مدینہ میں اناج بے حد کمیاب تھا ۔ اور لشکر اسلام میں بھوک کا دور دورہ تھا ۔ ایک موقعہ پر دو صحابہ نے پیٹ کھول کر دکھایا ، ایک ایک پتھر بندھا تھا ۔ آپ نے شکم کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر تھے ۔

اللہ اکبر ! سردار دو جہاں نے اپنی حکمرانی کے زمانے میں بھی عام زندگی سے ھٹ کر یعنی عامة المسلمین کی زندگی اور ان کے معیار سے برتر اور بہتر زندگی کو اختیار نہ فرمایا ۔ ھمیشہ عام لوگوں سے کم تر درجہ کے مادی

وسائل قبول کئے ۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی زندگی انتہائی عسرت کی بلکہ فقر و فاقہ کی زندگی تھی ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ کی زندگی کا نقشہ ایسا کیوں تھا ۔

عام طور پر بتایا جاتا ہے کہ حضورؐ نے اپنے لئے فقر و فاقہ کی زندگی کو ھی پسند کیا تھا ۔ کیونکہ مرفہ الحالی اور فارغ البالی کی زندگی سے آپ کو نفرت تھی ۔ لیکن ذرا سے غور پر یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس قسم کی عسرت و افلاس اور فقر و فاقہ کی زندگی جو رھبانیت کی دوسری شکل ہے اسلام کی روح کے سراسر منافی ہے۔ لہذا اس کی مذکورہ بالا توجیہ صحیح قرار نہیں پا سکتی ۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام حسنۃ الدنیا اور حسنۃ الآخرۃ کے حصول کی دعا مانگا کرتے تھے ۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کے لئے اس دنیا میں اچھی زندگی کی خواھش معیوب نہیں ۔ مگر وہ اپنے لوگوں سے برتر زندگی بسر کرنا پسند نہ فرماتے ۔ رھبر حقیقی کا یہی شیوہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے متبعین سے کبھی اپنے آپ کو بلند رکھنے کی کوشش نہیں کرتا ۔ چنانچہ سادگی اور شئے ہے ، اور فقر و فاقہ ایک دوسری شئے ۔ اس کی توجیہ بالکل صحیح توجیہ اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک وہ مقصد ھمارے سامنے نہ ہو جسے قرآن حکیم نے آپ کے لئے متعین کیا ہے۔ اور جسے ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم بروئے کار لانا چاھتے تھے ۔ قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جس میں محروم افراد معاشرہ کے بوجھ کی تمام تر ذمہ داری نظام معاشرہ پر ہو اور یہ نظام معاشرہ وھی ہے جسے عام طور پر مدنی دور حکومت کہا جاتا ہے۔ وہ دراصل اسی قسم کے معاشرے کے قیام کی اولین کوشش تھی ۔ سطح بیں نگاھیں لاکھوں مربع میل پر مشتمل حکومت اور اموال خراج و غنیمت تو دیکھتی ھیں ، لیکن انہیں وہ ذمہ داریاں دکھائی نہیں دیتیں جو اس معاشرے کے ناظم کے سر پر عاید تھیں ۔

ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر اس لاکھوں میل کی مملکت کے دائرے میں بسنے والے لاکھوں افراد تھے جنھیں کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا بہم پہنچانے کا مسئلہ تھا ۔ اس نظام کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا رحمت للعالمین اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے ۔

اس نوزائیدہ مملکت کے ذرائع اور محاصل قطعاً اس کے مکتفی نہیں ہو سکتے تھے کہ تمام افراد بہ ہمہ وجوہ فارغ البالی اور خوشحالی کی زندگی بسر کر سکتے ۔ اور چونکہ اس نظام میں مملکت کا سب سے بڑا رکن اپنا پیٹ اس وقت بھرتا ہے جب اسے اطمینان ہو جائے کہ تمام افراد مملکت نے پیٹ بھر کر کھا لیا ہے اور لباس اس وقت پہنتا ہے جب اسے یقین حاصل ہو کہ ہر فرد معاشرہ کو تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا میسر آ چکا ہے اس لئے اس کی اپنی زندگی بھی مملکت کے غریب ترین فرد کی زندگی ہوتی ہے ۔ یہ زمانہ تو پھر بھی مملکت کے آغاز کا دور تھا ۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں جب سلطنت کی حدیں دور دراز تک پھیل چکی تھیں خود خلیفہ کے تہہ بند میں بارہ پیوند نظر آتے تھے ۔ انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ عمر گیہوں کی روٹی اس وقت کھائے گا جب اسے یقین ہو جائے کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے ۔ اور حضرت ابوبکرؓ کو اس قدر یارا نہ تھا کہ وہ اپنی خواهش کے مطابق معمولی حلوہ کھا سکیں ۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں افراد مملکت کو روٹی ملنے لگی تھی ۔ لیکن جو کی ، گیہوں کی نہیں ۔ اسی لئے خلیفۃ المسلمین جو کی روٹی کھا لیتے تھے ۔ اور حضرت علیؓ کی سادگی تو اس باب میں ضرب المثل کا حکم رکھتی ہے ۔ ع

کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تمام افراد معاشرہ کو پیٹ بھر کر روٹی نہیں مل سکتی تھی ۔ جب حالات ایسے تھے تو سربراہ مملکت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی فاقے کرنا پڑتے تھے ۔ یہ ہے صحیح توجیہ اس حقیقت کی کہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم حاکم وقت ہونے کے بعد بھی انتہائی عسرت کی زندگی کیوں بسر کرتے تھے ۔ یہ رھبانیت و خانقاھیت کے فقر و فاقے نہیں تھے ۔ بلکہ خدائی نظام کے داعی کی ذمہ داریاں تھیں جو انہیں اپنا پیٹ بھرنے سے روکتی تھیں ۔ آپ غور فرمائیے کہ اس توجیہ سے بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے اور اگر اس حقیقت کو اس پس منظر میں پیش کیا جائے تو حضور کا یہ اسوہ ستائی ہوئی انسانیت کے لئے کس طرح سامان زیست مہیا کرنے کا ضامن بن جاتا ہے ۔

اس سلسلہ کی اگلی کڑی وہ روایات ھیں جن میں بتایا گیا ہے کہ مرض الموت کے ایام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سات دینار تھے اور حضور فرماتے تھے کہ انہیں صدقہ کر دو ۔ لیکن اس کے بعد حضور پر غشی طاری ہو گئی اور سب لوگ آپ کی تیمارداری میں مصروف ھو گئے ۔ آپ کو ھوش آیا تو فرمایا کہ وہ دینار لے آؤ ۔ دیناروں کو حضور نے اپنے ھاتھ پر رکھ کر فرمایا ۔ محمد کا اپنے رب پر کیا گمان ھوگا جبکہ وہ اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ ھوں ۔ پھر حضور اکرمؐ نے انہیں خود صدقہ کر دیا ۔ آپ کا یہ عمل بھی درھم و دینار سے راھبانہ نفرت کا مظاھرہ نہیں تھا ۔ بلکہ قرآن حکیم کی اس تعلیم کا آئینہ دار تھا جس کی رو سے فاضل دولت کے وجود کا تصور ھی نہیں کیا جا سکتا ۔ یعنی کسی شخص کے پاس اس کی ضروریات سے زائد دولت رہ ھی نہیں سکتی ۔ قرآن حکیم کے اسی حکم کا نتیجہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاضل دولت کبھی اپنے پاس نہیں رکھی ۔

ام المومنین حضرت عائشہ فرماتی ھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ درھم چھوڑا نہ دینار ، نہ بکری نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی (رواہ مسلم) ان اخلاق کو حضور کی عادیات میں شمار کرنا کسی طرح درست نہیں ۔ بلکہ یہ قرآن حکیم کے اس نظری فارمولے کے عین مطابق ہے جس میں یہ ارشاد ھوتا ہے کہ بیشک انسان ضرور باغی اور نافرمان ھو جاتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ امیر ھو گیا ہے ۔

بعض سیرت نگار اور واعظ حضرات بیان کرنے کو تو بعض روایات کو بڑی خوش الحانی کے ساتھ بیان کر دیتے ھیں لیکن اس کے بعد اس احساس سے گھبرا اٹھتے ھیں کہ اگر کسی نے یہ پوچھ لیا کہ جب سنت رسول اور اسوۂ حسنہ یہی ہے تو پھر آپ حضرات کس طرح کہتے ھیں کہ اسلام میں بے حد و حساب دولت جمع کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے اور نہ ھی ملکیت زمین پر ۔ بلکہ بعض نام نہاد عالم یہ کہنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ مسلمان چاہے تو ساری دنیا کی دولت خرید لے اس پر کوئی قدغن نہیں ۔ چنانچہ اس مخمصے سے نکلنے کے لئے وہ اس نوع کی توجیہات پیش کرنے لگ جاتے ھیں کہ یہ احکام تو حضور کی ذات کے لئے مخصوص ھیں عام مسلمانوں کے لئے نہیں ۔ یا پھر تاویل کے ذریعے یوں مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جس قسم کی مثالی زندگی اللہ کا رسول بسر کرتا ہے اس تک پہنچنا افراد امت کے بس کی بات نہیں ۔ یہ توجیہات اس کشمکش سے نکلنے کی ناکام کوششیں ھیں جو حضور اکرمؐ کی حیات طیبہ کے مذکورۂ بالا نقشہ اور واعظان کرام کے پیش کردہ تصور مذھب کے تضاد کا منطقی نتیجہ ہے ۔ قرآن حکیم کا ھر طالب علم جانتا ہے کہ دو چار احکام حضور کی ذات سے مختص تھے ۔ اور عامة المسلمین ان احکام کے مکلف نہیں ۔ (مثلاً ازواج مطہرات کا تعدد وغیرہ) ۔ ان کی صراحت قرآن حکیم کے اندر موجود ہے ۔ اگر مذکورۂ بالا

روایات کے احکام بھی ختمی مرتبت کی ذات سے مختص ہوتے تو ان کا ذکر بھی قرآن حکیم میں ضرور آتا ۔ چونکہ قرآن حکیم میں ان کا کوئی ذکر نہیں اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ یہ احکام حضور کی ذات ھی سے مختص تھے ۔ اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ جس راستہ پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چلتے تھے اس راستہ پر چلنا ممکن نہیں ۔ اگر اس کا اتباع ناممکن تھا اور ہے تو پھر اسوۂ حسنہ کی متابعت کو فرض عین قرار دینے کا مقصد ؟ اگر ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو امت کے لئے اسوہ حسنہ نہیں بننا تھا تو پھر کتاب کے ساتھ رسول بھیجنے کی کیا ضرورت تھی ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن حکیم اس لئے نازل کیا گیا کہ وہ بشری تقاضوں میں ھمارے جیسے تھے ۔ قل انما انا بشر مثلکم ۔ اور ان پر وحی اس لئے نازل کی گئی کہ وہ اسوۂ حسنہ کو قرآنی آیات کی تشریح و تفسیر کا عملی نمونہ بنائیں ۔

در حقیقت واعظوں کے ھاں یہ کشمکش اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ ان حضرات کے سامنے قرآن حکیم کا وہ نظام نہیں جسے عملاً متشکل کرنے کے لئے احمد مجتبی محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور جس کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی ۔ جس نظام میں فاضل دولت کسی فرد کے پاس رھتی ھی نہیں اسمیں جائدادیں بنانے یا زر و سیم کے ڈھیر ترکہ میں چھوڑنے کا سوال ھی پیدا نہیں ہوتا ۔ حضور کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ

و وجـــــدک عـائـــلاً فـاغنـی

(ھم نے تجھے مفلوک الحال پایا پھر غنی بنایا)

حضور اکرم صلی اللہ عیلہ وسلم کو یہ تونگری ھماری محترم ماں حضرت خدیجہ کے ساتھ نکاح کرنے کے سلسلہ میں میسر ہوئی جو تجارت کرتی تھیں اور مکہ کے مشہور تجار میں شمار ہوتی تھیں ۔ مگر اس کے ساتھ

ساتھ حضور کی یہ جاں نثار بیوی تن من دھن سے حضور کی خدمت کرنا اپنے
ئے سعادت خیال فرماتی تھیں ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دولت کہاں گئی ۔
یا حضور علیہ الصلوۃ والسلام نعوذ باللہ اتنے بھی ہوش مند نہ تھے کہ آجکل
ے تاجروں کی طرح اپنے مال، میں اضافہ کرتے ۔ حالات اور واقعات اس بات کی
ردید کرتے ہیں کہ حضور کو اللہ تعالی نے ایسی تاجرانہ فہم عطا فرمائی تھی
ہ شاید و باید ۔ مگر یہ دولت حضور نے عوام کی بھلائی کے لئے ان میں تقسیم
ر دی ۔ احادیث میں ذکر آتا ہے کہ حضور دولت کو غریبوں میں تقسیم کرنے میں
ز آندھی سے بھی زیادہ تیز تھے ۔

آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ قرآنی معاشرہ کی لازمی شق
نہیں کہ اس میں سربراہ مملکت اور دیگر ارباب حل و عقد کی زندگی فقر و
فاقہ اور عسرت و افلاس کی زندگی ہوگی ۔ اس کی لازمی شق یہ ہے کہ اس
میں ان ذمہ دار حضرات کا معیار زیست وہی ہوگا جو ملک کے عام افراد کا ہوگا۔
جـوں جوں عوام کا معیار بلند ہوتا جائیگا "خواص" کا معیار بھی بلند ہوتا
جائیگا ۔ اس میں ہر قسم کی آسائشیں اور فراوانیاں پہلے عوام کے لئے مہیا
کرنی ہونگی ، جب یہ آسانیاں عوام کو میسر آ چکیں گی تو ان "خواص" کے
لئے بھی جائز قرار پا جائیں گی ۔ یہ تھا معاشرہ کا وہ نقشہ جسے محمد رسول
اللہ ﷺ نے قائم کرکے دکھایا ۔ لیکن جسے اس تصور مذہب نے جو ہمارے دور
مفاد پرستی کی پیداوار ہے "روحانی" دنیا کا خواب کہکر ہماری عملی زندگی
سے اوجھل کر دیا ۔ اور اس کے بعد اس معاشرہ کے فقط تذکرے واعظوں کی زبان
ر رہ گئے تاکہ وہ مفلس اور نادار لوگوں کو یہ کہہ کر افیون کھلاتے رہیں کہ
م اس غریبی و ناداری سے قطعاً ملول خاطر نہ ہو یہ زندگی تو وہ ہے جسے
مت کے سردار خدا کے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا ۔ نتیجہ
س کا یہ ہے کہ دولت چند خاندانوں میں سمٹ کر جمع ہو رہی ہے اور کچھ

لوگ نان شبینہ تک کے محتاج ھیں۔

اسلامی ریاست میں دجلہ کے کنارے کا کتا بھی پیٹ بھر کر کھانے کا حق دار ہے اور یہ کیفیت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک مملکت ان خطوط پر متشکل نہ ہو جنہیں قرآن حکیم نے متعین کیا اور جن پر ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے ھاتھوں، باتقدس ھاتھوں نے دین کی عمارت استوار کی۔

خلافت ارض اور علم الاسماء کی نسبت سے

پندرھویں صدی ھجری میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں

(۲)

محمد شہاب الدین ندوی

تسخیر اشیاء اور باطنی نعمتیں :

بیان چل رہا تھا سائنسی علوم کے پھیلاؤ اور ان کے مسائل و مباحث کی وسعت کا ۔ تو غور فرمائیے کہ یہ تمام علوم، یہ تمام چیزیں اور یہ تمام مسائل و مباحث سوائے علم الاسماء کی تفصیل کے اور ھیں کیا ؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان چیزوں (مادہ و توانائی کے آثار و خواص) کو مسلمان محقق اور سائنس داں دریافت کرتے تو ان کے نام بھی وہ اپنی زبان میں کچھ اور رکھتے، جس کی وجہ سے شاید وہ اجنبیت دکھائی نہ دیتی جو آج نظر آرہی ہے(۱) ۔ اور دوسری حیثیت سے وہ علوم و فنون کے میدان میں بھی اقوام عالم کی رھبری کرکے پوری دنیا کے امام بنتے ۔ جیسا کہ بغداد کے دور عباسی اور مسلم اسپین کے دور اموی میں ہم کو نظر آتا ہے ۔

---

۱ ۔ اگرچہ علوم و فنون کی اصطلاحوں کے مترادفات ھماری زبان میں بھی وضع کر لئے گئے ھیں، مگر جس رفتار سے سائنسی علوم کی ترقی ہو رہی ہے اس رفتار سے وضع اصطلاحات کا کام نہیں ہو پا رہا ہے ۔ اور پھر بہت سی اصطلاحیں فرسودہ اور ناکارہ معلوم ہوتی ھیں ۔ اس بنا پر اکثر ہو بہو انگریزی اصطلاحات کے استعمال ھی کو ترجیح دینی پڑتی ہے ۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اصل معاملہ محض اصطلاحات کا بھی نہیں ہے بلکہ صحیح معنی میں ان علوم کے غیر دینی یا غیر ضروری ہونے کا تصور ہے ۔ جب تک ''علم،، کی تقسیم کا یہ تصور نہیں بدلے گا کوئی حقیقی تبدیلی نہیں آسکتی ۔

انسان کو علم اسمائے کائنات دئے جانے کا بنیادی مقصد — جیسا کہ تفصیل گزر چکی — مظاہر کائنات سے تعارف حاصل کرکے ان میں ودیعت شدہ فوائد سے مستفید ہونا اور خلافت ارض کے میدان کو سر کرنا ہے۔ اللہ تعالی نے ان مظاہر و موجودات میں انسان کے لئے بے شمار فوائد اور عجیب و غریب نعمتیں ودیعت کردی ہیں جو اس کی ربوبیت و رحمانیت کا بھی حیرت انگیز مظہر ہیں۔ قرآن حکیم میں صاف صاف فرمادیا گیا ہے :

الم ترا ان اللہ سخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض واسبغ علیکم نعمہ ظاھرۃ و باطنۃ : کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے تمہارے لئے زمین اور آسمانوں کی تمام چیزیں مسخر کردیں اور تم پر اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں پوری کر دیں ! (لقمان . ۲)

یہاں پر ''ظاہری اور باطنی نعمتوں،، کی اصطلاحیں خاص طور پر قابل غور ہیں۔ کتب تفسیر میں ان کے مختلف مفہوم و مصداق بیان کئے گئے ہیں۔ جن کو مختصر طور پر نمبر وار بیان کیا جاتا ہے :

۱ - بعض کے نزدیک ظاہری نعمتوں سے مراد ظہور اسلام اور دشمنوں پر فتح اور باطنی نعمتوں سے مراد فرشتوں کے ذریعہ امداد ہے۔

۲ - ظاہری نعمتوں سے شکل و صورت کا حسن اور اعضاء کی درستی اور باطنی نعمتوں سے مراد معرفت ہے۔

۳ - ظاہری سے مراد حواس ظاہری اور باطنی سے مراد عقل اور دل و دماغ ہیں۔ (ان تینوں اقوال کے لئے دیکھئے تفسیر کشاف)

۴ - امام رازی رح کے نزدیک ظاہری سے مراد جسمانی اعضاء کی درستی اور باطنی سے مراد ان اعضاء میں کارفرما پوشیدہ قوتیں ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفسیر کبیر)

۵ - علامہ زمخشریؒ نے نسبتاً ایک زیادہ بہتر اور فکر انگیز مفہوم کیا ہے جو خود ان کا اپنا قول ہے (۱) فرماتے ہیں :

الظاهرة کل ما یعلم بالمشاهدة، والباطنة مالا یعلم الابدلیل او لایعلم اصلاً، ی بدن الانسان من نعمة لایعلمها ولا یهتدی الی العلم بها : ظاهری سے مراد نعمت ہے جو مشاہدہ میں آسکے - اور باطنی سے مراد وہ نعمت ہے جو کسی سے معلوم ہو سکے یا بالکل معلوم نہ ہوسکے - اس لحاظ سے انسان کے بدن تنی ہی ایسی (پوشیدہ) نعمتیں ہیں جن کو انسان نہیں جانتا اور ان کی طرف ب نہیں ہوتا - (تفسیر کشاف ۳ / ۲۳۵)

میرے نزدیک اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ظاہری نعمتوں سے مراد زشات الٰہیہ ہیں جو آفرینش آدمؑ سے لے کر عصر حاضر تک برابر معلوم رف چلی آرہی ہیں - یعنی وہ لوازم حیات جن کے استعمال سے ہر دور کا بخوبی واقف رہا ہے - اور باطنی نعمتوں سے مراد خاص کر مادہ (Matter) وانائی (Energy) کے وہ پوشیدہ اسرار و حقائق ہیں جو علوم

واضح رہے کہ شرعی احکام کے برعکس تکوینی امور سے تعلق رکھنے والی آیات قرآنی کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان کافی اختلاف موجود ہے - اور اس قسم کی آیات کی تفسیر کبھی مکمل یا ''حرف آخر،، نہیں بن سکتی بلکہ علوم کائنات کی جیسے جیسے ترقی ہوتی جائے گی، ان آیات کریمہ کا بہتر مفہوم اور ان کے حیرت انگیز اعجازی پہلو خودبخود واضح ہوتے جائیں گے ، جو دراصل نوع انسانی کی فکری و اعتقادی اور تہذیبی و تمدنی ہر اعتبار سے رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں - موجودہ دور میں قرآن عظیم کا یہ سب سے بڑا اعجاز اور اس کا حیرت انگیز ''ہدایتی،، پہلو ہے - جس کو نظر انداز نہیں کر نا چاہئے -

سائنس کی ترقی کی بدولت منکشف ہو سکے ھیں ۔ جن کو موجودہ انسان مسخر کرکے بخوبی فائدہ اٹھا رہا ھے۔ مثلاً برق، بھاپ، جوھری توانائی(۱)، جوھری آئی سو ٹوپ، اور بے شمار کیمیائی مرکبات جو مصنوعی غذاؤں، ادویہ، کھادوں اور دیگر بے شمار مصنوعات سے متعلق ھیں ۔ اور اسی طرح مختلف قسم کے ترشے (Acids) وغیرہ جن کا استعمال جدید صنعتوں میں بہت عام اور اھم ھے ۔

یہ تمام نعمتیں روز اول ھی سے کائنات میں موجود تھیں، جن سے انسان علم الاسماء کی ترقی اور تسخیر اشیاء کی قوت کی بدولت صحیح فائدہ اب اٹھا رھا ھے ۔

ایک دوسری جگہ ارشاد باری ھے :

''اللہ الذی خلق السموات والارض وانزل من السماء ماء فاخرج بہ من الثمرات رزقا لکم و سخر لکم الفلك لتجری فی البحر بامرہ و سخر لکم الانھار۔ و سخر لکم الشمس و القمر دائبین و سخر لکم الیل و النھار . واتکم من کل ما سالتموہ و ان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا ان الانسان لظلوم کفار .

اللہ وہ ھے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے پانی برسایا، پھر اس پانی سے تمہاری روزی کی خاطر (طرح طرح کے) میوے نکالے ۔ اور کشتیوں کو تمہارے قابو میں کیا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلتی رھیں (کہ تم جہاں چاھو باسانی سفر کر سکو) اور دریاؤں کو مسخر کیا (کہ حسب منشا ان پر بند باندھو اور ان کا رخ موڑ لو) اور تمہارے لئے آفتاب و ماھتاب کو مسخر کیا (کہ ان کی توانائیوں سے تم حسب خاطر مستفید ھو سکو) اور تمہارے لئے رات اور دن کو کام میں لگایا (تاکہ تمہارے کام کرنے اور راحت پانے

---

۱ - جوھری توانائی کے مضر پہلوؤں پر بحث اگلے صفحات میں آرھی ھے ۔

کے اوقات معین ہو سکیں) ۔ اور اس نے (اس طرح) تمہارے (تمام فطری) مطالبات پورے کر دئے ۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہو تو نہ کر سکوگے۔ انسان بڑا ہی ستمگار اور ناشکرا ہے،، (جو ان نعمتوں سے مستفید ہونے کے باوجود خدا کا انکار کر بیٹھتا ہے) (ابراھیم ۳۲ / ۳۴)

ایک اور موقع پر ارشاد ہے :

وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منه . ان فی ذالك لایت لقوم یتفکرون . اور اس نے زمین اور اجرام سماوی کی تمام چیزیں تمہارے کام میں لگادی ہیں ۔ یقیناً اس باب میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے (بہت سے) دلائل موجود ہیں (جاثیہ ۱۳)

ان تمام آیات میں غور کیجئے ۔ ان آیات کریمہ کا منشا و مقصد کیا ہے اور یہ حکم کس کو دیا جا رہا ہے ؟ تسخیر اشیاء(۱) کس چیز کا نام ہے ؟ باطنی نعمتیں کس طرح ظہور پذیر ہوئی ہیں ؟ ظاہر ہے کہ یہ حکم خلیفہ الارض کو

---

۱ ۔ تسخیر کے لغوی معنی ہیں : کسی کو جبراً کام میں لگانا، رام کرنا، قابو میں کرنا وغیرہ ۔ امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ ''کسی خاص مقصد کے لئے کسی کو زبردستی لے جانا تسخیر کہلاتا ہے، اور ''مسخر،، وہ ہے جس کو کسی کام پر جبراً لگایا گیا ہو،، ۔ (مفردات القرآن) اللہ تعالی نے اپنے حکم ازلی اور قوت قاہرہ سے تمام موجودات عالم کو انسان کے خادم اور حاشیہ بردار کی حیثیت سے مختلف کاموں پر مامور اور تیار کر رکھا ہے اور ان میں مخفی طور پر بے شمار فوائد ودیعت کردئے ہیں ۔ اب انسان کا کام اپنے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے یہ ہے کہ وہ ان ''خدام،، سے اپنی عقل و دانش اور ضرورت کے مطابق خدمت لے اور ان مخفی فوائد کا پتہ لگا کر اور اپنے تمدنی مشکلات حل کر کے دنیائے انسانیت کے گیسو سنوارے ۔ ارشاد باری (بقیہ حوالہ اگلے صفحہ پر)

دیا جارہا ہے کہ وہ علم الاسماء کے ''منتر،، اور ''دست تسخیر،، کی قوت(۱) سے ''باطنی نعمتوں،، کو منظر عام پر لائے ۔ یہ باطنی نعمتوں یا مادہ اور انرجی کے پوشیدہ حقائق کو منکشف کرنے کا ''فارمولا،، ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ''مادہ کی توڑ پھوڑ،، اور ''انرجی،، کے اصولوں کو کام میں لانے سے مختلف ایجادات و اکتشافات کی شکل میں ''نعمتوں،، کی بارش ہونے لگتی ہے ۔ جیسے بجلی اور

(بقیہ حوالہ) ''واتا کم من کل فاسألتموہ (اور اس نے تمہارے تمام فطری مطالبات پورے کر دئے ۔) کے مطابق انسان کی کوئی مشکل اور اس کی کوئی فطری و تمدنی ضرورت ایسی نہیں ہے جس کا حل ''ضروریات سے بھر پور،، اسی کائنات ارضی میں موجود نہ ہو ۔ ان صاف ارشادات کے باوجود ان نعمتوں سے مستفید نہ ہونا محرومی نہیں تو پھر کیا ہے !

۱ ۔ اشیائے عالم کا اصل مسخر (تسخیر کرنے والا) جیسا کہ سابقہ حاشیہ میں صراحت کی جا چکی خالق کائنات جل‌شانہ ہے ۔ تمام موجودات پر اسی کا حکم اور اس کی فرمانروائی چل رہی ہے ۔ اس کے حکم سے ایک ذرہ بھی سرتابی نہیں کر سکتا ۔ اس حیثیت سے سب اس کی قوت قاہرہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں (ولہ اسلم من فی السموات والارض، نیز بل لہ ما فی السموات و مافی الارض)

مگر چونکہ انسان بھی (علمائے اسلام کی تصریح کے مطابق) صفات خداوندی کا مظہر ہے ۔ اس لئے وہ بھی ایک خاص دائرہ میں حاکم و مختار ہے ۔ جس طرح کہ سمیع و بصیر ہونا اللہ کی صفات ہیں مگر انسان بھی ایک خاص حد تک سمیع و بصیر ہے ۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات میں اس کی صراحت موجود ہے ۔ لہذا موجودات عالم کا اصل مسخر تو صرف باری تعالی جل شانہ ہے مگر مجازاً انسان کو بھی مسخر موجودات کہا جا سکتا ہے ۔ اور ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ۔

بھاپ سے چلنے والی ہزاروں قسم کی مشینیں، موٹر، ٹرین، ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر وغیرہ بہت سی تمدنی ضروریات ۔ اسی طرح فن زراعت میں استعمال ہونے والے جدید آلات، مشین اور کیمیائی کھادیں ۔ طب جدید میں استعمال ہونے والے آلات، مشین اور ادویات ۔ سب سے زیادہ مفید اور حیرت انگیز ترقی شاید طبعیات اور علم کیمیا کی ترقی کی بدولت عمل میں آئی ہے ۔ اس وقت دنیا میں جتنی بھی صنعتیں کام کر رہی ہیں، چاہے وہ مشینوں کی تیاری سے متعلق ہوں یا ادویات، کھادوں کی تیاری سے متعلق ہوں یا دیگر مصنوعات سے متعلق، سب میں بنیادی طور پر ان دونوں علوم کا عمل دخل ہے ۔ صرف اکیلے پٹرولیم ہی سے اس وقت دنیا میں ہزاروں کیمیائی صنعتیں چل رہی ہیں ۔ جیسے موم، الکحل، مصنوعی ربر، وارنش، پلاسٹک، خوشبویات، مصنوعی ریشے اور دھماکہ خیز مادے وغیرہ(۱)۔ اسی طرح لوہے اور فولاد کی ہزاروں صنعتیں، الکٹرانکس آلات کی ہزاروں صنعتیں، پلاسٹک کی ہزاروں صنعتیں، ربر کی ہزاروں صنعتیں کام کر رہی ہیں ۔ اور یہی حال دیگر چیزوں کا بھی ہے کہ ہر ایک مادہ یا چیز (اسم) سے سینکڑوں ہزاروں چیزیں (مصنوعات) تیار ہورہی ہیں ۔ تمدن جدید میں لوہے کی مصنوعات اور الکٹرانک آلات کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے ۔ اگر موجودہ تمدن سے صرف ان دو چیزوں کو ہٹا دیا جائے تو شاید اس کے ڈانڈے تمدن قدیم سے مل جائیں ۔

ان علوم اور ان کے فوائد سے قطع نظر صرف معاشیاتی نقطہ نظر سے غور کیجئے کہ یہ صنعتیں کتنی اہم ہیں ! قوموں کی ترقی اور ان کی خوشحالی کا دارومدار

---

۱ ۔ عربوں سے سستا تیل حاصل کرکے مغربی قومیں محض اپنی فنی جانکاری یا ''علم الاسماء میں مہارت،، کی بدولت اس سستے تیل سے مختلف کیمیائی مصنوعات تیار کرتی ہیں اور خوب نفع کماتی ہیں ۔

ان صنعتوں پر کتنا ہے! اس وقت روئے زمین پر یقیناً ہزاروں نہیں لاکھوں صنعتیں کام کر رہی ہیں اور دنیا کی قوموں میں ان کے درمیان سخت مقابلہ چل رہا ہے۔ کروڑوں آدمی مختلف مصنوعات کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں اور انسانی تمدن دن بدن ترقی کرتا جا رہا ہے (۱)۔ آج قوموں کی زندگی صنعتوں سے وابستہ ہو گئی ہے۔ جو قوم ''بے صنعت،، ہے وہ آج گویا کہ فقیر اور کنگال ہے، جو دنیا کے اسٹیج پر زیادہ دنوں تک ٹھہر نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ سرزمین ''زور آوروں،، کا مسکن و ماوی ہے۔ یہاں جو کمزوری دکھائے گا وہ قانون قدرت کے مطابق پیس کر رکھ دیا جائے گا۔ جیسا کہ فلسفہ تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔

منصب خلافت:

غرض خلاق فطرت نے یوم ازل ہی میں تمام مظاہر کائنات کے چند قوانین و ضوابط مقرر کئے پھر ان کا علم انسان کو عطا فرمایا کہ وہ ان مادی قوانین و ضوابط سے آگاہی حاصل کرکے موجودات عالم سے فائدہ اٹھائے۔ جس کے باعث ''نئی نئی نعمتیں،، ظاہر ہونے لگتی ہیں، جن کا تذکرہ ''واسبغ علیکم نعمہ ظاھرۃ و باطنۃ،، اور ''وان تعدوا نعمت اللہ لاتحصوھا،، میں کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو قوم ان علوم سے واقف ہوگی اور منشائے خداوندی کے مطابق موجودات عالم کی تسخیر کرے گی وہی خلافت ارض کی اصل مستحق بنے گی۔ حصول خلافت کے لئے تسخیر موجودات ضروری ہے۔ اور تسخیر موجودات کی کنجی علم الاسماء (علم اسمائے موجودات) ہے۔ لہذا علم الاسماء خلافت ارض کا پہلا باب اور اس کا اولین زینہ ہے۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جو قوم اس باب میں پیچھے رہ جائے وہ ''منصب خلافت،، سے بطور سزا معزول کر

۱۔ اور دوسری حیثیت سے فوجی و عسکری میدان میں بھی اسی نسبت سے ترقی ہو رہی ہے اور سخت مقابلہ چل رہا ہے۔

دی جاتی ھے۔ یعنی دوسروں کی غلام یا دست نگر بنادی جاتی ھے۔ کیونکہ قانون خداوندی کے مطابق اس دنیا میں کاھلوں کا کوئی کام نہیں رھتا۔

ھر دور کے تقاضے مختلف ھوتے ھیں۔ زندہ قوموں کے لئے ضروری ھے کہ وہ اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال لیں، ورنہ وہ جلد یا بدیر گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دی جائیں گی، یا ان کو تاریخ کے ''عجائب خانوں،، کے حوالے کر دیا جائے گا۔ گویا کہ وہ مردہ قومیں ھیں اور ان کا مقام دنیا کے اسٹیج کے بجائے میوزیم ھی مناسب ھو سکتا ھے۔

اب ایک دوسری حیثیت سے غور فرمائیے۔ قرآن حکیم میں اھل ایمان کو یہ حکم دیا گیا ھے:

و اعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ و من رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ و عدوکم و اخرین من دونہم لاتعلمونھم اللہ یعلمھم وما تنفقوا من شئی فی سبیل اللہ یوف الیکم و انتم لا تظلمون .

اور تم ان سے لڑائی کے لئے اتنی قوت اور زور آور گھوڑے تیار کرو جتنے تم کر سکتے ھو، کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور تمھارے دشمنوں پر دھاک بیٹھ جائے، اور ان کے علاوہ بعض دوسری قوموں پر بھی جن کو تم (اس وقت) نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ھے۔ اور اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ تم کو پورا ملے گا اور تمھارا حق مارا نہ جائے گا۔ (انفال ۶۰)

صحیفہ خداوندی میں ھر دور کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ھے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں گھوڑوں کا لفظ اور ''قوۃ،، کا لفظ استعمال کیا گیا ھے۔ اس سے مراد ھر قسم کی قوت اور جدید سے جدید تر سامان حرب ھے۔ اسی طرح ''عدو اللہ و عدوکم،، (اللہ کے اور تمھارے دشمنوں) سے مراد کفار و مشرکین ھیں اور ''و آخرین من دونہم،، (اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں) سے مراد دیگر

اقوام ھیں ۔ ''ترھبون به عدو الله،، (تا کہ تم اللہ کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھا سکو) یہ مقصد عسکریت فلسفہ جنگ، خلافت ارض کی غرض و غایت اور ''امن عالم،، کی بنیادی اینٹ ھے ۔ یعنی محض اس رعب و دبدبہ ھی کی بدولت تمھیں امن و امان اور چین و سکون حاصل ھو سکتا ھے ۔ ورنہ ظاھر ھے کہ ضعف اور کمزوری کی بدولت ھر قوم اور ھر ملک — جو زور آور ھو — دبانے اور حق مارنے لگ جائے گا ۔ کیونکہ عسکری اعتبار سے قوموں کی کمزوری قوموں کی موت کے مترادف ھوتی ھے ۔

یہ آیت کریمہ بیک وقت نہ صرف حتی‌المقدور جنگ کی تیاری اور اس راہ میں انفاق کی ترغیب و تحریص دلا رھی ھیں بلکہ خلافت ارض کا فلسفہ بھی سمجھانے اور مستقبل کے بارے میں کچھ پیشن گوئیاں کرتے ھوئے اپنے متبعین کو چالاک دشمنوں سے چوکنا اور ھوشیار رھنے کی تلقین بھی کر رھی ھے ۔ خلافت ارض کے تعلق سے اس آیت کریمہ اور اس سے ما قبل کی آیات (تسخیر والی) میں اسباق و بصائر کا ایک بحر زخار موجزن نظر آرھا ھے، جن کو میں مختصر طور پر اس کاغذی کوزے میں سمیٹنے کی کوشش کروں گا ۔

۱ ۔ اس آیت کریمہ کا منشاء جیسا کہ ظاھر ھورھا ھے ''فتنوں،، کو کچلنے اور باطل سے نبرد آزمائی کے لئے بہتر سے بہتر ھتھیاروں کی تیاری ھے ۔ آج تیر، کمان، تلوار، اور نیزے کا دور نہیں رھا ۔ بلکہ بندوق، مشین گن اور ٹینکوں کا دور بھی بہت بڑی حد تک ختم ھوگیا ھے ۔ اب راکٹ، میزائل، ایٹم بم، ھائیڈروجن بم، نیوٹران بم، جراثیمی بم، اور خلائی سیاروں کا دور ھے ۔ اب انسان خلا میں بیٹھ کر جنگ کرنے اور اجرام سماوی میں فوجی چھاؤنیاں قائم کرنے کی فکر میں ھے ۔ تا کہ وہ اپنا دفاع مضبوط کرکے ایک ھی وار میں اپنے دشمنوں کا صفایا کر سکے ۔

۲ - اقوام عالم کو قابو میں رکھنے کے لئے جدید سے جدید ھتھیاروں سے لیس ھونا ضروری ھے - اس کے بغیر ''ترھبون به عدو اللہ،، کا مقصد پورا نہیں ھوسکتا(۱)-

۳ - جب تک اقوام عالم کو قابو میں نه کیا جائے دنیا میں حقیقی امن و امان قائم نہیں ھو سکتا - جو اسلام کا اور خلافت ارض کا اولین مقصد ھے -

۴ - اگر مسلمان علوم و فنون کے باب میں امام ھوتے تو وہ منشائے الٰہی کے مطابق ''تسخیر اشیاء،، کا صرف افادی پہلو مدنظر رکھتے اور اس کے مضر و ھلاکت خیز پہلوؤں سے گریز و اجتناب کرتے - جیسا که آج دنیا کی جنگ باز قومیں دنیائے انسانیت پر جوھری اور جراثیمی جنگ مسلط کرکے تمام انسانوں کو موت کی نیند سلادینے کے درپے نظر آرھی ھیں - یه نتیجه ھے اس بات کا که علم الاسماء ''صالح،، ھاتھوں سے نکل کر ''غیر صالح،، ھاتھوں میں پہنچ گیا، یا پھر انہیں قابو میں رکھنے والی کوئی قوت باقی نہیں رھی -

۵ - موجودات عالم کی تسخیر سے متعلق اوپر جو آیات پیش کی گئی ھیں ان سب میں نعمتوں کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ ''لکم،، (تمہارے لئے) بار بار استعمال کیا گیا ھے -اس میں ''لام،، افادیت اور حصول منفعت پر دلالت کر رھا ھے - اس لحاظ سے مطلب یه ھوا که ''تسخیر اشیاء،، میں دنیائے انسانیت کا فائدہ اور تعمیری پہلو مد نظر ھونا چاھئے - پھر لفظ ''نعمت،، کا مفہوم بھی یہی ھے که وہ نوع انسانی کےلئے زحمت یا مصیبت نه بنےبلکه وہ خدائے رحمان کا عطیه ھونے کی حیثیت سے ھر حال میں اس کی رحمت و رأفت کا مظہر رھے -

---

۱ - یه مقصد ''بھیک،، کے چند ھتھیاروں کو جمع کرلینے سے حاصل نہیں ھو سکتا - بلکه اس کے لئے بذات خود جدوجہد کرنے اور خود کفیل بننے کی ضرورت ھے -

۶ - اس لحاظ سے اسلام کی نظر میں جوھری بموں، نیپام بموں، جراثیمی بموں اور دیگر ایٹمی اسلحہ کا استعمال بہت برا فعل اور سخت گناہ ہے، جو عالم انسانی کی تباھی و بربادی کا باعث ہے ۔ تمام بنی نوع انسان اسلامی نقطہ نظر سے ''عیال اللہ،، (اللہ کا کنبہ) ھیں جن کی تباھی و بربادی کی وہ اجازت نہیں دیتا ۔

۷ - ''طاقت کا توازن،، قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا اور ہے کہ مسلم حکومتیں نہ صرف اقوام عالم کی برابری کرتیں بلکہ ان سے ایک درجہ آگے بھی رھتیں(۱) ۔ مگر اس وقت دنیا کی مسلم حکومتوں کا — جو تعداد میں ۴۲ ھیں — یہ حال ہے کہ وہ نہ صرف اس میدان میں انتہائی کمزور ھیں بلکہ اسلحہ اور ھتھیاروں کے لئے بڑی طاقتوں کی دست نگر بھی ۔ یہ حقیقت میں اس بات کی سزا ہے کہ وہ تسخیر اشیاء یا کم از کم علم الاسماء کے میدان میں پیچھے کیوں رہ گئیں ۔

۸ - طاقت کے اعتبار سے ''قومی کمزوری،، دراصل قومی موت کے مترادف ہے ۔ اور یہ قانون فطری، شرعی، تاریخی اور سیاسی و عسکری ھر اعتبار سے صحیح ہے ۔ یہ صحیفہ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ کمزور قومیں اس کائنات میں زیادہ دنوں تک قومی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتیں ۔ بلکہ وہ جلد یا بدیر غالب اور طاقتور قوموں کا لقمہ تر بن جاتی ھیں ۔

۹ - مقصد خلافت اس وقت تک پورا نہیں ھو سکتا جب تک کہ مسلمان قومیں تسخیر اشیاء کے میدان میں خود آگے نہ بڑھیں اور ''مادہ،، میں ودیعت

---

۱ - یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ھوتا ہے کہ جب دوسری قومیں ایٹم بموں وغیرہ سے مسلح ھیں تو کیا مسلم حکومتوں کو بھی ان کی تقلید کرنی چاھئے ؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اگرچہ یہ اقدام اسلام کی نظر میں بہت برا اور قبیح ہے مگر طاقت کا توازن برقرار رکھنے اور ذھنی و نفسیاتی فضا بدلنے کے لئے اس کی تیاری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

شدہ قوتوں کو زیر کرکے ان کا صحیح استعمال نہ سیکھ لیں۔ بالفاظ دیگر سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بذات خود آگے نہ بڑھیں۔ اس وقت مسلم حکومتوں کے پاس وسائل کا ایک انبار موجود ہے۔ اگر وہ صحیح سمجھ بوجھ سے کام لے کر تسخیر اشیاء یعنی سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں کود پڑیں تو بہت جلد دنیا کی کایا پلٹ سکتی ہیں۔ اور موجودہ صورت حال معکوس ہو سکتی ہے۔ اس وقت خصوصیت کے ساتھ عرب ممالک کو اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس کرتے ہوئے جو دولت اللہ تعالی نے انہیں دے رکھی ہے اس کا صحیح استعمال کرنا چاہئے۔ عرب ممالک آج اس پوزیشن میں ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو خلافت ارض کی از سر نو تشکیل و تعمیر میں ایک موثر، فعال اور مثبت رول ادا کر سکتے ہیں۔ اور پوری مسلم دنیا ان کے اقدامات کی تائید کے لئے ان کی پشت پناہ بن سکتی ہے۔ اللہ تعالی نے اس وقت (پندرھویں صدی ھجری میں) دنیائے اسلام کو ایک فیصلہ کن مرحلے اور نازک موڑ پر کھڑا کر دیا ہے۔ اور ان کی ذرا سی بھی لغزش تباہ کن ہو سکتی ہے۔

۱۰۔ اس مقصد عظیم کے حصول کے لئے محض چند کانفرنسیں منعقد کرادینے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا، جب تک کہ ایک ٹھوس پروگرام بنا کر مثبت طور پر کام نہ کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے فوری طور پر سائنسی تعلیم کو عام کرنے اور سائنسی ادارے اور صنعتیں قائم کرنے کی طرف سب سے پہلے توجہ کرنی چاہئے (۱)۔

۱۱۔ اگر تمام مسلم ممالک متفق و متحد ہوکر خلافت ارض کے میدان میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے اپنے وسائل کا جائزہ لے کر

۱۔ اس وقت عرب ممالک کا کثیر سرمایہ یورپ اور امریکہ کے بینکوں میں ''بند،، پڑا ہوا ہے یا اس کا فائدہ غیر قوموں کو پہنچ رہا ہے۔ اگر وہ اس سرمایہ

(بقیہ حوالہ اگلے صفحہ پر)

از سر نو کام شروع کر دیں تو ان کی کھوئی ہوئی شان و شوکت دوبارہ واپس آسکتی ہے اور دین اسلام پھر سے غالب آسکتا ہے۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ تمام مسلم ممالک اپنے سارے اختلافات کو پس پشت ڈال کر اپنی ایک علیحدہ یونین اور ایک مرکزی سکریٹریٹ قائم کریں۔ بلکہ زیادہ بہتر ہوگا کہ مرکزیت قائم کرنے کے لئے ,,خلیفہ المسلمین،، یا ,,امیر المومنین،، کے فراموش شدہ تصور کو دوبارہ زندہ کیا جائے ' جس کو دنیا کے تمام مسلمانوں کی نظر میں تقدس کا درجہ حاصل تھا۔

,,خلیفہ المسلمین،، جس کو بنایا جائے وہ خدا کے احکام کو نافذ کرنے اور دنیا کے تمام مسلمانوں کی بہبودی کو مدنظر رکھنے والا ہو۔ اس لحاظ سے

(بقیہ حوالہ) سے اپنے ملکوں یا دوسرے مسلم ملکوں میں جدید صنعتیں قائم کرتے تو اس کے نتیجے میں دو طرفہ فائدہ ہوتا۔ یعنی خود ان ملکوں کو بھی فائدہ پہنچتا اور ترقی پذیر مسلم ملکوں کا بھی بھلا ہوتا، جو فنی اعتبار سے کچھ نہ کچھ جانکاری تو رکھتے ہیں۔ مگر سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

عرب ملکوں کو ایران اور امریکہ کے حالیہ واقعات سے سبق لینا چاہئے کہ ضرورت پڑنے پر دنیا کی یہ بڑی اور حریص طاقتیں کمزور قوموں کا سرمایہ تک ہڑپ کر جانے سے نہیں ھچکچاتیں۔ بلکہ (ایران کے سرمایہ کی طرح) اس کو منجمد کرکے ان کو مفلس و قلاش کر دیتی ہیں۔ اب عربوں کو سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہئے کہ آخر وہ سرمایہ — جس کو وہ ''محفوظ،، سمجھتے ہیں — کس کام کا جو ضرورت کے موقع پر یا آڑے وقتوں میں نہ تو خود ان کے کام آسکتا ہو اور نہ اس سے دنیائے اسلام کا کوئی بھلا ہوسکتا ہو۔!

اس کے تمام احکام - اسلامی قانون کے حدود میں - سب کے لئے واجب الاطاعت ہوں گے۔

ابھی ماضی قریب میں عالم اسلام کو متفق و متحد کرنے کی ایک بہت بڑی کوشش شروع ہو چکی تھی (جس کے داعی اور محرک ٹنکو عبدالرحمن تھے)۔ افسوس کہ یہ کوشش چند ھی سال بعد دشمنوں کی سازش اور ریشہ دوانیوں کا شکار ہو گئی۔ یہ کوشش ازسر نو شروع ھونی چاھیئے اور اس کو ھر قیمت پر پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔

۱۲ - اگر تمام مسلم ملکوں کی ایک وفاقی یونین وجود میں آجائے تو یہ سب سے بہتر ہوگا اور اس سے بہت اچھے اور مثبت نتائج نکل سکتے ھیں۔ مگر یہ کام دوسرے مرحلے کا ھے اور بہت مشکل بھی - پہلے مرحلے میں ایک متحدہ سکریٹریٹ قائم کرکے) دوسرے مرحلے کی راہ بتدریج ھموار کرنی چاھئے - اگر اس راہ میں پچیس پچاس سال بھی صرف ھو جائیں تو کوئی حرج نہیں ھے۔ ضرورت صرف مستقل مزاجی اور فولادی عزم کے ساتھ کام کرنے کی ھے - اور اس راہ میں چند مخلص اور بے لوث آدمیوں کو اپنی زندگیاں وقف کردینی چاھئیں - کیونکہ اس قسم کے نتائج راتوں رات برآمد نہیں ھو سکتے - ذھن سازی اور قوموں کی تعمیر بہت مشکل، صبر آزما اور پتہ ماری کا کام ھے ، مگر ناممکن اور محال نہیں منظم منصوبہ اور مسلسل عمل ، یہ دو چزیں کامیابی کی ضامن ھوں گی -

دنیائے اسلام میں رونما ھونے والے چند جدید ترین واقعات خصوصاً مسلم افغانستان پر روس کی فوج کشی اور یلغار نے مسلم ملکوں کی آنکھیں کھول دینے اور ان کے آپس کے تمام اختلافات کو فراموش کرکے متحد ھو جانے کا ایک نادر موقع فراہم کر دیا ھے - اگر اب بھی تمام مسلم ممالک ایک نہیں ھوجاتے

تو پھر اغیار کی ھوسناکیوں کی بھینٹ چڑھنے اور ان کا لقمہ تر بننے کے لئے انہیں تیار رھنا چاھئیے۔

ولا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم : اور تم آپس میں نزاع نہ کرو، ورنہ تم بزدل ھو جاؤ گے اور تمہاری ھوا اکھڑ جائے گی۔ (انفال ۳٦)

و اعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا : اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے رھو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو (آل عمران ۱۰۳) -

و ان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم : اگر تم نے روگردانی کی (اللہ کے احکام سے) تو وہ تمہاری جگہ پر کسی دوسری قوم کو لے آئے گا، پھر وہ تم جیسے نہ ھوں گے۔ (محمد ۳۸) -

۱۳ - کار خلافت کیا ھے اس پر حسب ذیل آیت کریمہ بخوبی روشنی ڈال رھی ھے - چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کو مخاطب کرکے کہا گیا ھے :

یا داؤد انا جعلنٰك خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق : اے داؤد ! ھم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ھے، پس تم لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا کرو (ص ٢٦)

خلیفہ ھونے کا مطلب یہ ھوا کہ دنیا میں عدل و انصاف قائم کیا جائے اور ظلم و زیادتی کو مٹادیا جائے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ھوگا کہ کوئی کمزور شخص یا کمزور قوم زمین میں عدل و انصاف قائم نہیں کرسکتی۔ عدل و انصاف کے قیام کے لئے بھی قوت و طاقت کی ضرورت ھے تاکہ کمزوروں کو ظالموں سے ان کا حق چھین کر دلایا جائے۔ اور دنیا میں امن واماں قائم کیا جائے۔ یہ اصول نہ صرف معاشرتی اور قومی لحاظ سے صحیح ھے بلکہ بین الاقوامی حیثیت سے بھی درست ھے۔ کیونکہ ''ظالم،، انسان یا ناحق کوش قوم صرف ''طاقت،،

کے آگے ھی سر جھکا سکتی ھے، اخلاقی وعظ و نصیحت اس کے لئے مؤثر اور کارگر نہیں ھوتی۔

ثم جعلنکم خلئف فی الارض من بعد ھم لننظر کیف تعملون : پھر ھم نے ان (قوموں کی تباھی) کے بعد تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تاکہ ھم دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ھو۔ (یونس ۱۴)۔

اگر ھم بھی خلافت ارض کے تقاضوں کو فراموش کرکے غافل و بے پرواہ رھے تو پھر ھماری تباھی بھی یقینی ھے، جیسا کہ پچھلی قوموں کا دردناک انجام ھمارے سامنے موجود ھے۔

۱۴ - بنیادی اور اصولی طور پر خلیفہ کے دو فرائض ھیں : (۱) شرعی احکام کا موثر طور پر نفاذ کرکے معاشرہ کی تطہیر کرنا (۲) اور تکوینی امور کو ترقی دے کر ملکی و ملی مصالح حاصل کرنا ۔ اس لحاظ سے خلیفہ کے لئے ضروری ھے کہ وہ علم تشریع (اسلام کے عباداتی، اخلاقی اور معاملاتی امور) اور علم تکوین (مادی علوم، مادی اشیاء اور ان کی قوتوں سے استفادہ) دونوں میں افراط و تفریط کے بغیر ایک توازن قائم رکھے اور دونوں کو برابر برابر ترقی دے۔ ان دونوں کی جامعیت ھی سے دینی و دنیوی تمام فوائد حاصل ھو سکتے ھیں اور ایک صالح پاکیزہ متوازن اور طاقتور معاشرہ وجود میں آسکتا ھے، جو کہ عند اللہ اصل مطلوب و مقصود ھے۔

۱۵ - پچھلے تمام مباحث میں آپ کسی بھی اعتبار سے غور کیجئے آپ کو نظر آئے گا کہ دنیائے اسلام کا ھر حیثیت سے قوی اور طاقتور ھونا ضروری ھے۔ یہی خدا کا پیغام اور اسلام کا مطالبہ ھے۔ خدا کے احکام اور زمانے کے تقاضوں سے روگردانی کرکے ھم کافی سزا بھگت چکے ھیں، اب ھم کو پوری طرح ھوش میں آجانا چاھئے۔

واضح رہے کہ علم تکوین یا علوم کائنات یا جدید سائنس اور ٹکنالوجی کا عدم وجود افراد کی زندگیوں میں تو اتنا اہم دکھائی نہ دے مگر قوموں کی زندگیوں میں اس کا عدم آج ان کی موت کا پیام ہوگا۔ افراد ہی سے قومیں بنتی ہیں۔ اور قطرہ قطرہ مل کر ہی دریا کہلاتا ہے۔ آج دنیا کے اسٹیج پر کوئی قوم زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی جو اس میدان میں پیچھے رہ گئی ہو۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ دور جدید میں محض اپنی طاقت اور وسائل کے اعتبار سے ''بڑی قومیں،، عددی اعتبار سے بڑی مگر طاقت کے اعتبار سے ''کم تر قوموں،، کو اپنی انگلیوں کے اشاروں پر نچارہی ہیں۔ اور اس دنیا میں وہی ہو رہا ہے جو وہ چاہتی ہیں۔ آخر ان کے پاس وہ کونسی کنجی اور وہ کونسا منتر ہے جس کے باعث ان کی یہ فسوں کاری چل رہی ہے؟ ظاہر ہے کہ ان کی یہ کنجی یا منتر ہے صرف اور صرف ''علم الاسماء،، اور ''تسخیر اشیاء،، میں ان کی جانکاری اور برتری۔ یہ دونوں چیزیں ہماری تھیں اور ہم ہی ان کے اصل وارث تھے۔ مگر ہماری غفلت کے باعث یہ چیزیں غیروں میں چلی گئیں ہیں۔ اب ہم کو کوشش کر کے دوبارہ اس میدان میں آگے بڑھنا اور ان دونوں چیزوں پر پھر سے قبضہ کر لینا چاہئے۔

۱۶۔ حالیہ جدید واقعات ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں۔ مثلاً فلسطین، یوگنڈا، اور افغانستان کا سقوط اور ان پر غیروں کا تسلط و غلبہ۔ اگر مسلم ممالک متحد ہوتے یا ان کا کوئی متحدہ بلاک موجود ہوتا تو اس قسم کے واقعات ہر گز نہ پیش آتے۔ اصل میں اغیار کی للچائی ہوئی نظریں پورے عالم اسلام، ان کی جغرافیائی اہمیت اور ان کے بے پناہ قدرتی وسائل پر لگی ہوئی ہیں۔ اس بنا پر اندر ہی اندر سازشیں ہورہی ہیں اور لاوا پک رہا ہے۔

۱۷ - اگر تمام مسلم ممالک ایک جھنڈے تلے جمع ہوجائیں تو پھر پوری دنیا اور اس کی تمام قوتیں مل کر ان کا ایک بال بھی بیکا نہ کر سکیں گی۔ بلکہ اس سے در حقیقت عالمی سیاست میں ایک انقلاب آجائے گا اور ان کا وزن قائم ہوجائے گا۔ ان کی حیثیت موجودہ متعدد بلاکوں کے درمیان ایک ''بیلینسنگ پاور،، کی سی ہوجائے گی۔ یعنی وہ جس بلاک کی طرف ہو جائیں گے اس کا پلڑا جھک جائے گا۔ یہ بھی گویا کہ ایک نمونہ ہوگا ان کے ''امت وسط،، ہونے کا۔

وکذلك جعلناكم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو (بقرہ ۱۴۳)

خلافت ارضی کے شرائط:

صحیفہ ربانی میں خلافت ارض کے تعلق سے امت محمدیہ سے جو زبردست اور تاکیدی وعدہ کیا گیا ہے وہ ملت اسلامیہ کے لئے پیام حیات اور صوت سرمدی کی حیثیت رکھتا ہے:

وعد الله الذين امنوا منكم و عملوا الصالحات ليستخلفنهم في الارض كما استخلف الذين من قبلهم ص و ليمكنن لهم دينهم الذى ارتضى لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم امنا يعبدونني لا يشركون بي شيئا و من كفر بعد ذلك فاولئك هم الفاسقون .

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور صالح عمل کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں ضرور خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے والوں کو بنایا تھا، اور ان کے دین کو — جس کو اس نے ان کے حق میں پسند کرلیا ہے — مضبوطی سے جمادے گا، اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ (شرط یہ ہے کہ) وہ میری عبادت کرتے رہیں (اس طرح کہ) کسی کو میرا شریک

نہ بنائیں(١)۔ اس (واضح حکم) کے بعد جو انکار کریں گے وہ بد کردار ہوں گے (نور ٥٥)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے :

و لقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون ان فی ھذا لبلاغاً لقوم عابدین۔ اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا کہ زمین کے وارث (آخر کار) میرے صالح بندے ہوں گے۔ اس میں عبادت گزاروں کے لئے ایک بہت بڑا پیغام ہے۔ (انبیاء : ١٠٥-١٠٦)

یہ دونوں آیتیں ایک دوسرے کی بخوبی تشریح و تفسیر کر رہی ہیں۔ اللہ تعالی کا یہ وعدہ اگرچہ دور خلافت راشدہ میں پورا ہو چکا ہے مگر یہ پیام حق ایک مژدۂ جاوید ہے جو ہر دور کے لئے مشروط طور پر عام ہے۔

پہلی آیت کریمہ میں ''زمین میں خلیفہ بنائے جانے،، (استخلاف فی الارض) کے لئے بنیادی شرط ایمان اور عمل صالح قرار دی گئی ہے۔ پھر اسی کو مختصر طور پر ''عبادت،، (یعبدوننی) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس طرح دوسری آیت میں بھی ''صالحین،، ہی کو ''عابدین،، کہا گیا ہے۔ اس لحاظ سے عبادت سے مراد

---

١ - ''یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا،، یہ دو جملے ہیں اور ان دونوں کے درمیان حرف عطف موجود نہ ہونے کی بنا پر یہ قابل غور ہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی عبادت اس طرح ہو کہ اس میں کسی قسم کے شرک کا شائبہ تک نہ ہو۔ شرک کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں سے ایک غیراللہ کی مطلق اطاعت بھی ہے۔ اہل ایمان سے شرک نہ کرنے کا مطالبہ (یہاں پر قومی و بین‌الاقوامی سیاق میں) میرے اپنے خیال سے شاید یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے خصوصی معاملات میں غیر قوموں کو حکم نہ بنائیں اور بے چون و چرا ان کے احکامات کی تعمیل نہ کریں وغیرہ۔

عمل صالح ھوا۔ اور عمل صالح قرآن کریم کی ایک وسیع اصطلاح ھے، جس میں تمام شرعی و اخلاقی احکام و اوامر داخل ھیں۔ اور جہاں دانی و جہاں بانی بھی اس عمل صالح میں داخل اور اس کا ایک ضروری حصہ ھے۔ اس کے بغیر نہ تو مسلم معاشرہ وجود میں آسکتا ھے اور نہ ''عمل صالح،، کو قرار و ثبات حاصل ھو سکتا ھے۔ مسلم معاشرہ کو وجود میں لانے اور اس کی حفاظت کرنے کے لئے جہاں دانی و جہاں بینی کی بھی ضرورت ھے۔ جیسا کہ دور رسالت اور دور خلافت راشدہ کے حالات اور واقعات (کفار و مشرکین اور یہود و نصاری وغیرہ کے ساتھ معرکہ آرائیاں) شاھد ھیں۔ کسی کمزور قوم یا کمزور معاشرہ میں عمل صالح یا احکام الہی کا مکمل ظہور و نفاذ بہت مشکل دکھائی دیتا ھے۔ جیسا کہ آج خصوصیت کے ساتھ ایران، پاکستان اور افغانستان کے حالات شاھد ھیں۔ اقوام عالم اور خاص کر بڑی طاقتیں اسلام قوانین کے نفاذ یا اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور اس کے دور رس عواقب و نتائج سے لرزاں و ترساں دکھائی دیتی ھیں۔ اسی وجہ سے وہ آج مسلم حکومتوں اور مسلم معاشروں کو برباد کر دینے پر تلی ھوئی ھیں۔

غرض ان آیات میں ''عمل صالح،، سے مطلوب محض چند رسوم و عبادات نہیں بلکہ ایک مکمل اور مثالی عمل کا نمونہ مطلوب ھے جو ھر اعتبار سے ''صالح،، ھو۔ یعنی شرعی امور کی پابندی کے ساتھ ساتھ دین برحق کو مضبوط بنیادوں پر قائم و دائم رکھنے کی تمام تدبیروں پر عمل پیرائی جو ازالہ خوف کے درجے میں آجائے۔ اس مثالی عمل سے مزین و آراستہ افراد ھی کو سورۂ انبیاء والی آیت میں ''الصالحون،، سے تعبیر کیا گیا ھے جو زمین کے وارث ھوں گے۔ اور حقیقت بھی یہی ھے کہ ایسی ھی صالح اور مثالی قومیں — جو کارزار حیات میں سرگرم عمل ھوں — کشور کشا ھو سکتی ھیں اور اپنے ملکوں کو اغیار کی دستبرد سے بچا سکتی ھیں۔

یہاں پر یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ ابتدائی دور میں قوموں کو ابھرنے اور کارزار حیات میں جدوجہد کرنے کے لئے اگرچہ وسائل سے زیادہ خدا کی ذات والا صفات پر بھروسہ اور یقین کامل کافی ہوتا ہے۔ مگر بعد کے مرحلے میں ملکی و ملی دفاع و استحکام کے لئے ہر قسم کے وسائل اکھٹا کرنے اور اپنے آپ کو پوری طرح تیار اور چوکس رکھنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ انفال والی آیت میں ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

بہر حال حصول خلافت اور اس کی برقراری و استحکام کے لئے (جو درحقیقت دین اور اس کے احکام کا استحکام ہی ہے) تدبیر اور جدوجہد یا قومی اور بین الاقوامی حیثیت سے بیدار مغزی اور ہر حیثیت سے دفاع ہر حال میں ضروری ہے۔ ان تمام مراحل میں ایمان اور عمل صالح کا مکمل مظاہرہ ہونا چاہئے۔ دونوں چیزیں ضروری ہیں کسی ایک چیز پر تکیہ کرکے دوسری چیز کا استخفاف نہیں کیا جا سکتا۔

ان آیات میں اہل ایمان سے تین چیزوں کا وعدہ کیا گیا ہے :

۱ - ان کو زمین کی خلافت سونپی جائے گی (استخلاف فی الارض)

۲ - ان کے دین کو مضبوط و مستحکم کیا جائے گا (تمکین دین)

۳ - خوف و دہشت کی فضا دور کرکے امن و سلامتی عطا کی جائے گی (تبدیل خوف من الامن)

یہی تین چیزیں ہیں جن کی آج دنیائے اسلام کو شدید ضرورت ہے۔ ان تینوں امور میں غور فرمائیے تو صاف واضح ہو جائے گا کہ موخرالذکر دو چیزوں کا حصول ہی اصل میں خلافت (پہلی چیز) کی بنیاد ہے۔ یعنی وہی ''عمل صالح،، کا مکمل اور بے خوف و خطر ظہور و نفاذ جس کو ''دین کی مضبوطی،، سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے جب تک یہ دونوں

چیزیں (دین کی مضبوطی یا عمل صالح کا بے روک ٹوک نفاذ اور دنیا کی معاصر قوموں سے پوری پوری بے خوفی) حاصل نه هوجائیے خلافت ارض ایک بے معنی لفظ رهے گا، چاهے روئے زمین پر ۴۲ کے بجائے ۴۲ سو مسلم حکومتیں وجود میں آجائیں۔ لهذا یه تینوں چیزیں اس وقت تک حاصل نهیں هو سکتیں جب تک که هم عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق خود کو کیل کانٹوں سے پوری طرح لیس نه کرلیں اور اقوام عالم کے مقابلے کے لئے دفاعی حیثیت سے اپنے آپ کو پوری طرح تیار نه کرلیں۔

موجوده ناگفتهبه حالات سے بددل اور مایوس هونے کی ضرورت نهیں۔ بلکه اپنے تمام وسائل کا جائزہ لے کر مثبت بنیادوں پر عالم اسلام کی تعمیر نو میں لگ جانے اور عهد نو کا زرین باب کھولنے کی ضرورت هے۔ الله تعالی کا وعده یقیناً سچا هے۔ وه اپنا وعده پورا کرکے رهے گا بشرطیکه هم نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ کام کرنے لگ جائیں۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله و کفی بالله شهیدا : وهی هے جس نے اپنے رسول کو هدایت اور سچا دین دے کر بهیجا تاکه وه اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔ اور الله کافی هے حق ثابت کرنے والا (فتح ۲۸)

کیا علوم سائنس کی تحصیل فرض هے :

امام غزالیرح اپنی شهره آفاق کتاب احیاء العلوم میں ''بیان العلم الذی هو فرض کفایة،، کے عنوان کے تحت اصولی طور پر تمام علوم کو علوم شرعیه اور علوم غیر شرعیه میں تقسیم کرکے تحریر فرماتے هیں :

''وه علم جو شرعی نهیں هے اس کی چند قسمیں هیں : وه علم یا تو محمود و مستحسن هوگا یا مذموم و غیر محمود هوگا یا جائز و مباح هوگا۔ پس محمود وه علم

ھے جس سے دنیوی امور کی مصلحتیں وابستہ ھوں جیسے طب اور حساب۔ اور یہ علم محمود بھی منقسم ھے : وہ یا تو فرض کفایہ ھوگا یا صرف فضیلت والا ھوگا فرض نہ ھوگا۔ تو فرض کفایہ وہ علم ھے جس سے دنیوی امور کی درستی میں صرف نظر نہ کیا جا سکتا ھو جیسے طب کیونکہ علم طب جسمانی صحت اور اس کی بقاء کے لئے ناگزیر ھے۔ اور جیسے علم حساب جو وصیت اور وراثت وغیرہ قسم کے معاملات میں بہت ضروری ھے(۱)۔ اور یہ وہ علوم ھیں جن سے اگر کوئی شہر خالی ھوجائے تو اھل شہر نقصان میں پڑ جائیں۔ اب اگر کوئی ایک شخص بھی ان علوم کو قائم و جاری کردے تو کافی ھو جائے گا اور بقیہ لوگوں کی طرف سے فرض ساقط ھو جائے گا۔ اس لحاظ سے ھمارے اس قول سے کہ ''طب اور حساب فرض کفایہ میں سے ھیں،، کسی کو تعجب نہیں کرنا چاھئیے۔ بلکہ (ھم تو یہاں تک کہیں گے کہ) مختلف قسم کی صنعتیں مثلاً کاشتکاری، کپڑے کی صنعت، سیاست، بلکہ پچھنے لگانا (نشتر زنی) اور درزی کا کام (وغیرہ) بھی فرض کفایہ میں داخل ھیں۔ حقیقت یہ ھے کہ اگر کسی شہر سے پچھنے لگانے والے (علاج کی غرض سے نشتر لگا کر فصد کھولنے والے) ھی ناپید ھو جائیں تو پھر اس شہر والوں کی خرابی آجائے گی اور وہ ھلاکت کے قریب ھو جائیں گے۔ جس ھستی نے بیماری کو پیدا کیا ھے اسی نے دوا بھی پیدا کی ھے اور اس کا استعمال بھی سکھایا ھے اور اس کے اسباب بھی گنا دئے ھیں۔ لہذا کسی بھی معاملہ کو مہمل قرار دے کر اس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

۱۔ آجکل دنیا کا کوئی کاروبار، کوئی کارخانہ، کوئی صنعت، کوئی بنک اور کوئی دفتر وغیرہ بغیر حساب کے ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ بلکہ اب تو سہولت کے لئے کمپیوٹروں کا نظام جاری ھو گیا ھے، جو آن کی آن میں لمبے لمبے حسابات حل کر کے رکھ دیتے ھیں۔

اب رہا وہ علم جو فضیلت میں تو شمار ہوتا ہے مگر فرض نہیں ہوتا، تو وہ وہ ہے جو حساب اور طب کے امور میں بہت زیادہ خوض اور گہرائی کے بعد حاصل کیا گیا ہو۔ یہ علم اگرچہ ضروری تو نہیں ہے مگر فائدہ سے خالی بھی نہیں ہے۔

اب رہا وہ علم جو مذموم ہے تو وہ جادو، طلسمات اور شعبدہ بازی وغیرہ کا علم ہے۔ اور مباح وہ علم ہے جو اشعار یا تاریخ وغیرہ سے متعلق ہو،،۔ (احیاء العلوم، ۱/۱۶)

امام غزالیرح اگر آج زندہ ہوتے تو عجب نہیں کہ موجودہ دور کے علوم خصوصاً سائنسی علوم کو فرض کفایہ ہی نہیں بلکہ — ہماری ملت کی موجودہ جانکنی اور زبوں حالی کو دیکھ کر — فرض عین قرار دے دیتے، جن سے آج اقوام عالم کا عروج و زوال وابستہ ہو گیا ہے۔

اسلام اور اصول تمدن :

اسلام ایک ابدی و سرمدی مذہب ہے، جو دین و دنیا دونوں کا جامع اور ہر قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہے۔ وہ دیگر مذاہب کی طرح ترک دنیا اور عزلت و گوشہ نشینی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ کارزار حیات کو گرم کرنے اور تمدنی ہنگامہ آرائیوں میں کودپڑنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اپنے متبعین کو تارک الدنیا مسکین اور ضعیف و کمزور نہیں بلکہ ایک سر گرم، فعال، خودکفیل اور بہادر و طاقتور قوم کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ وہ مثبت انداز فکر اور متوازن طریقہ تعلیم ہے جس کا تصور ہمیں دنیا کے کسی بھی مذہب میں نہیں ملتا۔

چنانچہ علامہ شبلی نعمانیرح نے اپنی کتاب ''الکلام،، میں ''ترقی تمدن کے وہ اصول جو دین اسلام میں پائے جاتے ہیں،، کے عنوان کے تحت چند نکات

سے بحث کرکے قرآنی دلائل سے انہیں مدلل و مزین کیا ہے - اس موقع پر میں پہلے دو نکات کا خلاصہ بیان کروں گا جن کا تعلق زیر بحث موضوع سے ہے -

''ہمارا دعوی صرف یہ نہیں کہ اسلام تمدن کے موافق ہے، بلکہ ہمارا یہ بھی دعوی ہے کہ وہ تمدن کو ترقی دینے والا ہے اور اس حد تک پہنچانے والا ہے جو تمدن کا انتہائی درجہ ہے - انسان کی تمام ترقیوں کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ وہ یہ خیال کرے کہ وہ اعلی ترین مخلوقات ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اسی لئے ہے کہ انسان اس سے تمتع اٹھائے - (دنیا میں) سب سے پہلے قرآن مجید نے اس اصول کی تعلیم دی (۲) انسان کی تمام ترقیوں کی بنیاد یہ ہے کہ اس کو یہ یقین ہو کہ اس کے خیر و شر، ترقی و تنزل، عروج اور زوال کا مدار تماستر اس کی سعی اور کوش پر ہے - اور دنیا اور دین کی تمام کامیابیاں محض اس کی کوشش پر موقوف ہیں - قرآن مجید نے اس اصول کو نہایت توضیح اور تاکید کے ساتھ بیان کیا :

و ان لیس للانسان الا ماسعی : انسان کے لئے اتنا ہی ہے جتنی اس کی کوشش ہے - (نجم ۳۹)

لها ما کسبت و علیها ما اکتسبت : انسان کے نفس کو جو فائدہ پہنچتا ہے اسی کی کمائی کی بدولت ہے- اور جو نقصان پہنچتا ہے اس کے کرتوت کی بدولت (بقرہ ۲۸۶)

ولا تکسب کل نفس الا علیها : اور جو کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر پڑتا ہے- (انعام ۱۶۴)

اولما اصابتکم مصیبة قد اصبتم مثلیها قلتم انی هذا قل هو من عند انفسکم : کیا جب ایسا ہوگا کہ تم پر کوئی مصیبت پڑے کہ جس کے دو چند تم پہلے پہنچا چکے ہو تو تم کہوگے کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی ؟ اے محمد

کہدو کہ یہ خود تمہاری اپنی ذات کی وجہ سے ہے (آل عمران)

ذالك بان الله لم يك مغيراً نعمة انعمها على قوم حتى يغيروا ما بانفسهم : یہ اس لئے کہ اللہ جب کسی قوم کو کوئی نعمت دیتا ہے تو اس کو بدلتا نہیں جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ بدلیں ۔ (انفال ۵۳)

ظهر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدی الناس : لوگوں کے کرتوت کی بدولت تمام خشکی و تری میں فساد پھیل گیا (روم ۴۱)

وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم : تم پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو خود تمہارے کرتوت کی بدولت (شوری ۳۰)

اسلام نے اس مضمون پر اس قدر زور دیا کہ قرآن مجید میں جابجا تصریح کی کہ بندہ جب ایک کام کر لیتا ہے تو خدا بھی اس کے موافق کرتا ہے :

ان الذین امنوا و عملوا الصلحت یهدیهم ربهم بایمانهم : جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے کام بھی اچھے کئے خدا ان کو ان کے ایمان کی وجہ سے ہدایت کرتا ہے (یونس ۹)

ان الذین لا یومنون بایت الله لا یهدیهم الله : جو لوگ اللہ کی نشانیوں پر ایمان نہیں لاتے اللہ ان کو ہدایت نہیں کرتا (نحل ۱۰۴)

و الذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا : جو لوگ ہمارے لئے مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو اپنی راہ دکھاتے ہیں (عنکبوت ۶۹)

یا ایها الذین امنوا تقوا الله و قولوا قولا سدیدا یصلح لکم اعمالکم : مسلمانو ! اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات بولو تو خدا تمہارے اعمال کو صالح کردے گا (احزاب ۷۰)

یا ایھاالذین امنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم : مسمانو ! اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو خدا بھی تمہاری مدد کرے گا اور تم کو ثابت قدم رکھے گا۔ (محمد ۷)

فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم : پھر جب وہ لوگ کج ہوئے تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو کج کر دیا (صف ۵)

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم : اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں (رعد ۱۱)

ان آیتوں میں خدا نے اپنے کام کو بندہ کے کام سے متأخر رکھا۔ فلما زاغوا الخ میں بیان کیا کہ جب ان لوگوں نے کجی کی تو خدا نے بھی ان کے دلوں کو کج کر دیا۔ (اسی طرح) یا ایھاالذین آمنوا میں یہ کہا کہ ''مسلمانو! پرھیزگاری اختیار کرو اور ٹھیک بات کہو تو اللہ تمہارے عمل کو صالح کر دے گا،،۔ حالانکہ پرھیزگاری خود عمل صالح کا نام ہے۔ اور جب کوئی شخص پرھیزگاری کرے گا تو پھر اس کے عمل کے صالح کرنے کی کیا ضرورت ہے،، (الکلام، ص ۱۸۰ - ۱۸۲)

اقوام عالم کی رہنمائی :

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالی کی مدد اور اس کی نصرت اسی وقت شامل حال ہوتی ہے جب کہ اھل اسلام اللہ تعالی کے تمام احکام پر عمل پیرائی کے جذبے کے ساتھ سرگرم عمل ہو جائیں اور ہر حیثیت سے میدان کارزار کو گرم کرکے خلافت ارض کی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں۔ نیز دینی و دنیوی ہر حیثیت سے مسلم معاشرہ کی خصوصاً اور اقوام عالم کی عموماً ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام دے کر موجودہ بین‌الاقوامی خطرات اور ہلاکت خیزیوں سے عالم انسانی کو

نجات دلائیں ۔ خلافت ارض کی یہ وہ عظیم ترین ذمہ داری ہے جو اس وقت مسلم قوموں کے کندھوں پر اللہ تعالی نے ڈال رکھی ہے ۔ موجودہ گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں امید اور روشنی کی کوئی کرن اگر نظر آرہی ہے تو وہ اسلام اور دنیائے اسلام ہی کی ہے ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلم قومیں اپنا یہ پارٹ اور وقت کا سب سے بڑا کردار کس طرح ادا کرتی ہیں !

کنتم خیرامۃ اخرجت للناس الخ تم بہترین امت ہو جو پوری نوع انسانی کے لئے برپا کی گئی ہے ۔ اللہ تعالی نے بہت پہلے ہی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ عالم انسانی کا ''خیر،، صرف دنیائے اسلام ہی سے وابستہ ہے ۔ یہاں پر ''الناس،، سے مراد پوری دنیائے انسانیت ہے جس کی صلاح و فلاح کی ذمہ دار دنیائے اسلام ہے ۔ عالم انسانی کی موجودہ کج روی کو روکنا اور اس کو راہ راست پر لانا یہ بھی وقت کا ایک بہت بڑا تقاضا اور خلافت ارض کا ایک اہم ترین مقصد ہے ۔ اہل اسلام کے پاس وہ ''نور ہدایت،، موجود ہے جس سے اس وقت دنیا کے تمام مذاہب اور تمام قومیں تہی دامن ہیں ۔

مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مادی اعتبار سے بھی اقوام عالم کی ''برابری،، ضروری ہے ۔ یہ ایک بہت بڑی نفسیاتی حقیقت ہے کہ دنیا کی قومیں مادی علوم میں جس کو اپنا ''امام،، تسلیم کر لیتی ہیں اپنے دیگر تمام معاملات میں بھی — چاہے وہ دینی ہوں یا دنیوی — ان کو ذہنی اعتبار سے ''امامت کے منصب،، پر فائز سمجھنے لگ جاتی ہیں ۔ جیسا کہ آج علمی دنیا پر (محض ان کے مادی علوم کی برتری کی بنا پر) مستشرقین کی ایک دھاک بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور ان کے ''اقوال،، کے مقابلے میں علمائے اسلام کی ''باتوں،، کو کوئی نہیں سنتا ، یا انھیں کوئی وقعت نہیں دیتا ۔ اگرچہ مستشرقین کی باتیں کتنی ہی غلط اور علمائے اسلام کی باتیں کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہوں ۔ اگر

مسلمان مادی علوم میں بھی بر تر ہوتے تو پھر یہ صورت حال کبھی رونما نہ ہوتی۔ لہذا ہمیں اس بنیادی علت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ بغداد اور اسپین کے عروج کے زمانہ میں مسلمانوں کی علمی برتری اور ان کے وقار کا بھی یہی حال تھا جو آج ہم کو مغربی قوموں میں نظر آرہا ہے۔ جب تک موجودہ صورت حال معکوس نہیں ہوگی ہم اقوام عالم کو ''معروف،، اور ''منکر،، کے اسباق نہیں پڑھا سکیں گے (۱)

اس لحاظ سے بھی آج ہم کو مادی علوم (علم الاسماء) میں ترقی کرکے اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنا چاہئیے ورنہ ''عالمی،، سطح پر ہماری کوئی وقعت نہیں رہے گی۔ بلکہ فریضہ خلافت کی ادائیگی میں ہم سراسر ناکام رہیں گے۔

---

۱ - دور جدید کا سب سے بڑا ''منکر،، ہے موجودہ تہذیب و تمدن کی ہلاکت آفرینیاں اور غلط اور مہلک قسم کے سائنسی ایجادات، جن سے عالم انسانی کو ہر حال میں بچانا ہے۔ اور یہ کارنامہ صرف دنیائے اسلام ہی انجام دے سکتی ہے، جو نوع انسانی کی امین اور اس کی محافظ بھی ہے۔ بشرطیکہ وہ اتنی طاقتور بن جائے کہ منشائے الٰہی کو بزور نافذ کر سکے۔ یہ ہے ''تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر،، کا صحیح اور ولولہ انگیز مفہوم موجودہ بین الاقوامی حالات کے اعتبار سے۔

واضح رہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دھلوی رح کے نزدیک قرآن کریم کے ارشادات و خطابات خاص خاص احوال و کوائف ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ان کا خطاب اصلاً عام ہوتا ہے اگرچہ وہ بعض مخصوص حالات ہی کے تحت نازل ہوئے ہوں۔ لہذا ان خطابات کو وسیع احوال و کوائف پر منطبق کرنا چاہئے (ملخص از الفوز الکبیر)

اسلامی تہذیب اور مغربی اقوام :

جب تہذیب کی بحث آ ھی گئی ھے تو مناسب معلوم ھوتا ھے کہ اس موضوع پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈال دی جائے۔ مغربی تہذیب کے بعض پرجوش حامی و شیدائی مسلمانوں کو مغربی تہذیب و تمدن کو — اس کی ظاھری چمک دمک کی بنا پر — اختیار کرلینے کا غلط مشورہ دیتے ھیں۔ حالانکہ تہذیب اور تمدن کے مفہوم میں فرق ھے۔ جو چیز لینے کی ھے وہ صرف تمدنی علوم و فنون ھیں نہ کہ تہذیب (معتقدات اور طرز معاشرت وغیرہ) مغربی تہذیب تو اپنے دیوالیہ پن اور اخلاقی گراوٹ کی آخری حد کو پہنچ چکی ھے۔ اس لحاظ سے تہذیب کے معاملے میں وہ خود ھماری محتاج ھے۔ اب تبادلے کے اصول کے مطابق ضرورت اس بات کی ھے کہ ھم اپنی تہذیب — اپنا مذھبی و اخلاقی سرمایہ — اس کے حوالے کرکے اس کے تمدنی علوم و فنون کے سرمایہ کو خود لے لیں۔ اس میں نہ صرف دونوں کا بھلا ھے بلکہ اس میں در اصل انسانیت کی فلاح مضمر ھے۔ واضح رھے کہ یہ علوم و فنون دراصل اس کے اپنے یا اس کا ذاتی سرمایہ نہیں بلکہ ھمارے ھی آباءواجداد کی وراثت ھیں جو مغربی قوموں کو خصوصیت کے ساتھ اسپین کی راہ سے ملے تھے (۱)۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ھوگا کہ ھمارا مغربی علوم و فنون کو اپنانا مغربی اقوام کا زیربار احسان ھونا نہیں بلکہ در حقیقت اپنی ھی امانت کو واپس لینا ھے (۲)۔ اور دوسری حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ایک مسلم حقیقت ھوگی کہ ھمارےآباء و اجداد نے قرون وسطی — بغداد، مصر اور اسپین کے ادوار — میں مغربی قوموں کو علوم و فنون دے کر گویا ان پر احسان کیا تھا۔ اب ھم تہذیبی حیثیت سے بھی ان کی راھنمائی کرکے پھر دوبارہ ان پر احسان

---

۱ - یہ اور بات ھے کہ انھوں نے ان علوم و فنون کو بے انتہاء ترقی دے دی ھے۔ مگر نیو اور بنیاد ھماری ھی ڈالی ھوئی ھے۔

۲ - واپس لے لینے کا مطلب چھین لینا نہیں بلکہ شکریہ کے ساتھ اپنا لینا ھے۔

کرنے والے ہوں گے ۔ اگر قرون وسطی میں اقوام مغرب ہمارے علوم و فنون کے ساتھ ہی ساتھ ہماری تہذیب بھی لے چکی ہوتیں تو موجودہ مغربی تہذیب کی گراوٹ، انارکی اور خدا فراموشی کا وہ حال نہ ہوتا جو آج نظر آرہا ہے ۔ بہر حال اسلامی تہذیب ہی ایک برتر تہذیب اور عالم انسانی کے لئے خیر و برکت کا باعث ہوگی جو اونچ نیچ سے عاری اور ہر حیثیت سے صالح و متوازن ہے ۔ جب تک اس تہذیب کا بول بالا نہیں ہوتا دنیا سے سیاست و معیشت کی ہوسناکی و خودغرضی اور معاشرتی و اخلاقی مفاسد اور تباہیوں کا خاتمہ نہیں ہو سکتا ۔

مسلم نشاۃ ثانیہ کا مدار

اہل اسلام کو اپنی تہذیب پر پوری طرح ثابت قدم رہتے ہوئے صرف جدید علوم و فنون (یا تمدن جدید) سے مستفید ہونا ہے ۔ ہماری تہذیب ایک چٹان کی طرح اٹل ہے، جس کا ہم کو سودا نہیں کرنا ہے۔ بلکہ اس چٹان پر برقرار رہتے ہوئے ہم کو صرف تمدن جدید سے استفادہ کرنا ہے ۔ تمدن ایک تغیر پذیر اور ارتقائی شے ہے جو کسی بھی دور میں ایک حالت پر نہیں رہتا ۔ ہمیں اپنی تہذیب کو سینے سے لگائے ہوئے زندگی کے میدان اور اس کی دوڑ میں تمدن کے ساتھ چلنا ہے ۔ ہم بیسویں صدی کے بجائے خواہ تیسویں صدی کے تمدن میں داخل ہو جائیں، ہماری تہذیب عزیز ہر حال میں ہمارے ساتھ رہے گی۔

اسلامی تہذیب اور تمدن جدید کے اجتماع ہی سے خلافت ارض کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اور مسلم نشاۃ ثانیہ عمل میں آسکتی ہے، جیسا کہ پچھلے تمام مباحث اور اس سلسلہ کی تمام آیات قرآنی میں غور و خوض کے بعد واضح ہوتا ہے۔ تمدن جدید یا صنعت و حرفت (ٹکنالوجی) کو اپنانے کے باعث نہ صرف ہماری غربت و افلاس دور ہو سکتی ہے اور بے شمار معاشی، قومی، سیاسی، عسکری اور بین الاقوامی فوائد و منافع حاصل ہو سکتے ہیں (جیسا کہ تفصیلات گزر چکیں)

بلکه عالمی سطح پر همارا وقار اور مرتبه بھی بہت بلند ہو جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کے بعد پھر ہم کو اپنی تہذیبی برتری کے اظہار کا موقع ملے گا جو بہت هی کارگر اور موثر ہوگا۔ اور اس طرح دنیا اسلام کی برکتوں سے مالامال ہو جائے گی۔ جو که عندالله مطلوب و مقصود هے۔

غرض خلافت ارض اس وقت دو حصوں میں بٹی ہوئی هے: اس کا مادی حصه غیروں کے قبضے میں هے اور صرف اس کا روحانی حصه اهل اسلام کے پاس هے جب تک یه دونوں حصے پھر سے یکجا نہیں ہو جاتے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیه ممکن نہیں ہو سکتی اور جب تک اهل اسلام کی نشاۃ ثانیه عمل میں نه آئے موجودہ دنیا اپنی تہذیبی و تمدنی هلاکت خیزیوں کے مہیب غار سے کبھی نہیں نکل سکتی۔

نصاب تعلیم کے سلسلے میں چند تجاویز:

اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری هے که ہم پورے نصاب تعلیم کا جائزہ لے کر اس میں مناسب تبدیلیاں کریں اور سائنسی علوم کی تحصیل پر زیادہ سے زیادہ زور دے کر ان کی تحصیل تیز سے تیز تر کر دیں۔ اس سلسلے میں راقم سطور کے ناقص علم کے مطابق چند تجاویز یہاں پر پیش کی جارهی هیں۔ :

۱ ۔ علم الاسماء یا علم کائنات یا سائنسی علوم کی کما حقه ترقی اور مسلم معاشرہ میں اس کی صحیح ترویج و اشاعت کے لئے ضروری هے که جدید سے جدید تر تمام علوم مادری زبان میں پڑھائے جائیں۔ خصوصیت کے ساتھ پاکستان میں ایک اردو یونیورسٹی کا قیام خاص کر اس مقصد کی خاطر بہت ضروری هے۔ کاش که هندوستان میں عثمانیه یونیورسٹی کا "اردو کردار" باقی رهتا جو اس بر صغیر میں ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رها تھا اور جدید سے جدید تر تمام علوم کو اردو میں منتقل کرنے کا عظیم الشان بیڑا اٹھائے ہوئے تھا۔

۲ - تمام سرکاری و غیر سرکاری مدارس میں سائنسی علوم کی تعلیم لازمی قرار دی جائے - بلکہ ان علوم کی تحصیل کی ترغیب و تحریص دلائی جائے، اور هر حال میں مادری زبان کو ذریعه تعلیم بنایا جائے، سوائے بعض خاص صورتوں کے -

۳ - عربی مدارس میں خصوصیت کے ساتھ چند سائنسی علوم کو داخل کرکے نصاب تعلیم کی اصلاح کی جائے - علم ایک مکمل وحدت ھے اور ھمارے علماء کو ''مکمل علم،، کا وارث بننا چاھئے، نه که آدھے علم کا - ورنه موجوده دور کی صحیح قیادت ممکن نہیں علم ھمارا ایک قیمتی سرمایه ھے، جس کی تقسیم کے باعث خوفناک نتائج رونما ھوئے - جو تاریخ کا ایک سیاه باب بن چکے ھیں - جیسا که ھمیں کلیسا اور مادیت کی کشمکش کے نتیجے میں دکھائی دیتا ھے - یه تاریخ اب دوباره کبھی نہیں دھرانی چاھئے -

۴ - موجوده عربی مدارس کے فارغین کے لئے (خصوصاً پاکستان جیسے ملکوں کی یونیورسٹیوں میں) کوئی دو ساله یا چار ساله کورس جدید علوم کی تعلیم کے لئے قائم کیا جائے - اس کے بغیر ھمارے علماء کو جدید علوم کی ترویج واشاعت کے باعث پیدا شده فکری، تہذیبی اور تمدنی مسائل کو صحیح طور پر سمجھنا مشکل ھے - اور ان مسائل کو سمجھے بغیر پیش پا افتاده مشکلات کا حل نکل نہیں سکتا -

۵ - فی الحال سائنسی علوم کی تمام درسی و غیر درسی اھم اھم کتابوں کا اردو اور دیگر مادری زبانوں میں ترجمه کرکے مادری زبان میں ان علوم کی تعلیم و تدریس کو آسان سے آسان تر بنایا جائے -

موجوده تعلیمی نقائص :

یه بات یاد رکھنی چاھئے که غیر ملکی زبانوں میں تعلیم دینے سے کسی فن

کے مسائل دلوں میں راسخ نہیں ہوتے ۔ کیونکہ زبان کی اجنبیت اس راہ میں ایک پردہ کے طور پر حائل رہتی ہے ۔ طلبہ کے سامنے کوئی فن غیر مادری زبان میں پیش کرنا گویا ان کے سامنے بیک وقت دو چیزوں کو پیش کرنا ہے، ایک زبان اور دوسرے فن ۔ اب وہ بیچارے حیران ہوتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کس کو سمجھیں ؟ زبان کو یا فن کو ؟ یہ بالکل ایک غیر فطری اور عجیب سا طریقہ بلکہ ایک ظلم ہے کہ کمسن اور نوخیز ذہنوں پر اتنا بوجھ ڈال دیا جائے جس کے وہ متحمل نہ ہو سکیں ۔ شاید اسی بنا پر اکثر طلبہ کا یہ مقصد بن جاتا ہے کہ وہ بجائے فن کو سمجھنے کے (جس کی ان میں استعداد نہیں ہوتی) امتحانی سوالات کے جوابات رٹ کر کسی نہ کسی طرح امتحان میں کامیاب ہو جائیں ۔ اس قسم کے ''کامیاب،، طلبہ آگے چل کر جب خود اساتذہ کے منصب پر فائز ہوں گے تو ظاہر ہے کہ اپنی عدم قابلیت کی بنا پر اپنے ماتحت طلبہ میں کوئی قابلیت پیدا نہیں کر سکیں گے ۔ بلکہ سرکاری مدارس میں زیادہ تر یہ رواج سا ہوگیا ہے کہ کلاسوں میں بجائے لکچرز دینے اور فنی مسائل ذہن نشین کرانے کے (جن کی ان میں استعداد نہیں ہوتی) چند نوٹس لکھوا کر (جو پہلے سے تیار شدہ اور متوارث چلے آرہے ہوتے ہیں) پیچھا چھڑا لیا جاتا ہے ۔ گویا کہ فرض ادا ہو گیا ۔ اور طلبہ کا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان نوٹس کو رٹ کر امتحان میں لفظ بلفظ انہی کو ایک طوطے کی طرح دھرا دیں ۔ اور یہ سلسلہ یونہی نسل در نسل چلا آرہا ہے ۔ اس فرسودہ نظام تعلیم میں اصلاح کا کسی کو خیال نہیں آتا ۔

اس ناقص طرز تعلیم کی بدولت معیار تعلیم دن بدن گر رہا ہے اور ہمارے نو نہالوں کی صلاحیتیں خواہ مخواہ ضائع ہو رہی ہیں ۔ انہیں ابھرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا ہے ۔ مشرقی ممالک خصوصاً ہندو پاک میں اچھے اور قابل سائنس دانوں کی کمی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ ترقی

یافتہ دنیا کی کوئی بھی قوم علوم و فنون کی تعلیم غیر ملکی زبان میں نہیں دیتی۔ بلکہ در حقیقت اس کی ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ اس نے اپنی قوم کے نونہالوں کی تعلیم اور ان کے ذہنی نشوونما کے لئے اجنبی زبان کو ذریعہ نہیں بنایا۔

حرف آخر:

یہ خیال دل سے نکال دینا چاہئے کہ مسلم قوموں میں ایجاد و اختراع کا مادہ اور اس کی صلاحیت نہیں ہے (جیسا کہ آج مغربی اقوام کا خاصہ دکھائی دیتا ہے۔) بلکہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اصل میں یہ ہمارے موجودہ نظام تعلیم کی خرابی ہے۔ ورنہ آج بھی ہماری ملت میں جابر بن حیان(۱) محمد بن موسی خوارزمی (۲) ابو نصر فارابی (۳) محمد بن زکریا الرازی (۴) ابن الہیثم (۵) ابن سینا (٦) البیرونی (۷)

---

۱ - جدید علم کیمیا کا بانی۔

۲ - ریاضی اور فلکیات کا زبردست ماہر۔

۳ - ایک بہت بڑا محقق۔

۴ - بے مثال طبیب اور ایک طبی انسائیکلوپیڈیا ''الحاوی،، کا مصنف۔

۵ - جدید طبیعیات کی ایک بحث روشنی (Light) کے اصولوں کا موجد اور ''بصریات،، کا زبردست ماہر۔ اس کے اصول آج بھی مستند اور جدید تحقیقات کے مطابق ہیں۔

٦ - زبردست طبیب اور کتاب ''القانون،، کا مصنف جو یورپ کی تمام یونیورسٹیوں کے نصاب میں ابھی حال تک شامل تھی۔

۷ - مسلمانوں کا نابغہ اور جینیس عالم جو اپنے دور میں یکتائے روزگار تھا۔

ابن نفیس (۸) ابوحنیفه الدینوری (۹) عمر خیام (۱۰) اور ابوالقاسم الزهراوی (۱۱) جیسے زبردست اور نامور سائنس داں، محققین اور موجدین پیدا ہو سکتے ھیں۔

بطور مثال یہاں پر صرف چند نام گنائے گئے ھیں۔ ورنہ اگر استقصاء کیا جائے تو ھمارے علماء، حکماء اور محققین و موجدین کی ایک بہت بڑی فہرست تیار ہو سکتی ھے، جن کے کارناموں کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم جلد درکار ہوگی۔

علوم و فنون کے باب میں ھمیں جاپانی قوم سے سبق سیکھنا چاھئے۔ جس نے دوسری جنگ عظیم میں اپنا سب کچھ برباد کر دینے کے باوجود ھمت نہیں ھاری بلکه تن من دھن کی بازی لگا کر ربع صدی میں نه صرف دنیا کے صف اول کے صنعتی ممالک میں شامل ہو گئی بلکه بہت سے ترقی یافته ممالک کو بھی پیچھے چھوڑ گئی۔ یه معجزه آخر کس طرح ظہور پذیر ھوا ؟ ظاھر ھے که یه سب کچھ مسلسل محنت، جفا کشی اور مقصد سے لگن کے علاوه اور کچھ نہیں ھے۔

اس مقالے کو ختم کرنے سے پہلے ھمارے علماء کے منصب پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈالنی ضروری ھے۔ جیسا که عرض کیا جا چکا ھے جدید علوم

---

۸ - ماھر طبیب اور کاشف دوران خون۔ مغربی دنیا غلطی سے ولیم ھاروے (پیدائش ۱۵۷۹ء) کو دوران خون کا انکشاف کرنے والا قرار دیتی ھے، جب که ابن نفیس کی وفات ۱۲۸۸ء میں ہوئی ھے۔

۹ - دنیا کا پہلا محقق علم نباتات (نه که کارل لنے ایس، جیسا که مغربی قومیں غلط بیانی سے کام لیتی ھیں)۔

۱۰ - ریاضی و ھیئت کا ماھر۔

۱۱ - جدید علم سرجری کا باوا آدم۔

کی ترقی اور ان کی ترویج و اشاعت سے ہمیشہ معاشرہ میں نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، جن کو سلجھانے اور فکری حیثیت سے معاشرہ کی رہنمائی کرنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے(۱) - اسی لئے ہمارے علماء کو جدید علوم و مسائل سے بھی آگاہ رہنا چاہئے تاکہ وہ مثبت طور پر نہ صرف مسلم معاشرہ کی بلکہ عالم انسانی کی بھی رہنمائی احسن طور پر کرکے خلافت ارض کے منصب عظیم سے عہدہ برآ ہو سکیں - ان بنیادی اقدامات کے بغیر کوئی ہمہ گیر ذہنی و فکری انقلاب لانا مشکل ہے - اور اس قسم کے ذہنی و فکری انقلاب کے بغیر عالم انسانی کی مکمل اصلاح کبھی نہیں ہو سکتی -

خلاصہ بحث یہ کہ آج ہم کو بیک وقت دو میدانوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے :

---

۱ - مثلاً اب سے چند سال پہلے جب پہلی مرتبہ امریکی خلابازوں کے ذریعہ چاند کی تسخیر عمل میں آئی تھی تو اس وقت خیالات کی دنیا میں زبردست انتشار برپا ہوگیا اور طرح طرح کے فکری و اعتقادی سوالات پیدا ہو گئے - اسی طرح آجکل ''ٹیسٹ ٹیوب بےبی،، کے مظاہرہ سے پیدا ہونے والے فقہی مسائل علمی حلقوں کو پریشان کئے ہوئے ہیں - یعنی اس عمل کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے نسلی، نسبی اور وراثتی مشکلات و پیچیدگیاں -

اس طرح آج دنیائے اسلام کو بہت سارے فکری، معاشرتی اور تمدنی مسائل و مشکلات کا سامنا ہے، جن کا حل تلاش کرنے کے لئے متعلقہ علوم اور ان کے مسائل کی گہرائیوں میں جانے کے ساتھ ساتھ دین کے ابدی نصوص میں بھی گہری بصیرت حاصل کرنی ضروری ہے - ان دونوں علوم کے مسائل و مباحث میں غور و فکر اور ان کے موازنہ و مقابلہ کے بعد ہی کوئی مفید اور تسلی بخش حل نکل سکتا ہے -

(۱) - هر ممکن طریقه سے سائنسی علوم کو ترقی دے کر صنعت اور ٹکنالوجی کے میدان میں مسلم معاشره کو آگے بڑھانا اور انہیں صف اول کی قوموں میں لا کر کھڑا کرنا -

۲ - سائنسی علوم کی ترقی اور ان کی ترویج و اشاعت سے پیدا ہونے والے فکری، معاشرتی اور تمدنی مسائل و مشکلات کا حل تلاش کرنا -

پہلا فریضه ماہرین سائنس پر عائد ہوتا ہے اور دوسرا فریضه علمائے اسلام پر - مسلم نشاۃ ثانیه کے لئے خلافت ارض کا مکمل حصول ضروری ہے - اور خلافت ارض بغیر علم الاسماء اور تسخیر اشیاء میں برتری کے کبھی مکمل نہیں ہو سکتی -

لہذا ہم کو اسلام اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیه کی خاطر اس مقصد عظیم کے حصول کے لئے تن من دھن کی بازی لگادینی چاہئے - اور کوشش کرنی چاہئے که پندرھویں صدی ہجری کو اپنی سرتوڑ جدوجہد کے ذریعه اسلام کی صدی بنادیں - وما ذالك علی الله بعزیز -

اقبال اور احیائے اسلام

رفیع الدین ہاشمی

احیائے اسلام یا اسلامی نشاۃ ثانیہ جیسے الفاظ کثرت استعمال سے بہت عام ہوگئے ہیں ۔ فاضل مضمون نگار نے بھی اس مضمون میں ان دو لفظوں کو جابجا استعمال کیا ہے ۔ احیاء حیات سے بنا ہے، اس کے معنی ہیں زندہ کرنا ۔ اسلام مرا نہیں کہ اسے زندہ کیا جائے۔ اسی طرح نشاۃ ثانیہ کا تصور بھی اغیار سے مستعار ہے اور اسلام کے ساتھ اس کی نسبت صحیح نہیں۔ انگریزی اصطلاحات اور مغربی تصورات کے زیر اثر ہم نے بہت سی ایسی باتیں اپنا لی ہیں جو ہمارے لئے درست نہیں ہو سکتیں ۔ ان سے احتراز کیا جائے تو بہتر ہے ۔

غلطیہائے مضامین مت پوچھ   لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

مسلمانوں کو اپنی گفتگو خاص کر دینی مباحث میں فقط اسلام کے مستند الفاظ اور مصطلحات کو ہی استعمال کرنا چاہئے اور اس استناد میں بنیاد قرآن و حدیث کو بنانا چاہئیے ۔ ورنہ ہم اپنی اصل سے بہت دور ہو جائیں گے ۔ (مدیر)

انبیاء علیہم السلام کی تمام تر جدوجہد کی غایت یہی تھی کہ بنی نوع انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلامی بنیادوں پر استوار کیا جائے ۔ بعثت نبوی کا مقصد بھی یہی تھا کہ ان اقیموا الدین اور لیظھرہ علی الدین کلہ کا عملی مظاہرہ کیا جائے ۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہالت و جاہلیت کے تمام طور طریقے ختم کرکے اپنے پیروکاروں کے اندر ایک انقلاب برپا کیا جس سے ان کی کایا پلٹ گئی ۔ آپ نے زندگی کے تمام شعبوں کو اسلامی قوانین و

اخلاقیات کے مطابق مرتب و منظم کیا جس کے نتیجہ میں آپ کا برپا کردہ انقلاب بساط عالم پر ایک زبردست سیاسی قوت بن کر ابھرا اور مشرق و مغرب کے باطل پرستوں کے لئے ایک چیلنج بن گیا۔

مگر خلفاء راشدین کے آخری زمانے میں مختلف علاقوں کی فتوحات اور اس کے نتیجے میں کثرت اموال اور تمدنی ترقی سے جاهلیت کی روح پھر سے بیدار ہونے لگی، اسلامی انقلاب کے مقاصد نظروں سے اوجھل ہوتے گئے اور نظم حکومت غیر اسلامی بنیادوں پر استوار ہونا شروع ہوا۔ چنانچہ مصلحین امت کو اصلاح احوال کی فکر دامن گیر ہوئی — خلفائے راشدین کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز پہلے شخص ہیں جنہوں نے حقیقی معنوں میں غلبہ دین اور احیائے اسلام کی سنجیدہ کوشش کی۔ بعد کے اکابر ملت اس کوشش کو آگے بڑھاتے رہے۔ فی الحقیقت اقامت دین اور احیائے اسلام کا مقصد عظیم، ہمیشہ سے مسلم اکابر کے پیش نظر رہا۔ اس ضمن میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد امام احمد بن حنبل، امام غزالی، شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی، اورنگ‌زیب عالمگیر، شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید، شاہ اسمعیل شہید اور بہت سے دوسرے اکابر کی مختلف‌النوع تجدیدی کاوشیں، تاریخ احیائے اسلام کے روشن ابواب ہیں۔ بیسویں صدی میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لئے جن اکابر نے کام کیا، ان میں علامہ اقبال کا نام بہت نمایاں ہے اور اس ضمن میں ان کی مساعی تاریخ احیائے اسلام کا ایک روشن باب ہیں۔

علامہ اقبال کے مستحکم اسلامی رجحان اور دینی مزاج کی تشکیل میں ان کے آباء و اجداد کے متصوفانہ رجحانات، والدین کی دین‌داری، گھر کا اخلاقی ماحول اور علامہ سید میر حسن کی تعلیم و تربیت اور فیضان نظر کے علاوہ دو باتوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے — اول : قرآن حکیم سے ان کا گہرا شغف — دوم :

آں حضور کی ذات گرامی سے والہانہ عقیدت ـــ احیائے اسلام کے لئے علامہ اقبال نے جو مختلف النوع کوششیں کیں وہ ان کے اس دینی مزاج کا حصہ تھیں جو متذکرہ بالا عوامل و اثرات کی بنا پر مرتب ہوا تھا۔

علامہ اقبال نے شعور کی آنکھ کھولی تو پورا عالم اسلام نہایت ھی پیچیدہ مسائل کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ فکری اور سیاسی دونوں اعتبار سے مغرب اس پر حاوی ہو چکا تھا۔ بیشتر اسلامی ممالک مغربی سامراج کے محکوم تھے۔ غلامی کے سبب وہ جمود، تعصب اور تنگ نظری کا شکار تھے۔ بر صغیر کے مسلمانوں کی حالت اور بھی دگر گوں تھی۔ ایک زوال پذیر معاشرہ کی طرح، ان کے جسد اجتماعی کو بے خبری، کور ذوقی، باھمی مناقشت تن آسانی اور بے عملی کا گھن لگ چکا تھا۔ خواری اور زبوں حالی کے اس رد عمل میں جو آوازیں بلند ہوئیں ان میں سب سے توانا، بلند اور زیادہ موثر آواز علامہ اقبال کی تھی۔ انھوں نے اپنی نثری اور شعری کاوشوں کے ذریعے مسلم خوابیدہ کو، بیدار ہوکر غلامی کی زنجیریں توڑنے کی تلقین کی۔ مقصود یہ تھا کہ غلامی سے نجات، احیائے اسلام کی تمہید بن سکے۔

احیائے اسلام کی تمنا بالکل ابتدائی زمانے ھی سے ان کے ہاں موجود تھی۔ اظہار کی صورت تبدیل ہوتی رھی مگر بذات خود یہ تمنا کبھی سرد نہیں ہوئی بلکہ عمر کے ساتھ اس جذبہ کی حرارت و شدت میں اضافہ ہوتا گیا ـــ تجدید و احیائے دین کے لئے اقبال کی مختلف النوع کاوشیں ان کی طویل زندگی میں مختلف سطحوں پر سامنے آتی رھیں۔ ان ھمہ جہت کوششوں کو محض کسی ایک زاویے سے دیکھنا، علامہ کی ھمہ گیر مساعی سے بے انصافی کے مترادف ہوگا۔ ان کی پوری شاعری، ان کی تمام نثری تحریریں، ان کا پورا نظام فکر و فلسفہ، ان کے جملہ تصورات

و نظریات، مثلاً خودی، بے خودی، فقر، عشق، مرد مومن، عقل وغیرہ، نہایت قریبی اور گہرے طور پر احیائے اسلام کےلئے ان کی مساعی کے ساتھ مربوط ھیں ۔

کسی نظریہ کو عملاً بروئے کار لانے کے لئے اس پر ایمان محکم اولین اور بنیادی شرط ھے ۔ ایمان و ایقان کے بغیر ایک عظیم مقصد کے لئے کسی کاوش کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ علامہ اقبال بیسویں صدی میں احیائے اسلام کی جدوجہد میں ایک نمایاں علامت کی حیثیت رکھتے ھیں ۔ اسلام کی سر بلندی کے لئے ان کے بے تاب جذبوں اور مضطرب تمناؤں کا راز اس امر میں پوشیدہ ھے کہ انہیں اسلام کی حقانیت کے ساتھ، اسلام کے روشن مستقبل پر بھی کامل یقین تھا ۔ بیسویں صدی کے آغاز میں عالم اسلام کے مایوس کن حالات کے پس منظر میں، اقبال کی طرف سے غلبہ اسلام کی یہ نوید :

آسماں ھوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش　　اور ظلمت رات کی سیماب پا ھوجائے گی
اس قدر ھوگی ترنم آفریں باد بہار　　نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ھوجائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام سجود　　پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ھو جائے گی

شب گریزاں ھوگی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معمور ھوگا نغمہ توحید سے

دیوانے کا ایک خواب معلوم ھوتی تھی یا محض ایک شاعرانہ تعلی — مگر عالمگیر اسلامی انقلاب پر اقبال کو کامل یقین تھا جس کا واشگاف اظہار انہوں نے نثر میں بھی کئی جگہ کیا ھے :۔ مثلاً :

''اسلام ایک عالمگیر سلطنت کا یقیناً منتظر ھے جو نسلی امتیازات سے بالا تر ھوگی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان بادشاھتوں اور سرمایہ

داروں کی گنجائش نہ ہوگی۔ دنیا کا تجربہ خود ایسی سلطنت پیدا کر دے گا۔ غیر مسلموں کی نگاہ میں شاید یہ محض خواب ہو لیکن مسلمانوں کا یہ ایمان ہے،، (۱)

ایک اور موقع پر فرمایا :

،،اس وقت جو قوتیں دنیا میں کارفرما ہیں، ان میں سے اکثر اسلام کے خلاف کام کررہی ہیں لیکن لیظھرہ علی الدین کلہ کے دعوے پر میرا ایمان ہے کہ انجام کار اسلام کی قوتیں کامیاب اور فائز ہوں گی،، (۲)

اسلام کے مستقبل پر یہ گہرا اعتماد، اسلام کے ضمن میں علامہ اقبال کی کاوشوں اور بحیثیت مجموعی ان کے فکر کے مطالعے میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ احیائے اسلام کے لئے علامہ اقبال کے مجموعی کام کو تین دائروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱ ۔ فرد کی تعمیر سیرت

۲ ۔ فکری اور علمی کاوشیں

۳ ۔ پاکستان کا تصور اور اس کے لئے عملی جدو جہد

(۱)

علامہ اقبال نے تاریخ عالم کے مطالع سے بجاطور پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب تک فرد اپنے اخلاق و اطوار اور سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا، معاشرے میں کسی بڑے انقلاب کی توقع عبث ہے۔ اقبال کے الفاظ میں : ،،دنیا میں کسی قوم کی اصلاح نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس قوم کے افراد اپنی ذاتی اصلاح کی طرف توجہ نہ کریں،،(۳)— فرد کا کردار قومی ترقی میں کیا حیثیت رکھتا ہے ؟علامہ کہتے ہیں:(۴) Character is a Kind of Energy

اور — ''کردار ھی وہ غیر مرئی قوت ھے جس سے قوموں کے مقدر متعین ہوتے ھیں،،(۵) — مسلمان مجموعی اعتبار سے اخلاقی انحطاط کا شکار تھے ۔ انھیں اس پستی سے نکالنے کے لئے اقبال ان کی اخلاقی تربیت کی طرف متوجہ ہوئے ۔ ان کا خیال تھا کہ اخلاقی تربیت کے لئے : ''مذھب بے حد ضروری چیز ھے،،(٦) ھماری زندگیوں پر مذھب کی مضبوط گرفت ضروری ھے ۔ یہ ھمیں بھٹکنے اور گمراہ ہونے سے بچاتی ھے ۔ اگر : ''یہ گرفت ڈھیلی پڑی تو ھم کہیں کے نہ رھیں گے ۔ شاید ھمارا انجام وھی ھو جو یہودیوں کا ھوا،،(۷) زندگی میں مذھب کی اسی اھمیت اور معنویت کی بنا پر گوئٹے کے اس قول : Art is Still Truth, take Refuge there

میں تصرف (Art کی جگہ Religion) کے بعد وہ اس بات کے قائل تھے کہ مذھب ھی ھماری راھنمائی اور دستگیری کرتا ھے ۔ ایک مسلمان مذھب پر عمل پیرا ہونا چاھے تو قرآن حکیم اس کے لئے مشعل راہ ثابت ھو سکتا ھے ۔ انسانی کردار کی تعمیر میں بھی قرآن حکیم زبردست معاونت کرتا ھے :

قرآن میں ھو غوطہ زن اے مرد مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

ایک بار چند نوجوانوں سے مخاطب ھو کر کہا :

''یاد رکھوں مسلمانوں کے لئے جائے پناہ صرف قرآن کریم ھے ۔ ۔ ۔ میں اس گھر کو صد ھزار تحسین کے قابل سمجھتا ھوں جس گھر سے علی الصبح تلاوت قرآن مجید کی آواز آئے،، (۸)

مگر اس کے ساتھ ھی یہ نصیحت بھی کی کہ :

''قرآن مجید کا صرف مطالعہ ھی نہ کیا کرو بلکہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرو،،(۹)

قرآنی تعلیمات کے حوالے سے اقبال کا مطالبہ یہ ہے کہ فرد کو ارکان اسلام کی پابندی کرنی چاہئے کیونکہ کسی قوم کی تشکیل و تعمیر کے لئے ارکان خمسہ کی پابندی ضروری ہے(۱۰) فرائض سے آگے بڑھ کر نوافل شب بیداری اور خاص طور پر تہجد کے اہتمام سے عبادت الٰہی کی حقیقی لذت نصیب ہوتی ہے(۱۱) یہی عبادت مسلمان کے اندر اخلاق فاضلہ کا موجب بنتی ہے ــ علامہ اقبال قرآن کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھنے کی تاکید کرتے ہیں۔ اسوہ حسنہ میں اعلائے کلمۃ الحق کو ایک نمایاں اور روشن باب کی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال کے نزدیک ایک حقیقی مسلمان کلمہ حق کا اعلان و اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا مگر سچائی کا اظہار اسی وقت ممکن ہے جب فرد کے اندر خود اعتمادی موجود ہو۔ اقبال کے فلسفہ خودی کا پس منظر یہی ہے ــ مسلمانوں کے سامنے خودی کی حقیقت واضح کرنے اور اس کی نشوونما اور تربیت و استحکام پر زور دینے کے ساتھ مسلمانوں کو عملی زندگی میں خودشناسی سے کام لینے کی تاکید کی۔ اس سلسلہ میں عشق اور فقر نہایت موثر اور کارگر ہتھیار ثابت ہو سکتے ہیں۔ جذبہ عشق میں غیر معمولی قوت پنہاں ہے۔ فقر کی لازوال دولت بھی عشق سے کم اہم نہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت اس قوم کا راستہ نہیں روک سکتی جس کو یہ دونوں قوتیں حاصل ہو جائیں:

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور

علامہ اقبال، احیائے اسلام کے لئے جس انقلاب کے داعی ہیں، اسے برپا کرنے کے لئے خودی، فقر اور عشق سے متصف ہونا ضروری ہے۔ فرد کے اندر یہ صفات پیدا ہو جائیں تو وہ ''مرد مومن'' کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ احیائے اسلام کے سلسلے میں مرد مومن کا کردار بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

امت مسلمہ کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو احساس ہوتا ہے کہ اسلام کے ضعف کا بہت بڑا سبب امت کے اندر مذہبی جھگڑے، فروعی مسائل پر شدید اختلافات، معمولی مسائل پر باہمی دشمنیاں اور مجموعی طور پر انتشار و افتراق کی وہ افسوس ناک صورت حال رہی جس نے اس قوم کو امت واحدہ کے طور پر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننے سے روکے رکھا — اس صورت حال کا ایک اہم پہلو علمائے سوء اور شریعت بیزار صوفیا کا غلط رویہ تھا — علامہ اقبال غیر اسلامی تصوف کو خاص طور پر خرابی احوال کا ذمہ دار گر دانتے ہیں۔ ان کے خیال میں ''تصوف کا وجود ہی سر زمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے،،(۱۲) علمائےسوء اور اہل تصوف کے متعلق اقبال کے جذبات بہت شدید ہیں۔ اس طبقے پر علامہ کی تنقید کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے مقام و مرتبے کو پہچانیں اور حضور پاک کے فرمان : العلماء ورثة الانبیاء کے مطابق اپنے اندر وہی اخلاق عالیہ، وہی صداقت شعاری اور وہی اسلامی اقدار پیدا کریں جو انبیاء کا اسوہ ہے۔

دوسرا طبقہ جس سے اقبال بطور خاص مخاطب ہوئے، نوجوانوں کا طبقہ تھا۔ اقبال کی دانش و بینش سے یہ امر پوشیدہ نہ تھا کہ نوجوانوں کی اعانت و تائید کے بغیر معاشرے میں کسی انقلاب کا تصور بے معنی ہے خاص طور پر احیائے اسلام کی تحریک میں کامیابی کا انحصار بڑی حد تک نوجوان طبقے پر ہے۔ خود آنحضور کی دعوت پر لبیک کہنے والوں میں اولیت کا شرف نوجوان طبقے کو حاصل ہوا۔ چنانچہ وہ مسلم نوجوانوں کو تن آسانی اور عیش پسندی کے بجائے جفا کشی، محنت اور سخت کوشی کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں شاہین کا استعارہ مسلم نوجوان کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

اور :

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا پردم ہے اگر تو، تو نہیں خطرہ افتاد

تو ستاروں پر کمند ڈالنے والا نوجوان اور ان تھک پرواز کرنے والا شاہین، ایک ہی کردار کی دو علامتیں ہیں اور یہ کردار مسلم نوجوان ہے۔ نوجوانوں کے لئے اقبال کے اضطراب اور درد مندی کا اظہار جس والہانہ خلوص کے ساتھ دور آخر کے کلام میں ہوا ہے۔ وہ ان کے بے تاب جذبوں کی سچی تصویر ہے۔

اس طرح احیائے اسلام کے سلسلے میں اولین سطح پر علامہ اقبال نے فرد کی انفرادی اصلاح اور اس کی تعمیر سیرت پر زور دیا اور معاشرے کے دو اہم طبقوں یعنی مذہبی رہنماؤں اور نوجوانوں کو اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریک میں اپنا مثبت، موثر اور فیصلہ کن کردار ادا کرنے پر زور دیا۔

(۲)

احیائے اسلام کے لئے فکری اور علمی سطح پر عالم اسلام کی فضا کو ساز گار بنانے میں علامہ اقبال کا رول اہم ہے۔ مسلمان انگریزوں کی سیاسی غلامی کے ساتھ ذہنی اور فطری اعتبار سے بھی مغرب سے مغلوب ہو چکے تھے اس کے نتیجہ میں۔ اول : وہ نیشنلزم کے سراب کا شکار تھے۔ دوم : دین و دنیا کی علیحدگی کا تصور ان میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ سوم : مغربی تہذیب سے مرعوبیت نے ان کے ذہن و فکر کو مفلوج کر دیا تھا — علامہ اقبال نے ان تینوں رجحانات پر کاری ضرب لگائی۔

اپنے فکری سفر کے آغاز میں اقبال خود بھی قوم پرست تھے مگر یورپ کو قریب سے دیکھنے پر انہیں نیشنلزم کے کھوکلے پن کا احساس ہوا۔ لکھتے ہیں :

''اس زمانے میں سب سے بڑا دشمن اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیاز و ملکی قومیت کا خیال ہے - پندرہ برس ہوئے جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا - اس وقت میں یورپ میں تھا - اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا - حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا،، (۱۳)

وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے اندر اس تصور کی اشاعت کا مقصد ان کی ملی وحدت کو پارہ پارہ کرنا ہے :

''مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریہ وطنیت کی اشاعت کی جائے،،(۱۴)

اسی بنا پر عرب قوم پرستی کا فتنہ پروان چڑھا، ترکی میں تورانیت کا غلغلہ اٹھا اور سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھرگیا - علامہ کے نزدیک : ''قومیت کا مغربی تخیل ایک روحانی بیماری ہے،،(۱۵) - انھوں نے اس بیماری کے خلاف بھر پور جہاد کیا - اقبال کے نزدیک انسانی اشتراک کا سب سے قوی رابطہ انسانی عقیدہ یا نظریہ ہے چنانچہ دنیا بھر کے کلمہ گو ایک قوم اور ایک ملت ہیں کہ ان کے درمیان سب سے زیادہ مضبوط رشتہ کلمہ توحید کا ہے - اسی بنیاد پر انھوں نے مغربی قومیت کے باطل تصور کو یکسر رد کر کے مسلمانوں کے تصور ملت کی بازیافت کی :

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

ملت کے اس تصور نے آگے چل کر حضرت علامہ کے ھاں اتحاد عالم اسلامی کی شکل اختیار کی :

ایک ھوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

مسلمانوں کے فکری و ذھنی انحطاط کا دوسرا نمایاں پہلو ان کا تصور دین تھا ۔ شہنشاھیت نے اھل مذھب کو مساجد تک محدود کردیا اور سیاست کی باگ ڈور خود سنبھال لی ۔ دین و سیاست میں بعد پیدا ھوا اور دونوں کو ایک دوسرے سے کلیتاً الگ سمجھا جانے لگا ۔ اقبال کے نزدیک : ''از روئے شریعت محمدیہ مذھب و سیاست میں کوئی تفریق نہیں''(۱۶) ۔ مزید برآں : ''اسلام بحیثیت مذھب کے دین و سیاست کا جامع ھے ۔ یہاں تک کہ ایک پہلو کو دوسرے پہلو سے جدا کرنا حقائق اسلامیہ کا خون کرنا ھے''(۱۷) ۔ انھوں نے دین و سیاست کی علیحدگی پر سخت تنقید کی کیونکہ اس کا نتیجہ ھمیشہ خوں‌ریزی اور عالمگیر تباھی کی شکل میں نکلتا ھے :

جلال پادشاھی ھو کہ جمہوری تماشا ھو
جدا ھو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ھے چنگیزی

درحقیقت احیائے اسلام کی تحریک میں کسی طرح کی پیش رفت اس کے بغیر ممکن ھی نہ تھی کہ دین کے محدود تصور کی نفی کرکے اس کا ایسا جامع تر تصور پیش کیا جائے ۔ جو نہ صرف سیاست بلکہ معیشت، تعلیم، عمرانیات، قانون غرض زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ھو ۔

نیشنلزم اور دین کے اس محدود تصور کے بعد اسلامی نشاۃ ثانیہ کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ مغرب سے ذھنی مرعوبیت تھی ۔ خصوصاً جدید تعلیم یافتہ

مسلمانوں کے ذہن تہذیب حاضر اور علوم جدیدہ کی چکاچوند سے سخت مرعوب تھے۔ علامہ اقبال مغرب اور مغربیت کا بذات خود مشاہدہ کر چکے تھے اس لئے انھوں نے نہایت واشگاف الفاظ میں اس کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا :

آہ یورپ با فروغ تابناک   نغمہ اس کو کھینچتا ہے سوے خاک
یورپ میں بہت روشنئی علم و ہنر ہے   حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات
فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب   کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

یہاں اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ فکر مغرب کے جو ثمرات خبیثہ جمہوریت، سوشلزم اور سرمایہ داری کی شکل میں دنیا کے سامنے ظہور پذیر ہوئے، اقبال نے ان سب باطل نظریات کو بہرطور ناقابل قبول قرار دیا۔ مغربی جمہوریت کو، جس کی بنیاد مادر پدر آزادی ہے، انھوں نے رد کر دیا۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمے آید

سوشلزم (اشتراکیت) کے بارے میں ان کے خیالات میں ایک ارتقا ملتا ہے۔ شروع میں اقبال نے روسی انقلاب کو مستحسن قرار دیا کیونکہ وہ مظلوموں کا حامی بن کر سامنے آیا تھا مگر بہت جلد اس کا اصلی چہرہ بے نقاب ہو گیا۔ چنانچہ اقبال نے اس سے برأت کا اعلان کرتے ہوئے تاریخ کی مادی تعبیر کو سراسر غلط قرار دیا(۱۸)۔ مجموعی طور پر مغربی فکر اور سیاست کے بارے میں علامہ اقبال کا یکم جنوری ۱۹۳۸ء کا ریڈیائی پیغام، ایک جامع تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ فی الحقیقت انھوں نے جس طرح تہذیب مغرب پر شدید تنقید کی، واشگاف الفاظ میں اسے چیلینج دیا اور جس دانش مندانہ بصیرت کے ساتھ اس کی تباہی کی پیش گوئی کی، برصغیر کی فکری تاریخ میں یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے — مغربی افکار، فلسفے اور مادہ پرستی پر انھوں نے چوٹ لگائی۔ اس کے نتیجہ میں

تعلیم یافتہ مسلمانوں میں مغرب سے مرعوبیت ختم ہونے لگی اور احیائے اسلام کے لئے فضا اور سازگار ہوگئی ۔ مغرب زدہ طبقہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اسلام محض ملا کا مذہب نہیں، ایک کامل دین ہے جو عصر حاضر کے چیلنج کا مقابلہ کرنے اور جملہ مسائل و معاملات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔

تاہم علامہ اقبال کو اس امر کا بھی شدید احساس تھا کہ عصر حاضر کے چیلنج کا جواب دینے کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہے ۔ بدقسمتی سے مذہبی علماء اجتہاد کی اہمیت سے غافل ہو چکے تھے ۔ احیائے اسلام کے ضمن میں فکری سطح پر علامہ اقبال کی مثبت عطا یہ ہے کہ انہوں نے اجتہاد کی ضرورت و اہمیت کو اجاگر کیا ۔ ان کے انگریزی خطبات میں چھٹا خطبہ ''الاجتہاد فی اسلام،، کے موضوع پر ہے ۔ اس سلسلے میں ایک بار فرمایا :

'' آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی سیاسی، معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے،، (۱۹)

علامہ کے ہاں ''اجتہاد،، پر یہ زور مسلم علماء کے اندر صدیوں کے فقہی جمود کے خلاف ایک رد عمل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس رد عمل کا ایک مثبت پہلو، اقبال کا یہ احساس ہے کہ عصر حاضر کی مقتضیات و مسائل کی روشنی میں اسلامی فقہ کی از سر نو ترتیب و تشکیل کی ضرورت ہے۔ ابتدا میں اقبال نے خود اس کام کا آغاز کیا لیکن پھر یہ نازک ذمہ داری کسی روشن دماغ عالم کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ۔ اسی ضمن میں انہوں نے متعدد علماء سے رابطہ قائم کیا مگر بات نہ بن سکی ۔ وفات سے چند ماہ پہلے خواجہ غلام السیدین کو لکھا :

''اسلامی اصول فقه کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا ارادہ تھا لیکن اب
یه امید موہوم معلوم ہوتی ہے''(۲۰)

بدقسمتی سے یه منصوبه بھی، اقبال کے بہت سے دوسرے علمی منصوبوں کی طرح
بروئے کار نه آسکا۔

علمی منصوبوں کی تکمیل کے سلسلے میں علامه اقبال کی خواهش تھی که
کوئی اجتماعی کوشش بھی ہونی چاہئے۔ مختلف اوقات میں علامه نے سید سلیمان
ندوی، مولانا شبلی نعمانی اور سید انور شاہ کاشمیری کو پنجاب منتقل ہونے
کی دعوت دی مگر کامیابی نه ہوئی۔ پٹھان کوٹ کا اداره دارالاسلام اسی سلسله
کی کڑی ہے۔ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں :

''مدت دراز سے علامه کے دماغ میں یه تجویز گردش کر رہی تھی که
ایک علمی مرکز قائم کیا جائے جہاں دینی و دنیاوی علوم کے ماہرین
جمع کئے جائیں اور ان ماہرین کو خورد و نوش کی فکر سے بالکل آزاد
کردیا جائے تاکه وہ ایک گوشے میں بیٹھ کر علامه کے نصب‌العین کے
مطابق اسلام، تاریخ اسلام، تمدن اسلام، ثقافت اسلامی اور شرع اسلام
کے متعلق ایسی کتابیں لکھیں جو آج کل کی دنیا کے فکر میں انقلاب
پیدا کردیں'' (۲۱)

حسن اتفاق سے پٹھان کوٹ (ضلع گورداس پور) کے ایک مخیر مسلمان چودھری
نیاز علی نے اس مجوزہ مرکز کے لئے زمین وقف کردی۔ اس ادارے نے ''دارالاسلام''
کی شکل اختیار کی اور مولانا سید ابوالاعلی مودودی علامه اقبال کے ایما پر دکن
سے یہاں آگئے۔ ان کا ارادہ تھا که ہر سال چند ماہ وہاں آکر قیام کیا کریں گے
مگر افسوس که وہ جلد ہی خالق حقیقی سے جا ملے — اس میں شبہه نہیں که اس

ادارے نے قابل قدر خدمات انجام دیں جس نے آگے چل کر احیائے اسلام کے لئے ایک عملی تحریک کی صورت اختیار کی ۔

(۳)

ہندوستان میں ایک علیحدہ اسلامی ریاست (جسے بعد میں پاکستان کا نام دیا گیا) کا تصور اور اس کے حصول و قیام کے لئے عملی کوششیں، احیائے اسلام کے لئے اقبال کی مساعی میں آخری سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں ۔

علامہ اقبال نے مغرب کے نظریہ قوم پرستی کو رد کرکے اسلام کے تصور ملت کو اجاگر کیا اور اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کا بھی واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ اسلام فرد کا پرائیویٹ مسئلہ نہیں بلکہ وہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے ۔ ایکہ مکمل ضابطہ حیات ہونے کے ناطے وہ حیات و کائنات کے کسی معمولی مسئلے کو بھی نظر انداز نہیں کرتا ۔ اس اعتبار سے سیاست و ریاست کے معاملات بھی مسلمان کے لئے اتنے ہی اہم ہوگئے جتنے مذہب، شریعت اور دین کے مسائل۔ سیاست سے علامہ کی دلچسپی اس لیے تھی کہ اول : ہندوستان آزاد ہو اور دوم : یہاں اسلامی حکومت قائم ہو ۔ ایک مکمل ضابطہ حیات ہونے کی حیثیت سے اسلام ہمیشہ اس امر کا متقاضی رہا (اور ہے) کہ اسے زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ و رائج کیا جائے ۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور ان اقیموا الدین کا مفہوم یہی ہے ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ کا اسوہ حسنہ شاہد ہے کہ سیاست و قوت کے بغیر اقامت دین ممکن نہیں ۔ اقبال کا معروف شعر :

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

اسی نکتے کی شعری تفسیر ہے ۔ ان کے خیال میں باطل کی بیخ کنی بھی قوت کے ذریعہ ہی ممکن ہے :

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم گذر اس عہد میں ممکن نہیں بےچوب کلیم

اسی سلسلےمیں ان کا یہ قول لائق توجہ ھے :

''مسلمانوں کو امربالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ھے ۔ اس سے ظاھر ھے کہ اشاعت حق کے پیچھے طاقت کی حمایت ھونی چاھئے ورنہ بغیر طاقت کے امر و نہی کیسے ممکن ھے ۔ اگر مسلمان امر و نہی کے فرائض ادا کرنا چاھتےھیں تو ان کے بازوؤں میں طاقت ھونا ضروری ھے'' (۲۲)

حمایت حق، شریعت اسلامیہ کے نفاذ اور اقامت دین کے لئے جس قوت کی ضرورت ھے ظاھر ھے وہ سیاسی اقتدار ھے ۔ مگر برطانوی سامراج کی غلامی میں فوری طور پر اقتدار کا حصول ایک امر محال سے کم نہ تھا ۔ تاھم اقبال نے مسلمانوں کے اندر سیاسی شعور کی بیداری پر پوری توجہ کی ۔ اپنے مخصوص افتاد طبع کی بنا پر ایک سیاسی لیڈر کی سی تندھی، مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ تو وہ سیاسی عمل میں حصہ نہ لے سکتے تھے تاھم آزادی سے متعلق کوئی معاملہ ھو یا مسلمانوں کا کوئی مخصوص مسئلہ وہ ھمیشہ ھند مسلم سیاست سے وابستہ رھے ۔ مجلس قانون ساز پنجاب کی رکنیت (۱۹۲٦ء تا ۱۹۲۹ء) کا محرک محض قومی خدمت کا جذبہ تھا ۔ ان تین برسوں میں انھوں نے مجلس میں مسلمانوں کی بھرپور وکالت کی ۔ سیاسی سطح پر اقبال کا اھم کارنامہ یہ ھے کہ انھوں نے ھمیشہ مسلمانوں کی علیحدہ قومیت پر زور دیا اور مخلوط انتخاب کی مخالفت کی ۔ مسلمانوں کے جداگانہ ملی تشخص کی خاطر جداگانہ اصول انتخاب پر اقبال کا اصرار آگے چل کر ایک جداگانہ اسلامی ریاست کے تصور کی شکل میں سامنے آیا — اقبال کی خداداد بصیرت نے دیکھ لیا تھا کہ ھندوستان میں انگریزوں کے دن گنے جا چکے ھیں اور ان کے رخصت ھونے کے بعد، اصول جمہوریت کے تحت ھندوستان کا اقتدار ھندوؤں کو

منتقل ہو جائے گا۔ اس صورت میں احیائے اسلام تو کجا، ہندی مسلمانوں کو اپنے ملی وجود کی بقا کے لئے ساری کوششیں مرکوز کرنی پڑیں گی — اس مرحلہ پر علامہ نے الہ‌آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کا تصور پیش کیا (تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے خطبہ الہ آباد)۔

جس زمانہ میں اور جس موقع پر اقبال نے ایک ''منظم اسلامی ریاست،، کا تصور پیش کیا، اس کی نزاکت اور تقاضا علامہ کی تجویز کو بے حد اہم بنا دیتا ہے — وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں مسلمان شدید انتشار اور مایوسی کا شکار تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح ہندوستانی سیاسیات سے بد دل ہوکر لندن جابسے تھے۔ اور بقول سید نور احمد : ''مسلم لیگ کا پلیٹ فارم طفلانہ حرکتوں کا میدان بن گیا تھا،،(۲۳) اس مایوس کن صورت میں اقبال کی پیش‌کردہ اسلامی ریاست کی تجویز، ہندی مسلمانوں کے لئے ایک بڑا سہارا ثابت ہوئی۔

پھر علامہ اقبال نے پاکستان کا تصور پیش کرنے پر ھی اکتفا نہیں کیا بلکہ حصول پاکستان کی جہد و جہد کی تائید کی اور حتی المقدور اس جہدوجہد میں عملاً شریک بھی ہوئے۔ یوں تو وہ پہلے بھی لیگ سے وابستہ رہ چکے تھے مگر عمر کے آخری دو برسوں میں انھوں نے قائداعظم کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے پنجاب مسلم لیگ کی صدارت قبول کرلی۔ ان کا یہ اقدام اس وقت کی ہندوستانی سیاسیات اور مسلم لیگ کی تاریخ میں زبردست اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ۱۹۳۴ء سے علیل تھے اور طویل بیماری نے ان کی عملی زندگی تقریباً ختم کر دی تھی لیکن اسلامی نشاۃ ثانیہ کی دیرینہ تمنا نے انھیں پراونشیل لیگ کی صدارت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ علامہ کا یہ اقدام مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب بنا اور اقبال کی

شہرت و مقبولیت نے مسلم لیگی کارکنوں کے لیے راہ عمل آسان کردی (۴۲)

مسلمانوں کے مستقبل سے ان کی دلچسپی، خطوط اقبال بنام قائداعظم سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ خطوط اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے اقبال کے ولولوں، امنگوں اور مضطرب جذبوں کا خوب صورت اظہار ہیں۔ ہندوستان کے مسلم سیاسی رہنماؤں میں انہوں نے محمد علی جناح سے تمام تر توقعات وابستہ کرلی تھیں۔ جناح صاحب کی قیادت میں مسلمانان ہند نے ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کے ذریعے پاکستان کو اپنی جدوجہد کی منزل مقصود قرار دیا اور سات سال بعد ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کی حیثت سے وجود میں آیا۔

پاکستان اسلامی نشاۃ ثانیہ کے سلسلے میں علامہ اقبال کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ اگرچہ حقیقی تعبیر اس وقت سامنے آئے گی جب پاکستان میں اسلامی قانون اور شریعت محمدیہ کا مکمل اور نتیجہ خیز نفاذ ہوگا اور پاکستان، دنیا میں اسلام کے احیا اور مسلمانوں کی سر بلندی کی واضح علامت بن جائے گا۔

احیائے اسلام کے لئے علامہ اقبال کی اس جہدوجہد میں اسلام اور ملت اسلامیہ کے لیے ان کے انتہائی خلوص، درد مندی اور دل سوزی کے جذبات بہت نمایاں ہیں۔ ان کا یہ شعر اسی کیفیت کا آئینہ‌دار ہے:

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز وساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

پھر اپنی ساری مساعی‌میں عشق رسول، اقبال کے لیےسب سے بڑا سہارا ہے۔ آنحصرت کے ایک فرمان کے مطابق غلبہ دین کے لیے کوشش ایک مسلمان کے لئے[۱] ایمان کی بنیادی شرائط میں سے ہے۔ آں حضور کی ذات اور آپ کا اسوہ حسنہ کار زار حیات میں اقبال کیلئے روحانی تائید کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ لکھتے ہیں :

''عام مسلمانوں کی طرح میرا بھی یہ عقیدہ ہے ۔ کہ حضور رسالت مآب کی زیارت خیر و برکت کا باعث ہے ۔ گذشتہ دس پندرہ سال میں کئی لوگوں نے مجھ سے ذکر کیا ہے۔ کہ انھوں نے حضور رسالت مآب کو جلالی رنگ میں یا سپاھیانہ لباس میں خواب میں دیکھا ہے ۔ میرے خیال میں یہ علامت احیائے اسلام کی ہے'' (۲۵)

اس ساری تگ و دو اور جہدوجہد کا مقصد بھی سنت رسول کی پیروی ہے تا کہ اس طرح آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات با برکات تک رسائی حاصل ہو اور ان کا قرب نصیب ہو۔ اقبال کے نزدیک ایک مسلمان کی جملہ مساعی کا محور یہی ہونا چاہیے :

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر بہ او نہ رسیدی، تمام بولہبی است

ان کے خیال میں آں حضور کی ذات گرامی سے تعلق خاطر نہ صرف دنیا بلکہ آخرت میں بھی مومن کی کامیابی کی ضمانت ہے ۔ احیائے اسلام اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے کی جانے والی کوششوں اور کاوشوں کا منتہائے مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کے قلوب عشق رسول کی سچائی، روشنی اور حرارت سے منور ہو کر جگمگا اٹھیں :

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

احیائے اسلام کے لئے علامہ اقبال کے ایمان افروز مشن کی داستاں، اقبال کے نام لیواؤں کے لئے ایک مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال نے نشاۃ ثانیہ کے لئے عمر بھر جو کاوشیں کیں ابھی ان کی تکمیل باقی ہے وہ آج بھی ہمارے لئے دعاگو ہیں:

عطا اسلاف کا جذب دروں کر　　　　شریک زمرۂ لا یحزنون کر

اور:

دل مرد مومن میں پھر زندہ کردے　　　　وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لا تذر میں

عزائم کو سینوں میں بیدار کردے　　　　نگاہ مسلماں کو تلوار کر دے

علامہ اقبال کی یہ دعا دنیا بھر کے مسلمانوں کو ان کا فرض یاد دلا رہی ہے:

فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

حوالہ جات

۱ ۔ گفتار اقبال — ص ۱۷۸

۲ ۔ کتاب مذکور، ص ۱۹

۳ ۔ مقالات اقبال ص ۵۳

۴ ۔ نقوش، اقبال نمبر دوم ص ۴۰۴

۵ ۔ شذرات فکر اقبال، ص ۱۲۴

۶ ۔ گفتار اقبال، ص ۲۵۵

۷ ۔ شذرات فکر اقبال، ص ۸۵

۸ ۔ گفتار اقبال، ص ۲۱۳

۹ ۔ حوالہ مذکور

۱۰ ۔ ملفوظات اقبال ص ۳۹

۱۱ ۔ اقبال نامہ، دوم ص ۱۹۳

۱۲ ۔ اقبال نامہ جلد اول : ص ۷۸

۱۳ ۔ انوار اقبال : ص ۱۷۶

۱۴ - حرف اقبال : ص ۲۲۲

۱۵ - کتاب مذکور : ص ۲۶۱

۱۶ - مقالات اقبال : ص ۹۲

۱۷ - اقبال نامہ، جلد دوم : ص ۳۹۳

۱۸ - اقبال نامہ، جلد اول : ص ۳۱۹

۱۹ - حیات انور: ص ۱۶۵

۲۰ - اقبال نامہ، جلد اول : ص ۳۲۰

۲۱ - ذکر اقبال : ص ۲۱۲ - ۲۱۳

۲۲ - نقوش، اقبال نمبر ۱ ص ۴۰۷

۲۳ - مارشل لاء سے مارشل لاء تک : ص ۱۴۱

۲۴ - تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو : ''اقبال کے آخری دو سال،،

۲۵ - انور اقبال : ص ۲۱۶

کتابیات

۱ - کلیات اقبال فارسی مطبوعہ شیخ غلام علی پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۳ء

۲ - کلیات اقبال اردو مطبوعہ شیخ غلام علی پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۳ء

۳ - گفتار اقبال، مرتبہ : محمد رفیق افضل، ادارہ تحقیقات پاکستان پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء

۴ - مقالات اقبال، مرتبہ : عبدالواحد معینی، شیخ محمد اشرف لاہور، ۱۹۶۳ء

۵ - شذرات فکر اقبال، مترجم : ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۳ء

۶ - ملفوظات اقبال، مرتبہ : محمود نظامی، لاہور، س ۔ ن

۷ - اقبال نامہ اول، مرتبہ : شیخ عطاءاللہ، شیخ محمد اشرف لاہور، (۱۹۴۵ء)

۸ - اقبال نامه دوم، مرتبه : شیخ عطا اللہ،شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۵۱ء
۹ - انوار اقبال، مرتبہ: بشیر احمد ڈار، اقبال اکادمی پاکستان کراچی، ۱۹۶۷ء
۱۰ - حرف اقبال، مترجم : لطیف احمد شیروانی، ایم ثناءاللہ خان اینڈ سنز لاہور، ۱۹۴۷ء
۱۱ - ذکر اقبال : عبدالمجید سالک، بزم اقبال لاہور، ۱۹۵۴ء
۱۲ - اقبال کے آخری دو سال : ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۶۱ء
۱۳ - تجدید و احیائے دین : ابو الاعلی مودودی، لاہور، ۱۹۵۴ء
۱۴ - حیات انور : سید محمد ازہر شاہ قیصر : دیوبند ۱۹۵۵ء
۱۵ - مارشل لاء سے مارشل لاء تک : سید نور احمد، لاہور، ۱۹۷۰ء
۱۶ - نقوش، اقبال نمبر حصہ اول و دوم، لاہور، ۱۹۷۷ء، ۱۹۷۸ء

ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد

سکولوں ، کالجوں اور لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

ماھنامہ
فکر و نظر
اسلام آباد

جلد - ۱۸ | ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ ☐ فروری ۱۹۸۱ء | شمارہ - ۹

فہرست

مجلس ادارت

نظـــرات

ربیع الاول کا شمارہ حروف کی دو رنگی اور اپنی دو گونہ اختصاصی جہات کے باعث مشترک اور مخلوط نوعیت کا حامل تھا ۔ اس میں کچھ مضامین ,,صدی ھجری،، کے آئینہ دار تھے تو کچھ ,,سیرت النبی،، کے عکس ریز۔ صوری اعتبار سے اس شمارے میں قدیم و جدید کا حسن امتزاج یوں دیکھا جا سکتا ہے کہ اس میں ایک طرف پرانی مشین کی لیٹر پرنٹنگ ہے تو دوسری طرف نئی مشین کی آفسٹ پرنٹنگ بھی ہے۔ حروف دونوں میں ٹائپ کے ھیں ۔ قارئین نے نوٹ کیا ھوگا کہ نئے ٹائپ کے حروف خوبصورت بھی ھیں اور خوش وضع بھی ۔ ان کے نقوش تیکھے ھیں ، نوک پلک سنوری ھوتی ہے ، خط و خال میں ایک طرح کا بانکپن ہے۔ امید ہے کہ اسے پسند کیا جائے گا ۔ بعض قارئین نے شکایت کی ہے کہ کتابت کو بدل کر ٹائپ میں رسالہ کیوں چھاپا جا رھا ہے۔ امید ہے کہ نئے ٹائپ کے بعد ان کی شکایت رفع ھو جائے گی اس لئے کہ یہ ٹائپ اس قابل ہے کہ اسے خط نستعلیق کا نعم البدل کہا جائے۔

دو رنگی کی لفظی مناسبت سے اقبال کا ایک شعر یاد آ گیا ۔

دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ھو جا
ســـرا سـر موم ھو یا سنگ ھو جا

کسی حریف ظریف کی رگ ظرافت پھڑک اٹھے تو وہ اس شعر سے محظوظ ھو لے۔ ھـم نے خود ھی اس کی ضیافت طبع کا سامان کر دیا ہے۔ مگر ارباب معنی جانتے ھیں کہ یہ شعر موجودہ صورت حال پر چسپاں نہیں ھوتا ۔ اس کے جواب میں اقبال ھی کے بعض اشعار یاد آتے ھیں جن سے اس کی وضاحت ھو جاتی ہے۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

یہ شعر کل یوم ہو فی شان (القرآن) اور تخلقوا باخلاق اللہ (الحدیث) " سے مستفاد ہے۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اشداء علی الکفار و رحماء بینھم (القرآن) کو اقبال نے شعر کا قالب عطا کیا ہے۔

شکر ہے کہ رفتہ رفتہ پابندی وقت کا عہد بھی پورا ہوتا نظر آ رہا ہے۔
اس مہینے رسالہ قمری حساب سے یکم تاریخ کو شائع ہو گیا ۔ اس کے لئے میں ادارے کے پریس منیجر ظفر علی صاحب کا شکر گزار ہوں ۔ انھوں نے نہ صرف تعاون کیا بلکہ حائل رکاوٹوں کو دور کرنے میں غیر معمولی جد و جہد سے کام لیا ۔ دعا ہے کہ بیچ میں پھر کوئی ناگہانی افتاد نہ پیش آئے جس کے باعث پرانی حالت عود کر آئے ۔ ایک ماھنامے کے لئے یہ بات ناقابل تصور ہے کہ وہ وقت پر شائع نہ ہو اور مہینوں لیٹ رہے۔ جنوری ۱۹۸۰ء میں جس وقت میں نے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی تھی پرچہ تین ماہ لیٹ تھا ۔ ایک سال کی جد و

جہد کے بعد ہم اس قابل ہو سکے کہ مقررہ وقت پر ماہ بماہ رسالہ آنے لگا۔ فالحمد للہ علی ذالک ۔ اس میں جہاں فکر و نظر کے ماتحت عملے کی فرض شناسی اور احساس ذمہ داری کو دخل ہے وہاں پریس منیجر اور ان کے ماتحت عملے کی بہتر کارکردگی ، مستعدی اور تندھی کا بھی حصہ ہے۔ میں ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ باہمی تعاون کی مدد سے ہم آئندہ بھی اس اچھی روایت کو جاری رکھ سکیں گے ۔ و باللہ التوفیق ۔

(شرف الدین اصلاحی)

قومی اور ملی تشخص کا پاس کرتے ہوئے فکرونظر انگریزی کیلنڈر کی بجائے عربی تقویم کے مطابق شائع کیا جاتا ہے۔ لیکن انگریزی تاریخوں کے رواج اور چلن کی وجہ سے سہولت کے لئے اس کا ذکر بھی ضروری ہوتا ہے۔ عربی اور انگریزی تاریخوں میں ہر سال جو فرق واقع ہوتا ہے اس کی وجہ سے دن تو کیا مہینوں میں بھی کلی مطابقت نہیں ہوتی۔ ربیع الاول کے فکرونظر پر پہلے حساب سے فروری کا مہینہ درج کیا گیا تھا۔ ربیع الثانی کے فکرونظر پر اس لحاظ سے مارچ کا اندراج ہونا چاہئیے تھا۔ مگر یکم ربیع الثانی کو ۵ فروری ہوگی اس طرح اس مہینے کا بڑا حصہ فروری میں گزرے گا ۔ اس لئے ربیع الثانی کے رسالے پر مارچ کی بجائے فروری کا مہینہ درج کرکے مطابقت پیدا کی گئی ہے۔

کشمیر میں سن هجری کی ترویج
اور
علوم و فنون کا ارتقاء

ڈاکٹر صابر آفاقی

مضمون نگار نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا ۔ انہوں نے تفصیل اور وضاحت سے یہ تو بتایا نہیں کہ کشمیر میں اسلام کی نشر و اشاعت کس طرح ہوئی ۔ مسلمانوں کے عہد میں کتنی مسجدیں تعمیر ہوئیں ، کتنے عربی اور دینی مدرسے ، علمی اور ادبی ادارے قائم ہوئے ۔ عربی زبان ، قرآن ، حدیث ، فقہ اور اسلامی تاریخ کی تعلیم کو کس درجہ فروغ ہوا ۔ دینی علوم اور اسلامی موضوعات پر کتنی کتابیں تصنیف کی گئیں ۔ کس پایے کے علماء و فضلا داعی اور مبلغ پیدا ہوئے ۔ جبکہ موضوع کے اصل تقاضے یہی تھے ان تقاضوں کو نظر انداز کیا گیا یا کما حقہ پورا نہیں کیا گیا ۔

مضمون نگار نے ظلم یہ کیا کہ نام نہاد فنون لطیفہ ،، اور اس کے لوازمات کی بہت سی ایسی خرافات کو بھی اسلامی علوم و فنون کے ذیل میں گنا ڈالا جن کا اسلام سے دور کا تعلق بھی نہیں ، محض اس لئے کہ ان کو فروغ دینے والے یا ان کی سرپرستی کرنے والے نام نہاد مسلمان تھے ۔ ڈوم ڈھاری ، بھاٹ مراثی ، سازندے ، گویے ، نچنیے ، اداکار اور اداکارائیں پیدا کرنے کے لئے اسلام نہیں آیا تھا

فن تعمیر ، ادب اور شاعری ، خطاطی ، نقاشی ، مینا کاری ، فن سپہ گری ، صنعت و حرفت کے پیشوں کی حد تک تو ، بشرطیکہ یہ سب اسلامی روح سے متصادم نہیں بلکہ هم آهنگ هوں ، کھینچ تان کر گنجائش نکالی جا سکتی ہے ۔ مگر یہ ناچ رنگ ، گانا بجانا ، اداکاری ، نقالی ، بھسی اور مسخرہ پن کے لئے اسلامی تہذیب و ثقافت میں کہاں سے جگہہ پیدا کی جا سکتی ہے ۔ (مدیر)

وادی کشمیر نگینہ زمرد میں ہے تو اس کے اطراف میں واقع علاقہ هائے کشتواڑ جموں ، راجوری ، پونچھ ، مظفرآباد ، گلگت ، بلتستان اور لداخ اس نگینے کا حلقۂ زریں ۔ کشمیر وادی اگر پھول ہے تو اطراف کے پہاڑی علاقے اس پھول کی پنکھڑیاں هیں ۔ مگر تعجب ہے کہ همارے ملکی وغیر ملکی مورخین کشمیر وادی کی تاریخ و ثقافت پر قلم اٹھاتے وقت ان پنکھڑیوں کو نظر انداز کر جاتے رہے ۔ اس طرح وہ همیں اس خطہ کی ادھوری اور یک طرفہ تصویر هی دکھا سکے ۔ حالانکہ وادی کی هر سیاسی ، مذهبی ، تمدنی اور ثقافتی تبدیلی ارد گرد کے علاقوں پر اثر انداز هوتی رهی ہے ۔

کشمیر کی تمدنی سرگزشت کا تاریخ ریکارڈ همیں ٢٦٦٦ ق م سے ملتا ہے ۔ کشمیر اور اس کے ملحقہ علاقوں پر دوسری صدی عیسوی میں یونانیوں نے حملہ کیا ۔ اسی صدی میں شُک اور پھر کوشان قبائل نے اسے فتح کیا ۔ ان حملوں نے کشمیر کی تہذیب و ثقافت پر دیرپا اور دور رس اثرات مرتب کئے ۔ ایک هندو مورخ بنیر جی کے بقول پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں گوجر قبائل نے کشمیر اور اس کے اطراف کو فتح کرکے زیرنگین کیا ۔[١]

بعد کی صدیوں میں هندومت اور پھر بدھ مت نے یہاں اپنا اقتدار قائم کیا ۔ اور یہ سرزمین گندھارا تہذیب کا اهم مرکز بن گئی ۔ نیل مُنی کی نیل مت

پوران اور پنڈت کلہن کی راج ترنگنی میں کشمیر میں ان مختلف تمدنوں کے عروج و زوال کی تفاصیل ملتی ہیں ۔

ساڑھے چار ہزار سال کی طویل تاریخ کے دوران کشمیر کی سرکاری ، علمی ، ادبی اور دینی زبان سنسکرت رہی جو شاردا رسم الخط میں اور بھوج پتر پر لکھی جاتی تھی ۔ اس عہد کے سبھی علوم و فنون مثلاً شاعری ، مصوری، ڈرامے ، مجسمہ سازی اور فن تعمیر میں ہندو روایات و عقائد کی عکاسی ہوتی تھی ۔ آخر کار رسم و رواج کی پابندی ، ذات پات کی تقسیم ، مہاجنی نظام اور برھمنی اقتدار نے ہندو سوسائٹی کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا اور ہندو عوام زندگی میں بہتر تبدیلیوں کے خواھش مند نظر آنے لگے ۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قدیم کشمیر کی سرحد ملتان سے ملی ہوئی تھی ۔ ساتویں صدی عیسوی کے آواخر میں جب محمد بن قاسم کے ہمراہ مسلمانوں نے سندھ کو فتح کرکے یہاں اسلام کی تعلیمات توحید ، عدل اور مساوات رائج کیں تو اس معاشرتی نظام کی خوشبو گلزار کشمیر میں بھی مہکنے لگی ۔ محمد بن قاسم کے اسلامی لشکر میں عرب و عجم کے لشکری شامل تھے۔ لہذا دھیرے دھیرے کشمیر میں فارسی زبان نہ صرف یہ کہ جڑ پکڑنے لگی بلکہ تاریخ بیہقی کے مطابق کشمیر گیارھویں صدی عیسوی میں فارسی زبان و ادب اور رسم الخط کا مرکز بن چکا تھا ۔ ابو الفضل لکھتا ہے کہ ایک حجام کا لڑکا جس کا نام تلک تھا ہندو کشمیر میں زیر تعلیم رہ کر فارسی زبان و خط میں مہارت حاصل کر چکا تھا اور وہ محمود غزنوی کا ترجمان مقرر ھوا تھا ۔ ابو الفضل لکھتا ہے ۔ این تلک پسر حجامی بود و لکن لقائی و مشاھدتی و زبانی فصیح داشت و خط نیکو بھندوی و فارسی ۔ و مدتی دراز بکشمیر رفتہ بود و شاگردی کردہ ۔(۲)

محمود غزنوی نے ۱۰۱۵ عیسوی میں کشمیر پر حملہ کیا ۔ وہ اس ریاست کو فتح تو نہ کر سکا لیکن اس کے حملے نے کشمیر کے معاشرتی ڈھانچے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا ۔ پنڈت کلہن نے راج ترنگنی مولفہ ۱۱۴۹ ع میں دویـــر اور گنجـــور جیسے فارسی الفاظ برتے ہیں جو کشمیر میں فارسی زبان کے نفوذ کا پتہ دیتے ہیں ۔ مشہور سیاح مارکو پولو لکھتا ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں کشمیر وادی میں مسلمانوں کی خاصی تعداد موجود تھی ۔

۱۳۲۵ ع میں کشمیر کا بدھ راجہ ، رینچن مسلمان ہو کر سلطان صدر الدین کہلایا اور یہ سال اسلامی ثقافت کے باقاعدہ استقرار کا نقطہ آغاز بن گیا ۔ اب فارسی زبان نے کشمیریوں پر نئے علوم و فنون کے دروازے کھول دئیے تھے ۔

اس اہم تاریخی تبدیلی کے چند ہی سال بعد ۱۳۳۹ ع میں شاہمیری خاندان کی حکومت قائم ہوئی تو اطراف کے کئی علاقے فتح کرکے سلطنت میں شامل کر لئے گئے ۔ شاہمیری عہد میں نومسلموں اور ایران و ترکستان سے آنے والے سینکڑوں علماء و صوفیاء کی بدولت کشمیر میں مکمل فکری و تہذیبی انقلاب رونما ہو گیا ۔ ان مہاجرین میں سید علی ہمدانی قابل ذکر ہیں ۔ مسلمان نیا تمدن اور نئی معاشرت ساتھ لائے تھے ۔ اخلاق ، آداب مجلس ، ادب و فنون ، یہاں تک کہ نیا لباس ، نیا سامان آرائش ، نئے کھانے ، نئی صنعتیں اور نئی اصطلاحات اپنا لی گئیں ۔ مسلمانی لباس کے رواج کے بارے میں میر حسن لکھتے ہیں ،،در زمان سلاطین کشمیر کہ مرد مان ہندوستان و ترکستان در اینجا وارد شدند و باشندگان اینجا دستار مشعث درعی و کفش اوزبکی یعنی میخ دار و پیراهن فراخ و طویل سینہ کشاده و آستین بہ درازی یک نیم درعہ چوڑی دار مروج نمودند،، ۔(۴)

لباس کی تبدیلی کے بعد تقویم میں تبدیلی لائی گئی ـ آپ جانتے ہوں گے کہ ہندو دور میں کشمیر میں جو مقامی سنہ مروج تھا اسے لوکک کہتے ہیں جو سپت رشی نے ایجاد کیا تھا ـ اس کی ابتداء ۳۰۷۵ ق م سے کی گئی تھی ـ اس حساب سے ۱۹۸۰ ع میں اس سنہ کا ۵۰۵۵ واں سال گزر چکا تھا ہے ـ جب کشمیر کا بدھ راجہ رینچن مسلمان ہوا تو اس نے یہ قدیم تقویم بھی موقوف کر دی اور اس کی جگہ ہجری سنہ کو رائج کیا ـ (۳) کشمیر اور اطراف کشمیر پر ۱۳۲۵ سے لے کر ۱۸۱۹ ع تک چار مسلمان خاندانوں ـــــ شاہمیریوں ، چکوں ، مغلوں اور افغانوں نے حکومت کی ـ ان خاندانوں کے پانصد سالہ عہد حکومت میں یہاں اسلامی تہذیب و ثقافت (۱) علم و ادب فکرو فلسفہ اور فن و ہنر کو فروغ حاصل ہوا ـ

کشمیر میں اسلام کے ورود سے قبل یہاں کے فن تعمیر پر ترکستانی ، رومی اور یونانی فن تعمیر کا اثر نمایاں رہا ـ مارتنڈ اور اونتی پور کی عمارات کے کھنڈر آج بھی اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں ـ منقش ستونوں اور دیواروں پر بنے ہوئے اپالو جیسے نقش و نگار اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں کہ یہ علاقہ ایک مدت تک یونان کے زیر نگیں رہا ـ

بعد کے ادوار میں کشمیر ہندو اور بدھ تہذیب و تمدن کا اہم مرکز بنا ـ ان زمانوں میں مندر ، اسٹوپا اور قلعے وغیرہ پتھر سے بنائے جاتے تھے ـ دیواروں پر دینی بزرگوں اور دیوتاؤں کی شبیہیں تراشی جاتی تھیں ـ ستونوں پر مورتیاں بنائی جاتی تھیں ـ اسلام کی آمد کے بعد سے یہ فن تعمیر یکسر بدل گیا ـ اسلام میں مورتی پوجنا اور مورتی بنانا حرام ہیں ـ لہذا سابقہ طرز تعمیر کے ساتھ

---

۱ ـ اسلامی تہذیب و ثقافت اور مسلم تہذیب و ثقافت میں فرق کرنا چاہئیے ـ دونوں کو اکثر خلط ملط کر دیا جاتا ہے جس سے خلط مبحث ہوتا ہے ـ (اصلاحی)

عمارتوں پر مشرکانہ علامتوں کی ترسیم موقوف ہو گئی ۔ مندر کی جگہ مسجد اور پاٹھہ شالہ کی جگہ مدرسہ تعمیر ہونے لگا ۔ اس طرح برج و مینار اور گنبد و محراب کے ظہور نے حسن تعمیر کو دو چند کر دیا ۔ مکین بدلا تو مکان بھی بدل گیا ۔ نئی سوچ نے جدید طرز تعمیر کو عام کیا ۔ نئے قلعوں ، باغوں ، نہروں ، تالابوں ، پلوں ، مسجدوں اور خانقاھوں میں اسلامی فن تعمیر کا حسن نظر آنے لگا ۔

اھل کشمیر مسلمان ہوئے تو سنسکرت کی جگہ فارسی نے لے لی ۔ بھوج پتر پر لکھنا متروک ھوا ۔ شاردا رسم الخط پر فارسی رسم الخط نے خط تنسیخ پھیر دیا ۔

اس انقلاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کشمیر کا شاعر ملا ندیمی کہتا ہے ۔

زین تختہ ھائے کاغذ زیبای رنگ رنگ
بشکست دور گردش پرکار عرش توز

چنانچہ لائبریریاں قائم ہوئیں اور مدارس میں اسلامی علوم کی تدریس ہونے لگی ۔ پھر جلد ھی خود کشمیری جو کتاب خواں ھی تھے صاحب کتاب بھی بن گئے ۔ جن علما نے مختلف موضوعات پر فارسی و عربی میں کتابیں اور حواشی تحریر کرکے شہرت پائی ان میں چند ایک کے نام یہ ھیں ۔ شیخ یعقوب صرفی ، ملا محسن فانی ، ملا محمد امین ، ملا نور محمد ، ملا محمد سعید ۔ اور ملا محمد انور مظفر آبادی کاشمیری ۔ ان علماء میں سرآمد روزگار ملا کمال کشمیری ھیں جن کی شاگردی پر ملا عبد الحکیم سیالکوٹی جیسے فلسفی ، مجدد الف ثانی جیسے مصلح ملت اور نواب سعد اللہ علامی جیسے سیاست

دان کو ناز تھا ۔ چونکہ کشمیر میں اسلام کی باقاعدہ اشاعت ۱۳۲۵ ع میں ایک عالم اور صوفی سید شرف الدین بلبل شاہ کے ذریعے ہوئی لہذا جلد ھی وادی اور اس کے اطراف میں ایک وسیع خانقاھی نظام قائم ھو گیا ۔ کشمیر میں تصوف کی بنیاد گوللہ عارفہ اور شیخ نوالدین ریشی نے رکھی ۔ مگر بعد کی صدیوں میں سہروردیہ ، قادریہ نقشبندیہ ، نور بخشیہ ، چشتیہ اور کبرویہ سلسلے کے صوفیاء نے عوام کی رشد و ھدایت کے لئے کوششیں کیں ۔ ان سلسلوں کے مشاھیر صوفیاء میں بابا نصیب الدین ، غازی شیخ مخدوم حمزہ ، بابا داؤد خاکی ، یعقوب صرفی اور بہاؤ الدین گنج بخش ہوئے ھیں ۔ شاھمیری اور چک عہد حکومت کے دوران وادی میں سینکڑوں خانقاھیں تعمیر ھوئیں ۔ تاریخ نے جن خانقاھوں کے نام محفوظ رکھے ھیں ان میں یہ زیادہ مشہور ھیں ۔ خانقاہ والا ۔ خانقاں کبرویہ ، خانقاہ اعلاً ، خانقاہ فیض پناہ ، خانقاہ سید محمد مدنی ، خانقاہ شمسی ، خانقاہ چشتی ، خانقاہ شیخ العالم ، اور خانقاہ معلّی ۔

فارسی میں جن کشمیری اھل قلم نے کتب تاریخ قلم بند کیں ان میں چند نمایاں نام یہ ھیں ۔ حیدر ملک چاڈورہ ، سید مہدی کشمیری ، نرائن کول عاجز ، رفیع الدین غافل ، خواجہ اعظم دیدہ مری ، بدیع الدین ، دیوان کرپارام ، بہاؤالدین خوشنویس ، خواجہ سناء اللہ خراباتی ، پیر حسن اور حاجی محمد مسکین ۔[۱]

سر زمین کشمیر سے فارسی کے جو عظیم شعراء اٹھے ان میں صوفی ، فانی ، مظہری غنی ، جویا ، اسلم سالم ، اور ملا حمید اللہ شاہ آبادی قابل ذکر ھیں ۔ ان شاعروں کا کلام اھل زبان کی میزان میں تل کر سند اعتبار حاصل کر

۱ ۔ کشمیری اھل قلم کے ذکر میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کے نام بھی ھیں ۔ موضوع کو مدنظر رکھیں تو یہ وضع الشی فی غیر محلہ کے حکم میں آتا ھے ۔ انہوں نے فارسی میں لکھا ھے ان کا ذکر بہتر ھوتا کہ الگ سے کیا جاتا ۔

چکا ہے۔

فارسی و عربی نے کشمیری اور دیگر زبانوں یعنی پہاڑی ، گوجری ، ڈوگری ، لداخی ، بلتی اور شنا پر نمایاں اثر ڈالا ہے۔ صرفی و نحوی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ فارسی نے ان زبانوں کو شعر و ادب کے اعتبار سے غنی بنایا اور ذخیرہ الفاظ میں بھی اضافہ کیا ۔ فارسی کا سب سے زیادہ اثر کشمیری شاعری پر ہوا ۔ دراصل کشمیری زبان کے شاعروں نے فارسی شاعروں کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری کی غزل فارسی غزل کی نقالی نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں فارسی مثنویوں کو سامنے رکھ کر کشمیری میں خمسے کہے گئے ۔ عرب و فارس کی داستانوں۔ شیریں فرہاد ، یوسف زلیخا ، لیلی مجنوں، وامق عذرا ، شیخ صنعان کو کشمیری کا جامہ پہنایا گیا ۔ کئی فارسی مثنویوں کے کشمیری نظم میں تراجم کئے گئے ۔ اس مختصر سے جائزہ کی روشنی میں یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ اگر کشمیر میں فارسی نہ پہنچتی تو موجودہ کشمیری زبان پیدا ھی نہ ھوتی ۔

اسلام کے آنے سے قبل یہاں مصوری اور مجسمہ سازی کا فن عروج کو پہنچا ھوا تھا ۔ اسلام میں مجسمہ سازی ممنوع ہے لہذا کشمیری مسلمانوں نے اس کی جگہ خطاطی ، مصورانہ خطاطی اور نقاشی کو رواج دیا ۔ کشمیر کے جن خطاطوں نے برصغیر میں شہرت پائی اور اپنے فن کا لوھا منوایا ان میں یہ فنکار ممتاز مقام رکھتے ھیں ۔

میر حسن کشمیری ، محمد حسین زریں قلم ، حسین کشمیری ، محمد مراد زریں قلم ، ملا محمد محسن ، محمد علی کشمیری ، محمد جعفر کشمیری، محمد ابراھیم ، ملا باقر کشمیری ، بہاء الدین خوشنویس ، حیدر کشمیری، ہدایت اللہ زریں قلم ، محمد رضا مشتاق ، محمد تقی کشمیری ، امام دیری، عبد

الرسول اور احمد علی کشمیری ۔ ان خطاطوں کی تحریروں کے نمونے ایر
ترکی اور یورپ کے کتب خانوں میں آج بھی دیکھے جا سکتے ھیں ۔ سلا
کشمیر اور مغل عہد حکومت میں خطاطی کو بے حد ترقی ھوئی ۔ اکثر حک
خوشنویسی کے شیدا اور خطاطوں کے قدردان تھے ۔ بطور مثال عالم گیر کی
زیب النساء نے ملا محمد شفیع کی نگرانی میں کشمیر میں ایک دفتر قائم کر
تھا جس میں خوشنویس نقاش اور طلا کار کام کیا کرتے تھے ۔

شاعری ، فن تعمیر اور خطاطی کے ساتھ ساتھ کشمیر و اطراف ک
کے فن کاروں نے مصوری و نقاشی جیسے اہم فنون میں کمال حاصل کیا ۔ ا
گپت ,,کٹنی مت،، میں لکھتا ہے کہ قدیم عہد میں کشمیر میں نقاشی تجارت
فروغ کا ذریعہ تھی ۔ نقاشی کپڑے اور دیواروں پر کی جاتی تھی ۔ کشمیر
باشندے مسلمان ھوئے تو انہوں نے عمارات میں نقاشی کی جدتیں دکھائیں
چھت کے نیچے منقش لکڑی استعمال ھونے لگی ۔ انواع و اقسام کی نقاشی
وہ کرداروں کو مجسم کر دیتے اور مناظر فطرت کی ایسی سچی تصویریں کھی
کہ وہ حقیقت کا ھم پلہ ٹھہرتیں ۔ عہد اکبری میں کشمیری ھنر مندو
مصوری میں اس طرز خاص کو ایجاد کیا جسے کشمیری قلم کہا گیا ۔ وکٹ
البرٹ میوزیم لندن میں ۲۴ بڑی تصاویر آج بھی موجود ھیں جو کپڑے پر
ھوئی ھیں اور ان کو سولھویں صدی عیسوی میں کشمیر میں بنایا گیا تھا

میں یہ رائے پیش کرنے میں کوئی مبالغہ نہیں سمجھتا کہ کشم
باشندہ شاعری خوش الحان پرندوں سے ، رقاصی بل کھاتی ھوئی ندیوں سے
موسیقی نغمہ ریز جھرنوں سے بچپن ھی میں سیکھ لیتا ہے ۔ نیل مت پورا
راج ترنگنی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر میں موسیقی قدیم ایام سے
مروج رھی ہے ۔ یہ موسیقی چھند پربند ، گیت، ودھا ، اشلوک اور پد کہ

تھی ۔ شاھمیری خاندان کے سلطان زین العابدین نے جھاں دیگر اسلامی فنون کو فروغ دیا وھاں اس نے موسیقی کی ترویج کے لئے بھی لائق تحسین کوشش کی ۔ مورخین نے لکھا ہے کہ وہ سونے چاندی سے ساز بھر کر سازندوں کو بطور انعام دیا کرتا تھا ۔ علاوہ ازیں اس نے ایران ، خراسان اور ترکستان سے نامی موسیقاروں کو بلا کر کشمیر میں آباد کیا تھا ۔ اس نے ملا عودی ، اور ملا جمیل کو خراسان سے بلایا تھا ۔ ملا جمیل نقاشی میں مہارت نامہ رکھتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس کی نقاشی کے نمونے آج بھی وادی میں دستیاب ھیں ۔ موسیقی کا فن سکھانے کے لئے کشمیر میں متعدد مدرسے قائم کر دیئے تھے ۔ چنانچہ کشمیری فن کاروں نے ایسی مہارت حاصل کر لی تھی کہ پیر حسن کے بقول بعض خوانندے ایسے تھے کہ ایک راگ کو بارہ مقاموں میں پیش کرتے تھے ۔ " و بعضی خواننده ها از قبیل بودند کہ یک راگ در دوازده مقام ادا می نمودند"(۵)

کشمیر کے سازندوں نے ایک بڑا آلہ موسیقی ایجاد کیا تھا جس کا نام گیچک تھا اور جو سارنگی سے مشابہ تھا ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ کشمیری پنڈت بھی اسلامی فنون سیکھ کر نام پیدا کر چکے ھیں ۔ اس سلسلے میں پنڈت بودھی بھٹ کا نام لیا جا سکتا ہے جس نے موسیقی پر ایک تالیف یادگار چھوڑی ہے ۔ مشہور مورخ پنڈت شیر پور بھی سلطان زین العابدین کا درباری گویا تھا وہ طنبورے پر خوب گاتا تھا ۔ تاریخ فرشتہ میں مرقوم ہے کہ سلطان زین العابدین خود بھی کئی سازوں کا موجد تھا ۔

جس طرح پہلے اشارہ کیا گیا کشمیر میں ایک طرف عرب ، ایران، سمر قند ، بخارا اور کابل کے موسیقار اور دوسری طرف برصغیر کے گویے آ کر جمع ھو گئے تھے ۔ ادھر خود کشمیر کے اھل فن نے اس مثلث کا تیسرا زاویہ بنایا تو جو موسیقی کی شکل سامنے آئی وہ خالص کشمیری موسیقی کہلائی ۔ جن ایرانی

راگنیوں کو کشمیری مطربوں اور سازندوں نے اپنایا ان میں یہ مشہور ہیں ۔
راست ، کشمیری راست ، چراغ ، عراق ، نوا ، شاھنواز ، نوروز ، نے ریز ، زنگولہ ،
چھہار گاہ ، کلیان ، کھمباج ، بہاگ جھجوٹی ، پہاڑی ، ٹوڑی ، آساوری
تلنگ ، سوھن ، سورتھہ ، رھاوی ، بلاول ، حسینی ، پوری ، کانگڑھا ، دھرپد ،
عشاق ، دھناسری وغیرہ ۔

مرزا حیدر دغلت اور اکبر کے دور حکومت میں کشمیر کی موسیقی کو
مزید ترقی ھوئی مورخین کا کہنا ہے کہ شاھزادہ یوسف شاہ چک کی موسیقی
کی فنی باریکیوں پر اس قدر گہری نظر تھی کہ اس نے بھرے دربار میں تان
سین کو ایک راگ کے بارے میں ٹوک دیا تھا جس پر تان سین کو اپنی غلطی کا
اعتراف کرنا پڑا تھا ۔ اسی یوسف شاہ کی ملکہ حبہ خاتون نے اپنی کشمیری
شاعری کو ایرانی موسیقی میں ڈھالا ۔ راگ راست کشمیری اسی کی ایجاد ہے
جو رات کے چوتھے پہر میں گایا جاتا ہے ۔ کشمیری زبان کے ممتاز شاعر اور نقاد
جناب امین کامل نے حبہ خاتون کو کشمیری موسیقی کی روح و رواں قرار دیا ہے ۔

سلطان حیدر شاہ نے نوازی میں مہارت رکھتا تھا ۔ موسیقی میں اس کا
استاد جہانگیر ماگری تھا ۔ کشمیر کی کلاسیکی موسیقی کو صوفیانہ کلام کہتے
ھیں ۔ اس کی ابتدا حسن شاہ کے عہد (۸۴ ۔ ۱۴۷۲) میں ھوئی ۔ حسن شاہ
خود کمپوزر تھا اور شاعر بھی ۔ شیرپور لکھتا ہے کہ وہ موسیقی کے شعبہ کا
سربراہ تھا اور اس شعبہ میں بارہ سو موسیقار تعلیم و ترویج موسیقی پر مامور
تھے ۔ زیرنظر عہد میں عود اور بانسری مقبول آلہ موسیقی تھا ۔ تمبنکناڑی اور
کشمیری طبلہ عورتوں میں مروج رھا ۔ فارسی موسیقی کی تقلید میں یہاں
طالیہ راگ ـــ چھکری تیار ھوا ۔ بعد میں ساز نائی نفیری ، طوطا گزی الغوزہ
ستـــاری اور قانون سے کام لیا جانے لگا ۔ لله عارفہ اور نور الدین ریشی کے

گیت لوگ دھنوں میں گائے جاتے تھے ۔ ان لوک راگوں کے نام یہ ھیں ۔ ایمن ، کھمباج ، آسا ، جھجوٹی ، پٹ دیپ ۔

رقص کو موسیقی سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ۔ سیاہ چشمان کشمیری کی شعر خوانی و پائے کوبی کی اسی صفت توأم کا ذکر کرتے ہوئے حافظ شیرزای نے کہا ہے ۔

بشعر حافظ شیرازمی رقصند و می کوبند
سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمر قندی

اشاعت اسلام کے بعد کشمیر میں رقص کو صوفیانہ اور حافظہ کا نام دیا گیا ۔ ان رقصوں میں ساز سنتور ، اور طبلہ استعمال ھوتا تھا ۔ فصل کاٹنے کے بعد شہنائی اور ڈھولک پر بچے ناچتے اور خوشی مناتے ۔ اس موسمی رقص کو بچہ نغمہ کہتے ھیں ۔

رُف بھی کشمیر کا عام رقص ہے۔ یہ دل آویز ھلکی سروں میں پیش کیا جاتا ہے ۔ مرحوم ھدایت اللہ اختر کی تحقیق کے مطابق اس رقص میں عورتیں ایک دوسرے کی کمر میں ھاتھ ڈال کر زنجیر بنا لیتی تھیں ۔ رنگین سنہری کپڑے پہنے ایک آگے ، قدم پیچھے اٹھاتے ہوئے موسیقی کے زیر و بم میں ایک سماں بندھ جاتا تھا ۔ اس رقص میں کسی ساز کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ (٦)

لکھت بھی ایک کشمیری ناچ ہے ، گلیوں اور صحنوں میں بچے ایک دوسرے کا ھاتھ تھام کر ناچتے اور جب ناچ عروج پر پہنچتا تو دیکھنے والے ان کی شکل نہ پہچان سکتے ۔

کشمیر اور اس سے ملحقہ پہاڑی ریاستوں کے باشندے اپنی ذھانت اور

فنکارانہ مہارت کے لئے ہمیشہ مشہور رہے ہیں ۔ اسلام کی اشاعت کے بعد کشمیر میں صنعت و حرفت کا باقاعدہ آغاز ہوا ۔ یہاں مختلف صنعتوں کے ماھــرین مثلاً ۔خطــاط صحاف، قالین باف ، زین ساز ، نمدہ ساز ، سنگ تراش ، شیشہ گر ، اسلحہ ساز ، نقاش ، قلمدان ساز ، شال باف ، گبہ ساز ، حکاک ، مہرکن ، طلا کار ، نقل نویس وغیرہ پیدا ہوئے ۔

کشمیر کی صنعتوں میں شال بافی ، قالین بافی ، ریشم سازی اور لکڑی کا کام شہرہ آفاق ہیں ۔ کشمیری صناعوں کے بنائے ہوئے قلمدان کابل ، ایران ، فرانس اور انگلستان کو برآمد کئے جاتے تھے ۔ آج کل تصویروں کے البم ، سگریٹ کیس اور ٹیبل لیمپ کے شیڈ بھی بننے لگے ہیں ۔

کشمیر اور اس کے ارد گرد کے علاقوں کی تاریخ و ثقافت کا جو جائزہ ہم نے پیش کیا اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں اسلامی روایت کے علوم و فنون کی ایسی ترقی ہوئی کہ اس خطــہ گل و لالہ اور وادی سرو و سمن کو ایران صغیر کا نام دیا گیا ۔

مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے ذہین فن کار آج بھی اسلامی علوم اور فنون کی ترقی کے لئے شب و روز کوشش کر رہے ہیں ۔ ہمیں یقین ہے کہ آئندہ ہمارے فکر کو اور رفعت ہمارے فن کو اور نکھار اور ہمارے علم کو اور وسعت نصیب ہوگی ۔

★ ★ ★ ★

مآخـــــذ

١ ـ هندو معاشره ـ انگریزی ـ بنیرجی ـ دهلی

٢ ـ تاریخ بیہقی ـ مشہد ١٣٥٠ هش

٣ ـ تاریخ حسن ج ١

٣ ـ تاریخ حسن ج ١

٥ ـ ایضاً ج ٢

٦ ـ کشمیر کے فنون لطیفہ

نیز دیگر تواریخ کشمیر بزبان فارسی ، انگریزی و اردو

* * * * *

فارسی کتب اخلاق پر ایک نظر

ڈاکٹر محمد ریاض

متکلمین اسلام کے نزدیک معرفت خداوندی اور علم اخلاق کے تین معروف طریقے رہے ہیں :۔ (۱) حسی و تجربی (۲) خبری و دینی (۳) اور نظری و استدلالی ۔ حس و تجربے کی رو سے حسن و قبح اور خوب و ناخوب کی بحث ہوتی رہی اور عقلاء کے محسوسات اور تجربات سے عام لوگ بہرہ مند ہوتے رہے۔خبری ودینی روش کی توضیح ضروری نہیں ۔ متکلمین اسلام نے اپنی دینی تعلیمات کی روشنی میں اوامر و نواھی ، خیر و شر اور نیک و بد امور کی مفصل بحثیں کی ھیں ۔ اس ضمن میں قرآن مجید ، احادیث نبوی ، اور بزرگان اسلام سے مستفاداقوال زیادہ منقول ہوتے رہے ھیں۔ نظری واستدلالی طریقے کو فلسفیانہ اسلوب بھی کہا جاتا ہے ۔ حکمائے یونان جیسے سقراط ، بقراط ، جالینوس ، افلاطون اور ارسطو کے افکار و عقائد بالخصوص اور دنیائے قدیم کے کئی دیگر دانشمندوں کے اقوال بالعموم متکلمین اسلام کے پیش نظر رہے ۔ ان فلسفیانہ اخلاقی افکار و اقوال کو مسلمان متکلمین نے نقل ھی نہیں کیا بلکہ دین اسلام کی تعلیمات سے ان کا تقابل و تطابق بھی کیا ہے ۔ فارسی میں کتب اخلاق کا نہایت قابل قدر سرمایہ ملتا ہے ۔ فارسی زبان کے مصنف ذولسانین تھے۔ اس لئے انہوں نے کتب اخلاق عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھی ھیں ۔ ان کتب میں ہر قسم کے تجربی ، دینی اور فلسفیانہ مباحث دیکھے جا سکتے ھیں۔

علم کلام کے مباحث سے اسلامی فکر و نظر کو جو فوائد ملے ان میں اخلاقی بحثوں کی اھمیت بھی شامل نظر آتی ہے۔ مثلاً فلسفۂ اخلاق کے ضمن میں ارسطو کے معاشرتی دلائل آج تک منقول ملتے ھیں ۔ وہ کہتا ہے کہ ہر معاشرے کے تین ارکان ھیں : آبادی ، معاشرتی قانون اور افراد معاشرہ کا باھمی تعاون ، جسے فرد اور جماعت کا تعاون بھی کہہ سکتے ھیں ۔ معاشرے کے اہم تر سہ گانہ ارکان آج بھی یہی قرار پا سکتے ھیں ۔ یونانی نظریۂ اخلاق میں جن امور کو فضائل و رذائل قرار دیا جاتا رھا ، ادیان کی زبان میں انہیں خیر و شر یا نیکی و بدی کہا گیا ہے۔ فارسی کتب اخلاق میں فضائل و رذائل کی بحث ملتی ہے اور ثواب و عذاب یا خیر و شر کی بھی ۔

اخلاق کے بارے میں استدلالی اور فلسفیانہ نقطہ نظر سے بعض ایسے مباحث چھیڑے جاتے رہے جو اب بھی قصہ پارینہ نہیں بنے ھیں ۔ مثلاً یہ تصور کہ اخلاق فرد کے نقطہ نظر سے متعین ہو یا معاشرے اور ملک کے نقطہ نظر سے۔ اس اباحی تصور کے بارے میں رطب و یابس آراء کتب اخلاق میں دیکھی جا سکتی ھیں ۔ ایک دوسری بحث یہ ہے کہ آیا روش اخلاق اور خوبی و نیکی کی پیروی کرنا ایک طبعی امر ہے یا اکتسابی ۔ تعلیم و تربیت اور تعزیری قوانین کے نفاذ کی ضرورت کے بیان میں اس امر کے بارے میں مفصل لکھا جاتا رھا ہے۔ ایک بحث یہ دیکھی جاتی ہے کہ سعادت و شقاوت کیا ہے اور نظام اخلاق سے ان کا کیا ربط ہے ؟ ایک بحث جبر و قدر کی ہے جو اکثر کتب اخلاق میں دیکھی جاتی ہے ۔

مدعا یہ ہے کہ آیا انسان اپنے اچھے یا برے اعمال کے انجام دینے میں آزاد ہے یا مجبور ۔ کتب اخلاق میں فضائل اور رذائل کی بحثیں دیگر امور کے مقابلے میں زیادہ مطول ملتی ھیں مگر صوفیا کے نقطہ نظر سے لکھی جانے والی

کتب اخلاق میں سلوک و عرفان اور احوال و مقامات کی اخلاق آموز توجیہات بھی ملتی ھیں ۔ اخلاق کے بارے میں استدلالی بحثوں کے ذریعے متکلمین اسلام نے اپنے دین کے عقائد ، عبادات اور اعمال خیر کی حقانیت تسلیم کروانے کی کوشش کی ہے ۔ حکمت شرع بیان کرنے کی ان مساعی کے ذریعے دین اسلام کی عقلی بنیادیں فراھم ھو گئیں ۔ ممکن ہے کہ انسانی عقل بعض دینی اعمال کی علت غائی کی صحیح ترجمانی نہ کر سکے مگر اس سے متکلمین اسلام کی کوششوں پر حرف نہیں آتا ۔

فارسی کتب اخلاق کی درج ذیل عنوانات کے تحت گروہ بندی کی جا سکتی ہے : نصیحت نامے ، اخلاق آموز داستانیں جن میں انسانوں کی اور حیوانات کی گفتگو کی صورت میں داستانیں ملتی ھیں ۔ حکام و ملوک کے نصیحت نامے اور عام یا اسلامی نظام اخلاق کے بارے میں کتب و مواعظ نامے اور سیر و سلوک کے بارے میں کتب وغیرہ ۔ مگر کئی دیگر موضوعات پر لکھی جانے والی کتب میں بھی اخلاقی مباحث موجود ھیں ۔ یہ کتب نثر یا نظم یا دونوں کے آمیزے کی صورت میں ملتی ھیں ۔ متعدد کتب برصغیر یا ایران وغیرہ میں زیور طبع سے آراستہ ھو چکیں مگر قلمی صورت میں ملنے والی کتب بھی اتنی زیادہ ھیں کہ مستقبل قریب میں ان سب کا شائع ھو جانا ممکن نظر نہیں آتا ۔ ایسی ۱۸۳ کتابوں کے بارے میں پروفیسر محمد تقی دانش پژوہ نے ۱۳۳۹ھ ش ۱۹۶۰ء میں تہران یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے کی طرف سے ایک کتابچہ شائع کیا تھا ۔ کوئی دس سال بعد ۱۳۴۹ھ ش / ۱۹۷۰ء میں اسی کتب خانے کے مخطوطات کی فہرست احمد منزوی صاحب نے مرتب کی اور انھوں نے مزید قلمی نسخوں کو متعارف کرایا ۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات مذکورہ دونوں فہرستوں کو بالاستیعاب دیکھ سکتے ھیں ۔ راقم پانچویں صدی ھجری سے نویں

صدی هجری تک کی صرف چند کتابوں سے مختصراً بحث کرے گا ۔

پانچویں صدی هجری

اس صدی میں تصوف کی دو اهم کتابیں فارسی میں لکھی گئیں ۔ ایک عربی سے ترجمہ اور شرح ہے ، اور دوسری طبع زاد ۔ شیخ ابی بکر محمد کلاباذی بخارائی (م ۳۳۸۰ هجری) کی کتاب"التعریف لمذهب التصوف " کا فارسی ترجمہ اور شرح شیخ ابوابراهیم اسماعیل المستملی بخارائی (م ۴۳۴ هـ)نے لکھی جو مصنف کے تلمیذ تھے ۔ دوسری کتاب شیخ علی جلابی هجویری داتا گنج بخش (م ۴٦۵ هـ) کی کشف المحجوب ہے ۔ ان دونوں کتابوں میں اخلاق صوفیہ سے بحث ملتی ہے ۔ ابویعقوب اسحاق سجزی نے بھی اسی صدی میں کشف المحجوب کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے ۔ مگر سات ابواب پر مشتمل یہ کتاب اسماعیلی عقائد کی حامل ہے ۔ یہ ابواب توحید ، عقل ، نفس ، فطرت ، موجودات ، نبوت اور معاد کے بارے میں هیں ۔ شرح تعرف ۴ جلدوں کی ایک ضخیم کتاب ہے ۔ آٹھویں صدی هجری کے کسی نامعلوم مصنف نے اس کتاب کا ایک خلاصہ لکھا ہے جو تہران سے شائع هو چکا ہے ۔ اس کتاب اور سید علی جلابی هجویری کی کشف المحجوب کے اخلاق آموز محتویات بیشتر احوال صوفیہ اور ان کے منقول اقوال کی صورت میں ملتے هیں ۔

امیر عنصر المعالی کیکاؤس زیاری سلطان محمود غزنوی کا بہنوئی تھا۔ بظاهر ۴۷۵ هجری میں اس نے اپنے بیٹے گیلان شاہ کی راهنمائی کی خاطر قابوس نامہ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس کے ۴۴ ابواب هیں ۔ اس کتاب میں زندگی اور جہانبانی کے آداب سے بحث ہے ۔ دینی اور اخلاقی نکتوں کو

مصنف نے بیشتر حکایات کے پردے میں بیان کیا ہے۔ ایک باب فتوت یا جوانمردی کے بارے میں ہے جو ایک مخصوص نہج اخلاق رہا ہے۔(۱)

ابوعلی حسن نظام الملک طوسی (م ۴۸۵ ھ) کا سیاست نامہ ، ۔ اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں اسلام کی سیاسی تعلیمات اور نامور مسلمان حکمرانوں کی روش اخلاق دلپذیز انداز میں ملتی ہے ۔ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری هروی (م ۴۸۱ ھ) کے کئی رسائل جیسے "قلندر نامہ" "مناجات نامہ" "اور کنزالسالکین" کا موضوع بھی اخلاق ہے۔ مگر اس صدی کے عظیم تر مصنف اخلاقیات حجۃ الاسلام امام ابوحامد محمد غزالی (م ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) ھیں ۔ عربی میں علم اخلاق پر ان کی بے نظیر کتاب "احیاء علوم الدین" ہے جو فارسی اور کئی دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ مگر کیمیائے سعادت نام کی کتاب میں امام غزالی نے اپنی عربی کتاب کے اهم تر مطالب خود بھی فارسی میں بیان کر دئے ھیں ۔ اس کتاب میں دین اسلام کی رو سے عقائد ، عبادات اور معاملات پر بحث کی گئی ہے اور نکات اخلاق کو دلپذیر انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ امام موصوف کے خطوط اور ان کے ایک فارسی رسالہ "نصیحۃ الملوک" میں بھی دلپذیز اخلاقی تعلیمات ملتی ھیں ۔ نظام اخلاق پر لکھنے والے بعد کے تقریباً ہر مصنف نے امام غزالی کی کتب و رسائل کا اثر قبول کیا ہے۔

چھٹی صدی ھجری

اس صدی میں ابوبکر محمد طرطوشی (م ۵۲۰ ھ) نے سراج الملوک فی العدل والسلوک کے نام سے ایک عربی کتاب لکھی تھی جسے مقدمہ ابن خلدون کا پیشرو کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ تقی الدین محمد نے کیا جو ابھی مخطوطات کی صورت میں ملتا ہے۔ مترجم عبدالرحیم خانخاناں (م ۱۰۳۶

ھ) کے دربار سے منسلک رھا ہے۔ مکارم اخلاق مولفہ رضی الدین ابوجعفر محمد
نشاپوری (م ۵۹۸ھ) چالیس ابواب میں قابوس نامے کی سی فلسفہ اخلاق پر
ایک عمدہ کتاب ہے۔ مگر اس کا مخطوطہ ھی راقم الحروف نے دیکھا ہے۔ اس
صدی میں حکیم سنائی غزنوی (م ۵۳۵ھ) اور شیخ نظامی گنجولی (م ٦۱۰ھ)
نے اپنی کئی فارسی مثنویوں میں اخلاقی مباحث پر طبع آزمائی کی مگر ان کی
کتابوں پر صوفیانہ اثرات غالب ھیں۔ سنائی کے ایک مقلد شیخ عطا نشاپوری کا
دور حیات ساتویں صدی هجری کے ربع اول تک محیط ہے۔ (م ٦۱۸ھ) ان کی
مثنویوں جیسے "منطق الطیر" "الهی نامہ" اور "مصیبت نامہ" میں دین کے علاوہ
تجربی و حسی اخلاق کے نمونے بھی ملتے ھیں ۔ ان کے "تذکرة الاولیاء" میں
صوفیا اور بزرگان دین کے احوال و اقوال کے تتبع میں مفید اخلاقی مباحث بھی
ملتے ھیں ۔روضةالعقول نام کی کتاب جواس صدی میں محمدبن غازی ملطوی نے
لکھی ، در اصل شاہ طبرستان مرزبان کی طبری زبان کی ایک کتاب کا فارسی
ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا ذکر "مرزبان نامہ" کے عنوان سے ساتویں صدی هجری
کی کتب میں کیا جائے گا ۔ اس کتاب کا اور "کلیله و دمنہ" کا اسلوب یکساں
نوعیت کا ہے شیخ الاشراق شهاب الدین مقتول (۵۸۴ھ) کے فارسی رسائل میں
فلسفہ اخلاق بڑی حد تک یونانی فلاسفہ سے ماخوذ ہے۔ ان کے اکثر رسائل کو
حالیہ سالوں میں فرانسیسی مستشرق هزی کوربن نے ایران سے شائع کرایا ہے۔

"کلیله ودمنہ" کی اصل سنسکرت بتائی جاتی ہے۔ کہتے ھیں کہ چھٹی
صدی هجری میں ساسانی بادشاہ نوشیرواں (۵۳۱ ۔ ۵۷۹ء) نے برزویہ نام کے
اپنے ایک طبیب کو هندوستان بھیجا تھا ۔ برزویہ کلیله ودمنہ کا ایک سنسکرت
متن ایران لے گیا اور اسے پهلوی میں ترجمہ کرایا ۔ عبداللہ بن المقنع نے پهلوی
متن کو عربی میں منتقل کیا جو ابتک دلپذیر کتاب کے طور پر پڑھا جاتا رھا ہے۔
مشهور فارسی شاعر رودکی ثمرقندی (م ۳۲۹ھ) نے ان داستانوں کو فارسی شعر

کا جامہ پہنایا ، مگر اس کے بہت تھوڑے اشعار دستیاب ہوتے ہیں ۔ اس کتاب کا معروف ترین متن وہی ہے جسے ابوالمعالی نصراللہ منشی نے چھٹی صدی ہجری کے وسط سے کچھ پہلے لکھا اور جسے سلطان بہرام غزنوی (۵۱۲ ۔ ۵۴۷ھ) کے نام سے معنون ہونے کی بنا پر "کلیلہ ودمنہ بہرام شاہی" کہتے ہیں ۔ سنسکرت میں ، کہتے ہیں ، مطالب دس باب تک محدود تھے ۔ مگر پہلوی ، عربی اور فارسی مترجمین نے چھ ابواب کا اضافہ کر دیا ۔ اب کتاب ١٦ ابواب کی حامل ہے۔ بعد کے زمانوں میں اس کتاب کو کئی مصنفین اپنے اپنے اسلوب میں ڈھالتے اور نئے نئے متن تیار کرتے رہے۔ مثلاً ملا حسین کاشفی کی "انوار سہیلی" اور ابوالفضل علامی (م ۱۰۱۱ھ) کی عیار دانش پروفیسر ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری نے مزید ایک متن کا کھوج لگایا ہے ۔[۲]

کلیلہ ودمنہ اخلاق کی بلند کتاب ہے ۔ مترجم نے آیات قرآن مجید ، احادیث رسول عربی اور فارسی امثال واشعار نقل کرکے عمدہ نکات حکمت سمجھائے اور خیر و خُلق کی ضرورت کے راز بتلائے ہیں ۔ لطف یہ ہے کہ یہ سب کچھ مختلف حیوانات اور پرندوں کی گفتگو کے پردے میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک حیوان کو دوسرے حیوان سے یا ایک پرندہ کو دوسرے پرندے سے محو گفتگو دکھا کر مصنف زندگی کے دلپذیر نکات اور تجربات سمجھاتا اور اخلاق آموز مباحث چھیڑتا جاتا ہے ۔

ساتویں صدی ہجری

سعدالدین وراوینی کا متن مرزبان نامہ اس صدی کے ربع اول میں لکھا گیا ۔ یہ کتاب کلیلہ ودمنہ سے شبیہ ہے اور جیسا کہ ایرانی محققین نے بھی لکھا ، مترجم نے کلیلہ ودمنہ بہرام شاہی کے اسلوب کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ البتہ مرزبان نامہ کلیلہ ودمنہ سے مشکل تر ہے ۔ طرز استدلال و استنتاج

دونوں کا یکساں ہے اور امثال و حکم نیز نکات اخلاق بھی جن و انس کے علاوہ چرند و پرند کی زبانی بیان کئے گئے ھیں ۔ اس صدی کی ایک دوسری اھم کتاب اخلاق "جوامع الحکایات و لوامع الروایات" ہے ۔ اس کے مصنف کا نام محمد عونی ہے جو ٦٣٠ھ کے لگ بھگ اچ (بھاولپور) میں فوت ھوا ہے۔ عونی بخارا کا رھنے والا تھا اور چنگیز خان کے حملے کے زمانے میں برصغیر میں وارد ھوا ۔ جوامع الحکایات ۴ جلدوں پر مشتمل ہے اور ھر باب کے ۲۵ باب ھیں ۔ یہ ضخیم کتاب ابھی بتمامہ شائع نہیں ھو سکی مگر اسکے دیدہ زیب مخطوطات کئی کتب خانوں میں نظر سے گزرتے ھیں ۔ ڈاکٹر نظام الدین احمد مرحوم نے اس کتاب پر بزبان انگریزی تحقیق کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی ۔ اختر شیرانی مرحوم نے اس کتاب کاایک حصہ اردو میں ترجمہ کرکے شائع کرایاتھا فارسی متن کے اجزاء کو ملک الشعراء بہار ، ڈاکٹر محمد معین ، محمد رمضانی ، ڈاکٹر مظاھر مصفا اور ان کی بیگم ڈاکٹر کریمہ بانو نے تہران سے شائع کرایا ، مگر آخری حصہ ابھی شائع نہیں ھوا ۔ محمد عونی کے تعارف میں یہ نکتہ جاننا ضروری ہے کہ اس مصنف نے لباب الالباب کے نام سے فارسی شاعروں کا ایک تذکرہ لکھا جو فارسی شعراء کے موجود تذکروں میں سب سے مقدم ہے ۔

جوامع الحکایات میں داستانوں کے پردے میں اخلاقی تعلیم دی گئی ہے اور بعد کے کئی مصنفین جیسے شیخ سعدی وغیرہ نے اس کتاب کی اخلاق آموز حکایات اور روایات کا اثر قبول کیا ہے۔ محمد عونی نے دین اسلام کی تعلیمات اور فلسفہ یونان کے رذائل و فضائل کے ذکر کے ذریعے اصول اخلاق سمجھائے ھیں ۔

شیخ شہاب الدین سہروردی (م ٦٣٢ھ) اپنی کتاب "عوارف المعارف" کے ذریعے معروف ھیں ۔ مگر فارسی کے ادب اخلاق میں بھی ان کا بڑا حصہ ہے۔

چنانچہ ان کے دو «فتوت ناموں» کو مرتضی صراف نے تہران سے شائع کرایا ہے (۳)
(۱۹۷۳ء) ۔ ان فتوت ناموں میں اخلاق صوفیہ کا ھی ذکر نہیں ، عام روش کے
اصول اخلاق بھی مذکور ھیں ۔

خواجہ نصیر الدین طوسی (م ۶۷۲ھ) کی کتاب «اخلاق ناصری» بے
حد معروف ہے اور متعدد بار شائع ھو چکی ہے۔ اس میں فلسفہ اور اصول اخلاق
ممزوج ھیں اور کسی قدر اسماعیلی عقائد کا پرتو بھی نظر آتا ہے ۔ مصنف نے
ابن مسکویہ (م ۴۲۱ھ) کی عربی کتاب «طہارۃ الاعراق فی تہذیب الاخلاق»
کو پیش نظر رکھا اور کتاب کو مندرجہ ذیل تین ابواب میں تقسیم کیا : تہذیب
اخلاق ، تدبیر منزل اور سیاست مدن ۔ ان ابواب کو بالترتیب اخلاق سنوارنا ،
امور خانہ داری اور جہاں بانی کہہ سکتے ھیں ۔

عربی میں فن مقامہ پر دو معروف کتابیں اس قرن تک تخلیق ھو چکی
تھیں ۔ مقامات ھمدانی اور مقامات حریری ۔ ان کی روش پر قاضی حمید الدین
بلخی (م ۵۵۹ھ) نے مقامات حمیدی لکھی جس میں ۲۴ مقامے ھیں ۔ اس کتاب
کی فنی حیثیت سے قطع نظر اخلاق آموزی کے لحاظ سے بھی یہ کتاب کافی اھم
ہے ۔

شیخ سعـــدی

فارسی کے ادب اخلاق میں شیخ مصلح بن عبداللہ سعدی شیرازی (م
۶۹۱ھ) ایک بے حد معروف اور اھم نام ہے ۔ یوں تو ان کے ضخیم دیوان شعر اور
فارسی رسائل میں بھی اخلاقی مباحث موجود ھیں مگر ان کی مثنوی «بوستان»
اور نثر و نظم کے آمیزے «گلستان» کو اس سلسلے میں غیر معمولی شہرت ملی ہے۔
بوستان ۶۵۵ھ میں لکھی گئی اور بعد کے سال میں «گلستان» ۔ بوستان کے دس

ابواب ہیں اور گلستان کے آٹھ۔

اس دوسری کتاب کا اسلوب بڑی حد تک "مقامے" کا سا ہے۔ بعض مطائبات اور تغزلات سے قطع نظر ان دونوں کتابوں کا موضوع اخلاق ہے۔ زندگی کے اہم امور سے متعلق کم ہی کوئی بات ہو گی جسے سعدی نے بیان نہ کیا ہو اور اس کے بیان کے ذریعے اخلاق و حکمت کا درس نہ دیا ہو۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا سعدی کی غزلیات بھی اخلاق آموز بیانات سے مملو ہیں۔ مثلاً۔

شرف نفس بجودست و کرامت بسجود
هر که این هر دو ندارد عدمش به ز وجود

خاکراهی که بروی گذری ساکن باش
که عیونست و جفونست و خدودست و قدود

دنیا آنقدر ندارد که برو رشک برند
ای برادر که نه محسود بماند نه حسود

قیمت خود بملاهی و مناهی مشکن
گرت ایمان درستست بروز موعود

آٹھویں صدی ہجری

اس صدی کے متعدد مصنفین نے اخلاقیات کے موضوع پر لکھا ہے مگر ہم چار پانچ افراد کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ حضرات شیخ نجم الدین زرکوب تبریزی (م ۷۱۲ھ)، شیخ علاءالدولہ سمنانی (م ۷۳۶ھ)، شیخ عبدالرزاق کاشانی (م ۷۳۶ھ)، عبید زاکانی (م تقریباً ۷۷۲ھ) اور میر سید علی ہمدانی شاہ ہمدان (م ۷۸۶ھ) ہیں۔ شیخ زرکوب اور علاءالدولہ سمنانی کے فتوت نامے

۱۹۳۹ء میں استنبول یونیورسٹی کے مجلہ اقتصاد میں عبدالقادر گولپنارلی نے شائع کرائے تھے ۔ ان رسائل میں انفرادی اور اجتماعی مسائل کی روشنی میں حسن اخلاق برتنے کی تعلیم ملتی ہے ۔شیخ کاشانی کے فتوت نامے کو پروفیسر محمد دامادی نے ۱۹۷۱ء میں تہران سے شائع کرایا تھا ، مگر دو سال بعد ۱۹۷۳ء میں مرتضی صراف نے اسے زیادہ بہتر صورت میں شائع کرایا ہے (رسائل جوانمردان صفحہ ۱ تا ۵۷) ۔ رسالے کا عنوان "تحفة الاخوان فی خصائص الفتیان" ہے ۔ عبید زاکانی ایک شاعر اور ادیب تھا مگر اس کی اهمیت اس وجہ سے ہے کہ اس نے اپنے معاشرے کی صحیح عکاسی کی اور ایک اچھے نقاد معاشرہ کا کردار ادا کیا ہے ۔ اخلاق الاشراف ، ریش نامہ، صد پند اور تعریفات کے عنوان سے ان کے رسائل مزاحیہ مطالب کے آئینہ دار ھیں مگر مزاح کے پردے میں مصنف نے اپنے اهل زمانہ کی بد اخلاقی نمایاں کی ہے اور اس طرح اخلاق کی ضرورت پر زور دیا ہے ۔ عبید زاکانی کے مزاح کا نمونہ هم ان کے رسالہ "ده فصل" سے نقل کرتے ھیں ۔

. . . الآدمی آنکہ نیک خواہ مردم باشد ۔ المرد آنکہ سخن بہ ریانگوید ۔ الدانشمند آنکہ عقل معاش ندارد ۔ القاضی آنکہ همہ کس اورا نفرین کنند ۔

تہران سے سال میں ایک بار شائع ہونے والا مجلہ "فرهنگ ایران زمین" کی جلد ۱۸ (۱۹۷۲ء) میں عبید زاکانی کے کلیات نثر و نظم کا ایک انتخاب شائع هوا تھا ۔ (صفحہ ۱ تا ۸۵) ۔

میر سیدعلی همدانی شاہ همدان کا تعارف راقم نے دسمبر ۱۹۷۳ء کے "فکر و نظر" میں کرایا تھا ۔ ان کے رسالہ فتوتیہ کا اردو ترجمہ بھی فکر و نظر کی مارچ ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں چھپ چکا ہے ۔ مگر اخلاق و سیاسیات اسلامیہ کے موضوع پر ان کی اهم تر تالیف "ذخیرة الملوک" ہے ۔ یہ کتاب

۱۹۰۵ء میں امرتسر سے شائع ہوئی تھی ۔ مگر راقم الحروف نے متن کو ادارہ «الکتاب» لاہور کے اہتمام سے بہتر صورت میں شائع کرانے کا بندوبست کیا ہے ۔ ذخیرۃ الملوک کے اخلاقی اور دینی مباحث اس کے درج ذیل دس ابواب کے عنوانات سے واضح ہو جاتے ہیں :

باب اول در شرائط و احکام ایمان و لوازم کمال آں کہ سبب نجات بندہ است از عذاب ابدی و وسیلہ وصول او بدوام لذات نعیم سرمدی ۔

باب دوم در ادائے حقوق عبودیت ۔

باب سوم در مکارم اخلاق و حسن خلق و وجوب تمسک حاکم و پادشاہ بسیرت خلفائے راشدین ۔

باب چہارم در حقوق والدین و زوج و زوجہ و اولاد و عبید و اقارب و اصدقا ۔

باب پنجم در احکام سلطنت و ولایت و امارت و حقوق رعایا و شرائط حکومت و خطر عہدہ آں و وجوب عدل و احسان ۔

باب ششم در شرح سلطنت معنوی و اسرار خلافت انسانی ۔

باب هفتم در بیان امر معروف و نہی منکر و فضائل و شرائط و آداب آں ۔

باب هشتم در حقائق شکر نعمت و ذکر اصناف انعام و افضال حضرت صمدیت جل جلالہ ۔

باب نہم در حقیقت صبر برمکارہ و مصائب دنیوی کہ از لوازم امور ولایت و سلطنت است ۔

باب دهم در مذمت تکبر و غضب و حقیقت آں ۔

۱۳۳ اقوال اور اخلاقی نصائح پر مشتمل میر سید علی همدانی کا ایک رسالہ "ذخیرۃ الملوک" کی ۱۹۰۵ء کی اشاعت کے ساتھ ضمیمے کے طور پر شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان منہاج العارفین ہے۔[۳]

نویں صدی ہجری

معین الدین مسکین فراهی (م ۹۰۷ھ) نے روضۃ الواعظین کے نام سے اس صدی میں ایک کتاب لکھی جو ۴ جلدوں میں ہے اور ان سب میں اخلاقیات سے متعلق ۴۰ احادیث نبوی کی شرح لکھی گئی ہے۔ میر سید محمد نور بخش (م ۸۶۹ھ) کی "مکارم الاخلاق" کا موضوع اس کے نام سے واضح ہے۔ یحیی سیبک فتاحی نشاپوری (م ۸۵۲ھ) کا قصہ "حسن و دل" مشہور ہے۔ اردو کے کلاسیکی رسالہ "سب رس" کی بنیاد یہی داستان ہے۔ اسی مصنف نے "شبستان نکات" کے نام سے فارسی نثر و نظم میں ایک کتاب اخلاق پر لکھی جو "گلستان سعدی" کے اسلوب میں ہے۔ مولانا عبدالرحمن جامی (م ۸۹۸ھ) کی "بہارستان" کا بھی یہی انداز ہے۔ اس صدی میں اخلاق پر لکھنے والے دو معروف مصنف ہیں۔ ایک جلال الدین دوانی شیرازی (م ۹۰۸ھ) اور دوسرے حسین واعظ کاشفی سبزواری (م ۹۱۰ھ)۔

جلال الدین دوانی کی "اخلاق جلالی" پر "اخلاق ناصری" کا واضح اثر موجود ہے اور مصنف نے مقدمے میں اس امر کا خود بھی اعتراف کیا ہے۔ کتاب کا اصل نام "لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق" ہے اور اس کا موضوع "تدبیر منزل اور سیاسیات مدن" ہے۔ کتاب کا اسلوب بیان "اخلاق ناصری" سے مشکل تر ہے یہ تعجب ہے کہ "اخلاق جلالی" ایسی قابل قدر کتاب آج تک ایران میں شائع نہیں ہوئی گو برصغیر میں یہ کتاب بار بار زیور طبع سے آراستہ ہوتی رہی ہے۔ موضوع اخلاقیات پر جلال الدین دوانی نے پانچ اور رسالے لکھے ہیں۔

جیسے "دیوان مظالم" ۔ یہ ابھی مخطوطات کی صورت میں ھیں ۔

حسین واعظ کاشفی کی اخلاق محسنی" (یا اخلاق محسنین) بھی ایران میں شائع نہیں ہوئی مگر برصغیر میں اس کا خاصا تداول رہا ہے ۔ اس کتاب کو مصنف نے ۹۰۰ ھجری میں تالیف کیا اور اس کے ۴۰ ابواب رکھے ۔ اخلاق ناصری اور اخلاق جلالی کے مقابلے میں اس کتاب کی زبان آسان ہے اور اس میں دین اسلام کی تعلیمات زیادہ سموئی گئی ھیں جبکہ فلسفہ یونان کا اس پر کمتر اثر ہے ۔ "انوار سہیلی" کلیلہ ودمنہ کی ایک "تہذیب نوین" ہے ، مگر اس کا اسلوب بیان متکلفانہ ہے ۔ اس مصنف کی ایک تصنیف "فتوت نامہ سلطانی" ہے ۔ یہ کتاب سلطان الاولیاء حضرت امام رضاؑ کے نام معنون ہونے کی بنا پر اس طرح موسوم ہوئی ۔ اخلاق و فتوت کے موضوع پر یہ ضخیم کتاب اکثر ڈاکٹر محمد جعفر محبوب کی تصحیح و توضیح کے ساتھ ۱۹۷۱ء میں تہران سے شائع ہوئی تھی ۔ مطبوعہ کتاب کے ۴۲٦ صفحے ھیں اور مصحح کا ۱۱۴ صفحے کا مقدمہ جدا ہے ۔ کتاب کے سات ابواب ھیں اور ہر باب کئی کئی فصول میں منقسم ہے ۔

بعد کی بعض کتابیں

بعد کی صدیوں میں بھی اخلاقیات کے موضوع پر فارسی میں کتابیں لکھی جاتی رہی ھیں ۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے ۔ راقم الحروف نے جو کتب دیکھی ھیں ان میں سے چند کے نام یوں ھیں ۔ آداب الصالحین و عمدۃ الواعظین ، سحر حلال ، جہاں نما ، پریشان اور خارستان ۔ پہلی دو کتابیں محدث عبد الحق دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کی ھیں ۔ سحر حلال بھی برصغیر میں لکھی گئی ۔ مصنف لطف اللہ لاہوری (م ۱۰۷۰ھ) ھیں ، جو پیشے کے لحاظ سے مہندس (انجینئر) تھے ۔ "جام جہاں نما" یا "جام جم" کے نام سے اوحدی مراغی

(م ۳۸۷ھ) کی ایک اخلاقی مثنوی معروف ہے ۔ مگر اس مختصر گفتگو میں ہماری توجہ منثور یا منظوم یا مخلوط نثر و نظم کتب و رسائل کی طرف مبذول رہی ہے ۔ دسویں صدی ھجری کے ایک مصنف غیاث الدین منصور دشتسکی شیرازی (م ۹۴۸ھ) نے "جام جہاں نما" کے عنوان سے ایک مفصل کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا ۔ اس کا مدعا اخلاقیات پر ایک دارالمعارف ترتیب دینے کا تھا مگر بظاھر یہ کتاب نامکمل رھی ہے ۔ (دیکھئے احمد منزوی کی مرتبہ فہرست نسخہ ھائے خطی دانشگاہ تہران میں مخطوطہ نمبر ۱۵۳۴) ۔ "پریشان" قاآنی شیرازی (م ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۴ء) کی "گلستان سعدی" کے اسلوب میں لکھی جانے والی کتاب ہے ۔ قاآنی نے سادہ رواں طرز اختیار کیا مگر سعدی کی حلاوت و شیرینی ایک دوسری ھی چیز ہے ۔ بعض حکایات کو بھی قاآنی نے سعدی کے تتبع میں لکھا ہے ۔ ایک مثال نقل کئے دیتے ھیں :

"دزدے بخانہ پارسائے در آمد ۔ چند انکہ جست چیزے نیافت ۔ دل تنگ شد ۔ پارسا را خبر شد ۔ گلیمے کہ برآں خفتہ بود در راہ دزد انداخت تا محروم نشود" ۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا
دل دشمناں را نکردند تنگ

ترا کے میسر شود ایں مقام
کہ بادوستانت خلافست و جنگ

مودت اھل صفا چہ در روے وچہ در قفا ۔ نہ چناں کز پست عیب گیرند و بپشت بیش بمیرند :

در برابـر چـو گـوسفنـد سلیم
در قفـا همچـو گـرگ مـردم خـوار

هر کـہ عیب دگراں پیش تو آورد و شمرد
بے گماں عیب تو پیش دگراں خواهد برد

(گلستان)

دزدے بہ خانہ درویشے رفت چندانکہ بیشتر جست کمتر یافت ـ درویش بیدار بود سر برداشت کہ من روز روشن در اینجا هیچ نیابم تو در شب تاریک چہ خواهی یافت جاه ؟ ـ

لاف طـاعت چنـد در پیـری زنـی
اے نکـرده در جـوانی هیچ کار

آنچہ را در روز روشن کس نجست
کے توانی جُست در شبهائے تار

(پریشان)

«خارستان» کے مصنف مجدالدین خوافی کے حالات زندگی سردست نا معلوم هیں ـ یہ کتاب بھی گلستان سعدی کی پیروی میں لکھی گئی ، البتہ مصنف نے اس کے ابواب گلستان کے ابواب سے دو چند یعنی سولہ قائم کئے هیں ـ اس کتاب کی اشاعت سوم اس وقت پیش نظر ہے ـ جو ۱۸۹۷ء میں منشی نولکشور کے شہره عالم پریس (لکھنؤ) میں هوئی ہے ـ مطبوعہ کتاب کے ۲۱۰ صفحے هیں اور ابواب کی سرخیاں حسب ذیل هیں :

(۱) در اوصاف حکام　　　(۲) در شفقت و ایثـار

(۲) در فضیلت علم (۳) در عشق و محبت (۵) در عهد و پیمان (٦) در بے وفائی دنیا (۷) در کرامات اولیاء (۸) در آداب نفس (۹) در ورزیدن صحبت ابرار (۱۰) در ریاضت (۱۱) در مناکحت و احوال زنان (۱۲) در حسد (۱۳) در منمت ظلم و فساد (۱۴) در نکوهش‌بخل و لئیمی (۱۵) در نوارد کلام (۱٦) در لطائف مردم ۔

کتاب کا اسلوب نگارش عربی آمیز ہے مگر اسے سادہ اور غیر متکلفانہ کہہ سکتے ہیں ۔ نمونے کے طور پر باب یکم کی دوسری حکایت ملاحظہ ہو :

"آورده اند کہ نعمان بن منذر ملکے بود در عرب قریب العهد باسلام ۔ پیش از منصب حکومت تنعم بودے و جامہ هائے نفیس پوشیدے و پہلو جز در حریر ننهادے ۔ چوں حکومت یافت پشمین پوشید و دیگر در تنعم نکوشید کہ "الآن حرمت علی اللذات (۵) ۔ قطعہ ع

ترک آسایش خود باید کرد
حاکمے کو عَلَم حکم افراشت

خواب در دیده او چوں آید
هر کرا پاس جهان باید داشت

مجموعی طور پر گلستان سعدی کی تقلید میں لکھی جانیوالی دیگر کتب کی طرح یہ بھی خشک اور بے آب و تاب ہے ۔

★ ★ ★ ★ ★

تـــوضیحـــات

۱ ۔ دیکھئے ماھنامہ «فکر و نظر» بابت اپریل و مئی ۱۹۷۰ء میں راقم الحروف کا مقالہ ۔

۲ ۔ ملاحظہ ھو ماھنامہ سخن تہران مرداد ۲۵۳۷ ش اگست ۱۹۷۸ء ۔ یک کلیلہ ودمنہ دیگر بہ متن ابن مقفح (م ۱۵۱ھ) کے عربی متن سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا ۔ مصنف چھٹی صدی ھجری کے کوئی محمد بن عبداللہ بخاراکی ھیں ۔ کتاب کا مخطوطہ استنبول کے کتب خانہ «قابو سرا» مین محفوظ ہے ۔

۳ ۔ رسائل جوانمردان ۔ تہران ۱۹۷۳ء ص ۲۵۰ ۔ اس مجموعے میں شیخ عبدالرزاق کاشی ، شیخ نجم الدین زرکوب اور شیخ شہاب الدین سہروردی وغیرھم کے فتوت نامے ھیں ۔

۴ ۔ رسالے کی اخلاقی نصیحتوں سے آگاھی کی خاطر ملاحظہ ھو راقم الحروف کی کتاب حضرت میر سید علی ھمدانی شاہ ھمدان (لاھور ۱۹۷۴ء) کا آخری حصہ ۔

۵ ۔ یعنی اب میں نے اپنے اوپر لذتیں حرام کر دی ھیں ۔

****

جمہوریت اور اسلام

محمد نذیر کاکا خیل

گذشتہ صدی میں اجنبی تسلط کے بعد ، مغربی تعلیم و تربیت اور جدید تہذیب و تمدن کے زیر اثر مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا تیار ہوا جو ذھنی غلامی میں مبتلا ہو کر شعوری یا غیر شعوری طور پر مغربی علوم و افکار اور جدید معیارات و اقدار کو اصل اور امر مسلمہ سمجھنے لگا اور ان کی روشنی میں ہر چیز کو دیکھنے کا خوگر بنتا گیا ۔ اپنے علوم و افکار اور تہذیبی اقدار کو یا تو انہوں نے رد کر دیا یا ان کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا ۔ چونکہ مسلم معاشرے کے ساتھ ان کا تعلق منقطع نہیں ہوا اس لئے بہت سے لوگوں نے بیچ کا راستہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ جدید و قدیم میں مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کی جائے ۔ اس طرز فکر و انداز نظر کا نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوریت اور اسلام ۔ اشتراکیت اور اسلام جیسے موضوعات پر مضامین اور مقالے لکھ کر دانش وری اور اسکالر شپ کا مظاہرہ کیا جانے لگا ۔ اس کا مقصد درپردہ جمہوریت اور اشتراکیت کے علمبرداروں کی خدمت کرنا تھا ۔ تاکہ وہ مسلمان جو دین سے لگاؤ کے باعث ان نظریات یا نظاموں سے بدکتے یا بھٹکتے ھیں آھستہ آھستہ ان کی وحشت دور ہو اور وہ ان سے قریب ہوں ۔ کاوے کاوے عشق اندر آورد بیگانہ را ۔

یہ ایک دور تھا جو گزر گیا ۔ باطل افکار و نظریات کا طلسم ٹوٹ چکا ہے ۔ اور دین اسلام کی حقانیت کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے ۔ وہ دن دور نہیں جب مسلمان ولولۂ تازہ کے ساتھ اسلام کا پرچم اٹھائے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا رہے ہوں گے ۔

جمہوریت ایک جدید سیاسی اصطلاح ہے جس کا مفہوم متعین نہیں ۔ جس نام نہاد جمہوریت کے بارے میں یہی متعین نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کس بلا کا نام ہے اس کی تعریف کیا ہے ، اس کو اصل و بنیاد

قرار دے کر اسلام کا اس کے ساتھ رشتہ جوڑنا یا اسلام میں اس کا ھیولی ڈھونڈنا عقل میں آنے والی بات نہیں۔

اسلام اسلام ہے۔ اسلام کا ، آسمانی ھدایت اور وحی الھی سے بے نیاز محض انسانی ذھن کی پیداوار کسی بھی نظریے یا نظام حیات کے حوالے سے ، خواہ وہ کتنا ھی روشن نظر آئے ، اس کی قلمرو کتنی ھی وسیع ھو ، اس کے حوالے سے اسلام کا مطالعہ ایک مسلمان کے لئے اندوھناک بھی ہے اور خطرناک بھی ۔ پہلے اسلام کو اسلام کے ذریعے پڑھنے اور سمجھنے پھر اس کو اساس اور معیار قرار دے کر آجکل کے نظریات اور نظام ھائے حیات کا تنقیدی مطالعہ کرکے ان کی کمزوریوں ، اسقام اور خامیوں کو واضح کیجئے تو انسانیت کی بڑی خدمت ھوگی ۔ اور اس طرح مسلمان ھونے کی حیثیت سے ممکن ہے کسی قدر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ھو جائیں ۔ (مدیر)

جمہوریت ایک جدید سیاسی اصطلاح ہے جسے مختلف معنوں میں لیا جاتا ہے ۔ اس کی شہرت و مقبولیت کے پیش نظر اشتمالیت پسند اپنے طرز حکومت پر اس کی چھاپ لگا کر دعوی کرتے ھیں کہ اصل جمہوریت معاشی جمہوریت ہے یعنی ایسا نظام جس میں ذرائع پیداوار پر حکومت کا کنٹرول ھو اور ان کے قول کے مطابق دولت کی منصفانہ تقسیم ھو اور استحصال کا خاتمہ ھو ۔ اس نظام میں ایک پارٹی کی حکومت ھوتی ہے جو پرولتاری آمریت کہلاتی ہے ۔ اس کا بنیادی مقصد سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ھوتا ہے ۔ چاھے سرمایہ دار جائز طریقہ سے کیوں نہ کماتا اور خرچ کرتا ھو ۔ اس قسم کی معاشی جمہوریت میں مادیت کو کلیدی حیثیت حاصل ھوتی ہے اور پیٹ کی خاطر انسان انسان کا غلام رھتا ہے ۔ حکومت کی مشینری میں فرد کی حیثیت ایک بے جان پرزے کی ھو کر رہ جاتی ہے ۔ اسلام میں اس جمہوریت کے لئے کوئی گنجائش نہیں کیونکہ اسلام معاشرے کے ساتھ فرد کو بھی اھمیت دیتا ہے اور پھر یہ کہ وہ زندگی کو ایک اجتماعی سالمیت سمجھتا ہے اور معاشرہ کی تشکیل و تعمیر اس طرح کرتا ہے کہ تمام افراد یکساں ترقی کر سکیں اور اعلی اخلاقی زندگی گزار سکیں ــ

جمہوریت کو ایک معاشرتی نظام کے معنی میں بھی لیا جاتا ہے جس

سے مراد ایک ایسے معاشرہ کا قیام ہے جس میں اونچ نیچ ، رنگ نسل ، ذات ، فرقہ ، مذہب وغیرہ کی کوئی تمیز نہ ہو ، مساوات اور عدل و انصاف کا دور دورہ ہو ، اور قانون کی حکمرانی ہو۔ جمہوریت کے اس تصور کو ایک ایسے معاشرے میں بروئے کار نہیں لایا جاسکتا جہاں صدیوں پہلے مذہب اور سیاست کو جدا کرکے اخلاقی اقدار کو پائمال کیا جا چکا ہو۔ اس قسم کی جمہوریت قانون کے ذریعے نہیں اخلاقی بنیادوں پر ھی قائم کی جا سکتی ہے۔ لہذا لادینی معاشرہ میں اس قسم کی جمہوریت کا قیام ایک خیال خام ہے۔

عام طور پر جمہوریت سے سیاسی جمہوریت مراد لی جاتی ہے جس کے معنی ھیں عام لوگوں کو حکومت کے معاملات میں بالواسطہ یا بلا واسطہ شرکت کے مواقع فراھم کرنا تاکہ وہ اپنی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کر سکیں۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ کسی بھی نظام کی بنیاد اگر انسانی افکار پر رکھی جائے تو اس میں کمی اور خامی رہے گی ، تکمیل صرف باری تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے ، اس کی ھدایت اور رھنمائی کے بغیر کوئی بھی نظام مکمل نہیں ھو سکتا ۔ یہ صحیح ہے کہ فلسفہ انسانی زندگی کے مقاصد کے حصول کا راستہ بتاتا ہے لیکن منزل کی تعیین صرف اور صرف دین ھی کرتا ہے۔ مغرب نے دین کو سیاست سے الگ کرکے اپنے نظاموں کی تباھی کا خود سامان کر لیا ہے۔ ان کے ھاں ابھی تک جمہوریت ایک ایسی اصطلاح ہے جو شرمندہ معنی نہ ھوئی ۔

اگر جمہوریت سے مراد عام لوگوں کی صلاح و فلاح ھو تو اسلام سب سے بڑھ کر جمہوری نظام حیات ہے ۔ لیکن اگر اس اصطلاح کو محدود و مخصوص کر دیا جائے تو اسلام میں اس کے لئے گنجائش اس لئے نہیں ھو سکتی کہ اسلام ایک اجتماعی سالمیت کا نام ہے۔ ذیل کے صفحات میں اسلام کے ان رھنما اصولوں کا مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے جو وہ زندگی کے مختلف شعبوں

کی ترقی کے لئے دیتا ہے۔ اس سے اسلامی نظام حیات کو سمجھنے اور اسلام اور مغربی جمہوریت کے درمیان فرق کو واضح کرنے میں مدد ملے گی ۔

اسلام دوسرے مذاہب کی طرح ایک مذہب نہیں بلکہ دین اور ضابطہ حیات ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً"، یعنی آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کردیا اور اپنی نعمتیں تم پر تمام کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو بطور دین پسند کیا(۱) قرآن پاک عمومی یا خصوصی اصول دیکر زندگی کے ہر شعبے میں بنی نوع انسان کی رهنمائی کرتا ہے۔ یہی اس کا اکمال اور اتمام ہے۔

اسلام کا مقصد ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے جس میں انسانی تعلقات، مساوات ، عدل ، رواداری، مواخاة ، باهمی تعاون اور همدردی کی اعلیٰ اخلاقی اقدار پر قائم ہوں۔ اسلام نسلی ، علاقائی اور سماجی امتیاز کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ برتری صرف حسن اخلاق اور تقویٰ کو حاصل ہے(۲) انما المومنون اخوة (۳) ۔ کہہ کر قرآن پاک نے قبائلی و نسلی عصبیت اور طبقہ واریت کے بتوں کو پاش پاش کر دیا ۔

افراط و تفریط سے پاک ایک متوازن اور عادلانہ نظام کے قیام کی خاطر قرآن پاک زندگی کے ہر شعبے میں عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے(۴) ۔ اور تلقین کرتا ہے کہ خونی ، ازدواجی اور سیاسی رشتے یا ذاتی بغض و عناد کو انصاف کے راستے میں حائل نہ ہونے دیا جائے (۵) ۔ ایک جمہوری معاشرے کے قیام کے لئے سماجی انصاف لازمی ہے اور قرآن پاک سماجی مساوات کی تعلیمات سے بھرا پڑا ہے۔ نزول قرآن کے وقت عرب معاشرے میں غلامی کا رواج تھا لیکن ایسا معاشرہ جس میں سماجی سطح پر آقا اور غلام کی تفریق کا تصور موجود ہو ، کبھی جمہوری نہیں بن سکتا ۔ قرآن پاک نے غلاموں کی سماجی حیثیت

کو بلند کرنے کی خاطر ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ان کی مالی اعانت کرنے کی ہدایت کی (٦) ۔ ان کی آزادی کے لئے زکوۃ کا ایک حصہ مختص کر دیا(٨)

ہجرت سے قبل (٩) اور بعد میں (١٠) مواخاۃ قائم کرکے رسول کریم ﷺ نے بھائی چارے کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کی نظیر اقوام عالم کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد و زن کی حیثیت اور ان کے باہمی حقوق و فرائض کے تعین ، انسانی برادری کے درمیان مساوات کے قیام ، انسانی عزت و عظمت کے استحکام ، جان و مال کی حفاظت اور سودی کاروبار کی ممانعت کا جو اعلان فرمایا اور جو دراصل آپ کی دس سالہ مدنی زندگی کا نچوڑ تھا (١١) ۔ عمرانیات کی تاریخ میں ایک نئے عہد کا آغاز تھا ۔

اسلام اگر ایک طرف ایسے معاشرے کے قیام کے لئے جس میں مساوات اور عدل کا دور دورہ ہو اخلاقی اصول اور ضابطے پیش کرتا ہے تو دوسری طرف وہ ان حالات کے خاتمہ کے لئے جو سماجی ناانصافی کا باعث بنتے ہیں متبادل نظام بھی پیش کرتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اسلام ایک متوازن معاشی نظام پیش کرکے ہر قسم کے استحصال ، احتکار ، اکتناز ، اور ارتکاز کا خاتمہ چاھتا ہے ۔ اس نظام میں نہ تو مادیت کو روحانیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا جاتا ہے اور نہ ہی روحانیت پر مادیت کو فوقیت دی جاتی ہے۔ قرآن پاک فرماتا ہے ۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم ۔ یعنی جو لوگ سونے چاندی کا خزانہ جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں (ضرورت مندوں پر) خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خبر سنادو۔(١٢) الذی جمع مالا و عددہ یحسب ان مالہ اخلدہ کلا لینبذن فی الحطمۃ ۔ یعنی جو مال جمع کرتا ہے اور گن گن کر رکھتا ہے کہ وہ اس کے کام آئے گا ، ہرگز نہیں وہ ضرور دوزخ میں ڈالا جائے گا ۔ (١٣) صحیح مسلم کی مرفوع حدیث ہے من

احتکر فهو خاطی ۔ یعنی جو انسانی خوراک کی اشیاء کو گرانی کی نیت سے ذخیرہ کرے وہ مجرم ہے۔ اسی طرح قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیت ذرائع معاش پر اجارہ داری کو رد کرتی ہے۔ خلق لکم ما فی الارض جمیعاً ۔ و جعلنا لکم فیھا معایش ۔ گویا قرآن کے نزدیک زمین کے ذرائع معاش سے استفادہ کرنا تمام انسانوں کا مشترکہ حق ہے ۔(۱۴)

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دنیا میں معاشی جمہوریت کے نام پر جو نظام قائم ہے اس میں انسان کی اپنی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ اس میں انسان اپنے ھی جیسے دیگر انسانوں کی غلامی کرتا ہے ۔ وہ اس کی تمام قوتوں کو خود مختارانہ اپنی منشاءکیمطابق استعمال کرتے ھیں جس سے وہ انسان انسان نہیں بلکہ حکومت کی مشینری کا ایک پرزہ بن کر رہ جاتا ہے ۔ اسلام جو معاشی نظام پیش کرتا ہے اس میں انسان کی اپنی قدر و منزلت برقرار رہتی ہے اور اس کی انفرادیت ریاست میں گم نہیں ہونے پاتی ۔ ارشاد ربانی ہے و ان لیس للانسان الا ما سعی یعنی یہ کہ انسان اپنی کوشش اور جد و جہد سے آزاد انہ استفادہ کرنے کا حقدار ہے۔(۱۵) و ھل تجزون الا ما کنتم تعملون ۔ یعنی انسان کو اپنے ھی عمل کا بدلہ ملے گا ۔ (۱۶)

دولت کا ارتکاز روکنے ، اسے استحصال کا ذریعہ نہ بنانے اور تمام لوگوں کو اس سے متمتع ہونے کے لئے قرآن پاک اسے گردش میں رکھنے کا حکم دیتا ہے (۱۷) ۔ زکوۃ کی فرضیت کا مقصد ھی معاشرے کے غریب و لاچار افراد کی مدد ، ارتکاز دولت کی حوصلہ شکنی ، طبقاتی کشمکش کا خاتمہ اور باھمی انس و محبت کا فروغ ہے۔ (۱۸) قرآن پاک کے نزدیک قابل ستائش وہ لوگ ھیں جو زکوۃ اور قانونی واجبات کے علاوہ بھی اپنے اموال میں سے سائل اور بے سہارا لوگوں کی مالی اعانت کرنا فرض سمجھتے ھیں ۔ و فی اموالھم حق معلوم

للسائل والمحروم ـ (۱۹) ـ قرآن پاک نے صدقات نافلہ کی بھی ترغیب دی بلکہ اس حد تک ہدایت کر دی کہ جو کچھ ضرورت سے زائد ہو اس کو محتاجوں میں تقسیم کر دو ـ و یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو (۲۰) ـ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ زکوۃ و صدقات کے علاوہ ضرورتمندوں کی حاجتیں پوری کرنے کے لئے اسلامی ریاست اضافی ٹیکس بھی عائد کر سکتی ہے (۲۱) ـ الغرض دولت کی منصفانہ تقسیم کی خاطر جو اقدامات بھی ضروری ہیں اسلام نے ان سے پہلو تہی نہیں کی ـ جس طرح غربت جمہوریت کی دشمن ہے اسی طرح دولت کی فراوانی اور اس کے نتیجے میں عیاشی بھی جمہوریت کے لئے سم قاتل ہے ـ چنانچہ قرآن حکیم اگر ایک طرف دولت کو گردش میں رکھنے کے انتظامات کرتا ہے تو دوسری طرف تبذیر (ناجائز کاموں پر خرچ) اور اسراف (بے ضرورت خرچ) کی بھی ممانعت کرتا ہے ـ ولاتبذرتبذیراً (۲۲) اور ولا تجعل یدک مغلولة الی عنقک ولا تبسطها کل البسط فتقعد ملوماً محسوراً (۲۳) ـ

سطور بالا میں اسلام کے معاشی نظام کا جو خاکہ پیش کیا گیا ، وہ ہر قسم کی خامیوں سے مبرا ہے ـ اس میں افراط ہے نہ تفریط ـ اس میں ایک طرف مادی ترقی اور خوشحالی کے لئے جگہ ہے تو دوسری طرف روحانیت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے ـ اسلام انسان کو پیٹ کا پجاری اور سیاسی غلام نہیں بناتا بلکہ افراد کو باعزت اخلاقی زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے ـ

اسلام ، نظام حیات کی تعمیر اخلاقی بنیادوں پر کرنا چاہتا ہے ـ اس مقصد کے لئے وہ جہاں معاشرتی عدل و انصاف کے بنیادی اصول بتاتا ہے اور ایک متوازن معیشت قائم کرتا ہے وہاں انسان کی سیاسی زندگی کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کے لئے کچھ سیاسی اصول بھی دیتا ہے ـ ملکی معاملات میں عام لوگوں کی بالواسطہ یا بلا واسطہ شرکت جدید جمہوریت کا طرۂ امتیاز ہے ـ

اسلام اسکوردنہیں کرتا لیکن اسلام نے اس شرکت‌کو بھی‌اخلاقی‌اصولوں کے تابع رکھا ہے جو اس کے بنیادی تصورات سے مستفاد ھیں ۔ اور آج مغرب میں بھی جہاں بے دین سیاست اور بے لگام جمہوریت کا عمل دخل ہے شدت سے اس کی ضرورت محسوس کی جا رھی ہے۔

قرآنی تعلیمات ، سنت رسول اور صدر اسلام کی تاریخ اس بات کی شاھد ہے کہ اسلام باھمی تعاون ، مشاورت اور تعمیری تنقید کو اجتماعی معاملات میں بڑی اھمیت دیتا ہے۔ قرآن پاک مشاورت کو مسلمانوں کی زندگی کا اھم جزو قرار دیتا ہے (۲۴) ۔ اور وحی الٰہی کے باوجود رسول مقبول سے کہتا ہے کہ آپ مسلمانوں سے ملکی معاملات میں مشورہ لیا کریں (۲۵) ۔ آپ نے ملکی معاملات میں نہ صرف مسلمانوں سے مشورہ لیا بلکہ ان کے مشوروں کو قبول بھی کیا (۲۶) ۔

جہاں تک ملکی اور قومی معاملات میں لوگوں کی شمولیت کا تعلق ہے ، اسلام نے عمومی اصول دیکر تفصیلات مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیں تاکہ وہ حالات کے مطابق خود طے کر سکیں ۔ جہاں تک ملک کا نظم و نسق چلانے کے لئے اھلکاروں کے انتخاب کا تعلق ہے ۔ اسلام یہ معاملہ بھی مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑتا ہے تاکہ انہیں بدلتے یا بدلے ھوئے حالات میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے ۔ البتہ قرآن پاک رھنمائی کے لئے ایک جامع اصول دیتا ہے۔

ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا (۲۸) ۔

حدیث میں اس آیت کی تفسیر و تشریح اس طرح ہے آپ نے فرمایا کہ یہاں لفظ امانت سے مراد حکومت یا ریاستی معاملات ھیں ۔ آپ نے فرمایا جب امانت ضائع کی جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔ عرض کیا گیا کہ امانت کیسے ضائع ھوگی ؟

آپ نے فرمایا جب حکومت کے معاملات ایسے لوگوں کے سپرد ہوں گے جو ان کے اهل نہ ہوں (۲۹) ۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں ملکیت کی طرح اقتدار بھی ایک امانت ہے جسے خدا کی خوشنودی اور اس کے بندوں کی خدمت کے لئے کام میں لایا جائے ۔

کچھ لوگ خصوصاً مغربی اداروں میں پڑھا لکھا طبقہ قرآن پاک کی آیتوں اور احادیث کو سیاق و سباق سے الگ کرکے یہ دعوی کرتا ہے کہ اسلام میں سخصی حکومت ہے ۔ یا وہ مسلمانوں کی تاریخ کے ایک دور کے حوالے سے اس پر ملوکیت کا ٹھپا لگانے کی ناکام کوشش کرتے هیں ۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن پاک اللہ تعالی اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ اولوالامر کی اطاعت کا بھی حکم دیتا ہے (۳۰) ۔لیکن اسکے ساتھ هی یہ بھی کہتا هیکہ اگر تمہارا ان سے اختلاف ہو تو اسے قرآن اور سنت کی روشنی میں حل کیا کرو ۔ دوسرے یہ کہ اولوالامر کی مختلف مفسرین نے مختلف تاویلیں کی هیں اور ان میں سلاطین و امراء کو بھی سامل کر لیا ہے (۳۱) ۔ امام زمخشری کے قول کے مطابق آیت محولہ بالا میں حکمرانوں کی مطلق اطاعت کے لئے نہیں کہا گیا ہے کیونکہ حکمرانوں کے لئے حکم ہے کہ وہ اپنے فرائض دیانتداری کے ساتھ سر انجام دیں اور عــــدل وانصاف کا دامن کبھی نہ چھوڑیں ۔ اگر وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں عدل و انصاف سے کام نہیں لیں گے تو وہ اس منصب کے اهل نہیں رهیں گے جس کے طفیل وہ اولوالامر کے زمرے میں شمار ہوتے هیں ۔ حکمرانوں کی اطاعت نہ کرنے کی دوسری وجہ امام زمخشری یہ بتاتے هیں کہ وہ اختلاف کی صورت میں فیصلہ اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کی روشنی میں نہیں کرتے (۳۲)

[illegible] تو ظاهر

ہے کہ وہ قرآنی آیات کی تشریح ہی کرتی ہیں چنانچہ احادیث میں بھی مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ امیر کی اطاعت کریں۔(۳۳) لیکن یہ اطاعت غیر مشروط نہیں ۔ اطاعت امیر صرف معروف میں لازم ہے ، معصیت میں نہیں۔(۳۴) اگر حاکم وقت کے احکامات اللہ کی نافرمانی کا سبب بنیں تو اس صورت میں اطاعت امیر واجب نہیں۔(۳۵)

ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم مختلف اقوال و بیانات کو ان کے تاریخی پس منظر میں نہیں دیکھتے ۔ خلافت راشدہ کے آخری دور میں جب خانہ جنگیوں کا آغاز ہوا تو زعماء کو ملت کے اتحاد و استحکام کی فکر دامن گیر ہوئی ۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ہر قسم کے خروج کی ممانعت کی۔(۳۶) اور اطاعت امیر پر زور دیا ۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ امیر کی امارت کو چیلنج کرنے اور اطاعت نہ کرنے کی وجہ سے جو قانوی خلا پیدا ہوگا اس سے بہتر یہی ہے کہ اس کی امارت تسلیم کر لی جائے اور اطاعت کی جائے تاکہ فتنہ و فساد برپا نہ ہو۔(۳۷) اسی قسم کے خیالات کا اظہار ابن جماعہ نے بھی کیا ہے (۳۸) ۔ اسی سلسلے میں بحث کرتے ہوئے امام یحی بن شرف النووی فرماتے ہیں کہ اطاعت امیر کے غیرمشروط احکامات دراصل امت کی وحدت کو برقرار رکھنے کیلئے ہیں ۔ کیونکہ اختلاف کی صورت میں انکے مذہب اور سیاست دونوں کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے ۔ (۳۹)

حکمرانوں کے انتخاب اور ان کی مشروط اطاعت کی بہت ساری مثالیں صدر اول کی تاریخ سے دی جا سکتی ہیں ۔ اختصار کے لئے ہم یہاں صرف دو حوالوں پر اکتفا کریں گے جو کتب تاریخ میں تقریباً ایک جیسے مذکور ہیں ۔ رسول کریم کی رحلت کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیق مسلمانوں کے حکمران منتخب ہوئے تو آپ نے نہایت وضاحت سے فرمایا کہ اے لوگو! تم ہی نے مجھے اپنا حکمران چنا ہے اگر میں درست کام کروں تو میری اعانت کرنا اور

اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کرنا ۔ جب تک میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو اور اگر میں ان کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں۔(۴۰) عامۃ الناس کے سامنے اپنے کاموں کے لئے حکمرانوں کی جوابدھی ، ذمہ داری اور شریعت کی پاسداری کا اندازہ حضرت معاذ بن جبل کی اس تقریر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے ملک شام کے حکمران کے دربار میں کی تھی ۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمارا حکمران ہم ہی میں سے ہے اگر وہ ہمارے درمیان قرآن و سنت پر عمل پیرا ہو تو ہم اس کی اطاعت کرتے رہیں گے لیکن اگر وہ ان (قرآن و سنت) سے روگردانی کرتا ہے تو ہم اسے معزول کر دیں گے۔(۴۱)

مندرجہ بالا بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اسلام چونکہ ایک متحرک قوت اور ایک مکمل دین ہے اس لئے یہ ایسے اصول نہیں دیتا جو ایک زمانے کے لوگوں کے لئے تو موزوں و مناسب ہوں لیکن دوسرے زمانے کے لئے قطعاً ناقابل عمل ہوں ۔ اس کے اصول ابدی ہیں جو ہر زمانے میں اپنائے جا سکتے ہیں ۔ سیاسی معاملات میں اس نے شوری کا ابدی اصول دیا ہے جسے مختلف زمانوں میں حالات کے مطابق اپنایا جا سکتا ہے ۔ حکمرانوں کے انتخاب سے لیکر ان کی معزولی تک کے معاملات باھمی مشوروں سے طے ہوں گے ۔ ان اصولوں پر تاریخ کے ایک عہد میں عمل درآمد بھی ہو چکا ہے ۔ حضرت ابوبکر کا انتخاب ، حضرت عمر کی نامزدگی اور حضرت عثمان اور حضرت علی کا چناؤ مسلمانوں کے باھمی مشوروں سے ہوا ۔ اور یہی جدید جمہوریت کا ماحصل ہے ۔ اسلام اور مغربی جمہوریت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں حکمرانوں کا انتخاب اہلیت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے جب کہ مؤخر الذکر میں یہ انتخاب پارٹی کی بنیاد پر عمل میں لایا جاتا ہے۔

حکمـــران کی معزولی کا سوال حضرت عثمان غنی کے عہد مبارک میں اٹھایا گیا ۔ اگرچـہ اس عہد کے واقعات کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے لیکن ذرا بھی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کـہ حضرت عثمان نے جان کی قربانی دیکر اس اصول کو دوام بخشا کـہ باھمی مشوروں سے منتخب ہونے کے بعـد حکمران اس وقت تک قانونی طور پر حاکم رھتا ہے جب تک وہ اس کا اھل رھتا ہے۔(۳۲) ھاں اگر وہ حکمرانی کا اھل نـہ رہے تو اھل الرائے یا اھل الشوریٰ اس سے استعفی طلب کر سکتے ھیں ۔ لیکن استعفی طلب کرنے کا حق نـہ تو اقلیت کی نمائندگی کرنے والوں کو دیا جا سکتا ہے اور نـہ ھی شورشیوں یا مفاد پرست عناصر کے کسی گروہ کو ۔ چنانچـہ حضرت عثمان سے جب شورشیوں نے اپنے آپ کو معزول کرنے کو کہا تو آپ نے ان کا مطالبـہ یـہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کـہ کیا میں نے اقتدار پر شمشیر کی نوک سے قبضـہ کر رکھا ہے کـہ تم میری معزولی تلوار کے زور سے چاھتے ھو۔(۳۳) » اس سے یـہ نتیجـہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کـہ نااھل لوگ اگر حکومت سے غیر قانونی طور پر استعفی کا مطالبـہ نہیں کر سکتے تو اسلامی ریاست میں ایسے لوگ حکمرانوں کا انتخاب بھی نہیں کر سکتے ۔ تاریخ شاھد ہے کـہ جب حضرت عثمان کی شہادت کے بعد شورشی حضرت علی کے پاس آئے اور آپ سے خلافت کا منصب سنبھالنے کو کہا تو آپ نے ان کی یـہ پیشکش یـہ کہـہ کر مسترد کر دی کـہ شہر میں اھل بدر اور اھل شوری موجود ھیں وہ جسے منتخب کریں گے وھی ملت اسلامیـہ کا حکمران ہوگا (۳۴) ۔ چنانچـہ دوسری مرتبـہ جب انصار اور مہاجرین کے سرکردہ اشخاص جو کـہ اھل الشوری اور اھل الرائے تھے ، آپ کے پاس آئے اور خلافت کی ذمـہ داریاں سنبھالنے کی استدعا کی تو آپ نے خلافت کا منصب سنبھالا اور برسر عام آپ کی بیعت کی گئی (۳۵) ۔

رسول کریم کا اپنی جانشینی کے بارے میں خاموشی اختیـار کرنـا ،

خلفائے راشدین کے انتخاب کے مختلف طریقے ، اور اس سلسلے میں صحابہ کرام کے بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ اسلام امور مملکت میں عام لوگوں کی شرکت کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتا ہے بلکہ اسے ایک مقدس فریضہ قرار دیتا ہے ۔ مگر اس کی نوعیت سب سے الگ ہے ۔ گزشتہ صفحات میں اسلامی نظام حیات کا جو اجمالی خاکہ پیش کیا گیا اس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام آج کل کی اصطلاح میں جمہوریت یا کسی ازم کا نام نہیں ۔ نہ وہ کسی کے مماثل ہے ۔ وہ ایک ایسا نظام حیات ہے جو زندگی کو اخلاقی اصولوں کا پابند بنا کر انسانی مسائل کو حل کرتا ہے ۔ مغربی جمہوریت ہو یا کوئی اور نقص اور ناتمامی کے باعث اسلام کے ساتھ ان کا کوئی میل نہیں ۔ جب کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور مزاج اور ترکیب میں ایک خاص نظام زندگی ہے ۔

****

حواشی اور حوالہ جات

۱ ـ قرآن مجید ـ سورۃ المائدہ ، آیت ۳

۲ ـ قرآن مجید ـ سورۃ الحجرات ـ آیت ۱۳

۳ ـ ایضاً آیت ۱۰

۴ ـ سورۃ النساء ـ ۵۸ ، المائدہ ، ۴۴ ، ۴۵ ، ۴۷ ، النحل ، ۹۰ الاعراف ، ۲۸

۵ ـ سورۃ النساء ، ۱۳۵ ، سورۃ المائدہ ، ۸

۶ ـ سورۃ النحل ، ۷۱

۷ ـ سورۃ البلد ، ۱۳ ، الدھر ، ۸ ، البقرہ ، ۱۷۷

۸ ـ سورۃ التوبہ ، ۶۰

۹ ـ ابن حبیب ، کتاب المحبر ، حیدرآباد دکن ، ۱۹۴۲ ، ص ۱۷ ـ ۷۰

۱۰ ـ ابن سعد ، کتاب الطبقات الکبری ، بیروت ، ۱۹۵۷ ، جلد اول ، ص ۳۹ ـ ۲۳۸

۱۱ ـ ابن ہشام ، سیرۃ النبی ، قاہرہ ، ۱۹۳۸ ، جلد چہارم ص ۲۷۵

۱۲ ـ قرآن کریم ، سورۃ التوبہ ، آیت ۳۴

۱۳ ـ ایضاً سورۃ الھمزہ ، آیت ۱ تا ۴

۱۴ ـ البقرہ ، ۲۹ ، الحجر ، ۲۰

۱۵ ـ النجم ، ۳۹ ـ ۴۰

۱۶ ـ سورۃ النمل آیت ۹۰

۱۷ ـ الحشر ، ۷

۱۸ ـ التوبہ ، ۶۰

۱۹ ـ الذاریات ، ۱۹

۱ ـ البقره ، ۲۱۹

۲ ـ مشکوۃ المصابیح جلد دوم ص ۶۲۳ ـ ابن حزم ، المحلی (قاهره ۱۳۳۹هـ) جلد ۶ ، ص ۱۵۶

۱ ـ سوره بنی اسرائیل ، آیت ۲۶

۲ ـ ایضاً آیت ۲۹

۲ ـ شوری ، ۳۸

۲۰ ـ آل عمرن ، ۱۵۹

۲۳ ـ مثال کے طور پر جنگ بدر کا نقشہ حباب بن منذر کے مشورہ پر بدل دیا گیا ـ (دیکھئے تفصیلات کے لئے سیرت ابن ہشام جلد دوم ص ۲۷۲) جنگ بدر کے اسیروں کی قسمت کا فیصلہ بھی باھمی مشوروں سے طے ہوا جس کی توثیق قرآن پاک نے بھی کی۔(طبری تاریخ ص ۷ـ۱۳۵۵) جنگ خندق کا نقشہ ایک آزاد کردہ غلام حضرت سلیمان الفارسی کی تحویز کے مطابق تیار کیا گیا۔ (سیرۃ ابن ہشام جلد سوم ص ۲۳۵)

۲۷ ـ الطبری ، جامع البیان لاحکام القرآن جلد دوم ص ۳۶ ـ ۲۳۵

۲۸ ـ قرآن پاک ، سورۃ النساء ، آیت ۵۸ ـ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے مفتی محمد شفیع ، معارف القرآن جلد دوم کراچی ۱۹۷۶ء، ص ۵۳ ـ ۳۳۲

۲۹ ـ بخاری شریف ، کتاب الرقاق ، کتاب العلم

۳۰ ـ سورۃ النساء آیت ۵۹

۳۱ ـ الطبری ، جامع البیان جلد ہشتم ص ۵۰۲ ـ ۴۹۷

۳۲ ـ زمخشری ، الکشاف ، قاهره ، ۱۳۵۴ هـ جلد اول ص ۲۹۰

۳۳ ـ بخاری شریف (نور محمد اصح المطابع) جلد دوم ص ۱۰۵۷

۳۴ ـ ایضاً ص ۵۸ ـ ۱۰۵۷

۳۵ ـ امام احمد بن حنبل ، سنن ، قاهره ، جلد پنجم ص ۶۶

لا طاعة لمخلوق فی معصیة الله

۳۶ ـ امام ابویوسف ، کتاب الخراج ، قاهره ، ۱۳۸۲ هـ ص ۹ ـ بخاری جلد دوم ص ۱۰۴۷

۲۷ ـ امام غزالی اپنی کتاب "الاقتصاد فی الاعتقاد" مطبوعہ قاہرہ میں ص ۱۰۷ پر لکھتے ہیں :-

أحسن ان یعول القضاة معزولون و الولایات باطلة والانکحة غیر منعقده و جمع تصرفاة اولاة فی اعطار العالم غیر نافذة و انما الخلق کلهم مقدمون علی الحرام او ان یقول الامامه منعقدة

۲۸ ـ رور نتھال ، پولیٹکیل تھاٹ ان میڈیوِل سلام ، لندن ۱۹۶۲ ، ص ۴۳ ـ البرٹ حورانی ، اریبک تھاٹ ان دی لبرل ایج ، لندن ، ۱۹۷۰ ، ص ۱۵ ـ ۱۳

۲۹ ـ یحیی بن شرف النووی ، شرح لمسلم الصحیح ، جلد دوم ، کراچی ، ۱۳۳۹ ،ھ ، ص ۱۲۳

۳۰ ـ الطبری ، تاریخ ، ص ۱۸۲۹

۳۱ ـ الازدی ، فتوح الشام ، (اردو ترجمہ ملیح آبادی) کلکتہ ، ۱۹۳۳ ، ص ۱۸۵ ـ ابوالکلام آزاد ، اسلامی جمہوریہ ، لاہور ، ۱۹۵۶ ، ص ۳۲

۳۲ ـ الماوردی ، الاحکام السلطانیہ ص ۱۷

۳۳ ـ ابن سعد ، الطبقات الکبری ، بیروت ، ۱۹۵۷ ، ص ۶۸ جلد دوم

۳۴ ـ ابن قتیبہ ، الامامة و السیاسة ، مصر ، ۱۹۶۹ ، ص ۳۶

۳۵ ـ ابن الاثیر ، تاریخ ، جلد دوم ص۱۵۳ ـ طبری تاریخ ص ۳۰۶۶ ـ

*****

علی گڑھ میں علامہ میمنی کے روز و شب

محمد محمود میمن

لاھور کی ملازمت سے سبکدوش ھو کر والد محترم پروفیسر عبدالعزیز میمن نے ۱۴ نومبر ۱۹۲۵ء سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ عربی میں بطور ریڈر اپنی ملازمت کا آغاز کیا ـ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بشیر الدین احمد صدیقی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں والد صاحب کے تقرر پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا "مولانا عبدالحق صاحب حقّی بغدادی مرحوم کے بجائے عربی ڈیپارٹمنٹ میں ایک نہایت قابل قدر اضافہ ھوا ہے ـ مولانا عبدالعزیز میمن صاحب ھمارے تعارف اور تحسین سے مستغنی ھیں ـ ان کا علمی ذوق اور ادب عربی میں ان کی عالمانہ تحقیق ان کو ان بلندیوں پر پہنچا چکی ہے جہاں لوگ بمشکل پہنچتے ھیں ـ مولانا کی مختلف اور متعدد عربی تصانیف مصر اور لاھور میں شائع ھو چکی ھیں اور باکمالان ادب سے خراج تحسین وصول کر چکی ھیں ـ ھم کو امید ہے ھماری یونیورسٹی مولانا کے تبُحر علمی سے مستفید ھوگی اور علی گڑھ کی فضا مولانا کے مزید اکتسابات علمی کی محرّک ھوگی " (علی گڑھ میگزین جوبلی نمبر " ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۰) ـ علی گڑھ کی طرف دلوں کو کھینچنے اور نوجوانان قوم کو کلمہ خیر سنانے کے لئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جوبلی منعقدہ دسمبر ۱۹۲۵ء کے موقع پر والد صاحب نے عربی میں ایک قصیدہ لکھا جو جوبلی میں پڑھ کر سنایا اور جو علی گڑھ میگزین میں شائع بھی ھوا ـ

یونیورسٹی کی حدود میں مکان نہ ملنے کے سبب ہم لوگوں نے شہر میں حکیم کی سرائے میں ایک مکان میں رہائش اختیار کی ۔ شہر اور یونیورسٹی کے درمیان تقریباً دو میل کا فاصلہ ہوگا ۔ کچھ عرصہ بعد یونیورسٹی میں انتظام ہو گیا اور ہم وہاں منتقل ہو گئے ۔ ہمارے آس پاس مندرجہ ذیل حضرات رہائش پذیر تھے : بشیر صاحب (لائبریرین) ، ڈاکٹر اسحاق مرحوم (فزکس) ، پیرزادہ صاحب (انگریزی) ، اللہ بخش صاحب مرحوم (کیمسٹری) ، حبیب الرحمن صاحب مرحوم (ٹریننگ کالج) ، منظور حسین خان صاحب مرحوم (برسر) اور شیخ عبدالرشید صاحب (تاریخ) ۔ ۱۹۳۲ء میں والد صاحب نے نابینا مدرسہ اور بنگالی کوٹھی سے کچھ فاصلہ پر بریلی لائن کے قریب اپنی ذاتی کوٹھی تعمیر کر لی جس کا نام میمن منزل رکھا اور پھر ہم اس کوٹھی میں منتقل ہو گئے ۔

ان دنوں بھی والد صاحب اپنے روزمرہ کے معمولات پر سختی سے کاربند رہتے تھے اور انہیں کسی مجبوری کے تحت بھی اپنے معمولات میں‌کسی قسم کی تبدیلی بہت شاق گذرتی تھی ۔ زندگی ایک مشینی انداز میں رواں دواں تھی ۔ صبح سویرے اٹھتے ضروریات سے فارغ ہو کر وضو کرتے اور نماز فجر ادا کرتے ۔ اس کے بعد تقریباً دو تین میل کی سیر کرتے ۔ واپس آ کر فوراً ناشتہ کرتے ۔ ناشتہ کے بعد حقّہ پیتے اور کتب بینی یا تصنیف و تالیف میں لگ جاتے ۔ اس وقت وہ اپنے کام میں اتنے زیادہ محو ہوتے کہ دنیا و ما فیہا کی انہیں کچھ خبر نہ ہوتی ۔ یونیورسٹی جانے کا وقت ہوتا تو والدہ محترمہ انہیں ہوشیار کرتیں اور وہ اپنے مقررہ وقت پر یونیورسٹی پہنچ جاتے ۔ دوپہر کے وقت بارہ بجنے کے فوراً بعد ان کی واپسی ہوتی ۔ کھانا کھاتے ، کچھ دیر بعد ظہر کی نماز ادا کرتے، پلنگ پر لیٹے لیٹے حقہ سے شوق فرماتے اور اخبار پڑھتے تاآنکہ نیند آ جاتی اور سو جاتے ۔ دوپہر میں قیلولہ کی عادت تھی ۔ تین اور چار بجے کے درمیان اٹھ بیٹھتے اور پھر تحقیقی کام میں مصروف ہو جاتے ۔ نماز عصر ادا کرتے اور

شام کی سیر کو نکل جاتے ۔ سیر کے وقت عام طور پر کوئی نہ کوئی شخص ان کے ہمراہ ضرور ہوتا جسے وہ اس دوران اپنے علم سے فیضیاب کرتے ۔ مغرب تک ان کی واپسی ہوتی ۔ نماز ادا کرتے اور کچھ دیر بعد رات کا کھانا کھاتے ۔ حقّہ پیتے ، افراد خانہ سے کچھ دیر باتیں کرتے ، ریڈیو پر خبریں سنتے اور اس کے بعد معمولی چہل قدمی کرتے ۔ عشاء کی نماز ادا کرتے اور اس کے فوراً بعد بتیاں گل کر دیتے ۔ رات کے وقت ہمیں پڑھنے لکھنے کی اجازت نہ تھی اور تاکید کی جاتی کہ سو جائیں ۔

جہاں تک غذا کا تعلق ہے والد صاحب زیادہ مرغن غذا سے پرہیز کرتے تھے ۔ اور متوازن غذا پسند فرماتے تھے ۔ گوشت کے علاوہ دسترخوان پر کم از کم ایک سبزی کا ہونا ضروری تھا ۔ رات کے کھانے کے ساتھ وہ دودھ دلیا ضرور لیتے تھے ۔ انہیں کوفتے ، سری پائے ، شامی کباب اور سیخ کباب بہت پسند تھے اشیائے خورد و نوش میں زیادتی کے قائل نہ تھے ۔ ان کے نزدیک چیز قلیل مقدار ھی میں کیوں نہ ہو مگر عمدہ ہو ۔ وہ دن میں تین روایتی کھانوں کے علاوہ بھی دو مرتبہ کچھ نہ کچھ ضرور لیا کرتے تھے ۔ جس میں پھلوں کے علاوہ نمکین اشیاء بھی ہوتی تھیں ۔ شام کی چائے کے ساتھ کھانے کی کسی نہ کسی چیز کا ہونا لازمی تھا ۔ انہیں شہد ، بنیر اور اصلی گھی کا بہت شوق تھا اور ان چیزوں کے حصول کی کوشش میں لگے رہتے تھے ۔ دوست احباب یہانتک کہ طلباء سے بھی ان چیزوں کی فرمائش کرتے ۔ کسی حالت میں بھی یہ چیزیں تحفتاً قبول نہ کرتے تھے ۔ خاص طور سے شاگردوں کو اصرار کرکےفوراً ادائیگی کرتے اور کہتے کہ کیا یہ کم احسان ہے کہ انہوں نے مجھے یہ چیزیں فراہم کیں ۔ دھی کی بہت تعریف کرتے تھے ۔ اور اس کے استعمال پر زور دیتے تھے ۔ شیرینی سے انہیں بہت زیادہ رغبت تھی خاص طور پر گاجر اور لوکی کا حلوا اور امرتیاں انہیں بہت پسند تھیں ۔ پھلوں میں امرود اور آم بکثرت استعمال کرتے

تھے اور فرماتے تھے کہ یہ دونوں پھل دلپسند ہیں اور مُلیّن ، اس کے علاوہ صحت بخش اور مفرّح بھی ۔ آم کا بہت شوق تھا ، عمدہ ہوں چاہے تھوڑے ہی کیوں نہ ہوں ۔ ان کے پسندیدہ آم سرولی ، دسہری اور سپیدہ تھے ۔ اگر کبھی عمدہ بنارسی لنگڑا میسر آجاتا تو وہ کھا لیتے تھے ۔ اس زمانہ میں عمدہ آم دو سے چار روپیہ سیکڑا تک مل جاتا تھا اور سیکڑا بھی ایک سو بیس کا ہوتا تھا۔

میمن منزل میں والد صاحب کا ایک مخصوص کمرا تھا جسے گھر کے افراد کتابوں والا کمرا کہتے تھے ۔ اس میں کمرے ہی کے ناپ کا مشرق وسطی سے لایا ہو ایک عمدہ قالین بچھا رہتا تھا اور ایک جانب زمین پر بیٹھ کر لکھنے کی پرانی وضع کی ڈھلوان میز رکھی رہتی تھی ۔ کمرے کے چاروں طرف بغیر دروازوں کی کتابوں کی الماریاں تھیں ۔ میرے اندازہ کے مطابق کتابوں ، قلمی نسخوں اور مسودات کی کل تعداد تین سے چار ہزار تک ہوگی ۔ ان میں تقریباً تمام کتابیں عربی کی تھیں ، چند ہی فارسی یا اردو کی تھیں اور وہ بھی بہت اہم اور نایاب قسم کی ۔ اس کمرے میں بیٹھ کر والد صاحب مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے ۔ ان کا مطالعہ بڑا تنقیدی ہوتا تھا وہ ساتھ ساتھ حاشیے بھی ثبت کرتے جاتے تھے ۔ کتب خانے کی ساری کتابیں ان کی پڑھی ہوئی تھیں اور ان پر حواشی تحریر تھے ۔ ان کے نزدیک مطالعہ برائے مطالعہ ایک بے معنی اور فضول کام تھا اور اسے وہ تضیع اوقات سمجھتے تھے ۔ وہ فرماتے تھے سرسری مطالعہ سے انسان حقیقی علمی کام کے قابل نہیں رہتا ۔ وہ حضرات والد صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرینگے جنہیں اعلی علمی تحقیق و تصنیف سے کچھ بھی دلچسپی رہی ہے ۔

علی گڑھ کا قیام ان کی تحقیقی زندگی کا سنہری دور تھا ۔ انہوں نے زیادہ تر علمی کام اسی زمانے میں کیے ان کا شہرۂ آفاق اور تحقیقی شاہکار ان

کی کتاب " سمط اللآلی " ہے جسے انہوں نے خود ۱۹۳۵ء میں مصر جا کر شائع کرایا ۔ اس کتاب نے شائع ہوتے ہی دنیائے عرب میں ہل چل مچا دی اور اسی کتاب کے ذریعے انہوں نے عربی لغت اور ادب میں علمائے عرب اور محققین زبان سے اپنے عمیق مطالعہ اور تحقیق کا لوہا منوایا اس کے بعد سے عرب انہیں عربی زبان و ادب کا امام تسلیم کرنے لگے ۔ ان کی اب تک تقریباً تیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے زیادہ تر علی گڑھ کے قیام کے دوران لکھی گئیں ۔

تقسیم سے قبل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے اعلی تعلیم کا ایک مرکزی ادارہ تھا ۔ ہندوستان کے کونے کونے سے مسلمان طلباء کھنچ کر تعلیم و تربیت کی غرض سے علی گڑھ آتے تھے ۔ افریقہ ، عرب دنیا اور دیگر ممالک کے طالبعلم بھی اس گہوارہ علم کا رخ کرتے تھے ۔ دوسرے مذاھب کے طلباء کے لیے بھی اس یونیورسٹی کا دامن وسیع تھا ۔ مشرق وسطی کے اکثر سربرآوردہ حضرات اس درسگاہ کو دیکھنے اور اھل علم سے ملنے یونیورسٹی تشریف لاتے تھے رامپور حامد ہال میں انہیں سپاسنامے پیش کئے جاتے تھے ۔ یہ حضرات عربی میں خطاب کرتے تو ترجمانی کی ذمہ داری والد صاحب کو سونپی جاتی تھی اور وہ اس حسن و خوبی سے ان کی تقاریر کا ترجمہ پیش کرتے تھے کہ ترجمہ اصل پر سبقت لے جاتا تھا اور لوگ سن کر عش عش کر اٹھتے ۔ جو ان سے ناآشنا ہوتے وہ بھی انہیں پہچاننے لگتے اور انہیں یہ علم ہو جاتا تھا کہ یہاں عربی کا ایک اتنا ممتاز عالم موجود ہے ۔

میری طالبعلمی کے زمانہ میں چند اساتذہ کا نام بڑی عزت و احترام سے لیا جاتا تھا اور یونیورسٹی میں ان کی موجودگی کو باعث افتخار سمجھا جاتا تھا ۔ ان اساتذہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں : ڈاکٹر ظفرالحسن مرحوم (فلسفہ) ڈاکٹر کریم حیدر لودھی مرحوم (معاشیات) ، ڈاکٹر ھادی حسن مرحوم

(فارسی) ، محمد حبیب مرحوم (تاریخ) اور والد محترم علامہ عبدالعزیز میمن مرحوم (عربی) ۔ علمی تحقیق ، تصانیف تالیفات کے اعتبار سے والد صاحب کو ان سب حضرات پر فوقیت حاصل تھی ۔ اس زمانہ میں حافظہ کے اعتبار سے دو نام مشہور تھے ان میں سے ایک والد صاحب اور دوسرے ڈاکٹر ھادی حسن مرحوم تھے ۔ والد صاحب کا حافظہ قابل رشک حد تک مثالی تھا ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کا تعلق عربی سے اور دوسرے کا فارسی سے تھا ۔

والد صاحب کو سیاست سے مطلق لگاؤ نہ تھا ۔ نہ درسگاہ کی سیاست سے اِنہیں دلچسپی تھی اور نہ ملک کی ۔ درسگاہ کی سیاست میں ملوث حضرات سے ملنا جلنا بھی پسند نہ فرماتے تھے ۔ ان کے نزدیک انسان کو اپنا مقام اپنی محنت سے حاصل کرنا چاھئے اور اپنے پیچھے ایسا تحقیقی کام چھوڑنا چاھئے کہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہ کر سکیں ۔ خوشامد پرستی ان کے مزاج کے خلاف تھی اور اپنی خودداری کو مجروح کرنا انہیں گوارا نہ تھا ۔ وہ کہتے تھے کہ یہ دونوں کام ، یعنی اپنے مضمون کی خدمت اور درسگاہ کی سیاست ، بیک وقت نہیں ہو سکتے ۔ انسان کو ان دونوں میں سے کسی ایک کو پسند کرنا پڑتا ہے ۔ ظاھر ہے اول الذکر میں عزت ہے ، نام نمود ہے اور کسی حد تک بقا بھی جبکہ مؤخر الذکر میں سراسر خسارہ ہے اور بعض اوقات رسوائی بھی ۔ اخبار ھمیشہ باقاعدگی سے پڑھتے ، ریڈیو پر خبریں بھی سنتے تھے اور اس طرح اپنے آپ کو ملک کے حالات سے باخبر رکھتے تھے ۔ سیاسی مسائل پر کبھی کسی سے گفتگو نہ کرتے اور اگر کوئی کچھ پوچھنے کی ھمت کر ھی بیٹھتا تو بلا جھجک بغیر کسی ذھنی تحفظ کے اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے ۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کا انہیں بہت دکھ تھا اور ان کی نظر میں ھماری موجودہ پستی کا سبب مغربیت کا غلبہ اور اسلام سے بُعد تھا ۔ ان کے نزدیک اصلاح کا واحد ذریعہ فہم قرآن تھا ۔

والد صاحب رھن سھن میں قدیم وضع کے پابند ، سادگی پسند اور تصنّع سے مبرّا تھے ۔ تہذیب و شائستگی کی حدود کو برقرار رکھتے ھوئے ھر چھوٹے بڑے سے بے تکلف ھو کر باتیں کرتے تھے ۔ لوگوں سے دوستی کے زیادہ قائل نہ تھے اور فطرتاً گوشہ نشین تھے ۔ اتنے علم و فضل کے باوجود غرور و تمکنت ان میں نام کو نہ تھا ۔ لوگوں سے تعلقات انسانیت اور شرافت کی بنیاد پر استوار کرتے تھے نہ کہ ان کی امارت یا معاشرے میں ان کے بلند مقام کی بنیاد پر ۔ ھماری کوٹھی میمن منزل کے قریب نابینا طلباء کا ایک اسکول تھا جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک سابق وائس چانسلر صاحب زادہ آفتاب احمد خان مرحوم نے قائم کیا تھا ۔ اس اسکول کے صدر مدرّس جو خود بھی نابینا تھے ان کے ساتھ والد صاحب کے پرخلوص مراسم تھے ۔ دونوں کے مراتب میں زمین آسمان کا فرق تھا مگر والد صاحب تقریباً ھر شام کچھ دیر کے لئے ان سے ملنے ضرور جاتے تھے ، خیریت پوچھتے تھے ، ادھر ادھر کی باتیں کرتے تھے اور ساتھ ساتھ حقّہ سے بھی لطف اندوز ھوتے تھے ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان کا نام احمد سعید یا محمد سعید تھا ۔ والد صاحب کا اپنے یونیورسٹی کے رفقاء میں دوستوں کا دائرہ بہت ھی محدود تھا ۔ جن حضرات سے والد صاحب کا ملنا جلنا تھا ان کے اسمائے گرامی یہ ھیں ؛ مولوی ابوبکر شیث صاحب مرحوم (دینیات) ، بشیرعلی صاحب مرحوم (کیمیا) ، عزیراحمد صاحب مرحوم (ریاضی) ، ڈاکٹر ھادی حسن صاحب مرحوم (فارسی) ، احسن مارھروی صاحب مرحوم (اردو) ، ڈاکٹر ظفرالحسن صاحب مرحوم (فلسفہ) ، ڈاکٹر فیاض صاحب مرحوم (یونیورسٹی ھسپتال) منظور حسین خان صاحب مرحوم (برسر) اور صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم ۔ صدر یار جنگ کو عربی سے بہت زیادہ شغف تھا ، عمر میں والد صاحب سے بڑے تھے اور والد صاحب ان کا بہت احترام کرتے تھے ۔

۱۹۳۲ء میں میں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور اس کے بعد ملازمت کے سلسلے میں مجھے علی گڑھ چھوڑنا پڑا ۔ تقسیم کے وقت میں ٹیچرس ٹریننگ کالج اجمیر میں لکچرار تھا ۔ والدین سے ملنے کی غرض سے سال میں کم از کم ایک مرتبہ علیگڑھ جانیکا اتفاق ضرور ہوتا تھا ۔ جب بھی میں علیگڑھ گیا کبھی میں نے والد صاحب کے روزمرہ کے معمولات میں کوئی فرق نہ پایا ۔ یونیورسٹی میں پڑھانے کے بعد گھر پر ان کا سارا وقت تحقیق و تصنیف میں گزرتا تھا اور انھیں اس سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا ۔ میں بوجہ فسادات اجمیر سے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں اپنی اھلیہ کے ساتھ عارضی قیام کی غرض سے پاکستان آ گیا اور حیدرآباد میں قیام کیا ۔ اس کے بعد حالات اتنے بگڑے کہ پھر ھندوستان جانا نصیب نہ ہوا ۔ ۱۹۵۰ء میں والد صاحب یونیورسٹی علی گڑھ سے پروفیسر اور صدر شعبۂ عربی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ۔ ایک سال کی توسیع کی مدت بھی گزاری اور ۱۹۵۱ء میں حتمی طور پر ملازمت سے سبکدوش ہوگئے ۔ اسکے بعد بھی انہوں نے علیگڑھ ہی میں قیام کیا ۔ ۱۹۵۴ء میں وہ مجھ سے ملنے کے لئے متعلقین کے همراہ پاکستان تشریف لائے اور اس عارضی قیام کے دوران ھی وزارت تعلیم حکومت پاکستان نے انھیں مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی کا پہلا ڈائریکٹر مقرر کر دیا جس کی ذمہ داری انہوں نے ۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو سنبھالی ۔

****

نقد و تبصرہ

* گلہائے بسیم فی اسوۃ النبی الکریم

تصنیف : غائص جہلمی

تقسیم کار : المعارف ۔ گنج بخش روڈ ۔ لاہور

صفحات : ۱۸۸ قیمت : ۲۷ روپے

معلومات عامہ کی ان کتابوں کا اپنا ایک مقام ہے جو کسی شخصیت کے احوال و آثار کو مختصر سوالوں اور مختصر جوابوں کی صورت میں پیش کرتی ہیں ۔ ذہنی آزمائش کے مقابلوں اور زبانی امتحانوں کے لئے یہ کتابیں بہت مفید ہیں ۔ گزشتہ چند برسوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی حیات مبارکہ پر اس طرح کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے ایک ,, گلہائے بسیم فی اسوۃ النبی الکریم،، بھی ہے ۔ مؤلف جناب غائص جہلمی نے ٦١ عنوانات کے تحت ۱۲۷٦ سوالات اور ان کے جوابات یکجا کئے ہیں ۔ انہوں نے جن مستند ماخذوں سے یہ کتاب ترتیب دی ہے ان میں سیرت ابن ہشام ، سیرت النبی (شبلی نعمانی) ، رحمۃ للعالمین (قاضی سلیمان منصور پوری) اور اصح السیر (عبد الرؤف دانا پوری) قابل ذکر ہیں ۔

کتاب معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے دلکش اور جاذب توجہ ہے ۔ تعلیمی اداروں کے کتب خانوں میں ایسی کتابوں کی موجودگی طلبہ کی معلومات میں اضافے کا سبب بنے گی ۔

★ **ہشت محفل**

ترتیب و تالیف : **سید محمد باقر**

تحقیق و ترجمہ : **ڈاکٹر ظہور الدین احمد**

تقسیم کار : **المعارف ۔ گنج بخش روڈ ۔ لاہور**

صفحات : **۱۱۹** **قیمت :۲۴ روپے**

حضرت شاہ ابو المعالی ۔ (۹٦۰ ھ ۔ ۱۰۲۴ ھ) صاحب نظر درویش ، شاعر اور عالم تھے ۔ شیخ عبد الحق محدّث دھلوی ، ابو الفیض فیضی اور ملاّ عبد القادر بدایونی جیسے معاصرین سے ان کے مراسم تھے ۔ موصوف قادری سلسلہ سے منسلک تھے اور شاہ عبد القادر جیلانی کے افکار و تعلیمات کی نشر و اشاعت میں مصروف رہتے تھے ۔ انہوں نے شاہ عبد القادر جیلانی کے حالات میں "تحفة القادریہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی اور شیخ عبد الحق محدّث دھلوی کو "فتوح الغیب" (تالیف : شاہ عبد القادر جیلانی) کے ترجمہ و شرح کی ترغیب دی ۔

حضرت شاہ ابو المعالی کے لائق فرزند سید محمد باقر نے ان کے آٹھ دنوں کے فرمودات قلمبند کئے اور انہیں "ہشت محفل" کا نام دیا ۔ ان فرمودات یا ملفوظات کا واحد قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے ۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد صاحب نے جو برصغیر میں فارسی ادب کی تاریخ پر سندکا درجہ رکھتے ہیں ، "ہشت محفل" کا متن تیار کیا اور اردو میں اسکا ترجمہ کیا ۔ ترجمہ اس قدر سلیس اور شستہ ہے کہ اس پر اصل کا گمان ہوتا ہے ۔

„هشت محفل„ ایک مختصر رسالہ ہے مگر اس میں قادری سلسلے کے آداب بیعت ، معرفت و حقیقت کے نکات اور مرشد کے فرائض وغیرہ مباحث آ گئے ھیں ۔ اس رسالے سے شاہ ابو المعالی کے علم و نظر ، ذوق شعر اور کمالات معنوی پر روشنی پڑتی ہے ۔ جناب ڈاکٹر ظہور الدین احمد صاحب نے شاہ ابو المعالی کے احوال و آثار محنت اور جستجو سے مرتّب کئے ھیں ۔ کتاب میں اصل متن اور ترجمہ دونوں شامل ھیں ۔

اسلامک بک فاؤنڈیشن لاھور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے گزشتہ چند برسوں میں صوفیاء اور تصوّف پر گراں قدر کتابیں شائع کی ھیں ۔ یہ کتاب بھی پہلی بار اسلامک بک فاؤنڈیشن نے چھاپی ہے ۔ کتابت ، طباعت اور جلد بندی نہایت معیاری ہے ۔

(اختر راھی)

★ ★ ★ ★ ★

ماہنامہ

علمی و دینی مجلہ

جمادی الاولیٰ ۱۴۰۱ھ

۱۸ شمارہ نمبر ۱۰

سکولوں ، کالجوں اور لائبریریوں کے لئے منظور شدہ -

ماهنامه
فکرونظر
اسلام آباد

جلد - ۱۸ | جمادی الاولی ۱۴۰۱ھ ☐ مارچ ۱۹۸۱ء | شمارہ - ۱۰

فہرست

فون : ڈائرکٹر ۲۱۷۰۵
ایڈیٹر ۲۵۹۵۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظـــــــــرات

ربیع الثانی کا رسالہ مقررہ وقت پر یعنی یکم ربیع الثانی ۔ ۷ فروری کو شائع ہو گیا تھا ۔ جہاں یہ پہلو لائق اطمینان ہے ایک پہلو تشویش کا بھی ہے۔ اس شمارے میں اغلاط بکثرت راہ پا گئی ھیں ۔ خصوصاً ڈاکٹر صابر آفاقی کا مضمون کشمیر میں سن ھجری کا اجراء اور علوم و فنون کی ترویج " غلطیوں کا طومار ہے۔ بر وقت اشاعت کی خوشی اغلاط کی نذر ھو گئی ۔

رست از یک بند تا افتاد در بند دگر

ایک نہ ایک علت لگی رہتی ہے۔

اگر دستے کنم پیدا نمی یابم گریباں را

هم اس فکر میں رات دن سرگرداں رہتے ھیں کہ رسالے کو بہتر سے بہتر بنایا جائے ۔ یہ نہیں تو کم از کم بھدے نقائص باقی نہ رھیں ۔ لیکن شاید هم نے ایک امر محال کو اپنا مقصد اور نصب العین قرار دے لیا ہے۔ اس لئے قدم قدم پر همیں ناکامی اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چرکے لگتے ھیں ، قلق ھوتا ہے۔ دماغ پریشان ، دل مضطرب اور روح بے چین ھوتی ہے۔ مگر کیا کیجئے ۔ شاید غالب کا یہ فلسفہ ھی صحیح فلسفۂ حیات ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ھیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

پوچھ گچھ اور تحقیق پر معلوم ھوا کہ پروف ریڈر حضرات نے اپنا کام ذمہ داری کے ساتھ انجام نہیں دیا ۔ فکرونظر کا عملہ میری نگرانی میں کام

کرتا ہے۔ ایک طویل اور مسلسل دور تربیت کے بعد اب وہ پروف ریڈنگ کے کام میں بڑی حد تک خود مکتفی ہو گئے ہیں ۔ مگر اس مرتبہ کچھ غیر متوقع صورت حال پیش آئی ۔ پریس کے پرف ریڈروں نے یونٹ کے پروف ریڈروں کو پروف نہیں دکھایا اور پرچہ چھاپ دیا ۔ کچھ کوتاهی یونٹ کے پروف ریڈروں سے بھی ہوئی ۔ ربیع الثانی کے رسالے کا غلط نامہ جمادی الاولی کے فکرونظر میں شائع کیا جا رہا ہے۔ قارئین کرام سے معذرت کے ساتھ گزارش ہے کہ وہ اس کے مطابق اپنی کاپی کی تصحیح کر لیں ۔

ربیع الثانی کا شمارہ چھپائی کے اعتبار سے بھی معیاری اور قابل تعریف نہیں ۔ زیادہ روشنائی کی وجہ سے حروف بھرے بھرے سے لگتے ہیں جو نظر کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ آفسٹ پرنٹنگ میں طباعت کا یہ معیار کسی طور پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا ۔ رسالہ آج کل نئی مشین پر چھپ رہا ہے۔ اس وقت پاکستان میں یہ اپنی ساخت اور قسم کی واحد مشین ہے۔ اس کا عملہ بھی نیا ہے جس کی اکثریت نو آموز اور خامکار ہے۔ ان کی خامیاں جاتے ہی جائیں گی ۔ توقع ہے کہ رفتہ رفتہ طباعت بہتر ہو جائے گی ۔

(شرف الدین اصلاحی)

★ ★ ★ ★ ★ ★ ★

مضمون نگاروں سے التماس

اگر آپ فکر و نظر کے لئے مضمون بھیجنا چاھتے ھیں تو پہلے فکر و نظر کی پالیسی اور معیار سے آگاھی حاصل کیجئے ۔ اس سلسلے میں فکر و نظر کا مطالعہ کسی حد تک آپ کی رهنمائی کر سکتا ہے ۔ پالیسی اور معیار سے متعلق کچھ ضروری گذارشات مناسب وقت پر عرض کی جائیں گی ۔ تنقیدی نگاہ ڈال کر اگر آپ خود ھی اس نتیجے پر پہنچ جائیں کہ آپ کا مضمون فکر و نظر کے لئے موزوں نہیں تو بہتر ہو گا کہ آپ مضمون بھیجنے کی تکلیف نہ اٹھائیں ۔ اس طرح آپ بھی زحمت اور خرچ سے بچ جائیں گے اور ہم بھی ۔

بار بار نظر ثانی کرکے اچھی طرح سے اطمینان کر لیجئے کہ مضمون میں کوئی غلطی یا خامی باقی نہیں رہ گئی ہے ۔

ورق کی پشت پر لکھنے سے احتراز کیجئے ۔

صفحے کے چاروں طرف کافی جگہ چھوڑیئے ۔ بین السطور فاصلہ رکھئے ۔ جلی ، صاف ، خوشخط اور کھلا کھلا لکھئے ۔ اس طرح آپ کے مضمون میں طباعت کے وقت غلطیاں کم سے کم ہوں گی ۔ غلطیوں سے مضمون کس طرح غارت ہوتا ہے آپ سے مخفی نہیں ۔

اسماء اور اعلام کو خاص طور سے بہت واضح اور نمایاں کرکے لکھئے ۔

شکلاً مشابہ حروف میں باھم فرق کو نمایاں کرکے لکھئے ۔

دقیق بیچیدہ اور نامانوس الفاظ کو زیادہ توجہ سے زیادہ صاف لکھئے ۔ کتابت اور طباعت کے مختلف مراحل میں کم پڑھے لکھے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے ۔

حواسی اور حوالہ جات یا کتابیات کو مضمون کے آخر میں اکٹھے اور سلسلہ وار لکھئے ۔

اردو مضمون میں انگریزی ہندسے نہ لکھئے ۔ بلا سدید ضرورت کے انگریزی الفاظ لکھنے سے بھی احتراز کیجئے ۔

فکر و نظر اپنے محدود صفحات کی وجہ سے زیادہ طویل مضمون کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔ دس پندرہ صفحات میں مباحث کو سمیٹیئے ۔ ورنہ آپ کا اچھا مضمون بھی محض طویل ہونے کے باعث واپس ہو سکتا ہے ۔

مضمون روانہ کرنے سے پہلے اس کی ایک نقل اپنے پاس رکھ لیجئے ۔ موصول سدہ مضامین ریکارڈ میں محفوظ رکھے جاتے ہیں ۔ عدم اشاعت کی صورت میں بھی مضامین واپس نہیں کئے جاتے ۔

سائع سدہ مضامین کا معاوضہ دیا جاتا ہے ۔ جس شمارے میں مضمون سائع ہو اس کے تین نسخے بلا قیمت ارسال کئے جاتے ہیں ۔

(مــــدیــــر)

★ ★ ★ ★

فرقہ صابئین پر ایک تحقیقی نظر

قاری محمد عادل خاں

صابی مذہب کے مآخذ کے متعلق بہت اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ جرمن لفظ نوستک ازم کے مترادف ہے۔ نوستک ازم نوستیکوس (Gnostikos) سے ماخوذ ہے۔ اس کا مصدر نوسس (Gnosis) ہے جس کے معنی معرفت و عرفان کے ھیں۔ نوستکزم کے پیروکار نوستک (Gnostics) یعنی عارف کہلاتے ھیں۔ دوسری صدی عیسوی میں یہ مذہب یا عقیدہ ارض روم میں خوب پھلا پھولا۔ چند تاریخی شواھد سے معلوم ھوتا ہے کہ اسکندریہ کے یہودیوں میں بھی نوستکی عقائد موجود تھے۔ لیکن اس سے قبل بھی نوستکوں کا وجود تھا۔ نوستکزم کے پیروکار اپنے مذہب کی تائید میں اناجیل اربعہ سے ثبوت پیش کرتے ھیں۔

مصر کا عیسائی فلسفی ویلینتینس (Valentinus) مسلک ویلینتینس کا بانی، مشہور فلسفی و مفکر بازیلدس (Basilides) مارقیون ازم کا بانی مارقیون (Marcion) اوبیٹس مصری (Obites) اور بردیسانس (Bardesanes) یہ تمام کے تمام نوستک ازم کے مبلغ تھے۔

نوستکی مذهبی رسوم و عقائد گو صابی مذهب سے مختلف هیں لیکن ان کے اساسی اور بنیادی عقاید میں کافی حد تک مشابهت پائی جاتی ہے۔

فلسفہ نوسس (Gnosis) کی ابتدا مصر کے قدیم ترین شہر اسکندریہ میں ہوئی ۔ اس فلسفہ نے آہستہ آہستہ عیسائیت پر بھی گہرا اثر ڈالا ۔

فلسفہ نوستک کے بیشتر آثار و باقیات قبطی زبان میں هیں ۔ یہ فلسفہ مندرجہ ذیل باتوں پر مشتمل ہے۔

مادہ اپنے وجود میں بہت بُرا ہے۔ خدائے واجب الوجود جو تمام آلائشوں سے پاک ہے ممکن نہیں کہ اس مادی عالم کی طرح مادی ہو ۔ خدا اور عالم مادی کا تعلق ایک زنجیر کی طرح ہے۔ چونکہ مادہ پست ترین مخلوق ہے اس لیے خالق اور مخلوق میں بہت بعد ہے۔ لیکن خدا شناسی صرف اس مادی عالم کے ذریعے ممکن ہے اس کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں جس سے خدا کی ذات پہچانی جا سکے ۔

خدا کا جسم نہیں ۔ حضرت عیسیٰ خدا کے بلند ترین مظہر هیں ۔ حضرت عیسی کا کوئی جسمانی وجود نہیں تھا ۔ ان کا کھانا ، پینا اور دنیاوی تکالیف میں مبتلا ہونا صرف ظاهری تھا باطن میں وہ ان تمام مادی ضرورتوں سے پاک تھے ۔

هر شخص ریاضت کے ذریعے اپنے جسم کو اپنا مطیع بنائے ۔ هر آدمی اپنے جسم کو مکمل فراموش کر دے تاکہ وہ شہوات نفسانی سے کلی نجات حاصل کرے ۔ اس مذهب میں ثنویت کا اثر بھی موجود ہے۔

ثنویت میں عقیدہ ہے کہ دونوں عالم اپنے وجود میں معنوی بھی هیں اور

مادی بھی ۔ نوستکی عقیدہ ہے کہ عالم روح عین عالم نور اور عالم مادی عین عالم ظلمت ہے۔ خدا احساس و ادراک سے ماورا ہے۔ وہ ایک ایسا باپ ہے جو نام و نشان سے بالا تر ہے۔ انسانی فکر اس کی بلند و بالا ذات تک نہیں پہنچ سکتی ۔ دنیا تجلیات الٰہی سے وجود میں آتی ہے۔

اس مادی عالم میں ایک شوق و جذب کی کیفیت ہے جو اسے خدا کی طرف کھینچ رہی ہے۔ انسانی طبیعت میں ایک تجلی ودیعت ہے جو اسے راہ نجات کی طرف کشاں کشاں لیے جاتی ہے۔ آخرکار وہ عالم نور میں پہنچ جاتا ہے۔ سب سے پہلا انسان نصف خدا تھا ۔ یہ خیال غالباً ایرانی اساطیری (دیو مالائی) کہانی سے اخذ کیا ہو گا ۔

حضرت عیسی خدا کے مولود اول ہیں ۔ عیسی نصف خدا ، عقل اور کلمہ ہیں ۔ انسان تجلیات کے ذریعے جس کی بارش اس پر عالم نور سے مسلسل ہو رہی ہے نجات حاصل کر سکتا ہے مگر نجات کسی صورت ممکن نہیں نجات صرف عنایات الٰہی سے ممکن ہے۔

ایک نجات دہندہ آنے والا ہے جس کا وعدہ خدا نے کیا ہے۔ یہ نجات دہندہ حضرت عیسی ہیں ۔ یہ عیسی ہی ہیں جنہوں نے "صوفیا" کو قید مادہ سے نجات دلائی ۔ "صوفیا" سے ان کی مراد عقل آسمانی ہے جو مادہ میں در آئی ہے۔

ان میں سے ایک فرقہ ویلنتینسی کہلاتا ہے جن کا عقیدہ ہے کہ نجات دہندہ خدا موسوم بہ سوٹر (Soter) اور "صوفیا" (عقل آسمانی) کے درمیان رشتہ ازدواج قائم ہے۔ اس واقعے کی یاد میں ایک مخصوص مذہبی جشن مناتے ہیں جسے "عید حجلہ عروساں" کہتے ہیں ۔

تخلیق عالم کے حل کا مسئلہ ہر دین و مذہب کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں ان کے ہاں ایک دیو مالائی کہانی ہے جو ان کی عبادات و رسوم کا ایک اہم جزو ہے ، مذہبی رسوم میں ہندوؤں کی رام لیلا کی طرح اس کی پوری پوری نقل کرتے ہیں -

اصلی عرفان علم حقیقی کا حصول ہے نہ کہ علم وہمی کا - اصلی عرفان دل میں ایک تپش پیدا کرتا ہے۔ یہ تپش کشف و شہود اور باطن میں توجہ سے فزوں تر ہوتی ہے۔ باطنی توجہ سے دل کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور انسان ایک بلند معرفت حاصل کر لیتا ہے۔ یہ معرفت اسے ایک نئی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ انسان کے نجات بخش عناصر دانش و عرفان ہی ہیں -

اس مذہب کے پیروکار ترک دنیا ، زہد و ریاضت اور از حد مشقت جسمانی پر ایمان رکھتے ہیں - ان کے ہاں بعض افراد بت پرستی بھی کرتے ہیں - تماثیل اصنام میں تمثیل عیسی بھی سامنے رکھتے ہیں - ان میں سے بعض کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسی نہ مصلوب ہوئے نہ قتل کیے گئے بلکہ وہ دار سے اتر کر اپنے شاگردوں کے ساتھ روپوش ہو گئے -

مسلمانوں کے ہاں بھی قریب قریب یہی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسی نہ سولی چڑھائے گئے نہ قتل کئے گئے بلکہ اللہ نے انہیں اوپر اٹھا لیا -

در حقیقت نوستکی مذہب ایران اور یونان کے درمیانی علاقے ، وادی دجلہ و فرات ، سوریہ ، فلسطین ، بابل و مصر جو ہیلنزم کے زیر اثر تھے کے دین و فلسفہ سے تطبیق و ہم آہنگی کی ایک کوشش تھی - اس دین کی اساس مادی سے روح کی نجات ہے۔

مغربی ایشیا میں قدیم بنیادوں پر ایک نئے فلسفہ نے جنم لیا ۔ یہ حصول عرفان کا ایک نیا طریقہ تھا ۔ اس فلسفے کی تشکیل ، توسیع اور نشر و اشاعت دوسری صدی عیسوی میں ہوئی ۔ تیسری صدی عیسوی میں یہ فلسفہ مصر و روم میں خوب پھیلا ۔ یہ فلسفہ "فلسفہ نجات و عرفان" سے قدرے مماثلت رکھتا تھا ۔ یہی فلسفہ نوستکزم کے نام سے مشہور ہوا ۔

بازیلدس ، کایوکراتس اور ویلنتینس اس فلسفے کے اہم ترین افراد ہیں۔ نوستک فلسفہ کے پیرو کار امتداد زمانہ سے کئی گروھوں میں منقسم ہو گئے ۔ ان میں سے ایک گروہ صابئین کہلایا ۔ یہ گروہ صابئین اپنے آپ کو "مندع" (Mandaens) بھی کہلاتے ھیں ۔ مندع کے معنی معرفت علم و عرفان ہے۔ یونانی میں اس کا ترجمہ نوسس (Gnosis) ہے اور یہ لفظ یونانی لفظ نوستوکی (Gnostice) سے مشتق ہے جس کے معنی "عرفان" کے ھیں ۔

بعض کا خیال ہے کہ "منداعی" کی اصطلاح آرامی زبان کے لفظ "مندع" یا "مندعا" سے مشتق ہے۔ کتاب دانیال میں یہ لفظ چار جگہ آیا ہے۔ انجیل لوقا کے سریانی ترجمے میں لفظ "مندع" کی جگہ یونانی اصطلاح نوسس سوتیوایس (Gnosis - soteoias) استعمال کی گئی ہے۔ جس کے معنی پہچاننا اور نجات کا راستہ کے ھیں اور یہ منداعی ھی کا ترجمہ ہے ۔ مندع (Mandayya) کے معنی عرفان کے ھیں ، اصل میں یہ لفظ ماندا ۔ د ۔ ھیا (Man-da - d - hiea) ہے ۔اس کے معنی نجات دھندہ کے ھیں ۔ اس سے مراد معرفت ھستی ہے۔ صابئین اپنے روحانی بزرگوں کو ناصریہ (Nasoraiya) کہتے ھیں اور کبھی کبھار اپنے آپ کو ناصری (Nasoraeans) کہتے ھیں ۔ مشہور منداعی محقق پروفیسر لیدزبارسکی(Lidz Barski) نے ناصریہ کے معنی "محافظ قانون و

دستورات مذھبی،، کے کیے ھیں ۔ ناصریہ کی اصطلاح یونانی لفظ (Nazotos) سے لی گئی ہے۔

ایپیفانس (Epiphanius) کا کہنا ہے کہ یونانیوں کی یہ اصطلاح حضرت یحیی کے پیرو کاروں کے لیے بولی جاتی تھی اور ایک لحاظ سے صابئین بھی حضرت یحیی کے پیرو کار تھے ۔

صابئین منداعی کی اصلی سر زمین

دین صابی کے پیروکاروں کا اصلی مقام ارض فلسطین ہے۔ بعد میں خاص وجوہ کی بنا پر یہ لوگ فلسطین سے ھجرت کر کے وادی دجلہ و فرات میں سکونت پذیر ھو گئے ۔ ان کی کتابوں میں لفظ ،،یاردنا،، کثرت سے استعمال ھوا ہے۔ یہ لفظ وہ ،،اردن،، کے لیے بولتے تھے ۔ یہ لفظ فلسطینی ہے۔ اس کے معنی صاف و شفاف جاری پانی کے ھیں ۔ ان کے مذھب کی بنیادی رسم بپتسمہ ہے جو جاری پانی کے سوا اور کسی پانی سے نہیں ھو سکتا ۔
انکے مذھبی لٹریچر میں فلسطین کو اصلی سرزمین کہاگیا ہے انکی مذھبی کتب میں جن مقامات کا ذکر کیاگیا ہے یہ مقامات سب کے سب فلسطینی ھیں ۔ ان باتـوں سے معلوم ھوتا ہے کہ ان کا اصل مقام فلسطین ھی ہے۔ اس کے علاوہ بھی چند شواھد ایسے ھیں جن سے یہ بات ثابت ھوتی ہے کہ دین صابی کی ابتدا فلسطین ھی سے ھوئی ہے۔ ان کی کتابوں میں یہودیوں سے سخت نفرت و حقارت کا اظہار کیا گیا ہے۔ کتاب گینز امینا (Ganz Aminaa) میں یہودیوں کو غلیظ اور گندہ لوتھڑا کہا گیا ہے ۔

ان کی اسی مقدس کتاب میں ایک جگہ تحریر ہے کہ شہر یروشلم کے

یہودیوں نے میرے مذھب کے پیرو کاروں کو بہت ستایا ہے۔ ایک اور جگہ ہے کہ جن بزرگوں نے بیت المقدس سے ھجرت کی ہے ان کو اس کا اجر ضرور ملے گا۔

ان تمام باتوں سے یہ ثابت ھوتا ہے کہ غالباً یہ لوگ کنعانی یہودی تھے، جنھوں نے اپنا اصل دین چھوڑ کر دین یحیی معمدانی اختیار کر لیا تھا۔

دین صابئین میں ایرانی دین کا اثر

بؤسیٹ (Bousset) لیدزبارسکی (Lidzbarski) اور رائیٹزے شتائن (Reitzestein) کا کہنا ہے کہ دین منداعی میں زردشتی فلسفے کے افکار و عقائد کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ افکار و عقائد انہوں نے اس وقت اختیار کیے تھے جب یہ لوگ فلسطین ھی میں تھے۔ نور و ظلمت ، رسوم و عقائد اور تقویم میں زرتشتیوں سے حیرت انگیز مشابہت ھی اس کا ثبوت ھیں۔ کلدانیوں کی ستارہ پرستی ، بابلیوں کے طلسمی عقائد اور جھاڑ پھونک ٹونا ٹوٹکا وغیرہ کا بھی ان پر کافی اثر تھا۔ ان کی بعض مذھبی کتابوں میں ہے کہ معبودان بابل سب کے سب شیاطین ھیں۔ صابئین منداعی کا کہنا تھا کہ معبودان بابل عالم ظلمت کا حصہ ھیں۔ یعنی یہ سب کے سب مادی ھیں۔ ان میں خدا ھونے کی صلاحیت نہیں۔ کیونکہ خدا مادہ سے ماورا ہے۔

صابئین منداعی کی حران کی طرف ھجرت

منداعیوں کی فلسطین سے حران کی طرف ھجرت کی دریافت کا سہرا مشہور منداعی شناس خاتون لیڈی ڈراؤرر (Lady Drawrer) کے سر ہے۔ انہیں اپنی تحقیق کے دوران ایک قدیم دستاویز "ھاران گاوای تا" کے نام کی ملی۔ "ھاران گاوای تا" سے مراد "حران داخلی" ہے۔ اور اسی سے یہ بات ثابت ھوئی کہ صابئین منداعی نے فلسطین سے ھجرت کر کے جس جگہ قیام کیا وہ حران ھی

تھا ۔

یہ ھجرت ان کی تحقیق کے مطابق شہنشاہ ارتاباتوس کے دور میں ہوئی ۔ ڈاکٹر روڈلف کی تحقیق یہ ہے کہ یہ وھی ارتاباتوس ھو گا جو حضرت عیسی کے دور میں حکومت کرتا تھا ۔

دین صابئین دین مسیحی سے قدیم ہے

معلوم ھوتا ہے کہ دین صابئین مسیحیت سے قدیم ہے۔ صابئین منداعی کا تھوڑا حال انجیل سے معلوم ھوتا ہے۔ بالخصوص انجیل یوحنا سے تو واضح طور پر یہ معلوم ھوتا ہے کہ دین صابی کے عقائد پہلی صدی عیسوی میں ارض فلسطین میں موجود تھے ۔ انجیل یوحنا کا مقدمہ جو نور و ظلمت کے فلسفے پر مشتمل ہے اس میں دین صابی کے فلسفے کے حامل مندرجہ ذیل مصرعے اس بات کو ثابت کرتے ھیں ۔

ابتدا میں کلمہ تھا
کلمہ خدا کے پاس تھا
اور خـــدا کلمہ تھا
ھستی اس میں تھی
ھستی کا نور انسان تھا
نور ظلمت میں چمکا
ظلمت اسے نہ پا سکی

یہ مصرعے بہت قدیم ھیں ۔ یہاں تک کہ مزامیر داؤد میں بھی موجود ھیں ۔ لیکن یہی مصرعے صابئین منداعی کی مقدس کتابوں میں تفصیل سے ھیں ۔ غالب گمان ہے کہ مقدمہ انجیل کے مصرعے نوستکی مذھب سے اخذ کیے گئے

هیں ۔ انجیل یوحنا تمام کی تمام عقیدہ حیات پر مبنی ہے ۔ یعنی هستئی مطلق اور نور و حقیقت ۔ صابئین کے هاں یہ اصطلاحات «هی یا» (حیات) ، «نهورا» (نور) اور «کوشط» (حقیقت) ملتی هیں ۔ انجیل یوحنا کے آٹھویں باب ۳۲ آیت میں حضرت مسیح کا یہ قول «حقیقت تم کو نجات دے گی» صابئین کی نماز کا جزو ہے ۔

انجیل یوحنا کے پندرهویں باب میں حضرت عیسی کا یہ فرمان «میں تاک حقیقی هوں » اور تاک ، منداعی میں ایک مقدس فرشتے کا لقب ہے ۔ فلسطین کے قدیم «نوستک تاک» کو مقرب اور معزز فرشتوں کے لیے استعمال کرتے تھے ۔

انجیل یوحنا کی مراد اس جگہ یہ ہے کہ حضرت عیسی حقیقی فرشتہ هیں اور نوستک کے فرشتے مجازی اور غیر حقیقی هیں ۔ ایک مذهبی گیت میں «لفظ تاک» اس طرح استعمال هوا ہے ۔

«مجھے عظیم هستی نے بویا ۔ بویا مجھکو عظیم هستی نے ۔ یعنی میں «تاک» هوں اور مجھکو عظیم هستی نے بویا ہے» ۔

ایک اور مذهبی گیت میں یہ لفظ اس طرح استعمال هوا ہے ۔

«تو ایک برے تاک کی طرح ہے جو اچھا پھل نہیں رکھتا» ۔

«یہاں تاک» سے مراد انگور کی بیل ہے ۔ مندرجہ بالا باتوں سے خیال هوتا ہے کہ دین صابئین منداعی دین مسیحی سے بھی قدیم ہے ۔

دین منداعی کے بارے میں زیادہ تر معلومات همیں انجیل یوحنا میں ملتی هیں ۔ اور یوحنا حضرت یحیی کا عبرانی نام ہے ۔ اس لیے مناسب معلوم هوتا ہے

کہ حضرت یحیی کے حالات پر روشنی ڈالی جائے ۔

حضرت یحیی کتب اناجیل کی روشنی میں

یحیی جنہیں فرانسیسی میں (Jean - Baptiste) اور انگریزی میں (John the Baptist) اور عربی میں معمدانی کہا جاتا ہے ، حضرت عیسی کے ظہور سے پہلے بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر تھے ۔ ان کے والد کا نام زکریاہ تھا ۔ ان کی والدہ حضرت ہارون کے خاندان سے تھیں ۔ حضرت یحیی کی پیدائش اور حضرت عیسی کی پیدائش میں صرف چھ ماہ کا فرق ہے ۔ یعنی حضرت یحیی ، حضرت عیسی سے چھ ماہ بڑے تھے ۔ عہد نامہ عتیق میں ان کا نام لیے بغیر ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔،،فریادی فریاد کر رہا ہے کہ بیابان میں خداوند کے لیے راستہ بنا دو ۔ اور صحرا میں شاہراہ خداوند کے لیے سیدھی کر دو ،، (اشعیاء ۴ : ۳) ۔

ایک اور جگہ اسی کتاب میں ہے،،کہ میں تمہارے لیے ایک عظیم اور مہیب دن کے آنے سے پہلے ایلیاہ (Eliyah) پیغمبر بھیجوں گا ،، (باب نہم آیت ۴ ۔ ۵) ۔

اناجیل کی روشنی میں حضرت یحیی کا قصہ اس طرح ہے کہ ہیرودیس کے دور حکومت میں ایک کاھن تھا جس کا نام زکریا تھا ۔ یہ زکریاہ آل بیا کے خاندان سے تھا ۔ ان کی زوجہ ہارون کے خاندان سے تھیں ۔ ان کا کوئی لڑکا نہ تھا ۔ دونوں میاں بیوی ضعف پیری سے کمزور و ناتواں تھے ۔ ایک دن زکریاہ کاھنوں کے لباس میں ملبوس بارگاہ خداوندی میں حاضر ھوا ۔ ناگاہ ایک فرشتہ دیکھا جو خوش خبری دیتے ہوئے کہنے لگا کہ اللہ تمہیں ایک بیٹا دے گا اس کا نام یوحنا ھوگا یہ خدا کا برگزیدہ پیغمبر ہو گا ۔ شراب سے پرھیز

کرنے والا ہو گا ۔ بنی اسرائیل کے بیشتر افراد اپنے پاس اکٹھے کر لے گا ۔ "زکریاہ نے کہا "یہ کیسے ہوگا ۔ میں بوڑھا ۔ میری بیوی بوڑھی" ۔ فرشتے نے کہا ۔ "میں جبرئیل ہوں ، خدا کا مقرب فرشتہ ، مجھے خدا نے بھیجا ہے کہ میں تمہیں یہ خوش خبری سناؤں ۔ جب تک یہ واقعہ ظہور پذیر نہ ہو گا تمہاری زبان گنگ رہے گی"۔ زکریاہ اس حال میں ہیکل سے باہر آئے کہ ان کی زبان گنگ ہو چکی تھی ۔ آخر کار یحیی پیدا ہوئے ۔ پیدائش کے آٹھویں روز رسم ختنہ کے موقع پر زکریاہ نے اشاروں میں پوچھا کہ اس کا نام کیا رکھیں ۔ کہا اس کا نام یوحنا (یحیی) ہو گا ۔ اس کے ساتھ ھی زکریا خدا کی تعریف و توصیف کرنے لگا۔ کہنے لگا وہ خدا قابل ستائش ہے جس نے بنی اسرائیل میں پیغمبر بیھیجا ۔ اے بیٹے ! تو خدا کا برگزیدہ پیغمبر ہو گا ۔ یہ بچہ رحمت خداوندی سے پرورش پانے لگا تاآنکہ اس کی شہرت چہار سو پھیل گئی ۔ اس کا لباس اونٹ کے اون کا بنا ہوا ہوتا تھا ۔ اس کی خوراک شہد اور ٹڈی تھی ۔ اس کے زھد اور تعلیمات کی خوب شہرت ہوئی ۔ لوگ ان کے پاس آتے اور گناھوں سے پاکی کے لیے غسل (بپتسمہ) کرتے تھے ۔ یہ انہیں بپتسمہ دیتے گناھوں سے دور رھنے کی تلقین کرتے تھے ۔ ان کے پاس ہر پیشے کے لوگ آتے ۔ یہ ان سب کو ان کے اخلاق و اعمال کے لحاظ سے نصیحت کرتے تھے ۔

یوحنا نبی لوگوں کو برائی سے روکتے اور ان میں حق کی دعوت و تبلیغ کرتے تھے ۔ ان کی اس تبلیغ سے ہیرودیس ان کا سخت دشمن ہو گیا ۔ لیکن یوحنا کی شہرت و عظمت اتنی زیادہ تھی کہ وہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا ۔ اس کی دشمنی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہیرودیس اپنے بھائی کی بیوی ہیرودیا (زوجہ فلیفوس برادر ہیرودیس) سے شادی کرنا چاھتا تھا ۔ دین یحیی میں بھاوج سے نکاح حرام تھا ۔ یوحنا انہیں اس بات سے منع کرتے تھے ۔ آخر کار تنگ آ کر قید کر دیا ۔ ہیرودیا بھی ان کی سخت جانی

دشمن ہو گئی ۔

ایک دن بادشاہ ہیرودیس کی سالگرہ کے موقع پر ایک عظیم الشان جشن منایا گیا ۔ دربار میں جشن کے موقع پر ہیرودیا کی بیٹی سلومی نے بادشاہ کے سامنے ایک نہایت خوبصورت رقص پیش کیا ۔ بادشاہ اور درباری اس رقص سے بہت محظوظ ہوئے ۔ ہیرودیس نے فرحت و انبساط کی ترنگ میں سلومی سے کہا مانگو کیا مانگتی ہو ۔ سلومی دوڑی ہوئی اپنی ماں کے پاس آئی اور کہا ماں! میں اس وقت بادشاہ سے کیا مانگوں ؟ ماں نے کہا اس وقت موقع ہے ، یوحنا ہمارا دشمن ہے ، تو اس کا سر مانگ لے ۔ سلومی نہایت ھی ناز سے دوبارہ دربار میں آئی اور کہا مجھے یوحنا کا سر ایک طشت میں چاہئے ۔ بادشاہ پہلے تو جھجکا لیکن شرمندگی سے بچنے کے لیے فوراً جلاد کو حکم دیا کہ جاؤ یوحنا کا سر کاٹ لاؤ ۔ جلاد نے قید خانے میں پہنچ کر یوحنا کا سر کاٹ کر ایک طشت میں رکھ کر سلومی دختر فیلیفوس و ہیرودیا کو پیش کر دیا ۔

یوحنا کے شاگرد اور پیروکار آئے اور جسم کو غسل دے کر دفن کر دیا ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے ۔ انجیل متی ۲ : ۱ ۔ ۱۷ ، ۱۴ : ۱ ۔ ۱۲ ، ۱۷ : ۱۲ اور ۱۳ : ۲۱ : ۲۲ ۔

انجیل لوقا ۱ : ۱۱ ۔ ۲۰ ، ۵۷ ۔ ۶۵ ، ۷۔ ۸۰ ، ۳ : ۱ ۔ ۲۲ ، ۵ ۔ ۲۲ ، ۳۳ اور ۱۱ : ۱ ۔

انجیل یوحنا ۱ : ۱۹ ۔ ۲۷ ، ۵ : ۳۲ ۔ ۳۵ اور ۱۰ : ۴۱ ۔

انجیل برناباس جو عیسائیوں کے نزدیک غیر معتبر اور مشکوک ہے اس میں یوحنا کا نام صراحت سے موجود نہیں لیکن ایک سو پینتالیس باب میں ایلیا نبی کا ذکر موجود ہے ۔ اور انجیل لوقا کے قول کے مطابق ایلیا نبی حضرت یحیی

ہی ہیں جن کو یوحنا کہتے ہیں ۔

اسی باب میں حضرت عیسی ایک کتاب یوحنا کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ وہ یہ کتاب یہودیوں کے سامنے تلاوت کیا کرتے تھے ۔ انجیل برناباس کے اس باب میں کتاب کی جن باتوں کا ذکر ہے وہ صاف طور پر زہد و عرفان کی باتیں ہیں اور اس کا تعلق نوستک ازم سے صاف ظاہر ہے۔ فرقہ صابی منداعی کی مقدس کتاب کے ابتدائی الفاظ اس کی تائید میں ہیں ۔

قصۂ یحیی قرآن کی روشنی میں

قرآن میں یحیی نبی کا ذکر تفصیل سے آیا ہے۔ سورہ آل عمران ، سورہ انعام ، سورہ مریم اور سورہ انبیاء میں ان کے حالات پر مختلف انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے ۔ ہم یہاں سورہ مریم سے اقتباس پیش کرتے ہیں جو اناجیل سے کافی حد تک مشابہت رکھتا ہے ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ کھیعص ۔

یہ تذکرہ ہے آپ کے پروردگار کی مہربانی فرمانے کا اپنے بندے زکریا پر جب کہ انہوں نے اپنے پروردگار کو پوشیدہ طور پر پکارا ۔ عرض کیا اے پروردگار میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں اور سر میں بالوں کی سفیدی پھیل گئی ۔ اور آپ سے مانگنے میں اے پروردگار ناکام نہیں رہا ہوں ۔ اور میں اپنے رشتہ داروں سے اندیشہ رکھتا ہوں ۔ اور میری بیوی بانجھ ہے سو آپ مجھکو خاص اپنے پاس سے ایک وارث دیجئے کہ وہ میرا وارث بنے اور یعقوب کے خاندان کا وارث بنے اور اس کو اے میرے رب پسندیدہ بنائیے ۔ اے زکریاہم تم کو ایک فرزند کی خوش خبری دیتے ہیں جس کا نام یحیی ہو گا کہ اس سے قبل ہم نے کسی کو اس کا ہم صفت نہ بنایا ہو گا ۔ زکریا نے عرض کیا اے میرے پروردگار

میرے اولاد کس طور پر ہو گی حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کے انتہائی درجے کو پہنچ چکا ہوں ۔ ارشاد ہوا کہ حالت یوں ہی رہے گی ۔ تمہارے رب کا قول ہے کہ یہ مجھکو آسان ہے ۔ اور میں نے تم کو پیدا کیا حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے ۔ زکریا نے عرض کیا اے میرے رب میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دیجئے ۔ ارشاد ہوا کہ تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم تین رات آدمیوں سے بات نہ کر سکو گے حالانکہ تم تندرست ہو گے ۔ پس حجرے میں سے اپنی قوم کے پاس آئے اورانکو اشارہ فرمایا کہ تم لوگ صبح وشام خدا کی پاکی بیان کرو ۔ اے یحیی کتاب کو مضبوط ہو کر لو ۔ اور ہم نے ان کو لڑکپن ہی میں سمجھ اور خاص اپنے پاس سے رقت قلب اور پاکیزگی عطا فرمائی تھی ۔ اور وہ بڑے پرہیزگار اور اپنے والدین کے بڑے خدمتگار تھے ۔ اور وہ سر کشی کرنے والے نہ تھے ۔ اور ان کو سلام پہنچے جس دن کہ وہ پیدا ہوئے اور جس دن انتقال کریں گے اور جس دن زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے ۔

(سورہ مریم از آیت نمبر ۱ تا آخر رکوع ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ)

قصۂ یحیی کتب صابئین کی روشنی میں

"کتاب گینزا" جو صابئین کی مقدس کتاب ہے اس میں حضرت یحیی کا قصہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ یحیی بن ابو صادا اس حال میں کہ ان کے باپ بوڑھے اور ان کی والدہ صد سالہ ضعیفہ تھیں ، پیدا ہوئے جب یحیی کی عمر تین سال اور ایک ماہ کی ہوئی تو ایک فرشتے (ھبل زیوا) نے ان سے بپتسمہ کے بارے میں گفتگو کی ۔ یحیی نے یروشلم میں پرورش پائی ۔ یارونا (اردن) میں آ کر بیالیس سال لوگوں کی اصلاح کی ۔ عیسی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انکساری سے ان کے دین کو قبول کیا ۔ لیکن عیسی نے دین یحیی کے طریقہ

بپتسمہ کو تبدیل کر دیا ۔

"هبل زیوا" انہیں یا ان کی روح کو عالم بالا میں لے گیا ۔ اور اس کے بعد اردن کے صاف اور پاکیزہ پانی میں غوطہ دیکر غسل کرایا ۔ ان کو لباس عظمت و بزرگی پہنایا ۔ ان کے سر کو ایک نورانی تاج سے زینت بخشی ۔ اور پاک نغمہ ان کے کانوں میں ڈالا ۔ یہ نغمہ ان کے دل تک پہنچ گیا ۔ یہ ایک مقدس نغمہ تھا ۔ اسی مقدس نغمہ کے ذریعے شاهان نور کی تعریف و توصیف ہوتی تھی ۔

وادیء دجلہ و فرات میں صابئین

صابئین یا منداعیان کو عربی میں مغتسلہ کہا جاتا ہے ۔ یہ لوگ حضرت یحیی کے پیروکاروں میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ غالب گمان ہے کہ فلسطین و حران سے ہجرت کے بعد ان میں کا ایک گروہ واسط اور بصرہ کے درمیانی علاقے میں سکونت پذیر ہو گیا ۔ ابن ندیم مغتسلہ کو"صابة البطائح" لکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مغتسلہ غسل آب کے قائل ہیں اور کھانے کی ہر چیز پہلے آب رواں سے دھوتے ہیں ۔ من و عن یہی عقائد صابئین کے ہیں ۔ اور اب بھی یہ لوگ وادی دجلہ اور فرات اور خوزستان میں موجود ہیں ۔ مانی دعوائے پیغمبری سے قبل انہی عقائد کا ماننے والا تھا ۔ بعد میں اس نے ان کے مذہب میں تبدیلی کر کے ایک نئے دین کی بنا ڈالی ۔

صابئین کی ایک مقدس کتاب "گنزاربا" (عظیم خزانہ) میں ہے کہ مانی ایک بہت بڑا شیطان ہے۔

صابئین کی ایران کی طرف ھجرت

صابئین منداعی کی مقدس کتابوں میں ایران کی طرف ھجرت کے بارے میں ایک قصہ درج ہے۔ یحیی نے وفات پانے سے پہلے اپنے بعد تین سو چھیاسٹھ کاھنوں کو اپنا جانشین مقرر کیا اور بیت المقدس میں انہیں جگہ دی ۔ انہوں نے ھیکل کے پاس ھی ایک کنیسہ تعمیر کیا ۔

یروشلم میں ایک یہودی پیشوا کی ایک لڑکی تھی جس کا نام ماریا تھا۔ ماریا بہت پرھیزگار دیندار ، اور نیکو کار تھی ۔ ھر روز ھیکل میں عبادت کے لیے آیا کرتی تھی ۔ ایک دن بھولے سے ھیکل میں جانے کے بجائے کنیسہ میں جا داخل ھوئی ۔ جس وقت وہ اندر آئی صابئین نماز میں مشغول تھے ۔ وہ کھڑی ھو کر ان کی نماز و طریقہ عبادت دیکھنے لگی ماریا کو یہ طریقہ عبادت اس قدر بھایا کہ فوراً ان کے دین میں داخل ھو گئی ۔ جب ماں کو معلوم ھوا تو اس نے باپ کو شکایت کر دی ۔ باپ نے بہت ڈرایا دھمکایا اور دین صابی سے پھیرنے کے لیے پوری کوشش کی مگر وہ دین صابی سے کسی طور نہ پھری ۔ آخر کار اس بات کا غصہ انہوں نے صابیوں سے نکالا ۔ اس غصے میں انہوں نے صابئین کو فلسطین سے نکلنے پر مجبور کیا ۔ ان میں ھزاروں قتل کیے اور ھزاروں کو شدید زخمی کیا ۔ اس وقت آسمان سے ایک فرشتہ باز کی شکل میں ظاھر ھوا ۔ اس نے اپنے پروں سے تمام یہودیوں کو دریا برد کر دیا ۔ ایک پر دریا پر ایسا مارا کہ دریا میں شدید طغیانی آ گئی جس کے نتیجے میں تمام یہودی دریا میں غرق ھو گئے ۔ بیت المقدس کو بالکل ویران کر دیا ۔ تمام صابئین کو جمع کر کے نئی جگہ آباد کر کے واپس آسمان کی طرف اڑ گیا ۔ ان میں سے کچھ تو ایک اور جنگ میں کام آئے اور باقی ماندہ نے ایران کی طرف ھجرت کی اور یہیں آ کر بس گئے ۔

تھیوڈور برقونی کی روایت اس طرح ہے کہ ایک شخص آدو نامی حدود میسان میں تھا جس کا نام دبدا اور ماں کا نام کشطا تھا ۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر گداگری کرتا ہوا ایک مقام پر پہنچا جہاں اس نے ایک محل تعمیر کیا اور اس محل میں وہ سنکھ بجایا کرتا تھا جسکے نتیجے میں ہزاروں کمزور عقیدے کے لوگ اسکے اردگرد جمع ہوگئے۔
ہے ۔ بعض مورخوں نے انہیں دستانیہ بھی کہا ہے ۔

صابئین قرآن کی روشنی میں

قرآن کریم میں صابئین کا ذکر تین بار آیا ہے۔ سورہ بقرہ میں آیت نمبر ٦٢ ، سورہ مائدہ میں آیت نمبر ٦٩ ، اور سورہ حج میں آیت نمبر ١٧ ۔ اور تینوں بار ان کا نام اہل کتاب کے ساتھ لیا گیا ہے۔

ان الذين آمنوا والذين هادوا والنصرى والصابئين من آمن بالله واليوم الآخر و عمل صالحاً فلهم اجرهم عند ربهم ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون

یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان اور یہود اور نصاری اور صابئین جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالی پر اور روز قیامت پر اور اچھے کام کرے ایسوں کے لیے ان کا اجر ہے ان کے پروردگار کے پاس اور کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر اور نہ وہ مغموم ہوں گے ۔ (سورہ بقرہ آیت نمبر ٦٢)

سورہ مائدہ میں یہ ذکر اس طرح ہے۔

ان الذين آمنوا والذين هادوا والصابؤن والنصرى من امن بالله

والیوم الآخر و عمل صالحاً فلا خوف علیهم ولا هم یحزنون

یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان ، یہودی ، نصاری اور صابئین جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ پر اور روز قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے ایسوں پر نہ کسی طرح کا اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے ۔ (سورہ مائدہ آیت نمبر ٦٩)

سورہ حج میں ہے

ان الذین آمنوا والذین ھادوا والصابئین والنصری والمجوس والذین اشرکوا ان اللہ یفصل بینھم یوم القیمۃ ان اللہ علی کل شیء شہید

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مسلمان اور یہود اور صابئین اور نصاری اور مجوسی اور مشرکین اللہ تعالی ان سب کے درمیان قیامت کے روز فیصلہ فرمادیں گے اور بے شک اللہ تعالی ہر چیز پر گواہ ہے ۔

صدر اسلام میں اور اس سے قبل بھی عرب اس دین سے آگاہ تھے ۔ ان کو حنیف یا صابئین کا نام دیتے تھے ۔ بعض مورخین نے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے انہیں مغتسلہ کہا ہے ۔ بعض مورخین نے انہیں صبائی سے مخلوط کیا ہے ۔ مگر حرانیوں کی ستارہ پرستی اور شرک کی بنا پر ان کو صابئین کہنے میں ان کو تردد ہوتا تھا ۔

کلمہ صابئین کے معنی

عربی زبان میں «صبا یصبا» کے معنی ہیں وہ لوگ جو ایک دین سے

دوسرے دین میں چلے جائیں ۔ ”صبا“ کے معنی کوچ کرنے کے بھی ہیں ۔ یہ دونوں معنی اس دین کے پیرو کاروں پر صادق آتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ یہ یہودیت سے دین یحیی معمدانی میں چلے گئے ۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے فلسطین سے کوچ کرکے دوسرے مقامات پر سکونت اختیار کی ۔

اس لفظ کی اصل صورت آرامی زبان میں ”صبع“ ہے کہ اس کا تیسرا حرف ”ع“ زبان صابی میں همزہ سے تبدیل ہو گیا ہے اس طرح یہ لفظ صبع سے صبا بن گیا ۔ اس کی دوسری مثال لفظ ”مندع“ ہے جو صابیوں کے ہاں ”مندہ“ کہلاتا ہے ۔ منداعی سے مندائی ۔ آرامی اور منداعی دونوں زبانوں میں ”صبا“ کے معنی بپتسمہ دینا ہے ۔ بعض نے ”صبا“ کو لفظ ”صب“ سے بغیر همزہ کے مشتق مانا ہے ۔ جس کے معنی ”فرد شدن درآب“ کے ہیں ، جو ظاہر ہے کہ ان کے دین کی ایک خاص رسم اور عقیدہ ہے ۔

قرآن میں جن صابئین کا ذکر آیا ہے وہ یہی منداعی ، مندائی یا صابی ہیں جو آج کل بھی شط العرب اور خوزستان کے اطراف و اکناف میں زندگی بسر کر رہے ہیں ۔

اگرچہ صابئین کی بعض مذہبی کتب ظہور اسلام کے بعد ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں لیکن ان کے مذہب کا وجود صدیوں پہلے سے تھا ۔

خوزستان میں صابئین کی جو مقدس کتابیں ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ صابی زبان دوسری صدی عیسوی میں ایک زندہ زبان کی حیثیت سے بولی اور سمجھی جاتی تھی ۔ اس زبان میں ان کی دینی مذہبی تعلیمات ، مناجات اور دعائیں لکھی جاتی رہی ہیں ۔ اور ان کے مذہبی اساسی عقائد بھی اس زبان میں موجود ہیں۔آجکل کے صابئین موحد اور اہل کتاب ہیں ۔ لہذا یہ کہا جا

سکتا ہے کہ قرآن نے جن صابئین کا ذکر کیا ہے وہ یہی لوگ ہیں ۔ کیونکہ قرآن نے ان کا ذکر گروہ اہل کتاب میں کیا ہے۔

اس بحث میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آیا حران کے صابئین اور فلسطین سے ہجرت کرنے والے صابئین ایک ہی ہیں یا الگ الگ ۔ قدیم تاریخی حقائق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حران کے باشندے مشرک اور ستارہ پرست تھے ۔ حالانکہ صابئین منداعی ستاروں کو عالم ظلمت کا حصہ بتلاتے ہیں۔ صابئین منداعی کے ہاں فرشتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں اتنا مبالغہ اور غلو کیا ہے کہ فرشتوں کو خدا کی صفات سے متصف کر دیا ۔ لیکن پھر بھی حیات یا ہستی صرف خدائے واحد ہی کا نام ہے۔

اسی لیے بعض علما نے صابئین منداعی اور صابئین حران میں فرق کیا ہے ، کہ صابئین منداعی موحد اور اہل کتاب ہیں اور صابئین حران مشرک اور بت پرست ۔

ابن القفطی متوفی ٦۴٦ھ تاریخ الحکما میں ایک روایت امام ابو حنیفہ اور ان کے دو ہم عصر فقہا سے نقل کرتے ہیں جو صابئین منداعی اور صابئین حران کے درمیان فرق کو واضح کرتی ہے۔ امام ابو حنیفہ مسلمانوں کے لیے صابئین منداعی کے ہاں نکاح کو ناجائز اور ان کے ہاتھ کا ذبیحہ حرام قرار دیتے ہیں اور صاحبین (امام ابو یوسف و امام محمد) ان دونوں باتوں کو جائز قرار دیتے ہیں ۔ صاحب تفسیر "مواہب الرحمن" نے اس کے برعکس لکھا ہے۔

صاحبین کا کہنا ہے کہ اختلاف ہم میں نہیں بلکہ اختلاف فتوی کی نوعیت میں ہے۔کیونکہ جب صابئین حران کے بارے میں فتوی مانگا گیا تو وہی فتوی دیا گیا جو مشرکوں کے ساتھ معاملات کے بارے میں شریعت کا حکم ہے۔ اور جب فتوی صابئین منداعی کے بارے میں مانگا گیا تو وہی جواب دیا گیا جو

اہل کتاب کے ساتھ معاملات کا حکم ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ فقہائے سلف ان دونوں میں فرق کو سمجھتے تھے اور ان کے دین کے فرق کو جانتے تھے ۔

صابئین حران

یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ حران موصل و شام کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے ۔ یونانی اس قصبہ یا جگہ کو (Kharran) رومی (Carrhan) اور عرب حران کہتے ہیں ۔ اس جگہ کے باشندے بت پرست تھے ۔

رومی دور سلطنت میں یہاں عیسائیت کا خوب چرچا رہا لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اپنے مذہب پر قائم رہے ۔ یہاں تک کہ جب یہ علاقہ اسلامی سلطنت میں شامل ہوا تب بھی یہ لوگ اپنے مذہب سے چمٹے ہوئے تھے ۔ شہرستانی کی کتاب "الملل و النحل" میں ہے کہ حرانی لوگ بابلی تہذیب سے متاثر اور ستارہ پرست تھے ۔ ستاروں کو آسمانی ہیاکل کہتے تھے ۔ ان کی ہر مذہبی رسم میں ستارہ پرستی نمایاں ہوتی تھی ۔

ابن ندیم کہتا ہے کہ حران کے صابئین نے ہفتہ کے تمام دن ستاروں کے نام سے موسوم کیے ہیں اور ہر ماہ ایک خاص طرح کی قربانی کرتے ہیں ۔ ابن ندیم نے حرانیوں کے آداب و رسوم کا ذکر قدرے تفصیل سے اپنی کتاب الفہرست میں کیا ہے لیکن اس میں ایک قباحت ہے کہ اس سے صابئین کی صحیح تاریخ متعین نہیں ہوتی ۔

حران کے ستارہ پرستوں کو صابئین کہنے کی وجہ کے بارے میں ابن ندیم نے الفہرست میں ایک حکایت ابو یشع قطیعی نصرانی کی کتاب "کشف عن مذاہب الحرنانیہ" میں سے نقل کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ ۔ مامون اپنے آخری ایام حکومت میں اہل روم سے جنگ کے ارادہ سے دیار مضر سے آگے بڑھا تو لوگ

استقبال و عزت افزائی کی غرض سے اس سے ملے ۔ جن میں حرنانیوں کا ایک گروہ بھی شامل تھا ۔ ان کا لباس اس طرز کا تھا اور ہیئت کذائی اس قسم کی تھی کہ انہوں نے قبائیں پہن رکھی تھی اور سنان بن ثابت کے دادا قرہ کی زلفوں کی طرح ان کے لمبے لمبے بال تھے ۔ مامون نے ان کے اس طرز کے لباس اور ہیئت کذائی کو کراہت کی نظر سے دیکھا اور پوچھا ۔

"تم کون ہو ؟ ذمی ہو ؟ "

"انہوں نے جواب دیا ہم حرنانی ہیں"

"اس نے سوال کیا تم نصاری ہو ؟ "

"انہوں نے کہا نہیں"

"اس نے پھر سوال کیا تو کیا تم یہودی ہو ؟ "

"انہوں نے جواب دیا نہیں"

"اس نے پھر کہا کیا مجوس ہو ؟ "

"انہوں نے کہا نہیں"

"اس نے دریافت کیا تمہارا کوئی نبی یا کوئی کتاب ہے ؟ "

اس سوال پر انہوں نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا ، جسے سمجھا نہ جا سکا ۔ اس پر مامون نے کہا اچھا تم وہ بت پرست زنادقہ ہو ، جنہیں میرے والد رشید کے عہد میں اصحاب الرأس کہا جاتا تھا اور تمہارا خون حلال ہے اور تمہاری حفاظت کی کوئی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی"

انہوں نے کہا "ہم جزیہ ادا کرتے ہیں"

مامون نے جواب دیا "جزیہ ایسے لوگوں سے لیا جاتا ہے جو ان ادیان و مذاہب سے تعلق رکھتے ہوں جو اسلام کے مخالف ہوں اور جن کا اللہ عز و جل نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے اور وہ جو حامل کتاب ہیں اور مسلمانوں سے انہوں نے

جزیہ دینے کی شرط پر صلح کی ہو ۔ تمہارا شمار نہ تو ان لوگوں میں ہوتا ہے اور نہ ان لوگوں میں ، اب دو چیزوں میں سے ایک کو اختیار کر لو یا تو خود کو اسلام کی طرف منسوب کرو یا ان ادیان میں سے کسی ایک دین کو قبول کر لو جن کا اللہ نے قرآن میں ذکر کیا ہے ، ورنہ میں تمہارے آخری فرد تک کو قتل کر دوں گا ۔ میں اپنے اس سفر سے واپسی تک تمہیں مہلت دیتا ہوں ۔ اگر تم حلقہ بگوش اسلام ہو گئے یا ان مذاهب میں سے کسی مذهب سے وابستہ ہو گئے جو اللہ کی کتاب میں مذکور هیں فبها ورنہ میں تمہارے قتل و استیصال کا حکم صادر کر دوں گا ۔ یہ کہکر مامون روم کو روانہ ہو گیا اور انہوں نے اپنی هیئت بدل لی ، بال منڈوا دئیے ، قبائیں زیب تن کرنا ترک کر دیں ، اور اکثر نے عیسائیت قبول کر لی اور زنانیر لٹکا لیں ۔ ایک گروہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا ۔ اور بہت کم لوگ اپنی اس بہلی حالت پر قائم رہے ۔ ایسے لوگ پریشانی اور اضطراب میں مبتلا ہو گئے تاآنکہ حران کا ایک دانا شخص ان کے پاس آیا ۔ اس نے کہا میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جس پر عمل کر کے تم محفوظ رہ سکتے ہو اور قتل سے بچ سکتے ہو ۔ چنانچہ زمانہ رشید سے اب تک جو مال کسی آڑے وقت کے لیے وہ بیت المال میں جمع کرتے رہے تھے اس کا ایک عظیم حصہ لیکر اس کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ شیخ نے کہا جب مامون اپنے سفر سے واپس آئے تو تم اس سے یہ کہو کہ "ہم صابئی هیں ۔ یہ ایک مذهب کا نام ہے جس کا اللہ جل اسمہ نے قرآن میں ذکر کیا ہے ، تم خود کو اس مذهب کی طرف منسوب کر لو مامون سے خلاصی حاصل کر لو گے" ۔ اس دن سے حرانی صابئین کہلانے لگے ۔ اس واقعے کی درستگی میں شبہہ کیا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ اس سے قبل بھی آخر یہاں اسلامی حکومت تھی تو انہوں نے ان سے کیوں جزیہ لیا ۔ یا شاید اس واقعے کے گھڑنے کی وجہ صرف یہ ہو کہ حران کے باشندوں کو صابئین کہنے کی توجیہ کی جائے ، حال یہ ہے کہ حرانیوں کا

صابئین کے ساتھ ان کے یہاں ھجرت کرنے سے پہلے کوئی تعلق نہیں ۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ صابئین نے جب فلسطین سے ھجرت کی تو اسی جگہ آ کر بس گئے کیونکہ یہ جگہ فلسطین کی راہ ھی میں ہے ۔

حران کے قدیم باشندوں کے مذھب کے بارے میں تفصیلی حالات شمس الدین ابو عبداللہ الصوفی الدمشقی متوفی ۷۲۷ھ کی کتاب "نخبة الدھر فی عجائب البر و البحر" میں موجود ھیں ۔ اس کتاب کے بیان سے حرانیوں کے مذھب پر قدرے روشنی پڑتی ہے ۔ ابو عبداللہ کا بیان ہے کہ حرانیوں کے پانچ بڑے معبد تھے اور ان کی ترتیب یہ تھی ۔ علت اول ، عقل اول ، فرماں روائے جہاں ، صورت اور روح ۔ سات دوسرے معابد سات ستاروں کے ساتھ خصوصیت رکھتے تھے ۔

ایپفانسیوس کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مذھب کے مؤسس یا بانی "الخسائی" یا "الکسائی" اور اس مذھب کے پیروکار سوبیائی (Sobiai) تھے۔ الکسائی کے معنی ھیں خدائے پنہاں ۔

البتہ لیڈی ڈراورر کی تحقیق کے مطابق یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فلسطین سے ھجرت کے بعد صابئین نے جب حران میں سکونت اختیار کی تو ان کے آپس میں میل جول سے ان کے مذھب گڈ مڈ ھو گئے ، اس کے بعد یہ لوگ صابئین ، ناصوری یا منداعین مشہور ھو گئے ۔ قرآن نے جب تمام مذاھب قدیم کو اسلام کی طرف آنے کی دعوت دی تو اس مذھب کے ماننے والوں کو بھی دعوت اسلام پیش کی ۔ آج کل منداعیوں کی تعداد آٹھ ھزار سے زیادہ نہیں ۔ یہ زیادہ تر عراق ، کویت ، سوق الشیخ اور بصرہ میں سکونت پذیر ھیں ۔ ان کا پیشہ صناعی اور زرگری ہے ۔

منداعی زبان

منداعی زبان مشرقی آرامی زبان سے نکلی ہے۔ یہ زبان جنوبی عراق میں مستعمل تھی ۔ احتمال ہے کہ حضرت عیسی کے ظہور کے وقت یہ زبان بولی جاتی ہو گی ۔ منداعی زبان سامی زبانوں میں سے ہے۔ صرف و نحو اور لہجہ کے اعتبار سے آرامی سے قریب تر ہے۔

منداعی حروف تہجی ۲۳ ہیں اور اکثر سامی خطوط کی طرح دائیں سے بائیں طرف لکھی جاتی ہے۔ یہ خط نبطی اور فینقی سے ملتا جلتا ہے۔

آج کل کے منداعیوں کے عقائد

خدا کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ خدا واحد ، ازلی ، ابدی ، لا محدود اور مادہ سے منزہ ہے۔ اس کے وجود کا ثبوت مادہ کا وجود ہے۔ خدا کے تین سو ساٹھ معاون ہیں جو عالم مادہ میں تمام کام سر انجام دیتے ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک جدا گانہ عالم نور کا مالک اور بادشاہ ہے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں

ماری آدر بوتا ، ہیبل زیوا ، شیشلام ربا ، مندا ہیبا ، سام زیوا ، سیمات ہیبا ، ماھزیل مالا لا ، اوثار راما ، ابتاھیل ، زھریل ، یہی یوھنا (یحیی یوحنا) اور بہرام ربا ۔ پروردگار بزرگ کو "ملکا نہورا ربا" کے نام سے پکارتے ہیں جو پیغامبر حیات ہے۔

تخلیق دنیا

خدائے یکتا نے سب سے پہلے ایک مخلوق پیدا کی جس کو "ہیی قدما" (ہیی قدیم) کہتے ہیں اور اس کو میثھیا سے تعبیر کرتے ہیں ۔ آفریدہ دوم کو ہیی

ثنیای (هیی الثانی) کا نام دیتے هیں ۔ اور اس سے مراد حضرت یحیی معمدانی ہے۔

آفریدہ سوم کو هیی اثلیثائی کا نام دیا ہے جس سے مراد حضرت عیسی هیں ۔ اس کے بعد خدا نے سات عالم کہ "آلمی دهشوخا" یعنی عوالم ظلمت هیں پیدا کیا اور اس عالم کو سورج سے روشنی بخشی ۔ آسمان سات طبقوں سے بنا ہے ۔ سورج طبقہ چہارم میں ہے ۔ اور چاند طبقہ هفتم میں ۔ زمین و آسمان دو مادوں آب و آتش سے مرکب هیں اور تمام مخلوقات عالم بھی انهی دو مادوں سے عالم وجود میں آئی هیں ۔ حضرت آدم کو "گبرا قدمیا" (Gabra Qadmia) کہتے هیں ۔ اس کے معنی مرد اول کے هیں اس کا لقب "آدم مادی بھی ہے" ۔

خدا نے چاها کہ آدم کو پیدا کرے تو اس نے هیبل زیوا کو زمین پر بھیجا۔ اس نسے پہلے آدم کو پھر اس کی بائیں پسلی سے حوا کو پیدا کیا ۔ اس کے بعد ان میں بادشاہ نور کے حکم سے روح پھونک دی اور بپتسمہ کا طریقہ سکھایا ۔ اس کے بعد خدا نے اور فرشتوں کو بھیجا کہ آدم کو سجدہ کریں ۔ سب نے سجدہ کیا لیکن "هاد بیشا" (Had Bisha) نے انکار کیا ۔ اس نے خدا سے کہا کہ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے خاک سے تو میں اسے سجدہ کیوں کر کروں ۔ خدا نے اسے لعنت کی اور عالم نور سے بھگا دیا ۔

فلسفہ وجود

صابئین منداعی کے نزدیک هر چیز کے دو وجود هیں ایک وجود پنہاں دوسرا وجود ظاهری ۔ وجود پنہاں کو مشونی کوشطا" اور وجود ظاهری کو "دارہ تیبل" کے نام سے پکارتے هیں ۔ ابن ندیم نے الفهرست میں پیروان کوشطا کو کشطئین کے نام سے یاد کیا ہے ۔ روح مرنے کے بعد اگر نیک هو تو عالم انوار یا بہشت میں جاتی ہے ، اگر بری هو تو عالم مادی و فانی اور دوزخ میں جاتی ہے ۔

اگر کسی روح کی نیکی اور بدی برابر ہو تو اسے اس وقت تک عالمِ مطراتی (برزخ) میں رکھتے ہیں جب تک اس کی تطہیر نہ ہو جائے ۔

صابئین مداعی کی مقدس کتابیں

دین صابی کی بہت سی مقدس کتابیں ہیں ۔ ان کا مذہبی لٹریچر بہت وسیع ہے ۔ ان کا دینی لٹریچر ادیان نوس میں شمار کیا جاتا ہے ۔ ان کی چند مذہبی کتابیں درج ذیل ہیں :

۱ ۔ **کتاب گینزا** (Ganza) ۔ یہ ان کی قدیم اور مفصل ترین کتاب ہے ۔ ان کا اعتقاد ہے کہ یہ کتاب حضرت آدم پر الہام کی گئی تھی ۔ اس کتاب کے مباحث تخلیق عالم ، صفات پروردگار ، وعظ و ارشاد اور تعلیمات یحیی ہیں ۔ یہ کتاب نثر اور نظم دونوں اصناف سخن میں ہے ۔ یہ کتاب کئی دفعہ چھپ چکی ہے ۔ اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے ۔

ایم نوربرگ (M. Norbarg) نے لاطینی زبان میں مع متن کے ۱۸۱۰ء میں پہلی دفعہ شائع کی ۔ دوسری دفعہ ایچ پیٹرمن (H. Petermann) نے ۱۸٦۷ء میں شائع کی ۔ تیسری دفعہ جرمن ترجمے کے ساتھ ایم ۔ لیڈز بارسکی (M. Lidzbarski) نے ۱۹۲۵ء میں شائع کی ۔

۲ ۔ **کتاب سید راد ہییا**(Sidra - d - Yahya) (کتاب یحیی) یاد راشہ دملکہ نام کی ہے ۔ اس کتاب میں بادشاہوں کے قصے ، حضرت یحیی کی تعلیمات اور ان کی زندگی کے حالات ہیں ۔ اس کتاب میں ہے کہ حضرت جبریل نازل ہوئے اور یہ کتاب یحیی پر الہام کی ۔ یہ کتاب لیڈز بارسکی نے دو جلدوں میں جرمن ترجمے کے ساتھ ، جلد اول ۱۹۰۵ء ، اور جلد دوم ۱۹۱۵ء میں شائع کی ہے ۔

۳ ـ قولستا(Qulasta) (یعنی مجموعہ جنگ اور متفرق رسوم) ـ اس کتاب میں زنا شوئی ، رسم بپتسمہ اور جشن عروسی کے قوانین درج ھیں ـ اس کتاب کا ایک نسخہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں موجود ہے ـ

۴ ـ کتاب ڈائیونا (Diuna) یہ نیک لوگوں کے تذکرے ھیں ـ اس کتاب کے نسخے کمیاب ھیں ـ

۵ ـ اسپر ملواشیا (Aspar Malusshia) ـ ستارہ شناسی ، دنوں کے نحس و سعد اور زائچہ کے معلوم کرنے کے بارے میں ہے ـ یہ کتاب لیڈی ڈراؤرر نے انگریزی ترجمے کے ساتھ ۱۹۲۹ء میں شائع کی ہے ـ

٦ ـ کتاب سید راد نیشماتا(Sidra - d - nishmata) ـ یہ مذھبی نغمے ھیں جن میں مردہ کی تجہیز و تکفین اور کیفیت انتقال روح کا بیان ہے ـ

۷ ـ کتاب انیانی (Aniani) ـ اس میں وہ دعائیں ھیں جنھیں یہ لوگ نماز میں پڑھتے ھیں ـ

۸ ـ قماھا دھیبل زیوا (Qamaha - d - Hibil Ziva) ـ اس میں ایک ھزار اور دو اشعار ھیں جو طلسم و جادو اور ٹونے ٹوٹکے سے متعلق ھیں ـ اس سے جادو اور طلسم سیکھا جاتا ہے ـ

۹ ـ کتاب پگرا (Pagra) ـ علم الابدان پر محتوی ہے ـ اس کے علاوہ اس میں ان غذاؤں اور دواؤں کا ذکر ہے جس سے انسانی بدن کو فائدہ پہنچتا ہے ـ

۱۰ ـ کتاب تریسا الپی شیالا (Trisa Alpi Shiala) ـ اس میں مسائل کا جواب ہے ـ

روزہ

یہ مسلمانوں کی طرح روزہ نہیں رکھتے بلکہ نفس کو ممنوعات سے روکتے ہیں اور اسی کو روزہ کہتے ہیں ۔

نماز

روزمرہ کی عبادات میں سے ایک عبادت نماز ہے۔ یہ دن بھر میں تین مرتبہ نماز پڑھتے ہیں۔اوقات نماز میں سے ایک طلوع آفتاب سے پہلے دوسرا زوال آفتاب کے بعد تیسرا غروب آفتاب کے بعد ہے۔ نماز سے پہلے وضو کرتے ہیں ۔ ان کا قبلہ برج جدی ہے۔ ان کی نماز میں سجدہ نہیں بلکہ صرف رکوع اور قیام ہوتا ہے۔

بپتسمہ کی اقسام

صابئین منداعی کی بنیادی دینی رسم بپتسمہ ہے۔ اس کی چند قسمیں درج ذیل ہیں : ۔

۱ ۔ بپتسمہ ولادت ۔ یہ بچہ کو پیدائش کے بعد دیتے ہیں ۔
۲ ۔ شادی کے موقع پر ۔
۳ ۔ عید پنچا ۔ ان کے عید کے پانچ دن ہیں جو یہ لوگ ہر سال مناتے ہیں ۔ ان کو عربی میں خمسہ مسترقہ کہتے ہیں ۔ یہ دن وہ سال میں شمار نہیں کرتے ۔ عید کے ان پانچ دنوں میں ہر منداعی پر لازم ہے کہ دن میں تین بار آب رواں سے غسل کرے ۔

صابئین منداعی کے نزدیک مندرجہ ذیل باتیں حرام ہیں :

۱ ـ کسی کو قتل کرنا ـ مگر دفاع میں جائز ہے ـ

۲ ـ شراب نوشی ـ

۳ ـ جھوٹی قسمیں کھانا ـ

۴ ـ غسل جنابت سے قبل کھانا اور پینا ـ

۵ ـ راھزنی اور چوری ـ

٦ ـ ایام عید میں اور یکشنبہ (اتوار) کو کام کرنا ـ

۷ ـ دوسروں کی بدگوئی اور غیبت ـ

۸ ـ زنا کرنا ـ

۹ ـ ختنہ کرنا ـ

۱۰ ـ وقت مقررہ پر قرض ادا نہ کرنا ـ

۱۱ ـ ہر اس جانور کا گوشت کھانا جس کی دُم ہو ـ

۱۲ ـ اپنے دینی بھائی کے علاوہ کسی پر اعتماد کرنا اور اس کے ساتھ میل جول رکھنا ـ

۱۳ ـ جھوٹی گواھی دینا ـ

۱۴ ـ زنِ شوھر دار پر نظرِ بد ڈالنا ـ

۱۵ ـ امانت میں خیانت کرنا ـ

۱٦ ـ جوا کھیلنا ـ

۱۷ ـ ہم جنسیت ـ

۱۸ ـ صابی کے علاوہ اور کسی دین کے حامی کے ساتھ کھانا پینا ـ

حران کے صابیوں میں بڑے مقتدر علماء گزرے ھیں جن میں سے چند کے نام یہ ھیں ـ اصطفن الحرانی ، طبیب ـ ھارون بن صاعد بن ھارون الصابی ، طبیب ـ ابراھیم بن زھرون الحرانی ، طبیب و منطقی ـ ابو الحسن ثابت ابراھیم بن زھرون الحرانی الصابی ـ ھلال بن ابراھیم ـ ثابت بن قرة ـ ابراھیم بن ثابت بن

قرہ ـ ابو سعید سنان بن ثابت ، مشہور ہیئت دان و فلسفی اور ریاضی دان ـ ابو اسحاق ابراهیم بن سنان ، حساب دان مہندس اور طبیب ـ ابوالحسن بن سنان الصابی ـ ابوالفرج بن ابی الحسن بن سنان ـ جابر بن حیان مشہور کیمیا داں ـ قرۃ بن قمیطا الحرانی ، اصطرلابی و تاریخ داں ـ ثابت بن سنان بن ثابت ، مورخ ـ هـلال بن المحسن بن ابراهیم الصابی ـ ابوطیب عبدالرحیم بن احمد الحرانی ، شاعر و ادیب ـ ابواسحاق الصابی کتاب التاجی کا مصنف ، شاعر و ادیب ـ

اس مضمون میں درج ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے : ـ

قرآن کریم ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانویؒ ـ

تاریخ الحکما ـ علامہ جمال الدین قفطی متوفی ٦٣٦ھ

الفہرست ـ ابن ندیم ـ

لسان العرب ـ ابن منظور ـ

الصابئون فی حاضرهم و ماضیهم ـ عبدالرزاق الحسنی ـ

کتاب مقدس ـ مقالہ سید تقی حسین ـ

مقالہ ڈاکٹر محمد جواد مشکور ـ

J. Hastings. Encyclopedia of Religion and ethics Vol III

R. Wilson. The Gnostic problem

E. S. Drawer. The mandaeans of Iraq and Iram

****

دیار ہند کا ایک علمی سفر

شرف الدین اصلاحی

سال گزشتہ فروری اور مارچ میں میں نے اپنے مخصوص ریسرچ پروجیکٹ "مولانا حمید الدین فراہی" کے سلسلے میں ہندوستان کا دوسرا مطالعاتی دورہ کیا۔ اس سفر میں دہلی، علی گڑھ، الہ آباد، لکھنو، اور اعظم گڑھ شہر اور مختلف قصبات اور دیہات میں پھرا۔ کتب خانے کھنگالے۔ افراد اور اشخاص سے ملاقاتیں کیں۔ اس دوران روزنامچے کی صورت میں صبح سے شام تک کی موٹی موٹی باتیں قلمبند کرتا گیا۔ واپس آنے کے بعد یہاں کی ذمہ داریوں نے خصوصاً فکر و نظر کی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیات نے اتنی مہلت نہ دی کہ کسی اور طرف نظر اٹھا کر دیکھتا۔ اسی میں یہ روداد سفر بھی بقول غالب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئی۔ ان اشارات اور یادداشتوں کو دوبارہ تفصیل سے لکھنے یا مرتب کرنے کا موقع نہ ملا۔ فرصت یا فراغت نہ وہاں تھی نہ یہاں ہے۔

سبحۂ سوی نہ سیارہ نہ گنجد رہبار
مگذارید کہ این سبحہ صحرا ماند

جو کچھ جیسے تھا نذر قارئین ہے۔ سردست قیام علی گڑھ کی سرگزشت پیش خدمت ہے۔

۱۷ فروری ۱۹۸۰ع کو لاہور سے بذریعہ کار واہگہ کے لئے روانہ ہوئے۔

پاکستان ہندوستان دونوں طرف کسٹم اور چیک پوسٹ میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ لکھت پڑھت کا کام کرنے والوں سے لیکر مزدور قلی تک سبھی

مسافروں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں ۔ کاغذات سفر میں سرکاری ملازم اور تعلیم یافتہ ہونے کے ذکر کا یہ فائدہ ہوا کہ دونوں طرف میرے ساتھ اچھا برتاؤ کیا گیا بلکہ خصوصی سلوک سے نوازا گیا ۔ عملہ کے لوگ اچھی طرح پیش آتے اور چائے پانی کے لئے پوچھتے ۔ قلیوں کو بھی جرأت نہیں ہوئی کہ تنگ کرتے ۔

دونوں طرف قلیوں کے ریٹ مقرر ہیں اور رسید دیکر پیسے لیتے ہیں ۔ پاکستان سائڈ پر ۵ روپے اور ہندوستان سائڈ پر ۸ روپے ریٹ مقرر ہے ۔ اس فرق کی وجہ غالباً فاصلے کی کمی بیشی ہو ۔ اس مقررہ رقم کے علاوہ قلی اور اہلکار مختلف بہانوں سے لوگوں کی جیبیں خالی کرتے ہیں ۔اکثر لوگ لٹنے پٹنے کے بعد امرتسر پہنچے تو شاکی تھے کہ کنگال کر دیا ۔ اٹاری سے امرتسر تک ٹیکسی کا کرایہ ۵۰ . ۱۲ فی کس ادا کیا گیا ۔ امرتسر ریلوے اسٹیشن پر قلیوں نے دو آدمیوں کے سامان کے ۱۴ روپے لیئے ۔ دو قلیوں نے ٹیکسی سے سامان اتارا ، انتظارگاہ میں لے جا کر بٹھایا پھر وهاں سے اٹھا کر گاڑی میں سوار کرایا ۔ اس اعتبار سے اجرت زیادہ نہیں لی ۔ ٹاٹا میں جگہ نہیں ملی اس لئے جنتا سے دلی کے لئے روانہ ہوئے ۔ ٹکٹ کی قیمت امرتسر سے دلی تک ۵۰ . ۲۰ روپیے بسرتھ ریزرویشن کے ۲۵ . ۵ الگ سے دینے پڑے ۔ پانچ بجے جنتا روانہ ہوئی ۔ ہمارے ڈبے میں جو تھری (۳) ٹائر تھا زیادہ تر پاکستانی تھے ۔ سفر اچھا رہا ۔ بوگی صاف ستھری تھی ۔ تھرڈ کلاس میں بھی جو پاکستان کی طرح سیکنڈ کلاس کہلاتا ہے گدے لگے ہوئے تھے ۔ ٦ بجے صبح ٹرین دھلی پہنچی ۔ دُھند اور کہر چھائی ہوئی تھی ۔ قلیوں نے ۲ آدمیوں کے سامان کے ، دو قلی تھے ، ۸ روپے لئے ۔ اسٹیشن سے چتلی قبر جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر پہنچے ۔ میرے ہمسفر کو یہیں ٹھہرنا تھا ، میں بھی ساتھ بندھا گیا ۔ مرکز کے لوگوں سے ملاقات ہوئی ۔ یوسف صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے ۔ قیم جماعت افضل حسین صاحب اور دیگر اہلکاروں سے ملاقات ہوئی ۔ ناشتے میں سادگی

دیکھ کر مدرسے کی زندگی یاد آئی ۔ چنا اور چائے یہ ناشتہ تھا ۔ غالباً رس بھی تھے ۔ ناشتہ کرکے وحید الدین خان مدیر "الرسالہ" سے ملنے ان کے دفتر گئے ملاقات ہوئی ۔ الجمعیت کی بلڈنگ میں ان کا دفتر ہے ۔ چوڑی والان ، بلی ماران ، گلی قاسم جان سے پا پیادہ گذر ہوا ۔ یہ قدیم شہر کا قدیم حصہ ہے ، پرانی عمارتیں اور حویلیاں دیکھ کر ذہن ماضی کی طرف بار بار منتقل ہوتا رہا ۔ دلی سے متعلق برسوں پہلے کے پڑھے ہوئے اشعار یاد آئے اور گنگناتا رہا ۔ ہائے دلّی کی گلیاں ، دلّی کے کوچے !

دل ولی کا لے لیا دلّی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں
(ولی)

دلّی کے نہ کوچے تھے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
(میر)

کیا بود و باس پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا

ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

(میر)

گرچہ پورب میں بہت ہے ان دنوں قدر سخن

کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

(ذوق)

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ

نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

(حالی)

سنا تھا دلی کے ٹھگ مشہور رہیں۔ مگر ایسی کوئی بات نظر سے نہیں گزری ۔ "دلّی کی دال والی منھ چکنا پیٹ خالی" ، اس کا بھی کبھی تجربہ نہیں ہوا ۔ یہ باتیں اگلے وقتوں میں کبھی رہی ہوں گی ۔ یا اب پھیل کر اتنی عام ہو چکی ہیں کہ دلّی کے ساتھ اس کی خصوصیت باقی نہیں رہی ۔

محلہ بلی ماران کی گلی قاسم جان میں مرزا غالب کی حویلی ہے ۔ اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں۔ اسی گھر میں غالب کا انتقال ہوا۔ خاص وضع کا پھاٹک اسی حال میں ہے ۔ باقی ادھر اُدھر دکانیں نئے طرز کی بن گئی ہیں ۔ اندر کے حصے میں دوکاندار کا زنانخانہ ہے پھاٹک میں لکڑی کی ٹال اور کوئلے کی دوکان ہے جس کے مالک ایک بڑے میاں ابراھیم نامی ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھے لکڑی اور کوئلے کے لین دین میں مصروف اپنا ھاتھ

منہ کالا کر رہے تھے۔ غالب سے متعلق میرے بعض سوالات پر بولے "ارے بھائی شعر شاعری والے تو ان کو بڑا آدمی سمجھتے ہیں مگر عالم لوگ بے دین شرابی کبابی کہتے ہیں"۔ پھاٹک کے دائیں طرف بھڑ بوجے اور بائیں طرف ریگزین کی دوکان ہے۔ غالب کی قبر نظام الدین اولیاءمیں ہے۔ وہیں ایک غالب اکیڈمی بھی ہے جس میں کتابوں کے علاوہ غالب کے باقیات کو ماڈلوں کی صورت میں رکھا گیا ہے۔ یہ اکیڈمی میں سال گذشتہ دیکھ چکا تھا اس لئے دوبارہ جانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

ادارۂ تحقیقات اسلامی ، اسلام آباد کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر عبد الواحد ھالے پوتا صاحب نے چلتے وقت فرمائش کی تھی کہ اگر دلی جانا ہو تو وہاں کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا پتا کرنا اور اگر انسٹی ٹیوٹ سے متعلق کوئی بروشیر وغیرہ ہو تو حاصل کرکے فوراً بذریعہ ڈاک بھیج دینا۔ میں نے دھلی پہنچتے ہی اس کے متعلق لوگوں سے دریافت کرنا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ ادارہ دلی شہر سے ۱۸ کیلومیٹر دور تغلق آباد میں ہے۔ ٹیکسی سے آنے جانے میں اچھا خاصا کرایے کا خرچ تھا۔ بس سے جانے کا وقت نہ تھا۔ وحید الدین خان کے ذریعے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کا اتا پتا ملا۔ مرکز جماعت آکر میں نے ٹیلیفون پر بات کی۔ وہ اس وقت نئی دھلی میں واقع پرانے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹیلیفون ہی پر انہوں نے رہنمائی کی اور ہم تقریباً ۱۲ بجے ان کے پاس پہنچے۔ آٹو رکشے سے ۸۵ . ۲ میٹر میں کرایہ بنا۔ میں نے رکشہ ڈرائیور کو پانچ روپے کا نوٹ دیا۔ اس نے انتہائی شرافت سے ۱۵ . ۲ روپے واپس کر دیئے۔ فاصلہ اچھا خاصا تھا۔ رکشے میں پندرہ منٹ لگے۔ اندازہ ہوا کہ یہاں کے رکشے والے میٹر درست رکھتے ہیں ، حریص اور لالچی بھی نہیں۔ پاکستان میں ٹوٹے پیسے واپس کرنے کا دستور نہیں۔ عادتیں بگڑی ہوئی ہیں۔ میٹر بھی شاذو نادر ہی درست ہوتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر سید اوصاف علی سے تفصیلی

ملاقات ھوئی ۔ انھوں نے علاوہ زبانی گفتگو کے اپنے ادارے سے متعلق بروشیر اور لٹریچر بھی عنایت کیا ۔ چائے اور بسکٹ سے تواضع الگ کی ۔ تقریباً ۲ بجے واپسی ھوئی ۔ واپسی میں ایک سردار جی کے آٹو رکشے میں بیٹھے ۔ کرایہ ۲۔۵۲ روپے بنا ۔ آنے جانے کے کرایوں میں یہ فرق اس لئے ھوا کہ واپسی میں اتفاقاً راستہ صاف ملا ، سگنل پر رکنا کم پڑا ، اور وقت بھی ۱۵ منٹ کی بجائے ۱۰ منٹ صرف ھوا ۔

مرکز جماعت پہنچے تو دو بج چکے تھے ۔ کھانا کھایا گیا ۔ کچھ دیر دعوت کے ایڈیٹر صاحب سے خُمینی اور موجودہ ایران کے متعلق ان کے مشاھدات و تاثرات سنے ۔ وہ حال ھی میں تہران سے واپس آئے تھے ۔ ان کو انقلاب کی سالگرہ میں شرکت کی دعوت ملی تھی ۔ سرکاری مہمان کی حیثیت سے وہ ایران گئے تھے ۔ انھوں نے موجودہ ایران کے متعلق اچھے تأثرات کا اظہار کیا ۔ میں تین بجے سیدھے سائیکل رکشے سے اسٹیشن کے لئے روانہ ھوا ۔ وقت کی تنگی کے باعث بعض قریبی عزیزوں کے ھاں جانا نہ ھو سکا ۔ ڈھائی روپیہ کرایہ طے ھوا ۔ دھلی سے علی گڑھ کا کرایہ ۲۰ . ۷ روپے دینے پڑے ۔ قلی کو ۳ روپے دیئے ۔ وہ خوش ھو کر چلا گیا ۔ جنتا ایکسپرس سے ۴ بجے شام روانہ ھوئے۔ ڈبہ بہت خراب ملا ۔ ریزرویشن نہ ھونے کے سبب سفر بہت تکلیف دہ رھا ۔ اتنا تکلیف دہ کہ توبہ بھلی ۔ خدا خدا کرکے تقریباً ۸ بجے علی گڑھ پہنچے ۔ قلی کو ۳ روپے دئیے ۔ اس نے جھگڑا کیا ۔ سائیکل رکشے میں سوار ھو کر سول لائن چلے ۔ کافی دیر کی تلاش کے بعد ٹھکانے پہنچے ۔ میرے ساتھ رکشے والا بھی بہت خوار ھوا ۔ ۵ روپے رکشے والے کو دئیے ۔ وہ بھی خوش ھو کر چلا گیا ۔ علی گڑھ میں میرا قیام اپنے عزیز علی اختر صاحب کے پاس رھا ۔ علی

اختر صاحب علی گڑھ یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج میں استاذ ہیں ۔ یہ جگہ
یونیورسٹی سے ملی ہوئی ہے اور اس علاقے میں زیادہ تر یونیورسٹی ہی کے لوگ
رہتے ہیں ۔ علی اختر سے معلوم ہوا کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں اساتذہ کے کا
تین کیڈر ہیں ۔ لیکچرر ۔ ریڈر ۔ پروفیسر ۔ اور ان کے اسکیل درج ذیل ہیں :۔

لکچرر ۔ ۷۰۰ ۔ ۴۰ ۔ ۱۱۰۰ ۔ ۵۰ ۔ ۱۶۰۰

ریڈر ۔ ۱۲۰۰ ۔ ۵۰ ۔ ۱۳۰۰ ۔ ۶۰ ۔ ۱۹۰۰

پروفیسر ۔ ۱۵۰۰ ۔ ۶۰ ۔ ۱۸۰۰ ۔ ۱۰۰ ۔ ۲۰۰۰

یہ بنیادی اسکیل ہے ۔ الاؤنسز اس کے علاوہ ہیں ۔

۱۹ فروری ۸۰ء

۱۹ کی صبح نہانے دھونے اور سفر کی تھکن اتارنے میں گذری ۔ ۱۱
بجے علی اختر یونیورسٹی سے کلاس وغیرہ بھگتا کر گھر آئے ۔ ان کے ساتھ ۲
بجے آمد کی اطلاع دینے تھانے اور سی آئی ڈی آفس کی کھوج میں نکلے ۔ ایک
بجے تک اس کام سے فارغ ہو کر گھر آ گئے ۔ کھانا کھایا اور آرام کیا ۔ شام ک
بعض شناساؤں کی تلاش میں نکلے جو قریب ہی سکونت پذیر ہیں ۔ راستے میں
اشتیاق ظلی مل گئے ۔ ان کا تعلق اعظم گڑھ کے ایک گاؤں چھاؤں سے ہے ۔
چھاؤں کا عربی میں ترجمہ کرکے یائے نسبتی لگا کر ظل سے ظلی بنا لیا گیا ہے ۔
ظلی مروجہ سرکاری تعلیم کے علاوہ مدرسۃ الاصلاح کے پڑھے ہوئے ہیں
یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں استاذ ہیں ۔ ان لوگوں کے ساتھ دوسرے متعدد
لوگوں سے ملاقات ہوئی ۔ اعظم گڑھ ہی کے ایک اور دوست مولانا امین احسن
اصلاحی کے خاندانی عزیز ڈاکٹر محمد اشتیاق سے بھی ان کے گھر ملاقات ہوئی

یہ صاحب یونیورسٹی کے شعبہ پولیٹکل سائنس میں استاذ ھیں انھوں نے بتایا کہ ان کی نظر سے لارڈ کرزن کی وہ تقریر گذری ہے جو اس نے خلیج فارس اور سواحل عرب کے دورے میں شیوخ کے سامنے کی تھی اور جس میں مولانا فراھی ترجمان کی حیثیت سے اس کے ساتھ تھے ۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ یہ تقریر تلاش کرکے میرے لئے نکالیں گے ۔

اشتیاق صاحب کے ھاں سے رخصت ھو کر ھم لوگ یونیورسٹی اسٹاف کلب گئے ۔ خیال تھا کہ یہاں مولانا عبد الرحمان طاھر سورتی کے بھائی احمد سورتی صاحب سے ملاقات ھوگی ۔ بعض امانتیں ان تک پہنچانی تھیں ۔ دیر تک انتظار کیا گیا مگر وہ صاحب تشریف نہیں لائے ۔ تقریباً ۹ بجے ھم کلب سے روانہ ھوئے ۔ راستے میں سورتی صاحب کا مکان پڑتا ہے ۔ دستک دی گئی ، وہ گھر پر ھی موجود تھے ۔ ان دنوں طبعیت کچھ ناساز ہے اس لئے کلب نہیں گئے ۔ میں نے امانتیں ان کے حوالہ کیں ۔ دیر ھو چکی تھی اس لئے دوسری ملاقات کا وعدہ کرکے ھم واپس آ گئے ۔

۲۰ فروری ۸۰ء

آج سے باقاعدہ کام شروع کرنا تھا ۔ اشتیاق ظلی اور علی اختر پہلے ھی اپنے اپنے حلقہ اثر میں میری آمد کی تشہیر کر چکے تھے ۔ میں پونے نو بجے گھر سے تنہا نکلا ۔ رکشہ کیا اور ٹریننگ کالج پنہچا ۔ رکشے والے نے ایک روپیہ کرایہ لیا ۔ کالج سے علی اختر صاحب کو لیا اور ھم دونوں اشتیاق ظلی کے پاس ان کے شعبے گئے ۔ اشتیاق ظلی کے پاس ھی فرخ جلالی ملے ۔ فرخ جلالی صاحب آج کل شعبہ تاریخ میں ھیں مگر اس سے پہلے ایک عرصہ تک یونیورسٹی لائبریری میں کتب حوالہ جات کے نگران اور ریکارڈ کیپر رھے ھیں ۔ بیشتر چیزیں ان کی نظر سے گذر چکی تھیں ۔ تھوڑی دیر میں انھوں نے متعدد

چیزیں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں ۔ اورینٹل سیکشن کے انچارج محمد ضیاء الدین انصاری صاحب نے بھی تعاون کیا ۔ ایک بجے تک ہم لوگ لائبریری میں مصروف رہے ۔ ایسی بہت سی چیزیں مل گئیں جن کی تلاش تھی ۔ کھانا کھانے گھر واپس آ گیا ۔ پیدل آنا ہوا ۔ کھانا کھا کر سو گیا ۔ سستی غالب آئی ۔ دوبارہ یونیورسٹی جانا نہ ہو سکا ۔ ۵ بجے ظلی صاحب گھر پر ہی آ گئے ۔ ۱۰ بجے تک ان کے ساتھ گپ شپ رہی ۔ اشتیاق صاحب نے طبقات ابن سعد کے دونوں ہی نسخے عربی اور فارسی اپنے نام نکلوا لئے تھے ۔ استفادہ کے لئے میرے پاس چھوڑ گئے ۔ رات میں کام کرنا چاہا مگر بجلی چلی گئی ۔ اس لئے سونا پڑا ۔ صبح اٹھ کر ان کتابوں سے ضروری باتیں نقل کیں ۔ مولانا فراہی نے زمانہ طالب علمی میں غالباً سرسید کی فرمائش پر اس کو عربی سےفارسی میں منتقل کیا تھا ۔

۲۱ فروری ۸۰ء

۹ بجے یونیورسٹی کے لئے نکلے ۔ لائبریرین صاحب سے ملاقات آج بھی نہیں ہوئی ۔ آج وہ آفس ہی نہیں آئے ۔ مولانا آزاد لائبریری کے اورینٹل ڈویژن میں رسالہ بدءالاسلام تلاش کیا گیا ۔ اشتیاق ظلی کی کوشش اور عملے کے تعاون سے عربی فارسی دونوں متن مل گئے جو اشتیاق صاحب کے نام نکلوا کر گھر لائے گئے ۔ یہ رسالہ شبلی نے مرتب کیا اور فراہی نے فارسی میں ترجمہ کیا ۔ دوپہر اشتیاق ظلی کے ساتھ یونیورسٹی کے بازار شمشاد مارکیٹ کی سیر کی ۔ چار کاپیاں دو روپے میں خرید یں ۔ ایک عدد Jem کا شارپنر خریدا ، قیمت ۱.۲۵ تھی۔امرود ڈھائی روپیہ سیر لیا گیا ۔ جوتے کی قیمت ایک جوتا بنانے والے سے دریافت کی ، معلوم ہوا کہ ۷۵ روپے میں بنا دے گا ۔ بازار کی مسجد میں نماز ظہر ادا کی ۔ دو ڈھائی بجے پھر لائبریری پہنچے ۔ لائبریرین صاحب

تشریف نہیں لائے تھے ۔ کوئی اور کام تھا نہیں ، المنار کے فائل موجود تھے ، ان کی ورق گردانی کی ۔ نظام القرآن پر مولانا رشید رضا کی تقریظ جلد ۱۲ کے دوسرے شمارے میں ملی ۔ ڈاکٹر معین کے مقالے کا معلوم کیا گیا مگر کیٹلاگ میں وہ نہیں ملا ۔ یہ مولانا فراھی پر پی ایچ ڈی کا تھیسس ہے ۔ ۴ بجے یونیورسٹی سے نکل کر اجمل کی تلاش میں پیدل ھی حبیب ھال گیا ۔ کمرہ نمبر ۲۳۳ جہاں اجمل سے ملنا تھا مقفل تھا ۔ ساتھ والے کمرے میں چھاؤں کے ایک ریسرچ اسکالر نسیم ظلی تھے ان سے بات چیت ہوئی ۔ انھی کے ساتھ جاوید سے ملاقات ہوئی جو قریب ھی دوسرے ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۴۷ میں تھے ۔ جاوید سلمہ اعظم گڑھی اور عزیز ھیں ، ایم اے کے طالب علم ھیں ۔ جاوید نے چائے اور بسکٹ سے تواضع کی ۔ انھی کے ھاں اعظم گڑھ کے بعض دوسرے لڑکوں سے بھی ملاقات ہوئی ۔ جاوید گھر تک چھوڑنے آئے ۔ ھم دونوں وھاں سے پیدل ھی گھومتے گھامتے واپس گھر آئے ۔ اشتیاق ظلی کے ھاں رات کا کھانا تھا ۔ کچھ دیر آرام کرکے میں اختر اور جاوید کوئی آٹھ بجے اشتیاق ظلی کے ھاں پہنچے ۔ کھانا ھوا ۔ اس کے بعد دیر تک سرسید اور شبلی ، علی گڑھ اور ندوہ کے موضوع پر گفتگو رھی ۔ ۱۰ بجے گھر واپس ہوئے ۔ راستے میں اختر صاحب نے خوشبودار میٹھے پان کھلائے ۔ پاکستان میں پان اپنے لیے شجر ممنوعہ رھتا ہے ۔ مہنگا ہونے کے علاوہ عام طور سے اتنا بد ذائقہ ھوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ جی نہیں چاھتا بلکہ کھا کر کوفت سی ھوتی ہے ۔ اختر صاحب نے ایک خاص دوکان سے پان کھلایا ۔ واقعی مزا آیا ۔ گھنٹوں مزے لے لے کر چباتا رھا ۔ صبح تک اس کا مزہ رھا ۔ اشتیاق ظلی کے ھاں سے بھٹنا گر کی ایک کتاب ”علی گڑھ ایم اے او کالج“ لے آیا تھا ، اس کو دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتے رھے ۔ بجلی اشتیاق صاحب کے ھاں ھی جا چکی تھی ۔ لالٹین اور لیمپ سے کام چلایا گیا ۔ اس کتاب میں کوئی خاص چیز نہیں ملی ۔ بعض حوالے بطور یادداشت نوٹ کر لیے ۔

ظلی کے ھاں سے واپسی کے بعد اعظم گڑھ روانگی کا پروگرام بھی زیر غور آیا ۔ طے پایا کہ بدھ کے بعد کی کوئی تاریخ ، جس میں سیٹ مل جائے ، ریزرویشن کرا لی جائے ۔ جاوید سلمہ نے اس کا ذمہ لیا کہ وہ کل ھوسٹل سے اسٹیشن جا کر پتا کریں گے ۔

کل مٹر کی پھلی ایک روپے کی ڈیڑھ کیلو لی گئی تھی ۔ آج ۸ آنے کیلو کی آواز لگا رھے تھے ۔ آلو نسبتاً مہنگا ہے ۔ ایک روپیہ کیلو ۔ گاجر ٦۰ پیسے کیلو ہے ۔ یونیورسٹی ھوسٹل میں اقامت پذیر طلبہ کے مصارف کی بابت دریافت کیا تو معلوم ھوا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے حبیب ھال میں کھانے کا خرچ ۵۰ روپے ماھوار ہے ۔ صرف دو وقت کا کھانا ملتا ہے ۔ اس میں ناشتہ شامل نہیں ہے ۔ سنگل بیڈ روم کا کرایہ حبیب ھال میں ۱۲ روپے ماھوار ہے ۔

۲۲ فروری ۸۰ء

آج جمعے کا دن تھا ۔ یونیورسٹی کے دفاتر اور لائبریری ساڑھے آٹھ بجے کھل کر ساڑھے گیارہ بجے بند ھو گئے ۔ میں بھی آج کچھ سویرے ھی یونیورسٹی پہنچ گیا ۔ مولانا فراھی پر معین الدین اعظمی کے مقالے کا سراغ مل گیا ۔ انصاری صاحب نے اسے ڈھونڈ نکالا ۔ آج ساڑھے گیارہ بجے تک اسی کی ورق گردانی کرتا رھا ۔ حالات کا حصہ بہت مختصر ہے ۔ اس میں زیادہ باتیں وھی ھیں جو اب تک پہلے ھی معلوم کر چکا ھوں ۔ انہوں نے ایک خاص پہلو کو لیا ہے ۔ میرا موضوع اس سے بہت وسیع ہے ۔ ساڑھے گیارہ بجے اٹھ گئے ۔ اشتیاق ظلی کے ڈیپارٹمنٹ آئے ۔ انہوں نے پانچ بجے شام گھر آنے کو کہا ۔ ھم اکٹھے ھی نکلے ۔ راستے میں امرود خریدا گیا ڈھائی روپے کیلو ۔ وہ اپنے گھر چلے گئے میں اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ھوا ۔ جمعے کی نماز کے لئے نکلے تو جاوید آئے

ہوئے ملے ۔ جمعے کی نماز پڑھ کر کھانا کھایا گیا ۔ جاوید میرے لئے B S C کی
ہوائی چپل لے آئے ، قیمت ۹۵ . ۱۰ تھی ۔ پاکستان کی نسبت دام زیادہ تھے۔ وہ
اسٹیشن سے معلوم کر آئے تھے ، ۲٦ فروری اور یکم مارچ کی تاریخوں میں برتھ
مل رہی تھی ۔ اختر صاحب سے مشورہ کے بعد طے ہوا کہ یکم مارچ کی
ریزرویشن کرا لی جائے ۔ جاوید کو سوروپے کا نوٹ دیا کہ وہ برتھ ریزرو
کرا لیں ۔ دو ڈھائی بجے وہ چلے گئے ۔ میں لیٹ گیا ، نیند آ گئی ۔ ساڑھے چار
بجے اٹھنا ہوا ۔ پانچ بجے اشتیاق ظلی آ گئے ۔ پروگرام کہیں جانے کا تھا ۔ مگر
بیٹھے تو بیٹھے ہی رہے ۔ گپ شپ ہوتی رہی ۔ ۹ بجے رات تک سلسلہ جاری
رہا ۔ اشتیاق چلے گئے ۔ ہم لوگوں نے کھانا کھایا ۔ میں نے نماز پڑھی اور سو گیا ۔
بجلی آج بھی غائب رہی ۔

۲۳ فروری ۸۰ء

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر بچوں کو خط لکھا ۔ ۱۰ بجے یونیورسٹی
پہنچا ۔ ایک صاحب کے ساتھ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر گئے
کہ یہاں بھی پرانا ریکارڈ ہے شاید کوئی مفید مطلب چیز مل جائے ۔ لیکن
بدقسمتی سے انچارج صاحب تشریف نہیں لائے ۔ معلوم ہوا کہ پیر کو ملیں گے ۔
یہ عمارت یونیورسٹی کی پرانی عمارتوں میں سے ہے ۔ آزاد لائبریری کی نئی
عمارت سے زیادہ دور نہیں ۔ ہز ہائینیس نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروا نے
بھوپال کے عطیہ سے ۱۹۱۵ء میں تعمیر ہوئی آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل
کانفرنس کے لئے ۔ اردو میں ایک لمبا چوڑا کتبہ لگا ہوا ہے جس میں اس کی
متعلقہ تفصیلات درج ہیں ۔ ایک گوشے میں ایجوکیشنل کانفرنس کا دفتر اور
لائبریری وغیرہ ہے ۔ عمارت کا بڑا حصہ بچوں کے اسکول کے لئے وقف ہے ۔ اوپر
انجمن ترقی اردو علی گڑھ کا دفتر ہے ۔ آدھ گھنٹے کی سیر کے بعد میں

یونیورسٹی لائبریری واپس آ گیا ۔ لائبریرین صاحب آج بھی نہیں آئے ۔ ڈپٹی لائبریرین سے ملاقات کی ۔ انہوں نے فارم بھروا کر عارضی ممبر شپ کا کارڈ جاری کروا دیا ۔ ڈاکٹر معین الدین کا مقالہ نکلوا کر اس میں سے ضروری حوالے وغیرہ نقل کئے ۔ دوپہر ڈیڑھ بجے تک اس کام سے فارغ ہو گیا ۔ بھوک پیاس محسوس ہوئی ۔ سمشاد مارکیٹ چلا گیا ۔ راستے میں کیلے والے سے کیلے لیکر کھائے ۔ یہاں کیلے بیچنے والوں کا دستور نرالا ہے ۔ اپنا مال بیچنے سے زیادہ وہ گاھکوں کی خدمت کو ضروری خیال کرتے ھیں ۔ بیچارے ھر آنے جانے والوں کو سلام کرتے ھیں ۔ گاھک کھڑا ھو جاتا ہے اور وہ ایک ایک کیلا چھیل چھیل کر بچوں کی طرح اسے پیش کرتے جاتے ھیں ۔ گاھک بس کہہ دے تو رک جائیں گے۔ آج میرے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ ھوا ۔ میں نے تین کیلے کھائے ۔ کیلے بھر بُھر خستہ میٹھے اور خوش ذائقہ تھے ۔ شمشاد مارکیٹ میں ایک عدد سیب قیمت ۱۲ آنے اور سو گرام جلیبی قیمت ٦۰ پیسے کھا کر طبیعت سیر ھو گئی ۔ ظہر کی نماز وھیں مسجد میں ادا کی ۔ واپس لائبریری آئے تو تین بج چکے تھے۔ بقیہ وقت سرسید روم میں گذارا ۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ضخیم فائلوں کی ورق گردانی میں وقت گذر گیا ۔ ایک دو جلدیں بمشکل دیکھی جا سکیں ۔ اس کمرے میں جتنا بڑا ذخیرہ کھنگالنا ہے اس کے لئے مہینوں کی مدت درکار ھوگی ۔

یونیورسٹی سے گھر کے لئے نکلے تو راستے میں اختر ملے ۔ وہ فیکلٹی لاؤنج میں ایک سیمینار اٹنڈ کرنے جا رہے تھے ۔ قریب ھی اسٹاف کلب تھا ۔ میں وھاں گیا ۔ تھوڑی دور ھی پر جاوید مل گئے ۔ وہ رجسٹرار آفس سے آ رہے تھے ۔ انہوں نے ٹکٹ حوالہ کیا اور کل آنے کا وعدہ کرکے رخصت ھو گئے ۔ ٹکٹ سرائے میر تک کا ہے۔ ٹکٹ کی قیمت ۳۰ روپے ، ۵ روپے ریزرویشن کے لگے ۔ میں کلب گیا اور ضرورت سے فارغ ھو کر فیکلٹی لاؤنج پہنچا ۔ "کمیونلزم" پر یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات (پولیٹیکل سائنس) کی طرف سے سیمینار کا اہتمام کیا گیا تھا۔

اچھے پیپرز پڑھے گئے اور بحث و گفتگو بھی اچھی رہی ۔ سنجیدہ ماحول میں تمام کارروائی ہوئی ۔ درمیان میں چائے اور بسکٹ دیا گیا ۔ ساڑھے چھ بجے سیمینار ختم ہوا ۔ وہاں سے اٹھ کر اسٹاف کلب آ گئے ۔ احمد سورتی اور یونیورسٹی کے بہت سے اساتذہ ایک کمرے میں بیٹھ گئے اور دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ۔ کوئی دس بجے گھر لوٹے ۔ کھانا کھایا ۔ آج اختر صاحب کو بچوں کے بگڑنے کا خیال ہوا ۔ تنبیہہ تادیب ڈانٹ ڈپٹ کے بعد انہوں نے گھر کے ماحول اور گھریلو زندگی پر ایک لمبی تقریر کی جو ۱۲ بجے تک جاری رہی۔ میں اٹھا نماز پڑھی اور سو گیا ۔

۲۴ فروری ۸۰ء

آج اتوار ، چھٹی کا دن ہے ۔ بازار ، شہر جانا ہے ۔ حبیب الرحمن اور جاوید دونوں گھر آ گئے ۔ انہی کے ساتھ شہر جانا ہوا ۔ علی گڑھ گندہ شہر ہے ۔ جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر اور بدبو کی لپٹ سے سابقہ پڑا ، ایک سوٹ کا گرم کپڑا خریدا گیا ۔ قیمت ۲۲۰ روپے ادا کرنی پڑی ۔ بجلی دن بھر نہیں آئی ۔ اس لئے فوٹو اسٹیٹ کا کام نہیں ہوا ۔ البرٹ ٹیلر ماسٹر کو سوٹ سلنے کے لئے دے دیا گیا ۔ سلائی دو سو روپے ہو گی ۔ دو تالے (٦ - ۱۰روپے) ایک قینچی (۸روپے) ایک چاقو(۲ روپے) خریدا ۔ ڈھائی بجے تک گھر واپس آ گئے ۔ شام کے پانچ بجے احمد سورتی صاحب کے ہاں جانا ہوا ۔ ۸ بجے تک نشست رہی ۔ گفتگو زیادہ تر مولانا فراھی پر یا تصوف پر ہوتی رہی ۔ ۹ بجے کے قریب واپس گھر آئے ، کھانا کھایا ، نماز پڑھی اور سو گئے ۔

۲۵ فروری ۸۰ء

کل رات ھی پروفیسر سورتی کے ہاں اشتیاق ظلی اور علی اختر کے

ساتھ طے ہو گیا تھا کہ کل ۱۱ بجے سب مل کر وفد کی صورت میں وائس چانسلر سے ملاقات کریں گے اور مولانا فراهی پر مواد کی فراهمی میں ان سے مدد کی درخواست کریں گے ۔ ایک هفتہ گذر گیا مگر ابھی تک کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی ۔ یونیورسٹی کے قدیم ریکارڈ سے مطلوبہ معلومات حاصل ہو سکتی هیں ۔ پروگرام کے مطابق هم چار آدمیوں کا وفد وائس چانسلر سے ملنے ان کے آفس گیا ۔ پہلے سے کوئی وقت لینا ضروری نہیں سمجھا گیا ۔ معلوم ہوا کہ وائس چانسلر صاحب آج اپنے دفتر نہیں آئیں گے ۔ بات ختم ہوئی ۔ یہاں سے سورتی صاحب تو واپس اپنے ڈیپارٹمنٹ چلے گئے کہ انہیں کام تھا بقیہ تین آدمی فیزکس ڈیپارٹمنٹ جا کر ڈاکٹر سید فضل محمد ریڈر شعبہ طبعیات و رکن یو سی جی کمیٹی سے ملے اور مسئلہ ان کے سامنے رکھا ۔ ڈاکٹر اسرار ریڈر شعبہ طبعیات همارے ساتھ تھے ۔ ان کا تعلق بھی اعظم گڑھ سے ہے ۔ اپنی اعلی دماغی صلاحیتوں کی وجہ سے بیرون ملک بھی جانے جاتے هیں ۔ انہوں نے ضروری باتیں نوٹ کر لیں اور وعدہ کیا کہ متعلقہ لوگوں سے گفتگو کرکے بتائیں گے ۔ کل معلوم ہوگا کہ انہیں کس قدر کامیابی ہوئی ۔ هم وهاں سے اٹھے تو دو بج چکے تھے ۔ فیکلٹی آ گئے ۔ وهاں یونیورسٹی کے اردو سہ ماهی رسالے فکر و نظر کے ایڈیٹر عتیق صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ شعبہ اردو کے ایک اور استاد شہر یار صاحب سے بھی ملاقات ہوئی ۔ پروفیسر عتیق سے معلوم ہوا کہ شعبہ اردو میں اساتذہ کی تعداد ۲۲ ہے اور طلبہ هزار سے زیادہ هیں ۔ یونیورسٹی میں طلبہ کی کل تعداد ان دنوں پندرہ هزار (۱۵۰۰۰) کے قریب ہے ۔ وهاں سے فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز گئے مگر دیر ہو چکی تھی کسی سے ملاقات نہیں ہوئی ۔ تقریباً ڈھائی بجے اختر اور ظلی گھر کے لئے روانہ ہوئے ۔ میں لائبریری آ گیا ۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جلد ۱۰ ۔ ۱۱ جو پہلے هی سے نکال کر رکھی ہوئی تھی ان کی ورق گردانی کرتا رہا ۔ کوئی کام کی بات نہیں ملی ۔

ساڑھے چار بجے لائبریری بند ہو گئی ۔ میں نکل کر قریب ھی لان میں بیٹھ گیا۔ آج دوپہــر کا کھانا شمشاد مارکیٹ کے ایک ہوٹل میں کھایا ۔ اسٹو کی پلیٹ آئی ، اس میں بو آ رھی تھی ، واپس کیا ۔ کوفتے کی پلیٹ آئی ، بد ذائقــہ ، زھر مار کیا ۔ ایک روپے چالیس پیسے لئے ۔ کھانا بہت خراب تھا ۔ گندگی اور پھوھڑپن بے حساب تھا ۔ کالج کے تمام لڑکے یہیں کھانا کھاتے ھیں ۔ پانچ بجے کے قریب جاوید اور حبیب الرحمن آ گئے ۔ ان کو لے کر شہر گیا ۔ سوٹ کا ٹرائل ھوا ۔ آگرے کا پیٹھے کا مربــہ تلاش کیا گیا ، نہیں ملا ۔ رسالــہ بدءالاسلام اور طبقات ابن سعد ، فارسی تراجم کے سرورق اور ابتدائی دو صفحات کی فوٹو اسٹیٹ کرائی گئی اور گھر واپس آ گئے ۔

۲۶ فروری ۸۰ء

۱۰ بجے لائبریری پہنچا ۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ دیکھنے کا کام جاری رہا ۔ ۱۹۰۹ ، ۱۰ ، ۱۱ ، ۱۲ تک کے گزٹ دیکھ ڈالے ۔ ہزار صفحات سے زائد دیکھ جانے کے باوجود کوئی مفید مطلب چیز نہیں ملی ۔ دو بجے یہ کام ختم ھوا ۔ کمر اور مونڈھے دُکھنے لگے شدت کی بھوک بھی لگ چکی تھی ۔ سامان خورد و نوش کی تلاش میں باھر نکلا ۔ لائبریری کے بیرونی گیٹ تک پہنچا ھی تھا کــہ حبیب الرحمن اپنے ایک دوست فقیر محمد کے ساتھ باھر سے آتے دکھائی دئیے ۔ حبیب الرحمن میرے عزیز اور میرے گاؤں سنجر پور کے رھنے والے ھیں اور فقیر محمد رشید احمد صدیقی کے وطن ،،مڑیاھو،، کے رھنے والے ھیں ۔ فقیر محمد صاحب نے ،،مــڑیا ھو،، کے بارے میں بتایا کــہ یــہ دراصل ،،منڈی آھو،، تھا جو بگڑ کر،،مــڑیا ھو،، یا ،،منڈیا ھو،، ھو گیا ۔ یــہ دونوں لائبریری کے قریب ھی سلیمان ھال کشمیر ھاؤس (ھوسٹل) میں رھتے ھیں ۔ وہ مجھے ساتھ لے گئے اور ھوسٹل میں کھانا

کھایا گیا ۔ کھانا اچھا خاصا تھا ۔ دال گوشت روٹی اور چاول کھانے میں تھے ۔ کھانا دیکھنے میں بھی ٹھیک تھا اور کھانے میں بھی برا نہیں تھا ۔ اگر یہ بات نظر میں رکھیجائے کہ کھانے کی فیس ماہوار صرف پچاس روپے ہے تو محسوس ہوتاہیکہ بہت مناسب ہے۔ دھلائی کیلئےہوسٹل میں جو دھوبی لگے ہوئے ہیں وہ ۲۰ پیسے فی کپڑا چارج کرتے ہیں ۔ سن کر تعجب ہوا ۔ بازار میں ۱۲ آنہ ایک روپیہ فی کپڑا دھلائی ہے اور اتنا اچھا دھوتے بھی نہیں ۔ کھانا کھا کر وھیں کمرے میں نماز پڑھی اور لیٹ گئے ۔ ۳ بجے تک آرام کیا ۔ سوا چار بجے نکلے ۔ تھیلا لائبریری میں انصاری صاحب کے پاس چھوڑ آیا تھا ۔ تھیلا لیکر گھر کے لئے چلے ۔ علی گڑھ سے مجھے مولانا فراھی کے سلسلے میں جن چیزوں کی تلاش تھی اس کی ایک فہرست فقیر محمد صاحب کو ان کے مانگنے پر دے دی اس خیال سے کہ وہ بعد میں تلاش کرکے ڈھونڈ نکالیں گے ۔ اور مجھے بھیج دیں گے ۔ میں نے سوچا ابھی سے گھر جا کر کیا کروں گا ، قریب ھی ایس ایس ہال میں مولانا فراھی کے پوتے حمد اللہ فراھی کو دیکھنے گیا ۔ کمرے کا نمبر وغیرہ معلوم نہیں تھا اس لئے ان کا پتا نہیں چل سکا ۔ واپس گھر آ گیا ۔ مغرب کی نماز پڑھ کر کھانا کھانے کے بعد علی اختر کو لیکر پھر نکلے ۔ ڈاکٹر اسرار کے گھر گئے۔

ان کا تعلق بھی اعظم گڑھ کے ایک گاؤں سے ہے ان سے معلوم کرنا تھا کہ ڈاکٹر سید فضل محمد صاحب نے کیا کیا ۔ وہ گھر پر نہیں تھے ۔ معلوم ہوا کہ محمد اشتیاق صاحب اعظمی (پولیٹیکل سائنس) کے پاس گئے ہیں ۔ ہم وہاں پہنچے ۔ ملاقات ہوئی ۔ معلوم ہوا کہ متعلقہ رجسٹرار صاحب چھٹی پر تھے اس لئے بات نہ ہو سکی ۔ کل کا وعدہ کیا ہے ۔ اشتیاق صاحب کے ذمہ لگایا تھا کہ وہ لارڈ کرزن کی وہ تقریر نکال کر دیں گے جو اس نے خلیج فارس اور سواحل عرب کے دورے میں کی تھی اور جس میں مولانا فراھی اس کے ساتھ تھے ۔ میرے سامنے انہوں نے پھر تلاش شروع کی ۔ خوش قسمتی سے ان کی اپنی کتاب

میں اس کا حوالہ مل گیا ۔ وارڈ ۔ اے ڈبلیو گوچ ڈی پی کی کتاب۔ Cambridge History of Foreign Policy V. III P. 321 پر وہ تقریر ہے ۔ کل یونیورسٹی میں اسے تلاش کیا جائے گا ۔ ۹ بجے تک نشست رہی ۔ واپس گھر آ گئے ۔ نماز پڑھی اور سو گئے ۔

۲۷ فروری ۱۹۸۰ء

۹ بجے صبح حسب معمول بیدل گھر سے نکلے ۔ سرسید ھاؤس راستے میں پڑتا ہے ۔ خیال ھوا اسے دیکھا جائے ۔ مگر وہ ابھی کھلا نہیں تھا ۔ معلوم ھوا ساڑھے نو بجے کھلتا ہے اور ساڑھے چار بجے بند ھوتا ہے ۔ وھاں سے اسلامک اسٹڈیز اور عربی ڈیپارٹمنٹ گیا ۔ شعبہ عربی کے صدر مختار الدین صاحب چھٹی پر تھے ۔ اقبال انصاری صاحب صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز سے ملاقات ھوئی ۔ بڑے تپاک سے ملے ۔ کافی سے تواضع کی ۔ کل شام گھر آنے اور کھانا کھانے کی دعوت دی ۔ میں نے معذرت کرنی چاھی مگر ان کے اصرار اور فیصلہ کن انداز کے آگے پیش نہ گئی ۔ سعید اکبر آبادی بھی یہیں ھوتے ھیں ۔ مگر آج وہ بھی نہیں آئے تھے ۔ البتہ اسلامک اسٹڈیز کی ڈیپارٹمنٹل لائبریری دیکھی ۔ وھاں سے آرٹس فیکلٹی ظلی صاحب کے پاس آئے ۔ گوچ کی کتاب تاریخ اور پولیٹیکل سائنس کے شعبوں میں مل کر تلاش کی گئی ، کامیابی نہ ھوئی ۔ ڈاکٹر عتیق‌مدیر فکرونظر کو دیکھنے گیا انکا کمرہ بند تھا۔گوچ کی کتاب مین لائبریری میں بھی تلاش کی گئی وھاں بھی نہیں ملی ۔ جلالی صاحب نے اسکرپٹ سیکشن میں قلمی خطوط کی نشاندھی کی ۔ ان کا خیال تھا کہ شاید ان میں کہیں مولانا فراھی کا بھی کوئی خط مل جائے ۔ اس سیکشن میں مسودات کا اچھا ذخیرہ ہے ۔ ۱۴ ھزار کے لگ بھگ قلمی مخطوطات جمع کئے گئے ھیں ۔ کوئی مطلوبہ چیز یہاں بھی نہیں ملی ۔ یہاں سے بے نیل مرام نکلے اور فیکلٹی

گئے ۔ ظلی کو ساتھ لیکر مدیر فکر و نظر کو تلاش کیا گیا ۔ ان سے فکر و نظر کے پرچے لینے تھے ۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی ۔ ڈاکٹر صفی صاحب انچارج سرسید ھاؤس کو دیکھا گیا وہ بھی جا چکے تھے ۔ ہم نے اپنے طور پر ھی سرسید ھاؤس دیکھنے کا فیصلہ کیا ۔ ایک صاحب نے سرسید ھاؤس کی سیر تو کرادی ، مطلوبہ مواد کے لئے کل کا وعدہ کیا ۔

یہ وہ بنگلہ ہے جس میں سرسید رھتے تھے ۔ اس کو گرا کر اسی طرز پر نئے سرے سے تعمیر کیا گیا ہے ۔ اس کے ساتھ ھی اسی کی حدود میں ایک طرف وہ بنگلیا ہے جو سرسید نے شبلی کے لئے بنوائی تھی ۔ سرسید کے باقیات میں ان کا عصا ، قطب نما گھڑی اور صوفہ سیٹ اور میز کرسیاں ، یہ چند چیزیں محفوظ کی گئی ھیں ۔ قدیم ریکارڈ بھی اسی بنگلے کے ایک کمرے میں محفوظ کیا گیا ہے ۔ اس عمارت کو سرسید اکیڈمی بنانے کا پروگرام ہے ۔ اسی خیال سے اسے تعمیر جدید کے بعد نئے سرے سے استوار اور آراستہ کیا گیا ہے ۔ چند منٹ میں اس کی سیر مکمل ھو گئی اور ظلی کے ساتھ گھر کی طرف چلے ۔ راستے میں ظلی صاحب نے اشارہ کرکے جامعہ اردو کی عمارت کو بتایا جہاں تین بجے قاری طیب صاحب کی تقریر تھی میں گھر آیا ۔ پانی گرم کراکے غسل کیا ۔ کھانا کھایا ، نماز پڑھی ، اتنے میں تین بج گئے ۔ قاری طیب صاحب کی تقریر سننے جامعہ اردو روانہ ہوئے ۔ یہاں متعدد ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جن کی تلاش تھی اور وہ نہیں مل رھے تھے ۔ سعید اکبر آبادی ، تقی امینی وغیرہ سے ملاقات ھوئی ۔ فکر و نظر کے لئے ان لوگوں کو لکھنے کی دعوت دی ۔

گھر واپس آئے تو حبیب الرحمن منتظر تھے ۔ ان کو لیکر شہر گئے اور سوٹ لے آئے ۔ سوٹ کی سلائی ۲۰۰ روپے ادا کئے ۔ واپسی میں ایس ایس ھال میں پھر حمد اللہ فراھی کو تلاش کیا گیا ۔ وہ نہیں ملے ۔ کارڈ چھوڑ کر چلا آیا ۔

۲۸ فروری ۱۹۸۰ء

صبح اٹھ کر ترجمہ طبقات ابن سعد اور ترجمہ رسالہ بدءالاسلام پر کچھ کام کیا ۔ یہ دونوں کتابیں مولانا فراھی کی ھیں اور نایاب ھیں ۔ ۱۰ بجے سرسید ھاؤس (سرسید اکیڈمی) گیا ۔ اکیڈمی کے کارکنوں کی مدد سے ۳ ۔ ۴ گھنٹے صرف کرکے تنخواہ کے رجسٹر کھنگالے ۔

سرسید ھاؤس (سرسید اکیڈمی)

سرسید کے ذاتی بنگلے کو سرسید اکیڈمی بنانے کے لئے کام ہو رہا ہے۔ پہلے مرحلے میں تعمیر نو کے بعد اس کو اس قابل بنایا گیا ہے کہ اس کو محض بطور یاد گار اسی شکل میں محفوظ رکھنے کے بجائے ایک جدید علمی اکیڈمی کا درجہ دیا جا سکے ۔ تعمیر نو میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ نقشہ اور طرز تعمیر وھی رکھا جائے جو پرانی عمارت کا تھا ۔ گویا اس عمارت کی بنیادیں وھی ھیں البتہ تعمیری مواد نیا لگایا گیا ہے۔ اکیڈمی کا اسٹاف مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس کے ڈائرکٹر پروفیسر خلیق احمد نظامی صدر شعبہ تاریخ ھیں ۔ اسی شعبے کے ایک اور استاذ ڈاکٹر وصی کو اکیڈمی کا انچارج بنایا گیا ہے۔ باقی اس کا انتظامی عملہ ہے۔ یہ سرسید کا ذاتی مکان ہے جس میں وہ رھائش رکھتے تھے ۔ اس کا وسیع و عریض کمپاؤنڈ ، خود عمارت کے دیوار و در اور سقف و بام دیکھ کر سرسید کے بڑا پن کا اندازہ ھوتا ہے جس کی ایک نہیں مختلف جہتیں ھیں اور اسی میں سے ایک جہت ان کی جسامت یا جسمانی فخامت بھی ہے۔ اس اکیڈمی میں لگی ھوئی ایک تصویر سے ان کی دیو قامتی اور بھی نمایاں ھو کر سامنے آتی ہے۔ تاریخ علی گڑھ اور سرسید کے ذکر میں شبلی کا تذکرہ بھی کسی نہ کسی صورت میں آ ھی جاتا ہے۔

سرسید کے بنگلے کے کمپاؤنڈ میں شبلی کی بنگلیا کا ذکر بھی ضرور ھی دھرایا جاتا ہے ۔ آج میں سرسید ھاؤس دیکھنے گیا تو شبلی کی بنگلیا کے متعلق بھی دریافت کیا ۔ اکیڈمی کے ایک کارکن نے ھاتھ کے اشارہ سے بتایا کہ اس طرف ہے ۔ پہلے تو میں اکیلا ھی چلا گیا لیکن جب مجھے اس قسم کی کوئی چیز نظر نہ آئی تو میں نے واپس آ کر دوبارہ استفسار کیا ۔ وہ کارکن میرے ساتھ ہو گئے ۔ اینٹوں اور مٹی کے ملبے کی طرف وہ مجھے لے کر گئے ۔ ملبے کے پاس کھڑے ہو کر بتایا کہ یہ ہے شبلی کی بنگلیا ۔ جگہ جگہ پرانی اینٹ اور مٹی کے ڈھیر رہ گئے ھیں ۔ بنیادوں تک کا پتا نہیں چلتا ۔ بڑے درخت کے سایے میں چھوٹے درخت کا باقی رھنا کار دشوار ھوتا ہے ۔ یہ بنگلیا سرسید نے اپنے قرب میں بطور خاص شبلی کے لئے بنوائی تھی ۔ ذمہ داران یونیورسٹی کو چاھئیے کہ اس کو بھی نئی زندگی عطا کریں ۔

اکیڈمی ابھی Under Making ہے ۔ سرسید کے آثار و باقیات جو مل سکے اس میں رکھے گئے ھیں ۔ ان کی چھڑی اور قطب نما گھڑی اور کچھ فرنیچر جو ان کے زیر استعمال رھا اس اکیڈمی میں محفوظ کر دیا گیا ۔ مطالعہ کی میز تو ٹھیک ہے البتہ مطالعے کی کرسی سرسید کے ابعاد ثلاثہ سے ہم آھنگ نظر نہیں آتی ۔ علمی اعتبار سے اھم اس اکیڈمی کا وہ حصہ ہے جس کو آرکائیوز سیکشن کہا جاتا ہے ۔ اس میں یونیورسٹی کا پرانا ریکارڈ اور علی گڑھ کی تاریخ سے متعلق کچھ اور بھی پرانے کاغذات رکھے گئے ھیں ۔

اکیڈمی کا یہ حصہ جو علمی اور تاریخی اعتبار سے اھم ہے یونیورسٹی اتھارٹیز اور حکومت ھند کی توجہ کا محتاج ہے ۔ اھلکاروں اور عہدہ داروں کے دفتر اور اکیڈمی کے دوسرے کمرے وغیرہ تو صاف ستھرے ھیں اور ان میں عہد جدید کی سج دھج نظرآتی ہے مگر آرکائیوز سیکشن ، جو اصل ہے ، یوں محسوس

ہوتا ہے کہ بے توجہی اور کسمپرسی کا شکار ہے ۔ یونیورسٹی کا تمام قدیم ریکارڈ یہاں منتقل کر دیا گیا ہے ۔ یہ ریکارڈ بہت قیمتی اثاثہ اور قومی سرمایہ ہے ۔ عہد جدید کے تقاضوں کے مطابق اس کو مرتب کرکے اس قابل بنانے کی ضرورت ہے کہ اس سے استفادہ کیا جا سکے ۔ اس وقت تک یہ عظیم الشان ذخیرہ کاغذات کے انبار اور فائیلوں کے ڈھیر کی شکل میں سرسید ہاؤس کے دو کمروں میں بند کر دیا گیا ہے ۔ روزانہ صفائی اور جھاڑ پونچھ کی طرف کبھی کوئی توجہ نہیں دیتا ۔ خود اکیڈمی کا عملہ اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتا ہے کہ اس کے کپڑے گرد و غبار سے اٹ جائیں گے ۔ آرکائیوز سیکشن کے ایک کارکن فہمی صاحب آج میری خاطر بدقت تمام اس کو کھلوانے میں کامیاب ہوئے ۔ یونیورسٹی کے پے رول (رجسٹروں) کو دیکھ کر مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ فراہی کب سے کب تک علی گڑھ کے ٹیچنگ اسٹاف میں رہے ۔ فہمی صاحب کی مدد سے اس میں قدرے کامیابی ہوئی ۔ اس تلاش و تحقیق کے نتائج جلد ہی ”فراہی اور علی گڑھ“ کے عنوان سے نذر قارئین کئے جائیں گے ۔ اکیڈمی کا عملہ شاکی نظر آیا ۔ یونیورسٹی اتھارٹیز اور حکومت ہند کو اس طرف توجہ کرنی چاہئے اور آرکائیوز سیکشن کی مناسب دیکھ بھال اور حفاظت کے لئے ضروری وسائل مہیا کرنے چاہئیں ۔ میں نے آج ۱۰ بجے سے ۲ بجے تک کا وقت اکیڈمی میں گذارا ۔ ڈائرکٹر اور انچارج دونوں میں سے کوئی بھی اکیڈمی نہیں آیا ۔ باقی کارکن گپ لڑاتے رہے اور چائے پیتے رہے ۔

سرسید اکیڈمی کے آرکائیوز سیکشن سے بعض ایسی معلومات مل گئیں جن کی مدد سے کچھ اور شہادتیں نکالی جا سکتی تھیں ۔ میں فوراً آزاد لائبریری کے سرسید روم کی طرف دوڑا اور دو گھنٹے صرف کرکے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے متعلقہ فائل دیکھے ۔ خوش قسمتی سے مولانا فراہی کی روانگی الہ آباد (میور کالج) کی تفصیل مل گئی ۔ بعض اور مفید معلومات بھی

ملیں ۔ یکم جون ۱۹۰۸ء سے مولانا فراھی چھ ماہ کی چھٹی لیکر میور کالج الہ آباد چلے گئے ۔ چھٹی ختم ہونے کے بعد کی کار روائی کا علم نہیں ہو سکا ۔ غالباً استعفا دیا ہوگا مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا ۔

فیکلٹی لاؤنج میں شعبہ اردو علی گڑھ کی طرف سے یوم فانی کی تقریب ڈھائی بجے شروع ہونی تھی ۔ شعبے کے ایک استاذ شہر یار صاحب مجھے شرکت کی دعوت دے چکے تھے ۔ چار بجے لائبریری سے نکل کر فیکلٹی لاؤنج کا رخ کیا ۔ اچھی تقریب‌تھی ۔۔ ارود سے دلچسپی کا اندازہ ہوا ۔ لاؤنج بھرا ہوا تھا ۔ جو لوگ بعد میں آئے کھڑے رہے ۔ اسی لاؤنج میں چند روز پہلے "کمیونلزم" پر پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کے زیر اہتمام ایک مجلس مذاکرہ میں شرکت کا موقع ملا تھا ۔ بہت کم لوگ تھے ۔ بمشکل ۴۰ ۔ ۵۰ آدمی ہوں گے ۔ جن میں اکثریت مقالہ نگاروں کی تھی ۔ آج کی تقریب میں تین چار سو کے قریب حاضرین تھے ۔ مجلس مذاکرہ کی مفصل کار روائی میں نے قلم بند کر رکھی ہے جو کسی دوسرے موقع پر پیش کی جائے گی ۔ ۷ بجے سے ایک مشاعرے کا اعلان کیا گیا مگر مجھے ایک جگہ اور جانا تھا اس لئے خواہش کے باوجود مشاعرے میں نہ جا سکا ۔

ساڑھے پانچ بجے سیمپوزیم سے فارغ ہو کر اشتیاق ظلی کے گھر آئے ۔ ان کے ساتھ آج شام سعید اکبر آبادی اور تقی امینی صاحب سے ملنے جانا تھا مگر دیر ہو جانے کی وجہ سے نہ جا سکے ۔ ظلی صاحب نے چائے پکوڑے اور بسکٹ سے تواضع کی ۔ تقریباً آٹھ بجے اٹھے ۔ برادرم علی اختر کی معیت اور رہنمائی میں صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز ایم اقبال انصاری کے دولتکدے پر حاضری دی ۔ انہوں نے لکھنوی طرز کے پر تکلف کھانے کھلائے ۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ وہ اور ان کی اھلیہ دونوں کا تعلق ارض نزاکت و نفاست لکھنو سے

ہے ۔ انہوں نے از راہ عنایت اپنے بعض مضامین اور انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے متعلق لٹریچر مطالعے کے لئے دیا ۔ علمی گفتگوئیں ہوتی رہیں ۔ میں نے فکر و نظر کے لئے مضامین کی فرمائش کی ۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ خود بھی بھیجیں گے اور اپنے رفقاء سے بھی بھجوائیں گے ۔

واپس آ رہے تھے ، راستے میں عضد الدین صاحب ساکن منگراواں کا گھر تھا ۔ وہ میرے نانہالی رشتہ دار ہوتے ہیں اور یونیورسٹی میں استاد ہیں ۔ ان سے مختصر ملاقات ہوئی ۔ دس بج چکے تھے ۔ گھر لوٹے نماز پڑھی اور سو گئے ۔

۲۹ فروری ۸۰ء

آج علی گڑھ میں میرے قیام کا آخری ورکنگ ڈے ہے ۔ کل یکم مارچ ۱۹۸۰ع کو رات کی گاڑی ,,دھلی بنارس میل،، سے روانگی ہے ۔ آج بھی سرسید روم میں کچھ وقت گذارا ۔ فرخ جلالی صاحب کی مدد سے بعض مفید باتیں ملیں ۔ معین الدین انصاری صاحب نے یہاں قیام اور لائبریری سے استفادہ کا ایک سرٹیفیکٹ دیا ۔ آفتاب صاحب سے حوالے کی چٹ واپس لی ۔ ان کو گوچ کی کتاب نہیں ملی ۔ شعبہ اردو سے عتیق صدیقی صاحب نے فکر و نظر علی گڑھ کا مکمل فائل عنایت کیا ۔ میں نے اس میں سے بعض پرچے منتخب کر لئے باقی کو علی اختر صاحب کے پاس چھوڑ دیا کہ بعد میں بھیج دیں گے ۔ اسلامک اسٹڈیز گیا ۔ اقبال انصاری صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ سورتی صاحب کے پاس ان کے دفتر گیا ۔ آج جمعہ ہے ، دیر ہو چکی تھی ، وہ جا چکے تھے ۔ ۱۲ بجے سی آئی ڈی آفس گیا ، ریذیڈنس پرمٹ لینا تھا ۔ یہ کام بھی ہو گیا ۔

یکم مارچ ۸۰ء

آج اعظم گڑھ کے لئے رات کے ۱۲ بجے دھلی بنارس ایکسپرس سے روانہ ھونا تھا ۔ صبح سویرے ھی اخلاق صاحب استاذ اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ آ گئے ۔ انھوں نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ دکھایا ۔ میں نے فکر و نظر کے لئے لکھنے کی فرمائش کی ۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے ۔ اقبال انصاری صاحب کے ساتھ رضا انصاری صاحب سے ان کے گھر جا کر ملاقات کی ۔ ان کا تعلق فرنگی محل سے بہت قریبی رہا ہے ۔ مولانا فراھی اور فرنگی محل کے تعلق کی نسبت ان سے گفتگو کی ۔ فکر و نظر کے لئے لکھنے کی دعوت دی ۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ مضامین بھیجیں گے ۔ ان کے ھاں سے نکلا تو احمد سورتی صاحب کے گھر الوداعی ملاقات کے لئے حاضری دی ۔ انھوں نے اپنے بھائی عبد الرحمن طاھر سورتی کے لئے خط اور بعض تحائف دیئے ۔ وھاں سے نکلا تو راستے میں فرخ جلالی مل گئے ، ان سے بھی علیک سلیک ھوئی ۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد اشتیاق پولیٹیکل سائنس کے ھاں گیا ۔ ان کی کتاب سے فراھی کے سلسلے میں ایک اقتباس نقل کیا اور حوالے لئے ۔ انھوں نے بڑی گرم جوشی اور تپاک سے الوداعی کلمات کہے ۔ اشتیاق ظلی کے پاس آیا ۔ سعید اکبر آبادی کی بیان کردہ ایک روایت جو مولانا فراھی اور انور شاہ صاحب کشمیری سے متعلق تھی تصدیق کی ، اس لئے کہ وہ بھی حاضر تھے وھاں ۔ ایک بجے گھر واپس آیا ۔ کھانا کھایا ، نماز پڑھی ، اور آرام کے لئے لیٹ گیا ۔ شام کو ٦ بجے کے قریب ڈاکٹر اقبال انصاری صاحب کے ساتھ عبداللطیف اعظمی صاحب گھر پر ملنے آئے ۔ بڑی کرم فرمائی کی انھوں نے ۔ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ھوتی رھیں ۔ اعظمی صاحب ان دنوں جامعہ ملیہ اور ذاکر انسٹی ٹیوٹ دھلی کے بیک وقت تین تین پرچوں کو سنبھالے ھوئے ھیں ۔ جامعہ آنے کی دعوت اتنے خلوص

سے دی کے بے اختیار جی چاھا کہ وھاں جایا جائے مگر پابندی کی زنجیر کہاں جانے دیتی ہے۔

جو مطلوبہ معلومات دوران قیام نہیں مل سکیں ان کی ایک فہرست یاران طریقت کے حوالہ کی کہ وہ میرے بعد بھی تلاش و تحقیق کا سلسلہ جاری رکھیں گے اور بذریعہ ڈاک نتائج سے مجھے آگاہ کریں گے۔

جزائر فیجی کے مسلمان

جزائر فیجی جو ۱۹۷۰ع میں آزاد ہو کر دولت مشترکہ کا رکن بنے آسٹریلیا اور شمالی امریکہ کے درمیان سمندری راستے پر واقع ہیں ۔ اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے ان جزائر کو بحر الکاہل کے رسل و رسائل میں بڑی اہمیت حاصل ہے جو اس خطے میں معاشی ترقی اور اسلام کی نشر و اشاعت میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے ۔ فیجی اور نیو کیلڈونیا کے علاوہ جہاں اسلام مہاجرین کے ساتھ آیا جنوبی بحر الکاہل میں ۱۳ ایسے چھوٹے آزاد جزیرے ہیں جہاں اسلام کو پھیلانے کی ضرورت ہے ۔ جنوبی بحر الکاہل کے ان جزائر میں اسلام کی برکت سے ان کے باشندوں کی قسمت بدل سکتی ہے ۔ فیجی کی کل آبادی چھ لاکھ (٦,٠٠٠٠٠) ہے جس میں سے نصف کے قریب اصلاً ہندوستانی ہیں جبکہ ۴۵ فیصدی سے زیادہ باشندے ملائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی پانچ فیصدی کا تعلق یورپی اور چینی اصل و نسل سے ہے ۔ یہاں کی سرکاری زبان انگریزی ہے ۔ اسلام ، ہندومت اور عیسائیت یہاں کے قابل ذکر مذاہب ہیں ۔

فیجی میں مسلمان بحیثیت مزدور شکر کے کارخانوں میں کام کرنے کے لئے ہندوستان سے برطانوی نوآبادیاتی دور میں لائے گئے ۔ ۱۹۷٦ کی مردم شماری کے مطابق اس وقت یہاں مسلمانوں کی تعداد ٦٠١٥٧ ہے ۔ مسلمانوں کی اکثریت چھوٹے کسانوں اور محنت کشوں پر مشتمل ہے اور روز افزوں افراط زر کی وجہ سے ان کا معاشی مستقبل یک گونہ تاریک نظر آتا ہے ۔ تعلیمی میدان میں پسماندگی نے ان کی معاشی اور سماجی حالت کو اور بھی زیادہ ابتر کر رکھا ہے ۔ اس کا نتیجہ ہے کہ یہاں کی مسلمان آبادی کو اپنی حالت سدھارنے میں دشواریوں کا سامنا ہے ۔

فیجی مسلم لیگ (پوسٹ بکس نمبر ۴۲۰ ـ SUVA ـ فیجی FIJI) جو ۱۹۲٦ میں قائم هوئی مسلمانوں کی واحد تنظیم ہے۔ اس کی شاخیں پورے ملک میں پھیلی هوئی هیں ـ یہ جماعت مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف ہے۔ یہ اسلام کی بنیاد پر قوم کی خدمت میں مصروف ہے۔ مسلم لیگ کو انگریزی، اُردو اور ملائی زبانوں میں ایسی کتابوں اور رسالوں کی ضرورت ہے جس سے مسلمانوں میں دینی علم کو فروغ هو اور اسلام کے ساتھ ان کا رشتہ مضبوط هو۔ ایسے مخلص کارکن جو جنوبی بحر الکاهل کے ممالک میں دعوت و ارشاد کا کام کرنے کے لئے تیار هوں فیجی مسلم لیگ سے مذکورہ بالا پتے پر رابطہ قائم کریں ـ

(ادارہ)

★ ★ ★ ★ ★

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے دو نسخے ارسال فرمائیے)

اقبال اور مسئلۂ تعلیم

مصنف — محمد احمد خان

ناشر — ڈاکٹر معز الدین ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی

طابع — سید اظہار الحسن رضوی

مطبع — مطبع عالیہ لاہور

صفحات — ٦٢٥ ـ قیمت نامعلوم

ملنے کا پتہ ـ اقبال اکیڈمی پاکستان ـ لاہور

جیسا کہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے کتاب کے بیش لفظ میں ذکر فرمایا ہے محمد احمد خان صاحب جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے ان لائق فرزندوں میں سے ہیں جن کے کارنامے شروع ہی سے مادر علمی کا نام روشن کرنے کا باعث ہوئے ـ ایک مصنف کی حیثیت سے ان کی شہرت کا باعث ان کی ضخیم کتاب ,,اقبال کا سیاسی کارنامہ،، ہے جو تقریباً بیس سال قبل شائع ہوئی تھی اور جس کا دوسرا ایڈیشن اقبال سینٹنری کے موقع پر اقبال اکیڈمی نے شائع کیا ـ اقبال اور اقبالیات محمد احمد خان صاحب کی دلچسپی کا خاص میدان ہے ـ اقبال ہی سے متعلق ایک اور کتاب ,,اقبال اور قوانین اسلام،، پچھلے دنوں زیر تصنیف تھی جو اب تک مکمل ہو چکی ہوگی ـ یہ کتاب پاکستان میں آج کل کے حالات کے پیش نظر یقیناً دلچسپی سے پڑھی جائے گی ـ

زیر تبصرہ کتاب اقبال اور مسئلہ تعلیم ۱۳ ابواب ، اشاریہ اور کتابیات پر مشتمل ہے ۔ چھ سو صفحے کی اس کتاب میں اقبال کے حوالے سے مسئلہ تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ جیسا کہ اس کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے اس کا موضوع مسئلہ تعلیم ہے ، نہ کہ فلسفہ تعلیم یا فن تعلیم ۔ کتاب کے آخری باب میں مصنف نے خود بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

میں جب کسی نئی کتاب کو ہاتھ میں لیتا ہوں، یوں ھی مطالعے کیلئے یا پڑھ کر تبصرہ لکھنے کے لئے تو سب سے پہلے میری نظر کتاب کے نام یا عنوان پر پڑتی ہے ، پڑتی ھی نہیں ٹھہرتی ہے ۔ اور میں یہ دیکھتا ہوں کہ کتاب کا عنوان درست اور با معنی ہے یا نہیں ۔ میرے نزدیک عنوان کتاب کو کتاب کے محتویات کا عکاس اور آئینہ دار ہونا چاہئے ۔ عنوان میں شامل ایک ایک لفظ اور ان الفاظ کی ترتیب بھی اپنا ایک مفہوم رکھتی ہے ۔ الفاظ کی تقدیم و تاخیر اور ترتیب میں فرق سے معنی بدل جاتے ہیں ، موضوع بدل جاتا ہے ، اور موضوع کے تقاضے بدل جاتے ہیں ۔ مثلاً پیش نظر کتاب ھی کو لے لیجئے ۔ "اقبال اور مسئلہ تعلیم" ، کی جگہ اگر "مسئلہ تعلیم اور اقبال" عنوان کر دیا جائے تو بادی النظر میں کوئی فرق نہیں محسوس کیا جائے گا مگر اھل نظر جانتے ھیں کہ دونوں میں بڑا فرق ہے ۔ یہ دونوں دو موضوع ھیں ۔ اور ان سے بحث کرنے میں ایک مصنف کو بالکل الگ الگ اپروچ اختیار کرنے کی ضرورت ہوگی ۔

دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے باریک اور نازک امتیازات کا بہت کم لوگ ادارک کر پاتے ھیں ۔ اقبال اور مسئلہ تعلیم چونکہ "سال اقبال" کی تقریب سے لکھی گئی ہے اور اسے شائع کرنے والے اقبال اکیڈمی پاکستان ھیں ، اس لئے قدرتی طور پر اس کا اصل موضوع اقبال کی ذات ہے ۔ یعنی اقبال کا مطالعہ اس حیثیت سے کہ انہوں نے تعلیم کے مسئلہ پر کیا کچھ کہا ہے اور

اس مسئلہ کو کس طرح حل کیا ہے۔ عنوان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کس کا مسئلہ تعلیم ، مسلم ملت کا ، ھندوستان کا ، دنیا کا ؟ مگر اقبال کے حوالہ سے سرزمین پاکستان میں مسئلہ تعلیم پر جو کتاب لکھی جائے گی وہ ظاھر ہے مسلمانوں ھی سے متعلق ہوگی ۔ اگر عنوان میں ,, ھمارا،، یا ,, مسلمانوں کا،، لفظ مذکور ہوتا تو عنوان ھی میں یہ بات طے ھو جاتی ۔

سرورق کتاب کا عنوان دیکھ کر ایک قاری کے ذھن میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا تعلیم کے مسئلے پر اقبال کے خیالات اس قابل ھوسکتے ھیں کہ انکو ایک کتاب کا موضوع بنایا جائے ؟ کیونکہ ان کی عام شہرت جن باتوں کی وجہ سے ہے ان میں تعلیم اتنی نمایاں نہیں ۔ سو کتاب کا پہلا باب ,,اقبال بحیثیت معلم و مفکر تعلیم،، گویا اس سوال کا جواب ہے۔ فاضل مصنف نے اس باب میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کو بے شک اس کا حق حاصل ہے کہ تعلیم کے بارے میں ان کے افکار و خیالات نہ صرف سنے جائیں بلکہ ان سے استفادہ بھی کیا جائے ۔ اقبال دس بارہ سال تک تعلیم کے پیشے سے وابستہ رھے ۔ انھوں نے تعلیم کے مسئلے پر غور کیا ہے اور اپنے خیالات پیش کئے ھیں ۔ اس باب کو کتاب میں صحیح مقام پر رکھا گیا ہے۔

دوسرا باب جس کا عنوان ہے ,,علوم جدیدہ اور ان کے بنیادی اصول ، اقبال کی نظر میں،، یہ باب ۴۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ مگر اس کے مباحث کا بڑا حصہ موضوع سے راست تعلق نہیں رکھتا ۔ بے شک ھماری تعلیم کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ آجکل کے علوم و فنون مسلمانوں کو حاصل کرنے چاھئیں یا نہیں اور اقبال کے افکار کی روشنی میں اس کا جواب اثبات ھی میں دیا جا سکتا ہے۔ مگر اس سلسلے میں اس بحث کی ہرگز ضرورت نہ تھی کہ یہ علوم اور ان کے بنیادی اصول کیا ھیں اور ان کا تعلق یونان سے جوڑا جائے یا عرب اور

مسلمانوں سے ۔ یہ ایک الگ بحث اور الگ موضوع ہے۔ موضوع زیر بحث کے تحت اس کتاب میں اس کے متعلق اس طول کلام کی نہ ضرورت تھی نہ گنجائش ۔ اسی طرح کے غیر ضروری ضمنی مباحث کو جگہ دینے سے کتاب کا حجم اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کا پڑھنا بار معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد کے چند اهم ابواب یہ هیں ۔ تعلیم جدید پر اقبال کی تنقید ، مقاصد تعلیم اقبال کے نقطۂ نظر سے ، سیکولر تعلیم اور اقبال ، تعلیم نسواں ، صنعتی تعلیم ابتدائی تعلیم ،وغیرہ ۔ ان ابواب کا تعلق موضوع کتاب سے براہ راست واضح ہے۔ مگر بعض ابواب کا تعلق محل نظر ہے۔ مثلاً اقبال کا نظریہ امتزاج علم و عشق ، سیکولر تعلیم اور اسلامی قومیت ، نام نہاد اسلامی ریسرچ پر اقبال کی تنقید ، اسلامی ریسرچ اقبال کے نقطۂ نظر سے ۔ ان ابواب کا تعلق فلسفہ تعلیم یا فن تعلیم سے تو جوڑا جا سکتا ہے مگر مسئلہ تعلیم کے ذیل میں ان ابواب کے عنوانات اور مشتمل مباحث کا ذکر وضع الشی فی غیر محلہ کے حکم میں آتا ہے۔ ان ابواب نے بھی کتاب کے حجم کو گراں بار حد تک بڑھانے میں مدد دی ہے۔

کتاب کا آخری باب جس کا عنوان ہے "ام المسائل" ، دقت نظر سے دیکھا جائے تو موضوع کتاب سے براہ راست اور بھر پور تعلق صرف اسی کے حصے میں آتا ہے۔ منطقی ترتیب کی رو سے اس باب کو کتاب کے آخر میں رکھنے کی بجائے کتاب کے شروع میں رکھنا چاھیے تھا ۔ اس باب کو پڑھے بغیر کچھ نہیں پتا چلتا کہ مسئلہ کیا ہے کس کا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلے کا حل مصنف کے الفاظ میں یہ ہے "کہ نظام تعلیم کی دو رنگی کو ختم کیا جائے اور ایک نیا تعلیمی راستہ نکالا جائے " ۔ لیکن لطف یہ ہے کہ مسئلے اور اس کے حل کا ذکر تو کتاب کے آخری باب اور آخری صفحات میں ہے

مگر اس کی نسبت اقبال کے خیالات کا اس باب میں کوئی ذکر نہیں ۔ اس باب کے ۱۳ صفحات میں صرف یہ چند الفاظ ہی ہیں جن کا تعلق اقبال سے ہے۔ "اقبال نے اسی راستے کی نشاندھی کی ہے"۔ بہر حال کتاب کا یہ واحد باب ہے جس کو قاری دلچسپی سے پڑھ ڈالتا ہے اور پڑھنے میں الجھن محسوس نہیں ہوتی ۔

کتاب کے موضوع اور دائرہ کار کا اندازہ تو کم و بیش اس کے عنوان سے ہو جاتا ہے مگر کتاب لکھنے کی غرض و غایت جس کا ذکر مصنف کو کتاب شروع کرنے سے پہلے حرف آغاز پیش لفظ یا مقدمہ وغیرہ قسم کی کوئی چیز لکھ کر کر دینا چاہئے تھا ، عقدہ لا ینحل ہی رہتا ہے ۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب کا لکھا ہوا مختصر سا پیش لفظ شروع میں موجود ہے مگر وہ بالکل ایک رسمی سی تحریر ہے۔ اس میں انہیں اس قسم کا کوئی سوال اٹھانے یا اس کی نسبت کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی ۔ یہ کام مصنف کا تھا کہ وہ ابتداء ہی میں کتاب کے موضوع ، مقصد اور مباحث کا اجمالاً تعارف کرا دیتے ۔

موضوع سے بحث میں مصنف کا انداز ناقدانہ نہیں بلکہ مادحانہ اور حامدانہ ہے ۔

مباحث اور مطالب میں تجزیہ کی کمی کا احساس ہوتا ہے ۔

تبصرے بے لاگ نہیں ۔

انداز بیانیہ ہے اور بیانات سطحی اور سرسری ہیں ۔

طول کلام زیادہ ہے ۔

اسلوب بیان شرح نویسی کا ہے ۔ کتاب کی اسکیم اور ابواب کی ترتیب

بہت اچھی نہیں ۔ ربط و تسلسل کا فقدان ہے ۔ تطویل لاطائل اکتا دینے والی ہے۔
یہ کتاب اطناب ممل کی بہترین مثال ہے ۔

اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ طالب علموں کے لئے جس طرح شرحیں
لکھتے ھیں بیشتر اسی اسلوب سے کتاب کے مباحث تحریر کئے گئے ھیں ۔ کوئی
باشعور واقعی معنوں میں بڑھا لکھا آدمی اس کتاب کو دلچسپی اور انہماک کے
ساتھ نہیں پڑھ سکتا ۔ کتاب کو پڑھنے کے لئے طبیعت پر جبر کرنا پڑتا ہے ۔
ترجموں اور شرحوں نے کتاب کے حجم کو بڑھانے میں مدد دی ہے ۔ مگر خود کتاب
اتنی بوجھل ہو گئی ہے کہ اسے لائبریری میں الماری کی زینت تو بنایا جا سکتا
ہے پڑھا نہیں جا سکتا ۔ شرح اور ترجمہ کی بھر مار کے بعد گائیڈ اور
خلاصہ میں پھر انہی باتوں کو بڑھنے کے لئے بڑے صبر و ضبط کی ضرورت ہوتی
ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے کتاب کے حجم کو بڑھانے کی ارادی
کوشش کی ہے ۔ بے ڈھب انداز سے مباحث کی تکرار گراں گزرتی ہے ۔

صفحہ ۵۹۱ پر ''کارے دارد ہے'' ۔ ''کارے دارد'' کافی ہے ۔ ''ہے'' کی
یہاں ضرورت نہیں ہے ۔ ھر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے ۔ صفحہ ۵۹۳ پر ''عملی
و فکری'' ''علمی و فکری'' ہونا چاھئے ۔ غالباً یہ پروف کی غلطی ہے ۔ صفحہ
۵۹۶ پر غالب کا ایک شعر نقل کیا ہے ۔

اسلام مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پہلے مصرعے میں اسلام کی جگہہ ایماں نون غنہ کے ساتھ ہے ۔ اسلام کے
ساتھ مصرعہ وزن سے گر جاتا ہے ۔

اس قسم کی اسقام سے کتاب کا علمی اور تحقیقی معیار مجروح ہوتا ہے

"ارباب مقتدر" ، صفحہ اول پر پیش لفظ میں "ارباب اقتدار" کی جگہہ "ارباب مقتدر" چھپا ہے۔ غالب گمان ہے کہ یہ پروف کی غلطی ہے۔ پیش لفظ مصنف کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ پھر بھی ذمہ داری اسی کی ہے۔

صفحہ ۸ پر سطر ۷ میں "مکاتیب و مدارس" ہے، "مکاتیب" کی بجائے "مکاتب" ہونا چاھئے۔ مکاتیب مکتوب کی جمع ہے، مکتب کی جمع مکاتب آتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی طباعت اور پروف کی غلطی ہو۔

محمد احمد خان صاحب کا اصرار تھا کہ کتاب کو بالاستیعاب پڑھ کر بےلاگ رائےکا اظہار کیا جائے۔ سو میں نے اپنی حد تک ان کے ارشاد کی تعمیل میں کاوش کی۔ میں نے سطور بالا میں دیانت داری کے ساتھ کتاب کی نسبت اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ یہ وہ تاثرات ھیں جو کتاب پڑھنے کے بعد پیدا ہوئے لیکن یہ کل صداقت نہیں ہے۔ ان تاثرات کے علاوہ کچھ اور بھی تاثرات ھیں جن کو ذکر نہ کیا گیا تو بات ادھوری رہ جائے گی اور تبصرہ کا توازن متاثر ہو گا۔ اس ضمن میں سب سے پہلی بات جس کا ذکر کیا جا سکتا ہے مصنف کی وسعت مطالعہ ہے۔ انہوں نے اقبال اور اقبالیات ھی کا مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ اور بھی بہت کچھ پڑھا ہے جس میں مشرقی علوم اور مغربی علوم دونوں شامل ھیں۔ دوسری اھم بات سلامت طبع کے ساتھ صحت فکر اور سداد نظر ہے جس کی فی زماننا بہت کمی ہے۔ مصنف کا نقطۂ نظر ملی شعور اور دینی حس سے بہرہ ور ایک مسلمان کا نقطہ نظر ہے۔ اس لئے ان کے اخذ کردہ نتائج ھمارے قومی عزائم اور امنگوں سے متصادم نہیں ہم آھنگ ھیں۔ تیسری بات یہ کہ مواد کی فراھمی میں انہوں نے انتہائی محنت اور کاوش سے کام لیا ہے جس کے باعث ان کی کتاب معلومات کا گنجینہ بن گئی ہے۔ چوتھی چیز زبان و بیان پر قدرت ہے۔ صحت کے ساتھ سلیس اور رواں اردو لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔

اس لحـــاظ سے بھی مصنف کی یہ کاوش لائق تحسین ہے۔ زوال علم و عرفان کے اس دور میں جبکہ بہت کم کوئی اچھی کتاب دیکھنے میں آتی ہے۔ محمد احمد خان صاحب کی یہ کوشش بعض خامیوں سے قطع نظر بحثیت مجموعی قابل قدر ہے ، بالخصوص اقبال پر شائع ہونے والی کتابوں میں اس کا درجہ کمتر نہیں ثابت ہوگا ۔

(شرف الدین اصلاحی)

★ ★ ★ ★

غلط نامہ

فکر و نظر .... ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ

صفحہ نمبر	سطر نمبر	غلط	صحیح
۷	۴	بھسی	بھشتی
۷	۶	زمرد میں	زمردیں
۷	۸	نگیتے	نگینے
۷	۱۴	تاریخ	تاریخی
۸	۱۱	آواخر	اواخر
۱۰	۴	چکا تھا ہے	چکا ہے
۱۰	۱۴	تک یونان کے	تک اھل یونان کے
۱۱	۲	لکا	لگا
۱۱	۱۹	ملا	مولانا
۱۲	۱۵	بدیع الدین	بدیع الدین منعمی
۱۲	۱۸	صوفی	صرفی
۱۳	۱۴	عروج کو	اپنے عروج کو
۱۴	آخری سطر	ودھا	دوھا
۱۵	۶	مہارت نامہ	مہارت تامہ

١٦	٢١	طالیہ	طالیانہ
١٧	٥	شیرزای	شیرازی
١٧	١۴	سنہری	سنہرے
١٧	١٥	ایک آگے قدم	ایک قدم آگے ، ایک قدم
١٨	١۴	ذھین	ذھین
٢٠	١٥	کتب اخلاق	کئی کتب اخلاق
٢٣		٣٣٨٠	٣٨٠
٢٣	٥	التعریف	التعرف
٢۴	٥	دلپذیز	دلپذیر
٢۴	١٥	دلپذیز	دلپذیر
٢٥	١٩	صدی هجری	صدی عیسوی
٢٩	١٢	یماند	بماند
٣٢	١٨	مکار مالاخلاق	مکارم الاخلاق
٣٣	١١	جعفر محبوب	جعفر محجوب
٣٣	١٩	جہاں نما	جام جہاں نما
٣٧	۴	ابن مقفح	ابن مقفع
٣٧	٦	بخارا کی	بخارائی
٣٨	١٠	بھٹکتے	بھڑکتے
٥٧	١٧	تضیع	تضییع
٥٨	١	سمط اللآئی	سمط اللآلی

****

فکر و نظر

علمی و دینی مجلہ

جمادی الآخرہ ۱۴۰۱ھ

ماہنامہ

فکر و نظر

اسلام آباد

جلد ۔ ۱۸ | جمادی الآخرہ ۱۴۰۱ھ ☐ اپریل ۱۹۸۱ء | شمارہ ۔ ۱۱

فہرست

مجلس ادارت

نظـــــــــرات

روزنامہ مشرق لاہور کے جمعہ ایڈیشن مشرق میگزین (مورخہ ٦ ـ فروری ١٩٨١ء) میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے "افکار و حوادث" کے تحت ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد پر ایک شذرہ لکھا ہے جس میں انہوں نے بعض ایسے نکات کی طرف اشارہ کیا ہے جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اس شذرے کا پہلا ہی فقرہ ہے ، "مختلف وزارتوں کے درمیان بیڈمنٹن کی چڑیا بننے کے بعد . . . . . . " ـ

ڈاکٹر صاحب نے ادارہ کی اب تک کی تاریخ کو اس ایک فقرے میں جس طرح سمیٹ کر بیان کر دیا ہے ہر وہ شخص اس کی تائید کرے گا جو ادارے کو دور یا نزدیک سے جانتا ہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی کا ایک جز بننے کے بعد جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے بلا شبہ "اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آخر کار اپنے صحیح مقام پر پہنچ گیا ہے"۔ اور یہی وجہ ہے کہ ادارے کے سینئر اور سنجیدہ اسکالروں نے بحیثیت مجموعی اس کا خیر مقدم کیا ہے اور اس خوشگوار اتفاقی حادثے پر اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ مگر ماضی کے تجربات نے ادارے کے بہی خواہوں کو اتنا قنوطیت پسند بنا دیا ہے کہ ان کے خیال میں اس کا حال خوش آئند ہونے کے باوجود مستقبل کے اندیشوں سے خالی نہیں۔ بقول شاعر

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیــــــاد کی نگاہ ســـوئے آشیاں نہیں

اس لئے ادارے سے ہمدردی رکھنے والوں کو چاہیئے کہ وہ ایمن نشیں نہ ہوں اور ادارے کو اس کی منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے مسلسل سرگرم

عمل رھیں۔ خدا نکردہ اس سے وہ مقام چھن جائے جو ۲۱ سال کی طویل کس مپرسی کے بعد ملا ہے۔

چھپا کــر آستیں میں بجلیاں رکھی ھیں گــردوں نے
عــــنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانــوں میں

ممکن ہے کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اس طرح ادارے کی انفرادیت متاثر ہوگی اور اس کا مستقل بالذات وجود باقی نہیں رہے گا۔ لیکن یہ خیال اس لئے صحیح نہیں ہے کہ جہاں تک ادارے کے نیچر آف ورک کا تعلق ہے وہ بدستور رہے گا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔اس میں کسے شبہہ ہو سکتا ہے کہ ایک باقاعدہ یونیورسٹی کا حصہ بننے کے بعد جہاں ادارے کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا ادارے کے لئے ترقی کی راہیں بھی کھلیں گی۔ ع ۔ قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

کے بمصداق اھل ادارہ اب کہہ سکتے ھیں کہ

قطــرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
هــــم کو منظور تنک ظرفی منصــور نہیں

ڈاکٹر صاحب نے اپنے جائزے میں ادارے کو اسلامی یونیورسٹی کے قلب کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ اسلامی یونیورسٹی کے حوالہ سے ادارے کا ذکر کرتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ادارے کو پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کے قلب اور دماغ (Nerve Centre) کا درجہ دینے کے لئے کبھی آرڈیننس بھی تیار کیا گیا تھا۔ ادارہ جب تک پاکستان کی ہر یونیورسٹی میں قلب بن کر نہیں دھڑکتا اور دماغ

کی طرح مرکز فکر نہیں بنتا، پاکستان اپنی منزل سے ھمکنار نہیں ھو سکتا۔ اس لئے کہ پاکستان کی اساس اسلام ہے اور اسلام کو عصر حاضر کے جدید ماحول میں ایک لائحۂ عمل یعنی لائق نفاذ نظام حیات کی حیثیت سے پیش کرنے کے لئے ھی ادارے کو وجود میں لایا گیا تھا اور یہ ذمہ داری شروع ھی سے ادارے کے اولیات میں ہے۔

سوال یہ ہے کہ اسلام کو مسلم ملت کو پاکستان کو دنیائے اسلام کو اس قسم کے ادارے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ جزئیات اور تفصیلات میں اختلاف رائے ھو سکتا ہے مگر اس بنیادی نکتے سے کوئی بھی ذی ھوش باشعور فرد ملت انکار نہیں کر سکتا کہ ایک ایسا ادارہ ھماری تاریخی ضرورت ہے جو علم دین اور حالات حاضرہ سے اگاھی کے بعد موجودہ مسائل کا حل تجویز کرے۔ مسلمانوں کو اسلام کے آفاقی اور ابدی اصولوں کے سایے میں وقت کے ساتھ چلنا ہے تو انہیں اپنے موجودہ علوم و فنون افکار و تصورات اعمال و وظائف کی تجدید اور صیقل گری کا عمل جاری رکھنے کے لئے ایک اعلی علیین درجے حیثیت اور مرتبے کے حامل ادارے کو نہ صرف قائم اور باقی رکھنا ھوگا بلکہ اپنے علمی اور فکری سفر کی زمام کار اس کے ھاتھ میں دینی ھوگی۔

مادی علوم اور جدید سائنس کی علمبردار اقوام نے اپنے سائنسی اداروں اور ان کے حاملین اور کار پردازوں کو کیا درجہ دے رکھا ہے۔ یہ کوئی سربستہ راز نہیں۔ چین جیسے ملک میں جہاں طبقاتی امتیاز کو کفر و شرک کا درجہ دیا جاتا ہے وھاں دیکھا جا سکتا ہے کہ اس قوم نے اپنے سائنسدانوں کو ھر قسم کی پابندیوں سے مستثنی قرار دے کر طرح طرح کے امتیازات سے نوازا ہے تاکہ وہ آزاد رہ کر ملک و قوم کے لئے مادی ترقی کی راھیں ھموار کر سکیں۔ ھم مسلمان جن روحانی اور اخلاقی افکار اور اقدار کے علمبردار ھیں ان کے فروغ کے لئے ھم نے اب تک کیا کوششیں کی ھیں اس کا ذکر نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ بات اس طرز

کے ادارے کی ضرورت اہمیت اور وجہ جواز کی تھی۔ اس ضمن میں فقط یہ نکتہ ذہن میں رکھیں تو بات کو سمجھنا آسان ہو جائے کہ آج بہت سے سیکولر ممالک اور غیر مسلم اقوام بھی اس طرز کے "نام کے سہی" اداروں کے قیام کو ایک ناگزیر ضرورت سمجھتی ہیں۔

بات صرف اپیروچ کی ہے۔ اس بارۂ خاص میں غیر مسلم ممالک کی اپیروچ منفیانہ ہو سکتی ہے۔ ہم مسلمان ہیں ہمارا رویہ مثبت اور مخلصانہ ہوگا۔ غیر مسلم ممالک تو یہ نکتہ پا جائیں کہ اپنے منفی مقاصد کے لئے اسلامی ادارے قائم کریں ہم مسلمان یہ نکتہ نہ پا سکیں کہ اپنے مثبت مقاصد کے لئے ایسے ادارے قائم کریں اور ان سے کام لیں۔ پاکستان میں قائم کرنے والوں نے اس طرز کا ادارہ قائم کر دیا اور انہوں نے ایسا کرکے ایک اچھے کام کی ابتداء کی۔ مگر اپنی زندگی کے بعض ادوار میں، ہمیشہ نہیں، کسی نہ کسی وجہ سے یہ ادارہ اپنے راستے پر یکسوئی کے ساتھ آگے نہ بڑھ سکا۔ کسی چیز کو اگر اس کام کے لئے استعمال ہونے کا موقع نہ مل سکے جس کے لئے وہ بنائی گئی ہے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ادارہ سالہا سال سے چھینا جھپٹی کا نشانہ بنا رہا ہے۔ اور اگر اس صورت حال میں اس کی صحیح نشو و نما نہ ہو سکی تو قصور کس کا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے شذرے میں ادارے کو یونیورسٹی کی طرح خود مختار حیثیت دینے کی سفارش کی ہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی کے قیام اور اس میں ادارے کے انضمام کے بعد قانونی اعتبار سے اسے یہ حیثیت حاصل ہو چکی ہے جو کسی نہ کسی درجے میں پہلے بھی حاصل تھی۔ مگر اس کے باوجود عملاً ادارہ اپنے اکیس سالہ عرصۂ حیات میں جس طرح بے یقینی، عدم استحکام اور کسمپرسی کا شکار ہو کر بازیچہ اطفال بنا رہا ہے اس کا ذکر خود صاحب موصوف نے بڑے بلیغ انداز میں اپنے شذرے کے پہلے ہی فقرے میں شٹل کاک کے

لفظ سے کر دیا ہے۔ اگر یہی صورت حال آئندہ بھی برقرار رہی تو پھر لامحالہ یہی کہنا پڑے گا۔

خزاں کہتے ہیں کس کو فصل گل ہو کوئی موسم ہو
وہــــی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بــال و پــر کا ہے

لیکن امید ہے کہ اب ادارے کو یہ صورت حال پیش نہیں آئے گی۔ ادارہ اپنے صحیح مقام پر پہنچ گیا ہے تو اب اسے اس مقام سے ہٹانا ترقی معکوس کے مترادف ہوگا۔ اس کی باگ ڈور وقت کے مضبوط ہاتھوں میں ہے جو اس کی حفاظت بوجہ احسن کر سکیں گے۔

(مــــــدیــــــر)

* * * * * * *

کتابخانہء مرعشی ، قُم
میں
برّصغیر کے مخطوطات

سید عارف نوشاهی

قُم (ایران) نے اب سیاسی اهمیت حاصل کی ہے مگر یہ همیشہ سے اهل تشیّع کا روحانی اور علمی مرکز و مرجع رها ہے۔ حال هی میں کتابخانہ گنج بخش ، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان راولپنڈی کو وهاں سے چھ جلدوں میں آیت الله نجفی مرعشی کے کتب خانہ کے مخطوطات کی فهرست موصول هوئی ہے۔

قم میں اس عظیم کتب خانہ کا وجود حضرت آیت الله العظمی سید شهاب الدین مرعشی نجفی کی مسلسل کوششوں کا مرهون منت ہے۔ اس میں موجود تمام مخطوطات (بجز چند) خود آیت الله مرعشی نے اکٹھے کئے اور بعد میں انهیں کتب خانہ کی تحویل میں دے دیا جو اب ایک پبلک لائبریری کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ لائبریری عربی ، فارسی ، ترکی اور اردو زبان کے مخطوطات کا مخزن ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ان میں بڑا تنّوع پایا جاتا ہے۔ البتہ اسلامی علوم پر کتب کی تعداد زیادہ ہے۔

فہرست نسخہ ہائے خطی

کتب خانہ مذکورہ کے افتتاح کے موقع پر ہی تہیہ کر لیا گیا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہوا مخطوطات کی فہرست شائع کر دی جائے گی ـ منصوبے کے مطابق ہر جلد میں چار سو قلمی نسخے ہوں گے اور اس طرح یہ منصوبہ کم و بیش بیس جلدوں میں مکمل ہوگا ـ فی الوقت اس سلسلے کی پہلی چھ جلدیں ہمارے پیش نظر ہیں جن کے مؤلف جناب سید احمد حسینی اشکوری ہیں ـ موصوف کا شمار ایران کے محققین اور علمائے دین میں ہوتا ہے ـ انہوں نے زیر نظر فہرست جناب سید محمود مرعشی کی نگرانی میں مرتب کی ہے جو سید شہاب الدین مرعشی کے صاحبزادے ہیں اور بظاہر زیر بحث کتب خانہ کے سرپرست بھی ـ

فارسی زبان میں لکھی گئی اس فہرست کی ہر جلد میں چار سو مخطوطات (بشمول مجموعہ ہا) کا تعارف درج کیا گیا ہے ـ جنہیں موضوعی، لسانی یا حروف تہجی کی ترتیب کی بجائے، مخطوطہ نمبر کے لحاظ سے شامل فہرست کیا گیا ہے ـ ان چھ جلدوں میں علی الترتیب ۱ سے ۲۴۰۰ نمبر تک کے عربی، فارسی، ترکی اور اردو مخطوطات کی فہرست موجود ہے ـ ان مجلدات کا مجمل تعارف پیش خدمت ہے :ـ

جلد نمبر	تعداد صفحات	سال طباعت	شمارۂ مخطوطات
۱	۴۳۱	۱۳۵۴ خ / ۱۳۹۵ ق	۱ تا ۴۰۰
۲	۴۲۱	مذکور نہیں	۴۰۱ تا ۸۰۰
۳	۳۸۴	درج نہیں	۸۰۱ تا ۱۲۰۰
۴	۴۱۴	ندارد	۱۲۰۱ تا ۱۶۰۰
۵	۳۸۸	۱۳۵۵ خ / ۱۳۹۶ ق	۱۶۰۱ تا ۲۰۰۰

٦　　۳۹۸　　۱۳۵۷ خ / ۱۳۹۸ ق　　۲۰۰۱ تا ۲۳۰۰

هر جلد کے آخر میں مندرجہ مخطوطات کے اہم صفحات کے عکس بھی شائع کر دئیے گئے ہیں ۔

کتب خانۂ مرعشی میں برّصغیر پاک و ہند کے مصنفین کی یا اس علاقے سے متعلق کتب بھی موجود ہیں اور زیر نظر مجلدات فہرست میں جا بجا ان کا ذکر ملتا ہے۔ قُم میں ان کتب کی موجودگی ایران اور شبہ قارہ کے درمیان علمی تعلقات اور مبادلات کی گواہی تو دیتی ہی ہے یہ امر اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ ہمارے ادب اور افکار کا دائرۂ اثر اس کے مولد تک ہی محدود نہیں بلکہ اطراف و اکناف کے ممالک کو بھی محیط تھا ۔

ہم نے یہاں فہرست کتب خانہء مرعشی کی چھ جلدوں میں مذکور متفرق مخطوطات میں سے ان ایک سو تین کتابوں کا استخراج کیا ہے جن کے مصنف ہندی الاصل ہیں یا باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے اور یہاں کی علم پرور اور پُرامن فضا میں تصنیف و تألیف کا کام کیا ۔

زیر نظر مقالہ میں ہمارا اصل مقصد کتاب (تصنیف) کو متعارف کرانا نہیں ہے بلکہ اس کے مخطوطہ کی نشاندھی کرنا ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر کتب متداول اور متعارف ہیں ۔ تاہم اس فہرست میں بعض نادر اور کمیاب کتب بھی مل جاتی ہیں جن کا تفصیلی ذکر ناگزیر تھا ۔ اس سلسلے میں ہم بھگوان داس ہندی کے اب تک مفقود تذکرۂ شعرا «حدیقۂ ہندی» ، محمد حافظی ظفرآبادی کی رمل پر آٹھویں صدی ہجری کی تصنیف «نتیجة الرمل» ، شمس الدین بن سید نسیب احمد کا مرتّبہ تذکرہ «عنایات الہیہ» اور موجود مداری کا «دیوان اشعار» مع مقدمہ کا نام لیں گے ۔ ہم فارسی شعراء کے تذکروں پر کام کرنے والے محققین بالخصوص جناب سید شاہ محمد عطاء الرحمن عطا کاکوی کو «حدیقۂ ہندی» کی طرف متوجہ کریں گے کہ وہ اس کا عکس یا مائیکرو فلم

حاصل کرکے اس پر کام کریں ۔ اس طرح ھندوستانی اور پاکستانی شعراء کے احوال و آثار کا ایک خالی باب پُر ھو سکے گا ۔

ھماری قارئین سے درخواست ہے کہ وہ یہ مقالہ صرف اس نقطۂ نظر سے نڑھیں (اور فخر و مباہات کا احساس بھی کریں) کہ ھم قُم میں محفوظ اپنے اسلاف کی کتابوں کے قلمی نسخوں سے متعارف ھو رھے ھیں ۔

(۱) آزاد بلگرامی ، میر غلام علی (۱۱۱۶ھ ـ ۱۲۰۰ھ)

۱ ـ شجرۂ طیبہ (تاریخ و تذکرہ ، فارسی)

سادات کی تفضیل اور مؤلف کے آبا و اجداد کے حالات پر مشتمل ہے۔

مخطوطہ نمبر ۳۲۸ : نستعلیق ، ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ ، ۲۰۰ ص ، پہلے ورق بر راجہ سید محمد مہدی کے کتب خانہ اور آخری صفحہ پر «فقیر آزاد» کی دو بیضوی مہریں موجود ھیں ـ یہ قلمی نسخہ سید علی رضا حسنی حسینی ریحان نے ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ میں آیت اللہ مرعشی کو پیش کیا ـ اس مخطوطہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں ایک تکملہ ہے جو سید نظام الدین کے خاندان کے حالات پر مبنی ہے۔

(حوالہ ـ ج ۲ ص ۳۲)

۲ ـ غزلان الہند (بلاغت ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۳۹۱ : نستعلیق ، امتیاز علی بن شیخ بھوتی (کذا) بلگرامی ، ۱۲۴۷ھ ، ۱۳۶ ص ـ پہلے ورق پر «کتابخانہ سید علی اصغر بلگرامی» اور «ابن علی» کی بیضوی مہر ثبت ہے ، حاشیے پر تصحیحات موجود ھیں ـ

(حوالہ ـ ج ۱ ص ۳۰۸ ـ ۳۰۹)

۳ ـ مرآت الجمال (مثنوی ، فارسی)

چلر سو اشعار پر مشتمل صوفیانہ مثنوی ہے ـ

مخطوطہ نمبر ۲۰۸٦ : نستعلیق ، سید محمود بن سید احمد ساکن شمس آباد ، ۱۱٦۵ھ ۵۲ ص ـ کرم خوردہ (بحوالہ ج ٦ ص ۹۸)

(۲) آگاہ مدراسی ، محمد باقر (۱۱۵۸ ـ ۱۲۲۰ھ)

۱ ـ تلک عشرۃ کاملہ ھندیہ (شعر ، عربی)

ابتدا میں نعت النبی میں دس قصائد ھیں ـ آخر میں سات متفرق قصیدے ھیں ـ

مخطوطہ نمبر ۳۲۲ : نسخ ، ۱۱۷۴ھ ، ۱٦۸ ص ، پہلے ورق پر ایک بڑی مربع مہر ہے «قاضی القضاۃ افضل العلماء محمد ارتضا علی خان بہادر» .

(حوالہ ـ ج ۲ ص ۲٦ ـ ۲۷)

(۳) ابو الحسن نقشبندی سندھی مدنی (۱۲ صدی ھجری)

مخطوطہ نمبر ۱۳۹۰ میں مندرجہ ذیل رسائل موجود ھیں ـ

۱ ـ انباء الانبیاء فی حیاۃ الانبیاء ، ص ۱۳ ـ ۳۷ (عقائد ، عربی)

اس رسالہ میں یہ بحث کی گئی ہے کہ شہداء اور انبیاء ظاھری موت کے باوجود معنوی طور پر ھمیشہ زندہ رھتے ھیں ـ

۲ ـ حقیقۃ الایمان ،ص ۳۸ ـ ۴۳ (عقائد ، عربی)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فاسق مومن نہیں ھوتا اور کافروں کی طرح فساق بھی ھمیشہ دوزخ میں رھیں گے ـ اس رسالہ میں عمل کو ایمان سے الگ شمار کیا گیا ہے اور مومنوں کے مختلف درجات بیان کئے گئے ھیں ـ

۳ ـ تہذیب البیان فی ترتیب القرآن ، ص ۱۹۱ ـ ۱۹۳ (قرآنی علوم ، عربی)

نزول قرآن ، تدوین و تواتر قرآن کے بارے میں یہ رسالہ ۱۱۷٦ھ میں تالیف ھوا ـ

۴ ـ اجوبۃ مسائل ست ، ص ۱۹۷ ـ ۱۹۸ (قرآنی علوم ، عربی)

قرآن اور فقہ سے متعلق ان چھ سوالات کے جوابات ھیں جو بعض طالب علموں نے مؤلف سے کئے۔

نسخ ، ابراھیم بن محمد ، حاشیہ بر تصحیحات.

(حوالہ ۔ ج ۳ ص ۲۸۷ ۔ ۲۹۷).

(۴) **احمد سرھندی مجدد الف ثانی (۹۷۱ھ ۔ ۱۰۳۴ھ)**

۱ ۔ **مکتوبات** (تصوف ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۱۳۸۴ : نستعلیق ، پہلے صفحہ بر مالک (جس کا نام درج نہیں) نے رجب ۱۱۳۱ھ کی تاریخ لکھی ہے۔ حواشی بر تصحیحات ، ۳۸۴ ص ۔ زیر نظر مخطوطہ مکتوبات کا تیسرا دفتر ہے۔

(حوالہ ج ۳ ص ۲۷۵ ۔ ۲۸۲)

(۵) **احمد بن عبدالرحیم صفی پوری**

۱ ۔ **شرح دیوان عرفی شیرازی** (شعر ، فارسی)

عرفی کے ۳۸ قصائد کی مختصر شرح ہے جو رجب ۱۲۵۴ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ۔

مخطوطہ نمبر ۱۹۳۰ : نستعلیق ، محمد عبد الرحمن بن محمد صلاح الدین ھاروی ، دوشنبہ ۲٦ شعبان ۱۳۱٦ھ ، ۳۷٦ ص ۔ کرم خوردہ.

(حوالہ ۔ ج ۵ ص ۳۰٦)

(٦) **ارتضا علی خان گوپاموی (۱۱۹۸ ۔ ۱۲۷۰ھ)**

مخطوطہ نمبر ۳۱٦ میں ان کے مندرجہ ذیل رسائل ھیں ۔

۱ ۔ **تفسیر چهل کاف** ،ص ٦۹ ۔ ۸۳ (دعا ، فارسی)

۲ ۔ **تنبیہ العقول فی اثبات اسلام آباء الرسول** ،ص ۱۹ ۔ ۳٦ (عقائد، فارسی)

آنحضرت ﷺ کے آبا و اجداد کے صاحب ایمان ہونے کے اثبات میں ہے۔

نسخ ، احمد علی خان بن انور علی خان بہادر ، ۲۰ ذیقعد ۱۲۳۱ھ ـ
(حوالہ ـ ج ۲ ص ۱٦ ـ ۲۱)

(۷) امان اللہ حسینی امانی (م ۱۰۴۷ھ)

۱ ـ رقعات

مخطوطہ نمبر ۲۰۹۹ : نستعلیق . شکستہ ، ۱۷ صفر ۱۲۳۲ھ ، بحکم غلام حیدر خان بن غلام حسین خان صاحب بہادر ، ۸۳ ص.
(حوالہ ـ ج ٦ ص ۱۱۳ «ترسل» کے نام سے درج ہے).

(۸) بھگوان داس ہندی (۱۱٦۳ھ ـ زندہ ۱۲۲۰ھ).

۱ ـ حدیقۂ ہندی (تذکرہ فارسی)

بھگوان داس کے ایک دوسرے تذکرہ «سفینۂ ہندی » (تالیف ۱۲۲۰ھ) کے مرتّب سیّد شاہ محمد عطاء الرحمن عطا کاکوی اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں ـ

« بھگوان داس یک ضخیم تذکرہ سعرائے فارسی مشتمل بر احوال شعرائے ماضی و حال در ۱۲۰۰ھ بنام حدیقۂ ہندی ہم تالیف کردہ بود ـ آں ہم ہنوز مفقود است.» (سفینۂ ہندی ، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۵۸ ، عرض مرتّب)

لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس نادرالوجود تذکرہ کا قدرے تفصیلی ذکر کریں ـ

یہ تذکرہ ۲۰ جمادی الاولی ۱۲۱۱ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ـ اس میں ہند و پاک کے مختلف طبقات کے فارسی شعراء کا ذکر ہے ـ خود مصنف نے اس کی تقسیم اور درجہ بندی یوں کی ہے :ـ

باب اوّل : مدح آصف الدولہ و میرزا محمد فاخر ، اور تعریف ہندوستان ـ یہ باب ایک مقدمہ اور دو رکن پر مبنی ہے ـ

باب دوم : ذکر پردگیان معنی ـ شاعرات کے احوال پر مشتمل یہ باب درج ذیل چار فصلوں میں منقسم ہے ـ

چمن اوّل : بادشاهان و شاهزادگان شاعر

چمن دوم : وزراء و امرائے شاعر

چمن سوم : مشائخ و فقرائے شعر پرداز

چمن چهارم : سائر شعرائے صاحب حال.

ابتداء : آغاز سخن سپاس حضرت آفریدگاری ست تعالی شانہ کہ مُشتی خاک را برگزیده بطغرائے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم .

انتهاء : درمیان سخنـــوران انام نظم مـن‌محضـــرخـــردمنـدیست
هنــــدو هنــــدزاد و بـوم منست زین دو باعث تخلصم هندیست

مخطوطہ ۹۰۷ : ستعلیق هنـدی ، سانـد بخط مؤلف ، حواشـی پر تصحیحات و اضافات . بعض عنوانات سرخ . آخری نصف کے عنوانات لکھے نہیں گئے . مجلد . ٥٢٦ ص . ۱۷ سطر . تقطیع ۲۳ x ۱۲/۵ سنتی میٹر . کرم خورده.

(حوالہ ـ ج ۲ ص ۳۹۷ ـ ۳۹۸).

(۹) **بیدل عظیم آبادی** ،مرزا عبد القادر (م ۱۱۳۳ھ)

۱ ـ دیوان بیدل

غزلیات اور رباعیات کا مجموعہ ہے۔

مخطوطہ نمبر ۸۰۷ : نستعلیق ، سید عمر مولوی ، ۱۲۷۷ھ ، بمقام قونیہ (ترکی) جوار (مزار) مولانا روم ، ۱۲ ۷ ص. (حوالہ ـ ج ۲ ص ۳۸۷ ـ ۳۸۸) فاضل فهرست نگار نے یہ دیوان سوالیہ علامت کے ساتھ بیدل بخاری سے منسوب کیا ہے۔ لیکن ابتدا سے جو اشعار نقل کئے هیں ان سے معلوم هوتا ہے کہ یہ دیوان بیدل عظیم آبادی کا ہے۔

(۱۰) **جواد ساباط لطفی بن ابراهیم ساباط السباطی** (م تقریباً ۱۲۵۰ھ)

عربی الاصل شخص تها ـ ملّت محمدیہ کو چهوڑ کر مسیحی مذهب

اختیار کر لیا ـ اور ناناناتیل ساباط کے نام سے مشہور ہوا ـ ١٢٢٢ھ میں کلکتہ میں شیخ احمد شروانی سے ملاقات ہوئی تھی ـ (تذکرہ علمائے ہند از رحمان علی ، اردو ترجمہ از محمد ایوب قادری ، کراچی ١٩٦١ھ ص ١٥٣).

١ ـ منتخب العہدین (عقائد، عربی)

انبیاء اور ان کے ادیان کے بارے میں تورات اور انجیل سے منتخب مضامین ہیں ـ تورات سے انتخاب ١٢٣٠ھ میں اور انجیل سے انتخاب ١٢٣١ھ میں بمقام مرشد آباد ـ

مخطوطہ نمبر ٣٩٦ : نستعلیق ، بخط مؤلف ، ٢٦ جمادی الاولی ١٢٣١ھ ، بمقام مرسد آباد ، ٢٢٣ ص. (حوالہ ـ ج ١ ص ٢١٢ ـ ٢١٣) فہرست نگار نے مؤلف کا نام یوں لکھا ہے ,,سید جواد بن ابراھیم ساباط حسنی قادری حنفی"

(١١) قاضی چکن بن احمد بن سلیمان حنفی

١ ـ خزانة الروایات (فقہ ، عربی)

مؤلف نے ان تمام فقہی فتاوی کو یکجا کر دیا ہے جو انہوں نے زندگی بھر جمع کئے اور متفرق یادداشتوں کی صورت میں پڑے ہوئے تھے ـ

مخطوطہ نمبر ٢٠٩٣ : نسخ ، محشی ، ٣٣٦ ص ـ زیر نظر نسخہ صرف جلد اول ہے ـ اور کتاب العلم سے سروع ہو کر کتاب الصوم پر بطور ناقص ختم ہو جاتا ہے . (حوالہ ـ ج ٦ ص ١٠٩ ـ ١١٠).

(١٢) شیخ حبیب اللہ پٹنوی (١٢ صدی ھجری)

١ ـ التسویہ ، شرح (اوّل) ص ١٣٦ ـ ١٦٥ (تصوف ، عربی)

شارح نے ,, شرح التسویہ ,, از خواجہ خورد کا جواب دیا ہے اور زیادہ تر ابن عربی کے اقوال سے استشہاد کیا ہے ـ

٢ ـ التسویہ ، شرح (دوم) ص ٢٠٩ ـ ٢٣٩ (تصوف ، عربی)

اس شرح میں شیخ حبیب اللہ نے شیخ محمود بن محمد جونپوری کے نظریات مندرجہ "حرز الامان " کا جواب لکھا ہے۔

۳ ۔ حرز الایمان ، شرح ، ص ۲۳۲ ۔ ۲٦۱ (فلسفہ ، عربی)

اس حاشیے میں بھی جونپوری کے اقوال کا جواب دیا گیا ہے۔

مخطوطہ نمبر : ۴۱۰ : نستعلیق و نسخ ، رکن الدین بن عبد اللہ ، ۱۴ شعبان ۱۳ جلوس محمد شاہی ، ۱۱۳۳ھ ، بمقام جہان آباد۔

(۱۳) حزین ، محمد علی (۱۱۰۳ ۔ ۱۱۸۱ھ)

ایران سے ہندوستان آئے تھے۔

مخطوطہ نمبر ۴۹۴ میں شیخ حزین کے مندرجہ ذیل فارسی رسائل ہیں :۔

۱ ۔ فتح السبل ص ۲ ۔ ۱۱۸ (کلام)

یہ رسالہ ۱۱۵۳ھ میں بمقام لاہور تالیف ہوا۔

۲ ۔ الاغاثۃ ص ۱۲۲ ۔ ۱۹۸ (کلام)

امامت کے اثبات پر یہ رسالہ ۱۱۴۴ھ میں تالیف کیا۔

پہلا رسالہ بخط نستعلیق مولف کے عہد میں کتابت ہوا ۔ دوسرا رسالہ نیز بخط نستعلیق ، محمد ھادی ، ۲٦ شعبان ۱۱۳۹ھ . بمقام شاھجہان آباد . (حوالہ ۔ ج ۲ ص ۱۰۳ ۔ ۱۰۴)

مخطوطہ نمبر ۵۴۰ بھی حزین کے آثار کا مجموعہ ہے جو مشتمل ہے درج ذیل پر :۔

۱ ۔ کلیات حزین ص ۲ ۔ ۱۷۵ (شعر ، فارسی)۔

۲ ۔ اوزان و مقادیر ص ۱۷٦ ۔ ۳۸۰ (فقہ ، فارسی)۔

نستعلیق ، بخط مؤلف ، ۱۱۷۳ھ ، محشی و مصحح (حوالہ ج ۲ ص ۱۳۲ ۔ ۱۳۳)

۳ ـ شرح قصیدۃ لامیہ (ادب ، فارسی)

حضرت علی کی مدح میں اپنے ہی ایک عربی قصیدہ کی ۱۱۷۰ھ میں فارسی شرح لکھی۔

مخطوطہ نمبر ۲۰۸۱ : نستعلیق ، بخط مصنف ، ۳۲ ص .(حوالہ ج ٦ ص ۹۴)۔

(۱۴) سید حسین بن دلدار علی نقوی لکھنوی (م ۱۲۷۳ھ)

۱ ـ حدیقۃ سلطانیہ در مسایل ایمانیہ (عقائد ، فارسی)۔

شیعی عقائد پر اس کتاب کی تالیف ۱۲٦۳ھ میں شروع ہوئی۔

مخطوطہ نمبر ۱۳۲۷ : نسخ خوش ، عنوانات سرخ ، ۴۹٦ ص ـ قدرے کرم خوردہ (حوالہ ج ۴ ص ۱۱۰ ـ ۱۱۱)۔

(۱۵) خواجہ خورد

۱ ـ تسویہ ، شرح ص ۸٦ ـ ۱۳۳ (تصّوف ، عربی)

مخطوطہ نمبر ۴۱۰ : نستعلیق ، رکن الدین بن عبد اللہ ، ۱۴ شعبان ۱۱۳۳ھ بمقام جہان آباد (حوالہ ج ۲ ص ۱۰ و ۱۲)۔

(۱٦) سید دلدار علی لکھنوی (۱۱٦٦ ـ ۱۲۳۵ھ)

۱ ـ الشہاب الثاقب (عقائد ، عربی)

صوفیاء بالخصوص ان کے نظریہ وحدت وجود کے ردّ میں ہے۔

مخطوطہ نمبر ۱۹۸۸ : نسخ ، محمد علی بن محمد صادق ، ۴ شوال ۱۲۵۸ھ حاشیہ پر تصحیحات . ۱٦۸۰ ص. (بحوالہ ج ۵ ص ۳٦۰)

۲ ـ ذوالفقار (عقائد ،فارسی)

ایک سنّی عالم دین کی کتاب ''استیعاب الکلام'' کا جواب ہے۔

مخطوطہ نمبر ۲۲۷ : نستعلیق ، ۳ رجب ۱۲۱۹ھ ''ہاشم علی جعفر'' اور کتابخانہ سید ابو جعفر کی مواہیر . ۳۹۸ ص ـ کرم خوردہ (بحوالہ ج ۲ ص

۳۱٦ ـ ۳۱۷).

دوسرا مخطوطہ ، نمبر ۲۰۹۵ : نستعلیق ، عربی عبارات بخط نسخ ، پہلے ورق پر ,,محمد علی خان ،، اور ,,زین العابدین خان ،، کی مہریں ،۲۸۲ ص ـ کرم خوردہ (بحوالہ ج ٦ ص ۱۱۰)

(۱۷) رتن لعل مست

۱ ـ تحفۂ دکن (تاریخ ، فارسی)

دکن کی عمومی تاریخ ہے ـ ۱۲۹۲ھ میں تألیف ہوئی ـ (تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو فہرست مخطوطات فارسی کتب خانہ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد دکن ، مرتبہ محمد اشرف ، جلد اول ، عدد ۳۱۳).

مخطوطہ نمبر ۲۰۸۰ : نستعلیق ، عنوانات سُرخ ، ابتداء میں فہرست مطالب ، ۱۰۰ ص . (بحوالہ ج ٦ ص ۹۳).

(۱۸) رحمت اللہ گیلانی (۱۱صدی ہجری)

علم تجوید و قرأت حیدر آباد میں ملا محمد قاسم قاری نجفی اور ان کے صاحبزادے خیر الدین محمد سے سیکھا ـ قرأت کی مزید تعلیم کے لئے مکہ چلے گئے اور وہاں شیخ احمد الحکمی سے استفادہ کیا ـ

۱ ـ برهان القاری فی تجوید کلام الباری (تجوید ، فارسی)

۱۰۳۵ھ میں مؤلف نے حیدر آباد میں حکیم عبد الجبار کے آگے زانوئے تلمّذ تہہ کیا اور پھر انہی کی ترغیب پر یہ کتاب تالیف کی ـ

مخطوطہ نمبر ۱۸۳۳ : نستعلیق ، ملکیت کی یادداشت مورخ جمادی الاولی ۱۲۹۱ھ. محشی ، ۳۷۸ ص . (بحوالہ ج ۵ ص ۲۲۹ ـ ۲۳۱).

(۱۹) شائق بریلوی ، نذیر الدین حسن بن غلام محی الدین (۱۳ صدی ہجری).

۱ ـ دو پیکر ، ص ۳ ـ ۳۲. (عروض و قافیہ ، فارسی)

۱۲۳۰ھ میں منظوم کی ۔

مخطوطہ نمبر ۱۰۳۳۸ : نستعلیق ، ۷ محرم ۱۲۳۹ھ ، حاشیہ بر تصحیحات (بحوالہ ج ۳ ، ص ۲۲۹)

(۲۰) شرف الدین احمد بن یحیی منیری (٦٦١ ـ ۷۸۲ھ).

۱ ـ مکتوبات (تصوف ، فارسی).

زیر نظر مخطوطہ ناقص الاوّل ہے اور اس میں ایک سو بچاس مکتوبات ہیں ۔ یہ وہی مجموعہ ہے جو زین بدر عربی نے مرتّب کیا تھا ۔

مخطوطہ نمبر ۱۲۲۳ : نسخ مائل بہ ثلث ، عنوانات سرخ ، حاشیہ میں تصحیحات . ناقص الاول و وسط . ۲۳۷ ص. (بحوالہ ج ۳ ، ص ۱۸ ـ ۲٦).

(۲۱) شمس الدین بن سید نسیب احمد (۱۲ صدی ہجری).

۱ ـ عنایات الہیہ (تذکرہ ، فارسی)

مشہور صوفی سید عنایت اللہ بن سید محمد حسینی حنفی نقشبندی خجندی اور ان کی اولاد و خلفاء کے حالات و کرامات پر مبنی یہ تذکرہ ربیع الاولی ۱۱٦۲ھ میں لکھا گیا ۔

مخطوطہ نمبر ۲۱۵۴ : نستعلیق بدخط ، عنوانات سرخ . ۱۳٦ ص (بحوالہ ج ٦ ، ص ۱٦۰ ـ ۱٦۱).

(۲۲) شہاب الدین احمد بن عمر دولت آبادی (م ۸۴۹ھ)

۱ ـ شرح الکافیہ (نحو ، عربی)

مخطوطہ نمبر ۱۳٦٦ : نستعلیق ، سلطان علی بن شیخ ولی شروانی ، دو شنبہ ، اواخر ربیع الآخر ۹٦۲ھ بمقام قسطنطنیہ ، منقش و مذہب ، ۳۲۲ ص ، صفحات کا بالائی حصہ کرم خوردہ اور نم زدہ ، (بحوالہ ج ۳ ص ۱۳۹ ـ ۱۴۰).

(۲۳) ضیاء الدین برنی (م ۷۸۵ھ)

۱ ـ **تاریخ فیروز شاهی** (تاریخ ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۱۰۲۵ : نستعلیق ، ذیقعد ۹۸۳ھ ، عنوانات سُرخ ۔ کرم خوردہ ، مگر دوبارہ درست کی گئی ہے تا ہم اب بھی بعض جملے پڑھے نہیں جا سکتے ، ۴۲۲ ص. ابتداء میں دس صفحات بر مشتمل کتاب کا تعارف بقلم ابو المحامد عرشی حیدر آبادی مورخ ۲۱ محرم ۱۳۹۳ھ. (بحوالہ ج ۳ ص ۲۱۹ ـ ۲۲۰).

(۲۴) ضیا نخشبی (م ۷۵۱ھ)

۱ ـ **عشرۃ الملوک** ، ص ۴۳ ـ ٦۹ (طب و جنسیات ، فارسی).

"کوک شاستر" کا دس ابواب میں فارسی ترجمہ ہے ۔

مخطوطہ نمبر ۱۵٦۳ : نستعلیق ، مرزا حبیب اللہ علوی ، ۲۲ صفر ۱۳۴۰ھ بمقام حیدر آباد ۔ منقول از نسخہ حکیم ابو القاسم نور محمد مورخ ۱۰۸۵ھ. عنوانات سرخ (بحوالہ ج ۳ ، ص ۳۷۳ ـ ۳۷۴) فہرست نگار نے مؤلف کا نام "ضیا بخش" لکھا ہے ، ہمارے خیال میں وہی ضیا نخشبی ہے جن سے منسوب کتاب "لذت النساء" کے متعدد نسخے موجود ہیں۔

(۲۵) ظہوری ، ملاّ نور الدین محمد (متوفی میان ۱۰۲۴ ـ ۱۰۲٦ھ)

۱ ـ **دیوان ظہوری** (شعر ، فارسی)

غزلیات ، ساقی نامہ اور رباعیات ہیں ـ

مخطوطہ نمبر ۱۷۳۵ : نستعلیق ، ۱۹ صفر ۱۱۵۸ھ. پہلے ورق پر "محمد صادق بن محمد حسین" کی بیضوی مہر ، محشی ، ۸۵۸ ص . (بحوالہ ج ۵ ص ۱۲۰ ـ ۱۲۱).

۲ ـ **سہ نثر ظہوری** (ادب ، فارسی)

زیر نظر مجموعہ میں "نورس نامہ" از ص ۳۲ تا ۳۵ اور "گلزار ابراہیم" از ص ۳۵ تا ۴۹ ہے ـ

مخطوطہ نمبر ۱۳۵۱ ، شمس ، رجب ۱۰۵۳ھ. (بحوالہ ج ۳ ص ۱۳۵۱).

(۲٦) عبد الجلیل (۱۲ صدی ھجری)

واجب الحفظ (طب ، فارسی)

ساٹھ ابواب میں حفظ صحت کی تدابیر بیان کی گئی ھیں ۔ مؤلف حکیم محمد اکبر ارزانی (م ۱۱۳۰ھ) کا شاگرد تھا اور زیر نظر کتاب میر معز اللہ کے ملاحظہ سے گزری ۔

مخطوطہ نمبر ۲۱۹٦ : نستعلیق ، صرف پہلے دس ابواب ، ۳۲ ص. (بحوالہ ج ٦ ، ص ۱۹۰ ۔ ۱۹۱).

(۲۷) عبد الحق محدث دھلوی (م ۱۰۵۲ھ)

تکمیل الایمان و تقویۃ الایقان (عقائد ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۲۱۳٦ : نستعلیق ، ابو محمد عیش بن نورالہدی فاروقی جاجموی ، ۲ رجب ۱۲۷۴ھ. ۱۷۴ ص. (بحوالہ ج ٦ ص ۱۳٦ ۔ ۱۳۷).

(۲۸) عبد الحکیم سیالکوٹی (م ۱۰٦۷ھ)

حاشیہ حاشیۃ اللاری علی شرح الکافیہ (نحو ، عربی)

ملا عبد الغفور لاری (م ۹۱۲ھ) کے «فواید الضیائیہ» پر حاشیہ پر حاشیہ ہے ۔

مخطوطہ نمبر ۱۵۳۳ : نسخ ، عنوانات سرخ ، ۱۰۰ ص. (بحوالہ ج ۳ ص ۳۳۴).

(۲۹) عبد العزیز دھلوی (۱۱۵۹ ۔ ۱۲۳۹ھ)

۱ ۔ تحفۂ اثنی عشریہ (عقائد ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۸۴۳ : نستعلیق ، نرسنگراؤ ، ۱۱ جمادی الاولی ۱۲۱۷ھ بمقام اورنگ آباد، حواشی پر تصحیحات . ۳۱۰ ص. (بحوالہ ج ۳ ص ۳۹۳۸)

۲ ـ سوال و جواب شاه بخاری ، ص ۲ ـ ۲۵ (عقائد ، فارسی)

شیعہ و سنّی اختلافی مسائل پر اهلسنت و جماعت کے دفاع میں دس سوالوں کے جوابات هیں ـ

۳ ـ سوال و جواب ،ص ٢٦ ـ ۱۳۹ (عقائد ، فارسی)

فقہی ، اعتقادی اور فلسفی مسائل پر ۲۹ سوالات کے جواب هیں ـ

مخطوطہ نمبر ۵۲۴ : نستعلیق ، عبد الرحمن ، ۲۷ محرم ۱۲۷۳ھ۔

(۳۰) عبد الله بن سید بہادر علی (۱۳ صدی هجری)

۱ ـ تفسیر مقبول (تفسیر قرآن ، اردو)

سورهائے یٰس ، رحمن ، واقعہ ، تبارک ، نوح ، عم ، مزمل اور جنّ کا مختصر ترجمہ و تفسیر ہے ـ مصنف نے یہ کتاب مولوی عبد الملک بن مولوی محمد صادق اور محمد حسین بن محمد سلیم کی راهنمائی میں اور مولوی محمد عبد الحلیم کے حکم پر منتخب کی ہے ـ

مخطوطہ نمبر ۱۸۴۵ : نستعلیق ، ۲۲۲ ص . کرم خورده ..(بحوالہ ج ۵ ص ۲۳۱).

(۳۱) علاء طبیب ، نور الله

۱ ـ چوب چینی ،ص ٦٩ ـ ۹۸ (طبّ ، فارسی)

مؤلف بیس سال تک هندوستان میں یہاں کے حکماء کے ساتھ چوب چینی کے خواص پر مباحثے کرتا رها ہے ـ

مخطوطہ نمبر ۱۵٦۳ ، نستعلیق ، مرزا حبیب الله علوی ، ۲۲ صفر ۱۳۴۰ھ ، منقول از نسخۂ حکیم ابو القاسم نور محمد مورخ ۱۰۸۵ھ . (بحوالہ ج ۴ ، ص ۳۷۴).

(۳۲) علی متقی برهانپوری (۸۸۵ ـ ۹۷۵ھ)

۱ ـ احوال مهدی آخرالزمان ، ص ۲۱۳ ـ ۲۲۷ (عقائد ، فارسی)

امام مہدی کے بارے میں ساٹھ فصول نقل کی ہیں ۔

مخطوطہ نمبر ۵۲۳ : نستعلیق ، عبد الرحمن ، ۲۷ محرم ۱۲۷۳ھ ۔
(بحوالہ ج ۲ ص ۱۲۹ ـ ۱۳۰)

۲ ـ تلخیص البیان فی علامات مہدی آخر الزمان (عقائد ، عربی)

مخطوطہ نمبر ۲۰۷ : نستعلیق ، مجموعہ کے پہلے ورق پر کسی ہندوستانی کتب خانہ کی مہر ہے (بحوالہ ج ۲ ، ص ۲۹٦ و ۲۹۸) ـ مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے مطالب اور ترتیب فصول میں یکسانیت پائی جاتی ہے صرف زبان کا فرق ہے ـ

(۳۳) شاہ غلام علی نقشبندی دہلوی (م ۱۲۳۰ھ)

۱ ـ مکتوبات (تصوف ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۱۸۱٦ : خط رقعی : ایک صفحہ پر گول مہر عبد اللہ بن حسن الخالدی ، ۱۱۲ص. (بحوالہ ج ۵ ص ۱۹۸).

(۳۴) فقیر دہلوی ، شمس الدین (۱۱۱۵ ـ ۱۱۸۳ھ).

حدائق البلاغہ ص ۱۷۱ ـ ۳۲۵ (بلاغت ، فارسی).

زیر نظر مخطوطہ میں صرف حدیقۂ چہارم تا ششم ہے ـ

مخطوطہ نمبر ۱۰۳۸ : نستعلیق ، ۷ محرم ۱۲۳۹ھ ، (بحوالہ ج ۳ ص ۲۳۱ و ۲۳۲)

(۳۵) فیضی ، ابو الفیض (۹۵۴ ـ ۱۰۰۴ھ)

۱ ـ سواطع الالہام (تفسیر قرآن ، عربی)

مخطوطہ نمبر ۱۹۲۵ : نسخ ، حاشیہ پر تصحیحات ، ۵۹٦ ص .
(بحوالہ ج ۵ ص ۱۹۲۵، فہرست نگار نے مؤلف کی کنیت «ابو الفضل» لکھی ہے جو صحیح نہیں)

(۳٦) گنج شکر ،شیخ فرید الدین (متوفی میان ٦٦۰ ـ ٦۹۰ھ).

۱ ـ وجودیہ ،ص ٦۱ ـ ٦٦ (تصوف ، فارسی)

تصوف کی اصطلاحات کی تشریح ہے ۔

مخطوطہ نمبر ۳۱٦ : نسخ ، گویا احمد علی خان بن انور علی خان بہادر ۲۰ ذیقعد ۱۲۳۱ھ. (بحوالہ ج ۳ ص ۱۸ و ۲۱).

دوسرا مخطوطہ نمبر ۱۳۸٦ : نستعلیق ، ۱۳ رجب ۱۲۸۵ھ ، ص ۱۵ ـ ۲۰ (بحوالہ ج ۳ ، ص ۲۸۳)

(۳۷) گیسو دراز، صدر الدین ابو الفتح محمد (۷۲۰ ـ ۸۲۵ھ)

۱ ـ وجود العاشقین (تصوف ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۱۳۸٦ : نستعلیق ، ۱۳ رجب ۱۲۸۵ھ ، ص ۲ ـ ۱۳. (بحوالہ ج ۳ ، ص ۲۸۳)

(۳۸) لعل بہاری بہوجنوری (شائد بجنوری) ۱۱ صدی ہجری

۱ ـ منتخب سبمرت جاک و لک (ہندو عقائد ، فارسی)

ہندو فلسفی جاک ولک کی کتاب ,, سبمرت ،، کا انتخاب اور ترجمہ ہے جو اورنگ زیب عالمگیر کے حکم پر ۱۰٦۸ھ میں کیا گیا .

مخطوطہ نمبر ۲۳۳۲ : نستعلیق بدخط ، ۳۱۲ ص (بحوالہ ج ٦ ص ۳۱۸ ـ ۳۱۹)

(۳۹) محب اللہ الہ آبادی (م ۱۰۵۸ھ)

مخطوطہ ۳۱۰ میں ان کے مندرجہ ذیل رسائل ہیں : ـ

۱ ـ التسویہ ، ص ۲ ـ ۱۱ (تصوّف ، عربی)

۲ ـ ترجمہ التسویہ ص ۱۳ ـ ۸۲ (تصوف ، فارسی)

نستعلیق و نسخ ، رکن الدین بن عبد اللہ ، ۱۳ شعبان ۱۱۳۳ھ (بحوالہ ج ۲ ص ۹ ـ ۱۰ و ۱۲)

(۴۰) محمد اکبر مشہور بہ محمد ارزانی بن میر حاجی مقیم قادری

١٢٢٣هـ)

۱ ـ حدود الامراض (طب ، عربی)

امراض کی حروف تہجی کے اعتبار سے فرہنگ ہے ۔

مخطوطہ نمبر ۱۹۳۳ : نستعلیق ، ۷۰ص ـ چنداں کرم خوردہ . (بحوالہ ج ۵ ص ۱۹۳۳)

۲ ـ طب اکبری (طب ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۱۱۱۳ : نستعلیق ، محمد قاسم سرناپ ، ۱۱ رجب ۱۲٦۳ھ .بتصحیح مولوی محمد یوسف علی خان ، کرم خوردہ ، ۵۸۳ ص ـ محشی (بحوالہ ج ۳ ص ۲۸۳)

(۴۱) محمد امین ارکاٹی حیدر آبادی (۱۱ صدی ہجری)

۱ ـ گلشن سعادت (انشاء ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۴۷۰ : نستعلیق ، سید محمود بن عابد علی ، ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ . بمقام حیدر آباد ۱۸۰ ص . (بحوالہ ج ۲ ص ۷٦).

(۴۲) محمد بن سید اصغر حسین امروہوی (۱۳ صدی ہجری)

مخطوطہ نمبر ۱۸۹۱ میں ان کے مندرجہ ذیل اردو رسائل ھیں :

۱ ـ حجج حاویہ در مطاعن معاویہ ص ۲ ـ ٦۰ . (تاریخ)

امیر معاویہ کے حالات زندگی اور بقول مصنف ان سے سرزد ہونے والے غیر اسلامی امور کی نشاندھی کی گئی ہے یہ رسالہ ذیقعدہ ۱۳۳۱ھ میں تالیف ہوا ـ

۲ ـ باب جنان در فصل اذان ، ص ٦۵ ـ ۸۰ (فقہ)

اذان اور اقامت میں «حی علی خیر العمل » اور «اشہد ان علیاً ولی اللہ » کہنے پر شیعہ و سنّی آراء و روایات کو جمع کیا گیا ہے ۔

۳ ـ خیر العمل ، ص ۸۱ ـ ۱۱۳ (فقہ)

سید ثاقب حسین نے مصنف کے رسالہ باب جنان (مذکور بالا) پر کچھ اعتراضات کئے تھے۔ مصنف نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۱۲ میں لکھا گیا۔

نستعلیق ، ۱۳۳۳ھ. پہلے ورق پر کتابخانہ سید محمد مہدی ریاست پیرپور اور آخری صفحہ پر "امین الفصاحۃ ناطق الملک سید الشعراء سید مومن حسین صفی سنہ ۱۳۱۴ھ" کی مہر نبت ہے۔ کرم خوردہ ، ۱۱٦ ص ۔ (بحوالہ ج ۵ ص ۲٦٦ ـ ۲٦۷)

(۴۳) محمد بن شاہ فضل اللہ برھانپوری (متولد تقریباً ۹۵۲ ـ متوفی شائد ۱۰۲۹ھ)

ان کے فارسی رسالہ "تحفۃ المرسلہ" کی عربی شرح موجود ہے بنام نخبۃ المسألہ فی شرح التحفۃ المرسلہ

از سید عبد الغنی بن اسمعیل نابلسی دمشقی (م ۱۱۴۳ھ).

یہ شرح ۱٦ صفر ۱۱۱۱ھ میں لکھی

مخطوطہ نمبر ۲۱۵ : نستعلیق ، ۱۳ صدی ھجری ، ۳۸ ص . (بحوالہ ج ۱ ص ۲۴۴)

(۴۴) محمد حافظی ظفر آبادی

۱ ـ نتیجۃ الرمل (رمل ، فارسی)

علم رمل پر ۵۱ مقالات ھیں ـ مصنف نے کتاب کا انتساب علاء الدولہ خلجی (گویا وھی علاءالدین خلجی ٦۹۵ ـ ۷۱۵ھ) کے نام کیا ہے اور خود کو شیخ نصیر الدین محمود اودھی (م ۷۵۷ھ) کے اقارب سے ظاھر کیا ہے۔

مخطوطہ نمبر ۱۰۱۳ : نستعلیق ، عنوانات سرخ اور بعض کی جگہ خالی پڑی ہے ، پہلے صفحہ پر محمد علی بن محمد محسن کی ملکیت کی یادداشت ، ۲۸۰ ص (بحوالہ ج ۳ ص ۲۰٦).

(۴۵) محمد سعید اسلمی مدراسی (م ۱۲۷۲ھ)

مخطوطہ نمبر ٦٥٠ میں مندرجہ ذیل فارسی رسائل ھیں :

۱ ۔ نصیحت نامہ ، ص ۲ ۔ ۸ (عقائد)

۲ ۔ سوال و جواب بہادر خان ،ص ۹ ۔ ۳۷ (عقائد)

۳ ۔ سوالات و بمتعلق سلسلۂ علیم اللہی (تصوف).

نستعلیق ، ۷ ذی الحجہ ۱۲۵۵ھ ، چند جگہوں پر سلطان محمود کی مہر اور پہلے ورق پر فخر الدین قادری کی یادداشت تملّک . (بحوالہ ج ۲ ص ۲۴۷ ـ ۲۴۸).

(۴٦) مفتی محمد عباس بن علی اکبر لکھنوی (م ۱۳۰٦ھ)

۱ـ الجواهر العبقرية فی الرد علی التحفة الاثنی عشریہ (عقائد ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۱۰۱٦ : نستعلیق ، علی بن مرزا محمد تقی خان ، ۳ شعبان ۱۳۱۰ھ بمقام لکھنو۔ پہلے ورق پر راجہ سید مہدی کے کتب خانہ کی مہر ، ۲۲۸ ص. (بحوالہ ج ۳ ص ۲۱۲)

۲ ۔ الروض الاریض فی منجزات المریض (فقہ ، عربی).

۱۲۹٦ھ میں تالیف ہوئی ۔

مخطوطہ نمبر ۲۰۳۰ : نسخ ، ۱۲۹٦ھ . مؤلف کا تصحیح شدہ نسخہ پہلے صفحہ پر ان کی مہر «لا اله الا الله القوی عبده السید عباس بن علی موسوی » ثبت ہے ۔ ۲۹۸ ص. (بحوالہ ج ٦ ص ۳٦).

۳ ۔ صفحہ الماس فی کیفیة الارتماس (فقہ ، عربی).

[illegible]ھ میں [illegible] تکمیل کو پہنچی.

مخطوطہ نمبر ۱۸۰۳ . نسخ ، کاظم بن جعفر طباطبائی اصفہانی ، [illegible] [illegible] محشی کے حواشی ، پہلے ورق پر مصنف کی مہر .

ورق ۳۳ سے بعد مصنف اور کاتب کی یادداشتیں ، ۱۲۶ ص. (بحوالہ ج ۵ ص ۱۸۸).

۳ ـ المعادن الذهبیة اللجینیہ فی المحاسن الوهبیة الحسینیة (تذکرہ، عربی)

سید حسین بن سید دلدار علی لکھنوی کا مفصل تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۶۴ھ میں لکھا گیا تا ہم شعبان ۱۲۶۸ھ میں اس پر تکملہ لکھا گیا ۔

مخطوطہ نمبر ۳۰۲ : نستعلیق ، سید حسین ، معاصر مصنف ، پہلے ورق پر کتابخانہ راجہ سید مہدی کی مہر ، ۱۹۸ ص . (بحوالہ ج ۲ ص ۳ ـ ۴).

(۴۷) میر سید محمد علی

۱ ـ نجاسات عشرہ (فقہ ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۲۰۷ : نستعلیق ، مجموعہ میں ص ۱۹۷ ـ ۱۹۸ . (بحوالہ ج ۲ ، ص ۲۹۸).

(۴۸) آخوند ملا محمد علی کشمیری

۱ ـ عمل شمسی و قمری (طب ، فارسی)

طبی مفردات پر مشتمل ہے۔ کتاب اور مؤلف کا نام ایک یادداشت میں پہلے ورق پر موجود ہے۔

مخطوطہ نمبر ۱۳۹۸ : نستعلیق ، محمد حسن بن علی رضا ، ۱۶ ذی قعد ۱۳۰۰ھ . پہلے ورق پر مہدی بن ریحان اللہ موسوی کے تملک کی یادداشت، مورخ رمضان ۱۳۳۱ھ . (بحوالہ ج ۳ ص ۳۰۲ ـ ۳۰۳).

(۴۹) سید محمد بن دلدار علی لکھنوی (م ۱۲۸۴ھ)

۱ ـ ثمرة الخلافة (عقائد ، فارسی).

ربیع الاول ۱۲۴۹ھ میں تالیف ہوئی .

مخطوطہ ۲۰۹۷ : نستعلیق ، ۱۳۲ ص. (بحوالہ ج ۶ ص ۱۱۱ ـ ۱۱۲)

مخطوطہ ۲۱۶۳ میں ان کے مندرجہ ذیل رسائل موجود ہیں :۔

۱ ۔ فضیلت حضرت علی بر صحابہ ،ص ۲ ۔ ۳۶ (عقائد ، فارسی)

۲ ۔ تفضیل مفضول ، ص ۵۰ ۔ ۵۸ (عقائد ، فارسی)

۳ ۔ نجات موحدین ، ص ۶۲ ۔ ۹۹ (عقائد ، فارسی)

۴ ۔ قتال النصاب ، ص ۱۰۲ ۔ ۱۲۳ (عقائد ، عربی).

روایت کافی "لو علم ابو ذر ما فی قلب سلمان لقتلہ " کے دفاع میں :

۵ ۔ گوہر شاہوار و در آ بدار ، ص ۱۲۶ ۔ ۱۵۶ (عقائد ، فارسی)

قرآن اور اہلبیت کی فضیلت میں .

مخطوطہ نمبر ۲۱۶۳ : نسخ ، میر فضل شاہ کاتب میدانی کشمیری ، ۲۳ ذیقعد ۱۳۰۸ھ . کرم خوردہ. ۱۷۸ ص. (بحوالہ ٦ ص ۱۶۶ ۔ ۱۶۹)

فہرست نگار وضاحت کرتے ہیں کہ "مخطوطہ کے پہلے ورق پر یہ تصریح ہے کہ مجموعہ میں موجود تمام رسائل سیّد محمد لکھنوی کے ہیں لیکن " الذریعہ الی تصانیف الشیعہ " تالیف آقا بزرگ تہرانی میں بعض رسائل دوسروں سے منسوب ہیں " ۔ جب ہم نے تعاقب کیا تو صرف "قتال النصاب " کے بارے میں پتہ چلا کہ یہ سید اولاد حسین شکوہ آبادی کی تألیف ہے جو سید محمد لکھنوی (زیر بحث) کے حکم پر ہوئی ۔ البتہ صاحب ذریعہ نے سید محمد لکھنوی کی ایک کتاب "قتال النواصب " کا بھی ذکر کیا ہے۔ (ذریعہ ج ۱۷ ص ۳۷).

زیر نظر مجموعہ (نمبر ۲۱۶۳) کے صفحہ ۱۶۰ تا ۱۷۷ **سید علی محمد بن سید محمد لکھنوی کا فارسی رسالہ "الاثنی عشریہ فی البشارات المحمدیہ "** بھی موجود ہے۔

(۵۰) محمد وحدت کلکتوی

۱ ۔ شیخ صنعان و ترسا (مثنوی ، فارسی) .

بزمی اور عرفانی مثنوی ہے۔

مخطوطہ نمبر ٦٣٨ : نستعلیق ، سید مہدی بن شمس الدین حسینی دھکردی ، ۲۳ جمادی الاولی ۱۲۲۲ھ . ص ۲ ـ ۱۸۲ (بحوالہ ج ۲ ص ۲۳۸ ـ ۲۳۹)

دوسرا مخطوطہ نمبر ۱۹۸۷ : نستعلیق ، غرہ ربیع الاولی ۱۳۳٦ھ. پہلے صفحہ پر «علی نقی الموسوی » کی مہر ، ۱۸۲ ص (بحوالہ ج ۵ ص ۳۵۹ ـ ۳٦۰).

(۵۱) محمود بن محمد جونپوری

۱ ـ حرز الایمان ، ص ۱۷۰ ـ ۲۰۷ (فلسفہ ، عربی)

مخطوطہ نمبر ۳۱۰ : نستعلیق و نسخ ، رکن الدین بن عبد اللہ ، ۱۴ سعبان ۱۱۳۳ھ بمقام جہان آباد (بحوالہ ج ۲ ص ۱۱ ـ ۱۲)

(۵۲) محمود بن محمد گیلانی معروف بہ محمودگاوان (م ۸۸٦ھ)

۱ ـ ریاض الانشاء (انشا ، فارسی).

اس مجموعہ منشآت میں وہ مکتوبات بھی شامل ھیں جو مصنف نے ہندوستان میں اپنے عہد وزارت کے دوران میں سلاطین کی طرف سے لکھے تھے۔

مخطوطہ نمبر ۱٦۰۴ : نستعلیق ، اواخر ذی الحجہ ۹۱۴ھ ، ۵۳۰ ص. (بحوالہ ج ۵ ، ص ۹ ـ ۱۰).

دوسرا مخطوطہ نمبر ۲۳٦۷ : نستعلیق ، قدیم نسخہ ، حاشیہ پر تصحیحات (بحوالہ ج ٦ ص ۳۵۲)

(۵۳) مخفی ، زیب النساء بیگم (م ۱۱۱۳ یا ۱۱۱۴ھ)

۱ ـ دیوان مخفی (شعر ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۲۰۹۳ : نستعلیق ، ۳ ذیقعدہ ۱۲۵٦ھ ، ۱۷۲ ص (بحوالہ ج ٦ ص ۱۰۸ ـ ۱۰۹).

(۵۴)　مرتضی حسین بلگرامی

۱ ـ حدیقة الاقالیم (جغرافیہ ، فارسی)

هفت اقلیم کی جغرافیائی معلومات پر یہ کتاب ۱۲۰۲ھ میں تالیف ہوئی .

مخطوطہ نمبر ۳۷۱ : نستعلیق خوش ، موهن لعل لکھنوی ، ۲۳ ذیقعده ۱۲۳۰ھ ، بمقام کودھا (جے پور) ، ۹۳۲ ص . (بحوالہ ج ۱ ص ۳۹۰ ـ ۳۹۱).

(۵۵)　مصلح الدین محمد لاری انصاری (م ۹۷۹ھ)

۱ ـ شرح هیئت قوشچی ، ص ۲۷۳ ـ ۴۲۸ (هیئت ، فارسی).

قوشچی (م ۸۷۹ھ) کے رسالہ ,,هیئت ,, کی اس شرح کا انتساب محمد ساه قطب شاه کے نام ہے ـ

مخطوطہ نمبر ۱۱۵۸ : نستعلیق ، عبد الله بن حاجی مرحوم ، حاشیہ بر تصحیحات ، ۴۲۸ ص.

(بحوالہ ج ۳ ص ۳۳۰ ـ ۳۳۱).

(۵٦)　معتمد خان ، محمد شریف (م ۱۰۴۹ھ).

۱ ـ اقبالنامۂ جهانگیری (تاریخ ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۳۹۴ : نستعلیق ، ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ . پہلے ورق پر کتابخانۂ راجہ سید محمد مهدی کی مہر ، کرم خورده ، ۴۵۴ ص . (بحوالہ ج ۱ ص ۴۱۱ ـ ۴۱۲).

(۵۷)　موجود مداری ، سید عبد الجلیل (۱۳ صدی هجری)

سید علی حسن خان نے ,,صبح گلشن ,, میں موجود کا دو سطری تعارف لکھا ہے (صبح گلشن ، مطبوعہ بھوپال ص ٣٦٧ ـ ٣٦٨) ـ لیکن کتابخانہ مرعشی میں جو ,,دیوان موجود ,, پایا جاتا ہے اس کے مقدمے میں شاعر نے اپنے حالات زندگی قدرے تفصیل سے لکھے ہیں جو ہم عیناً نقل کر رہے ہیں ـ

«عبد الجلیل متخلص بموجود حنفی مذهب مداریہ مشرب هندی مولد کہ باشعار هندی بتخلص سائل مشهور است و نشو و نما یافتہ بخاک پاک پکنور (شاند مکنپور) جداعلاش سپهدار عون بن سید عبد الله جناری بجذب قسمت از خط حلبْ همراه . . . سید بدیع الدین قطب المدار . . . وارد هند گشتہ هنگام ورود بلدۂ کابل بحکم جناب . . . . سید احمد بن سید ولایت الله سبزواری جبهره ای معتقد گشتہ ـ ـ . .جد بزرگوارش شاه عبد الجلیل مرحوم کہ بهفت واسطہ بحضرت سید ارغون میرسد . . . خطی کامل داشت و از بناهای او دیواری است خشتی کہ سیاحان بلاد و امصار مثلش کمتر نشان دهند ، والد ماجدش خیر الزاهدین حضرت شاه بیاری شخصی صاحب نسبت و ریاضت بوده ، قریب شصت سال باوجود عوارض امراض وغیره قیام شبی از وی فوت نشده ».

۱ ـ دیوان موجود (ادب ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۲۰۸۳ : نستعلیق ، علی مولائی ، ۱۰ ربیع الاول ۱۲۳٦هـ (بعهد شاعر) کرم خورده ، ۱۳۸ ص. (بحوالہ ج ٦ ص ۹٦ ـ ۹۷).

(۵۸) مهندس لاهوری ، لطف الله (معاصر دارا شکوه مقتول ۱۰٦۹هـ)

۱ ـ منتخب (ریاضی ، فارسی)

مخطوطہ ۱۵۵۱ : نستعلیق هندی ، حواشی پر اضافات ، کرم خورده ، ۹٦ ص (بحوالہ ج ۳ ص ۳۵۲).

(۵۹) میسری

۱ ـ گلشن وحدت (ص ۲ ـ ۹۹ (مثنوی ، اردو).

تصوف پر یہ مثنوی ۱۲۲۵هـ میں لکھی گئی .

۲ ـ میراث الطالبین ، ص ۲ ـ ۲۰۶ (مثنوی ، اردو).

از امام الدین شاه چشتی ـ شائد انہی کا تخلص میری هو (نوشاهی).

تصوف پر مثنوی ہے ـ

مخطوطہ نمبر ۲۰۵۹ : نستعلیق ، غلام محمد ، پہلے صفحہ پر امام الدین چشتی کی مہر . (بحوالہ ج ٦ ص ۷۰ـ ۷۱).

(٦۰) نظام حاجی غریب یمنی (۸ صدی هجری)

۱ ـ لطائف اشرفی (تصوف ، فارسی).

مخطوطہ نمبر ۱۹۱۱ : نستعلیق ، عنوانات سرخ ، ۸٦٦ ص . (بحوالہ ج ۵ ص ۲۸۰ ـ۲۸۳)

(٦۱) نعمت خان عالی (م ۱۱۲۱هـ)

۱ ـ وقائع حیدر آباد و گولکنڈه (تاریخ ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۱۷۳۸ : نستعلیق ، ۳۸ ص ـ (بحوالہ ج ۵ ، ص ۱۲۵. وهاں فہرست نگار نے کتاب کا نام ،،واقعۂ نعمت خان عالی ،، لکھ کر مصنف کے نام کی جگہ سوالیہ نشان ڈال دیا ہے).

(٦۲) نور الله شوشتری (م ۱۰۱۹هـ)

۱ ـ احقاق الحق و ازهاق الباطل (عقائد ، عربی)

۱۰۱۴هـ میں بمقام آگره تالیف کی ـ

مخطوطہ نمبر ۱۲۲۱ : نسخ ، عنوانات سرخ ، ۱۳۴۲ ص. (بحوالہ ج ۴ ص ۱٦).

(٦۳) وارستہ سیالکوٹی مل (م ۱۱۸۱هـ)

۱ ـ مصطلحات الشعراء (لغت ، فارسی)

مخطوطہ نمبر ۸۳۳ : نستعلیق ، علی بخش متوطن قصبہ بانده ، ۳

شوال ۱۲۷٦ھ ، برائے سید باقر حسین ، پہلے صفحہ پر سید ابو جعفر سر پور کے کتب خانہ کی مہر ، کرم خوردہ ، ۵٦۰ ص ۔ (بحوالہ ج ۳ ص ۳۱).

(٦۴) واقف لاهوری ، نورالعین (۱۱۰۰ ـ ۱۲۰۳ھ)

۱ ـ دیوان واقف

غزلیات ، رباعیات ، ترجیع بند اور مخمس پر مشتمل ہے ـ

مخطوطہ نمبر ۱٦۰۳ : نستعلیق خوش ، ۳ جمادی الثانیہ ۱۲٦٦ھ.
شروع میں واقف کے حالات زندگی ، ۵٦۴ ص. (بحوالہ ج ۵ ، ص ۸ ـ ۹)

متفرق کتب :جن کے مؤلف معلوم نہیں ہیں یا وہ مشترک ہیں ـ

اخبار شاهی اودھ (تاریخ ، فارسی)

اودھ کی ۲ جنوری ۱۸۵۱ء سے ۳۱ دسمبر ۱۸۵۱ء کی ڈائری ہے ـ

مخطوطہ نمبر ۲۳۳۰ : نستعلیق هندی ، کرم خوردہ ، ٦۴ ۳ ص (بحوالہ جلد ٦ ص ۳۱۷).

اذکار و اوراد ص ۵۱ ـ ٦۱ (فارسی)

بعض مضامین قطب العارفین حضرت شاہ معین تاج الدین کے رسالہ سے منقول ہیں ـ

مخطوطہ نمبر ۳۱٦ : نسخ ، احمد علی خان ، ۲۰ ذیقعدہ ۱۲۳۱ھ (بحوالہ ج ۲ ص ۱۷ ـ ۱۸ و ۲۱).

بیاضیں ،جن میں برصغیر کے شعراء کا کلام درج ہے ـ

مخطوطہ نمبر ۱۳۱ : بیاض مرتّبہ محمد حسن قزوینی ـ اس میں اشعار کے علاوہ وہ منشآت بھی ہیں جو مؤلف نے اصفہان ، بارہ متی ، پونہ ، حیدر آباد وغیرہ میں ۱۱۹۳ ـ ۱۲۱٦ھ کے دوران میں لکھیں . اس بیاض میں نظام علی خان پادشاہ دکن ، نظام الدین اولیاء ، بوعلی قلندر ، نقد علی خان ایجاد حیدر آبادی ، شاہ جہان بادشاہ ، جہان بیگم ، حیات النساء بیگم ، زیب النساء

بیگم ، جہانگیر ، نعمت خان عالی ، ہمایوں ، سید محمد گیسو دراز ، مرزا عبد الرحیم خانخانان کا کلام ہے (ج ۱ ، ص ۱۵۸ ـ ۱٦۰)

مخطوطہ نمبر ۴۱٦ : اس میں قطب الدین بختیار کاکی اور بو علی قلندر کے قصائد از ص ۳ تا ۱۸ موجود ہیں ـ

مخطوطہ نمبر ٦۲٦ : اس میں آفاق و انفس از خسرو دہلوی (ص ۱۳۱ ـ ۱۳۹) بھی موجود ہے (ج ۲ ص ۲۲۷) ـ

مخطوطہ نمبر : ۲۳۰۵ : اس میں شاہ طاہر دکنی کے اشعار پائے جاتے ہیں (ج٦ ص ۲۸۸ ـ ۲۸۹).

حاشیہ التسویہ (تصوف ، عربی)

شیخ محب اللہ الہ آبادی کے نظریات کے اثبات میں ـ

مخطوطہ نمبر ۴۱۰ : نستعلیق ، رکن الدین ، ۱۳ شعبان ۱۱۳۳ھ بمقام جہان آباد . ص ۲٦۱ ـ ۳۲۱ (بحوالہ ج ۲ ص ۱۲).

مہابھارت (ہندو ادب ، فارسی)

صرف فن دواز دہم ہے ـ

مخطوطہ نمبر ۱٦۲۷ : نستعلیق ، ۷۰۸ ص . (بحوالہ ج ۵ ص ۳۰ ـ ۳۱)

المختارات من قسم الشعر

فراهی کی طرف منسوب ایک مجموعۂ انتخاب

شرف الدین اصلاحی

اس وقت مولانا فراهی کی طرف منسوب عربی کے ایک‌شعری مجموعۂ انتخاب کا سرسری تعارف پیش کرنا مقصود ہے۔ یہ اس کتاب کا واحد قلمی نسخہ ہے جو معلوم و موجود ہے۔ فروری ۸۰ء کے سفر هند میں یہ میرے هاتھ لگا۔ کتاب کے تعارف سے پہلے میں ضروری سمجھتا هوں کہ ان حضرات کا ذکر کروں جن کے تعاون اور حسن اعتماد نے مجھے اس قابل بنایا کہ اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ میں اس کو نہ صرف دیکھ اور پرکھ سکوں بلکہ قارئین فکر و نظر سے متعارف بھی کرا سکوں۔ ان حضرات کے ذکر سے اس کتاب کے استنادی پہلو پر بھی روشنی پڑے گی۔

اس کتاب کی موجودگی کا ذکر اور نشاندهی سب سے پہلے عزیزی اجمل اصلاحی نے کی. پہلی مرتبہ میں نے اسے مدرسة الاصلاح میں اجمل سلمه کے والد محترم برادرم مولوی ایوب صاحب اصلاحی کے کمرے میں دیکھا جهاں نہ جانے اور کتنے لعل و گهر گدڑی میں لپٹے پڑے هیں. اُس وقت یہ اجمل میاں کے پاس تھی اور انهی کے هاتھ سے میرے هاتھ میں آئی. اجمل کو یہ کتاب عاصم نعمانی کے ماموں علی میاں کی وساطت سے ملی. معلوم هوا کہ یہ عاصم میاں کی دریافت ہے اور وهی اس کے مالک هیں۔ عاصم نعمانی مولانا

فراهی کے بڑے صاحبزادے محمد سجاد صاحب کے نواسے اور حکیم یوسف صاحب ساکن بندول کے پوتے ہیں۔ اور بالفعل مولانا فراہی کے گاؤں پھریہا میں رہائش پذیر ہیں۔ پھریہا ہی میں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ اُن دنوں وہ مولانا فراہی کے در کے قریب ہی اپنا گھر تعمیر کروا رہے تھے۔ حکیم یوسف صاحب مولانا فراہی کے شاگرد بھی تھے اور عزیز بھی جیسا کہ فراہی کے سوانحی خاکے میں تفصیل سے ذکر آئے گا۔ اعظم گڑھ کے ان دونوں گاؤوں بندول اور پھریہا میں آج سے نہیں قدیم سے نسلاً بعد نسلٍ رشتوں ناطوں کا سلسلہ در سلسلہ قائم ہے۔ گویا عاصم نعمانی دادھال اور نانہال دونوں طرف سے مولانا فراہی کے ساتھ نسبت اور تعلق رکھتے ہیں۔

میں علی میاں (مولانا فراہی کے پوتے اور مدرسۃ الاصلاح کے موجودہ ناظم) کا ممنون ہوں کہ انہوں نے انتہائی فراخدلی سے اس کتاب کو پاکستان لانے کی اجازت مرحمت فرمائی اور اپنے مسافر نواز ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا۔ علی میاں عاصم سلمہ کے سگے ماموں ہیں اور عاصم نے معاملے کا فیصلہ ان پر چھوڑ دیا۔ اگر علی میاں کی رضامندی حاصل نہ ہوتی تو میرے لئے دشواری پیدا ہو جاتی۔ میں عاصم نعمانی کا بھی شکر گذار ہوں جن کی جستجو اور جوہر شناسی کی بدولت یہ کتاب ضائع ہونے سے بچ گئی۔ عاصم نعمانی ان سینکڑوں ہزاروں جواہر پاروں میں سے ایک ہیں جو اس خطہ نے پیدا کیے مگر انہیں آگے بڑھنے کا موقع نہ ملا اور وہ ضائع ہو گئے۔ میں اس نوجوان کی قوت حافظہ اور دماغی صلاحیتیں دیکھ کر بہت متأثر ہوا۔ جاھلی شعراء کا کلام جس طرح انہیں یاد ہے اس کی مثالیں زوال علم و عرفاں کے اس دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ زمانہ طالب علمی کی پڑھی ہوئی چیزیں ایک مدت گذرنے کے بعد آج بھی انہیں یوں ازبر ہیں کہ جیسے دیکھ کر پڑھ رہے ہوں۔ مولانا فراہی کے دو شعروں کا ماخذ فقط عاصم نعمانی کا دماغ رہ گیا ہے۔ پہلے وہ شعر

سن لیجئے

قسماً بمن رفع السماء من غیر حـــــیّ
و اختار خیـــــر الخلق من آل لـــویّ

لـم ابنہـا طمـع الخلـود و انمــــا
هــــــی زینة الدنیا لحیّ بعد حـــیّ

معتصم نعمانی کو اب سے ۲۰ برس پہلے،کاغذ کا ایک ٹکڑا،بادامی رنگ کا، بوسیدہ حالت میں، مولانا فراھی کے اپنے خط میں پنسل سے لکھا ھوا، حاجی رشید صاحب (برادر خورد فراھی) کی کتابوں میں ملا تھا جو ذرا سا ادھر اُدھر کرنے سے پھٹ جاتا تھا۔ وہ کاغذ تو گم ھو گیا البتہ اس پر درج اشعار معتصم نعمانی کے حافظے میں باقی رہ گئے۔ مولانا فراھی نے یہ اشعار گھر کے دروازے پر اپنے یا کسی اور کے ، لگانے کے لئے لکھے تھے اس لئے کہ اشعار سے پہلے «علی باب البیت» عنوان بھی کاغذ پر لکھا ھوا تھا۔ پہلے مصرعے میں حی کے معنی عاصم کے خیال میں کھمبے کے ھیں۔ جو تحقیق طلب ہے. اگر لغت ساتھ دے تو اس کو پڑھ کر ذھن قرآن مجید کی ایک آیت کے ان الفاظ کی طرف منتقل ھوتا ہے۔ اللہ الذی رفع السمٰوات بغیر عمد ترونہا (رعد ـ ۲) لیکن اجمل اصلاحی کا خیال ہے کہ «من غیر حیّ» نہیں «من غیر عیّ» ھوگا۔ اس لئے کہ حی کے معنی ستون کے نہیں آتے۔ عی کے ساتھ بھی مصرعہ موزوں رھتا ہے اور بات بھی بن جاتی ہے۔ عی معنی عجز و قصور کے ھیں۔ اسی طرح دوسرے مصرعے میں «من آل لوی» کی جگہ عاصم نعمانی کے بیان کے مطابق «من الالوی» لکھا ھوا تھا۔ لیکن اس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ «من آل لوی» اجمل اصلاحی کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اجمل سلمہ کی یہ دونوں باتیں

دل کو لگتی ھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ شعر کہتے ھیں یا نہیں، ان کی یہ دونوں کوششیں ان کے ذوق شعر و ادب کا کافی ثبوت فراھم کرتی ھیں۔ ان شعروں کی موجودگی کا ذکر بھی پہلے انہی نے کیا تھا۔

ذکر عاصم نعمانی کا تھا۔ انہوں نے عربی چہارم تک مدرسة الاصلاح میں پڑھا۔ تکمیل سے پہلے ندوہ چلے گئے۔ تکمیل وھاں بھی نہیں کی. ششم یا ھفتم تک ندوہ میں رھے۔ اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے عالم فاضل کا امتحان پاس کیا اور طبیہ کالج لکھنؤ میں داخلہ لے لیا جہاں سے ایف ایم بی ایس کا پانچ سالہ کورس کرنے کے بعد سند فراغت لی. اعظم گڑھ میں قیام کے دوران ان سے متعدد ملاقاتیں ھوئیں۔ مجھے بار بار یہ احساس ھوتا رھا کہ یہ نوجوان اگر یکسوئی کے ساتھ فراھی کے فکری مشن کی تکمیل میں لگ جاتا تو کارھائے نمایاں انجام دیتا۔ جو اب شعلۂ مستعجل کی طرح بجھ کر کوئلے اور راکھ میں تبدیل ھو چکا ہے۔ حسرت تو ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔ عاصم نعمانی کے پاس شبلی کے بھائی جنید صاحب کے اصل خطوط کا ایک ضخیم مجموعہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چھوٹی موٹی نادر اور نایاب چیزیں ھیں۔ مجھے اپنے پروجیکٹ فراھی کے سلسلے میں ان کی مدد سے کئی مفید باتیں معلوم ھوئیں۔

عام حالات میں شاید میں ادھر متوجہ نہ ھوتا لیکن جب مجھے یہ معلوم ھوا کہ متعلقین فراھی میں سے کسی نے اس کا کھوج لگایا ہے تو میری دلچسپی میں اضافہ ھوا۔ میں نے پھریہا جا کر عاصم نعمانی سے ملاقات کی اور سوالات کرکے اس کے متعلق معلومات فراھم کیں۔ میرے سوالات کا زبانی جواب دینے کے علاوہ انہوں نے کچھ باتیں میری فرمائش پر لکھ کر بھی دیں۔

بہتر ھوگا کہ ان کی یہ باتیں انھی کے الفاظ میں نقل کر دی جائیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا فراہی رحمۃ اللہ کی پوری زندگی کا غائرانہ مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ مولانا موصوف نے سارے دنیاوی مشاغل کو یکسر ختم کرکے اپنی تمامتر توجہ قرآن حکیم کے تدبر کے لئے مرکوز کر دی تھی چنانچہ موصوف نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کا کسی نہ کسی زاویے سے تعلق قرآن مجید ھی سے مشاھدہ میں آتا ہے۔ فن نحو، فن بلاغت، مفردات پر مولانا کی خامہ فرسائی اسی امر کی دلیل ہے۔ مولانا کے زیر نظر شعری انتخابی مجموعہ کا از اول تا آخر جائزہ لینے سے دو باتیں سامنے آتی ھیں۔

(۱) پہلی یہ کہ اس مجموعہ میں ان اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں قرآنی الفاظ زیادہ سے زیادہ استعمال ھوئے ھوں۔ نیز اس زمانے کے جاھلی شعرا کا کلام چنا گیا ہے جو اسلوب کے اعتبار سے نسبتاً قرآن سے قریب تر ھوں۔

(۲) دوسری بات جو اس مجموعے کی ورق گردانی سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مجموعۂ اشعار اسلامی عقائد میں پختگی پیدا کرتا ہے۔ توحید، معاد، جزا و سزا، شرافت نفس اور اعلی اخلاقی اقدار کو اپنے اندر بدرجۂ اتم سموئے ھوئے ہے۔ اس مجموعہ میں مخرب اخلاق اشعار سے اجتناب کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان اسالیب والے اشعار کو شامل کیا گیا ہے جن کا استعمال علی العموم قرآن میں بار بار کیا گیا ہے۔ اس مجموعۂ کلام کے مطالعہ سے مفردات القرآن کے معانی کے تعین میں بڑی مدد لی جا سکتی ہے۔ جبکہ قرآن حکیم کو سمجھنے اور سمجھانے میں مفردات کو بڑی اھمیت حاصل ہے۔

میرے سوالات میں تین باتیں خاص کر اھم تھیں۔ چونکہ ان کے

جوابات عاصم سلمه کی تحریر میں نہیں ہیں اس لئے ان کی بابت الگ سے ذکر ضروری ہے۔

میرا پہلا سوال یہ تھا کہ ان کو یہ کتاب کہاں سے اور کس طرح ملی۔ بعض دوسرے لوگوں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ یہ کتاب عاصم کو بندول میں اپنے دادا حکیم یوسف صاحب کی کتابوں میں ملی تھی - یہ ان لوگوں کا قیاس تھا۔ عاصم کا اپنا بیان یہ ہے کہ انہیں یہ کتاب پھریہا میں مولانا فراهی کے گھر سے نہیں بلکہ پڑوس کے ایک گھر سے ملی۔ یہ کوئی ۱۹۵۷ - ۱۹۵۸ء کی بات ہے جب ان کی عمر ابھی ۱٦ - ۱۷ سال تھی اور وہ الاصلاح میں درجہ دوم یا سوم عربی کے طالبعلم تھے۔

مولانا فراهی کے پڑوس میں ان کے خاندان کے علاوہ برادری کے لوگوں میں سے کسی اور کا گھر نہیں ہے۔ صرف رعایا اور اسامیوں کے گھر ہیں۔ یہ بات غور طلب ہے کہ یہ کتاب پڑوسی کے گھر کہاں سے کس طرح پہنچی۔ عاصم نعمانی کے خیال میں یہ ان کے دادا کی لکھی ہوئی ہے اور انہی کے لئے مولانا فراهی نے یہ انتخاب کیا تھا۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس کو بندول میں ہونا چاهئے تھا۔ یہ کتاب بندول سے پھریہا کیسے آئی اور پھریہا میں مولانا فراهی یا خاندان کے کسی اور فرد کے گھر سے ملنے کی بجائے پڑوس کے ایک بیگانے گھر سے کیوں ملی۔

میرا دوسرا سوال سرورق کے متعلق تھا۔ کتاب کا پہلا اور دوسرا صفحہ باقی صفحات سے مختلف ہے۔ اس کے متعلق عاصم کا بیان ہے کہ یہ دونوں صفحے انہوں نے خود لکھ کر لگائے ہیں۔ مگر یہ ان کا اضافہ یا الحاق نہیں ہے بلکہ اصل کے مطابق نقل کرکے بعد میں لگائے ہیں۔ چونکہ یہ دونوں صفحے بوسیدگی کی وجہ سے کٹ پٹ کر بالکل خراب ہو گئے تھے اور ان کے ضیاع کا اندیشہ تھا اس لئے انہوں نے ٹکڑوں کو یکجا کرکے مربوط کیا اور ان

کی تحریروں کو دوسرے کاغذ پر نقل کرکے ساتھ لگا دیا۔ اگر وہ نقل کے ساتھ اصل کو بھی جس حال میں بھی تھی محفوظ رکھتے تو یہ ثبوت کے لئے کافی ہوتا۔

سرورق کے صرف پہلے صفحے پر ہی فراہی کا نام ہے۔ اس صورت حال نے کتاب کی استنادی حیثیت کو بہت کمزور کر دیا۔ اب عاصم کے بیان پر اعتماد کرکے ہی اس کو مولانا فراہی کا انتخاب تسلیم کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ دوسرے قرائن بھی اس کی تائید کریں۔ داخلی شہادت میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ جن شعراء کا کلام درج کیا گیا ہے اور ان کے جو اشعار لئے گئے ہیں وہ فراہی کی اپنی ادبی شخصیت مذاق اور معیار سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔ اور یہ کام کوئی مزاج شناس فراہی ہی کر سکتا ہے جس کا اپنا ناقدانہ شعور اور ادبی ذوق اتنا بلند ہو کہ وہ پرکھ کر دیکھ سکے۔ کوئی صاحب چاہیں تو طبع آزمائی کر سکتے ہیں۔ سردست میں ہی آئندہ صفحات میں اس نقطہ نظر سے مختصراً جائزہ لینے کی کوشش کروں گا۔ بہر حال اس کتاب کی نسبت سے پہلا بنیادی اور اہم سوال یہی ہے کہ مولانا فراہی کی طرف اس کی نسبت کس حد تک صحیح اور لائق اعتبار ہے۔ اگر اصل سرورق موجود ہوتا اور اس پر ان کا نام درج ہوتا تو یہ اشکال پیدا نہ ہوتا۔ ان حالات میں شعروں کے انتخاب کو دیکھنا ہوگا کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ عاصم نعمانی نے اپنی تحریر میں اس جہت سے بعض نکات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ ان اشعار میں قرآن مجید کے اشباہ و نظائر بکثرت ملتے ہیں جو مولانا فراہی کا خاص انداز ہے۔ یہ نکتہ توجہ طلب ہے مگر تفصیلی جائزہ کے بعد ہی اس سلسلے میں کوئی قطعی بات کہی جا سکتی ہے۔

میرا تیسرا سوال اس کے خط کے بارے میں تھا۔ خط کے بارے میں یہ طے ہے کہ مولانا فراہی کا نہیں ہے۔ اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ عاصم

نعمانی کا کہنا ہے کہ یہ نسخہ ان کے دادا حکیم یوسف صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حکیم یوسف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں سے انہوں نے ملا کر دیکھا ہے اور انہیں یقین ہے کہ یہ خط انہی کا ہے۔ لیکن خط ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ خط کے بارے میں کتاب کے اندر کوئی اندراج موجود نہیں۔ ایسی صورت میں اندازہ اور قیاس ھی لگایا جا سکتا ہے۔ حکیم یوسف صاحبؒ کا خط اگر ثابت ہے تو اس سے مولانا فراھی کے ساتھ ان کی نسبت اور تعلق کے پیش نظر ذھن اس طرف جاتا ہے کہ یہ انتخاب مولانا فراھی کا ہوگا۔ کیونکہ حکیم یوسف صاحب مولانا فراھی کے عزیز بھی تھے اور شاگرد بھی۔

سرورق کے بعد فہرست کتاب والے صفحہ پر جو بعد میں لگایا گیا ہے بالکل آخر میں دستخط کے انداز میں "شمیم الدین" لکھا ہوا ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ کوئی صاحب شمیم الدین ان دو صفحات یا پوری کتاب کے کاتب یا ناقل ہوں گے لیکن عاصم سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے نفی میں جواب دیا اور صراحت سے بتایا کہ شمیم الدین کسی نے یوں ھی لکھ دیا ہے۔ شروع کے دو صفحات یا پوری کتاب کی کتابت سے "شمیم الدین" نامی کسی شخص کا کوئی تعلق نہیں۔

مولانا بدر الدین اصلاحی سے اس کا ذکر آیا اور میں نے ان کی رائے اور رد عمل معلوم کرنا چاھا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ انہوں نے سرے سے اس کو در خور اعتنا اور لائق توجہ نہیں گردانا اور مجھے مشورہ دیا کہ اس قسم کی گری پڑی چیزوں کو اھمیت نہ دیں اور مولانا فراھی کے باقیات میں اس کا ذکر نہ کریں۔

لیکن میرے سامنے یہ سوال تھا اور ہے کہ جب ایک چیز ان کے نام کے ساتھ محسوس اور مرئی شکل میں ٹھوس حقیقت بن کر ثابت و موجود ہے تو اس

کو یوں ھی کس طرح نظر انداز کر دیا جائے۔ سرورق کو الحاقی یا جعلی قرار دے کر رد کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ دوسرے قرائن اور شواھد بھی اس کے حق میں ھوں۔ قدیم جاھلی شعراء کے عربی اشعار کا انتخاب، کاغذ اور سیاھی کی قدامت ، خاندان فراھی کے ایک فرد کے پاس اس کی موجودگی ایسے قرائن ھیں کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا فراھی کے جتنے مسودات ھیں ان میں سے کسی پر بھی ان کا نام درج نہیں ہے مگر چونکہ وہ ان کے اپنے خط میں ھیں اور اس کے مباحث ان کے خاص ھیں اور ان کا حیّز طبعی اپنا ہے اس لئے نام نہ ھونے کے باوجود ان کی نسبت کے بارے میں کسی کو شک و شبہہ نہیں ھو سکتا۔ مگر اس کتاب کو چونکہ وہ درجہ حاصل نہیں اس لئے بعض الجھنیں پیدا ھوتی ھیں۔ اور اس کو آنکھ بند کرکے مولانا فراھی کا انتخاب تسلیم کر لینا درست نہ ھوگا ۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس کی طرف مطلق التفات ھی نہ کیا جائے ۔

اجمل اصلاحی اور بعض دوسرے اصحاب کا خیال ہے کہ کسی طالب علم کے لئے مولانا فراھی نے یہ اشعار لکھوا دیئے ھوں گے اور یہ بھی ھو سکتا ہے کہ خود حکیم یوسف کی ضرورت طالب علمی کے لئے انھوں نے یہ انتخاب لکھوا دیا ھو یا نشان لگا کر دے دیا ھو کہ وہ نقل کر لیں۔ خود انتخاب کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی. علاوہ ازیں اپنی ھیئت کذائی کے ساتھ یہ مجموعہ مولانا فراھی جیسے بلند پایہ عالم شاعر اور ادیب کی طرف سے کسی سنجیدہ کوشش کاوش اور اھتمام کا نتیجہ نہیں ھو سکتا۔

کتاب کے آخری صفحہ (۸۰) کی آخری دو سطروں میں (اس صفحے کا عکس مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں) اس کا سن کتابت واضح طور پر درج ہے جو یوں ھیں۔

„قد تمت ھذہ النسخة فی شھر جمادی الاولی

لسنة اربع و ثلاثین علی ثلاثة مائة و الف من الھجریة»

یہ نسخہ جمادی الاولی ۱۳۳۴ ھجری میں مکمل ھو۔ ظاھر ہے اس سے اشارہ کتابت ھی کی طرف ھو سکتا ہے نہ کہ جمع و تدوین کی طرف کتاب کے دوسرے صفحہ پر بھی فھرست کے بعد سال کتابت سے متعلق بعینہ یہ الفاظ درج ھیں لیکن چونکہ پہلا اور دوسرا صفحہ اصل کیساتھ کا نہیں ہے بلکہ بعد میں لگایا گیا ہے ،اسکا کاغذ رسم الخط اور سیاھی وغیرہ بالکل حال کی ہے، اسلئے اس کی استنادی حیثیت اس بایے کی نہیں ھو سکتی، لیکن آخری صفحے کی آخری دو سطروں کے مذکورہ بالا الفاظ کے بعد اس بیان کے بارے میں کسی شک و شبھے کی گنجائش باقی نہیں رھتی. ان دو سطروں کا رسم الخط کاغذ اور سیاھی ایک دم وھی ہے جو پوری کتاب میں ہے اور جس کی قدامت مسلّم ہے۔ کاغذ رنگ اور خستگی سے بالکل نمایاں ہے کہ وہ اب سے ٦۰۔ ۷۰ سال پہلے کا ہے۔ میری نظر اس باب میں عامیانہ اور سطحی ہے مگر قدیم قلمی نسخوں کے کسی پارکھ سے رجوع کیا جائے تو امید ہے کہ وہ بھی یہی رائے دے گا۔ میں اطمینان کے لئے کسی ماھر سے رجوع کروں گا۔

یہ ضروری نہیں کہ جو اس کتاب کا سال کتابت ہے وھی سال جمع و تدوین بھی ھو لیکن اتنا طے ہے کہ یہ انتخاب ۱۳۳۴ کے بعد کا نہیں پہلے کا ہے۔ اس موقع پر مولانا فراھی کے سنۂ ولادت اور سنۂ وفات کو سامنے رکھا جائے تو اس نسخہ کتاب کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے میں شاید مدد ملے۔ ھجری تقویم کے مطابق ۱۲۸۰ ھ ان کا سنہ پیدائش اور ۱۳۴۹ھ سنہ ارتحال ہے۔ گویا اس کی کتابت مولانا کی وفات سے ۱۵ سال پہلے ھوئی جب ان کی عمر ۵۴ برس ھو چکی تھی۔

اصل کتاب جو تادم تحریر میرے پاس ہے مختصراً اس کا حلیہ اور سراپا بیان کر دیا جائے تو نامناسب نہ ھوگا۔ کتاب اس وقت مجلد حالت میں ہے لیکن

اس کی جلد آج کل کی ہے۔ کتاب کے پشتے پر اوپر نیچے دو جگہ سفید کاغذ کی ٹکلیاں لگی ہوئی ہیں اور ان پر باقاعدہ کتاب کا نام اور نمبر وغیرہ لکھا ہوا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی ایسے کتب خانے یا لائبریری کی زینت رہ چکی ہے جس میں کتابیں باقاعدہ اہتمام کے ساتھ رکھی جاتی تھیں۔ عاصم کے بیان کے مطابق یہ کتاب جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کے ناظم مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی نے دیکھنے کے لئے لی۔ انہوں نے اسے اپنے ادارے کی لائبریری میں داخل کر لیا یہ نمبر انہی کا ڈالا ہوا ہے۔ ۴ ـ ۵ برس تک یہ کتاب جامعۃ الرشاد کی لائبریری میں رہی۔ اس کے بعد واپس ملی۔ اس کی تقطیع ۲۰ x ۳۰ کی ہے۔ کل صفحات ۸۰ ہیں جن میں پہلا دوسرا صفحہ جدید العہد ہے۔ پہلے صفحے پر چار سطروں میں یہ اندراجات ہیں۔«مختارات.من قسم الشعر۔ اختارھا۔ الامام المعلم عبد الحمید الفراھی»۔ ڈیش علیحدہ سطر کو ممیز کرنے کے لئے میں نے لگا دیا ہے۔ سرورق کتاب کا نام «مختارات» ہے جبکہ کتاب کے پشتے پر کتاب کا نام المختارات الف لام کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ جلد کے ساتھ علیحدہ سے لگائے گئے ورق پر بھی سرورق کی عبارت لکھی گئی ہے لیکن اس میں المعلم کا لفظ نہیں ہے صرف «الامام عبد الحمید الفراھی» ہے۔ کتاب کے پشتے پر نیچے ۹۵ کا عدد لکھا ہوا ہے جبکہ اندر جلد کے ساتھ والے صفحے پر ۲۲/۵۶۳ رقم ہے۔ دوسرے صفحے پر کتاب کی فہرست ہے جس میں صفحہ نمبر اور شاعروں کے نام ہیں۔ چونکہ اس کے بعد کے صفحہ (عکس ملاحظہ ہو) پر ۳ کا عدد ہے اور یہ صفحہ پہلے اور دوسرے صفحہ کی طرح بعد کا نہیں بلکہ اصل کے ساتھ کا پرانا ہے اس لئے اس سے پہلے دو صفحات کا ہونا ناگزیر ہے۔ صرف دو صفحات ہی ہو سکتے ہیں، نہ زیادہ نہ کم۔اور ظاہر ہے کہ یہ دو صفحات معروف طریقے کے مطابق سرورق ور فہرست ہی کے ہو سکتے ہیں۔ صفحہ ۳ سے کتاب شروع ہوتی ہے۔ اس طرح کہ شاعر کے نام کے ساتھ «قال فلان» کرکے

جلی خط میں گویا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد آمنے سامنے دونوں مصرعے لکھ کر اشعار درج کئے گئے ہیں۔ عنوان کے بعد اور اشعار سے پہلے بحر کا نام بھی بالالتزام درج ہے۔ اصل کتاب چونکہ حسب وعدہ کتاب کے مالک عاصم نعمانی کو کسی مناسب وقت پر واپس بھیجنی ہے اس لئے از راہ احتیاط میں نے اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی تیار کرا لی ہے۔اس کی ایک کاپی میرے پاس ہے اور ایک کاپی ادارہ تحقیقات اسلامی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

کہیں کہیں حاشیے میں پنسل سے نوٹ بھی لکھے ہوئے ہیں جن میں مشکل الفاظ کے معنی اور وضاحتی اشارات ہیں جو فارسی اور عربی میں ہیں۔ ان کے خط سے گمان ہوتا ہے کہ یہ مولانا فراہی کا ہاتھ ہے۔ حاشیہ لکھنے کا انداز بھی انہی کا لگتا ہے۔ مثلاً ص ۳ کے اوپر ایک حاشیہ کی دو سطریں یوں ہیں "فلان لا یعرف الحی من اللیّ - یعنی حق از باطل نشناسد" ایک حاشیہ یوں ہے "افسانہ گویندگاں - مجلس افسانہ" ایک اور حاشیہ یوں ہے۔ "لشکر گـــــــراں- نامے لشکرے کہ منذر را بود و دیارے است بیمامہ" - صفحہ ۱۰ پر "قال ابو النشناش النہشلی اللّصّ" کے اوپر نمبر ۱ ڈال کر نیچے یہ حاشیہ ہے "؎ وفی حماسة هذه الاشعار مروية بتغير الالفاظ علی ص ۱۲۲" اس طرح کے نوٹ اور بھی ہیں۔ اس کے بعد ص ۵۷ پر یہ نوٹ بھی لائق توجہ ہے۔ "هبت ام مرزم وهی الشمال لأنها تاتی بنوء المرزم و معه المطر و البرد"

حاشیے کے بارے میں عاصم نعمانی سے میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ حاشیے پڑھتے وقت میں نے لکھے تھے۔ لیکن بہ نظر غائر دیکھنے اور پرکھنے کے بعد عاصم کا یہ بیان محل نظر معلوم ہوتا ہے۔ عاصم کے ہاتھ کی تحریر میرے پاس ہے۔ ان کے خط میں اور ان حواشی کے خط میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ بعض حاشیے دوسرے ہاتھ کے بھی ہیں جو عاصم کے ہو سکتے ہیں۔ گفتگو کے وقت چونکہ کتاب سامنے موجود نہیں تھی اس لیے زیادہ دو ٹوک بات

نہ ہو سکتی تھی ۔ بہر حال اگر یہ حاشیے مولانا فراھی کے ھاتھ کے ھیں تو اس سے بھی فراھی کے ساتھ اس کتاب کی نسبت کے خیال کو تقویت ملتی ہے۔

معلوم ھوتا ہے کہ کتابت سرکنڈے کے قلم سے کی گئی اور روشنائی بھی گھر کی بنی ھوئی معلوم ھوتی ہے۔ کاغذ دبیز مضبوط اور چکنا ہے رنگت بالکل زرد بلکہ سیاھی مائل زرد ہے۔ اور یہ رنگ کہنگی کا غماز ہے۔ کاغذ یوں تو دیکھنے میں مضبوط نظر آتا ہے مگر موڑنے سے فوراً ٹوٹ جاتا ہے ۔ اس سے بھی کتاب کی قدامت کا اندازہ ھوتا ہے۔

اس مجموعے میں مختلف شعراء کے چھوٹے بڑے کل ۸۱ انتخاب ھیں۔ ان میں سے بعض مشہور شعراء کے نام یہ ھیں۔ درید بن صمہ، امراوالقیس مالک بن نویرہ، مہلهل بن ربیعہ اعشی باھلہ، تأبط شرا، عمرو بن معدی کرب، سلامة بن جندل ۔

ان میں سے بعض شاعروں کا نام ایک سے زائد بار بھی آتا ہے۔ ایسے انتخاب بھی ھیں جن کے ساتھ کسی شاعر کا نام نہیں ہے اور " و قال بعضهم" لکھ کر اشعار درج کر دئے ھیں۔ ان میں جو بحریں برتی گئی ھیں اشعار کے اندراج سے پہلے ان بحروں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ھر انتخاب کے ساتھ درج ذیل بحور میں سے کسی ایک کا ذکر ہے

خفیف، بسیط، رجز، طویل، هزج، کامل، وافر، سریع، متقارب، منسرح

اس مجموعے میں شامل بیشتر شعراء غیر معروف ھیں اور ان کا کلام عام طور سے متداول نہیں ہے جبکہ بعض انتخابات بغیر نام ھی کے ھیں۔ اگر یہ ثابت ھو جائے کہ یہ مجموعہ مولانا فراھی کا انتخاب کردہ ہے تو اس پر تحقیقی کام ھو سکتا ہے۔ قدیم شعرائے جاھلیت کے دواوین اور مجامیع کی ورق گردانی کرکے تقابلی مطالعہ کیا جائے تو مفید علمی نتائج برآمد ھو سکتے ھیں۔ اس کے لیے دار المصنفین اعظم گڑھ اور ندوة العلماء لکھنؤ کے کتب خانوں

میں بیٹھ کر کام کرنے کی ضرورت ہوگی اس لیے کہ شعرائے جاہلیت کا غیر متداول اور نایاب کلام بڑی حد تک ان کتب خانوں میں موجود ہے۔

****

۸۰

وما التیفاق والمعفا ق والعنیداق والارمد
وما العطاط والقطا ط والملطاط والمذود
وما الظن وما الظن وما القن وما الاعود
وما العاق والنات ق والفاسق والمصمد
وما الهضهاض والانفا ض والاوناض والاقمد
وما اللضلاض والنفا ض والانواض والمقعد
وما العارض والغامـ ض والنافض والانقد
وما الكتفان والكلفا ن والصرفان والارغد
الا لا تحقرن شعری فشعری من يريد ازيد
لقد حسنت شعرا كالـ حريت المضرم الموقد
نصيحا لو حضر سحبا اقر له لبيد ابلد
الا قل للمجادل ويد لك سلم لا تكن اعند
فانت الصاغر الضارع وانت الاعقد الافند
لقد كلفت يا مسكين تقاتل بالحديد ادرد
وان خاركك سكت قل فميدان السباق اجرد

قد تمت هذه النسخة فی شهر جمادی الاولی
لسنة اربع وثلاثين على ثلاثمائة والف من الهجرية

٣

قال عدي بن رعلاء الغساني

(الخفيف)

ربما ضربة بسيف صقيل — دون بصرى وطعنة نجلاء
وغموس تضل فيها يد الآ — سي ويعيي طبيبها بالدواء
رفعوا راية الضراب وآلوا — ليذودن سامر الملحاء
فصبرنا النفوس للطعن حتى — جرت الخيل بيننا في الدماء
ليس من مات فاستراح بميت — انما الميت ميت الاحياء
انما الميت من يعيش ذليلا — سيئا باله قليل الرجاء

قال رجل من غني

(البسيط)

ان العواذل قد اتعبنني نصبا — وخلتهن ضعيفات القوى كذبا
الغاديات على لوم الفتى سفها — فيما استفاد ولا يرجعن ما ذهبا
يا ايها الراكب المزجي مطيته — لا نعمة تبتغي عندي ولا نسبا
اعص العواذل وارم الليل عن عرض — بذي سبيب يقاسي ليله خببا
نائي المعدين خاط لحمه زيم — سام يجر جياد الخيل مجتذبا
مل الحزام اذا ما اشتد محزمه — ذي كاهل وليان يملأ اللببا
يظل يخلج طرف العين مشترفا — فوق الاكام اذا ما انتص وارتقبا
كالسمع لم ينقب البيطار سرته — ولم يدجه ولم يضرب له عصبا
عاري النواهق لا ينفك مقتعدا — في المطنبات كاسراب القطا عصبا

مواخاۃ' اسلامی معاشرے کا سنگ بنیاد

محمد یوسف فاروقی

اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

مواخاۃ أخوۃ سے مشتق ہے جس کے معنی ھیں ایک دوسرے کا بھائی بننا۔ تاریخ اسلامی میں یہ لفظ ایک مثالی معاشرہ کا عنوان بن گیا ہے۔ عام طور پر سیرت کی کتابوں میں مواخاۃ کا ذکر اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ یہ محض مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارہ پیدا کرنے کے لئے اختیار کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں دونوں طبقوں کے درمیان رشتۂ اخوت مضبوط ھو گیا تھا، لیکن اگر بنظر غایر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ھوتا ہے کہ یہ عمل رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی کا ایک اھم حصہ تھا ، جس کے بہت دور رس معاشرتی سیاسی اور اقتصادی نتائج برآمد ھوئے ۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں یہ عمل دو مرتبہ پیش آیا۔ پہلی مواخاۃ مکہ مکرمہ میں ھوئی اور یہ وھاں اسلام قبول کرنے والوں کے درمیان کرائی گئی تھی۔ مکی زندگی میں جب مختلف گھرانوں اور مختلف قبائل کے ایک ایک یا دو دو افراد اسلام قبول کر رھے تھے، ان میں قریش کے افراد بھی تھے اور بعض دیگر قبائل سے تعلق رکھنے والے بھی، بعض مال دار بھی تھے اور بہت سے نادار و غریب بھی، حلقۂ اسلام میں داخل ھونے کا خمیازہ انھیں یہ بھگتنا پڑتا تھا کہ اپنے ھی خاندان کی دشمنی مول لینا پڑتی تھی، گھر والے منہ موڑ لیتے تھے، رشتہ دار اور احباب قطع تعلق کر لیتے تھے، قبائلی نظام میں خاندان کی

سرپرستی اور تحفظ کی جو ضمانت حاصل ہوتی تھی اب اس کی بھی کوئی ضمانت نہ تھی، بلکہ دین سے ہٹانے کے لئے مختلف حربے استعمال کیے جاتے تھے، ایسی صورت میں یہ لوگ اپنے آپ کو تنہا تنہا محسوس کرنے لگے تھے، مصائب و ابتلاء کے اس دور میں یہ احساس شدت سے ابھر رہا تھا کہ ان کا کوئی قریبی دوست ہو جس سے حال دل کہہ سکیں۔ کوئی ایسا شریک غم ہو جس کے سامنے اپنے غم کو ھلکا کر سکیں، خونی رشتوں کے منقطع ہو جانے کی وجہ سے جس انس و تعلق کے فقدان کا احساس ہو رہا ہے وہ ختم ہو جائے۔ یہ ایک اہم معاشرتی مسئلہ تھا جسے رسول اللہ نے اس طرح حل فرمایا کہ ان کے درمیان مواخاۃ کرادی. اس طرح ان مسلمانوں کے درمیان ایک نیا رشتہ الفت و محبت قائم ہو گیا۔ اس عقد مواخاۃ سے ان افراد کے تحفظ اور آباد کاری کا حل بھی پیش نظر تھا جو مکہ مکرمہ کے باشندے نہ تھے۔ بلکہ باہر سے آئے تھے اور دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ مواخاۃ جن لوگوں میں کرائی گئی تھی وہ یہ تھے۔

ابو بکر صدیق اور عمر فاروق کو باہم بھائی بنا دیا گیا، حضرت عثمان غنی کے بھائی عبد الرحمن بن عوف ہوئے۔ عبیدہ بن الحارث اور بلال بن رباح، ابو عبیدہ اور سالم مولی ابی حذیفہ، زبیر بن عوام اور عبد اللہ بن مسعود، مصعب بن عمیر اور سعد بن ابی وقاص، سعد بن زید اور طلحہ بن عبید اللہ میں بھائی بندی ہوئی.

مستدرک حاکم میں حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ائ اصحاب کے درمیان مواخاۃ کرادی تو اس موقعہ پر حضرت علی باقی رہ گئے تھے ۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے ان سب کے درمیان رشتہ اخوۃ قائم کر دیا ہے میرا بھائی کون ہوگا؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا میں تمہارا بھائی ہوں۔ (۱) یہ پہلی مواخاۃ تھی جو معاشرتی ضرورت کے تحت عمل میں

آتی تھی۔ ایک اور اہم بات جو اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر تھی وہ یہ کہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے وہ افراد جو بہت غریب تھے یا وہ جنہوں نے غلامی کی حالت میں زندگی کا طویل حصہ گزارا تھا، جس کی وجہ سے ان کی ذھنی سطح سرداران عرب کے مقابلہ میں بہت نیچی تھی، عزائم اور طبیعت میں بھی قائدین کا سا ولولہ اور بلندی نہیں تھی، ان کی مواخاۃ ایسے افراد کے ساتھ کرائی گئی جو قریش کے نمایاں طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور پوری طرح قائدانہ صلاحیتیں رکھتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ دل و دماغ پر غلامی کے جو اثرات تھے وہ بہت جلد ختم ہو گئے اور فکری و طبعی اعتبار سے وہ بھی اعلی درجے کی قائدانہ صلاحیتوں کے مالک بن گئے۔ ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالم کا مقام تو اس قدر بلند ہوا کہ حضرت عمر نے اپنی وفات سے قبل فرمایا تھا کہ "اگر آج سالم مولی ابی حذیفہ زندہ ہوتے تو میں انہیں مسلمانوں کا خلیفہ مقرر کر دیتا"(۲۱)۔ حضرت عمر کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ سالم میں اتنی بڑی تبدیلی آ گئی تھی کہ وہ بہت سے آزاد اور نمایاں حیثیت رکھنے والوں سے بھی سبقت لے گئے تھے۔ تو آزاد غلاموں میں اتنا بڑا انقلاب رسول اللہ ﷺ کی اس بلند اور کامیاب پالیسی کا نتیجہ تھا۔ اس اسلامی روح کے اثرات عہد نبوی کے بعد بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ علماء کرام کی نمایاں شخصیتوں میں موالی بھی اپنی فکری اور علمی وسعتوں کے ساتھ میدان علم و عمل میں سر خیل نظر آتے ہیں۔ مکہ مکرمہ میں عطا ابن رباح، یمن میں طاؤس بن کیسان، سر زمین مصر میں یزید بن حبیب، شام میں امام مکحول، خراسان میں ضحاک بن مزاحم، جزیرہ میں میمون بن مہران اور بصرہ میں حسن بن ابی الحسن بصری وغیرہ موالی تھے اور أئمہ محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔

دوسری مرتبہ مواخاۃ مدینہ میں ھجرت کے تقریباً پانچ ماہ بعد

مہاجرین و انصار کے مابین ہوئی. اس مواخاہ کے ذریعہ ۴۵ مہاجرین کو ۴۵ انصار کے ساتھ رشتہ اخوت میں منسلک کر دیا گیا۔ یہ مواخاۃ کئی اعتبار سے تاریخ اسلام میں بہت اہمیت رکھتی ہے. سیاسی نقطہ نگاہ سے اس کے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔

ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو مدینہ منورہ میں اسلام قبول کرنے والوں میں سب سے زیادہ اہم طبقہ اوس و خزرج کا تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں ان کی باهمی خون ریز جنگوں کے زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوئے تھے۔ یہودی جو مدینہ کی اقتصادیات کو اپنے قبضہ میں لیے ہوئے تھے بظاہر رسول اللہ ﷺ کو خوش آمدید کہہ رہے تھے لیکن یہودیوں کی تاریخ پر نظر رکھنے والا کوئی فرد بھی ان پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا، یہودیوں کے پیش نظر ان کی اپنی سیاسی مصلحتیں تھیں، وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعاون کرکے عربوں کی قوت کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکیں گے اور روم کے عیسائیوں کے خلاف انتقامی کار وائی کر سکیں گے، جنھوں نے ان یہودیوں کو مقدس سر زمین فلسطین سے نکال دیا تھا۔ یہودیوں کے سیاسی عزائم کے پیش نظر اس بات کی ضرورت تھی کہ مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ یکجہتی اتحاد و استحکام ہو۔

مکۂ مکرمہ سے ہجرت کرکے آنیوالے مہاجرین کا تعلق عدنانی عربوں سے تھا، جو مکۂ مکرمہ اور حجاز کے صحرائی علاقوں میں آباد تھے، یہ لوگ بدویانہ زندگی کے عادی تھے، ان کی عادات و اطوار میں صحرائی قوم کے اثرات راسخ تھے، ان کی تہذیب و تمدن اور رسوم و رواج میں خشک صحرائی علاقوں کی تہذیب رچی بسی ہوئی تھی. دوسری طرف مدینہ منورہ میں آباد اوس و خزرج کا تعلق قحطانی عربوں سے تھا، یہ پہلے یمن میں آباد تھے، اور زراعت پیشہ لوگ تھے، اہل یمن زراعت اور آبپاشی میں بہت ترقی یافتہ تھے، انھوں

نے اپنی زمینوں کی آب پاشی کے لئے ایک عظیم الشان بند تعمیر کیا تھا جو تاریخ میں سد مآرب کے نام سے مشہور ہے،پانی کی کثرت اور اچھی زراعت کی وجہ سے یہ لوگ خوشحال تھے، قرآن حکیم میں سورۂ سبا میں ان کی خوش حالی کو بیان کیا گیا ہے،بعد میں ایک زبردست طوفان آیا جس کی وجہ سے اھل یمن کا یہ عظیم الشان بند بھی تباہ ھوگیا اور زمینیں زیر آب آگئیں،یہ سیلاب تاریخ میں سیل عرم کے نام سے منسھور ہے؟ قرآن حکیم نے بھی اس سیلاب کا ذکر کیا ہےاس تاریخی سیلاب کے بعد یہاں سے بہت سے قبائل نے ترک وطن کرلیا،لیکن یہ ایسی جگہوں پر جا کر آباد ہوئے جہاں اچھی قابل کاشت زمینیں تھیں اور پانی کی سہولت تھی، قبیلہ قحطان کے انھی لوگوں میں سے کچھ مدینہ منورہ میں جا کر آباد ھو گئے، اور وھاں بھی زراعت کو ذریعہ معاش بنایا، مدینہ منورہ کے مشہور قبائل اوس و خزرج کا تعلق انھی سے تھا، ان کی تہذیب و ثقافت میں متمدن اور متمول قوموں کے اثرات تھے۔ ھجرت کے بعد مدینۂ منورہ میں قحطانیوں اور عدنانیوں دونوں کا اجتماع ھو گیا۔ ان دونوں جماعتوں کے تہذیبی اور تمدنی فرق کو ختم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ انھیں ایک دوسرے سے بہت قریب کیا جائے، اور ایسا انداز تربیت اختیار کیا جائے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی اچھی عادات اور مفید طور طریقے تو اختیار کر لیں لیکن آپس میں کسی قسم کا نسلی تعصب نہ ابھر سکے۔ اس بات کا بہت زیادہ خطرہ تھا کہ یہودی جو مدینہ منورہ کی سیاست میں ایک اھم گروپ کی حیثیت رکھتے تھے وہ قحطانیوں کے اس تہذیبی اختلاف کو ابھاریں گے اور انھیں متحد ھونے کے بجائے تفریق کی راہ پر ڈالنے کی کوشش کرینگے۔ اس سے قبل اوس و خزرج کی طویل جنگوں میں وہ یہ کردار ادا کر چکے تھے۔ اس خطرہ کے پیش نظر اس بات کی ضرورت تھی کہ کوئی ایسا معاشرتی اھم فیصلہ کیا جائے، یا ایسی پالیسی اپنائی جائے کہ ان منڈلانے والے خطرات کی روک تھام کی جا سکے۔ لھذا ان

تمام خطرات کا سد باب کرنے اور ایک نئی ملت کی تشکیل کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے انصار و مہاجرین کے درمیان مواخاۃ کرائی. اس فیصلہ کی رو سے ان غریب مہاجرین کو انصار کے اموال میں شریک کر دیا گیا اور مرنے کے بعد وراثت میں بھی شریک ٹھہرایا گیا۔ اس عمل کا فوری طور پر اقتصادی فائدہ تو یہ ہوا کہ بے خانماں مہاجرین کی آباد کاری کا مسئلہ حل ہوا، ساتھ ھی ان کی معاشی مشکلات بھی دور ھوئیں۔ سرزمین مکہ سے ھجرت کرکے آنے والے یہ افراد تجارت پیشہ لوگ تھے۔ انصار کی مالی اعانت اور اپنے سابقہ تجارتی تجربات کی وجہ سے انہوں نے جلد ھی نہ صرف اپنے آپ کو مستحکم کر لیا بلکہ تجارت میں یہودیوں کی اجارہ داری کو بھی توڑ دیا۔ انصار و مہاجرین آپس میں اس قدر گھل مل گئے کہ عدنانی و قحطانی قبائل کا تہذیبی و تمدنی بُعد بھی ختم ہو گیا۔ اور ایک نئی تہذیب ایک نئے تمدن کا آغاز ہو گیا، وہ تہذیب و تمدن جس کی اساس اسلام کے بنیادی عقائد تھے۔

رسول اکرم ﷺ نے ان مختلف تہذیبی قبائل میں جو روح بیدار کی تھی اور جس خلوص و مودت کے ساتھ رشتہ مواخاۃ قائم فرمایا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ بہت جلد ایک ملت واحدہ بن گئے، جس کا کلمۂ جامعہ صرف اسلام تھا۔

جن لوگوں کے مابین یہ نیا رشتہ اخوت و محبت قائم ہوا تھا یہ خونی رشتوں سے بھی زیادہ مضبوط ثابت ہوا۔ ان کے باھمی ایثار و قربانی کا ذکر قرآن حکیم نے اس طرح کیا ہے.

"و یؤثرون علی انفسهم و لو کان بهم خصاصه"

وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ھیں وہ خود ضرورت مند کیوں نہ ھوں[۴]

تاریخ میں ھمیں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ پتہ

چل سکے کہ ان ۹۰ افراد میں کبھی بھی کوئی جھگڑا یا رنجش ہوئی ہو۔ حقیقی بھائیوں کے درمیان تو اختلافات اور جھگڑوں کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں مگر ان بھائیوں کے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ تاریخ میں کوئی ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی . ہاں اخوت و محبت ،ایثار و قربانی کی لا تعداد مثالیں موجود ہیں۔

****

---

(۱) فتح الباری، باب کیف آخی النبی بین اصحابہ ۔ ناموں کی مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے، ابن سید الناس، عیون الاثر ج ۱ ص ۱۹۹

(۲) اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ج ۲، ص ۲۳۶ الاستیعاب ج ۲ ص ۵۹۸۔

(۳) الحشر ۹

نقـــد و تبصـــره

(تبصرے کے لیے دو نسخے ارسال فرمائیے)

مکتوبات ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی

مرتبہ عبد الرحمن ناصر اصلاحی جامعی

عبد الرحمن ناصر اصلاحی جامعی کی طرف سے مختصر سا رجسٹرڈ پارسل موصول ہوا تو میرا پہلا تأثر یہ تھا کہ شاید انہوں نے دائرہ حمیدیہ سے مولانا فراہی کی کوئی نئی کتاب شائع کی ہے۔ چونکہ ان کو معلوم ہے کہ میں مولانا فراہی پر کام کر رہا ہوں اس لئے یہی خیال گذرا کہ انہوں نے مجھے کوئی چیز میرے کام کی بیجھی ہے۔ لیکن پارسل کھولا تو اس میں سے دو پتلی پتلی کتابیں "برائے تبصرہ" کا اندراج لئے نکلیں، جو ناگوار نہیں تو کوئی خوشگوار رد عمل بھی پیدا نہ کر سکیں۔ اس لئے کہ تبصرے کے لئے کتابوں کی وصول تحصیل کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ اس طرح کے پارسل آتے ہی رہتے ہیں۔ تبصرہ کے لئے آنے والی کتابوں کو میں اور شاید کوئی ایڈیٹر بھی ذوق شوق سے کم ہی پڑھتا ہے۔ کتاب کو الٹ پلٹ کر سرورق اور سرنامہ دیکھا تو بھی کوئی خاص خوش آئند رد عمل نہ ہوا۔ بلکہ الٹا طبیعت جھلائی کہ ناصر صاحب نے یہ کیا مذاق کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کے مکاتیب پر مشتمل کوئی مجموعہ ہوتا تو بھی کوئی بات ہوتی، یہ دس پندرہ برس کے ایک لڑکے کے خطوط۔ اولاً تو انہوں نے شائع کیوں کئے، شائع کئے تو کیجئے ، مجھے بھیجنے کی

کیا ضرورت تھی۔ اور وہ بھی تبصرہ کی فرمائش کے ساتھ ۔ ان خیالات کے
ساتھ ایک اور خیال بھی آیا ہے اور وہ یہ کہ ناصر صاحب اس عمر میں کوئی
ایسا ویسا کام تو کرنے سے رہے، انہوں نے ان خطوط کو مرتب کرکے چھاپا ہے اور
مجھے بھیجا ہے تو ضرور کوئی بات ہوگی۔ اس خیال نے مجھے کتاب کے مطالعے پر
مائل کیا۔ پہلا خط بلکہ خط کا پہلا لفظ پڑھ کر میں چونکا اور مجھے اس
نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ ان خطوط کا لکھنے والا ایک
نابالغ طفل مکتب سہی اس کو یوں نظر انداز نہ کرنا چاھئیے۔ اس کے بعد ج
میں نے پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ھی چلا گیا۔

میں نے پڑھنا شروع کیا تو پہلے ھی خط میں متعدد ایسے مقامات سے
گذر ہوا کہ بے ساختہ ارادہ کیا کہ نمونتاً ان کے اقتباس پیش کروں گا اور اس
کے لیے میں نے بعض حصے نشان زد بھی کئیے، مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا ہر خط
میں ایسے ھی بجلیوں کے کوندے نظر کو خیرہ کرتے رہے ۔ صورت حال یہ تھ
کہ

زِ فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

یہ فیصلہ کرنا مشکل نظر آیا کہ کس خط کے کس حصے کو دوں اور کس حصے
کو نہ دوں۔ اس لئے اس ارادے کو موقوف کرکے میں اصحاب ذوق اور ارباب مغو
سے سفارش کروں گا کہ ۱۴ ۔ ۱۵ برس کے اس طالب علم کی نگارشات کو ج
بصورت خط محفوظ ھیں خود پڑھیں اور حیرت و استعجاب کے ساتھ ان کی
رنگینی ، شیرینی اور لطف آفرینی سے شاد کام ہوں۔

خلیل الرحمن اعظمی کو میں جانتا ضرور ہوں مگر واقعہ یہ ہے کہ
اب تک میں نے قسم کھانے کو بھی ان کی کوئی چیز نہیں پڑھی تھی۔ ان ک
جاننے کے لئے اعظم گڑھ کی نسبت کافی تھی۔ ان کی "شہرت یا رسوائی" دونو

کا حال میرے لئیے دیدہ نہیں شنیدہ ھی کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال اس وقت اس کا ذکر بے محل ہوگا۔ ان خطوط کی روشنی میں جن کا تعلق ان کے عہد طفلی سے ہے پردۂ تخیل پر جو تصویر ابھرتی ہے اس میں خلوص، سادگی اور سچائی سے آشنا، تصنع، تکلف، ریاکاری اور نام و نمود سے پاک ایک معصوم مگر ہونہار بچے کے خال و خط نمایاں ھیں۔ جس کو مبدأ فیاض نے فطرت سلیمہ کے ساتھ ہوش و آگہی کی گونا گوں صلاحیتوں سے نوازا تھا۔

اب کہ میں نے یہ خطوط پڑھ ڈالے ھیں مجھے یہ بدگمانی ہو رہی ہے کہ کہیں ناصر صاحب نے "خلیل نوازی" میں (ایک جگھہ خلیل الرحمن نے القاب میں خود یہ الفاظ استعمال کئے ھیں۔ "خلیل نواز! سلام و نیاز۔ واضح رھے کہ خلیل معنی دوست کے آتے ھیں) " نواز شہائے بے جا" نہ کر گذرے ہوں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے ان خطوط کے خال و خط سنوارے ہوں اور اس مشاطگی کی وجہ سے ان میں یہ نکھـــار آ گیا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ عقل یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی کہ ایک گاؤں کا رہنے والا کم عمر دیہاتی لڑکا ایسے خطوط لکھ سکتا ہے۔ باتیں اور ان کو کہنے کا انداز دونوں اس کی اوقات سے باھر معلوم ہوتے ھیں۔ اس خیال کو اس سے تقویت ملتی ہے کہ انھی خطوط میں ناصر صاحب کی استادی، اصلاح اور رہنمائی کا بار بار ذکـــر آتا ہے۔ بہر حال استاد شاگرد دونوں داد و تحسین کے مستحق ھیں۔

خلیل الرحمن اعظمی نے ناصر اصلاحی کی رھبری میں جو سفر شروع کیا اس میں آگے چل کر انہوں نے بڑی بڑی منزلیں طے کیں۔ اعلی تعلیم، معلمی اور ادبی کارنامے سب نے مل کر ان کی شہرت کو چار چاند لگائے مگر ناصر صاحب جوھر قابل رکھنے کے باوجود گوشۂ گمنامی میں رھے۔ ان خطوط کے مرتب بھی وھی ھیں، مکتوب الیہ اور مخـــاطب بھی، اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بھی کچھ بیاں ہو جائے۔ ناصر صاحب مدرسة الاصلاح سرائے میر اور

جامعہ ملیہ دھلی کے تعلیم یافتہ ھیں۔ سالہا سال سے مدرسۃ الاصلاح میں خا۔ن اور دائرہ حمید یہ میں معتمد کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ھیں۔ اور یہ دونوں کام اعزازی ھیں۔ ان کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی بلکہ زمینداری ہے۔ ان کی ادبی صلاحیتوں کے سلسلے میں یہی کافی ہے کہ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی جیسا قلم کار ان کی آغوش تربیت کا پروردہ ہے۔ خلیل الرحمن نے ایک جگہ خود لکھا ہے "میرے ایک عزیز عبد الرحمن ناصر جو اس زمانے میں میرے ادبی رھنما تھے، اس رسالے کے مستقل قلمی معاونین میں تھے اور ان کے افسانے اور ترجمے " جدید اردو " میں پابندی سے چھپا کرتے تھے"۔

یہ جوھر قابل کس طرح ضائع ھوا اس کے لئے خلیل الرحمن کے انہی خطوط سے بعض جملے نقل کر دینا کافی ھوگا۔

"مجھے اکثر بڑا افسوس ھوتا ہے کہ ایک جوھر قابل اس طرح سے زمینداری کے جال میں پھنس کر اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر رہا ہے" (خط نمبر ۱۸)

آپ کو خط لکھتے وقت نہ جانے کیوں میرا دل دُکھتا ہے۔ مجھے ایک جواں مرگ ادیب کی یاد آنے لگتی ہے جو جیتے جی ادب سے کنارہ کش ہے اور ان چنگاریوں کو اپنے دل کی خاکستر میں دفن کئے ہوئے ہے جو اس کی ذرا سی توجہ سے شعلہ بن سکتی ھیں"۔ (خط نمبر ۱۹)

رہا ان خطوط کی قدر و قیمت کا سوال تو اس کے لئے میں سوال و جواب دونوں میں ناصر صاحب ھی کے الفاظ مستعار لونگا۔ "خلیل الرحمن مرحوم کے زمانہ طالب علمی کے یہ خطوط کس مرتبے کے ھیں؟ یہ قارئین جانیں" (ص ۷) بحیثیت مرتب انہوں نے اس کی ضرورت نہیں محسوس کی تو بحیثیت تبصرہ نگار مجھے بھی ان خطوط کے مرتبے کی نسبت اظہار رائے کرکے قارئین کو افیون دینے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ مشک کو عطار کی گفتگو کا پابند کرنے

میں بے حاصلی کے سوا کیا رکھا ہے۔ اس لئے میں مجرد یہ سفارش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ قارئین اسے خود پڑھیں اور رائے قائم کریں۔ میرا اندازہ ہے کہ پڑھنے والے اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔ اس سے ان کے ذوق مطالعہ کی تسکین ہی نہیں ہوگی بلکہ وہ اس سے کچھ نہ کچھ سیکھیں گے بھی۔ جس میں ادب، اخلاق، اخلاص، پاکیزہ اور صحت مند رسم محبت ہی نہیں، زبان بیان اور اظہار کا بانکپن بھی ہے۔

البتہ مجھے اس کتاب کے نام پر یہ اعتراض ہے کہ یہ مکتوبات ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کے تو نہیں ایک بچے خلیلؔ الرحمن کے ہیں۔ اس کی جگہ میں ناصر صاحب ہی کی تحریر کا ایک لفظ یا فقرہ تجویز کرتا ہوں۔ ,,میرے خلیل،، یا کوئی اور لفظ یا فقرہ جو حقیقت حال کا آئینہ دار ہو۔ لیکن جس دنیا کے بازار میں انہیں پیش کرتا ہے اس کا طور ہی اور ہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کو تو لوگ جانتے ہیں ,,میرے خلیل،، یا ,,خلیل الرحمن ،، کو کون جانتا ہے۔

یہ خطوط اس وقت لکھے گئے جبکہ لکھنے والے کی عمر ابھی مشکل ہی سے ۱۳ ۔ ۱۴ برس کی ہوگی ۔ ۹ ۔ اگست ۱۹۲۷ اعظمی صاحب کی تاریخ پیدائش ہے۔ ہر چند کہ میں نے اقتباس نہ درج کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ ۱۲ ۔ اگست ۱۹۴۰ کو لکھے گئے ایک خط کا یہ اقتباس درج کرکے اپنے ہی ارادے کو فسخ کرتا ہوں ۔

آپ کا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ آپ ایک حسین اور جمیل مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ جہاں کے نظارے آپ کو موہ لیتے ہیں اور جہاں صبح و شام جمنا کی لہریں آپ کے قدم چومتی ہیں۔ اس سے مجھے بھی بڑی خوشی ہے۔ لیکن یہ عرض کروں گا کہ اپنے دیہات کے مناظر کو بھی اپنے دل کے کسی گوشے میں محفوظ رکھیئے گا۔ وہ لہلہاتی ہوئی کھیتیاں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، صبح

شام کے دلفریب نظارے، ساون کی اودی اودی گھٹائیں، کوئل اور پپیہے کے دردناک نغمے بھی یاد رکھے گا اور صفحہ دل پر ان کی تصویریں بنائے رکھے گا۔۔ (خط نمبر ۱)

کتاب کی قیمت اور ملنے کا پتا درج کرکے بات ختم کرتا ہوں۔ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔قیمت چار روپے پچاس پیسے۔ ملنے کا پتا ۔ دائرۃ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ یو پی، انڈیا۔

(شرف الدین اصلاحی)

نام کتاب	-	اسلامی مذاهب
مصنف	-	شیخ محمد ابو زهره مصری
مترجم	-	پروفیسر غلام احمد حریری ایم اے
قیمت	-	۲۴ روپے
ناشر	-	ملک سنز ۔ کارخانہ بازار ۔ فیصل آباد

یہ کتاب عالم اسلام کے معروف فقیہ شیخ محمد ابو زهره پروفیسر لاء کالج جامعہ الازہر مصر کی تصنیف «المذاهب الاسلامیة» کا رواں اور شگفتہ اردو ترجمہ ہے۔ شیخ ابو زهره اپنے تبحر علمی کے باعث پوری دنیائے اسلام میں معروف ہیں۔ انہوں نے اسلام پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ پاکستان میں بھی ان کی بیشتر تصانیف کے اردو تراجم شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ کتاب کے مترجم پروفیسر غلام احمد حریری بھی اپنے علم و فضل، اور علوم دینی پر متعدد کتابوں کے تراجم کی وجہ سے مشہور ہیں۔

شیخ ابو زهره نے یہ کتاب مصر کی وزارت تعلیم کی فرمائش پر تحریر کی تھی۔ لیکن یہ وهیں تک محدود نہ رهی، بلکہ پورے عالم اسلام میں مقبول هو گئی۔ تصنیف هذا در اصل امور دین میں امت مسلمہ کے اختلافات کی

تاریخ ہے۔ اس میں ان عوامل کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جو اختلافات کے پس منظر میں کار فرما تھے۔ اور ان فرقوں کا بھی ذکر ہے جو اختلافات کے گرداب میں پھنس کر مرکز سے دور ہوتے ہوتے دائرہ اسلام ہی سے خارج ہو گئے۔

یہ کتاب معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ جس سے اردو دان طبقہ خصوصاً تعلیم و تاریخ اور تحقیق کے شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہل علم استفادہ کر سکتے ہیں۔ دینی مدارس، اسکولوں ، کالجوں اور یونیورسٹیوں نیز تحقیقی اداروں کے کتب خانوں میں اس کتاب کی موجودگی مفید ہوگی۔

اللہ تعالی ناشرین کو جزائے خیر عطا فرمائے جن کی انتھک محنت کے نتیجے میں یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ اور جنھوں نے تشنگان علم کو سیراب کرنے کی سعی جمیل کی ہے۔

(حافظ محمد یونس)

فکر و نظر
EXCHANGE
THAT THEY MAY GAIN UNDERSTANDING IN FAITH
رجب ۱۴۰۱ھ   مئی ۱۹۸۱ء
NEW DELHI

نگراں

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا

ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد

فون : ۲۱۷۰۵

مدیر

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی

فون : ۲۷۲۹۵/۰۶

سالانہ چندہ پندرہ روپے	ششماہی آٹھ روپے	فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

طابع و ناشر : **محمد سمیع اللہ** سکرٹری ادارۂ تحقیقات اسلامی ۔ اسلام آباد

فون : ۲۷۳۹۱

مطبع : اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پریس ۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۵۰۱ ۔ اسلام آباد

فون : ۲۰۹۵۲

سکولوں ، کالجوں اور لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

ماہنامہ

فکر و نظر

اسلام آباد

جلد - ۱۸ | رجب ۱۴۰۱ھ □ مئی ۱۹۸۱ء | شمارہ - ۱۲

فہرست

مجلس ادارت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظـــــــرات

وفاقی وزیر راجہ ظفر الحق نے وزارت کا بار امانت اٹھانے کے بعد جن جگہوں کو اپنی اولین توجہ کا مستحق گردانا ان میں سے ایک ادارۂ تحقیقات اسلامی بھی ہے ۔ ادارے کے ساتھ راجہ صاحب کا تعلق ان کی نئی قومی ذمہ داریوں کا مرہون منت نہیں ۔ ادارے کے ساتھ ان کے ربط وتعلق کی داستان پرانی اور قدرے طولانی ہے جس کے دہرانے کا یہ محل نہیں ۔ علم دوست ہونے کے باعث ادارۂ تحقیقات اسلامی شروع ھی سے ان کی توجہ کا مرکز رہا ہے ۔ وہ محض اپنی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے گاھے گاھے ادارے کو اپنی آمد سے نوازتے رہتے تھے ۔ اسکالروں کے علاوہ ادارے کا گرانمایہ کتب خانہ ہمیشہ ان کے لئے وجہ کشش رہا ۔ اس لئے گزشتہ دنوں جب راجہ صاحب ادارے میں تشریف لائے تو ادارے کے ارکان نے گرم جوشی کے ساتھ ان کا دلی خیر مقدم کیا ۔

راجہ صاحب قانون کے پیشے سے وابستہ رہے ۔ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کی راہ میں حائل بعض عملی دشواریوں کا انہیں ذاتی تجربہ ہے ۔ ان میں سے ایک دشواری جس کا حل ادارے کے دائرہ کار میں آتا ہے عدالتوں کے لئے مستند ذرائع اور اصل مآخذ سے قابل استعمال شرعی مواد کی فراھمی ہے ۔ قانون کے پیشے سے وابستہ وکلاء اور جج صاحبان کی اکثریت شرعی قوانین سے ناواقف ہے اور عربی میں ھونے کے باعث وہ ان کا براہ راست مطالعہ نہیں کر سکتے ۔ اس صورت حالات میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ وہ تمام مواد جس کی فوری ضرورت ہے اردو میں منتقل کرکے ان کے دروازے ان پر کھول دیئے جائیں ۔

چنانچہ جب راجہ صاحب نے اپنی تقریر میں ادارے کے ڈائرکٹر اور اسکالروں کے سامنے اس مسئلے کا ذکر کیا تو یوں محسوس کیا گیا کہ جیسے یہ تو پہلے ھی سے جانی اور پہچانی ہوئی بات ھو ۔ ادارے میں راجہ صاحب کی اس تجویز کا نہ صرف خیر مقدم کیا گیا بلکہ عملی اقدامات کی تدابیر زیر غور آئیں۔بسرعت تمام ھنگامی بنیادوں پر منتخب شرعی قوانین پر مشتمل مجلدات کی تیاری کا قصیر المیعاد منصوبہ بنایا گیا ۔ امید ہے کہ تین ماہ کے اندر ان قوانین کی تدوین کا کام مکمل کر لیا جائے گا ۔ نقشہ کاریوں مرتب کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے قرآن مجید کی متعلقہ آیات مع اردو ترجمہ درج کی جائیں گی ۔ ترجمے میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے طے کیا گیا ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ترجمۂ قرآن کو پیش نظر رکھا جائے گا ۔ قرآن مجید کے بعد احادیث مع ترجمہ کے درج کی جائیں گی ۔ اس کے بعد فقہ کی کتابوں سے متعلقہ مواد اخذ کرکے اختصار کے ساتھ بصورت ترجمہ درج کیا جائے گا ۔ فقہی مسالک میں بالترتیب حنفی ، شافعی ، مالکی ، حنبلی اور جعفری نقطہ ہائے نظر سے الگ الگ رائیں پیش کی جائیں گی تاکہ کسی بھی مسئلے کے متعلق سارا مواد یکجا مل سکے ۔ وکلاء اور جج صاحبان کو مراجعت میں آسانی ھو ۔ قرآن حدیث اور فقہ کے قانونی مصادر اور شرعی مآخذ ایک نظر میں دیکھے جا سکیں اور حسب ضرورت ان سے استفادہ کیا جا سکے ۔

یہ ایک بہت بڑا کام ہے لیکن ادارے میں قرآن حدیث اور فقہ کے ماھرین کی ایک پوری ٹیم جس طرح مصروف کار ہے توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ منصوبہ مقررہ وقت کے اندر مکمل ھوجائے گا انشاء اللہ ۔ راجہ صاحب نے اس ضمن میں حکومت کی طرف سے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا ۔ جس سے کارکنوں کو تقویت ملی اور وہ ھمہ تن سرگرم عمل ھیں ۔

(مدیر)

رویت ہلال اور ہجری تقــــویــــم ؟

ضیاءالدین لاہوری

موجودہ زمانے میں جب کہ گزشتہ صدیوں کی نسبت رسل و رسائل اس قدر ترقی کر چکے ہیں کہ عالم اسلام کے تمام ملکوں کا براہ راست رابطہ چند لمحوں میں ممکن ہے پندرھویں صدی ہجری کے آغاز نے کُل اسلامی دنیا میں سرکاری طور پر اسلامی ہجری کیلنڈر اپنانے کی اہمیت میں وقت کی اشد ضرورت کی حد تک اضافہ کر دیا ہے اور یہ احساس شدت سے ابھر رہا ہے کہ تمام مسلمان ممالک اسے اختیار کرکے اسلامی تشخص کا مظاہرہ کریں۔ جہاں تک شمسی عیسوی کیلنڈر سے استفادہ کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ مسلم ہے۔ کھیتی باڑی کا مسئلہ موسموں کے تغیر و تبدل کے باعث کسی خاص عرصہ کے پہچان کی ضرورت غیر مسلم ممالک کے ساتھ خط و کتابت میں اس کا استعمال اور نمازوں کے اوقات وغیرہ مسائل کے پیش نظر ہم اس کی افادیت سے کسی صورت کنارہ کش نہیں ہو سکتے لیکن ہجری کیلنڈر کو ضمنی طور پر اپنا کر صرف مذہبی تقریبات کی ادائیگی کی حد تک محدود کرکے ہم اسلامی قدریں کھونے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ہمارے اکثر عظیم دانشور حضرات بھی ہجری تاریخوں اور مہینوں کے ناموں تک سے لاعلم ہوتے ہیں اور مذہبی عبادات کی ادائیگی کی تاریخیں معلوم کرنے کے لئے دوسروں کے دست نگر ہوتے ہیں۔ ہجری کیلنڈر کے باقاعدہ استعمال سے تمام لوگ لاعلمی کی اس کیفیت سے دو چار ہونے سے بچ جائیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ شمسی کیلنڈر کو ضمنی طور پر جاری

رکھ کر اس سے بھی مستفید ہوتے رہیں گے۔

میرے خیال میں رویت ہلال کا اختلاف ہی ایک ایسا مسئلہ ہے جو اس دور میں ہجری کیلنڈر کو تمام اسلامی ممالک میں یکساں طور پر اپنانے کی راہ میں حائل ہے۔ ذہن میں ایک سوال اٹھتا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ سائنس کی اس ترقی کے زمانہ میں رویت ہلال کے لئے ہم ماہرین علوم فلکیات سے رجوع کریں تاکہ ایک ایسا معیار قائم ہو جائے جس سے ہم آئندہ رویت ہلال کی یقینی پیشن گوئی کر سکیں۔ یقیناً ہر شخص کی یہی خواہش ہوگی کہ اس کا کوئی ایسا حل نکل آئے جس سے ہم شرعی تقاضوں کے مطابق جدید علوم سے استفادہ کرکے نہ صرف یہ کہ تمام عالم اسلام میں ایک ہی روز مذہبی تقریبات منعقد کریں بلکہ روز مرہ زندگی اور دفتری کاموں میں بھی اسلامی ہجری کیلنڈر اپنا سکیں۔ میں نے چند ماہ پیشتر اپنے قیام لندن کے دوران یونیورسٹی آف لندن آبزرویٹری اور رائل گرین وچ آبزر ویٹری سے اس مسئلہ پر خط و کتابت کی۔ میں نے ان سے استفسار کیا کہ کیا علوم فلکیات کے ماہرین کوئی ایسا معیار قائم کرنے کے قابل ہو چکے ہیں جس سے آئندہ رویت ہلال کی یقینی پیشن گوئی کی جا سکے۔ میں نے ان سے وضاحت چاہی کہ اس سلسلہ میں چاند کی عمر، غروب آفتاب اور غروب قمر میں فرق اور شاہد (دیکھنے والا) کی سطح سمندر سے بلندی کو کہاں تک دخل ہے۔ اس کے جواب میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر یونیورسٹی آف لندن آبزر ویٹری شعبہ فزکس و علوم فلکیات کے خط محررہ ۱۱ جولائی ۱۹۸۰ع کے متعلقہ حصہ کا ترجمہ درج ذیل ہے[۱]۔

"آپ کے دوسرے استفسار سے متعلق ، کہ آیا آبزر ویٹری سائنس دان کوئی ایسا معیار قائم کرنے کے قابل ہو چکے ہیں جس سے آپ نیا چاند نمودار ہونے والی شام کی یقینی پیشن گوئی کر سکیں، مجھے افسوس ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ کچھ

---

۱ ۔ اصل انگریزی خط بطور ضمیمہ نمبر۱ مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں (مدیر)

عرصہ قبل اس خصوصی مسئلہ پر عدلیہ سعودی عرب کے
اراکین کے ساتھ میرے طویل مذاکرات ہوئے اور معلوم ہوا کہ
اس سلسلہ میں پیش کی جانے والی کوئی بھی تجویز یقینی طور
پر قرآن مجید کے تقاضوں سے تقریباً متصادم ہے مسئلہ یہ ہے کہ
در حقیقت رویت ہلال کے متعلق کوئی بھی مفروضہ قائم نہیں
کیا جا سکتا۔ ایک خاص زاویے کا تعین کیا جا سکتا ہے مگر یہ
بھی ہمیشہ محض ایک اتفاق کی بات ہوگی کہ خصوصی تیز
بصارت کا حامل کوئی فرد خاص کر غیر متغیر اور صاف مطلع
میں چاند کے اپنے STATUTORY مقام پر پہنچنے سے پیشتر
ہی اسے دیکھنے کے قابل ہو سکے۔ اصل مسئلہ کا، ان نکات میں
سے جن کا ذکر آپ نے کیا ہے لازماً کسی سے بھی تعلق نہیں،
بلکہ محض اس بات سے ہے کہ چاند سورج سے کس قدر
فاصلے پر ہو جو جھٹ شے آسمان پر دکھائی دے سکے۔ جزوی
طور پر اس کا انحصار چاند کی سورج سے دوری اور دوسرے
تغیر پذیر عناصر پر ہے جیسا کہ فضا میں شفاف پن و موازنہ
(CONTRAST) اور مشاہدہ کرنے والے کی نظر کی تیزی۔ قرآن
مجید کسی ایسے طریق کار کا جو چاند کے سورج سے ایک
مخصوص فاصلے پر مبنی ہو، خصوصاً مزاحم دکھائی دیتا ہے
مجھے اس بات پر افسوس ہے کہ میرے خیال میں کوئی ایسا
سائنسی طریقہ نہیں ہے جس سے کہ اس موقع پر اسلام کے
تقاضے پورے کئے جا سکیں۔"

رائل گرین وچ آبزرویٹری انگلستان کی سائنس ریسرچ کونسل فلکیاتی
معلومات پر وقتاً فوقتاً تحقیقاتی پرچے جاری کرتی ہے رویت ہلال کے مسئلہ پر

نومبر ۱۹۷۴ء میں ان کی آخری معلوماتی شیٹ نمبر ٦ شائع ہوئی جس کا ترجمہ درج ذیل ہے[1]۔

"ہر ماہ نئے چاند کے پہلی مرتبہ دکھائی دینے والی تاریخوں کے متعلق پیش گوئی کرنا ممکن نہیں کیونکہ ایسے کوئی قابل اعتماد اور مکمل طور پر مستند مشاہدات موجود نہیں ہیں جنہیں ان شرائط کو متعین کرنے میں استعمال کیا جا سکے جو چاند کے اول بار دکھائی دینے جانے کے لئے کافی ہوں۔ پیشن گوئی کی سادہ ترین بنیاد یہ ہے کہ متعلقہ جگہ پر غروب آفتاب کے وقت چاند ایک خاص عمر سے (جو فلکیاتی نئے چاند کے وقت سے شمار کی جائے) زیادہ ہو۔ تاہم بہتر یہ ہے کہ عمر کی بجائے اس وقت چاند کا سورج سے حقیقی زاویائی فاصلہ (ELONGATION) استعمال کیا جائے۔ نیا چاند اس وقت تک دکھائی دینے کے قابل نہیں ہوتا جب تک کہ سورج افق سے نیچے نہ ہو۔ لہذا جھٹ پٹے کے دوران چاند کے ارتفاع کو حساب میں رکھنا زیادہ مناسب ہے۔ نیا چاند دکھائی دینے کے اتفاقات کا قدرے انحصار چاند کے زمین سے فاصلے پر ہے۔ یہ اتفاقات اس وقت سب سے زیادہ ہوں گے جب چاند قریب ترین (یعنی PERIGEE پر) ہوگا۔ مقامی کیفیات، خاص کر شاہد کی سطح سمندر سے بلندی اور گرد و پیش کے ماحول کی خصوصیت، اہمیت کی حامل ہیں اور جب آسمان ابر آلود نہ بھی ہو تو فضا کے شفاف پن میں ایک سے دوسرے دن قابل ذکر تغیرات ہو سکتے ہیں۔ مشاہدہ کرنے والے کی نظر کی تیزی بھی بڑی اہم

[1] ۔ اصل بگریزی شیٹ بطور ضمیمہ نمبر۲ مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں (مدیر)

ہے یہ بھی قبول کرنا چاھیئے کہ زمین پر طول بلد اور عرض بلد دونوں کے ساتھ فلکیاتی کیفیات میں قابل ذکر تغیرات ھوتے ھیں اور اگر موسمی کیفیتیں ھر جگہ اچھی بھی ھوں تو رویت ھلال کی تاریخیں جگہ بہ جگہ مختلف ھوں گی۔ لہذا پیشن گوئیاں صرف محدود علاقوں کے لئے کار آمد ھو سکتی ھیں۔ عام کیفیات کے تحت چاند پہلی مرتبہ اس وقت تک دکھائی نہیں دیتا جب تک کہ اس کی عمر تیس گھنٹوں سے زائد نہ ھو جائے۔ لیکن چند ایسی معتبر اطلاعات بھی موجود ھیں جہاں بہت اچھی کیفیتوں میں چاند اس وقت دیکھا گیا جب اس کی عمر صرف بیس گھنٹے تھی۔ تین درجے جھکاؤ (DEPRESSION) کی صورت میں جب تک کہ چاند کا ارتفاع (ALTITUDE) پانچ درجے سے اور زاویائی فاصلہ (ELONGATION) دس درجے سے بڑھ نہ جائے اس کا دکھائی دینا بعید از قیاس ہے۔

چونکہ یہ امر واضح ہے کہ رویت ھلال کے متعلق کوئی بھی پیشن گوئی غیر یقینی ھوتی ہے اس بات کا طے کرنا ضروری ہے کہ آیا قبل ازوقت کسی ایسی پیشین گوئی کو ترجیح دیجائے جسکے حق میں، اگرچہ کیفیات اچھی ثابت ھوں، ثبوت پیش نہ کئے جا سکیں، یا بعد میں کوئی ایسی پیشن گوئی کی جائے جو گزشتہ روز کے مشاھدے کو بے اثر بنا سکے۔ سادہ سا اصول جس کا یہ دفتر عموماً مشورہ دیتا ہے یہ ہے کہ متعلقہ جگہ پر غروب آفتاب کے وقت چاند کی عمر تقریباً تیس گھنٹے یا زیادہ ھونی چاھیئے۔ اور یہ مؤخر الذکر قسم ہے۔ لیکن یہ اصول

وسطی اور بالائی عرض البلد میں قابل اعتبار نہیں ہے۔

رویت ہلال کے مسئلے پر بعض مصنفین کی تحریروں کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں ماہرین علوم فلکیات مکمل معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں۔ ماہرین علوم کی آراء اپنے متعلقہ شعبہ کے مسائل پر سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مندرجہ بالا تحقیقات موجودہ دور تک رویت ہلال سے متعلق ماہرین علوم فلکیات کی حتمی سند ہیں جو ان مفروضوں کو غلط ثابت کر رہی ہیں۔ جب مفروضے ہی غلط ہو گئے تو ان کی بنیاد پر پیش کی گئی تجاویز کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی ۔ لہٰذا ہمیں نئے سرے سے ان مسائل کا حل سوچنا ہوگا ۔

ہجری کیلنڈر کو باقاعدہ اختیار کرنے کا مشورہ دینا تو بہت آسان ہے مگر اس پر عمل در آمد میں کئی مشکلات حائل ہیں۔ ہمارے ہاں قمری تاریخوں اور مذہبی تقریبات کا فیصلہ رویت ہلال کے شرعی ثبوت کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ اس لئے دفتری طور پر اس کے استعمال میں کئی پیچیدگیاں ہیں۔ گزشتہ تاریخوں کے ایام کی بالکل صحیح نشان دہی کرنا اگر چہ بڑا مشکل اور دقت طلب ہوگا مگر مہینے گزرنے کے ساتھ ساتھ تاریخوں اور ایام کے باقاعدہ نقشے بنا کر اس مشکل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ مگر چونکہ ہر جگہ ہر مہینے تیار کئے جانے والے نقشوں کی دستیابی اکثر افراد کے لئے ممکن نہ ہوگی اس لئے عام حالات میں اس کا ایک حل یہ ہو سکتا ہے کہ ہر تاریخ کے اندراج کے ساتھ یوم کا ذکر بھی ضروری کیا جائے۔ لیکن اگلے مہینوں کی تاریخوں کی صحیح نشان دہی پھر بھی نا ممکن ہوگی اور ہم کسی صورت یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ فلاں تاریخ بروز فلاں۔ اس طرح دنیوی امور کی انجام دہی میں ہمیشہ بے یقینی کی کیفیت رہے گی۔ اس مشکل کا حل یوں ہو سکے گا کہ یوم کو تاریخ پر ترجیح دی جائے ۔ اور بھی کئی قسم کے مسائل پیدا ہوں گے جن کا حل سوچے بغیر نئے

کیلنڈر کو اپنانا درست نہ ہوگا۔

جہاں تک اسلامی ممالک کے مابین خط و کتابت کا تعلق ہے اس میں اور بھی پیچیدگیاں ہیں۔ بعض اسلامی ممالک نے رویت ہلال کی سائنسی توضیح کو بنیاد بنا کر ہجری کیلنڈر کو سرکاری حیثیت دے رکھی ہے جس کے باعث ان کی تاریخوں کا دوسرے ممالک سے، جہاں رویت ہلال کا شرعی نقطہ نگاہ سے اعلان کیا جاتا ہے ، کبھی ایک روز اور کبھی دو روز کا اختلاف ہوتا ہے۔ اپنے اپنے ممالک میں تو مروجہ قمری تاریخوں کا استعمال کوئی مسئلہ نہیں لیکن دوسرے اسلامی ممالک کے ساتھ خط و کتابت میں ان تاریخوں کا استعمال الجھنوں کا باعث ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر جس مہینے سعودی عرب اور پاکستان کی قمری تاریخوں میں دو دن کا فرق ہو اور سعودی عرب سے ایک خط ۵ تاریخ کی مندرج تاریخ کے ساتھ دوسرے روز پاکستان میں ۴ تاریخ کو پہنچ جائے۔ گویا محررہ تاریخ سے ایک روز پہلے مل جائے، تو بڑی عجیب کیفیت پیدا ہو جائے گی. جب تک کہ تمام اسلامی ممالک ایک ہی قسم کے کیلنڈر کو رائج کرنے پر متفق نہیں ہو جاتے اس وقت تک میرے خیال میں اس مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ ہجری تاریخوں کے ساتھ عیسوی تاریخیں بھی درج کی جائیں۔ اس طرح اسلامی اور غیر اسلامی ممالک دونوں کے لئے یکساں لائحۂ عمل اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اندرون ملک بھی اس تجویز پر عمل ہو سکتا ہے لیکن مستقبل کی تاریخوں کے لئے یہ مسئلہ پھر بھی باقی رہے گا کہ ہجری تاریخ کو بنیاد بنایا جائے یا عیسوی تاریخ کو کیونکہ غیر مسلموں کی تقریبات میں عیسوی تاریخ بنیاد ہوگی اور اسلامی تقریبات میں ہجری تاریخ بعض غیر واضح صورتوں میں غلط فہمیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں جن سے بچنے کے لئے سنجیدگی سوچ بچار ضروری ہے۔

رویت ہلال کی سائنسی توضیح سے ایک یا دو روز کا فرق پڑ جانا کس

طرح ممکن ہے اس کی مثال دینے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ عرب ممالک میں نئے چاند کا ہونا رویت ھلال کے اعتبار سے قرار نہیں دیا جاتا بلکہ ان کا چاند اسی وقت ہو جاتا ہے جب چاند کی عمر شروع ہوتی ہے یعنی جب چاند اور سورج کا درمیانی فاصلہ صفر درجے ہوتا ہے۔ ماہرین علوم فلکیات کے نزدیک یہی نیا چاند ہے لیکن ان ہی کے عمومی مشاہدے کے مطابق اس کا نظر آنا اسی وقت ممکن ہے جب اس کی عمر تقریباً تیس گھنٹے یا زائد ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری اور عرب ممالک کی قمری تاریخوں میں ہمیشہ فرق رہتا ہے۔ مندرجہ ذیل مثال اس اختلاف کو واضح کرے گی۔

نئے چاند کی عمر شروع ہونے کے اوقات کی دو صورتیں فرض کیجئے۔

پہلی صورت	دوسری صورت
بدھ ١٠ بجے صبح	بدھ ٣ بجے شام

دونوں صورتوں میں سعودی عرب میں پہلی تاریخ جمعرات کو ہوگی۔

اسلام آباد میں پہلی صورت میں بدھ کو بوقت غروب آفتاب (٦ بجے شام) چاند کی عمر صرف ٨ گھنٹے ہوگی اس لئے چاند نظر نہیں آ سکے گا۔ اگلے روز یعنی جمعرات کو غروب آفتاب کے وقت چاند کی عمر ٨ + ٢٤ یعنی ٣٢ گھنٹے ہو جائے گی لہذا چاند نظر آئے گا اور پہلی تاریخ جمعہ کو ہوگی۔ اس طرح سعودی عرب میں رائج تاریخوں سے ایک دن کا اختلاف ہوگا۔

دوسری صورت میں بدھ کو اسلام آباد میں غروب آفتاب کے وقت چاند کی عمر صرف ٣ گھنٹے ہوگی اس لئے چاند نظر نہیں آئے گا۔ اگلے روز جمعرات کو بوقت غروب آفتاب اس کی عمر ٣ + ٢٤ یعنی ٢٧ گھنٹے ہوگی۔ یہ عمر ٣٠ گھنٹے سے کم ہونے کی وجہ سے چاند کے نظر آنے کا امکان نہیں۔ اس سے اگلے روز جمعہ کی شام کو اس کی عمر ٢٧ + ٢٤ یعنی ٥١ گھنٹے ہو جائے گی اس لئے چاند ضرور نظر آئے گا لہذا اس سے اگلے روز یعنی ہفتہ کو چاند کی پہلی

تاریخ ہوگی اور اس طرح سعودی عرب کی تاریخوں سے دو دن کا فرق ہوگا۔
ان حالات میں ایک عالمی اسلامی کیلنڈر کے اجراء کی قابل عمل
صورت کیا ہو سکتی ہے یہ ماہرین کے غور و فکر کا مقام ہے۔

* * * * * * *

UNIVERSITY OF LONDON OBSERVATORY
DEPARTMENT OF PHYSICS AND ASTRONOMY
(University College London)

OBSERVATORY ANNEXE
33/35 DAWS LANE
LONDON, NW7 4SD
Telephones 01-959 6911
01-959 7367

MILL HILL PARK
LONDON NW7 2QS

Telephone 01-959 1618
01-959 3198

Mr Zia Ud Din
47 Poplars Road
London E17

11 July 1980
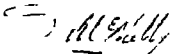
Dear Mr Ud Din

Thank you for your letter of 6th July. I am afraid I cannot give you any advice on non-technical books on the comparison of the Islamic and Christian calendars. However, there is quite a good section on the comparative calendar in the explanatory supplement to the Astronomical Ephemeris which is published by Her Majesty's Stationery Office and should be available through most public libraries. Should the explanatory supplement not be sufficient for your needs, then I suggest that you contact the Director of the Nautical Almanac Office, at the Royal Greenwich Observatory, Herstmonceux Castle, Hailsham, Sussex, who might be in a better position to give you more detailed references on this important topic.

With regard to your second query about whether observatory scientists have been able to set a standard by which you can be certain of the evening when a New Moon will appear, then I am afraid the answer is no. I had a long discussion with members of the Saudi Arabian judiciary some time ago on this particular problem and it seemed that any suggestion which one might make was almost certain to be in conflict with the requirements of the Koran. The problem is that one cannot really make any assumptions about the visibility of the New Moon. One can specify a certain angle but there is always just a chance that someone with particularly keen sight in a particularly steady and clear atmosphere, might just be able to detect the Moon prior to its reaching its statutory position. The problem is essentially not connected with any of the points that you mention but simply with how far must the Moon be from the Sun in order to be able to see it in the twilight sky. This depends in part on how far the Moon must be from the Sun, but on other variable factors like the clarity and contrast in the atmosphere and the visual acuity of the observer. The Koran specifically seems to inhibit any method which requires the Moon to be a specific distance from the Sun.

I am sorry to say there is no scientific way, I think, in which the requirements of Islam can be met at the moment.

Yours sincerely

D McNally
Assistant Director

SCIENCE RESEARCH COUNCIL

Astronomical Information Sheet Nº 6

(Prepared by H M Nautical Almanac Office, Royal Greenwich Observatory, Herstmonceux Castle, Hailsham, Sussex)

A note on the prediction of the dates of first visibility of the new crescent Moon

It is not possible to predict accurately the dates on which the new crescent Moon will first be seen each month since there is no collection of reliable, fully documented, observations that can be used to establish the conditions that must normally be satisfied at the time of first visibility. The simplest basis for prediction is that the Moon should be more than a certain age (measured from the time of astronomical new moon) at the time of sunset at the place concerned. It is, however, better to use the true elongation (i.e. the angular separation) of the Moon from the Sun at this time, rather than the age. The new crescent is not normally visible until the Sun is below the horizon and so it is desirable to take into account the altitude of the Moon during twilight. The chances of seeing the new crescent depend slightly on the distance of the Moon from the Earth, being greatest when the Moon is closest (i.e. at perigee). The local conditions, especially the height of the observer above sea level and the character of the surrounding surface, are important, and even when the sky is free from cloud there can be considerable variations in the clarity of the atmosphere from day to day. The visual acuity of the observer is also significant. It must be realized too that there are considerable variations in the astronomical conditions with both longitude and latitude on the Earth so that even if the weather conditions were good everywhere, the dates of the first sightings would differ from place to place. Predictions can, therefore, only be valid for restricted areas.

Under ordinary conditions, the first sighting will not occur unless the age of the Moon exceeds 30 hours, but a few reliable reports are known of sightings, under very good conditions, when the age has been only 20 hours. It is unlikely that the new crescent will be visible unless the elongation exceeds 10° and the altitude of the Moon exceeds 5° when the depression of the Sun is 3°.

Since it is clear that any prediction of the date of first visibility must be uncertain, it is necessary to decide whether to prefer an early prediction that could not be substantiated by direct observation if conditions prove to be good, or a late prediction that could be vitiated by an observation on the previous day. The simple rule that is usually recommended by the Office - namely that the age of the Moon should be about 30 hours, or more, at the time of sunset at the place concerned - is of the latter kind, but this rule is not reliable in middle and high latitudes.

GAW

1974 November

رصـــد گاہ دھلـــی

شبیـــر احمد خاں غـــوری

رصد گاہِ دھلی جس کے کھنڈر عوام میں " جنتر منتر" کے نام سے مشہور ہیں اس کی تعمیر و تشکیل میں یہاں کی تین اہم قوموں نے حصہ لیا ہے۔

راجہ جے سنگھ (جس نے مغل تاجدار محمد شاہ کے حکم سے اس رصد گاہ کو تعمیر کیا تھا) اور اس کے بعض قریبی معاون ہندو تھے ، جنھوں نے فطری طور پر یہاں کے ہندو علم الھیئت میں ید طولیٰ حاصل کیا تھا۔

رصد گاہ کے اکثر کارکن اور محققین مسلمان تھے ، جو اس زمانہ کے عام دستور کے مطابق اسلامی علم الھیئت میں دستگاہِ عالی رکھتے تھے۔ خود راجہ جے سنگھ نے بھی جب وہ قدیم ہیئتی نظام کی افادیت سے مایوس ہو گیا ، تو اسلامی علم الھیئت ھی کی طرف توجہ مبذول کی اور اس کے اندر غیر معمولی تبحّر و تمہّر حاصل کیا۔ اس نے نہ صرف اپنے پیشرو مسلمان ہیئت دانوں کی تصانیف ھی کا امعانِ نظر سے مطالعہ کیا بلکہ عملی مشاھدات سے بھی ان کی دریافتوں کی صحت کی تصدیق کرنے کی کوشش کی۔ اس کا معاونِ خصوصی جگناتھ نہ صرف عربی زبان کا فاضل تھا وہ یونانی اور اسلامی علم الھیئت میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ چنانچہ راجہ کے ایماء سے اس نے بطلیموس کی "کتاب المجسطی" کا عـــربی سے سنسکرت میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

آخر زمانہ میں اسے بتایا گیا کہ یورپ کے اندر اس علم میں بڑی ترقی ہوئی ہے اور ہنوز وھاں کے فضلاء ارصادی سرگرمیوں میں مصروف ھیں۔ ان

داستانوں سے متأثر ہو کر راجہ نے جیسوٹ مبلغین سے جو اس فن میں بھی مہارت رکھتے تھے استفادے کی کوشش کی ۔

فاضل راجہ کی انتھک کوششوں کا ماحصل رصد گاہ کی تعمیر کے علاوہ ایک ہیئتی جدول کی تصنیف بھی تھا ، جسے اس نے اپنے آقائے ولی نعمت (محمد شاہ) کے نام پر "زیج محمد شاہی" کے نام سے شائع کیا ۔

مگر ہر چند کہ اس "زیج" میں آخری دو ماخذوں سے خوشہ چینی کے واضح نشانات ملتے ھیں ، اول الذکر کا ادنی المام بھی نہیں ہے اور اس کا پڑھنے والا خود کو اس رصد گاہ کے مشہور تذکرہ نگار جی ۔ آر ۔ کاپے کے ساتھ اتفاق کرنے پر مجبور پاتا ہے کہ "یہ مفروضہ کہ اس نے اپنے اصولی ہیئتی افکار ھندو روایات سے حاصل کئے مکمل طور پر ساقط الاعتبار ہے" ۔

جہاں تک اسلامی ہیئت سے استفادے کا تعلق ہے نہ صرف جے سنگھ کی مرتبہ "زیج" بلکہ اس کی قائم کردہ رصد گاہ بھی اس کے مسلمان پیشروؤں کی کاوشوں کا تسلسل معلوم ہوتی ہے جیسا کہ جوزف نیڈھم "چینی ثقافت اور علم و حکمت" میں رقمطراز ہے ۔

" (راجہ جے سنگھ) اگر چہ ھندو تھا اور ھندو معاونین ھی کی مدد سے رصدگاہ کا کام انجام دیتا تھا ، بایں ھمہ وہ مکمل طور پر علم ہیئت کی اسلامی ، عربی روایات کا متبع تھا اور اپنے کام کو الغ بیگ کی ارصادی سرگرمیوں کا تسلسل سمجھتا تھا "۔

اسی طرح جی ۔ آر ۔ کاپے کا کہنا ہے :۔

"ان عوامل کے باب میں ذرہ برابر شک نہیں ہے ، جنھوں نے اس کی (ہیئتی) سرگرمیوں کا رخ متعین کیا ۔ یہ الغ بیگ جیسے مسلمان ماہر فلکیات ہیئت دانوں کے اثرات تھے "۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اگر "زیج محمد شاہی" کے مصنف کے نام سے قطع نظر کر

لیا جائے اور اس بات کو نظرانداز کردیا جائے کہ اسمیں وقت کے دستور کے علی الرغم،،نعت رسول،، نہیں لکھی گئی تو یہ اسلامی علم الهیئت هی کا شاهکار معلوم هوگی ۔ اور اگر اسے الغ بیگ کی ،،زیج جدید گورگانی،، کا سرقہ کہنا سوء ادب هو ، تو بھی موخر الذکر کا چربہ کہے بغیر نہیں رها جا سکتا ۔ اس کی تصدیق دونوں زیجوں کے تقابلی مطالعہ سے کی جا سکتی ہے ۔

اور جہاں تک یوربی علم الهیئت کے اثرات کا تعلق ہے ، سوائے سرسید کے کسی تذکرہ نگار نے ان کی نشاندهی نہیں کی ، جس کی وجہ امعان نظر سے پوری کتاب کے مطالعہ میں کوتاهی ہے ۔ ان لوگوں کی توجہ صرف دیباچہ تک محدود رهی (جس کا انگریزی ترجمہ موجود تھا) اصل کتاب، بالخصوص اس کے تیسرے مقالے کے حرفاً حرفاً پڑھنے کی کسی نے زحمت نہیں فرمائی اور جب یہ ،،اثرات،، تذکرہ نگاروں کی نظر سے اوجھل رهے تو ان کے بظاهر فقدان کی توجیہ عجیب عجیب انداز سے کی ۔ چنانچہ جی ۔ آر ۔ کاپے جیسے محقق نے بھی اسے جیسوٹ مسریوں کی مذهبی تنگ نظری پر محمول کیا ۔ دوسرے نقادوں اور تذکرہ نگاروں نے تو اسے در خور ذکر تک نہیں سمجھا ۔

بهر حال یہ رصد گاہ اس ملک میں اپنی نوعیت کی واحد تعمیر ہے ۔ اس سے پہلے یہاں کوئی رصد گاہ تعمیر نہیں هوئی نہ قدیم هندو دور میں اور نہ قرونِ وسطی کے اندر مسلمانوں کے عہد حکومت میں اور نہ هی اس انداز پر اس کے بعد هی کوئی رصد گاہ تعمیر هوئی ۔ چنانچہ ایک اطالوی مورخ علم الهیئتِ جیور جیو ابیتی لکھتا ہے :۔

،،هندوستان کے شہروں کے کھنڈروں میں بابل کی طرح رصد گاهوں کا نشان نہیں ملتا،، خود راجہ جے سنگھ کو اس کا اعتراف ہے ، چنانچہ وہ ،، زیج محمد شاهی،، کے دیباچہ میں کہتا ہے :۔

،،مدت مدید گزر گئی ہے مگر صاحب اقتدار راجاؤں میں سے کسی نے

بھی اس کی طرف توجہ نہیں کی اور فرقہ اہل اسلام میں بھی بادشاہ الغ بیگ مرحوم و مغفور کے زمانہ سے جسے تین سو سال سے زائد ہو رہے ہیں سلاطین ذی سان و امراء بلند مکان میں سے کسی نے اس کی پروا نہیں کی ۔

واقعہ یہ ہے کہ رصد گاہ دھلی رصدگاھوں کے اس سلسلے کی آخری کڑی ہے ، جس کا آغاز عباسی خلیفہ ابو عبد اللہ المامون نے ۲۱۴ ھ (مطابق ۸۲۹ء) میں کیا تھا ۔ المامون سے پہلے بھی عہد اسلام میں ایک رصد گاہ کا ذکر ملتا ہے جو رصد گاہ مامونی سے کوئی نصف صدی بیشتر شہر جندی سابور میں محمد بن احمد النہاوندی کی سربراھی میں سرگرم کار تھی اور جس کی ہیئتی دریافتوں کو اس نے ,,الزیج المستمل،، میں قلمبند کیا تھا ۔ ویسے مسلمانوں میں ارصادی سرگرمیوں کا حوالہ اس سے بھی کہیں پہلے سے ملتا ہے ، چنانچہ ابو ریحان البیرونی نے ,,تحدید نہایات الاماکن،، میں لکھا ہے کہ اس نے ایک پرانی یادداشت میں ان فلکی مساھدات کی تفصیل پڑھی تھی جو شہر بست میں ۹۰ھ اور ۱۰۰ھ کے درمیان کئے گئے تھے ۔ مگر یہ سب کچھ سرکاری سرپرستی سے بے نیاز ہو کر کیا گیا تھا ۔ اس لئے ان کی تفصیل موجب تطویل ہوگی ۔

غرض عہد اسلام کی سب سے پہلی رصد گاہ جو سرکاری سرپرستی میں قائم ہوئی ، بغداد اور دمشق کی رصد گاہ مامونی تھی ۔ اس طرح کی دوسری مشہور رصد گاہ بھی اس کے کوئی ایک سو ساٹھ سال بعد بغداد ھی میں تعمیر ہوئی ۔ اسے بویہی تاجدار عضدالدولہ کے بیٹے شرف الدولہ نے ۳۷۸ھ (مطابق ۹۸۸ع) میں قائم کرایا تھا ۔ اس انداز کی اگلی رصد گاہ رصد گاہ ملکشاھی تھی جسے سلجوقی تاجدار ملک شاہ نے مروجہ تقویم کی اصلاح اور نوروز کے وقت کے تعین کے لئے عمر خیام کی سربراھی میں ۴۶۷ھ (مطابق ۱۰۷۴ع) میں شہر اصفہان کے اندر تعمیر کرایا تھا ۔

اس دوران میں بیشمار رصدگاھیں تعمیر ہوتی رھیں ۔ ایک ترک

محقق نے صرف ان رصدگاھوں کی تعداد جو ۸۰۰ء اور ۱۰۵۰ء کے مابین قائم کی گئیں اور جن کی ارصادی سرگرمیوں کی تفصیل ھنوز دنیا کے کتب خانوں میں محفوظ ہے ایک سو چار بتائی ہے ۔ اس سے مسلمان ھیئت دانوں کی ارصادی مساعی اور اسلام کے ھیئتی ادب کی ثروت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ مگر جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے رصد گاھیں عموماً سرکاری سرپرستی سے بے نیاز ھو کر محض ذاتی شوق سے قائم ھوتی تھیں ۔ ان میں البتانی اور البیرونی کی ارصادی سرگرمیاں خصوصیت سے مشہور ھیں ۔

سرکاری سرپرستی میں قائم ھونے والی سب سے مشہور رصدگاہ مراغہ کی تھی جسے ھلاکو خان کے حکم سے خواجہ نصیر الدین طوسی نے ۶۵۸ھ (مطابق ۱۲۵۹ء) میں قائم کیا تھا ۔ اس کی ارصادی و ھیئتی سرگرمیوں میں محقق طوسی کے علاوہ اسلامی قلمرو کے اساطین فضلائے علم الھیئت قطب الدین شیرازی ، نجم الدین کاتبی قزوینی ، موید الدین عرضی دمشقی ، محی الدین مغربی وغیرھم نے حصہ لیا ۔ اس رصد گاہ کی شہرت اسی زمانہ میں دور دور تک پھیل گئی تھی ، چنانچہ بادشاہ چین کی خواھش پر ایلخانی قلمرو کا ایک فاضل جمال الدین اس رصد گاہ میں استعمال ھونے والے آلات کی تفصیلی فہرست لے کر چین گیا ۔ ان آلات میں اسطرلاب بھی تھا ، جس سے اھل چین اس وقت تک قطعاً نا آشنا تھے ۔ مگر ان آلات کا زیادہ تفصیلی تذکرہ اس رصد گاہ کے ایک رکن موید الدین عرضی دمشقی نے اپنے رسالہ ، " رسالہ فی کیفیة الارض وما یحتاج الی علمه و عمله من طریق المودیة الی معرفة اوضاع الکواکب" میں قلمبند کیا ہے جس کی اساس پر مستشرقین نے اس رصدگاہ کی کیفیت مختلف علمی رسائل و جرائد میں شائع کی ہے ۔ لیکن رصد گاہ سے زیادہ اھم اس کے ارصادات و مشاھدات ھیں جن کے نتائج کو " زیج ایلخانی" کے نام سے مرتب کیا گیا تھا ، کیونکہ اسی " زیج ایلخانی" نے " زیج محمد شاھی" کے لئے نمونہ

عمل کا کام سر انجام دیا (تفصیل آگے آ رہی ہے) ـ

مراغہ کی رصدگاہ کے کوئی پونے دو سو سال بعد تیمور کے پوتے الغ بیگ نے سمرقند میں ایک عظیم الشان رصد گاہ تعمیر کرائی ـ وہ خود ریاضی و ہیئت میں دستگاہ رکھتا تھا اور ان فنون کے ماہرین کا قدرداں تھا ـ ان میں چار فاضل خاص طور سے مشہور ہیں ـ معین الدین کاسی ، غیاث الدین جمشید کاسی ، قاضی زادہ رومی اور علاء الدین قوشجی ـ پہلے غیاث الدین جمشید کاسی کو رصد گاہ کا سربراہ مقرر کیا گیا ـ مگر جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا ـ زاں بعد بادشاہ نے اپنے استاد قاضی زادہ کو رصد گاہ کا متولی مقرر کیا ـ مگر اتمام رصد سے پہلے ہی ان کا بھی انتقال ہو گیا ـ آخر میں الغ بیگ نے علاء الدین علی قوشجی کی مدد سے خود اس کام کو ختم کیا اور اسی ہیئتی دریافتوں کو ایک ہیئتی جدول میں قلمبند کیا جو ”زیج جدید سلطانی“ یا ”زیج الغ بیگ“ کے نام سے مشہور ہے ـ دولت شاہ ”تذکرۃ الشعراء“ میں اس زیج کے بارے میں لکھتا ہے :

”والیوم نزدِ حکماء آں زیج متداول و معتبر است و بعضے آرا بر زیج نصیری ایلخانی ترجیح می کنند“ ـ

آج کل یہ ”زیج الغ بیگ“ حکماء کے نزدیک معتبر اور ان کے یہاں مروج ہے بلکہ بعض فضلاء تو اسے نصیر الدین طوسی کی ”زیج ایلخانی“ پر بھی ترجیح دیتے ہیں ـ

مستشرقین ”رصد گاہ سمرقند“ پر عہد اسلام کی سرگرمیوں کا تذکرہ ختم کر دیتے ہیں ، حالانکہ ان کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا ، چنانچہ ۱۵۷۷ء میں اس کے انداز پر استانبول میں بھی ایک رصد گاہ قائم کی گئی جس سے متاثر ہو کر یورپ میں رصد گاہوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا ـ

مگر رصد گاہ استانبول سے زیادہ شہرت رصد گاہ دہلی نے حاصل کی ، جس کی تعمیر میں نیز جس کے اندر استعمال ہونے والے آلات کی تیاری میں

راجہ جے سنگھ نے رصد گاہ سمرقند کی تقلید کی جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے۔

"جس طرح کے آلات رصدیہ سمرقند کی رصدگاہ کے اندر تیار کرائے گئے تھے، مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کی مدد سے یہاں (دھلی میں) بھی تیار کرائے۔ مثال کے طور پر یہاں پیتل کا ایک ذات الحلق بنوایا گیا جس کا قطر تین رایج الوقت گز تھا۔ رایج الوقت گز شرعی گز کا تقریباً دگنا ہوتا ہے۔ اسی طرح ذات النقبتین، ذات الشعبتین، سدس فخری اور حلقہ شاملہ تیار کرائے"۔

مگر بعض وجوہ سے وہ ان سے مطمئن نہیں ہوا۔ لہذا اس نے ان آلات میں اصلاح کی اور پیتل کے بجائے پتھر اور چونے سے نئے آلات بنوائے جن کے ھندی نام رکھے جیسے جے پرکاس، رام جنتر اور سمراتھ جنتر۔

یہ نئے ھندی الاسم آلات کہاں تک راجہ جے سنگھ کی ذاتی اختراع اور اس کے ابتکار فکر کا نتیجہ تھے اور کہاں تک مراغہ اور سمرقند کی رصدگاھوں میں استعمال ہونے والے آلات کی اصلاح، اس کا فیصلہ اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک ان آلات اور پچھلے مسلمان آلات سازوں نے ان کی تیاری پر جو کتابیں لکھی ھیں ان کا تقابلی مطالعہ نہیں کر لیا جاتا۔ خوش قسمتی سے ان میں سے بعض کتابیں دنیا کی مشہور لائبریریوں میں ھنوز موجود ھیں۔ مویدالدین عرضی دمشقی کے "رسالہ فی کیفیة الارصاد" کا ذکر اوپر آچکا ہے مولانا عبدالعلی برجندی کا رسالہ فی آلات الرصد" رضا لائبریری رامپور میں اور "رسالہ مختصر فی بیان الرصد" کتب خانہ آصفیہ میں موجود ھیں۔ اور بھی رسائل ھنوز موجود ھیں۔

اس تقابلی مطالعہ کی ضرورت اس لئے اور بھی ہے کہ انہیں ثقیل سنسکرت نام دیکر قطعاً غیر مانوس بنا دیا گیا ہے، جیسے "ششت ماسا" جو سدس فخری کا نیا نام ہے۔ حالانکہ اسے فخر الدولہ دیلمی کے درباری منجم ابو محمد محمود خجندی نے ایجاد کیا تھا۔ مگر نئے نام سے وہ "ویدک کال" کی

یادگار معلوم ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ دلچسپ حال " نام کرن" اسطرلاب کا ہوا جسے " ینتر راجہ" کے نام سے موسوم کیا گیا ۔ اس سے مرعوب ہو کر گیرٹ (GARRETT) کو کہنا پڑا کہ

" یہ آلہ بہت ہی قدیم ہندو ایجاد معلوم ہوتا ہے" ۔

حالانکہ اسطرلاب کے موضوع پر قدیم ترین سنسکرت کتاب مہندر سوری کی ہے جسے اس نے ۱۲۹۲ء شاکا میں لکھا تھا جو ۱۳۷۰ء کے مطابق ہے۔ اور اس سے کہیں پہلے عربی فارسی زبانوں میں اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی تھیں ، جن کی ایک کثیر تعداد مہندر سوری کے پیش نظر تھی ۔ مہندر سوری نے اپنی کتاب فیروز تغلق کے عہد میں لکھی جسے حسب تصریح " سیرت فیروز شاہی" نجوم اور اسطرلاب سازی سے غیر معمولی دلچسپی تھی ۔

" اسطرلابہا با قواعد و قوانین این علم ساختہ رسالہا در وضع آں پرداختہ . . . . اسطرلاباب نامہ کہ منسوب است باسطرلاب فیروز شاہی و بر بالاترین منارہ فیروز آباد نصب کردہ اند ، باختراع و تصنیف و ارشاد و تالیف خاص حضرت سلطنت خلد اللہ ملکہ مرتب شدہ . . . . الحق تصنیف آں آلات جدید مختص بپادشاہ و تالیف رائے ہمایوں است . . . . آں اسطرلاب تام بسعی جمیل بادشاہ اسلام شمالی و جنوبی مرتب شدہ " ۔

" الناس علی دین ملوکہم" کے مصداق اس کے زمانہ میں اسطرلاب سازی فضلائے وقت کا بڑا دلچسپ مشغلہ تھا اور اسی سے متاثر ہو کر مہندر سوری نے یہ کتاب لکھی تھی ۔

بہر حال رصد گاہ دہلی کے یہ نئے آلات فضلائے محققین کی یلغارِ تحقیق کے منتظر ہیں ، اگر چہ جی ۔ آر کاے انہیں قدیم مسلمان ہیئت دانوں کے ایجاد کردہ آلات کی اصلاح بتاتا ہے ۔ وہ موکد طور پر لکھتا ہے ۔

"عام طور پر جے سنگھ کے آلات یا تو الغ بیگ اور اس کے پیشروؤں اور جانشینوں کے استعمال کردہ آلات کی نقل تھے یا ان کی براہ راست اصلاح تھے" ۔

مثال کے طور پر وہ " جے برکاش" کو بیروسس کے نصف کرہ کی ترقی یافتہ شکل اور اس کے اندر پیمائش کے انتظام کو قدیم مسلمانوں کے آلہ " المسطرہ" پر مبنی بتاتا ہے ۔

اس سے زیادہ واضح مسئلہ "زیج محمد شاہی" کا ہے اوپر ذکر آ چکا ہے کہ زیج ایلخانی" نے "زیج محمد شاہی" کے لئے نمونہ عمل فراہم کیا ہے ۔ "زیج ایلخانی" میں چار باب ھیں ۔ پہلا تواریخ پر ، دوسرا حرکات کواکب و اوضاع ثوابت پر ، تیسرا معرفت اوقات و طوالع میں ، اور چوتھا نجوم پر ۔ "زیج الغ بیگ" اور"زیج شاھجہانی " میں بھی یہی چار ابواب ھیں ۔ پہلا معرفت تواریخ پر دوسرا معرفت اوقات و طالع اوقات میں ، تیسرا "روش ستارگان و مواضع ایشان" پر اور چوتھا اعمال نجومی میں ۔ یہی انداز "زیج محمد شاھی" میں ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ اس کا بھی پہلا مقالہ معرفت تواریخ میں ہے ۔ دوسرا " معرفتِ طالع ھروقت" میں اور تیسرے کا عنوان ہے "در معرفت روش ستارگان و مواضع اینہا در طول و عرض و اُنچہ ملائم، آنست" نجوم والا مقالہ نہیں ہے ۔ مگر اس سے بھی زیادہ اھم " زیج الغ بیگ" اور " زیج محمد شاھی" میں مواد کی یکسانی ہے ۔ اگر دونوں کے مختلف ابواب کے مواد کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو سوائے ضمائر اور صیغوں کے اختلاف کے کوئی فرق نہیں ملے گا ۔ مثلاً ایک میں جمع متکلم کا صیغہ ملے گا تو دوسرے میں جمع غائب کا ۔ اس غیر معمولی مماثلت کی بنا پر اگر "زیج محمد شاھی" کو "زیج الغ بیگ" کا سرقہ کہنا سوء ادب ھو بھی تو اس کا چربہ ضرور کہا جا سکتا ہے ۔ لیکن جہاں اختلاف ہے وہ بڑا اھم ہے اور وھی راجہ جے سنگھ کا کمال ہے ۔ مثلاً " زیج الغ بیگ"

میں میل کلی ۲۳ درجہ ۳۰ دقیقہ ۱۷ ثانیہ ہے۔ . . . . مگر راجہ کی دریافت ۲۳ درجہ ۲۸ دقیقہ ہے۔ چنانچہ دوسرے مقالہ کے تیسرے باب میں بکمال خود اعتمادی لکھتا ہے :-

"میل کلی برصد سمرقندی کج ل یز و فرنگیاں کج لط ۔ وما بتدقیقِ تمام کج کح یافتہ ایم" ۔ اس سے بھی زیادہ اہم کارنامہ ایک دقیقہ کی جیب (SINE) کا ہندسی اصول سے استخراج ہے ، جس کے اندر بطلیموس کے زمانہ سے ہیئت دان و ماہرین ریاضیات ناکام رہے تھے ۔ الغ بیگ نے تو صرف ایک درجہ کی جیب نکالنے میں کامیابی حاصل کی تھی ۔ مگر راجہ جے سنگھ نے ایک دقیقہ کی جیب نکالنے کا بھی خالص ہندسی طریقہ دریافت کر لیا ، چنانچہ اسی مقالے کے پہلے باب میں کہتا ہے :-

واضح ہو کہ مرحوم بادشاہ الغ بیگ نے خالص ہندسی دلائل کی مدد سے کسی قوس کے (جس کی جیب معلوم ہو) تہائی حصہ کی جیب معلوم کرنے کا طریقہ دریافت کر لیا تھا اس طرح وہ ایک درجہ کی جیب نکالنے میں کامیاب ہو گیا تھا ۔ لیکن ہمیں خدائے تعالی کی مہربانی سے معلوم الجیب قوس کے پانچویں حصہ کی جیب نکالنے میں کامیابی ہو گئی ہے۔ اس کی مدد سے ہم نے خالص ہندسی طریقوں سے ایک دقیقہ کی جیب نکال کر اپنی زیج میں قلمبند کر دی ہے ۔

اپنے مسلمان پیشروؤں سے علمی و عملی علم الهیئت میں راجہ جے سنگھ کے اخذ و استفادے کی تفصیل موجب تطویل ہوگی ، لہذا اس سے صرف نظر کرکے یورپی یا جدید ہیئت سے اس کے تأثر کا ذکر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ جدید تحقیقات نے راجہ کی ان کوششوں کی جزئیات تک کا پتہ چلا لیا ہے جو اس نے اس فن کے واقف کار جیسوٹ مشنریوں کو اپنے یہاں بلانے اور ان سے استفادہ کرنے کے سلسلے میں کی تھیں مگر اس کے یہاں جدید ہیئت کے اثرات

کی نشاندھی سرسید کے علاوہ ھنوز کسی اور محقق نے نہیں کی ۔ یورپی فضلاء سے استفادے کی کوشش کا آغاز راجہ نے ۱۷۲۸ء سے کیا جس کا سلسلہ اس کی وفات (۱۷۴۳ء) تک قائم رھا ۔ ظاھر ہے یہ تقریباً پندرہ سال کا اختلاط و ارتباط اور علمی مذاکرہ بے اثر نہ رہا ھوگا ۔ چنانچہ جوزف ٹیڈھم "چینی علم و حکمت اور تہذیب و ثقافت" میں لکھتا ہے :-

"مسلمان ھیئت دانوں بالخصوص الغ بیگ کا متبع ھونے کے باوجود یورپی تصانیف کا ایک بڑا ذخیرہ اس کی دسترس میں تھا اور اس کے کارکن فلیمسٹیڈ اور لاھائر کی ھیئتی جداول کا بطلیموس کی کتاب المجسطی سے کم استعمال نہیں کرتے تھے" ۔

مگر جی ۔ آر ۔ کایے کو اس سے اختلاف ہے کیونکہ جیسا کہ اس کا کہنا ہے یہ روابط اس وقت شروع ھوئے جب راجہ اپنا رصد کا کام ختم کر چکا تھا ۔ اس سے بھی بڑی وجہ اس کے خیال میں ان کیتھولک (جیسوٹ) پادریوں کی تنگ نظری ہے جو جدید ھیئت کے اصول و نظریات کو اپنے مذہب کے لئے ایک ضرب کاری سمجھتے تھے اس لئے وہ ان کی تعلیم و تلقین کس طرح کر سکتے تھے۔

مگر صورت حال یہ ہے کہ ان محققین میں سے شاید ھی کسی نے "زیج محمد شاھی" کو بالاستقصاء پڑھنے کی زحمت گوارا کی ھو ، صرف اس کے دیباچہ کے ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے ۔ بہر حال "آثار الصنادید" میں سرسید نے لکھا ہے ۔

"یہ رصد خانہ وہ ہے کہ جس میں پہلے پہل انگریزی ھیئت جدید کے اکثر قواعد تسلیم کئے گئے . . . . انہیں باتوں سے یقین ھوتا ہے کہ اس رصد خانہ میں انگریز بھی شریک تھے ۔ بلکہ انگریزی ھیئت جدید کے قواعد کا اس یونانی رصد خانہ میں مان لینے کا بڑا سبب یہی معلوم ھوتا ہے"۔

اس کے بعد انہوں نے "ایک مختصر فہرست ان باتوں کی" دی ہے "جو

برخلاف یونانی هیئت کے اس رصد خانے میں تسلیم کی گئی ہیں۔ مگر ان تمام اثرات کا استقصاء جن کی سرسید نے نشاندھی کی ہے اور "زیج محمد شاھی" سے ان کی تصدیق تو موجب تطویل ہوگی ۔ لہذا مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق چند ایک کا بیان کیا جا رہا ہے۔ سرسید کہتے ہیں :-

(۱) "مدار خارج مرکز شمس کو بیضئی تسلیم کیا" ۔

سرسید نے یہ بات "زیج محمد شاھی" کی حسب ذیل تصریح سے اخذ کی ہے۔

"این خواهان تحقیق خواست کہ انچہ بتدقیق از روئے رصد یافتہ مطابق آں شکلها هم درست کرده شود . . . اول باید دانست کہ مدار خارج المرکز آفتاب را رصد کردن بشکل محیط سطح بیضئی معلوم شده" ۔

(۲) یہ بات تسلیم کی گئی کہ زھرہ اور عطارد بھی چاند کی طرح آفتاب سے روشن ہیں اور بدر اور ھلال ہوتے ہیں ۔

(۳) یہ بات مانی گئی کہ زحل گول کروی شکل پر نہیں بلکہ اھلیلجی شکل پر ہے۔

(۴) مشتری کے گرد چار روشن ستارے قبول کئے گئے ہیں جن کا اقمار مشتری نام ہے۔

یہ باتیں "زیج محمد شاھی" کی حسب ذیل تصریحات سے ماخوذ ہیں ۔

"در سرکار ما دوربین ها ساختہ اند کہ بواسطہ آں . . . . هیئات بعضے از کواکب سیاره و صفات آنهارا مخالف مکتوبی معروف و مشهور یافتیم . . . . اول آنکہ برای العین مشاهده کردیم کہ زهره و عطارد هم مانند قمر از آفتاب استفادهٔ نور میکنند چہ آنهارا دیدم بسبب قُرب و بُعدِ آفتاب متناقص النور و متزائد النور می گردند ۔

دوم آنکہ زحل را می بینم کہ شکل اھلیلجی دارد . . . . .

سوم آنکہ بر حولِ مشتری قریب بمسافتہ منطقہ اش چہار کوکب روشن یافتہ ایم کہ بر حول مشتری میگردند» ـ

اس طرح راجہ جے سنگھہ کی یہ کوشش ، رصد گاہ اور «زیج محمد شاھی» قدیم و جدید علم الھیئت کی آمیزش کی ایک قابل قدر یادگار ہے اور اگر راجہ کا اتنی جلد انتقال نہ ہو جاتا یا اسے جیسوٹ مشنریوں کے بجائے یورپ کے فضلائے علم الھیئت سے تبادلۂ خیالات کا موقع مل جاتا تو اس خطے میں سائنس بالخصوص علم الھیئت کی ترقی و ارتقا کا رخ کچھہ اور ھی ہوتا ـ

ترجمان فراھی سے ایک ملاقات

شرف الدین اصلاحی

جب سے مجھے مولانا فراھی پر تحقیق کا منصوبہ تفویض ہوا ہے نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی ہے ، کیسی کیسی سنگلاخ اور پر خار وادیوں سے گذرا ھوں۔ اس راہ میں کوہ کنی بھی کی ہے اور صحرا نوردی بھی ۔ اس کی داستان قلمبند کروں تو یہ خود ایک ضخیم کتاب بن جائے ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ تحقیق نام ھی ہے کوہ کنی کا بلکہ احیاناً ،،کوہ کندن کاہ برآوردن،، کا۔ شاید ہی پرندے کو اپنے آشیانے کیلئےایک ایک تنکا جمع کرنے میں اتنی محنت صرف کرنی پڑتی ہو جتنی کہ ایک رھروِراہِ تحقیق کو اپنے منصوبے کے لیے مواد اکٹھا کرنے میں صرف کرنی پڑتی ہے ، بالخصوص جبکہ وہ کسی نا سپردہ راستے پر چلنے کا بیڑا اٹھا بیٹھے ۔

میں اس سے پیشتر اپنے کسی مضمون میں لکھ چکا ھوں کہ مولانا فراھی عربی ادب کی تحصیل کے سلسلے میں ایک عرصہ تک لاھور میں مقیم رھے ۔ مگر یہ بات کم لوگوں کو معلوم ھوگی کہ انہوں نے علیگڑھ سے فراغت کے بعد سندھ مدرسہ الاسلام کراچی میں برسوں استاذ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں ۔ یہ وھی مدرسہ ہے جس میں قائداعظم محمد علی جناح نے بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی ۔ ان کا پہلا بچہ جس کا نام محمد حماد تھا ۹ برس کی عمر میں فوت ھو کر کراچی میں سپرد خاک ہے۔ ان کے پوتوں میں سے بعض تقسیم کے بعد پاکستان آگئے اور میری ابتدائی معلومات کے مطابق وہ نواب شاہ

سندھ میں سکونت پذیر ھیں ۔ اس وقت پاکستان میں ان کے فکر سے متاثر نوجوان افراد کا ایک اچھا خاصا حلقہ موجود ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن کی اشاعت سے پاکستان میں اب فراھی اجنبی نہیں رھے ۔ اور ان کا دائرہ تعارف روز بروز وسیع سے وسیع تر ھوتا جا رھا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی کا قائم کردہ حلقہ تدبر قرآن جس کا محور فکر فراھی ہے برگ و بار لازھا ہے۔ اس حلقے سے وابستہ نوجوان نہ صرف اپنے سیرت و کردار بلکہ فکر و نظر کے اعتبار سے بھی اس بار امانت کو اٹھانے کے لئے تیار ھو رھے ھیں جس کو مولانا امین احسن اصلاحی ایک مدت مدیدہ تک یکہ و تنہا اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھائے رھے ۔ ان نوجوانوں کے سینے اللہ تعالٰی نے اس فکر کے لیے کشادہ کر دئیے ۔ آج وہ کامل شرح صدر کے ساتھ اس کے لیے سرگرم عمل ھیں ۔ پاکستان کے سنجیدہ حلقوں میں جس طرح تدبر قرآن کا خیر مقدم کیا گیا ہے اور جس طرح فکر فراھی کو پذیرائی حاصل ھو رھی ہے مجھے مولانا امین احسن اصلاحی کے اس قول میں ذرہ برابر مبالغہ نظر نہیں آتا کہ " پندرھویں صدی مولانا فراھی کی صدی ہے " ۔ چودھویں صدی میں بے شمار تفسیریں لکھی گئی ھیں اور قرآنی علوم و افکار پر ان گنت لوگوں نے کام کیا ہے۔ یہ فیصلہ مستقبل ھی کرے گا کہ ان میں سے کس کو کتنی زندگی ملتی ہے۔ اور یہ زندگی اور موت ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اس کو حیات و ممات کے خالق نے اپنے ھاتھ میں رکھا ہے۔ اور اس کے پیمانے ھم انسانوں سے بالکل مختلف ھیں ۔ اس کے ھاں بقا و فنا کے اصول ھمارے اصولوں سے یکسر جداگانہ ھیں ۔

مولانا امین احسن اصلاحی مولانا فراھی کے شاگرد رشید ھی نہیں انکے علم کے وارث اور انکے فکر کے امین بھی ھیں۔ پاکستان میں وہ واحد شخص ھیں جو فراھی پر کام میں مدد اور رھنمائی کے اھل ھیں۔ جب سے میں نے یہ منصوبہ لیا ہے متعدد مرتبہ انکی خدمت میں حاضری دے چکا ھوں۔ اس سے پہلے وہ

ضلع شیخوپورہ کے ایک دور افتادہ گاؤں رحمن آباد (چک نمبر ۴) میں رھائش پذیر تھے جس کا پرانا دیہاتی نام بھیکو دی ٹبی ہے اور یہ خانقاہ ڈوگراں کے مغرب میں واقع ہے۔ اب تقریباً ایک سال سے وہ لاھور میں مقیم ھیں ۔ ادھر فکر و نظر کے کام کی وجہ سے میں منصوبے کی طرف بھر پور توجہ نہ دے سکا ۔ کئی ایک تنقیح طلب مسائل پر تبادلہ خیال کے لئے مولانا سے ملاقات کی ضرورت تھی ۔ ایک عرصہ کے بعد میں نے فروری کے پہلے ھفتے میں ان سے ملاقات کا پروگرام بنایا ۔ پہلے وہ اچھرہ رحمن پورہ کے قریب فاضلیہ کالونی میں کرائے کا مکان لیکر رہ رہے تھے جہاں پہنچنا بہت آسان تھا ۔ میں لاھور پہنچا تو معلوم ھوا کہ ان دنوں وہ لاھور میں اپنے چھوٹے داماد میجر انور کے پاس اقامت رکھتے ھیں ۔ لاھور میرے لئے نیا نہیں ۔ میں سالہا سال تک اس کا شہری رہا ھوں اور اسکے چپے چپے سے واقف ھوں ۔ مگر یہ جگہ واھگہ سرحد کی طرف چھاؤنی کے علاقے میں بالکل ایک نئی آبادی ہے جو نہ صرف قلب شہر سے بہت دور ہے بلکہ غیر معروف بھی ہے ، اور وھاں تک پہنچنے کے لئے پر پیچ دشوار گذار راستوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہ جگہ شہری نقطہ نظر سے اتنی غیر معروف ہے کہ شاید اس کا ابھی تک کوئی باقاعدہ نام بھی نہیں رکھا گیا ہے۔ چنانچہ جب میں نے مولانا کے بڑے داماد نعمان شبلی صاحب سے پتا معلوم کیا تو انہوں نے اپنی تمام تر مہندسانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر نقشوں اور مختلف علامات کی مدد سے بات کو اس حد تک واضح کر دیا کہ میں اسکے سہارے پہنچنے میں کامیاب ھوگیا۔مگر کوئی باقاعدہ پتا بتانے سے وہ بھی قاصر رہے اور خود مولانا اصلاحی بھی ۔ نعمان شبلی صاحب واپڈا میں چیف انجینئر ھیں اور واپڈا ھاؤس کے کمرہ نمبر ۵۱۹ میں ان کا دفتر ہے ۔ ان کی رھائش ''اپر مال'' پر واپڈا آفیسرز کالونی میں ہے۔ دینی رجحان اور سلامت طبع کی وجہ سے فراھی اور فکر فراھی سے انہیں بھی یک گونہ دلچسپی ہے۔ اور

مولانا اصلاحی کو ان پر اس درجہ اعتماد ہے کہ مولانا فراھی کی جو باقیات پاکستان میں ان کے پاس تھیں حفاظت کے خیال سے انھی کی تحویل میں دے رکھی ھیں ۔

میں نعمان صاحب اور حلقہ تدبر قرآن کے دوسرے رفقاء کا شکر گذار ھوں کہ انھوں نے اس کام کو اپنا کام سمجھ کر ھمیشہ میرے ساتھ تعاون کیا ۔ مولانا کی اھلیہ ایک عرصے سے شوگر کے مرض مزمن میں مبتلا چلی آرھی ھیں۔ ان کسی حالت تشویش ناک حد تک خراب ہے ۔ مولانا کے لئے یہ صورت حال خاصی پریشان کن ہے ۔ خود مولانا کو بلڈ پریشر کی شکایت ھو گئی تھی مگر علاج کے بعد اب وہ بالکل ٹھیک ھیں ۔ میں جب تک لاھور میں رھا مسلسل بارش ھوتی رھی اور سردی اپنے شباب پر تھی ۔ فروری کے مہینے میں اھل لاھور کے لئے یہ موسم اس سال کچھ غیر متوقع اور غیر معمولی تھا ۔ میں اسلام آباد کی سردی پیچھے چھوڑ کر گیا تھا مگر وھاں کی سردی سب کو پیچھے چھوڑ گئی ۔ عام حالات میں کوئی دوسرا ھوتا تو شاید مولانا معذرت کرتے ۔ مگر میں جس کام کے لئے گیا تھا اور جن حالات میں گیا تھا ان کے خلق کریم سے اور الطاف عمیم سے بعید تھا کہ مجھے مایوس کرتے ۔

مولانا نے تدبر قرآن کا کام ختم کر لیا ہے ۔ تدبر قرآن کی آخری یعنی آٹھویں جلد اسوقت پریس میں ہے۔ پبلشرصاحب سے جو حلقے ھی کے ایک رکن ھیں معلوم ھوا کہ اختتام فروری سے پہلے پہلے تدبر قرآن کی آخری جلد مارکیٹ میں آجائیگی ۔ مولانا اصلاحی ان دنوں حدیث اور اسکے متعلقات کے مطالعہ میں مصروف ھیں۔ انھوں نے فرمایا کہ قرآن کے بعد اب اگر کوئی چیز پڑھنے اور کام کرنے کی ھوسکتی ہے تو وہ حدیث ہے۔ جس نہج پر میں نے قرآن پر کام کیا ہے چاھتا ھوں کہ اسی نہج پر حدیث پر بھی کام کرکے ایک کتاب لکھ دوں۔ اس سلسلے میں انھوں نے حدیث، فقہ، اصول حدیث اور اصول فقہ کا باقاعدہ

مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ آج کل وہ موافقات کا مطالعہ کر رہے ہیں ۔ میں جس وقت ان کی خدمت میں پہنچا وہ اپنے داماد میجر انور کی سرکاری رہائش گاہ واقع ملٹری کیمپ کے باہر دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ ان کی اہلیہ جو عرصے سے علیل ہیں اور کافی کمزور ہو چکی ہیں وہیں قریب چارپائی پر لحاف اوڑھے لیٹی ہوئی تھیں ۔ پاس ہی ایک مونڈھے پر شاطبی کی موافقات عینک کے ساتھ رکھی ہوئی تھی ۔ حدیث اور فقہ کی تمام امہات الکتب تقریباً انہوں نے دیکھ ڈالی ہیں ۔ انہوں نے مجامیع حدیث میں سے بخاری کو بطور نمونہ کے چن لیا ہے اور اس مطالعے میں اسی کو سامنے رکھیں گے ۔ بخاری کی دونوں شرحیں (ابن حجر اور عینی) بھی منگا کر رکھ لی ہیں ۔

میں فکر و نظر کے وہ تمام پرچے جمع کرکے لے گیا تھا جن میں مولانا فراہی سے متعلق کوئی چیز تھی ۔ فکر و نظر ان کے نام اعزازی جایا کرتا تھا مگر ادھر پتے کی تبدیلی کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تھا ۔ بہت خوش ہوئے ۔ فرمایا ان کو یکجا جلد بندی کراکے محفوظ کرلوں گا ورنہ ادھر ادھر ہو جائیں گے ۔ مجھ سے ہندوستان کے حالات تفصیل سے سنے ۔ مدرسۃ الاصلاح کے بارے میں بار بار پوچھتے رہے ۔ انہوں نے اس ضمن میں مولوی عاصم صاحب ساکن کوٹلہ کے ایک خط اور اپنے جواب کا ذکر بھی افسوس کے ساتھ کیا ۔ اسی سلسلے میں اعظم گڑھ کی ایک اور دینی درسگاہ "جامعہ الفلاح بلریا گنج " کا ذکر بھی بار بار آیا ۔ مدرسۃ الاصلاح کی عمارتوں اور قصبہ سرائے میر کے کوچہ و بازار کے بارے میں بھی کرید کرید کر سوالات کئے اور انتہائی دلچسپی اور انہماک سے میرے جوابات سنے ۔ جب میں نے بتایا کہ مدرسۃ الاصلاح میں طلبہ کے ڈائیننگ ہال میں ٹاٹ اور چٹائی کی جگہ میز کرسی آگئی ہے تو مولانا کو روحانی مسرت ہوئی۔جیسے انکے دل کی قلی کھل اٹھی ہو۔ مولانافراہی جس کمرے میں رہتے تھے اسکی بابت خاص طور سے پوچھا

جب میں ہے بتایا کہ وہ اسی حال میں ہے اور میں نے اس جگہ تک کا تعین کیا جہاں مولانا مدرسہ کے اساتذہ اور سینئر طلبہ کو درس دیتے تھے تو والہانہ بولے اس کی تصویر نہیں لی ۔ میں نے کہا خاص اس کمرے اور اس جگہ کی تصویر کا اہتمام میں نہیں کر سکا البتہ مدرسے کی عمارتوں کی تصویریں میں لایا ہوں ۔ مولانا فراہی کی دو نادر تصویروں کا ذکر کیا تو ان کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا جو میں ارادے کے باوجود نہ لے جا سکا تھا ۔

میں اس دوران ہندوستان کے دو سفر کر چکا ہوں جس کی مجموعی مدت ساڑھے چار مہینے ہوتی ہے اور اس مدت کا ایک ایک لمحہ میں نے مولانا فراہی سے متعلق مواد کی فراہمی میں صرف کیا ۔ اس کے بعد مولانا کو ان اسفار کی روداد اور اپنی ,, فتوحات ،، کا حال سنانے کا موقع اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔ اور نہ مجھے یہ اندازہ تھا کہ مولانا اصلاحی اس قدر شغف اور والہیت کا مظاہرہ کریں گے ۔ معمولی قسم کی دو چار باتیں ہی سنائی ہوں گی کہ مولانا بے تاب ہو کر کہنے لگے ,, بھئی کب تک آجائے گی یہ کتاب میں زندہ نہ رہا تو کیا فائدہ ،، ۔ ایک بار نہیں متعدد بار انہوں نے یہ فقرہ دہرایا کہ ,, بھئی آپ سب کام چھوڑ کر پہلے اسے مکمل کریں اور اگر نہ ہو تو ملازمت چھوڑ دیں ،، ۔ انہوں نے خوشی اور استعجاب کے ساتھ بار بار کہا کہ میں تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اب اتنا زمانہ گذر جانے کے بعد کوئی شخص یہ معلومات اکٹھی کر سکے گا ۔ مولانا داد و تحسین کی وارفتگی میں یہاں تک کہہ گئے کہ بھئی ان مستشرقین کے کام کرنے کے ڈھنگ بھی نرالے ہیں جب یہ کام کرنے پر آتے ہیں تو نہ جانے کہاں کہاں کی خبر لاتے ہیں۔ مولانا کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ مسلمانوں میں مستشرق کا لفظ اچھے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ اور میرا خود اس لفظ کے بارے میں یہی تصور ہے۔ اپنی نسبت مولانا کی زبان سے یہ لفظ سنکر مجھے بالکل اچھا نہیں لگا ۔ حاشا وکلا ۔ العیاذ باللہ ۔ کوئی اور ہوتا تو میں اس

پر احتجاج کرتا ۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ مولانا کا منشا ہرگز وہ نہیں رہا ہوگا۔ وہ جس جہت سے مجھے داد دینی چاہتے تھے اس کے لئے ان کی نظر میں بھرپور لفظ یہی ہو سکتا تھا ۔ ان کا مقصد میری کاوش اور جستجو کو خراج تحسین پیش کرنا تھا اور اس میں انہوں نے انتہائی فیاضی سے کام لیا ۔ اس لئے میں یہی کہوں گا کہ ؎

ستم احباب کے آئینۂ اخلاص تھے ہمدم
مقام شکر تھا ہم شکوۂ بیداد کیا کرتے

شعر میں ,,احباب،، کا لفظ ہے جبکہ مولانا میرے بزرگ ہیں ۔ شعر میں تصرف جائز ہوتا تو میں اس کو بدل دیتا ۔ مولانا کی ان باتوں سے میری حوصلہ افزائی ہوئی اور نئے سرے سے کام کرنے کا عزم پیدا ہوا ورنہ میں تو بساط لپیٹ چکا تھا اور بستہ باندھ کر رکھدیا تھا۔ میرا لاہور کا یہ سفر دو خاص مقاصد کیلئے تھا ۔ ایک تو مولانا فراہی سے متعلق کچھ امور اور مسائل پر گفتگو کرنی تھی دوسرے خود مولانا اصلاحی کے اپنے متعلق سوانحی قسم کی معلومات براہ راست ان سے معلوم کرکے حیطۂ تحریر میں لانی تھیں ۔ ان دونوں باتوں کا تفصیلی ذکر یہاں مناسب نہ ہو گا ۔ یہ باتیں اپنے مقام پر آئیں گی ۔ اس وقت ملاقات میں عام دلچسپی کی دو چار باتیں اور بیان کرکے اس سلسلے کو ختم کر دینا چاہوں گا ۔

ہندوستان کے سفر میں میں نے دائرۂ حمیدیہ میں محفوظ مولانا فراہی کے غیر مطبوعہ مسودات کو بھی تفصیل سے دیکھا اور ان سے ضروری مواد اخذ کیا ۔ مجھے ان مسودات میں مولانا فراہی کی دو کتابیں نہیں ملیں ۔ (۱) حکمۃ القرآن (۲) حجج القرآن ۔ مولانا بدر الدین اصلاحی نے جن کے پاس یہ مسودات رکھے ہوئے ہیں بتایا کہ ان کو خود ان کی تلاش ہے اور وہ ان کے لئے فکر مند ہیں ۔ ایک زمانے میں تمام مسودات کی اصل کاپیاں مولانا اصلاحی نے پاکستان

منگوائی تھیں اور بعد میں واپس بھجوادی تھیں ۔ مولانا اصلاحی کا خیال تھا کہ تمام مسودوں کی اصل انہوں نے واپس کر دی ہے اور اب ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے ۔ ان کو اس سلسلے میں ہندوستان سے جب بھی خط لکھا گیا انہوں نے یہی جواب دیا ۔ جبکہ ہندوستان میں یہ چیزیں نہیں پہنچیں ۔ میں نے اس کا ذمہ لیا کہ میں ان مسودات کو پاکستان جاکر لاہور میں تلاش کروں گا ۔ میں نے مولانا اصلاحی اور دیگر متعلقہ اصحاب سے اس سلسلے میں بات کی ۔ شکر ہے کہ دو میں سے ایک مسودہ حجج القرآن تو دریافت ہو گیا ۔ البتہ حکمة القرآن کا سراغ نہیں مل سکا ۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ بھی لاہور ھی میں کسی صاحب کے پاس ہے اور ایک نہ ایک دن اس کا بھی سراغ مل جائے گا۔ انشاء اللہ ! (۱)

میرے ایک سوال کے جواب میں اصلاحی صاحب نے فرمایا "جبرو اختیار اور ناسخ و منسوخ پر میں نے مولانا ھی کے افکار کی روشنی میں لکھا ہے ۔ میرا اس میں کوئی کارنامہ نہیں ہے بجز اس کے کہ میں نے مزید وضاحت کر دی ہے۔ تدبر قرآن میں دیکھئے ان مسائل پر بہت اچھی بحث ہے ۔ "

انہوں نے ان مسائل پر اتنی عمدہ بحث کی ہے کہ پڑھ کر ان کو خود آپ اپنے پررسک آگیا ۔ کہنے لگے " لکھنے کے بعد میں نے خود پڑھا تو بے ساختہ زبان سے کلمہ تحسین نکلا کہ واہ میں تو بہت اچھا لکھتا ہوں ۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے مولانا کے فکر سے ماخوذ ہے ۔ میں نے اپنے افکار تو مولانا کے کھاتے میں ڈالے ھیں مگر ان کے افکار کو میں نے اپنے کھاتے میں نہیں ڈالا ہے ۔ لوگوں کو اس کی شکایت بھی ہے ۔" اس کے بعد مولانا نے اپنا خاص جملہ دھرایا ۔ "اگر کوئی بات صحیح ہے تو ان کی ہے اور غلط ہے تو میری ہے" ۔ میں نے

---

۱ ۔ تازہ صورت حال یہ ہے کہ دوسرا مسودہ بھی مل گیا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ برادرم نعمان صاحب کی توجہ اور عنایت سے ان کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بھی تیار ہو کر آ گئی ھیں ۔

تفسیر کے باب میں تفردات فراهی کا ذکر کیا تو اصلاحی صاحب نے کہا «الف سے لیکر ی تک ان کی تفسیر تفردات کے زمرے میں آتی ہے۔ اصلاحی صاحب نے مولانا فراهی کا یہ قول دھرایا « اعقل الناس اعذر الناس» اور «فراهی کا اپنا کردار یہی تھا ۔ تفسیر میں بحیثیت مجموعی ان کا تعلق کسی سے بھی نہیں ہے بسم اللہ سے لے کر رحیم و رحمن کی تشریح تک میں وہ ساری دنیا سے منفرد ھیں ۔ الحمد للہ میں وہ ساری دنیا سے منفرد ھیں ۔ یہ سوال نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ کہاں کہاں منفرد ھیں ۔ وہ از اول تا آخر منفرد ھیں ۔ کہیں کہیں دوسروں کے ساتھ اتفاق بھی ہو گیا ہے مگر یہ اتفاق اتفاق سے ہو گیا ہے۔ انہوں نے کسی کی پیروی نہیں کی ہے۔»

میرے اس سوال کے جواب میں کہ فکر فراهی سے کیا مراد ہے مولانا نے فرمایا ۔ زندگی کے ہر پہلو میں فکر کے ہر زاویے میں ان کی اپیروچ مختلف ہے۔ رجوع الی القرآن مولانا فراهی کا مابہ الامتیاز ہے ۔ وہ تفسیر میں زبان نظام اور قرآنی سواھد و نظائر پر اعتماد کرتے ھیں ۔ ہر شعبے میں ان کے فکر کی بنیاد قرآن مجید ہے ۔ ادب ، بلاغت ، منطق ان سب میں ان کی بنیاد قرآن ہے ۔ منطق میں بھی وہ ارسطو کے پیرو نہیں بلکہ قرآن کے پیرو ھیں ۔ بلاغت میں بھی ان کا یہی حال ہے ۔ ان کی فقہ اور فلسفہ بھی مبنی ہے قرآن پر ۔ وہ کلامی نہج استدلال کو غلط سمجھتے ھیں ۔ اسی طرح منطق میں بھی وہ جرجانی وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ۔ ان سب کو وہ غلط سمجھتے ھیں ۔ وہ ایک نئے علم کلام کے موجد ھیں ۔»

علوم جدیدہ کے بارے میں مولانا فراهی کا موقف یا نقطہ نظر کیا تھا ، اس سوال کے جواب میں مولانا اصلاحی نے اسلامی علوم کے بارے میں مولانا فراهی کے نقطہ نظر پر سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ « قرآن ان

علوم سے تعرض نہیں کرتا اور نہ ان میں مداخلت کرتا ہے۔ البتہ وہ ان کے لئے فور کارنرز ضرور متعین کرتا ہے۔ وہ ان کو کچھ حدود و قیود کا پابند کرنا چاھتا ہے اور بس۔ باقی قرآن کو اس سے غرض نہیں کہ آپ ان علوم کو سیکھتے ھیں یا نہیں سیکھتے ۔"

میں نے اسی ضمن میں ایک سوال یہ کیا کہ آجکل یہ رجحان شدت سے فروغ پا رھا ہے کہ قرآن کو دنیا بھر کے علوم و فنون کا سرچشمہ ثابت کیا جائے۔ مولانا نے کہا " قرآن کتاب ھدایت ہے اور بس باقی باتیں لغو ھیں۔ ایک صاحب نے اسی طرح نماز میں ورزش کے بہترین اصول دریافت کرنے کی کوشش کی اور اس پر ایک کتاب لکھ ماری۔ آجکل لوگ قرآن میں نئے نئے نکتے تلاش کر رھے ھیں۔ قرآن کو کمپیوٹرائز کرنے کا تماشا بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ لوگ قرآن کے مقصد نزول کو پس پشت ڈال کر اسی طرح کی باتوں میں پڑ گئے ھیں۔ "اس پر میں نے فکر و نظر میں شائع شدہ مولانا ھاشمی کے ایک مضمون کی نشاندھی کی۔ وہ پرچہ اتفاق سے وجود تھا مولانا نے اسے کھول کر فوراً دیکھا۔

جدید سائنسی علوم کی تحصیل کے لئے قرآن مجید میں تحریک کا غلغلہ بھی آجکل زور شور سے بلند کیا جا رھا ہے۔ اس کی بات آئی تو مولانا نے اس باب میں میرے نقطہ نظر کی تائید کی اور فرمایا کہ " ان علوم و فنون کے لئے فطرت انسانی میں خود ضرورت سے زیادہ تحریک موجود ہے۔ اس کے بعد ضرورت یہ رہ جاتی ہے کہ اس تحریک کو اپنی حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے اور اس کو غلط سمت میں نہ جانے دیا جائے۔ قرآن چونکہ صحت و سلامتی کا علمبردار ہے اس لئے یہ فریضہ وہ انجام دیتا ہے۔ ایسے عقائد اصول اور نظریے تجویز کرتا ہے جن سے علوم و فنون کے منہ زور گھوڑے کے منہ میں لگام دی جا سکے۔ "

کسی فن یا کتاب کے مطالعہ میں مولانا فراھی کے ناقدانہ انداز نظر اور بے لاگ اظہار رائے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا اصلاحی نے کہا کہ بڑے سے بڑا فلسفی مفکر اور ماھر فن ان کی تنقید اور رائے زنی سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ مطالعے کے دوران وہ حاشیے میں اگر مسلمان ہے تو قد اخطأ یا قد اصاب رحمہ اللہ اور غیر مسلم ہے تو فقط اصاب یا اخطأ ضرور لکھتے ھیں ۔"

میں مسافر تھا اس لئے میں نے رخصت پر عمل کیا اور نماز میں قصر کیا۔ میں نماز سے جلدی فارغ ہوگیا ۔ مولانا نے پوچھا نماز پڑھ لی میں نے کہا جی ھاں میں نے قصر پڑھی ہے ۔ فرمایا جو بھی پڑھی پڑھ تو لی۔میں نے کہا بعض ائمہ قصر کو جائز ھی نہیں ضروری سمجھتے ھیں ۔ مولانا نے کہا، ھاں یہ احناف کا مسلک ہے، ۔ اس کے بعد فرمایا ، بہر حال رخصت رخصت ہے عزیمت عزیمت ہے ۔ میرے نزدیک یہ مسلک صحیح نہیں ہے خواہ کسی کا بھی ہو۔ تفسیر لکھنے کے دوران میں میں نے اس سلسلے میں سینکڑوں صفحات کا مطالعہ کیا ۔ مختلف مکاتب فکر کا مطالعہ کیا ۔ ان کے دلائل کو سمجھنے کی کوشش کی مگر آخر کار جس نتیجے پر پہنچا وہ یہی ہے اور میں نے تفسیر میں اسکا ذکر کردیا ہے کہ بہر حال رخصت رخصت ہے اور عزیمت عزیمت ہے ۔ حنفیہ رخصت کو ضروری سمجھتے ھیں مگر میرے نزدیک یہ مسلک صحیح نہیں ہے ۔ "

ضمیمہ

کسے معلوم تھا کہ فروری کی سرگزشت ملاقات میں اپریل کے اس سانحے کا ذکر بھی شامل کرنا پڑے گا کہ بیمار نے قید حیات سے چھوٹ کر شفا پائی ۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

انا للہ وانا الیہ راجعون!

۱۵ اپریل کو تعزیت اور مزاج پرسی کے لئے میں نے مولانا اصلاحی کی جائے رھائش پر حاضری دی ۔ تجہیز و تکفین میں شریک ہونے والے بعض احباب سے یہ سن کر تشویش سی تھی کہ مولانا پر اس صدمے کا خاصا اثر ہے ۔ کیوں نہ ھو واقعہ سخت ہے اور بندہ بشر ہے ۔ لیکن دو دن بعد یہ دیکھ کر اطمینان سا ہوا کہ مولانا نے طبیعت پر قابو پا لیا ہے ۔ میں ڈیڑھ گھنٹے تک مولانا کے پاس بیٹھا رہا اس دوران میں نے بہت کم لب کشائی کی ۔ یوں بھی ان کی گفتگو کے لذت آشنا ہمیشہ یہی تمنا کرتے ھیں کہ

ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ڈیڑھ گھنٹے مسلسل مولانا کی باتیں سنتا رہا ۔ اب تک ان کی گفتگوؤں میں ہم انکا دماغ بڑھا کرتے تھے آج دماغ کیساتھ دل میں بھی جھانکنے کا موقع ملا۔ قاہرہ کے ہوائی حادثے میں جواں سال بیٹے کی المناک موت پر مولانا نے ابو صالح اصلاحی مرحوم کی بیوہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ اسکی قبر تو میرے دل میں بن گئی ہے لیکن ایک دوست نے جب یہ بتایا کہ ابوصالح اصلاحی مرحوم کی حادثاتی موت پر مولانا اتنے دل گرفتہ نظر نہ آئے تھے جتنے رفیقۂ حیات کی اس طبعی موت پر صدمے سے نڈھال نظر آتے تھے تو میں فکر مند ہو گیا کہ مبادا یہ اثر دیر پا ہو ۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے زندگی میں پہلی بار مولانا کو آبدیدہ اور گلو گیر دیکھا ۔ یوں تو رفاقت کا یہ رشتہ ھی کچھ ایسا ہے مگر مولانا کی رفیقہ حیات جن صفات کی مالک تھیں اور خاص کر مولانا کے لئے ان کی ذات جو مفہوم رکھتی تھی اس کا یہ فطری تقاضا تھا کہ زہر غم رگ و پے میں سرایت کر جائے ۔

وہ ایک دولتمند باپ کی بیٹی تھیں ۔ راھوں ، پٹھانکوٹ مشرقی پنجاب میں جن کی بہت بڑی زمینداری تھی ۔ ان کے والد کا نام چودھری عبد الرحمن تھا ۔

مرحومہ کا نام انوار اختر تھا ۔ راجپوت خاندان کی وہ تمام اچھی روایات انہیں ورثے میں ملی تھیں جو نسلی تفاخر کی پیداوار نہیں بلکہ سیرت و کردار کی پختگی کا نتیجہ تھیں ۔ داد و دھش کے ساتھ راجپوتی آن بان اور شان تمکنت مرحومہ کی طبیعت کے جوھر اصلی تھے ۔ تقسیم کے بعد خاندان نے ھجرت کرکے مغربی پنجاب میں سکونت اختیار کی ۔ مرحومہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں ۔ اس لئے شروع ھی سے انہیں اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کو بروئے کار لانے کا موقع ملا ۔ اپنے دائرے میں وہ نہ صرف ایک موثر اور فعال شخصیت کی مالک تھیں بلکہ اپنی اعلی انتظامی صلاحیتوں کی بدولت جائداد کی دیکھ بھال اور خانگی معاملات کی انجام دھی میں بھی خود مکتفی تھیں ۔ انہوں نے مولانا کو ھمیشہ علمی کاموں کے لئے نہ صرف فارغ البال رکھا بلکہ کوشش و اھتمام کرکے سازگار ماحول مہیا کیا ۔ وہ صحیح معنوں میں اسلام کی " المرأة الصالحه" تھیں۔انہوں نے مولانا اور خاندان کے لئے جس ایثار و قربانی کا عملی ثبوت دیا وہ فی زماننا بہت شاذ ہے ۔ مولانا کی یہ دوسری شادی تھی ۔ پہلی شادی اعظم گڑھ یو پی میں برادری کے لوگوں میں ہوئی تھی ۔ پہلی بیوی غالباً پھریہا مولانا فراھی کے گاؤں کی تھیں جن کے بطن سے تین لڑکے اور ایک لڑکی بڑے ھو کر آل و اولاد والے ھوئے ۔ پہلی بیوی بچوں کو کمسنی میں چھوڑ کر راھی ملک عدم ھوئیں ۔ تقسیم سے کچھ عرصہ قبل مولانا اعظم گڑھ سے پٹھان کوٹ آ گئے تو یہیں ۱۹۴۵ء کے آگے پیچھے ان کی دوسری شادی ھوئی ۔ اس وقت مولانا کی عمر تقریباً ۴۵ برس تھی جبکہ محترمہ کی عمر ۳۵ برس کے لگ بھگ ھوگی ۔ ۳۵ برس کی رفاقت کے بعد یہ داغ مفارقت مولانا کے لئے بے شک ایک صدمۂ عظیم ہے ۔ ذیابیطس ان کا خاندانی مرض تھا جس کے باعث وہ پہلے ھی بہت نحیف و نزار ھو چکی تھیں کہ پندرہ دن پہلے ان پر اچانک فالج کا حملہ ھوا جس میں جسم کا دایاں حصہ متاثر ھوا ۔ علاج معالجے میں حتی

الوسع کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی ۔ پانچ دن ایک نیورو کلینک میں بھی داخل رہیں جس کا ہزار روپیہ یومیہ خرچ ادا کیا گیا ۔

اپریل کی ۱۱ تاریخ تھی دن گزار کر رات کے ساڑھے گیارہ بجے داعی اجل کو لبیک کہا ۔ ۱۲ تاریخ کو اتوار کے دن دوپہر سے پہلے وہیں ہر بنس پورہ ملٹری کیمپ کے مقامی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا ۔ قریبی عزیزوں کی رائے تھی کہ لاہور شہر کے کسی بڑے قبرستان میں دفن کیا جائے مگر مولانا نے جائے وفات کے قریب غریبوں کے قبرستان کو ترجیح دی ۔ ظاہر ہے اس فیصلے کے پیچھے مولانا کی افتاد طبع کے علاوہ ان کے اس فکر کو بھی دخل تھا جو ظلال قرآن میں پروان چڑھا ہے ۔ اطلاع عام کی بجائے صرف خاص عزیزوں کو خبر دی گئی ۔ پھر بھی راہ دسوار اور منزل دور ہونے کے باوجود خاصی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے ۔ لاہور میں موجود اعزا اور احباب کے علاوہ جماعت اسلامی ، انجمن خدام القرآن اور حلقہ تدبر قرآن سے وابستہ نیازمند کثیر تعداد میں سریک جنازہ ہوئے ۔ کیمپ کے فوجیوں نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی ۔ یوں دعائے مغفرت کے لئے اٹھنے والے ہاتھ کیفیت کے علاوہ کمیت میں بھی کم نہ تھے ۔

راقم کو اس وقت اطلاع ہوئی جب ۱۳ اپریل کی رات اچانک لاہور پہنچا ۔ خبر سن کر زندگی کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا ۔ فروری کی ملاقات میں میں ان کے پاس دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا تھا ۔ انہوں نے مجھے پہچانا اور مل کر خوش ہوئیں ۔ مجھے وہ زمانہ یاد آیا جب ہجرت کے بعد لاہور میرا مستقر ٹھہرا ۔ میں نے اچھرہ میں اقامت اختیار کی ۔ مولانا رحمان پورہ میں ۵۰ روپے ماہوار کرائے کے مکان میں اہلیہ اور بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے ۔ میں کچھ دنوں کے لئے اپنے ذریعہ معاش سے محروم ہو گیا ۔ مولانا نے مجھے اپنے یہاں مہمان رکھنے کی پیش کش کی ۔ ان دنوں مولانا کے معاشی حالات بہت اچھے نہ تھے ۔ پھر بھی انہوں نے

اصرار کیا کہ میں حاضر میں حجت نہ کروں ۔ یہ معاملہ مولانا سے تھا مگر عملاً اس کا تمام بار خاتون خانہ کو اٹھانا پڑا کہ وھی ربۃ البیت تھیں ۔ جب دور دستوں کے لئے ان کا ظرف اتنا وسیع تھا تو اپنوں کے لئے انہوں نے کیا کچھ نہ کیا ھوگا ۔ پہلی بیوی سے مولانا کے صغیر السن بچوں کی پرورش پرداخت تعلیم و تربیت اور شادی بیاہ کے لئے انہوں نے جو کچھ کیا ، خود مولانا کی مدت العمر جس طرح خدمت کی وہ ایک لمبی داستان ہے۔

مولانا کے ساتھ ان کا رشتہ ازدواج میں منسلک ھونا قران السعدین ثابت ھوا جس کے نتیجے میں دنیا کو ,, تدبر قرآن ،، جیسا گنج گرانمایہ ملا ۔ مولانا کا علم اور فکر ایک بند خزانہ تھا جسے مرحومہ نے اپنے شعور ، قدر شناسی اور حسن خدمت سے کھول کر عام کر دیا ۔ دنیا مولانا اصلاحی کے فیضان علم سے محروم رھتی اگر انھیں انوار اختر جیسی باشعور علم دوست اور جان نثار شریک زندگی نہ ملتیں ۔ وہ صحیح معنوں میں شریک زندگی تھیں اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ مولانا کے صدقہ جاریہ میں ان کا بھی حصہ ہے تو غلط نہ ھوگا ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ۔ مولانا اصلاحی اور خاندان کے دوسرے افراد کو ان کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے !

* * * * * *

انقـــــلاب مکـــــہ

محمد اختر مسلم

حضور ختمی مرتبت ﷺ کی بعثت سے قبل کا دور قرون مظلمہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سرمایہ داری کا دور دورہ تھا۔ ملوکیت نے انسان کو آزادی سے محروم کر دیا تھا۔ احبار و رُھبان کی بیسوائیت نے انسان کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ انسان حسن عمل سے محروم تھا۔ تہذیب و تمدن اور اخلاق ایک قصۂ پارینہ بن چکے تھے۔

احبارورُھبان کی رہبانیت، قیصر و کسریٰ کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تفسیم انسانیت کے انسانیت کش نسلی و جغرافیائی معیارات یہ تھے وہ اطواق و سلاسل جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی۔ حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے چھٹے خطبہ "الاجتہاد فی الاسلام" میں تہذیب و تمدن کے ایک مورخ DENISON کی کتاب EMOTION AS THE BASIS OF CIVILISATION " طویل اقتباس نقل کیا ہے۔
جس سے حضور ختمی مرتبت ﷺ کی بعثت سے قبل کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصر مشید، جس کی تعمیر پر چار ہزار سال صرف ہوئے تھے منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا اور نوع انسان پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی تھی جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا

پیاسا تھا اور آئین و ضوابط کو کوئی جانتا تک نہیں تھا ۔ قدیم قبائلی آئین و مسالک اپنی قوت و احترام کھو چکے تھے اس لئے اب ملوکیت کے پرانے طریق و انداز کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا ۔ عیسائیت نے جن قواعد و ضوابط کو رائج کیا تھا وہ نظم و ضبط اور وحدت و یکجہتی کے بجائے تشتت و افتراق اور بربادی و ھلاکت کا موجب بن رہے تھے ۔ غرضیکہ ہر طرف فساد ھی فساد نظر آتا تھا ۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز و شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ ، سائنس اور لیٹریچر کے سنہری پھلوں سے لدی ہوئی تھیں ، اب لڑکھڑا رہا تھا ۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی اور وہ اندر تک بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا ۔ جنگ و جدال کے طوفان نے اس کے ٹکڑے کر ڈالے تھے جو صرف پرانی رسموں کے بندھن سے یکجا کھڑے تھے اور جن کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ اب گرے کہ تب گرے ۔

کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوع انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دے ۔ اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لے ؟ اس لئے کہ پرانی رسومات و آئین سب مردہ ہو چکے تھے ۔ اور ان ھی جیسے قوانین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا ۔ ۔ ۔ "

اس سوال کا جواب وہ خود ھی ان الفاظ میں دیتا ہے ۔

" یہ امر موجب حیرت و استعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر عرب کی سرزمین سے پیدا ہوا اور اس وقت پیدا ہوا جب اس

کی اشد ضرورت تھی،، ۔

(ترجمہ منقول از ۔۔ سلیم کے نام خطوط ۔۔)

آخر ان تاریکیوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے اس ذات قدسی صفات کی بعثت کی ساعت سعید آئی جسے اللہ رب العزت نے سراج منیر (جگمگاتا چراغ) فرمایا ۔ جس کی آمد کا مقصد قرآن نے یوں بیان فرمایا ۔

و یضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم

(اور ان سے ان کا بوجھ اتارتا ہے اور وہ طوق بھی جو ان پر تھے)

حضور اکرم ﷺ کی بعثت در حقیقت ایک انقلاب کی آمد تھی ۔ ایک عالمگیر انقلاب جس کے ذریعہ دنیا اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھی و اشرقت الارض بنور ربھا ۔ یہ اسی انقلاب کا نتیجہ تھا کہ : ۔

وہ قوم ۔ ۔ ۔ جو بکریوں کی نگہبانی کرنے اور انہیں درندوں سے بچانے میں مصروف رہتی تھی وہ حضور اکرم ﷺ کے بابرکت وجود کی بدولت انسانیت کی نگہبان مظلوم انسانوں کو ظالموں سے نجات دلانے والی قوم بن گئی ۔

وہ قوم ۔ ۔ ۔ جو اپنے قبیلے اور نسل کو دوسرے قبائل اور نسلوں پر فوقیت دیتی تھی رنگ ، نسل اور زبان کے اختلافات کے غیر فطری معیاروں سے بلند ہو کر اسلام کے جھنڈے تلے وحدت انسانی کو انسانیت کی معراج سمجھنے لگی ۔

وہ قوم ۔ ۔ ۔ جو معصوم لڑکیوں کی پیدائش کو نحوست تصور کرتے ہوئے انہیں زندہ دفن کر دیتی تھی وہ عورت کو اس کا فطری مقام عطا کرکے اور اس کی عفت و عصمت کی محافظ بن گئی ۔

وہ قوم ۔ ۔ ۔ جو اپنی بھوک مٹانے کی خاطر دوسروں کو لوٹ لیا کرتی تھی حضور ختمی مرتبت ﷺ کی تعلیم کی بدولت دوسروں کی بنیادی

ضروریات پوری کرنے کے لئے خود بھوکی رهنے لگی ۔

وہ قوم ۔ ۔ ۔جو همیشہ منتشر رهی ، جو حکومت کے اجتماعی تصور سے یکسر نا آشنا تھی، جو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول پر کار بند تھی ، حضور اکرم ﷺ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے دنیا کی پہلی آئین پسند ، قانون کی پابند حقیقی جمہوریت کی دلدادہ قوم بن گئی ۔

وہ قوم ۔ ۔ ۔جو عملی زندگی میں عدل و انصاف سے نا آشنا تھی حضور اکرم ﷺ کی بدولت عدل و انصاف کا ایک مثالی نمونہ بن گئی ۔ جس نے دسمن سے بھی عدل کرکے انصاف کی تاریخ میں ایک زرین باب کا اضافہ کیا ۔

وہ قوم ۔ ۔ ۔جو اپنے بڑے آدمیوں کے بت بنا کر پوجا کرتی تھی ، شخصیت پرستی، بت پرستی اور شرک کا شکار تھی ، ختمی مرتبت ﷺ کی بدولت خدا کی وحدانیت پر ایمان لاکر دنیا سے بت پرستی ، شخصیت پرستی اور شرک کو ملیا میٹ کر دیا ۔

وہ قوم ۔ ۔ ۔جس کے نزدیک عزت کا معیار رنگ ، نسل ، حسب و نسب اور مال و دولت تھا حضور اکرم کی بدولت تقوی ، حسن عمل اور مکارم اخلاق کو عزت کا معیار سمجھنے لگی ۔

وہ قوم ۔ ۔ ۔جو سراب و زنا ، سود اور جوئے کی دلدادہ تھی ، حضور اکرم ﷺ کی بدولت اسی قوم نے شراب کے خم سڑکوں پر اونڈیل دیئے ، نکاح کو سعار بنایا ، سود اور جوئے میں دوسروں کا مال لوٹ کر کھانے کی بجائے زکوۃ اور صدقات کے ذریعہ دوسروں کی کفالت کرنے والی قوم بن گئی ۔

انقلاب مکہ کے نتائج کوئی کہاں تک گنائے ۔ اس انقلاب کے بانی

آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی دعوت کی بنیاد تھی لا اله الا الله محمد رسول الله ۔ یعنی سوائے الله کے کوئی معبود نہیں اور محمد الله کے رسول ہیں ۔ اور اب انہی کی رہبری ہمارے لئے کافی ہے ۔ یہ اعلان توحید محض علم کلام یا فلسفہ ما بعد الطبیعیات کا کوئی مسئلہ نہ تھا ۔ حکیم الامت علامہ اقبال کے الفاظ میں یہ زندہ قوت تھی ۔ ایک خدا اسکے سب بندے اسی کے قانون کے پابند ۔ اسکے قانون کی نظر میں سب یکساں ۔ سب کو اپنی امنگوں اور آرزؤوں کی تکمیل کے مواقع میسر ۔ سب کو کسب معاش کی سہولتیں حاصل ۔ کسب معاش کی صلاحیتوں میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی معاش سے محروم رہے اور کوئی ضرورت سے زیادہ حاصل کرکے لہو و لعب کی نذر کر دے ۔ در حقیقت اسلامی معاسرہ میں کسب حلال ، اکل حلال اور بذل حلال کے اصول بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ۔

ایک خدا کے تصور نے ذات پات ، اونچ نیچ اور مختلف طبقات کے وجود ہی کو ختم کر دیا ۔ سب ملت واحد بن گئے ۔

حضور اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق ملت ایک جسم ہے ۔ جس کا کوئی حصہ تکلیف میں ہوگا تو سارا جسم اس تکلیف کو محسوس کریگا ۔ جسم کے ہر عضو کو اس کی ضرورت کے مطابق خون کی ضرورت ہے اگر اس عضو کو خون کی مناسب مقدار نہ ملے تو وہ عضو شل ہو جائیگا ۔ اسی طرح قوم کے معاشی وجود میں دولت کو گردش میں رہنا چاھئیے ورنہ قوم کا ایک حصہ شل ہو جائیگا اور باقی حصہ بھی اس کی وجہ سے ناکارہ رہیگا ۔

ایک خدا کے تصور نے مذھبی اجارہ داریوں کی گنجائش ھی ختم کر دی ہے ۔ قانون خدا کا ، اس کا شارح خدا کا رسول ۔ ۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح پوپ یا پادری کا قول یا اس کی تشریحات اور توجیہات

قانون نہیں بن سکتیں ۔ بلکہ ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم سیکھنا فرض قرار دیکر احبار و رہبان کے وجود کو ختم کر دیا گیا ۔ علم عام کیا ہوا کہ ہر شخص اپنے حقوق اور ذمہ داریوں سے واقف ہو گیا ۔ در حقیقت یہی انسانیت کا شرف اور جمہوریت کی بنیاد ہے۔ الغرض کیا معاش اور کیا معاد ہر شعبہ زندگی میں اجارہ داریاں ختم ہو گئیں ۔ چشم دنیا نے اس انقلاب عظیم کے ذریعہ جو کامیابیاں دیکھیں وہ درحقیقت حضور کی دعوت توحید اور ایمان بالآخرت کا نتیجہ تھیں ۔

اس انقلاب عظیم کے متعلق مشہور مفکر کار لائل اپنی مشہور زمانہ تصنیف HEROES AND HERO WORSHIP میں لکھتا ہے کہ ، "عربوں کے لئے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انہیں تاریکیوں سے نور کی طرف لے آئی تھی ۔ عرب اس کے ذریعہ پہلی دفعہ زندہ ہوا ۔ ایک ایسی قوم جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی اس کی طرف ایک رسول (ﷺ) آیا جو اپنے ساتھ ایک پیغام لایا (القرآن الحکیم) جس پر وہ قوم ایمان لے آئی ۔ وہ دیکھو ۔ وہی گمنام چرواہے دنیا کی ممتاز قوم بن گئے ۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم الشان ملت میں تبدیل ہو گئی ۔ "

ایک صدی کے اندر اندر عرب دنیا کے بڑے حصے پر چھا گئے ۔ اس کے بعد سینکڑوں برس ہو چلے ہیں کہ یہ اسی شان و شوکت اور درخشندگی و تابندگی سے کرہ ارض کے ایک عظیم حصہ پر مسلط ہیں ۔ یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا ۔ ایمان بہت بڑی چیز ہے۔ ایمان سے زندگی ملتی ہے۔ جو نہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا اس قوم کی تاریخ میں انقلاب آ گیا ۔

آئیے ہم اقرار کریں کہ ،

ہم نے توحید اور ایمان بالآخرت کے عقیدہ کے باوجود اسی عملی زندگیوں میں مفادات اور اپنی خواهسات کے بتوں کی پوجا کی جو روس اپنائی ہوئی ہے اسے ترک کرکے حضـــور اکـــرم ﷺ کے طریقے کے مطابق خدا کی وحدانیت اور ایمان بالآخرت کو اسی عملی زندگی کی اساس بنائیں گے ـ دولت کمائینگے لیکن اس کا ڈھیر لگانے کے بجائے اسے خدا کے حکم کے مطابق دوسرے انسانوں کی ضروریات پوری کرنے پر خرچ کریں گے ـ اس لئے کـہ یہی اسوۂ رسول ہے ـ

محمد مارمیڈ یوک پکتھال

قرآن مجید کا پہلا نو مسلم انگریز مترجم

اختـــــر راهـــــی

قــرآن مجیــد کا پہلا انگـریزی تـرجمـہ ۱٦٣٨ء تا ١٦٨٨ء کے درمیانی عرصے میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ، لاطینی ترجمے سے کیا گیا تھا۔ دوسرا کامل ترجمہ جارج سیل (GEORGE SALE) کے قلم سے ۱۷۳۴ء میں اشاعت پذیر ہوا اور تقریباً ڈیڑھ صدی تک یہی ترجمہ انگریزوں کے لئے تعلیمات قرآن سے آگاہی کا ذریعہ رہا۔ جارج سیل نے عیسائی نقطہ نظر سے حواشی لکھے اور بیضاوی و کشاف سے بھرپور استفادہ کیا۔ ڈیڑھ صدی کے طویل عرصے میں انگریزی زبان کے اسالیب بیان میں اس قدر تبدیلیاں واقع ہوئیں کہ ترجمہ فرسـودہ ہو گیـا۔ ۱۸٦۱ء میـں کیمبرج یونیورسٹـی کے استـاد جے ایم۔راڈویل(J. M. RODWELL) نے سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کیا۔ زبان و بیان میں اصلاح کی اور ایک دوسری جدّت یہ برتی کہ قرآن مجید کی سـورتـوں کـو نـزولی ترتیب سے مرتّب کیا یعنی آغاز سورہ علق اور اختتام سورہ مائدہ پر کیا۔ اس کے بعد ۱۸۸۰ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے جرمـن پروفیسر (MAX MULLER) نے مشرق کی تمام کتب مقدّسہ کو انگریزی قالب میں ڈھالنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کے ترجمے کے لئے قرعہ فال ای.ایچ.پامر (E. H. PALMER) کے نام پڑا جو کیمبرج یونیورسٹی کے عربی

زبان و ادبیات کے استاد تھے۔ پامر کا ترجمہ ۱۹۰۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اُسی زمانے میں پادری وھیری (WHERRY) نے چار جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔

یہ تمام تراجم غیرمسلم فاضلوں نے کئے تھے جن میں اکثر مقامات پر معنوی تحریف اور قطع و برید کی گئی تھی.ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی مسلمان عالم یہ خدمت انجام دیتا۔ اسکا شدید احساس محکوم ھندوستان کے مسلمانوں میں پایا جاتا تھا۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے انفرادی طور پر کئی ترجمے کئے۔ بعض شائع نہ ھوسکے،بعض نامکمل رہے اور چند ایک زیور طباعت سے آراستہ ھو کر اھل نظر کے ھاتھوں میں پہنچے(۱) ۔ تاھم ان ترجموں میں وہ زور بیان ،سلاست اور روانی پیدا ھونا ممکن نہ تھی جو اھل زبان کی خصوصیت ہے۔ آخر اللہ تعالی نے یہ سعادت ایک نو مسلم انگریز، مارمیڈ یوک پکتھال کو بخشی ۔ جس نے پہلے اسلام قبول کیا اور پھر چند سالوں کی جگر کاوی ، غور و فکر اور تدبّر و تفکّر کے بعد قرآن مجید کا ترجمہ نہایت خوبصورت زبان میں کیا۔ آج یہ ترجمہ ، قرآن مجید کے مقبول ترین تراجم میں سے ایک ہے۔ صرف امریکہ میں لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکا ہے۔

محمد مارمیڈ یوک پکتھال نے ترجمہ قرآن کے دیباچے میں لکھا ہے:(۲)

"اس ترجمہ کا مقصد انگریزی خواں طبقے کے سامنے یہ بات پیش کرنا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان قرآن کے الفاظ سے کیا مفہوم لیتے ھیں اور قرآن کی ماھیت کو موزوں الفاظ میں سمجھانا اور انگریزی بولنے والے مسلمانوں کی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ معقولیت کے ساتھ یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ کسی الہامی کتاب کو ایک ایسا شخص عمدگی سے پیش نہیں کر سکتا جو اس کے الہامات اور پیغام پر ایمان نہ رکھتا ھو۔ یہ

پہلا انگریزی ترجمہ ہے جو ایک ایسے انگریز نے کیا جو
مسلمان ہے۔ بعض تراجم میں ایسی تعبیریں کی گئی ھیں جو
مسلمانوں کے لئے دلآزار ھیں اور تقریباً سب میں زبان کا ایسا
انداز بیان اختیار کیا گیا ہے جسے مسلمان غیر موزوں سمجھتے
ھیں۔ قرآن کا ترجمہ ناممکن ہے[۳۲]۔ یہ قدیم شیوخ کا اور میرا
عقیدہ ہے۔ میں نے اس کتاب کو علمی انداز میں پیش کیا ہے اور
اس کے لئے کوشش کی گئی ہے کہ موزوں زبان استعمال کی
جائے۔ لیکن یہ ترجمہ قرآن مجید نہیں ہو سکتا کیوں کہ وہ تو
بے مثل و بے عدیل ہے۔ اس میں اتنی ہم آھنگی ہے کہ لوگ اسے
سنتے ھی رونے لگتے ھیں اور وجد میں آجاتے ھیں۔ یہ تو قرآن
کے مفہوم کو انگریزی زبان میں پیش کرنے کی محض ایک
کوشش ہے اور اس کے سِحر کی قدرے عکاسّی۔ یہ عربی قرآن
کی جگہ نہیں لے سکتا۔ نہ میرا یہ مقصد ہے۔

محمد مارمیڈ یوک پکتھال کا ترجمہ قرآن زبان و بیان کے لحاظ سے بے
مثال ہے۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی مرحوم جو خود انگریزی زبان کے مترجم
قرآن ھیں۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ :

« پکتھال اپنی زبان کا ادیب اور اھل قلم تھا . . . . . . اس کی
زبان کی خوبی و شستگی کا کیا کہنا ۔ اصل قرآن کی جاذبیت
زبان و بیان ایک حد تک ترجمہ میں منتقل ہو آئی ہے[۳۴]»

نو مسلم فاضلہ مریم جمیلہ اس ترجمے کے بارے میں لکھتی ھیں کہ:

«مجھے اس کے مقابلے کا کوئی انگریزی ترجمہ نہیں مل سکا ۔
کسی ترجمے میں وہ فصاحت و بلاغت اور انداز بیان نہیں جو
اس میں موجود ہے۔ بہت سے دوسرے تراجم میں اللہ کے لئے «گاڈ»

کا لفظ استعمال کرنے کی غلطی کی گئی ہے۔ لیکن پکتھال نے ہر جگہ اللہ ہی استعمال کیا ہے۔ اس سے اسلام کے پیغام میں مغرب کے قاری کے لئے بڑا تأثر پیدا ہوتا ہے(۵)۔"

قرآن مجید کا یہ جلیل القدر مترجم ۷ اپریل ۱۸۷۵ء یکم ربیع الاول ۱۲۹۲ھ کی صبح کو انگلستان میں سفک (SUFFALK) کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کے والد چارلس پکتھال مقامی گرجا گھر کے پادری تھے۔ چارلس کی پہلی بیوی سے دس بچے ہیں ۔ اس بیوی کے انتقال کے بعد چارلس نے دوسری شادی امیر البحر ڈی۔ایچ۔اوبرائین کی بیٹی سے کی۔ اس بیوی سے چارلس کے ہاں مارمیڈ یوک پکتھال پیدا ہوا۔

مارمیڈ یوک پکتھال نے ہیرو (HARROW) کے پبلک اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ زمانۂ طالب علمی میں سرونسٹن چرچل پکتھال کے یاران مکتب میں سے تھے۔ اسکول سے فارغ ہو کر پکتھال نے ترکی یا ایران کے انگریزی سفارت خانے میں ملازمت حاصل کرنے کی خاطر مقابلے کا امتحان دیا مگر ناکام رہا۔ اس ناکامی کے باوجود پکتھال قاہرہ چلا گیا۔ اُس وقت پکتھال کی عمر انیس سال کے لگ بھگ تھی۔ یہ نقل مکانی اُس کی زندگی کے عظیم انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

مارمیڈ یوک پکتھال کئی سال تک مصر، شام، فلسطین اور عراق میں گھومتا رہا آخر میں ترکی چلا گیا۔ اس سیاحت میں مارمیڈ یوک پکتھال نے عربی اور ترکی زبانوں میں اتنی مہارت حاصل کر لی تھی کہ ان زبانوں میں اپنا ما فی الضمیراحسن طریقے سے ادا کر لیتا تھا اور ان زبانوں کے لٹریچر سے استفادہ کر سکتا تھا۔ عربی زبان و تہذیب سے متاثر ہو کر مارمیڈ یوک پکتھال نے اپنی وضع

عربوں جیسی بنا لی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت عثمانیہ میں اندرونی خلفشار پیدا ہو چکا تھا اور یورپی طاقتیں خلافت کی قوّت توڑنا چاہتی تھیں۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں خلافت عثمانیہ کو شکست ہو چکی تھی۔ مار میڈ یوک پکتھال کا خیال تھا کہ یورپی طاقتیں مذہبی تعصّب کے سبب خلافت عثمانیہ کے ٹکڑے کرنا چاہتی ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں مار میڈ یوک پکتھال انگلستان گیا اور اینگلو عثمانیہ سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ترکوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہو رہی تھیں ان کا تدارک ہو۔ سوسائٹی کی کوششیں بار آور ثابت نہ ہوئیں حتی کہ ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی اور خلافت عثمانیہ کو اتحادی طاقتوں کے خلاف لڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔

مار میڈ یوک پکتھال عرب ملکوں کے زمانۂ قیام میں اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہوا۔ وہ جامع اموی دمشق، کے شیخ العلماء سے رابطہ رکھتا تھا۔ اُسی زمانے میں جب مار میڈ یوک پکتھال نے شیخ العلماء کو اپنی ایمانی کیفیّت سے آگاہ کیا تو شیخ نے مار میڈ یوک پکتھال کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ عرصہ مطالعہ اور غور و فکر جاری رکھے اور قبول اسلام کا اعلان انگلستان میں کرے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۱۴ء میں مار میڈ یوک پکتھال نے لندن میں اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔

۱۹۱۷ء میں مار میڈ یوک پکتھال کی ملاقات لندن میں خواجہ کمال الدین سے ہوئی جو شاہجہان مسجد ووکنگ میں "اسلامی مشن" کے انچارج تھے۔ خواجہ صاحب ۱۹۱۹ء میں ہندوستان چلے آئے تو اُن کی غیر حاضری میں شاہجہان مسجد میں خطابت کی ذمہ داریاں مار میڈ یوک پکتھال نے ادا کیں اور "اسلامی مشن" کے ترجمان مجلّہ "اسلامک ریویو" کے مدیر رہے۔

۱۹۲۰ء میں مار میڈ یوک پکتھال کو برصغیر کے معروف اخبار «بمبئی کرانیکل» کی ادارت پیش کی گئی. اس پیشکش کو قبول کرتے ہوئے پکتھال بمبئی آ گئے۔ خیال تھا کہ وہ تین سال یہاں رہیں گے مگر وہ ایک سال کے بعد وطن واپس چلے گئے۔ تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کے پُر آشوب دور میں مار میڈ یوک پکتھال نے قوم پرست طبقے کی خوب نمائندگی کی. پُر زور اداریئے لکھے۔ زورِ قلم سے اپنا مؤقف اعلی طبقے میں منوایا اور بہت سے دوسرے راھنماؤں کی طرح مارمیڈ یوک پکتھال بھی اُسی زمانے میں کھدر پوش بنے۔

۱۹۲۴ء میں مارمیڈ یوک پکتھال دوبارہ برصغیر آئے اور ریاست حیدر آباد دکن کی ملازمت اختیار کی. وہ چادر گھاٹ ھائی اسکول کے برنسپل تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان مرحوم اُس زمانے میں اُن سے ملے تھے۔ وہ اپنی یادیں تازہ کرتے ہوئے لکھتے ھیں:

«وہ انگریزی کے اعلی درجے کے ادیب اور عربی زبان سے بخوبی واقف تھے اور عربوں میں عرصے تک رہ چکے تھے۔ پکتھال بڑے بکّے اور راستباز مسلمان تھے۔ اسلام کے متعلق جب بھی اُن سے گفتگو ہوتی تو انہوں نے ھمیشہ اس کی اخلاقی برتری کو نمایاں کیا۔ ــــــــــ اسلامی تعلیم میں جس چیز نے انہیں سب سے زیادہ گرویدہ کیا وہ اس کا عملی اور اخلاقی پہلو ہے۔ ایک دفعہ کہتے تھے کہ انسانی مساوات اور عالمگیر اخوّت کے اصول اسی کے مظاھر ھیں جو آج بھی اتنے ھی قابل قدر ھیں جتنے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھے۔ ان کی بدولت اسلام کا پیغام سدا بہار ہے۔ ابھی اس کی اثر آفرینی ختم نہیں ہوئی ہے(۶)»

چادر گھاٹ ھائی سکول کے فرائض منصبی کے ساتھ اُنہوں نے ۱۹۲۷ء

میں بلند پایہ سہ ماہی علمی رسالہ ,, اسلامک کلچر،، (ISLAMIC CULTURE) جاری کیا جو تا حال باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ رسالہ غیر اسلامی دُنیا میں اسلام کی تعلیمات اور مسلمانوں کی تہذیب پر سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

نظام حیدر آباد دکن کی سرپرستی میں مار میڈ یوک پکتھال نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ شروع کیا۔ جب ترجمہ مکمل ہو گیا تو سرکار نظام کی طرف سے اُنہیں دو سال کی رخصت دی گئی کہ مصر جا کر جامعہ ازھر کے علماء سے اپنے ترجمہ کے بارے میں تبادلہ خیال کریں اور ترجمہ کو حتی الامکان بہتر بنائیں۔ تمام مراحل سے گزرنے کے بعد دسمبر ۱۹۳۰ء میں یہ ترجمہ زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔

جنوری ۱۹۳۵ء میں مار میڈ یوک پکتھال نے حیدر آباد ایجوکیشن سروس سے علیحدگی اختیار کی ۔ سرکار نظام نے تا حیات پنشن مقرر کر دی. پکتھال برصغیر سے واپس انگلستان چلے گئے تاہم ان کی خوشگوار یادیں ایک عرصے تک زندہ رھیں۔ شیخ عطا اللہ مرحوم نے لکھا ہے کہ:

,, مجھے علی گڑھ میں اُن کے چند شاگردوں سے ملاقات کا موقع میسّر آیا۔ اُن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی. لیکن ہر ایک اُن کے خلوص اور اُن کی شفقت پدرانہ کا مداح تھا(۲)،،

انگلستان میں مارمیڈ یوک پکتھال نے تبلیغ اسلام کا کام جاری رکھا۔ آخر وقت تک وہ اسلامی موضوعات پر لکھتے رہے اور تقریروں کے ذریعے اسلام کا پیغام پیش کرتے رہے۔ مار میڈ یوک پکتھال بھرپور زندگی گزار کر ۱۹ مئی ۱۹۳۶ء ـ ۲۷ صفر ۱۳۵۵ھ کو حرکت قلب بند ہو جانے سے فوت ہوئے اور لندن میں مسلمانوں کے قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

مارمیڈ یوک پکتھال اسلامی اخلاق سے پوری طرح آراستہ تھے۔ فرائض

مذھبیہ باقاعدگی اور پابندی سے ادا کرتے تھے۔ برصغیر کے زمانۂ قیام میں نادار طلبہ کی خود مالی امداد کرتے تھے اور بے تعصّب اور بے ریا شخص تھے ۔

مار میڈ یوک پکتھال کی قلمی یادگاروں میں ترجمۂ قرآن کے علاوہ دس بارہ اعلی درجے کے ناول ھیں ۔ ان میں SAID THE FISH ER MAN (سعید۔ماھی گیر) اُن کی پہلی تالیف ہے جو سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ۱۹۰٦ء میں اُن کا ناول THE HOUSE OF ISLAM (دار الاسلام) شائع ھوا۔ اس کے بارے میں ای۔ایم۔فاسٹر (E. M. FORSTER) نے لکھا ہے کہ اس میں "از حد خوبصورتی" ہے اور یہ "دین کا ایک کھلا اعلان" ہے۸۔

ان کے علاوہ مار میڈ یوک پکتھال کے ناولوں میں ORIENTAL ENCOUNTER (مشرقی محاربات) اور KNIGHTS OF ARAB زیادہ مشہور ھیں۔

اسلامی موضوع پر مار میڈ یوک پکتھال کی ایک اھم تالیف THE CULTURAL SIDE OF ISLAM ہے یہ کتاب اُن خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مدراس کی مسلم ایسوسی ایشن کے زیر اھتمام ۱۹۲۷ء میں دیئے تھے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ شیخ عطا اللہ ایم۔اے کے قلم سے شائع ھو چکا ہے۔

****

حواشی

(۱) برصغیر کے اہل علم کے انگریزی تراجم قرآن کے لئے دیکھئے

عبد الماجد دریا بادی ـــــ قرآن مجید کے انگریزی تراجم ـــــ ماہنامہ بینات (کراچی) بابت اگست ۱۹۶۳ء ـ ص ۳۱۳ محمد سالم قاسمی ـــــ جائزہ تراجم قرآنی ـــــ دیوبند ـ مجلس معارف القرآن دارالعلوم دیوبند (۱۹۶۸)ء

(۲) ترجمہ ر دیباچہ THE MEANING OF THE GLORIOUS QURAN

(۳) مشہور مستشرق ایچ اے آر گب (H. A. R. GIBB) نے لکھا ہے کہ درحقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا جیسے کسی بلند پایہ نظم کا ترجمہ ناممکن ہوتا ہے۔ وحی کی زبان مخصوص ہوتی ہے قرآن مجید کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے سے صرف یہ ہوگا کہ عربی زبان کے تراشے ہوئے نگینوں کے گوشے واضح طور پر پیش کرنے کے بجائے مترجم نے وضع کردہ الفاظ استعمال کرے گا جو اصل الفاظ کی جامعیت کو محدودکر دیں گے۔ ایسی آیات جن میں احکام و قوانین یا عقاب کا ذکر ہے اُن میں ترجمے کا یہ عیب شاید زیادہ نمایاں نہ ہو تاہم جو لطافتیں اور رنگینیاں اصل عبارت میں ہیں وہ کسی صورت میں ترجمہ میں نہیں آ سکتیں۔ مثال کے طور پر یہ سادہ سی آیت ہے

انّا نَحْنُ نُحْیِ و نُمِیْتُ و إلیْنَا الْمَصِیْرُ (۵۰ ۴۳)

انگریزی ہی نہیں دُنیا کی کسی بھی زبان میں اس کا ترجمہ ناممکن ہے اس کے چھ لفظوں میں پانچ بار ہم کی ضمیر استعمال ہوئی ہے پانچ بار ہم کی ضمیر کو اس قدر مختصر عبارت میں کسی زبان میں اس خوبی اور جوش و خروش سے ادا کیا جا سکتا ہے (MODERN TRENDS IN ISLAM)

(۴) ماہنامہ بینات (کراچی)۔

(۵) قرآن سے میرا تعلق ـ شمارہ ڈائجسٹ (لاہور) ـ قرآن نمبر (۱) ـ بابت نومبر ۱۹۶۹ء ـ ص ۱۱۱

(۶) ندوی کی ذات اعظم گڑھ ـ دار المصنفین ـ ۱۹۶۷ء) ـ ص ۳۰۶ ـ ۳۰۷

(۷) تہذیب اسلامی (لاہور ـ شیخ محمد اشرف تاجر کتب ـ ۱۹۶۳ع) ـ ص ۸

(۸) مضمون SALUTE TO THE ORIENT بحوالہ ماہنامہ THE MUSLIM (لندن) بابت اپریل ۱۹۶۹ء ص ۱۵۹ ـ

* * * * * * * * *

نقــــــد و تبصــــــره

(تبصرے کیلئے دو نسخے ارسال فرمائیے)

چراغ لالہ ۔ انوار صولت

انوار صولت فکر و نظر یونٹ میں ایک طویل عرصہ تک ہمارے رفیق کار رہے ہیں ۔ اس تعلق کی وجہ سے بھی فکر و نظر پر ان کا حق ہے۔ جب تک وہ ادارہ سے وابستہ رہے فکر و نظر کے بہت سے امور و مسائل کی طرف سے بے فکری رہی ۔ اپنی ادبی صلاحیتوں کی بدولت انہوں نے اپنے فرائض کو ہمیشہ بوجہ احسن انجام دیا ۔ شعر و شاعری سے انہیں شروع ہی سے لگاؤ رہا ہے۔ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کہتے رہے ۔ اس وقت وہ عمر کے جس حصے میں ہیں ، اندک اندک شود بسیار ، اچھا خاصا کلام جمع ہو گیا ہوگا ۔

چراغ لالہ ان کی شعری تخلیقات کا پہلا مجموعہ ہے جسے بطور تمہید انہوں نے شائع کیا ہے۔ اس میں ان کا عہد جوانی کا کلام شامل ہے۔ عہد جوانی جس کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے۔

دریغــا کــہ عهــد جوانی گــذشت
جـــــوانی مگــــوزندگانی گذشت

ان کا اپنا بیان ہے۔

"میں نے عمر بھر بہت کچھ لکھا ، ہر موضوع پر لکھا ، مگر اس

مجموعے میں میرے دور شباب کی صرف چند غزلیں ، نظمیں ، نیز چند آزاد اور نثری نظمیں اور طنزیہ کلام شامل ہے اور باقی کلام مستقبل کے کسی مناسب موقع کے لئے محفوظ ہے ۔

توقع رکھنی چاہئے کہ اس بیش کش کے بعد پیش رفت جاری رہے گی اور ان کا بقیہ کلام بھی زیور طبع سے آراستہ ہو کر جلد منظر عام پر آئے گا ۔

صولت صاحب کے ہاں شاعری ضلالت و غوایت یا رندی و ہوسناکی سے عبارت نہیں ۔ متانت و سنجیدگی جس طرح ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی میں ایک نمایاں عنصر ہے اسی طرح ان کی شاعری میں بھی اس کا پرتو صاف نظر آتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے دور شباب کے کلام میں بھی اس طرح کے اشعار اکا دکا نہیں کثرت سے ملتے ہیں ۔ میں حصہ غزل سے چند اشعار نقل کرتا ہوں۔غزل میں شاعر کے بھٹکنے اور بھٹکنےکا زیادہ امکان ہوتا ہے ۔

معا تائید حق امداد کو صولت پہنچتی ہے
مصائب میں دعا ہم مانگتے ہیں گر کبھی دل سے

ان درختوں کی طرح صولت گذاری زندگی
خود جلے جو دھوپ میں اوروں پہ سایہ کر دیا

جیسے جیسے میں ہوا صولت حقائق آشنا
شعر میرا ترجمان زندگی بنتا گیا

اک ضرب بت شکن سے سبھی ہوں گے پاش پاش
یہ لات یہ منات ذرا دیکھتے رہو

جس نے دنیا میں کیا دعوی کہ میں ہوں سقراط
لوگ دوڑے ہیں بھرے زھر کا سالہ لے کر

سو صفحات کا یہ مجموعہ کتابت ، طباعت ، کاغذ ، جلد بندی اور گرد بوش ، ہر اعتبار سے جاذب نظر ہے۔ صولت صاحب نے اسے اھتمام میں اسے طبع کرایا ہے۔ ان کے اسعار میں ان کا خون جگر سامل بھا ھی ، کتاب کے صوری محاسن میں بھی اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ توقیر حسین بوسٹ بکس ۱۰۰۲ ۔ اسلام آباد سے طلب کی جا سکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ۔ سابد اس ب میں ان کا نقطہ نظر اسد اللہ خان غالب سے ہم آھنگ ھو ۔

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چسم خریدار پہ احساں میرا

(شرف الدین اصلاحی)

****

شریف التواریخ جلد اوّل

مؤلف	:	سیّد شریف احمد شرافت نوشاہی
ناشر	:	ادارہ معارف نوشاھیہ ساھن پال شریف گجرات
صفحات	:	۱۱۲ + ۱۲٦۲
طباعت اور جلد بندی	:	عمدہ
قیمت	:	۷۵ روپے

تذکرہ نگاری مسلمان اھلِ قلم کا ایک پسندیدہ موضوع رہا ہے اور ہر

دور میں معاشرے کے مختلف طبقات ۔ علماء و صوفیہ ، شعراء ، اطباء اور امراء کے تذکرے لکھے گئے اور یہ سلسلہ حسبِ روایت جاری ہے۔ ،،شریف التواریخ،، سلسلہ قادریہ کی ایک شاخ ،،نوشاھیہ،، کا مفصّل تذکرہ ہے۔ اس شاخ کے بانی عہدِ جہانگیری کے ایک صوفی حضرت حاجی محمد نوشہ گنج بخشؒ تھے ۔ مؤلف کتاب بانیء سلسلہ کی اولاد میں سے ھیں اور سلسلہ نوشاھیہ قادریہ کے سجادہ نشین ھیں ۔

شریف التواریخ تین ضخیم جلدوں پر پھیلی ھوئی ہے۔ زیر نظر جلد اوّل موسوم بہ ،،تاریخ الاقطاب،، ۱۳۵۵ھ میں مکمل ھوئی مگر تالیف کے چوالیس سال بعد پہلی مرتبہ زیورِ طباعت سے آراستہ ھوئی ۔ جناب مؤلف نے متقدمین کے انداز پر جلد اوّل کو دو ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ھر باب چند فصلوں میں منقسم ہے ۔ پہلے باب میں ولایت کی حقیقت ، اولیاء اللہ کی اقسام ، اُن کے خوارق و کرامات ، بیعت طریقت اور خرقۂ خلافت و ارشاد کے مسائل بیان کئے گئے ھیں ۔ دوسرے باب میں حضرت نبی اکرم ﷺ سے لے کر حضرت نوشہ گنج بخشؒ تک شجرۂ طریقت کے سب ھی اکابر کے سوانححیات اور دیگر تفصیلات قلمبند کی گئی ھیں ۔

شریف التواریخ کی زیر تبصرہ جلد مؤلف کی اُس دور کی تالیف ہے جب اُن کی عمر بمشکل تیس سال تھی ۔ یہی سبب ہے کہ اس تالیف میں وہ پختگی اور سلاست نہیں ہے جو اُن کی دوسری تالیفات مثلاً تذکرۂ نوشہ گنج بخشؒ اور اذکارِ نوشاھیہ میں پائی جاتی ہے۔ کتاب کا عمومی انداز بیان سادہ ہے تاھم بعض مقامات پر عبارت آرائی سے کام لیا گیا ہے ۔

آغازِ کتاب میں جناب محمد اقبال مجددی کے قلم سے ،، تقریب،، اور جناب سیّد عارف نوشاھی کے قلم سے جناب مؤلف کے حالات زندگی شامل ھیں ۔ اِن تحریروں سے جناب مؤلف اور اُن کی کاوش ،، شریف التواریخ،، کا اچھا

تعارف ہو جاتا ہے۔ کتاب کے آخر میں تیرہ عنوانات کے تحت مفصّل اشاریے منسلک ہیں جو اُردو کتابوں میں ایک اچھی روایت کا آغاز ہے۔

صوفیہ کے اکثر تذکروں کی طرح سریف التواریخ میں بھی حکایات، خوارق عادت، تعویذات اور محبت و عقیدت میں غلو کی مثالیں ملتی ہیں مگر اس کے ساتھ ہی تذکرہ میں سامل افراد کے احوال و آثار پر جس محنت اور لگن سے مواد جمع کیا گیا ہے۔ بے اختیار اس کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ کتابیات (باب اوّل، فصل اوّل) پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جناب مؤلف صوفیہ کے تذکروں، معاصر تاریخوں اور دینیات کے ذخیرے پر وسیع نظر رکھتے ہیں۔

"سریف التواریخ" صوفیہ کے تذکروں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ امید ہے کہ اس سلسلے کی دوسری اور تیسری جلد بھی مستقبل قریب میں سائع ہو جائے گی۔

(اختــــــر راهی)

ســـــــوئـــے منـــزل

"ادارہ تعلیمات اسلامیہ پوسٹ بکس ۸٦٩ راولپنڈی" ایک نوخیز ادارہ ہے جسے چند اسلامی ذہن رکھنے والے نوجوان مل کر امداد باہمی کی بنیاد پر چلا رہے ہیں اور جس کا مقصد انہی کے الفاظ میں "جدید تعلیم یافتہ طبقے تک سلام کے زریں اصولوں کو پہنچانا ہے"۔ "سوئے منزل" اسی ادارے کا ترجمان ہے جو ہر ماہ پابندی سے سائع ہوتا ہے۔ لیکن اسے ماہنامہ یا ماہوار رسالہ اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ضابطے کی ان رسمی شرائط کو پورا نہیں کرتا جو

کسی ماہنامے کے لئے ضروری ہوتی ہیں ۔ گویا یہ سلسلہ وار کتابچے ہیں جو رسالے کے طرز پر مرتب کیئے جاتے ہیں ۔ ادارہ اب تک اس کی تین قسطیں سائع کر چکا ہے ۔ ۶۴ صفحات کے اس کتابچے کی قیمت صرف ۲ روپے رکھی گئی ہے جو آجکل کے لحاظ سے بہت کم ہے ۔ کتابت طباعت کاغذ اور سرورق ہر چیز ان نوجوانوں کے ذوق و سوق کی آئینہ دار ہے ۔ اور ان کے وسائل کو مدنظر رکھ کر دیکھیں تو ان کے حسن انتظام اور حسن کارکردگی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ۔

سونے منزل سفر میں زاد راہ کا اندازہ درج ذیل ان عناوین سے لگایا جا سکتا ہے جو دوسری اور تیسری اساعت کی زینت ہیں :۔

"قرآن اور تصور عدل ، اسلام میں عورت کا مقام ، اکابر ملت کی عظیم خدمات ، کمیونزم اور مذہب ، انسان کامل ، سائنس کے فروغ میں مسلمانوں کا حصہ ، جنگ آزادی اور علمائے حق ۔"

اس کا ایک مستقل عنوان ہے " دین کے آئینے میں" اس کے تحت دین کے متعلق سوالات کے جواب دیئے جاتے ہیں ۔

یہ نوجوان سب کے سب پڑھے لکھے ہیں ۔ دینی جذبے کے ساتھ ان کا ادبی ذوق بھی بلند ہے ۔ زبان و بیان کے اعتبار سے مضامین کا معیار اچھا ہے ۔ ان کی اپنی تحریریں بھی ان کے ادبی ذوق کی آئینہ دار ہیں ۔ مگر کتابت کی اغلاط بکثرت ہیں ۔ اس طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے ۔

(شرف الدین اصلاحی)

****

شعبان ۱۴۰۱ھ — جون ۱۹۸۱ء

نگراں

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا

ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد

فون : [illegible]

مدیر

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی

فون : [illegible]

فکر و نظر اسلامی حدود کے اندر آزادی اظہار رائے کا حامی ہے۔ فکر و نظر میں کسی مضمون کی اشاعت کا یہ مطلب نہیں کہ ادارہ ان افکار و خیالات سے لازماً متفق ہے جو اس میں پیش کئے گئے ہیں۔ مضمون نگار اپنے خیالات کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔

سالانہ چندہ پندرہ روپئے	ششماہی آٹھ روپئے	فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

طابع و ناشر : **محمد سمیع اللہ** سکرٹری ادارۂ تحقیقات اسلامی ۔ اسلام آباد

فون : [illegible]

مطبع : اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پریس ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵ ۔ اسلام آباد

فون : ۳۰۹۵۲

سکولوں ، کالجوں اور لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

ماهنامه

فکرونظر

اسلام آباد

جلد - ۱۸ | شعبان ۱۴۰۱ھ □ جون ۱۹۸۱ء | شمارہ - ۱۲ - الف

فہرست

مجلس ادارت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظـــــرات

اسے ہماری ادبی تاریخ یا دنیائے ادب کا ایک المیہ ہی کہا جائے گا
اگر آج ہم اپنے ادب میں اسلامی یا دینی رجحانات کو موضوع بحث بنانے کی
نچلی سطح پر اتر آئیں اور ادب میں اسلامی رجحانات کو تلاش کرنے کی سعی
کریں ۔ ورنہ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے خود کو عصر حاضر کے غلط پروپگنڈوں
سے دور رکھہ کر ادب کی حقیقت و ماہیت یا اس کی اصل روح کو سامنے رکھیں
اور غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچنے میں ہمیں دیر نہیں لگے گی کہ ادب اور
دین یا ادب اور اسلام کا چولی دامن کا ساتھہ ہے ، کل بھی رہا ہے اور آج بھی ہے
اور کل بھی رہے گا ۔ اس لیے کہ اسلام اور اسلام کے حامل آسمانی صحائف نہ
صرف یہ کہ وہ خود ادبی شاہکار ہیں بلکہ وہ ادب عالیہ اور مثالی ادب کے
اولین سرچشمے اور کامل نمونے ہیں مواد اور مضامین کے اعتبار سے بھی اور
ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے بھی ۔ میں جب اسلام کا لفظ استعمال کرتا ہوں
تو میرے نزدیک دین یا مذہب کا وہ محدود تصور نہیں ہوتا جو زمان و مکان کے
دائرے میں وقتی ہنگامی اور مقامی تعبیرات کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ بلکہ میرے
پیش نظر اس کا ازلی اور ابدی تصور ہوتا ہے ۔ آج یہ حقیقت بھی ہماری
نگاہوں سے تقریباً اوجھل ہو چکی ہے اور اس کا ادراک بہت کم لوگوں کو ہے
کہ اس دنیا کے پہلے انسان سے لیکر آخری انسان تک سب کا سچا دین جس کو
ان کے پیدا کرنے والے نے ان کے لئے بنایا ہے اور قائم کیا ہے وہ اسلام ہے ۔ دینی تاریخ
سے باخبر افراد اس کی گواہی دیں گے ۔ ان الدین عند اللہ الاسلام ۔ آدم علیہ
السلام کا دین بھی اسلام تھا آدم علیہ السلام کے بعد تمام انبیاء کا دین بھی اسلام

تھا ۔ آخری نبی کا دین بھی اسلام تھا اور آخری نبی کے بعد اس کی وساطت سے قیامت تک تمام بنی نوع انسان کا دین بھی اسلام ہے۔

چونکہ ادب اپنی مجرد صورت اور اصلی شکل میں اسلام ھی کا ایک حصہ ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ دنیا میں پائی جانے والی ہر اچھی بات یا اچھائی کی طرح ادب بھی اسلام ھی کی دَین ہے اس لئے اس کا منطقی نتیجہ یہی نکل سکتا ہے کہ سچا اور صحیح ادب خواہ وہ کسی زمانے یا کسی جگہ یا کسی زبان کا کیوں نہ ہو وہ وھی ہے جو اسلامی رجحانات کا نہ صرف آئینہ دار ہو بلکہ اسلامی اثرات کے زیر سایہ پروان چڑھا ہو ۔ ادب کی سیدھی سادی تعریف جو سب کے نزدیک قابل تسلیم ہو یہی ہو سکتی ہے کہ ایک اچھی بات کو اچھے انداز میں کہنے کا نام ادب ہے ۔ خود لفظ «اچھی» کے دو پہلو ھیں ۔ ایک اضافی (سبجیکٹیو) دوسرا معروضی (اوبجیکٹیو) ۔ اس کے اضافی مفہوم اور تصور میں اختلاف کی گنجائش ہے اس میں ایک انسان دوسرے انسان سے مختلف نقطہ نظر رکھ سکتا ہے مگر اس کا معروضی مفہوم ایک اور صرف ایک ، ناقابل تغیر اور غیر اختلافی ہے ۔ اور یہ وہ تصور ہے جس کا تعلق فانی مخلوق انسان سے نہیں بلکہ غیر فانی ، خالق خدا کی ذات سے ہے ۔ وہ خود اچھا ہے اور تمام اچھی باتوں کا سرچشمہ ہے ۔ اللہ جمیل و ھو یحب الجمال۔ اسی بات کو غالب نے اپنے خاص انداز میں یوں کہا ہے ۔

دھــــر جــز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

یہ دنیا اجتماع ضدین سے وجود میں آئی ہے ۔ یہاں ہر چیز کے ساتھ خواہ وہ چیز مادی ہو یا غیر مادی اس کے ساتھ اس کی ضد بھی لگی ہوئی ہے۔ خدا خود ہے تو شیطان کو بھی اذن عام ملا ہوا ہے ۔ خیروشر دونوں کا پیدا کرنے والا وھی خالق کل ہے۔ مگر ان میں سے ایک خدا کو پسند ہے دوسرا ناپسند ۔ اور

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک انسان کے حق میں مفید اور بہتر ہے تو دوسرا مضر اور بدتر۔ اس میں خدا کی اپنی کوئی مصلحت یا فائدہ نہیں۔ فائدہ اس کے پیش نظر انسان ھی کا ہے۔

ادب بھی انسان کے فطری تقاضوں میں سے ایک تقاضا ہے مگر ادب کا وھی تصور انسانی فطرت سے ہم آھنگ کہا جائے گا جو اس کو اس کے مقامِ انسانیت سے گرانے کی بجائے اس کو اونچا اٹھائے۔ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے ھمارے پاس ایسا معیار جس میں اختلاف کی گنجائش نہ ھو صرف ایک ہے اور وہ ہے خدا کی پیدا کی ھوئی مثبت اقدار نہ کہ منفی اقدار اور جس کا تعین ھم صرف دینی ھدایات اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کر سکتے ھیں۔ میری اب تک کی گفتگو کا ماحصل یہ ہے اور میں اس بات کو بہ تکرار دعوے کے ساتھ باصرار کہنے کو تیار ھوں کہ ادب اپنے اضافی تصور کے اعتبار سے نہیں معروضی تصور کے اعتبار سے وھی ھوسکتا ہے جو دین اسلام کے زیر اثر وجود میں آیا ھو۔ اس سے ھٹ کر جو ادب ھوگا وہ نام نہاد ادب،ادب نہیں بےادبی کی ایک قسم ھوگا؟ جس کا نام ادب رکھ لیا گیا ھوگا۔ نام کا کیا ہے۔ کچھ بھی رکھ لیجئے۔ اور آج کی دجل اور مکرو فریب سے بھری ھوئی اس دنیا میں تو یہ چلن عام ہے کہ جنون کا نام خرد رکھ دو اور خرد کا نام جنون رکھ دو اور جو چاھو کرتے پھرو۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاھے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے

آخر یہ نرالا دستور بھی تو اسی دنیا کا ہے جس میں ھم اور آپ رھتے ھیں کہ

برعکس نہند نامِ زنگی کافور

کالے کلوٹے حبشی کا نام کوئی کافور رکھ دے تو کسی کی مجال ہے جو اسے روک سکے۔ لیکن اس نام رکھ دینے سے کالا گورا نہیں ھو سکتا وہ کالا ھی رھے گا۔

آج اگر ادب کے نام پر بے ادبی کو حسن کے نام پر بدصورتی کو پاکیزگی کے نام پر گندگی کو اچھالا جا رہا ہے تو ظاہر پرست نگاہیں ممکن ہے اس سے دھوکا کھا جائیں مگر حقیقت بیں نگاہوں کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا ۔

میں فقط آج کی یا ماضی قریب کی یا ماضی بعید کی بات نہیں کرتا بلکہ میں کہتا ہوں کہ جب سے ہماری یہ دنیا وجود میں آئی ہے اور ایک ادب سند مخلوق سے آباد ہوئی ہے اس وقت سے لے کر بعد کے عہد بہ عہد ادوار میں بلا انقطاعِ تسلسل ہر زمانے میں ادب اپنے حقیقی معنوں میں وہی تھا جو اسلامی دینی یا آسمانی رجحانات کا حامل رہا ہو ۔ اردو ایک حدیث العہد زبان ہے ۔ عبرانی ، رومن ، انگریزی یا سنسکرت جیسی قدیم زبانوں کو لے لیجئے ان سب کا کلاسیکی ادب اپنے اپنے دور کے مذہبی اثرات کے تحت کسی نہ کسی درجے میں ان روایات کا حامل اور ان اقدار کا علمبردار رہا ہے جو زمینی ذرائع سے نہیں آسمانی ذرائع سے انسان تک پہنچیں ۔ یہ درست ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ حق کے ساتھ باطل کی آمیزش ہوئی ۔ اسلام کے ساتھ کفر و شرک کو بھی ملایا گیا ۔ نیکی کے ساتھ بدی بھی لگ گئی اور ان کے ملے جلے اثرات ہم کو ہر دور کے ادب میں نظر آئیں گے مگر اس حقیقت اور امر مسلمہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان ادوار کے ادب میں جتنی اچھی قدریں تھیں وہ دین کے راستے سے آئیں اور جتنی بری قدریں تھیں وہ انسانوں نے شیطان ، شیطان کی ذریت اور اس کے پیروکاروں سے سیکھیں اور جب ان کو اپنی زندگی میں داخل کرلیا تو پھر وہ آپ سے آپ ان کے ادب میں جو زندگی کا عکاس ہوتا ہے وہ تمام بری قدریں بھی اچھی قدروں کے ساتھ در آئیں ۔

اب میں اس نکتے کو ایک اور پہلو سے واضح کرنا چاہتا ہوں ۔ خود لفظ ادب کی لغوی اور معنوی تشریح پر غور کریں تو بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ادب اصلاً زندگی کی مثبت قدروں ہی سے عبارت ہے نہ کہ منفی قدروں سے

اچھائی ، سچائی ، طہارت پاکیزگی ، صلاح و فلاح ، صحت و صفائی کے عناصر سے اس کا ھیولی تیار ھوتا ہے نہ کہ اس کے برعکس اوصاف سے ۔ ادب کے لئے دنیا کی دوسری زبانوں میں جو الفاظ ھیں ممکن ہے میری یہ تشریح ان پر صادق نہ آئے مگر ادب جو کہ عربی زبان کا لفظ ہے اس میں اس جہت اور زاویے سے غور کرنے کی کافی باتیں ھیں عربی لغات کی طرف رجوع کریں تو معلوم ھوگا کہ ادب اور اس مادے سے بنے ھوئے دوسرے الفاظ میں جو بات بطور قدر مشترک نظر آتی ہے وہ ہے تہذیب ، شائستگی ، اخلاق ، انسانیت اور انسانیت کے لوازمات ۔ عربی زبان میں اس لفظ کے اصلاحی مفہوم میں بھی یہ باتیں نمایاں نظر آئیں گی ۔ چنانچہ عربی شاعری اور خطبات عرب کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ گواھی دیں گے کہ عربی روایات ادب کا نمایاں عنصر یہی باتیں ھیں ۔ چونکہ ھماری اردو اپنی لسانی اور ادبی روایات کے لئے بالواسطہ اور بلا واسطہ عربی ھی کی رھین منت ہے اس لئے اس میں بھی کم و بیش یہ اثرات کسی نہ کسی درجے میں موجود رھے ھیں ۔ ادب کو بحیثیت ایک اصطلاح کے ماضی میں بہت خراب کیا گیا ہے لیکن اصطلاح سے ھٹ کر اس لفظ کے اندر اردو زبان میں ایسے بے شمار نشانات مل جائیں گے جس سے ھمارے بیان کی تائید ھوتی ہے ۔ ادب آج بھی روز مرہ بول چال میں تہذیب و اخلاق شرافت اور انسانیت کا مترادف سمجھا جاتا ہے ۔ با ادب با نصیب ، بے ادب بے نصیب ، اردو ھی کے اقوال زریں ھیں ۔ اور یہ شعر ملاحظہ ھو ،

ادب ھی سے انسان انسان ھے
ادب جو نہ سیکھے وہ حیوان ہے

عام زندگی یا زندگی کے عکاس ادب میں یہ رجحان کہاں سے آئے گا اگر ھم اسلام کو اپنی زندگی سے خارج کر دیں ۔

ان چند اصولی اور بنیادی مباحث کے بعد اب میں موضوع کے اس پہلو

کی طرف آتا ہوں کہ آج ہمارے ادب میں اسلامی یا بالفاظ دیگر پاکیزہ ادبی رجحانات کا کیا حال ہے۔ ہم آج کو جب تک کل تک کے پس منظر میں رکھ کر نہیں دیکھیں گے بات واضح نہیں ہو گی ۔ وبضدها تتبین الاشیاء ۔

اردو زبان و ادب کی ابتداء اور ارتقاء کے مختلف ادوار میں اسلامی اور غیر اسلامی رجحانات ملے جلے نظر آتے ہیں لیکن گزشتہ نصف صدی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو صاف نظر آئے گا کہ غیر اسلامی رجحانات میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا ۔ اس اضافے کی رفتار میں تیزی اس وقت آئی جب اسلام دشمن عناصر نے منظم ہو کر ادب کے محاذ پر شبخون مارا ۔ انہوں نے ادب کی پرانی قدروں کو تاراج کیا اور ان کی جگہ رفتہ رفتہ نئی قدروں کو فروغ دیا جس میں غیر اسلامی عناصر کی بھر مار تھی یہاں تک کہ ادب میں اسلام کے سوا سب کچھ جگہ پانے لگا ۔ حالات یہاں تک بدلے کہ

ع ۔ جو تھا نا خوب بتدریج وهی خوب هوا

پہلے ادب میں اسلام سے ہٹ کر بھی ایک اخلاقی حس اور معاشرتی رکھ رکھاؤ دکھائی دیتا ہے ۔ میر تقی میر کے سامنے مشاعرے میں جب جرأت رندی اور ہوسناکی کے اشعار پڑھ کر داد کے طالب ہوئے تو میر صاحب نے منہ بنا کر کہا " شاعری سے تم کو کیا نسبت بس اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو" ۔ حالانکہ میر صاحب کوئی مولوی عالم یا دینی رهنما نہ تھے بلکہ آج کل کی اصطلاح میں محض ایک شاعر تھے ایک عام انسان تھے۔اسطرح مرزاشوق کی بے محابا مثنویوں کو دیکھ کر کسی نقاد نے اس سے بھی سخت جملہ کہا تھا لیکن بعد کے ادوار میں یہ حس آہستہ آہستہ کمزور پڑتی گئی ۔ ایک منصوبے کے تحت ایسی تمام قدروں کو پامال کیا گیا جو شرافت اور اخلاق پر مبنی تھیں اور کھلم کھلا عریانی فحاشی ، بے حیائی اور جنسی بے راہ روی کو اس طرح رواج دیا گیا کہ اسلام تو کجا ہر طرح کی شرافت اور اخلاق کا

جنازہ نکل گیا ۔ ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر طرح کی بے ادبی ادب ٹھہری ۔ ادب میں خدا رسول اخلاق اور شرافت کا نام لینا جرم سمجھا جانے لگا ۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

ادب میں خدا کا نام لینا اتنا ھی بڑا جرم متصور ہونے لگا ۔ خدا کا نام لینے والے ادیب بھی ادب میں خدا کی باتیں کرنے سے ڈرتے تھے ۔ دین کو جو کہ ادب کا سب سے بڑا مربی تھا اس کو ادب سے اس طرح خارج کیا گیا کہ ادب اور دین دریا کے دو ایسے کنارے ہو گئے جو کبھی یکجا نہیں ہو سکتے اور کبھی آپس میں نہیں مل سکتے ۔ حالانکہ ادب کا اگر کوئی واقعی مصرف ہو سکتا ہے تو یہی کہ وہ دین کا خادم ہو اور اس راستے سے انسانیت کا خادم ہو ۔ ادب کو لادینی رجحانات ھی کا ترجمان نہیں بنایا گیا بلکہ عام اخلاق اور شرافت سے بھی اس کے رشتے منقطع کر دیئے گئے ۔ اس رجحان کو تقویت دینے میں جہاں بیرونی اثرات نے اپنا پارٹ پلے کیا وھاں ملک کے اندرمعاشرتی حالات نے بھی مدد دی ۔ اندرون ملک ان حالات کے بدلنے سے صورت حال میں تبدیلی آئی ہے اور اس کے اثرات اور نتائج نظر آنے لگے ھیں ۔ لیکن بے ادبی کے وہ ادارے مراکز اور تنظیمیں بدستور سرگرم عمل ھیں جن کو غلطی سے ایک مدت تک ادب سے نہیں بلکہ ادب کے نام کے ساتھ نسبت دی جاتی رھی ۔ حالات کی تبدیلی سے ان ادیبوں کو حوصلہ ملا ہے جو صحیح معنوں میں ادب کے نقیب ھیں اور جن کے یہاں اسلامی اور دینی رجحانات ھی ادب کے نمایاں خط و خال ھیں ۔ اس تبد کے اثرات جہاں ملک میں سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں میں دیکھے جا سکتے ھیں وھاں ذرائع ابلاغ میں بھی اس کی جھلکیاں نظر آنے لگی ھیں ۔ اب اللہ رسول دین اور اسلام کا ذکر کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں کی جاتی ۔ مگر ابھی

یہ ابتداء ہے۔ سمت بدلی ہے۔ رخ بدلا ہے۔ روبہ منزل سفر کا آغاز ہو گیا ہے۔ لیکن منزل ابھی دور ہے۔ ادب کے صحت مند تصور کے نقیب اور علمبردار اپنی مساعی تیز کر دیں اگر وہ منزل سے ھمکنار ہونا چاھتے ھیں ۔

نوارا تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیزترمی خواں چوں محمل را گراں بینی

(مدیر)

* * * * * * *

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسودہ اسلامی دستـــور

عـــرض مترجـــم

اسلامی دنیا میں مروجہ دساتیر پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو جہاں ہم انہیں غیر اسلامی کہنے میں متأمل ہوتے ہیں وہاں ہمارے لئے انہیں اسلامی کہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ یہ اسلامی دستور جو کہ ایک مسودہ کی شکل میں ہے ایک تجویز کی حیثیت رکھتا ہے اسی لئے اسے پڑھنے کے بعد یہ ضرور محسوس ہوگا کہ اسمیں مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے مثلاً دستور کی تمہید میں اللہ تعالی کے مقتدر اعلی ہونے کا بیان، انسان کا بحیثیت نائب اس کام کو سرانجام دینا ، امت اسلامیہ کے اسلامی دعوت کے میدان میں فرائض ، عالم اسلامی کا اتحاد اور اسلامی نقطہ نظر سے مسلم اور غیر مسلم ممالک سے خارجی معاملات وغیرہ وغیرہ اس کمی کے باوجود یہ اسلامی دستور قرآن و سنت کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس کو سامنے رکھ کر ہم اسلامی دنیا میں مروّجہ دوسرے دساتیر کا جائزہ لے سکتے ہیں کہ وہ کس حد تک اسلامی یا غیر اسلامی ہیں اور ان میں کہاں کہاں اصلاح کی ضرورت ہے۔

انہی باتوں کے پیش نظر میں نے اس کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی تاکہ اہل علم بالعموم اور قانون دان ، دانشور اور علماء بالخصوص اس پر غور و فکر کریں اور ضروری اضافے کے ساتھ اسے کسی بھی اسلامی ملک میں عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ یہی مقصد اس اسلامی دستور کے عربی زبان میں مرتب کرنے والوں کے پیش نظر تھا۔ رب العالمین اسلامی نظام کے قیام میں کی جانے والی تمام کوششوں کو دنیا میں کامیاب اور آخرت میں ذریعہ نجات بنائے۔ آمین یا رب العالمین۔

تاج الدین ازهـری

مقدمہ

۱ ۔ ادارہ تحقیقات اسلامی ازہر کی آٹھویں کانفرنس جو ذی القعدہ ۱۳۹۷ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۷ میں قاہرہ میں منعقد ہوئی تھی ، اس میں یہ قرارداد پاس کی گئی تھی کہ ازہر بالعموم اور ادارہ تحقیقات اسلامی بالخصوص ایک ایسا اسلامی دستور مرتب کرے جسے کسی بھی ایسی حکومت کی درخواست پر پیش کیا جا سکے جو شریعت اسلامیہ کو مکمل نظام زندگی کے طور پر اپنانا چاہتی ہو ۔ اور اس اسلامی دستور کو مرتب کرتے وقت جس قدر ممکن ہو مذاھب اسلامیہ کے متفق علیہ اصولوں پر اعتماد کیا جائے ۔

۲ ۔ اسی قرارداد پر عمل کرتے ہوئے ادارہ تحقیقات اسلامی نے اپنے ۱۱ محرم ۱۳۹۸ھ مطابق ۲۱ دسمبر ۱۹۷۷ کے اجلاس میں یہ طے کیا کہ اس منصوبے کو مجلس کی اسلامی دستور ساز کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے اور اس کام کے لئے ان اشخاص کو مدعو کیا جائے جو اس میں معاون ہو سکیں ۔

۳ ۔ بنابریں اس وقت کے شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود رحمة اللہ علیہ صدر ادارہ تحقیقات اسلامی نے اعلی سطح کی ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں مجلس کے دستور ساز ممبران کے ساتھ اسلامی فقہ اور قانونی میدان میں کام کرنے والی چیدہ چیدہ شخصیات کو بھی شامل کیا گیا تاکہ یہ سب مل کر اس اہم کام کو سرانجام دے سکیں ۔

۴ ۔ اس اعلی سطح کی کمیٹی نے اپنے اجلاس میں جو شیخ الازہر کی صدارت میں منعقد ہوا تھا ایک ذیلی کمیٹی تشکیل کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ باھمی مشاورت اور بحث و تمحیص کے بعد اسلامی دستور کا مسودہ تیار کرے اورتکمیل کے بعد اسے اعلی سطح کی کمیٹی کے سامنے پیش کرے ۔

۵ ۔ ذیلی کمیٹی کا ھفتہ وار اجلاس باقاعدہ ھوتا رہا یہاں تک کہ اسلامی دستور کے مسودے کی تیاری کا کام مکمل ھو گیا اور اس نے اسے آخری شکل دے کر اعلی سطح کی کمیٹی کو پیش کر دیا ۔

یہ مسودہ حسب ذیل نو ابواب پر مشتمل ہے جن میں مجموعی کل ترانوے دفعات ھیں :

باب اول	امت اسلامیہ	۴ دفعات
باب دوم	اسلامی معاشرے کے اصول	۱۳ دفعات
باب سوم	اسلامی معاشیات	۱۰ دفعات
باب چہارم	سخصی آزادیاں اور حقوق	۱۰ دفعات
باب نجم	امام (سربراہ مملکت)	۱۷ دفعات
باب ششم	عـــدلیہ	۲۲ دفعات
باب هفتم	سوری ، نگرانی اور قانون سازی	۲ دفعات
باب هشتم	حکومت	۲ دفعات
باب نهم	عمومی وقتی امور	۷ دفعات

جنرل سیکریٹریٹ
ادارہ تحقیقات اسلامی
(ازھـــر)

* * * * * *

باب اوّل امت اسلامیہ

دفعہ نمبر ۱ ۔ ا ۔ مسلمان ایک امت هیں ۔
ب ۔ شریعت اسلامیہ تمام قانون سازی کا واحد سرچشمہ ہے ۔

دفعہ نمبر ۲ ۔ امت اسلامیہ کے اندر اندر متعدد ممالک هو سکتے هیں ان ممالک میں نظام حکومت کی مختلف اشکال اختیار کی جا سکتی هیں ۔

دفعہ نمبر ۳ ۔ حکومت کسی بھی اسلامی حکومت یا اسلامی حکومتوں سے باهمی طور پر متفقہ شرائط پر اتحـاد کر سکتی ہے ۔

دفعہ نمبر ۴ ۔ عوام امام (سربراہ مملکت) اس کے معاونین اور تمام حکاّم کا شریعت اسلامیہ کے احکام کے مطابق محاسبہ کر سکتے هیں ۔

باب دوم اسلامی معاشرے کے اصول

دفعہ نمبر ۵ ۔ تعاون اور ایک دوسرے کی کفالت معاشرے کا بنیادی اصول ہے ۔

دفعہ نمبر ٦ ۔ هر نیکی کا حکم دینا اور هر برائی سے روکنا فرض ہے اور جو اس پر قدرت رکھنے کے باوجود اس میں کوتاهی کرتا ہے وہ خدا کے سامنے مجرم ہے ۔

دفعہ نمبر ۷ ۔ خاندان معاشرے کی بنیاد اور دین و اخلاق اس کے بنیادی عناصر حکومت خاندان کی امداد و سرپرستی مامتا کی حمایت ، اور بچے کی نگہداشت کی ضمانت کے ساتھ اس کے لئے مطلوبہ وسائل بھی فراهم کرے گی ۔

دفعہ نمبر ۸ ۔ خاندان کی حفاظت ، نکاح کی حوصلہ افزائی ، اس کے لئے رہائش اور دوسری ممکنہ امداد ، جیسے مادی وسائل کے حصول کو آسان بنانا حکومت کا فریضہ ہے ۔ باعزت ازدواجی زندگی ، عورت کے لئے شوهر کی اطاعت اور خدمت ، اولاد کے لئے ممکنہ وسائل کی فراهمی حکومت کے فرائض میں سے ہے ۔

دفعہ نمبر ۹ ۔ امت کی سلامتی اور افراد کی صحت کی نگہداشت حکومت کا فرض ہے اور وہ اس کے لئے تمام باسندوں کو امراض سے حفاظت اور علاج کے لئے مفت طبی سہولتیں فراهم کرے گی ۔

دفعہ نمبر ۱۰ ۔ علم حاصل کرنا فرض ہے اور تعلیم کو عام کرنا حکومت کی قانونی ذمہ داری ہے ۔

دفعہ نمبر ۱۱ ۔ دینی تربیت تعلیم کے تمام مراحل میں ایک بنیادی پروگرام ہوگی ۔

دفعہ نمبر ۱۲ ۔ حکومت مسلمانوں کے لئے متفق علیہ امور و فرائض ۔ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرت خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی تعلیم کا، تعلیم کے مختلف مراحل میں ایسا انتظام کرنے کی پابند ہوگی جو اس مرحلے کے لئے کافی ہو ۔

دفعہ نمبر ۱۳ ۔ حکومت مسلمانوں کے لئے تعلیم کے مختلف مراحل میں ان کی تعلیمی حیثیت کے اعتبار سے قرآن کریم حفظ کرانے کے انتظام ۔ طلبہ کے علاوہ عام افراد کے لئے حفظ قرآن کریم کی غرض سے مختلف اداروں کے قیام ۔ قرآن کریم کی طباعت اور اس کو عام کرنے کی پابند ہوگی ۔

دفعہ نمبر ۱۴ ۔ ہر قسم کی بے پردگی پر پابندی ہوگی اور اس سے بچنا لازمی ہوگا ۔ حکومت بے پردگی سے بچاؤ کے شعور کو عام کرنے کے لئے شریعت اسلامیہ کے احکام پر عمل کرتے ہوئے قوانین بنائے گی اور ضروری آرڈی ننس جاری کرے گی ۔

دفعہ نمبر ۱۵ ۔ عربی سرکاری زبان ہوگی اور اسلامی تقویم کی پابندی تمام سرکاری خط و کتابت میں ضروری ہوگی ۔

دفعہ نمبر ۱۶ ۔ تمام امور عوامی مصلحت کے مطابق انجام پائیں گے اور دین ۔ عمل ۔ جان ۔ مال اور عزت کی خصوصی حفاظت کی ضمانت دی جائے گی ۔

دفعہ نمبر ۱۷ ۔ صرف مقاصد کا شریعت اسلامیہ کے مطابق ہونا کافی نہ ہوگا بلکہ ضروری ہے کہ ہر قسم کے حالات میں وسائل بھی شریعت اسلامیہ کے احکام کے مطابق ہی ہوں ۔

باب سوم ۔ اسلامی معاشیات

دفعہ نمبر ۱۸ ۔ اقتصادی نظام شریعت اسلامیہ کے اصولوں پر مبنی، انسانی عزت و وقار اور

سماجی انصاف کا ضامن ہوگا ۔ زندگی میں فکر وعمل کے ذریعے رزق حاصل کرنے کی کوشش کو ضروری قرار دے کر کسب حلال کی حفاظت کی جائے گی ۔

دفعہ نمبر ١٩ ۔ تجارت ، صنعت و حرفت اور زراعت کی آزادی کی شرعی حدود کے اندر ضمانت دی جائیگی ۔

دفعہ نمبر ٢٠ ۔ حکومت اقتصادی ترقی کے لئے سریعت اسلامیہ کے مطابق منصوبے بنائے گی ۔

دفعہ نمبر ٢١ ۔ حکومت ذخیرہ اندوزی کا قلع قمع کرے گی اور بلا ضرورت کبھی قیمتوں کے معاملے میں دخل نہیں دے گی ۔

دفعہ نمبر ٢٢ ۔ حکومت غیر آباد زمینوں کی آباد کاری کی حوصلہ افزائی اور قابل کاشت اراضی میں کاشتکاری کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کرے گی ۔

دفعہ نمبر ٢٣ ۔ ہر قسم کے خفیہ یا علی الاعلان سودی لین دین پر پابندی ہوگی ۔

دفعہ نمبر ٢۴ ۔ زیر زمین معدنیات اور خام قدرتی دولت حکومت کی ملکیت ہوگی ۔

دفعہ نمبر ٢٥ ۔ ہر وہ چیز جس کا کوئی مالک نہ ہو بیت المال کی ملکیت ہوگی اور اسے افراد کی ملکیت میں دینے کے لئے قانون بنایا جائے گا ۔

دفعہ نمبر ٢٦ ۔ حکومت زکوٰۃ کو جو اسے افراد کی جانب سے وصول ہوگی شرعی مصارف میں خرچ کرے گی ۔

دفعہ نمبر ٢٧ ۔ نیک کاموں کے لئے وقف کرنا جائز ہے اور تمام ملک میں اس کی تنظیم کے لئے قانون بنایا جائے گا ۔

باب چہارم ۔ شخصی آزادیاں اور حقوق

دفعہ نمبر ٢٨ ۔ عدل و مساوات حکومت کی بنیاد ہے شخصی حقوق کے دفاع اور اس کے مطالبے کے حق کی ضمانت دی جائے گی اور اسے نقصان پہنچانا جرم ہو گا۔

دفعہ نمبر ٢٩ ۔ دینی و فکری عقیدہ ، اس پر آزادی سے عمل درآمد ، تحریر و تقریر کے

ذریعہ اس کا اظہار ، مختلف تنظیمیں اور ٹریڈ یونینیں بنانا اور ان کی رکنیت ، شخصی آزادی ، آزادی نقل مکان اور انعقاد اجتماع ، یہ سب فطری اور بنیادی حقوق ہیں جن کی حکومت شرعی حدود کے اندر ضمانت دے گی ۔

دفعہ نمبر ۳۰ ۔ رہائش ، خط و کتابت اور شخصی معاملات آزاد ہوں گے ۔ انکا تجسس ممنوع ہوگا ۔ اس آزادی پر کسی بہت بڑی خیانت یا اچانک خطرے کے لاحق ہونے کی صورت میں پابندی کا قانون تعین کرے گا اور حکومت اس پابندی کا استعمال عدالتی حکم کے بغیر نہیں کر سکے گی ۔

دفعہ نمبر ۳۱ ۔ اندرون اور بیرون ملک نقل و حرکت کی عام اجازت ہوگی ۔ عدالتی حکم کے بغیر جس میں اسباب کی وضاحت کر دی گئی ہوگی نہ تو کسی باشندے کو ملک سے باہر سفر کرنے سے روکا جائے گا ، نہ ہی کسی ایک جگہ رہنے کے لئے مجبور کیا جائے گا اور نہ ہی ملک بدر کرنا جائز ہو گا ۔

دفعہ نمبر ۳۲ ۔ سیاسی پناہ گزینوں کی واپسی نا ممکن ہوگی لیکن اخلاقی مجرموں کی واپسی کے لئے متعلقہ ملکوں سے طے شدہ معاہدوں کے تحت کاروائی کی جائے گی ۔

دفعہ نمبر ۳۳ ۔ کسی بھی فرد کو اذیت دینا جرم ہے اس جرم پر دی جانے والی سزا سے اس کے مرتکب کو معاف نہیں کیا جائے گا ۔ مرتکب جرم اور اس میں شریک دونوں مالی نقصان کے ذمہ دار ہوں گے ۔ اگر اس میں کسی سرکاری ملازم کے تعاون ، موافقت یا خاموشی کو دخل ہو تو اسے فوجداری اور دیوانی دونوں اعتبار سے مجرم گردانا جائے گا اور حکومت سب سے برابر پوچھ گچھ کرے گی ۔

دفعہ نمبر ۳۴ ۔ وہ سرکاری ملازم جس کے محکمے میں جرم کا ارتکاب ہو اور وہ اس کا علم ہوتے ہوئے حکاّم تک جرم کی اطلاع نہ پہنچائے تعزیرات کے تحت سزا کا مستوجب قرار پائے گا ۔

دفعہ نمبر ۳۵ ۔ اسلام میں کوئی بھی قتل بغیر قصاص لئے نہیں چھوڑا جائے گا ۔ حکومت

اس مقتول کے ورثاء کو جس کا قاتل معلوم نہ ہو سکے یا مصیبت زدہ افراد کو جن کا نقصان دھندہ معلوم نہ ہو اور اگر معلوم ہو جائے تو اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جو اس کے لئے کافی ہو تو حکومت اپنی طرف سے معاوضہ ادا کرے گی ۔

دفعہ نمبر ۳۶ ۔ ہر آدمی کو اپنے اوپر یا دوسرے پر عائد جرم کے خلاف دفاع کرنے یا اس سے مال کے دھوکہ دھی سے چھن جانے یا کسی حق کے عدم حصول کے خلاف شکایت کرنے کا حق ہے ۔

دفعہ نمبر ۳۷ ۔ حق عمل ، حق کسب اور حق ملکیت کی ضمانت ہوگی اور کوئی بھی شریعت اسلامیہ کے احکام کے بغیر اسے نقصان نہیں پہنچا سکے گا ۔

دفعہ نمبر ۳۸ ۔ عورت کے لئے شریعت اسلامیہ کی حدود میں کام کرنے کی اجازت ہوگی۔

دفعہ نمبر ۳۹ ۔ حکومت املاک کی آزادی ، حق ملکیت اور اس کے احترام کی ضمانت دے گی ۔ کسی بھی ذریعہ سے املاک کی ضبطی ناجائز ہوگی ۔ صرف خاص حالات میں عدالتی حکم کے ذریعے ہی کسی شخص کی نجی املاک کو ضبط کیا جا سکے گا ۔

دفعہ نمبر ۴۰ ۔ کسی بھی شخص کی ملکیت مصلحت عامہ کے بغیر ختم نہیں کی جائے گی اور مصلحت عامہ کی صورت میں اسے رائج الوقت قانون کے مطابق اس کا پورا پورا معاوضہ دیا جائے گا ۔

دفعہ نمبر ۴۱ ۔ اخبار نکالنے کی عام اجازت ہوگی اور صحافت کو شریعت کی مقرر کردہ حدود کے اندر مکمل آزادی حاصل ہوگی ۔

دفعہ نمبر ۴۲ ۔ عوام کو قانون میں بیان کردہ طریقوں کے مطابق مختلف تنظیمیں اور ٹریڈ یونینیں بنانے کا حق ہوگا ۔ لیکن جس کی سرگرمیاں معاشرے کے نظم و ضبط کے خلاف ہوں یا زیر زمین مسلح شکل میں ہوں یا کسی بھی وجہ سے احکام شریعت اسلامیہ کے خلاف ہوں اس پر پابندی لگائی جائے گی ۔

دفعہ نمبر ۴۳ ۔ ان تمام حقوق کا استعمال شریعت اسلامیہ کے مقاصد کے لئے ہوگا ۔

پانچواں باب ۔ امام (سربراہ مملکت)

دفعہ نمبر ۴۴ ۔ ملک کا ایک امام (سربراہ) ہوگا جس کی رائے کی مخالفت کے باوجود اطاعت لازمی ہوگی ۔

دفعہ نمبر ۴۵ ۔ رب العالمین کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں اور نہ ہی امام کی کسی ایسے اس حکم میں اطاعت کی جا سکتی ہے جو شریعت اسلامیہ کے صریح مخالف ہو ۔

دفعہ نمبر ۴۶ ۔ قانون میں امام کے انتخاب کے لئے عام بیعت (انتخاب) کے طریقے کی وضاحت کر دی جائے گی ۔ یہ عدلیہ کی زیر نگرانی مکمل ہوگی اور اس میں حصہ لینے والوں کی مطلوبہ کثرت رائے کا اعتبار کیا جائے گا ۔

دفعہ نمبر ۴۷ ۔ مملکت کی سربراہی کے امیدوار کا مسلمان مرد ، عاقل ، بالغ ، صالح ، اور شریعت اسلامیہ کے احکام کا عالم ہونا شرط ہے ۔

دفعہ نمبر ۴۸ ۔ امام کی تقرری امت کے تمام گروہوں کی عام بیعت کے ذریعے حسب قانون انجام پائے گی ۔ عورت کے لئے جائز ہے کہ انتخاب میں شرکت کا حق طلب کرے جب کہ اس کی شرائط پوری ہوں اور انتخاب ممکن ہو ۔[۱]

دفعہ نمبر ۴۹ ۔ بیعت مکمل ہونے سے پہلے امام کی بیعت کی مخالفت کرنے والے کی کوئی باز پرس نہیں کی جا سکتی ۔

دفعہ نمبر ۵۰ ۔ بیعت میں شریک ہونے والوں کو امام کو اس کے منصب سے جب اس کے اسباب پورے ہوں قانون میں بیان شدہ طریقے سے الگ کرنے کا اختیار ہوگا ۔

دفعہ نمبر ۵۱ ۔ امام عدلیہ کے تابع ہوگا اور بذریعہ نائب اس کے سامنے حاضر ہوگا ۔

دفعہ نمبر ۵۲ ۔ سربراہ مملکت تمام حقوق و واجبات میں عام باشندوں ہی کی طرح ہوگا لیکن مالی معاملات میں اس کے اختیار کا تعین قانون کرے گا ۔

دفعہ نمبر ۵۳ ۔ کسی کا امام کے لئے وصیت کرنا ، اس کے حق میں یا اس کے چوتھے درجے تک کے رشتہ داروں کے حق میں وقف کرنا ناجائز ہوگا ۔ امام جس کا وارث ہو اس کی طرف سے وصیت جائز ہے ۔ امام کے لئے ملکی املاک کی خرید و

---

۱ ۔ کمیٹی کی رائے میں عورت سے متعلق جملہ مزید تحقیق و بحث کا محتاج ہے ۔

فروخت اور اس کا کرایہ پر لینا یا دینا ناجائز ہوگا ۔

دفعہ نمبر ۵۴ ۔ امام کو تحفے تحائف دینا رشوت شمار ہوگی اور انہیں بیت المال میں جمع کر دیا جائے گا ۔

دفعہ نمبر ۵۵ ۔ امام کو عدل و انصاف ، احسان اور نیک عمل میں رعایا کے لئے ایک نمونہ ہونا چاھئے وہ دوسرے مسلمان رھنماؤں کے ساتھ اسلامی جماعت کو پیش آمدہ مسائل کے حل میں شریک رھے گا ۔ اسی طرح ہر سال حج کے لئے وفد بھیجے گا اور اس کے ذریعے سرکاری اور غیر سرکاری اجتماعات میں شرکت کرے گا ۔

دفعہ نمبر ۵۶ ۔ امام دشمن سے جہاد کے لئے لشکر کی قیادت ، سرحدوں اور وطن کے دفاع ، شرعی حدود کے قیام اور معاھدے کرنے کا ذمہ دار ہے ۔

دفعہ نمبر ۵۷ ۔ امام افراد اور جماعت دونوں کو نیکی کا حکم دینے ، برائی سے روکنے اور فرائض کی ادائیگی کے قابل بنانے کا ذمہ دار ہے ۔

دفعہ نمبر ۵۸ ۔ امام سرکاری ملازمین کا تقرر کرے گا اور وہ اعلی درجے کے ملازمین کے علاوہ دوسروں کی تقرری کا قانونی اختیار کسی دوسرے کو بھی تفویض کر سکتا ہے ۔

دفعہ نمبر ۵۹ ۔ شرعی حدود کے سوا کسی بھی جرم کو قانون ھی کے ذریعہ معاف کیا جا سکے گا اور امام کو شرعی حدود اور خیانت عظمی کے سوا خاص حالات میں سزا کو معاف کرنے کا اختیار ہے ۔

دفعہ نمبر ۶۰ ۔ امام کو قانون میں بیان کردہ استثنائی تدابیر اختیار کرنے کا حق ہوگا خاص کر جبکہ ملک میں اضطراب و بے چینی پھیل جائے یا پھیلنے کا خطرہ ہو ، پورا ملک خطرے میں ہو ، خانہ جنگی ہو جائے ، یا کسی دوسرے ملک سے جنگ چھڑ جائے بشرطیکہ وہ ان تدابیر کو پندرہ دن کے اندر مجلس نمائندگان کے سامنے پیش کرے ۔ اگر مجلس کا انتخاب نہ ہوا ہو تو سابقہ مجلس ھی بلائی جائیگی اور اگر وہ یہ کاروائی نہ کریگا تو یہ تدابیر خود بخود کالعدم ہو جائیں گی ۔ ان غیر معمولی تدابیر ، ان سے پیدا شدہ نتائج ان سے متعلقہ تمام معاملات غیر متعین ہونے کی صورت میں ایک

قانون بنایا جائے گا ۔

باب ششم ۔ عـــدلیہ

دفعہ نمبر ٦١ ۔ قاضی شریعت اسلامیہ کے احکام کے مطابق عدل و انصاف سے فیصلے کریں گے ۔

دفعہ نمبر ٦٢ ۔ تمام لوگ عدالت کے سامنے برابر ہیں اور کسی شخص یا گروہ کو خصوصی عدالت کے ذریعہ ممیز کرنا ناجائز ہوگا ۔

دفعہ نمبر ٦٣ ۔ خصوصی عدالتوں کا قیام اور کسی بھی فیصلے میں مدعی کو اس کے قانون میں مقرر شدہ قاضی سے محروم کرنا ناجائز ہوگا ۔

دفعہ نمبر ٦٤ ۔ عدالت کو امام یا حاکم کے خلاف کسی دعوے کی سماعت سے روکنا ناجائز ہوگا ۔

دفعہ نمبر ٦٥ ۔ تمام احکام کا اجراء اور نفاذ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھ ہوگا اور قاضی اپنے فیصلوں میں شریعت اسلامیہ کے علاوہ کسی دوسری شریعت کا تابع نہ ہوگا ۔

دفعہ نمبر ٦٦ ۔ احکام کا نفاذ حـــکومت کی ذمہ داری ہے اور اس سے روکنا یا اس کے نفاذ میں تاخیر قابل مواخذہ جرم ہے ۔

دفعہ نمبر ٦٧ ۔ حکومت عدلیہ کی آزادی کی ضمانت دے گی اور اس آزادی کو نقصان پہنچانا جرم ہوگا ۔

دفعہ نمبر ٦٨ ۔ حکومت عدالتوں کے لئے اہل ترین افراد کا انتخاب کرے گی اور ان کے فرائض کی ادائیگی کو آسان بنائے گی ۔

دفعہ نمبر ٦٩ ۔ شرعی حدود کے جرائم میں ضروری ہے کہ ملزم اپنے وکیل کے ساتھ عدالت میں حاضر ہو اور اگر اس کا وکیل نہ ہو تو حکومت اس کو وکیل مہیا کرے گی ۔

دفعہ نمبر ٧٠ ۔ عدالتی کاروائی کھلی ہوگی ۔ اس میں ہر شخص حاضر ہو سکے گا اور کس شرعی ضرورت کے بغیر اس کی بند کمرے میں کاروائی نہ ہوگی ۔

دفعہ نمبر ٧١ ۔ شرعی حدود کی سزائیں زنا ، قذف، چوری ، حرابہ، شراب نوشی اور

ارتداد کے جرائم میں نافذ ہوں گی ۔

دفعہ نمبر ۷۲ ۔ شرعی حدود کے جرائم کے علاوہ قاضی جو تعزیرات نافذ کرے گا ان کی قانون میں وضاحت کر دی جائیگی ۔

دفعہ نمبر ۷۳ ۔ قانون میں احکام قسامہ کی وضاحت کر دی جائے گی اور ان میں مجموعی تاوان دیات کی مقررہ مقدار سے زیادہ نہیں ہو سکے گا ۔

دفعہ نمبر ۷۴ ۔ قانون میں توبہ کے قبول کرنے کی شرائط اور اس کے احکام کی وضاحت کر دی جائے گی ۔

دفعہ نمبر ۷۵ ۔ سزائے موت صرف مصالحت کا امکان ختم ہو جانے یا مقتول کے ورثاء کی طرف سے عدم معافی کی صورت میں دی جائے گی ۔

دفعہ نمبر ۷۶ ۔ قصاص کے معاملہ میں ایک دیت کی مقدار سے زیادہ پر مصالحت جائز ہوگی ۔

دفعہ نمبر ۷۷ ۔ دیت کے معاملہ میں عورت اور مرد کے درمیان میں مساوات جائز ہوگی ۔

دفعہ نمبر ۷۸ ۔ زخموں کے قصاص میں مکمل مماثلت ضروری ہے اور اس کا تیقن عدالت میں ہی ہو سکتا ہے ۔

دفعہ نمبر ۷۹ ۔ کوڑوں کی سزا تعزیرات میں بنیادی سزا ہوگی اور محدود مدت کے لئے سزائے قید سوائے جرائم کے ممنوع ہوگی جس کی وضاحت قاضی کرے گا ۔

دفعہ نمبر ۸۰ ۔ قیدی کی تذلیل ، اس کو ذہنی اذیت دینا اور اس کے عزت و وقار کو نقصان پہنچانا ناجائز ہوگا ۔

دفعہ نمبر ۸۱ ۔ ایک اعلی دستوری عدالت قائم کی جائے گی جس کا کام شریعت اسلامیہ اور اس دستور سے متعارض تمام احکام کو کالعدم کرنا ہوگا اور اس کے علاوہ اس کی دوسری ذمہ داریوں کی وضاحت کر دی جائے گی ۔

دفعہ نمبر ۸۲ ۔ ظلم کے خلاف شکایات سننے کے لئے ایک محکمہ قائم کیا جائے گا اور قانون میں اس کی تشکیل ، اس کی ذمہ داریوں اور اس کے ملازمین کی تنخواہوں وغیرہ کا تعین کیا جائے گا ۔

باب ہفتم ۔ شوریٰ ، نگرانی اور قانون سازی

دفعہ نمبرلا ۸۳ ۔ ملک میں ایک مجلس شوری ہوگی جس کو مندرجہ ذیل اختیارات حاصل ہوں گے ۔

۱ ۔ ایسے قوانین بنائے گی جو شریعت اسلامیہ سے متعارض نہ ہوں ۔

۲ ۔ ملک کے سالانہ بجٹ اور اس کے اختتامی حسابات کی پڑتال اور تصدیق کرے گی ۔

۳ ۔ قانون کا نفاذ کرنے والے با اختیار اداروں کی جملہ کاروائیوں کی نگرانی کرے گی ۔

۴ ۔ کابینہ کے فرائض اور ذمہ داریوں کا تعین کرے گی اور بوقت ضرورت اس کابینہ سے اپنا اعتماد واپس لے لے گی ۔

دفعہ نمبر ۸۴ ۔ قانون میں شوریٰ کے انتخاب کی شرائط ، مجلس سوری کو وجود میں لانے کے طریقہ کار اور اس کے ارکان کی شرائط کو متعین کر دیا جائے گا ۔ یہ سب شوری کی بنیاد پر اس طرح ہوگا کہ اس میں ہر عاقل بالغ اور اچھی شہرت رکھنے والے کو اظہار رائے کی ضمانت دی جائے گی ۔ اسی طرح مالی اعتبار سے ارکان مجلس کے معاملے کو واضح کر دیا جائے گا لیکن مجلس اپنا طریقہ کار اور قواعد ضوابط خود طے کرے گی ۔

باب ہشتم ۔ حکـــــومت

دفعہ نمبر ۸۵ ۔ حکومت تمام سرکاری معاملات انجام دینے والے اداروں کی نگران اور شریعت میں مسلمہ مفاد عامہ کے حصول کی ذمہ دار ہوگی اور امام (سربراہ مملکت) کے سامنے جواب دہ ہوگی[۱]

دفعہ نمبر ۸۶ ۔ وزراء کے تقرر کی شرائط، منصب پر فائز رہنے کے دوران ان کے لئے ممنوع کام اور ان کے ارتکاب کی صورت میں ان کے محاسبے کا طریقہ کار قانون میں متعین کر دیا جائے گا ۔

---

۱ ۔ جن ملکوں میں مجلس سوری نہ ہو وہاں یہ جملہ حذف کر دیا جائے گا ۔

باب نہم ۔ عمومی وقتی امور

دفعہ نمبر ۸۷ ۔ .... شہر ملک کا دار الحکومت ہوگا ۔

دفعہ نمبر ۸۸ ۔ ملک کے جھنڈے ، اس کے نشان اور ان دونوں سے متعلق ضروری امور کی قانون میں وضاحت کر دی جائے گی ۔

دفعہ نمبر ۸۹ ۔ قوانین پر عمل ان کے نفاذ کی تاریخ سے ہوگا ۔ اس تاریخ سے پہلے عمل صرف اسی وقت ہوگا جب اس کی صراحت کر دی گئی ہو اور اس کے لئے مجلس نمائندگان کے ایک تہائی ارکان کی منظوری لازمی ہوگی لیکن فوجداری مقدمات سے متعلق قانون کا نفاذ تاریخ نفاذ ہی سے ہوگا ۔

دفعہ نمبر ۹۰ ۔ قوانین جاری ہونے کے دو ہفتے کے اندر اندر سرکاری گزٹ میں شائع کئے جائیں گے ۔ اور ان کے شائع ہونے کی تاریخ سے ایک ماہ کے بعد اگر کوئی دوسری میعاد مقرر نہ کی گئی ہو تو ان پر عمل ہوگا ۔

دفعہ نمبر ۹۱ ۔ امام اور مجلس نمائندگان دونوں کو دستور کی کسی دفعہ یا دفعات میں ترمیم کے لئے مطالبہ کا حق ہوگا لیکن درخواست میں مطلوبہ دفعہ اور اس میں ترمیم کی وجوہ و اسباب کا بیان کرنا ضروری ہوگا ۔ اگر درخواست مجلس نمائندگان کی طرف سے ہو تو ضروری ہے کہ کم از کم مجلس کے ایک تہائی ارکان نے اس پر دستخط کئے ہوں ۔ مجلس ہر حالت میں ترمیم طلب دفعہ پر بحث کرے گی اور اپنے ایک تہائی ارکان کی کثرت رائے سے اس پر فیصلہ دے گی ۔ اگر اس تجویز کو مسترد کر دیا گیا تو دوبارہ اسی دفعہ میں ترمیم کے لئے ایک سال سے پہلے تجویز پیش نہیں کی جا سکے گی ۔ اور اگر مجلس اس سے اتفاق کر لے تو موافقت کی تاریخ سے دو ماہ کے بعد اس مطلوبہ ترمیم طلب دفعہ پر بحث ہوگی ۔ مجلس کے ارکان کے دو تہائی حصے کی اتفاق رائے کی صورت میں اسے امت کے سامنے استصواب رائے کے لئے پیش کیا جائے گا ۔ اگر استصواب رائے کا نتیجہ ترمیم کے حق میں ہوا تو استصواب کے نتیجے کے اعلان کے ساتھ ہی اسے نافذ سمجھا جائے گا ۔

دفعہ نمبر ۹۲ ۔ اس دستور کے اجراء سے پہلے کے تمام قوانین اور قواعدوضوابطاصحیح (valid) اور نافذ رهیں گے لیکن دستور میں مقرر کردہ طریقہ کار بیان شدہ قواعد و ضوابط کے مطابق ان کو کالعدم کیا جا سکے گا یا ان میں ترمیم کی جائے گی ۔ اگر یہ قوانین یا قواعد و ضوابط شریعت اسلامیہ کے احکام کے مخالف ہوں تو ان کو کالعدم کرنا یا ان کو دوسرے قوانین سے بدلنا لازمی ہوگا ۔

دفعہ نمبر ۹۳ ۔ اس دستور پر عمل درآمد استصواب کے ذریعہ امت کی جانب سے اس کی منظوری کے اعلان کے بعد ہوگا ۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

★ ★ ★ ★ ★

فراہی کے دو نایاب فارسی ترجمے
"بدء الاسلام" اور "طبقات ابن سعد"

شرف الدین اصلاحی

میرا خیال ہے کہ فراہی کی یہ سب سے پہلی مطبوعہ کتابیں ہیں۔ اب تک ہم ان کے فارسی دیوان کو ان کی سب سے پہلی مطبوعہ کتاب سمجھتے رہے جو ۱۹۰۳ء میں پہلی بار مطبع شمسی حیدر آباد دکن سے "دیوان حمید" کے نام سے شائع ہوا جب وہ سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی میں استاد تھے۔ مگر ان دو ترجموں کی دریافت کے بعد یہ نظریہ غلط ہو گیا ہے کہ ان کی سب سے پہلی مطبوعہ کتاب دیوان حمید ہے۔ فارسی ترجمہ رسالہ بدء الاسلام اور فارسی ترجمہ طبقات ابن سعد دیوان سے تقریباً بارہ سال پہلے اس زمانے میں طبع ہوئے جب فراہی ایم اے او کالج علی گڑھ میں ایف اے کے طالب علم تھے۔ غالب ہے کہ سرسید اور شبلی کی فرمائش پر انہوں نے یہ ترجمے کالج کے طلبہ کے لئے تیار کئے۔

کالج میں داخلے سے پہلے وہ عربی فارسی کی تکمیل کر چکے تھے اور ان دو زبانوں میں ان کی صلاحیت اس درجے کی تھی کہ سرسید نے ان کو ان دونوں کلاسوں سے مستثنیٰ کرنے کی سفارش کی۔ سرسید ان دونوں زبانوں میں مولانا کی صلاحیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے بلاتأمل کالج کے پرنسپل مسٹر بیک کو یہ رقعہ لکھکر بھیجا کہ میں آپکے پاس ایک ایسے طالب علم کو بھیج رہا ہوں جس کی استعداد اور قابلیت ان دو زبانوں میں کالج کے اساتذہ سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ بات مسٹر بیک کو ناگوار گزری اور انہوں نے کالج کے اساتذہ سے اس کی شکایت کی۔ شبلی کے پاس گئے تو انہوں نے کہا دوسروں کے لئے یہ بات توہین کی ہو سکتی ہے میرے لئے تو فخر کی بات ہے اس لئے کہ جس طالب علم کے بارے میں سرسید کا یہ خط ہے وہ ان دونوں زبانوں میں میرا شاگرد ہے۔ یہ قصہ مولانا امین احسن اصلاحی نے مجموعہ تفاسیر فراہی کے دیباچے میں نقل کیا ہے۔ اس پس منظر میں یہ بات بالکل قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ سرسید اور شبلی نے کالج کی نصابی ضرورت کے لئے طالب علم

فراھی سے یہ کام کروایا ھوگا ۔

مولانا فراھی کی سوانح سے متعلق قابل ذکر قسم کی معلومات اب تک اصلاً دو ھی آدمیوں نے بہم پہنچائی ھیں ۔ ایک سید سلیمان ندوی نے دوسرے امین احسن اصلاحی نے ۔ سید صاحب نے ان کی وفات پر ایک مقالہ سپرد قلم کیا اور اصلاحی صاحب نے مجموعہ تفاسیر فراھی کے دیباچے میں اپنی یاد داشت کی مدد سے کچھ حالات مختصراً درج کیے ۔ ان دونوں بزرگوں نے ان کی تصانیف میں ان دونوں کتابوں کا سرسری ذکر کیا ہے ۔ یہ کتابیں نایاب بلکہ نابید ھو چکی تھیں ۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ان کا ایک ایک نسخہ علی گڑھ یونیورسٹی کی آزاد لائبریری میں موجود تھا ۔ مجھے ان کی موجودگی کا علم سب سے پہلے ڈاکٹر مظفر بکھراوی کے ایک خط سے ھوا جو اتفاق سےمدرسۃالاصلاح کے دفتر کے کباڑ خانے میں یوں ھی میرے ھاتھ لگ گیا ۔ یہ خط ڈاکٹر مظفر نے مولانا بدر الدین اصلاحی ناظم مدرسہ کو علی گڑھ سے اس زمانے میں لکھا تھا جب وہ طبیہ کالج علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے ۔ انھی نے ان کتابوں کو پہلے پہل دریافت کیا اور اس کی نقلیں دائرہ حمیدیہ کو مہیا کیں ۔ اگر ڈاکٹر مظفر کا یہ خط مجھے نہ ملتا تو شاید میں بھی ان کی موجودگی سے بے خبر ھی رھتا ۔ یہ کتابیں اس لحاظ سے کوئی اھم چیز نہیں ھیں کہ مولانا کے فکر اور اصل کام سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے مگر ان کے سوانح نگار کو بہر حال ان کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچانی چاھئے ۔ اور اس لحاظ سے ان کی اھمیت بہر حال مسلم ہے کہ وہ مولانا کے علمی سفر اور ذھنی ارتقاء کے مدارج میں سے ایک درجہ بلکہ اس کی پہلی منزل ہے ۔ ان کتابوں سے جہاں عربی فارسی میں طالب علم فراھی کی استادانہ مہارت اور ترجمہ کی ماھرانہ صلاحیت کا اندازہ ھوتا ہے وھاں ان کے مزاج اور افتاد طبع کا رخ بھی متعین ھوتا ہے ۔ یہ کتابیں جیسا کہ سید سلیمان ندوی اور مولانا اصلاحی نے لکھا ہے مولانا فراھی نے سرسید کی فرمائش پر ترجمہ کیں مگر انھی فراھی سے جب سرسید کی تفسیر کا ترجمہ کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے معذرت کر دی ۔ ملاحظہ ھو دیباچہ مجموعہ تفاسیر فراھی صفحہ ۲۷ ۔ قبول و انکار کا یہ فرق فراھی کے عرفان نفس اور شعور ذات کا غماز ہے ۔ اخوان علی گڑھ کو اس کے ماننے میں تامل ہے ۔ مولانا اصلاحی نے اس روایت کا ذریعہ نہیں بتایا ۔

ذیل میں ان ھر دو کتابوں کا قدرے مفصل تذکرہ کیا جاتا ہے :-

ترجمۂ فارسی رسالہ بدء الاسلام

"تاریخ بدأ الاسلام" کے نام سے شبلی نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی پروفیسری کے زمانے میں قرآنی آیات اور کتب سیرت مثل تاریخ ابوفداء ، شفاء لقاضی عیاض اور کامل لابن الاثیر سے انتخاب کرکے عربی میں ایک رسالہ مرتب کیا ۔ جو مطبع مفید عام آگرہ سے چھپا ۔ شبلی کا یہ رسالہ بھی نایاب ہے ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی آزاد لائبریری میں اس کا ایک نسخہ البتہ موجود ہے ۔ اس کا سرورق یوں ہے ،

"تاریخ بدأ الاسلام

لمولانا و بالفضل اولٰنا الادیب الاریب محمد سبلی النعمانی

پروفیسر مدرسة العلوم علیگڑھ

مقتبساً من آیات القرآن ۔ و ملتقطاً من کتب العلماء

ذوی الصدق والایقان کتاریخ

ابی الفداء والشفاء لقاضی عیاض والکامل لابن الاثیر

طبع فی المطبع مفید عام الکائن فی بلدة اکبر آباد"

شبلی کے اصل عربی رسالے پر بھی تاریخ طباعت درج نہیں ۔ اس کے صفحات کی تعداد ۵۴ ہے ۔

کتاب شروع کرنے سے پہلے کے تعارفی کلمات جس کو آج کی زبان میں پیش لفظ کہہ سکتے ہیں لائق توجہ ہیں ۔

"الحمد لله رب العالمین والصلوة علی رسوله سیدنا محمد خاتم النبیین وعلی آله و اجمعین و بعد فهذه نبذة من وقائع النبوة و جملة من حوادث الرسالة جردتها من تاریخ ابی الفداء و الکامل لابن الاثیر والشفاء لقاضی عیاض و اقتبست شیئاً صالحاً من آیات القرآن فجاء ت مع کونها جزءاً من کل وغیضا من فیض ۔ کافلة للقدر الواجب جامعة لشتات المطالب ۔ فاما الاسفار التی دونت فی ذالک فهی کساحة الملوک ویقع فیها الجوهر والخذف فلا تجدی الا لمن کان من تنقید الروایة و امعان النظر فی اعلی محل و بلغ فی سعة العلم وجودة الذهن اعظم درجة وابعد غایة واما الذی فاتته دقة النظر وصیانة الرای فه ں ان یحجر عن الاقتحام فی تلک المهامة الفجاء التی یجار فیها القطا و یضربها الخطا و الا فیکون کراکب متن عمیاء بل یخبط خبط عشواء ۔

وها انا معترف حق الاعتراف ان حظی فی جمعها لیس الا التالیف المحض والالتقاط البحت و اصرح انی بعد ماذکرت ابتداء الدعوة جئت بعبارتهم علی اصلها وما زدت علیها شیئاً الا ما الجأنی الیها شان التالیف بین اشتاتها و قصدی اتیان الروایات علی وجوهها وهباتها و نشرع فی المقصود والله الموفق للصواب والیه المرجع والمآب۔

(تاریخ بدأ الاسلام ۔ محمد شبلی نعمانی ۔ مطبع مفید عام آگره)

اسی رسالے کو مولانا فراهی نے فارسی کا جامہ پہنایا ۔ یہ ترجمہ بھی مطبع مفید عام آگره سے چھپا ۔ فارسی اور عربی دونوں ھی نسخوں میں ایسی کوئی داخلی شہادت موجود نہیں جس سے یہ معلوم هوسکے کہ یہ رسالے کس لئے تیار کیے گئے اور کس نے تیار کرائے۔ اندازه ہے کہ یہ کالج کے طلبہ کی درسی ضروریات کیلئے سرسید کی فرمائش پر تیار کیے گئے۔ بعض خارجی شہادتوں سے اسکی تائید هوتی ہے ۔ ان کے سنۂ تالیف یا سنۂ طباعت کا بھی پتا نہیں چلتا ۔ اور نہ ھی یہ معلوم هو سکا کہ یہ کالج کی کس جماعت کے کس نصاب میں پڑھائے جاتے تھے ۔ علی گڑھ کالج کے بعض کارکنوں کی زبانی البتہ اسقدر معلوم هوا کہ یہ کالج کے نصاب میں عرصہ تک داخل رهے اس لئے بار بار ان کی طباعت هوتی رهی ۔ لیکن بار بار طباعت کے باوجود آج یہ رسالے اس طرح ناپید هیں کہ عرصہ دراز تک صرف ان کے نام سے لوگ آگاه تھے ۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں ان کا ایک ایک نسخہ موجود ہے اور راقم نے اپنے سفر هند (فروری ۱۹۸۰ ء) میں ان کو دیکھا اور پڑھا ۔ فوٹو اسٹیٹ کی سہولت نہ هونے کی وجہ سے ان کی نقل حاصل نہیں کی جا سکی ۔ فراهی کے رسالے کا سرورق یوں ہے :۔

"ترجمہ فارسـی

رسالۂ بدء الاسلام

رساله بدء الاسلام درسیرت نبوی علی صاحبها الصلوة والسلام

کہ بزبان عربی از تالیفات مولانا

مولوی محمد شبلی نعمانی بوده است

مولوی محمد عبد الحمید صاحب

آنرا ترجمہ نمودند .

در مطبع مفید عام آگرہ طبع شد»

فراھی کے ترجمہ کے صفحات کی تعداد ۳٦ ہے۔ یہاں فراھی کے نام میں عبد الحمید کے ساتھ محمد بھی لگا ہوا ہے جو بعد کی کتابوں میں نہیں ہے سنہ طباعت درج نہیں ۔ یہاں سرورق نام کے ساتھ لفظ فراھی نہیں ہے جو بعد کی کتابوں میں آتا ہے۔ کتاب کے اصل متن سے پہلے یہ عبارت بھی لائق توجہ ہے :

«نحمدہ و نصلی ۔ من بندہ الٰہی حمید فراھی ۔ این نامہ راکہ برادر معظم مولانا شبلی نعمانی در شرح سیرت نبوی از دفاتر سیر انتخاب زدہ ترتیب دادہ اند از تازی بفارسی در اوردم ۔ و ھذا اوان الشروع فی المقصود» ص ۲

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب کی طباعت کے وقت مولانا نے فراھی لکھنا شروع کر دیا تھا ۔ یہ کتاب عربی میں تھی فراھی نے اس کو فارسی کا جامہ پہنایا ۔ شبلی کے تصنیف کردہ رسالے کا نام «تاریخ بدأ الاسلام » ہے۔ مولانا فراھی کے ترجمے میں عنوان کتاب کے ساتھ تاریخ کا لفظ نہیں ہے ۔ رسالہ کا لفظ ہے ۔

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں یہ دونوں رسالے ، فارسی اور عربی، «کتب محفوظہ» میں رکھے ہوئے ہیں ۔ اور ان کے نمبر درج ذیل ہیں ۔

	ف		ع
فراھی کا ترجمہ فارسی	س	شبلی کا عربی رسالہ	س
	م ۱۹ ش		م ۱۹ ش
	ن ۳		

جہاں تک عربی ٹیکسٹ کا تعلق ہے اس میں شبلی کا کارنامہ فقط اس قدر ہے کہ انہوں نے قرآن حکیم اور کتب سیرت سے اقتباسات اخذ کرکے ان کو مربوط اور مرتب کر دیا ہے۔ اس کی صراحت انہوں نے آغاز کتاب میں خود کر دی ہے۔

مولانا فراھی کا کارنامہ بھی بس اسی قدر ہے کہ انہوں نے اس کو عربی سے فارسی میں منتقل کر دیا ہے۔ شبلی کے پیش لفظ کو انہوں نے ترجمے میں شامل نہیں کیا ہے اور اس کی جگہ اپنی طرف سے یہ دوسطریں لکھ دیں ۔

«من بندہ الٰہی حمید فراھی» . . . الخ

اس رسالے کے سرورق مولانا فراھی کا جو نام چھپا ہے اس میں یہ چیز بطور خاص لائق توجہ ہے کہ عبدالحمید سے پہلے محمد بھی نام کا جزو ہے۔ ھو سکتا ہے یہ طابع اور ناشر کی اختراع ھو۔ نیز یہ کہ کتابوں پر بہت شروع ھی سے حمید الدین کی بجائے عبدالحمید چھپنے لگا تھا۔ اس رسالے پر سن طباعت درج نہیں لیکن قرائن سے معلوم ھوتا ہے کہ یہ رسالہ ترجمہ فارسی طبقات ابن سعد کے ساتھ ھی لکھا گیا۔ طبقات ابن سعد ۱۸۹۱ء میں چھپا اور یہ وہ سال جس میں فراھی نے ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔

مولانا فراھی کی ان دونوں ھی کتابوں پر نام یہی "محمد عبدالحمید" درج ہے جب کہ کالج کے ریکارڈ میں ھر جگہ حمیدالدین ہے۔ مولانا کے ان دو ناموں کا ذکر ان پر قلم اٹھانے والوں میں سے تقریباً سبھی نے کیا ہے اور مختصراً بحث کرکے مسئلہ کو واضح کرنے کی کوشش بھی کی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بات واضح نہیں ھوئی اور یہ مسئلہ ھنوز تحقیق طلب ہے کہ ان میں سے کونسا نام اصل ہے جو والدین نے رکھا اور کونسا بعد کی پیداوار ہے۔ یہ بحث میرے اصل مقالے میں اپنے مقام پر آئے گی جو انشاء اللہ فیصلہ کن ثابت ھوگی۔

اس رسالے میں صفحہ ۲ کی پہلی سطر میں "حمید فراھی" کے ذکر سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا نے اس وقت تک اپنے نام کے ساتھ فراھی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ شبلی کے مرتب کردہ عربی رسالے میں نہایت اختصار کے ساتھ آنحضور کی ولادت سے لیکر وفات تک کے حالات اور اھم واقعات بیان ھوئے ھیں۔ آخر میں اخلاق و شمائل کا ذکر ہے۔ یہ رسالہ سیرۃ النبی کا خلاصہ یا بچہ ایڈیشن ہے۔ بعد میں شبلی نے اسی کو پھیلا کر سیرۃ النبی کا خاکہ تیار کیا۔ اس میں مولانا فراھی کا حصہ اسی قدر ہے کہ انھوں نے اس کو فارسی کے قالب میں ڈھالا۔ اس وقت ڈھالا جب وہ ایم اے او کالج علی گڑھ میں طالب علم تھے۔ اس کو اسی حیثیت سے دیکھنا چاھیئے۔ اس سے مولانا فراھی کی فارسی دانی کا اندازہ ھوتا ہے۔ مولانا کاا ترجمہ خاصا آزاد ہے۔ ترجمہ نہیں ترجمانی ہے۔ وہ عربی عبارت کی بلفظہ پابندی نہیں کرتے۔ اس ترجمے میں گھٹانا بڑھانا دونوں طرح کے تصرفات موجود ھیں —— ذیل میں شبلی کی عربی عبارت کے ساتھ فراھی کی فارسی عبارت بطور نمونہ درج کی جاتی ہے اس سے ترجمے کی نوعیت کا اندازہ ھو جائے گا۔

عـــــــربی اقتباس

"ولما علمت قریش انه قد صار لرسول الله ﷺ انصار خافوا من خروجه الی المدینة فاجتمعوا فی دارالندوہ (وھی دار بناھا قصی بن کلاب و کانت العرب یجتمعون فیھا اذا

کانوا علی امر جامع) فقال بعضهم لبعض ان هذا الرجل قد کان من امره ما کان و ما نامنه ان یثب علینا بمن اتبعه فاجمعوا فیه رایاً فقال بعضهم احبسوه فی الحدید واغلقوا علیه الباب و قال آخر ننفیه من بلدنا ولا نبالی این وقع۔ ـ

(تاریخ بدأ الاسلام ـ محمد شبلی النعمانی ـ مطبع مفید عام الکائن فی بلدۃ اکبر آباد ص ۱۸)

فارسی ترجمہ

«چوں قریش از اسلام انصار آگہی یافتند از غصه دست بہم سودند و بآزار مسلمانان تیر تر گشتند و از رفتن آنحضرت بمدینه اندیشه ناک گشته در دار الندوه کہ خانہ مشوره بود (و آں خانه را قصی بن کلاب طرح افگنده بود و عرب در انجا از بہر شوراے انجمن می گشتند) گرد آمدند باهم گفتند هما نا دیدید که کار ایں مرد از کجا تا کجا رسید ـ اندیشه است که روزے با پیروان خود برما دست تطاول کشد ـ باید کہ همگان رائے بزنیم پس یکے گفت بروے بند نہید و در خانہ اش زندانے کنید دیگر گفت از شہرش بدر سازید و باز نجوئید کہ کجا رفت»۔ ـ

(ترجمہ فارسی رسالہ بدء الاسلام ـ مولوی محمد عبد الحمید ـ مطبع مفید عام آگره ص ۱۲)

اس ترجمے سے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں مولانا فراهی کی اهلیت کا بخوبی اندازه لگایا جا سکتا ہے ـ اس وقت مولانا کی عمر ۳۰ کے لگ بھگ هوگی ـ فراهی نے ۱۶ برس کی عمر میں خاقانی کے تتبع میں قصیده لکھ کر اپنے اساتذه کو حیرت میں ڈال دیا تھا ـ اس لئے فارسی زبان پر ان کی قدرت تو پہلے هی سے مسلم تھی ـ باقی ترجمہ اپنی جگہ ایک الگ فن ہے اور بسا اوقات یہ تصنیف و تالیف سے مشکل هوتا ہے ـ فراهی نے اس کام کو کس طرح انجام دیا نمونہ آپ کے سامنے ہے ـ رسالے میں بیچ میں عربی اشعار جہاں آئے هیں انہیں یوں هی رهنے دیا گیا ہے ـ یعنی ان کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے ـ

ترجمۂ فارسی طبقات ابن سعد

عربی ٹیکسٹ کا سرورق نقل مطابق اصل :ـ

قطعــة

من طبقات محمد بن سعد کاتب الواقدی

فی

بعثۃ رسول اللہ الرسل بکتبه و ذکر وفادات العرب

علی رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم

طبـــع بامـــر
النواب وقار الدوله وقار الملک المولوی
محمد مستاق حسین انتصار جنگ بہادر
لافادة طلاّب مدرسه العلوم علی گڈھ
طبع فی مطبع مفید عام الکائن
فی بلدة اکبـــر آباد
سنـــه ۱۳۰۸ ھ ۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی آزاد لائبریری کے اوریئنٹل سیکشن میں اس کتاب کا نمبر درج ذیل ہے :۔

فارسی ترجمے کا سرورق نقل مطابق اصل :۔

ترجمـــه فارسی بارة
از
طبقات محمد بن سعد کاتب الواقدی
در ذکـــر
فرستادن پیغمبر خدا قاصدا نرا بسوی بادشاهان
و قبائل عرب و رسیدن سفیران عرب
نزد آنحضرت صلی الله علیه و سلم
ترجمـــه نموده
مولوی محمد عبد الحمید صاحب اعظم گڈھی سلّمه الله تعالی
بحکـــم
نواب وقار الدوله وقار الملک مولوی محمد مستاق حسین
انتصار جنگ بہادر بجهت افاده طالب علمان مدرسة العلوم علی گڈھ
۱۸۹۱ ع
در مطبع مفید عام آگره طبع شد ۔

لائبریری میں اس کتاب کا نمبر ہے ف

۹ء ۲۹۷

الف ۱۲ ت

ن ۳

اور صفحات کی تعداد ۱۰۶ ہے۔ سرورق مترجم کا نام خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ یہاں بھی عبدالحمید کی بجائے حمیدالدین ہے اور اسکے ساتھ محمد بھی لگا ہوا ہے۔ محمد کے ساتھ عبدالحمید کہیں اور نظر سے نہیں گزرا۔ ترجمہ کے سرورق کو عربی کتاب کے سرورق سے مقابلہ کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ بالکل آزاد ہے۔ اصل عبارت کی پابندی کو لازم نہیں سمجھا گیا اور بعض جگہ موقع محل کے لحاظ سے اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ مثلاً بعثة رسول الله الرسل بکتبه کا ترجمہ فرستادن پیغمبر خدا قاصد نرا سوی بادشاهان و قبائل عرب " کیا ہے۔ اس میں بسوی بادشاهان و قبائل عرب " اضافہ ہے۔ دوسری طرف بکتبه کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ جو خود بخود سمجھ لیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے قاصد خطوط لے کر ھی جاتے ھیں۔ یہ حذف و اضافہ متن کے مطابق ہے۔ متن میں ملوک اور قبائل عرب کے پاس خطوط لے کر اشخاص کو بھیجنے کا ذکر ہے۔

عربی مس کے ابتداء میں درج مقدمہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مقدمہ بھی مولانا فراھی کا لکھا ہوا ہے۔ قرائن اور داخلی شہادت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ فارسی ترجمے کے سرورق کی عبارت میں جو بعض تصرفات حذف و اضافہ کی صورت میں نظر آتے ھیں وہ مقدمے کی عبارت سے ہم آھنگ ھیں۔

ترجمے میں آخری صفحہ پر حاشیے میں دو سطروں کا ایک نوٹ ہے جو سید احمد کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر سید کی نظر سے یہ ترجمہ گزرا اور انہوں نے ایک نوٹ بھی لکھا ہے۔ پوری کتاب میں صرف یہی ایک نوٹ ہے۔ تلاش کے باوجود کسی دوسرے نوٹ کا سراغ نہیں ملا۔

نوٹ یوں ہے۔

سفیران ملوک و قبائل نزد پیغمبر خدا صلعم آمدند نہ بنزد دیگراں۔ پس فرمودن پیغمبر خدا صلعم کہ ایں سفیر درندگان نزد سما آمده است صریح دلالت میکند کہ اینهمہ کلام مزاحاً بود چنانکہ حضرت صلعم گاه گاه بطور مزاح هم چیزے می فرمود صلی الله علیه و سلم۔

سید احمد

یہ نوٹ وفد السباع کی روایت پر ہے جو اس کتاب کی آخری روایت ہے اور اس کا نمبر ۱۳۶ ہے ۔ سرسید کا یہ نوٹ اصل عربی متن میں نہیں ہے ۔ یہ صرف فراهی کے فارسی ترجمے میں ہے ۔

فراهی کے فارسی ترجمے سے پہلے مناسب ہوگا کہ عربی متن کی نسبت جس سے یہ ترجمہ کیا گیا مختصراً عرض کر دیا جائے ۔ خوش قسمتی سے فارسی اور عربی دونوں هی نسخے مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اورنٹنل سیکشن میں مل گئے اور میں نے ان سے استفادہ کیا ۔ عربی متن کل ۱۲۳ صفحات پر مشتمل ہے ۔ سرنامہ کے بعد صفحہ ۲ ۔ ۳ پر کتاب اور اس کے مصنف کی نسبت تعارفی کلمات هیں جس کے لکھنے والے کا نام درج نہیں ۔ یہ «پیش لفظ» یا «عرض مرتب» قسم کی مختصر تحریر ہے ۔ صفحہ ۴ سے اصل کتاب شروع هوتی ہے ۔ ص ۳۷ تک اس کا ایک جزو ہے جس کا عنوان ہے «ذکر بعثة رسول الله الرسل بکتبه الی الملوک یدعوهم الی الاسلام و ما کتب به رسول الله لناس من العرب وغیرهم»
ص ۳۸ سے ص ۱۲۳ تک اس کا دوسرا جز ہے ۔ اس کا عنوان ہے «ذکر وفادات العرب علی رسول الله صلعم»

پیش لفظ کی ابتدائی سطور سے اس کتاب پر روشنی پڑتی ہے اس لئے اس کو نقل کر دینا مفید هوگا ۔

«و بعد فهذان جزءان من طبقات ابن سعد ۔ الاول فی ارساله صلی الله علیه وسلم الرسل الی الملوک و قبائل العرب ۔ و الثانی فی وفادات العرب علی رسول الله صلی الله علیه و سلم ۔ و لما کان من اهم الامور فی تاریخ الاسلام الاطلاع علی کیفیة شیوع الاسلام فی اقطار العرب وغیرها من الممالک و کان الجزءان المذکوران مشتملین علی اطلاعات مهمة فی هذا الباب امر بطبعهما النواب وقار الملک بهادر لافادة العام ولا سیما لطلبة العلم من جماعة الاسلام نقلاً عن النسخة اللتی طبعت فی جرمن من بلاد اوربا ۔ فانها نسخة رائقة تغلب علی الظن صحتها والثقة بها ۔ ثم ان طبقات ابن سعد کتاب حافل فی خمسة عشر مجلداً و مختصرها اصغر منها وهی ایضا لابن سعد ۔ و لیس القطع بان هذین الجزئین هل من اصل الطبقات ام من مختصرها و ایما کانت فهی من مزید الاعتبار و الثقة برتبة لا یوازیها غیر ها من کتب السیر کسیرة ابن هشام وما یماثلها » ۔ ص ۲ ۔ ۳ ۔

پندرہ جلدوں کی اس ضخیم کتاب سے فقط یہ دو جز کتاب میں آئے هیں ۔ یہ اصل

طبقات سے ماخوذ ہے یا اسکے اختصار سے اسوقت اس سوال کا جواب یقیناً مشکل تھا مگر اب کوئی تحقیق کرنا چاہے تو یہ کام مشکل نہیں رہا ۔ عربی اور فارسی دونوں نسخوں میں سرورق بھی اور متن میں بھی بصراحت مذکور ہے کہ نواب وقار الملک کے حکم سے یہ کتابیں چھاپی گئیں عربی نسخے میں سرورق تاریخ طباعت سنۂ ھجری میں درج ہے جو ۱۳۰۸ھ ہے۔ جبکہ فارسی ترجمہ میں سنۂ عیسوی درج ہے جو ۱۸۹۱ ء ہے۔ تقویم تاریخی کی رو سے یہ دونوں سن ایک ھیں ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ھوا کہ عربی اور فارسی دونوں نسخے ساتھ چھپے ۔ علی گڑھ کالج کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ ۱۸۹۱ میں مولانا نے ایف اے میں داخلہ لیا ۔ متن میں یہ ذکر ہے کہ افادہ عام خاص کر مسلمان طلبہ کے لئے اس کی طباعت کا اہتمام کیا گیا ہے ۔ لیکن سرورق عربی اور فارسی دونوں میں علی الترتیب «لافادة طلاب مدرسة العلوم علیگڑھ » اور بجہت افادہ طالب علمان مدرسة العلوم علیگڑھ کے الفاظ درج ھیں ۔ اس اندراج سے قطعیت کے ساتھ یہ بات مبرھن ھو جاتی ہے کہ یہ کتابیں (عربی فارسی) اصلاً علی گڑھ کالج کے طلبہ کے لئے چھاپی گئیں ۔ رسالہ بدأ الاسلام میں اس طرح کا کوئی اندراج نہیں ہے لیکن طرز اور نمونہ اس کا بھی بالکل یہی ہے اس لئے قیاس ہے کہ وہ بھی اسی مقصد سے اور اسی زمانے میں تیار کرائے گئے ۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے ریکارڈ سے تصدیق کرنے کی کوشش کی گئی مگر اس میں کامیابی نہ ھوئی ۔

جیسا کہ عرض کیا گیا یہ کتاب دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ پہلا جز ان ۵۷ خطوط پر مشتمل ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے سلاطین اور دوسرے لوگوں کو ارسال کئے ۔ دوسرے جز میں عرب کے ان وفود کا ذکر ہے جو آنحضور کی خدمت میں آئے ۔ اور ان کی تعداد ۷۱ ہے۔ سب سے آخر میں وفد السباع کا ذکر ہے۔ طبقات ابن سعد چھپ کر عام ھو چکی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ۔ جہاں تک مولانا فراھی کے ترجمہ فارسی کا تعلق ہے اس کے متعلق بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ۔ نمونةً ذیل میں عربی اور فارسی دونوں کے مختصر «اقتباسات درج کیے جاتے ھیں ۔ فراھی کی فارسیت اور ترجمے ککی اہلیت کا خود ھی اندازہ ھو جائے گا ۔

عربی اقتباس

«وفد ثقیف ۔ اخبرنا محمد بن عمر الاسلمی عن عبد الله بن ابی یحیی الاسلمی عن من اخبرہ قال لم یحضر عروۃ بن مسعود و غیلان بن سلمة حصار الطائف کانا بجرش یتعالمان صنعة

المرادات و المنجنيق والدبابات فقدما و قد انصرف رسول الله عن الطائف فنصبا المنجنيق و المرادات و الدبابات و اعدا للقتال ثم القى الله فى قلب عروة الاسلام وغيره عما كان عليه فخرج الى رسول الله فاسلم ثم استاذن رسول الله فى الخروج الى قومه ليدعوهم الى الاسلام فقال انهم اذا قاتلوک قال لأنا احب اليهم من ابكار اولادهم ثم استاذنه الثانية ثم الثالثة فقال ان سئت فاخرج فخرج فسار الى الطائف خمسا فقدمم عشاءً فدخل منزله فجاء قومه فحيوه بتحية الشرک فقال عليکم بتحية اهل الجنة السلام ودعاهم الى الاسلام » ۔

(قطعة من طبقات محمد بن سعد كاتب الواقدى ص ٨١ طبع فى مطبع مفيد عام الكائن فى بلدة اكبر آباد سنة ١٣٠٨هـ)

فارسی تـــــرجمـہ

«سفارت ثقیف ۔ آورده اند کہ عروه بن مسعود و غیلان بن سلمه در محاصرۂ طائف نبودند۔ ودر مقام جرس فن فلاخن و سنگ انداز و دبابه می آموختند ۔ و چوں پیغمبر خدا از طائف باز می آمد فلاخن و سنگ انداز و دبابه را بر بائے کردند و بآهنگ بر خاش برخاستند ۔ مگر خدایتعالی دل عروه را بگردانید و خواهش اسلام درو افگند تاسوئے پیغمبر خدا آمد و اسلام گرفت و دستوری خواست تا بسوئے قوم خود باز رود وایشاں را سوئے اسلام بخواند ۔ آنحضرت فرمود باتو بجنگ بر خیزند ۔ گفت مرا از فرزندان خود عزیز تر دارند ۔ وچوں سہ بار پرسید ۔ آنحضرت فرمود اگر رفتن خواهی برو۔ عروه روانہ شد تابس از پنج روز بهنگام شام بہ طائف رسید و بمنزل خود در آمد مردماں بدیدارش آمدند و بهنجار مشرکان آبادس گفتند ۔ عروه گفت بآئین بهشتیاں سلام گوئید و ایشاںرا سوئے اسلام بخواند » ۔

(ترجمہ فارسی ، پاره از طبقات محمد بن سعد کاتب الواقدی ص ٦١)

رسالہ بدء الاسلام کے برعکس اس کتاب میں فراهی نے اشعار کا بھی ترجمہ کر دیا ہے۔ جیسا کہ ان اقتباسات سے ظاهر ہے فراهی نے ترجمے میں سند کو حذف کر دیا ہے اور اس کی جگہ «آورده اند» کہہ کر بات شروع کر دی ہے۔ طلبہ کے لئے اس کی ضرورت نہ تھی۔ اصل کی پابندی سے بے نیازی نے ترجمہ کو آزاد بنا دیا ہے اس ترجمے کی خوبی کے متعلق سید صاحب کا ایک فقره نقل کرکے بات ختم کرتا هوں۔ «اس کی زبان ایسی ہے کہ معلوم هوتا ہے کہ عہدِ سامانی کا کوئی نثر نویس فارسی لکھ رہا ہے » ۔ یادرفتگان ص ١٣٢ ۔

مولانا فراهی کی ان دونوں کتابوں کے سرورق اور ابتدائی دو صفحات بصورت عکس ملاحظہ هوں۔

* * * * * * *

ترجمۂ فارسی

رسالۂ بدء الاسلام

رسالہ بدء الاسلام در سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کہ
بزبان عربی از تالیفات مولانا مولوی محمد شبلی نعمانی بودہ است

مولوی محمد عبد الحمید صاحب

آنرا ترجمہ نمودند

در مطبع مفید عام آگرہ طبع شد
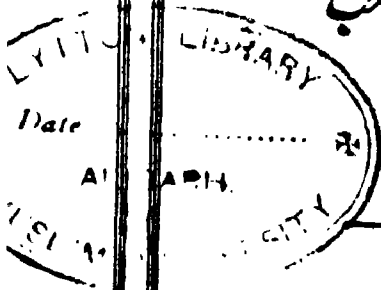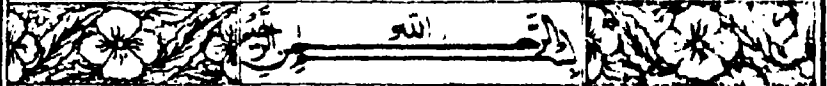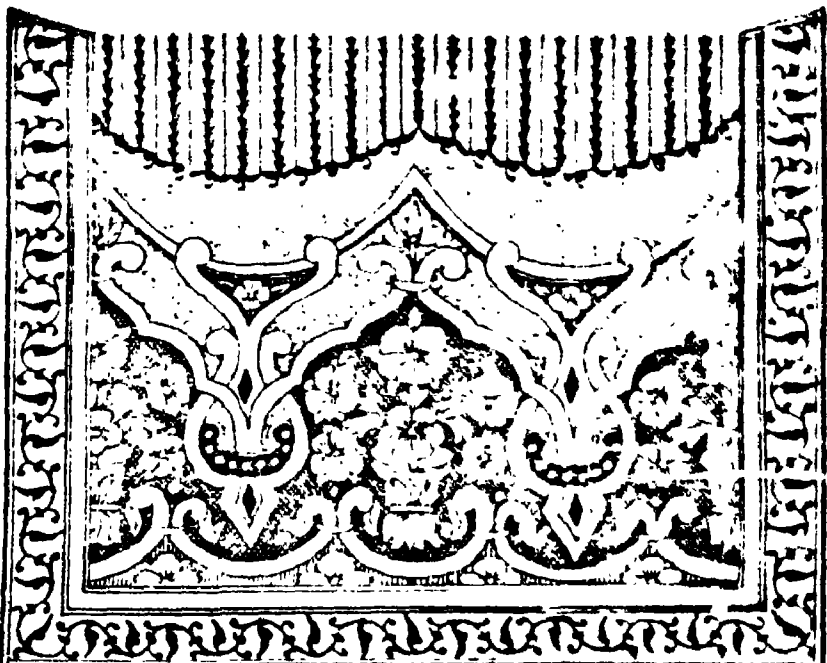
نحمده ونصلی - من بنده آلی حمید فراهی - این نامه را که برادر معظم مولانا شبلی نعمانی در شرح سیر نبوی از دفاتر سیر انتخاب زده ترتیب داده اند از تازی بفارسی در آوردم - وهذا اوان الشروع فی المقصود

ولادت آنحضرت صلی الله علیه وسلم

پیغمبر خدا محمد مصطفی در سنه ۴۰ از حکومت کسری تولد فرمود پدر آنجناب عبدالله بن عبدالمطلب بود و مادر آمنه بنت وهب و دایه حلیمه سعدیه - آنحضرت دو ماهه بود که عبدالله بمرد و هشت سال پس از واقعه فیل عبدالمطلب هم براه عدم شتافت و ابوطالب را وصیت کرد تا آنحضرت را در کنار مهر پرورد چون آنحضرت به آغاز جوانی رسید آوازه پاکیزه خوئی و راستکاری آنجناب آویزه گوش هر پیر و برنا شد تا آنکه امین یعنی راستبازش میخواندند و هم ازینجا خدیجه که بانوی با شرافت و دولت بود کار تجارتی را بجناب بسپرد آنحضرت پذیرفت و متاعش بشام برده در آن بازرگانی سود برداشت

چون باز آمدند و خدیجه در کار آنجناب صدق و صفا بیش از آن دید که گمان داشت درخواست کرد
تا حلیلهٔ آنحضرت باشد۔ پس آنحضرت با اعمام خود ابوطالب و حمزه و چند دیگر کسان پیش پدرش
که خویلد بن اسد بود رفتند تا عقد نکاح بخدیجه بسته شد۔ از خدیجه زینب و رقیه و ام کلثوم
و فاطمه و قاسم (که بدان کنیت میفرمود) و طاهر و طیب بوجود آمد۔ پسران آنجناب پیش از
هنگام پیغمبری سر در کنار اجل نهادند مگر دختران آن در زمان همایون یافتند و اسلام گرفتند۔

آغاز رسالت

آنحضرت چون چهل ساله شدند ایزد پاک ایشانرا به پیغمبری برگزید و فرقان مجید نازل فرمود
دران روزگار عرب بر یک ملت نبودند۔ گروهی دهریه بودند و میگفتند ان هی الا حیاتنا
الدنیا نموت و نحیی و ما یهلکنا الا الدهر۔ و چون از روز رستخیز می شنیدند میگفتند
ءاذا کنا عظاما و رفاتا ءانا لمبعوثون۔ و گروهی خدای یگانه را میگرویدند مگر خداوندان
فروتر هم از ارواح و فرشتگان پیشا پیش در کارگاه گیتی دستگاهی داشتند تا بتان را بنام
شان تراشیده می پرستیدند۔ و میگفتند ما نعبدهم الا لیقربونا الی الله زلفی۔ و گروهی
می گفتند که فرشتگان همگی دختران یزدانی هستند۔ با اینهمه در پرخاشخری و باده خواری و
قماربازی و بدکاری و کشتن اولاد و معاملت ربوا۔ و کثرت نکاح و زنده در گور کردن دختران
همه بر یک جاده میرفتند چون پیغمبر خدا ایشان را براه راستین رهنمونی فرمود تا بتان را فرو هلند
و یگانه خدای را بپرستند برآشفتند و اعتراضات بیمعنی پیش آوردند۔ یکی گفتی اجعل الالهة
الها واحدا و یکی تقلید پیشینان را دستاویز ساختی و گفتی ما سمعنا بهذا فی ابائنا
الاولین۔ بل نتبع ما الفینا علیه اباءنا۔ پس چون از تیره درونی آن سخن را ایشان
در نگرفت۔ آنجناب بدلائل متین که جلوهٔ بداهت داشت و از گنجائی فهم آن گروه بیرون نبود

ترجمهٔ فارسی پارهٔ

از

طبقات محمد بن سعد کاتب الواقدی

در ذکر

فرستادن پیغمبر خدا قاصدان بسوی بادشاهان و قبائل عرب و رسیدن سفیران عرب نزد

آنحضرت صلی الله علیه وسلم

ترجمه نموده

مولوی محمد عبد الحمید صاحب اعظمگڈھی سلمه الله تعالی

بحکم

نواب وقار الدوله وقار الملک مولوی محمد مشتاق حسین انتصار جنگ بهادر

بجهت افادهٔ طالب علمان مدرسة العلوم علیگڈھ

سنه ۱۸۹۱ع

در مطبع مفید عام آگره طبع شد
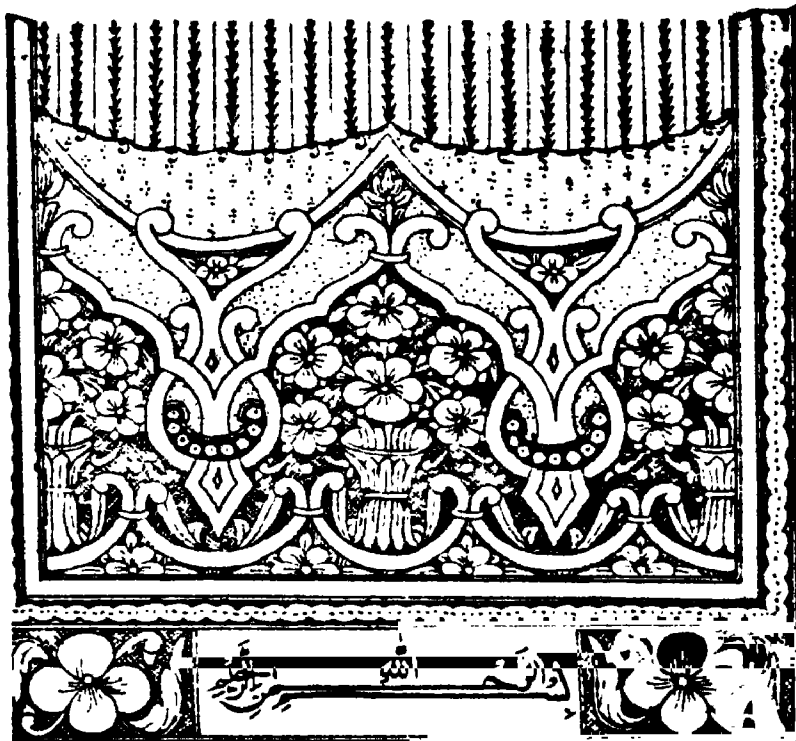
امّا بعد – این دو پاره ایست از طبقات ابن سعد که از زبان عربی بفارسی ترجمه شده یکے از ان دو پاره در ذکر فرستادن پیغمبر خدا قاصدان را بسوی بادشاهان و قبایل عرب است و دیگرے در رسیدن سفیرانِ عرب نزد آنحضرت صلی الله علیه وسلم چون در تاریخ اسلام این آگهی از مهمّاتِ امور است که اسلام در اطرافِ عرب و بلادِ دیگر چگونه اشاعت یافت واین هر دو پاره سرمایهٔ اینگونه آگهیها بود **نواب وقار الملک بهادر** بنظر افادهٔ عام وخصوصاً بغرض فائده طلبای اهل اسلام خواستند که آن نسخه را که در جرمن بزبان عربی چاپ شده اصل قرار داده ترجمه اش بزبان فارسی نموده چاپ کرده آید چه آن گزیده نسخه ایست و بر صحت او اعتماد توان کرد –

طبقات ابن سعد رحمہ اللہ کتابے بزرگ بود کہ پانزدہ مجلد داشت۔ مصنف بارہا آن را
اختصار کرد و یقین نیست کہ این پارہ ہا از کدام ہر دو ہستند لیکن از ہر چہ کہ باشند ہر دو را
در ارزش و صحت آن پایہ است کہ دیگر نامہا مثلاً سیرۃ ابن ہشام وغیرہ در
رتبۂ آن نیست۔

ابن سعد کہ ابو عبد اللہ کنیت دارد و نامش محمد بن سعد بن منیع الزہری است
کاتب واقدی بود علامہ ذہبی او را در میزان الاعتدال ذکر کردہ و معتمد گفتہ۔ علامہ نووی
در تہذیب الاسماء واللغات آوردہ کہ اگرچہ استادش واقدی ضعیف است امّا او
خود ثقہ است۔ و علامہ ابن خلکان در ترجمہ اش چنین گفتہ کہ او از فضلا و بزرگان بود۔ با
واقدی زمانے صحبت داشت و بکار کتابت او بود و ہم ازین بود کہ بنام کاتب الواقدی
آوازہ گشت و حدیث از سفیان بن عیینہ و اقران او گرفت۔ و ابوبکر بن ابی الدنیا و
ابو محمد الحرث بن ابی اسامہ التیمی از و حدیث آموختند و او کتابے بزرگ در طبقات
صحابہ و تابعین و خلفا تا زمان خویش رقم زد و در وا جادت بکار برد و او در پانزدہ مجلد آمد
و ہم او را کتابے دیگر است کہ طبقات صغیر نام دارد و او راستباز و ثقہ بود و
مے گویند کہ تالیفات واقدی نزد چہار کس فراہم آمد کہ اوّل شان کاتبش محمد بن سعد
بود۔ و ابن سعد در علم حدیث و روایت گرامی پایہ داشت و بسیارے از کتب در
حدیث و فقہ تالیف نمود۔ و حافظ ابوبکر خطیب مصنف تاریخ بغداد در حق او نوشتہ
کہ محمد بن سعد نزد ما از ارباب عدالت بود و حدیثش بر راستی او گواہ است

اقبال اور تعمیر سیرت

مفتی عبد الــــودود

اقبال کی شہرت ایک شاعر اور فلسفی کی حیثیت سے ہے اور یہ دونوں ہی گفتار کے غازی زیادہ اور کردار کے غازی کم ہوتے ہیں ۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے کرتا نہیں ۔ یقولون مالا یفعلون ۔ فلسفی بھی عمل سے زیادہ فکر کے میدان کا شہسوار ہوتا ہے۔ اقبال اپنے بارے میں خود ہی کہتے ہیں ۔

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

لیکن یہ شاعر اور فلسفی کی ایک کمزوری ہے جس میں معصومیت پائی جاتی ہے اس لئے کمزوری ہونے کے باوجود پسندیدہ سمجھی جاتی ہے۔ ان کے بارے میں اسی لئے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان کا اپنا عمل کیا ہے دیکھا یہ جاتا ہے کہ جو بات وہ کرتے ہیں وہ کیا ہے اورکیسی ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں اقبال کے یہاں کسی بھی مسئلے کے متعلق جو باتیں ملتی ہیں ان میں وزن بھی ہے اور گہرائی بھی ۔ اس لئے وہ انسان کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہتیں ۔ اقبال کی شاعری بنیادی طور پر اسلامی تعلیمات کی نقیب ہے۔ ان کا فکر قرآن سے مستنیر ہے۔ ان کا اسلام کا مطالعہ کسی عالم دین کے برابر نہ ہو لیکن وہ اپنے شاعرانہ شعور کی مدد سے بات کی تہہ تک پہنچنے میں بہت سے عالموں سے آگے دکھائی دیتے ہیں ۔ تعمیر سیرت کے موضوع پر ان کے افکار و خیالات ان کے کلام میں بکھرے ہوئے ہیں اور ان کی نوعیت کسی عام تصنیف کی طرح کسی مربوط اور مسلسل بیان کی نہیں، نہ مقالے اور مضمون کی ہے ۔ جس میں عقلی اور نقلی دلائل سے بات کو مستحکم کیا جاتا ہے ۔ شعر میں بات کہنے کا انداز نثر کے انداز سے مختلف ہوتا ہے۔ یہاں بات وضاحت اور صراحت سے

نہیں اشارہ اور کنایہ میں کہی جاتی ہے ۔ اور یہی شاعری کا کمال ہے ۔

بسرھنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی است
حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایمائیست

اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کنایہ صراحت سے بلیغ ہوتا ہے ۔ عربی معولہ ہے الکنایة ابلغ من التصریح ۔ لیکن اس کو سمجھنے کے لئے ذہن کا رسا ہونا اور طبیعت کا اخّاذ ہونا ضروری ہے ۔
اقبال کے کلام میں تعمیر سیرت سے متعلق جو مطالب بیان ہوئے ہیں ان میں اسلامی تعلیمات اور دینی روایات کا پرتو عیاں ہے ۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اقبال کو اردو کے تمام شعراء سے ممتاز کرتی ہے ۔ ذیل میں ہم اختصار کے ساتھ سیرت و کردار سے متعلق اقبال کے خیالات کا ایک سرسری خاکہ پیش کرتے ہیں ۔

اقبال کا نظریۂ سیرت و کردار

بنیادی طور پر اقبال زندگی کو جہد مسلسل ، سعی پیہم اور کوشش ناتمام سے عبارت سمجھتے ہیں ۔ قـرار ، سکون اور آرام کو وہ زندگی کے لئے زہر ہلاہل جانتے ہیں ۔ لیکن یہ جدوجہد ، سخت کوشی اور تگ و دو ان کی نظر میں ایک مسلسل عمل ہی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس کی نوعیت تخلیقی ہے ۔ یہ تخلیقی عمل انسان کو ایک قیمتی تحفہ کے طور پر عطا ہوا ہے ۔ جس کے ذریعہ وہ اس دنیا کو ایک نئی صورت دے سکتا ہے اور اس میں ترتیب حسن اور نکھار پیدا کرکے ایک جہان تازہ آباد کر سکتا ہے ۔ اقبال دنیا میں انسان کو شاہین (غالب نہ کہ مغلوب) جیسی زندگی گزارنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ وہ حریت ، جوانمردی اور غیرت و خوداری کو اپنانے کا درس دیتے ہیں ۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی وسیع و عریض کائنات کی تسخیر کے لئے سورج کی طرح تب و تاب (عمل کی حرارت) پیدا کرنے کا سبق دیتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ۔

ور بیائی چوں شرار از خود مرو
در تلاشِ خرمنے آوارہ شو

تاب و تب داری اگر مانند مہر
پا بنہ در وسعت آباد سپہر

سینۂ داری اگر در خورد تیر
در جہاں شاہیں بزی شاہیں بمیر

زندگی را چیست رسم و دین و کیش
یک دم شیری بہ از صد سال میش

تسخیر فطرت اور تسخیر کائنات ہی ایک ایسا مقصد نہیں جو اس کے پیش نظر رہتا ہے بلکہ ایک بلند اخلاق کا حامل انسان بلند تر اخلاقی مقاصد کے حصول کے لئے بھی کوشاں رہتا ہے۔ اقبال اعلیٰ سیرت و کردار کی خصوصیت کی تشریح اپنی مثنوی اسرار خودی میں اس وقت کرتے ہیں جب وہ حضرت علیؓ کے بعض ناموں میں پنہاں مطالب کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک بو تراب کے لقب کا مستحق صرف وہ شخص ہے جو اپنے مادی وجود اور ہوا و ہوس پر غلبہ پالیتا ہے ۔ ایسا شخص پھول کی طرح نرم و نازک نہیں ہوتا بلکہ پتھر کی طرح سخت اور ٹھوس ہوتا ہے ۔ وہ خود دار اور عمل کا پیکر ہوتا ہے ۔ وہ اپنے زور بازو سے ایک نئے زمانہ کو وجود میں لاتا ہے ۔ زندگی کے دوران اور موت کے وقت بھی وہ ہر جگہ جوانمردی کا ثبوت دیتا ہے ۔ اقبال زندگی کو ایک ایسی قوت سمجھتے ہیں جو غلبہ پانے کے جذبہ سے نموپاتی ہے ۔ ان کے نزدیک طاقت مشکلات سے فرار میں نہیں پنجہ آزمائی میں نشوونما پاتی ہے ۔ وہ انسان کو اشرف المخلوقات کی حیثیت سے اس کا مقام یاد دلاتے ہیں اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کچھ اصولوں اور ضابطوں سے روشناس کراتے ہیں ۔ افراد اگر خدا کی ودیعت کردہ صلاحیتوں، استعداد اور قوی کو بروئے کار نہ لائیں تو انسان کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہونے کی بجائے موت کی آغوش میں ابدی نیند سے ہمکنار ہو جاتی ہیں ۔

فرماتے ھیں -

ھــر کہ در آفــاق گـــردد بو تراب
بــاز گـــردانــد ز مغـــرب آفتاب

از خود آگاھـــی ید اللّٰھی کــنــد
از یــد اللّٰھی شہنشاھـــی کنــد

ســنگ شــو ، اے ھمچــو گل نازک بــدن
تــا شـــوی بنیــادِ دیـــوارِ چمــن

گـــر نـہ سازد با مــزاجِ او جہاں
مـــی شود جنگ آزمــا با آسمـــاں

در جہـــاں نتــواں اگر مردانــہ زیست
ھمچــو مـــرداں جاں سپردن زنــد گیست

زنــدگی کشــت است حاصــل قــوت است
شــرح رمــز حـــق و باطــل قــوت است

اے ز آداب امـــانــت بے خبــر
از دو عـــالــم خویش را بہتــر شمــر

گویا وہ مسلسل اپنے علم اور ذھنی قوی میں اضافہ کرنے اور اپنی ذاتی استعداد کے بھرپور استعمال کی تلقین کرتے ھیں جس کے بغیر فرد ماحول کے رحم و کرم پر رھتا ہے ۔ اس کی اپنی قوت عمل مفلوج ھو کر رہ جاتی ہے -

تــو کہ از نـــور خـــودی تابندۂ
گـــر خودی محــکم کنـــی پائنـــدۂ

چـــوں خبـــر دارم ز ساز زندگی
بــا تـــو گـــویـــم چیـــست راز زندگی

غوطہ در خود صورت گوھر زدن
پس ز خلوت گاہ خود سر بر زدن
زندگی از طوف دیگر رستن است
خویش را بیت الحرم دانستن است

فکر و عمل کی یہ صلاحیتیں غیروں پر تکیہ کرنے کی بجائے عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ کرتی ھیں اور اس کے لئے قوت و توانائی بخشتی ھیں ۔ لیکن یہ قوت اپنی بقا و استحکام کے لئے محبت اور عشق کے جذبہ کی محتاج ہے جو انسان کو دنیوی آلائشوں سے منزہ کرکے اس کا رشتہ اپنے خالق کے ساتھ استوار کرنے پر آمادہ کرتا ہے ۔

ھر خاکی و نوری پہ حکومت ہے خرد کی
باھر نہیں کچھ عقل خدا داد کی زد سے
عالم ہے غلام اس کے جلال ازلی کا
اک دل ہے کہ ھر لحظہ الجھتا ہے خرد سے

آخری سعر میں اس روح کی نشاندھی کی گئی ہے جو ذھنی عمل میں ھمیشہ موجود ھونی چاھئیے اور جس کے بغیر انسان اپنے فکر و عمل میں اللہ تعالی کی خوشنودی اور رضا کے تابع نہیں رہ سکتا ۔ وہ جانتا ہے کہ خدا کی رضا مقصود نہ ھو تو صلح بھی جو بظاھر نیک کام ہے سراسر بدی بن جاتی ہے اور اگر اس کی خوشنودی مطلوب ہے تو لڑائی بھی بلا شبہہ نیکی کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔ ھماری زندگی کا ایک ایک عمل صرف اور صرف اس کی منشاء و مرضی کے مطابق ھونا چاھئیے ۔

تابع حق دیدنش نادیدنش
خوردنش نوشیدنش خوابیدنش
قرب حق از ھر عمل مقصود دار
تا ز تو گردد جلالش آشکار

صلح شر گردد چو مقصود است غیر
گر خدا با شد غرض جنگ است خیر
هر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید
تیغ او در سینۂ او آرمید

اقبال کا مرد مومن نہ صرف خارجی طور پر حق کا پرستار اور باطل سے ٹکرانے والا ہے بلکہ وہ داخلی طور پر خود اپنی ذات سے بھی نبرد آزما رهتا ہے۔ وہ اپنے سفلی جذبات اور نفسانی خواهشات پر اس طرح جھپٹتا ہے جیسے چیتا هرن پر حملہ کرتا ہے۔

مرد مومن زندہ و باخود بجنگ
بر خود افتد همچو بر آهو پلنگ

ان اعلی و ارفع اخلاقی اور روحانی اقدار کا حامل انسان تعمیر خودی کے ذریعہ انتہائی بلندیوں تک پہنچ جاتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

توحید کا عقیدہ انسانی فکر وعمل کو بلند تر معانی سے آشنا کرتا ہے۔ اللہ تعالی کی ذات اپنی جملہ صفات جلال و جمال کے ساتھ انسان کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ اسی سے اس میں عزت نفس اور جوانمردی کے اوصاف پیدا هوتے هیں ۔ وہ بدی کی قوتوں سے مفاهمت اور تعاون کی بجائے ستیزہ کار رهتا ہے۔ وہ کسی طرح غیر اللہ کا سہارا لینا گوارا نہیں کرتا۔

خودی را مردم آمیزی دلیل نارسائی ها
تو اے درد آشنا بیگانہ شو از آشنائی ها
بدر گاہ سلاطین تا کجا ایں چہرہ سائی ها
بیا موز از خدائے خویش ناز کبریائی ها
محبت از جوانمردی بجائے می رسد روزے
کہ افتد از نگاهش کاروبار دلربائی ها

ایک اور جگہ فرماتے ھیں کہ مسلمان وہ ہے جو خدا کے سوا ہر شے سے بے نیاز ہو اور اس کی ذات دنیا کیلئے خیروبرکت کا سرچشمہ ہو۔ وہ اپنا رزق کمینوں کے ہاتھوں سے لینا قبول نہ کرے ۔ ایک جگہ عرفان نفس اور خود آگاھی کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ھیں کہ فرد اس لئے فرد ہے کہ اس نے اپنی ھستی کو پہچان کر پیام مصطفیٰ کے مطابق تمام باطل خداؤں کو چھوڑ دیا ۔

مسلم استغنی بے نیاز از غیر شو
اھل عالم را سراپا خیر شو
رزق خود را از کف دوناں مگیر
یوسف استی خویش را ارزاں مگیر
از پیام مصطفیٰ آگاہ شو
فارغ از ارباب دون اللہ شو

اقبال کے نزدیک اللہ کا ڈر ہر قسم کے خوف سے انسان کو مبرا کر دیتا ہے۔ نفسیات کا علم اور تجربہ بھی یہی بتاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں جنگ و جدال جبرو استبداد ، طاقت کی نمائش اور دوسرں کا استحصال ڈر اور خوف ھی کا شاخسانہ ہے۔ طاقتور کے ھاتھوں کمزور کا پسنا ۔ جدید خیالات و تصورات کو دبا دینے کا رجحان ۔ ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ مال و دولت کو قانونی تحفظ دینا ۔ اھل ثروت کا دوسروں کے مقابلہ میں ھر لحاظ سے تفوق ۔ قوموں کے درمیان اسلحہ کی دوڑ اور اس قسم کے دیگر منفی رجحانات سے صاف طور پر عیاں ہے کہ موجودہ دور کے رگ و ریشے میں خوف و بیم ، حسد اور جلن ، بغض و عناد ، خوشامد اور جھوٹ کا زھر سرایت کر چکا ہے۔

لابہ و مکاری و کین و دروغ
ایں ھمہ از خوف می گیرد فروغ

هر شر پنہاں کہ اندر قلب تست
اصل او بیم است اگر بینی درست

اقبال نفسیات کے علم اور فطرت انسانی کے رموز سے بخوبی واقف ہیں اسی لئے فرماتے ہیں تیری تعمیر جس مٹی سے کی گئی ہے اس میں محبت کے ساتھ خوف کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ خوف کا علاج یہ ہے کہ عصائے لااله سے اس کا قلع قمع کر دیا جائے۔

طرح تعمیر تو از گل ریختند
با محبت خوف را آمیختند
خوف دنیا خوف عقبیٰ خوف جاں
خوف آلام زمین و آسماں
حب مال و دولت و حب وطن
حب خویش و اقربا وحب زن
تا عصائے لااله داری بدست
هر طلسم خوف را خواهی شکست

توحید کا عقیدہ انسان کے اخلاق و کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے اثر سے ڈر اور خوف کے جذبات مفقود ہو جاتے ہیں اور طبیعت میں دلیری اور شجاعت کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال معاشرہ کے افراد کے لئے اخلاقی طور پر کن امور کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ اقبال ایک منظم معاشرہ میں افراد کے باہمی احترام اور حسن سلوک کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر باہمی رواداری کا جذبہ موجود نہ ہو تو ظاہر ہے تصادم اور

ٹکراؤ کی صورتیں پیدا ہوں گی ۔ اپنی خودی کی حفاظت کے ساتھ دوسروں کی خودی کا احترام ایک لازمی امر ہے۔ معاشرہ کے دیگر افراد کی آراء، عقائد ، افکار و خیالات یا باہمی اختلافات کو اگر گوارا نہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم معاشرے کو ارتقا کی بجائے شکستگی سے ہمکنار کر رہے ہیں ۔ بال جبریل میں وہ بنی نوع انسان کی محبت کا درس دیتے ہیں جو حق پسندی سے پروان چڑھتی ہے۔

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی نا خوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندہ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند

اقبال کے نزدیک روا داری کو کمزوری پر محمول نہیں کیا جا سکتا بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ صلاحیت بھی طاقت و قوت سے جنم لیتی ہے۔ دوسروں کے عقائد اور آراء کے احترام کے ساتھ اپنے عقائد سے گہری وابستگی بھی لازمی ہے۔ بنیادی طور پر اقبال رواداری کو سچی انسانیت اور مذہب کی اعلیٰ روح سمجھتے ہیں ۔ وہ کافر و مومن سب کو خدا ہی کی مخلوق سمجھتے ہیں اور حرف بد کو زبان پر لانا گناہ سے کم نہیں جانتے ۔

دیں سراپا سوختن اندر طلب
انتہائش عشق و آغازش ادب
حرف بد را بر لب آوردن خطاست
کافر و مومن ہمہ خلقِ خداست
بندہ عشق از خدا گیرد طریق
می شود برکافر و مومن شفیق

آدمیت احتـــــرام آدمی
بـــا خبـــــر شو از مقـــام آدمی

اقبال سیرت و کردار کی نشوونما کے لئے فقریا استغنا کو نہایت ضروری سمجھتے ھیں
ور مادہ پرستی کے رجحان کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ھیں ۔ جس کے باعث انسان کی نظر سے
علی مقاصد اوجھل ھو جاتے ھیں اور اخلاقی ترقی مفقود ھو جاتی ہے۔ انسان کو دنیوی مال و
سباب سے بے تعلقی کا رویہ اختیار کرنا چاھئیے ۔ اسی کا نام «فقر» ہے۔ فقر سے بلند اخلاقی
ندروں کا فروغ ھوتا ہے اور انسان ھـــر قسم کی برائی سے محفوظ رھتا ہے۔

خـــدا کے پاک بنـــدوں کـــو حکومـــت میـــں غـــلامـــی میں
زرہ کوئـــی اگـــر محفـــوظ رکھتـــی ہے تـــو استغنـــــاء

فقر کا یہ مطلب ھرگز نہیں کہ انسان کمزوری و بزدلی کا نشان بن جائے ۔ اور بنیادی
مقوق تک سے دستبردار ھو جائے ۔ اس جگہ اقبال قرآن مجید کی ھدایت کے مطابق عمل کرنے
کی تلقین کرتے ھیں۔ «ولا تنس نصیبک من الدنیا ۔» «اور دنیا میں سے اپنا حصہ لینا مت بھولو»۔
اقبال کی نظر میں دولت و ثروت اور طاقت و قوت کی وجہ سے جو کجروی پیدا ھوتی ہے فقر
اسکے خلاف مدافعت کا رجحان پیدا کرتا ہے ورنہ اکثر مردان حق اندیش اور اھل نظر بھی
دوسروں کیلئے نقصان کا باعث بن جاتے ھیں ۔ کثرت نعمت و تعیش سے سوز و گداز ، ھمدردی
اور محبت کے جذبات و احساسات ناپید ھو جاتے ھیں ۔

گرچـــہ باشـــی از خـــــداونـــدان دہ
فقـــــر را از کف مدہ از کف مـــدہ
اے بســـا مـــرد حق انـــدیش و بصیر
مـــی شود از کثـــرت نعمـــت ضـــریـــر
کثـــرت نعمـــت گـــداز از دل بـــرد
نـــاز مـــی آرد نیـــاز از دل بـــرد

گزشتہ اوراق میں جو معروضات پیش کی گئیں ان سے اقبال کے نظریہ اخلاق و کردار
کا ایک مجمل سا خاکہ سامنے آ جاتا ہے۔ سیرت و کردار کے لحاظ سے «مرد مومن» وہ ہے جو
پنی انفرادیت کو اپنے ماحول میں مستحکم اور توانا رکھتا ہے ۔ وہ اللہ تعالی کے معین کردہ

مقاصد کے حصول میں کوشاں رهتا ہے اور تسخیر کائنات کا مشن بھی جاری رکھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ خود کو دنیا کی آلائشوں سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ عزت نفس اسے مہم جوئی اور جرأت مندی بخشتی ہے۔ رواداری اور دوسروں کے حقوق کی نگہداشت ایسے امور هیں جن کی طرف وہ برابر اپنی توجہ کو مبذول رکھتا ہے۔ ایک جگہ اقبال مرد مومن کا خاکہ یوں کھینچتے هیں۔

هاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا هاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز
خاکی و نوری نہاد ، بندۂ مولا صفات
هر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم هو یا بزم هو پاک دل و پاکباز

آخر میں ایک نہایت هی اهم سوال جو اقبال کے قارئین کو دعوت فکر دیتا ہے یہ ہے کہ اخلاق و کردار کا وہ آئیڈیل جو اقبال نے همیں دیا ہے کیا وہ انسان کی دسترس میں ہے۔ کیا اس تک رسائی یا اس کا حصول ممکن بھی ہے۔ انسانی کمزوریاں بھی تو سد راہ بنتی هیں۔ پھر اخلاق و کردار کے اس بلند نصب العین کو حاصل کرنا کیسے ممکن هو ؟

اس سوال کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے کہ آئیڈیل بہر حال ایک منزل ہے جو یقیناً بلند ترین حیثیت کی حامل ہے۔ آئیڈیل کا حصول اتنا سہل نہیں تاهم اس کے حصول کی مخلصانہ جدو جہد سے همارے کردار کی راہ ضرور متعین هوتی ہے۔ آئیڈیل تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش میں هم جو کچھ حاصل کرتے هیں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ همیں اس وقت هوتا ہے جب هم اپنا موازنہ کسی ایسے شخص سے کریں جو آئیڈیل سے محروم هو۔ اس میں اخلاقی ترقی اور کردار کی بہتری کے آثار ضرور ملتے هیں۔ اخلاقی اور روحانی آئیڈیل ایک نہایت هی متحرک قوت ہے جس نے نہ صرف افراد کے اخلاق و کردار کی اصلاح کی ہے بلکہ قوموں کی زندگی میں بھی انقلاب برپا کیا ہے۔ اس سلسلے میں اهل عرب کی فکری اور عملی قوتوں کی نشوونما جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و سلم کی اخلاقی هدایات و تعلیمات کے

آئیڈیل کے زیر اثر ہوئی اس کی ایک روشن مثال ہے۔ آنحضور نے اسلام کے پیرووں کے سامنے سیرت و کردار کا جو آئیڈیل پیش کیا ہم اس تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکیں لیکن اس آئیڈیل تک پہنچنے کی کوشش میں ایک سچا پیرو جو کچھ پا لیتا ہے وہ بھی کم نہیں۔ یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئیے کہ سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے اقبال جو نسخہ تجویز کرتے ہیں وہ ان کی اپنی ایجاد نہیں ۔ مقصد اور طریق کار دونوں میں انہوں نے اس ہستی کو سامنے رکھا ہے جس کی ذات ہر بات میں ہمارے لئے نمونہ اور مثال ہے۔

کتابیات

کلیات اقبال فارسی ۔

کلیات اقبال اردو

جاوید نامہ ص ۱۸۴ ـ ۱۸۵

اسرار خودی ص ۴۸ ـ ۴۹ ـ ۵۰ ـ ۵۱

اسرار خودی ص ٦۵ ـ ٦٦

ضرب کلیم ص ۳۹

اسرار خودی ص ٦۲ ـ ٦۳ ـ ٦۴

اسرار خودی ص ۷

زبور عجم ص ۱۲۳

رموز بے خودی ص ۱۵۸ ـ ۱۵۹ ـ ۱٦۱

رموز بے خودی ص ۹٦

اسرار خودی ص ۳۲

بال جبریل ص ۵٦ ـ ۵۷

بال جبریل ص ۲۱

جاوید نامہ ص ۲۰۵

بال جبریل ص ۲۳

جاوید نامہ ص ۲۰٦

بال جبریل ص ۷۰

* * * * *

علم طب میں مسلمانوں کا حصہ

محمد اختر مسلم

صدیاں گزر چکی ہیں لیکن قرون وسطی کے مسلمان دانشوروں ، سائنس دانوں انجینئروں ، طبیبوں اور اهل صنعت و حرفت کے کارناموں کی تابانی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا ۔ ان کے نظریے ، ان کے علوم و فنون ، ان کی عمارتیں اور ان کی ایجادات آج بھی بہت سے ترقی یافتہ علوم و افکار کی بنیاد ہیں ۔ اور ان کے بعض نظریات تو تھوڑے بہت فرق کے ساتھ جوں کے توں اب تک موجود ہیں ۔ کندی ، فارابی ، بیرونی ، زہراوی ، رازی ، ابن سینا ، رومی ، خالد بن یزید بن معاویہ ، جابر بن حیان ، الیعقوبی ، ابن رشد ، غزالی ، ابن طفیل ، محمد بن موسی مسعودی ، بیطار طوسی ، ابو الوفا اور ماوردی ، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کارزار حیات کے مختلف شعبوں میں تجربے کئے ۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے قدرت کے بہت سے رازوں سے پردے اٹھائے ۔ علم کے کارواں کو صحیح راستے پر لگایا ۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ لوگ قدیم و جدید علوم کے درمیان بیچ کی کڑی تھے ۔ اگر بیچ کی یہ کڑی نہ ہوتی تو شاید عصر حاضر بھی آج اس شکل میں موجود نہ ہوتا ۔ یہ محض «پدرم سلطان بود» کا لاف و گزاف نہیں ۔ مسلمانوں کو اس بات کا یقین ہونا چاہئے کہ یورپ کی موجودہ علمی ترقی میں ان کا بھی حصہ ہے ۔ اور اگر آج ہم یورپ کے علوم سے استفادہ کر رہے ہیں تو یہ گویا اپنی ہی متاع گم گشتہ کی باز یافت ہے ۔ ہمیں مغرب پرستی کے طعنے سے گھبرا کر یورپ سے استفادہ میں تأمل نہیں کرنا چاہئے ۔ علم دست گرداں ہے ۔ ہم نے یونانیوں سے علوم سیکھے ۔ ہم سے یورپ نے سیکھے ۔ اب یورپ سے ہم سیکھ رہے ہیں ۔ اور اگر ہم نے اسی لگن اور جذبہ کے ساتھ اپنے استفادہ کو جاری رکھا تو وہ دن دور نہیں جب دوسرے لوگ پھر ہم سے علم حاصل کریں گے ۔

علم شفاء سے مسلمان عربوں کی دلچسپی کا محرک در اصل وہ مشہور قول ہے جس میں علم کی دو شاخیں بیان کی گئی ہیں ۔ یعنی علم ادیان اور علم ابدان ۔ گویا دین اور طب ہی

اصل علوم ھیں ۔ اور سچا جوئندہ وہ ہے جو ایک ساتھ بدن اور روح کی شفاء و تندرستی کا طالب ھو ۔ حکیم الامت علامہ اقبال کی اصطلاح میں تن کی دنیا اور من کی دنیا ایک صحیح جوئندہ حقیقت کے لئے یہ دونوں ولایتیں الگ الگ نہیں بلکہ ایک ھی ملک کے دو متصل خطے ھیں جن کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ۔ چنانچہ اسی نظریہ کا اثر تھا کہ پہلے زمانے میں ایک طبیب فن طب میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ ما بعد الطبیعات کا جاننے والا ۔ فلسفی اور حکیم بھی ھوتا تھا ۔ یہ عرب ھی تھے جنھوں نے سب سے پہلے دوا فروشی کی دوکانیں کھولیں ۔ اور دواسازی «صیدلہ» کا سب سے پہلا مکتب قائم کیا ۔ دواؤں کے خواص کے فن قرابادین پر اولین کتاب پیش کی ۔ ۹۳۱ ء میں خلیفہ المقتدر کے حکم سے طبیبوں کا امتحان لینے کے سلسلے میں ممتاز طبیب سنان بن ثابت کا تقرر عمل میں آیا ۔ اسے ہدایت کی گئی کہ وہ صرف ایسے ھی طبیبوں کو علاج معالجہ کا اجازت نامہ جاری کرے جو مقررہ معیار پر پورے اتریں ۔ صرف شہر بغداد میں ۸٦۰ سے بھی زیادہ طبیبوں نے اس عملی امتحان میں کامیابی حاصل کی اور یوں سارا دار الخلافہ غیر مستند اتائیوں اور نیم حکیموں سے پاک ھو گیا ۔

الرازی جس کو یورپ RHAZES کے نام سے یاد کرتا ہے ۸٦۵ ء میں پیدا ھوا اور ۹۲۵ ء میں انتقال کر گیا ۔ الرازی نہ صرف دنیائے اسلام میں بلکہ قرون وسطی کے جملہ مفکرین اور اطباء میں سب سے زیادہ ذھین اور طباع مفکر و طبیب تھا ۔ وہ بغداد کا سب سے بڑا طبیب تھا ۔ کہتے ھیں کہ بغداد کے ایک نئے بڑے شفاخانہ کے محل و قوع کے انتخاب کے لئے اس نے مختلف مقامات پر گوشت کے ٹکڑے لٹکا دئیے تھے اور جس مقام پر گوشت کے سڑنے کی علامات سب سے کم پائی گئیں اسے ھسپتال کی تعمیر کے لئے منتخب کر لیا ۔ جراحی کی وہ سوئی جس سے زخم کھولا جاتا ہے جسے انگریزی میں (SETON) کہتے ھیں اسی کی ایجاد ہے ۔ رازی کے طبی رسائل میں سے اس کا وہ رسالہ سب سے زیادہ مشہور ہے جو اس نے چیچک اور کھسرہ پر لکھا ہے ۔ «الجدری و الحصبہ» تاریخ طب میں اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ ہے ؟ اور افادیت کے اعتبار سے اسے بجا طور پر عربوں کے طبی ادب کا شاھکار سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن اس سے بھی بڑا کارنامہ رازی کی جامع تصنیف الحاوی ہے ۔ اس کا پہلا لاطینی ترجمہ ایک یہودی فرج بن سالم نے انژد کے چالس اول کی سرپرستی میں ۱۲۷۹ ء کے قریب کیا تھا ۔ بعد ازاں (۱۲۸٦ ء کے بعد) یہ کتاب یورپ میں CONTINENS کے نام سے کئی بار شائع ہوئی ۔ ۱۵۴۲ء

میں بمقام وینس یہ کتاب پانچویں مرتبہ طبع ہوئی ۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ کتاب طبی معلومات کی قاموس ہے ۔ اس میں ان تمام معلومات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے جو اس زمانہ تک یونان ، ایران اور ہندوستان کے طبی ادب سے عربوں نے حاصل کی تھیں ۔ مزید برآں رازی نے اپنی تازہ بہ تازہ طبی تحقیقات بھی اس میں شامل کیں ۔ حکیم الرازی کی طبی تصانیف ایسے زمانہ میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں جب طباعت و اشاعت کا نظام اپنے عہد طفولیت میں تھا ۔ حکیم الرازی کی تصانیف لاطینی مغرب کے دماغوں پر صدیوں تک نمایاں طور پر اثر انداز رہیں ۔ ڈاکٹر کارل سوڈوف کی رائے میں رازی ہر دور کا عظیم ترین طبیب ہے ۔ اور فرینڈ کہتا ہے " اس نے خون کے خمیر میں چیچک کا سبب دریافت کیا " ۔

عرب کی تاریخ طب میں حکیم الرازی کے بعد دوسری ممتاز شخصیت حکیم بو علی سینا (AVICENNA) کی ہے ۔ حکیم بو علی سینا کی مشہور زمانہ بلند پایہ قاموسی کتاب القانون فی الطب ہے ۔ جس کا یورپی زبانوں میں CANON کے نام سے ترجمہ ہو چکا ہے ۔ طب کی تاریخ میں اس کتاب کو ایک بلند مقام حاصل ہے ۔ یورپ کی طبی درس گاہوں میں اس کو درسی کتاب کے طور پر پڑھایا جاتا تھا ۔ پندرھویں صدی کے آخری تیس سالوں میں اس کتاب کا ایک عبرانی اور سندرہ لاطینی ایڈیشن شائع ہوئے ۔ حکیم بو علی سینا نے اپنی تصنیف القانون کے ایک باب بعنوان " من العقاقیر و الادویہ " میں کم و بیش ۷٦۰ دواؤں کے نام اور خصوصیات کا ذکر کیا ہے ۔ بارھویں صدی سے لیکر سترھویں صدی تک مغربی دنیا میں اس کتاب کو ایک کامل رہبر حیثیت حاصل رہی ہے ۔ اور آج بھی یورپی دنیا میں اس سے استفادہ کا عمل جاری ہے ۔ ڈاکٹر ولیم آسلر(OSLER DR. WILLIAM) نے اپنی مشہور کتاب FO MEDICAL SCIENCE EVOLUTION میں حکیم بو علی سینا کی کتاب القانون کے متعلق لکھا ہے کہ " ابن سینا کا رسالہ القانون اتنی طویل مدت تک طبی انجیل کی طرح پڑھا جاتا رہا کہ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی " ۔

چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں یورپ طاعون پھیلنے کے باعث تباہ ہو رہا تھا ۔ عیسائی اس آفت کے سامنے قضائے الٰہی کے عقیدے کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے ۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ چونکہ یہ بلا اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس لئے اسے کسی طریقے سے بھی روکا نہیں جا سکتا ۔ توہمات کی اس تاریکی میں غرناطہ کے مشہور طبیب ابن

الخطیب نے تحقیق کی قندیلیں روشن کیں ۔ انہوں نے متعدی امراض کے متعلق ایک رسالہ
لکھا جس میں سائنٹفک تحقیقات کی روشنی میں یہ بات ثابت کی کہ ،

«جو لوگ یہ کہتے ھیں کہ ھم تعدیہ کے امکان کو نہیں مانتے کیونکہ یہ
احکام الہی کے خلاف ہے ۔ ان لوگوں کو ھمارا جواب یہ ہے کہ تعدیہ کا
وجود تجربات ، تحقیقات ، فہم و ادراک کی شہادت اور قابل اعتماد
بیانات سے ثابت ہے ۔ یہ تمام حقائق زبردست دلیلیں تعدیہ کی صداقت پر
تحقیق کرنے والے پر پوری طرح ثابت ھو سکتی ھیں جب وہ دیکھتا ہے کہ
ایک ایسا شخص جو کسی متعدی مرض میں مبتلا مریض کے ساتھ اٹھتا
بیٹھتا ہے اور رھتا ہے آخر کار اس مرض میں خود بھی مبتلا ھو جاتا ہے ۔
لیکن وہ شخص جو متعدی مرض میں مبتلا مریض سے دور رھتا ہے اس
مرض سے بالکل محفوظ رھتا ہے ۔ تحقیق کرنے والا یہ بھی معلوم کر سکتا
ہے کہ متعدی مرض کے جراثیم مریض کے کپڑوں ، اس کے کھانے پینے کے
برتنوں ، حدیہ کہ کان کے بندوں کے ذریعہ بھی دوسرے آدمیوں میں منتقل
ھو جاتے ھیں » ۔

PHILIP K. HITTI -- « THE ARABS » PAGE 141

ابن میمون ایک مشہور طبیب گذارا ہے ۔ اس نے ختنہ کے طریقے کی اصلاح کی ۔ بواسیر
جیسے موذی مرض پر تحقیق کی اور «قبض» کو اس کی علت قرار دیا ۔ اس کے لئے ایسی
ھلکی پھلکی غذا تجویز کی جس میں بیشتر ترکاریاں ھیں ۔ طب پر اس کی مشہور ترین
تصنیف « الفصول فی الطب» ہے ۔

الزھرا اندلس کا ایک قصبہ تھا ۔ جو قرطبہ سے پانچ میل کے فاصلے پر تھا ۔ یہ قصبہ
اب مٹ چکا ہے لیکن اسی خاک سے جس نامور شخصیت کو جنم دیا وہ آج تک زندہ ہے ۔ اس
بطل جلیل کا نام شیخ ابو القاسم بن عباس زھراوی تھا ۔ جو ایک عظیم سرجن کی حیثیت سے
مشہور ھوا ۔ جسے دنیائے طب فن جراحت کے امام کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ۔

شیخ الزھراوی نے ایک «التصریف» لکھی ۔ اس کتاب کی شہرت کے سبب کتاب کا نام
خود مصنف کے نام پر پڑ گیا ۔ اور اب طب کی دنیا میں یہ کتاب زھراوی کے نام سے معروف ہے ۔
یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے ۔ پہلا حصہ مصنف کے تبحر علمی کا آئینہ دار ہے اور
دوسرا حصہ عملی تجربات پر مشتمل ہے ۔ کتاب کا دوسرا حصہ تین ابواب پر مشتمل ہے ۔

۱ ۔ داغنے کا بیان ۔ اس باب میں شیخ الزہراوی نے سر سے پاؤں تک تمام جملہ امراض کا علاج داغنا تجویز کیا ہے۔ ہر فصل میں ہر بیماری کے متعلق تفصیل سے بحث کرتے ہوئے شیخ نے لکھا ہے کہ پہلے دواؤں سے کام لو ۔ اگر علاج کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو پھر داغنا ہی مناسب ہے۔ امام الجراحت شیخ الزہراوی نے داغنے کے متعدد آلات بنائے اور پھر ان کے استعمال سے متعلق بالتفصیل لکھا ۔ ان آلات کی تعداد تقریباً ۸۵ ہے۔ آج سائنس کے ترقی یافتہ عہد میں بھی ہر مرض کا آخری علاج شعاعوںRADIOTHERAPY کے ذریعہ ہی کیا جاتا ہے۔ شیخ الزہراوی نے اپنی تحقیق سے یہ بھی ثابت کیا کہ جب مرض زخم کی صورت اختیار کر لے تو پھر اس کا علاج صرف اور صرف داغنا ہے۔ مثلاً ناسور ، جذام ، بواسیر وغیرہ وغیرہ ۔

(ب) شَـــق (OPERATION)

اس باب میں اعضاء اور امراض سے متعلق بحث ہے تاکہ مرض کی صحیح تشخیص ہو اور مریض کا علاج صحیح اور بروقت ہو سکے ۔ پھر اس امر کی وضاحت ہے کہ اگر ان امراض میں سے کوئی مرض زخم کی صورت اختیار کر لے تو اس کے آپریشن کا طریق کیا ہونا چاہئیے ۔ خصوصاً سر کی جراحی ، دانت نکالنا ، ہلتے ہوئے دانتوں میں سونے یا چاندی کے تار باندھنا ۔ آج بھی دانتوں کے مختلف امراض کے علاج کے سلسلے میں چاندی کا سیال بھرا جاتا ہے۔ آنکھ کے پردے کا آپریشن ، کان اور ناک کٹے ہوئے اجزاء کا جوڑنا ، ٹانکے لگانا وغیرہ ، غیر طبعی شکل میں پیدا ہونے والے جنین کو رحم مادر سے نکالنا ، توأم بچوں کے مردہ جنین کو نکالنا ، بچوں کے فطری اعضاء اگر غیر فطری حالت میں ہوں تو ان کا کھولنا ، زائد گوشت کا آپریشن کرنا اور کاٹنا ، پتھری کو خواہ مثانہ میں ہو یا گردے میں نکالنا ، پیٹ کا آپریشن ، ورم شدہ مقامات کا آپریشن ، چھوٹی سی چھوٹی رگ میں نشتر لگانا وغیرہ ، یہ وہ کارنامے ہیں جن کے آگے عہد حاضر کی جراحت بھی عزت و احترام کے ساتھ اپنا سر خم کرتی ہے۔

شیخ الزہراوی اپنی مذکورہ تصنیف میں لکھتے ہیں کہ اگر طوالت میری اس تصنیف کے لئے غیر مناسب نہ ہوتی تو میں اس کے متعلق دقیق باتیں بیان کرتا اور دلیل و برہان سے بتاتا

کہ آگ کس طرح اجسام میں اپنا کام کرتی ہے۔ مگر ہر شخص کے لئے اس کا فہم مشکل ہوتا ۔ وہ اپنے مشاہدات و تجربات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ ،

«میں نے جو کچھ اس فن میں حاصل کیا اس لئے کیا کہ میں حکمائے قدیم کا بڑی عمیق نظر سے مسلسل مطالعہ کرتا تھا ۔ پھر ان کے تجربات سے میں نے اس فن کو مستنبط کیا اور عمر بھر ان نظریات کی روشنی میں تجربات کرتا رہا ۔»

امام زہراوی سے قبل فن جراحت خصوصاً اعضاء کے جوڑ اور آپریشن کا فن مدون و مرتب نہ تھا ۔ قدیم حکما کے تذکروں میں اس شعبہ کا ضمناً ذکر ملتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ امام زہراوی نے فن جراحت کے موتیوں کو جو بکھرے پڑے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ منتشر ہونے کے سبب اپنی آب و تاب سے محروم ہو جائے انہیں یکجا کرکے لازوال ابدیت عطا کی ۔ اور یوں اس فن کی عظمت میں چار چاند لگ گئے ۔

امام زہراوی نے جس تحقیق و کاوش سے فن جراحت کی تدوین کی اس کے لئے انسانیت ہمیشہ ان کی ممنون احسان رہے گی ۔ انہوں نے کسی گوشے کو نامکمل نہیں چھوڑا حتی کہ جراحت کے سلسلے میں مرہم پٹی ، پرہیز ، اور موسمی اثرات وغیرہ کا بھی ذکر تفصیل سے کیا ۔

جسم انسانی کا ہر عضو ایک اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن دل و دماغ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ امام زہراوی نے دماغ کا آپریشن بھی کیا ۔ اس باب میں ان کی تحقیق کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی تصنیف سے ایک باب نقل کیا جاتا ہے۔

بچوں کے سر میں پانی جمع ہونے کے اسباب

اس نوع کی بیماری بچوں کو زیادہ تر ولادت کے وقت ہوتی ہے ۔ دایہ کا بچہ کو ولادت کے بعد بغیر کسی نرم چیز کا سہارا دیئے رکھ دینے سے یہ مرض پیدا ہوتا ہے۔ بعض اوقات پوشیدہ امراض بھی اس کا سبب بن جاتے ہیں ۔ بچوں کے علاوہ یہ مرض بڑوں کو بھی لاحق ہو جاتا ہے۔ میرے تجربہ کے مطابق اس مرض میں بچے کی موت جلد واقع ہو جاتی ہے۔

بچہ کا سر بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے ، رطوبت سر میں بڑھتی رہتی ہے ، جب ہر جگہ پانی ہی پانی ہو جاتا ہے تو بچہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہ رطوبت جمجمہ کی ہڈی کے نیچے جمع ہو جاتی ہے ۔ اگر رطوبت جلد کے نیچے ہے تو ورم کم ہوگا ۔ چنانچہ ایسی صورت میں شگاف بیچ میں عرضاً دینا ہوگا ۔ شگاف کی لمبائی دو انچ سے زیادہ نہ ہونی چاہئے ۔ یہاں تک کہ

رطوبت بہہ جائے ۔ اگر رطوبت زیادہ ہو اور ورم بھی کافی ہو تو اس پر دو متقاطع شگاف (صلیبی +) لگانے چاہئیں ۔ اگر رطوبت ہڈی کے نیچے ہو تو اس کی علامت یہ ہوگی کہ سر کی سیون ہر جگہ سے کھل جائیگی ۔ اور جب دباؤ دے تو ابھری ہوئی معلوم ہوگی اور کچھ اندر کی طرف دبا ہوا محسوس ہوگا ۔ یہ علامت ایسی ہے جو طبیب سے مخفی نہیں رہ سکتی ہے۔

امام زہراوی کا مذکورہ بالا بیان کلی طور پر فنی حیثیت کا حامل ہے ۔ ان کے اس بیان کی تشریح کے سلسلے میں بعض دیگر حکماء کی آراء نقل کی جاتی ہیں ۔

حکیم بو علی سینا کھوپڑی کی ساخت کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ کھوپڑی کی طبعی ساخت عبارت ہے تین سچی درزوں اور دو چھوٹی درزوں سے ۔ حکیم بو علی سینا کے شارح علامہ محمود آملی لکھتے ہیں کہ ،

«درز حقیقی سے مراد وہ درز ہے جس میں متصلہ ہڈیوں کے زوائد اور دندانے ایک دوسرے کے نشیب میں اس طرح داخل ہو جائیں جس طرح دو آروں کو ملا دیا جائے ۔ درز کاذب سے مراد یہ ہے کہ دونوں ہڈیاں چپکی ہوئی ہوں ۔ یہی سبب ہے کہ بعض لوگ ایسی درز کو درز قشری (چھلکے والی درز) اور بعض زلزاتی یعنی چپکی ہوئی درز کہتے ہیں» ۔

عرب وریدوں کے ذریعہ خون پہنچانے کے عمل سے بھی واقف تھے اور امعائے مستقیم کو غذا پہنچانے کے لئے چاندی کی نلکیاں استعمال کرتے تھے ۔ دنیا کو قرابادین کی پیش کش سب سے پہلے عربوں ہی نے کی اور سب سے پہلی دوا سازی کی دکانیں اور گشتی شفاخانے قائم کرنے والے بھی یہی لوگ تھے ۔

المتوکل کی خلافت کے دوران میں قاہرہ میں شفاخانہ قائم کیا گیا ۔ صلاح الدین ایوبی نے مصر میں متعدد شفاخانے کھولے ۔ قاہرہ کے عامل ابن طولون نے ۸۷۲ء میں ایک شفاخانے کے لئے تین لاکھ روپے کا عطیہ دیا ۔ اس شفاخانہ میں ہر مرض کے علاج کے لئے علیحدہ علیحدہ وارڈ تھے ۔ علاج کے ساتھ مریضوں کو مفت خوراک دی جاتی تھی ۔ بیرونی مریضوں کے لئے الگ شعبہ قائم تھا ۔ جراحی کے وارڈ الگ تھے ۔ صرف بغداد ہی میں نہیں بلکہ تمام اسلامی دنیا میں پاگلوں کے لئے شفاخانے کھولے گئے ۔ جہاں پاگلوں کا علاج انسانی ہمدردی اور زیادہ تندہی سے کیا جاتا ۔ جبکہ مغربی دنیا میں صدیوں بعد بھی ان ذہنی مریضوں کو مجرم ہی سمجھا جاتا تھا ۔ ۸۵ ۔ ۱۱۸۳ء اور بعد ازاں ۹۱ ۔ ۱۱۸۹ء میں علامہ ابن زبیر نے مکہ

مکرمہ کا سفر کیا تو انہوں نے بغداد ، موصل ، حلب اور دمشق میں اعلیٰ درجہ کے شفاخانوں کا جال بچھا دیکھا ۔ سلطان صلاح الدین نے ایک بڑے فاطمی محل کو شفاخانے میں تبدیل کیا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ زنانہ وارڈ الگ تھے اور ان میں طبیب عورتیں تھیں ۔

بغداد کا سب سے بڑا شفاخانہ عضد الدولہ کا تھا ۔ اس کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر حاضر کے اکثر شفاخانوں کے پایے کا تھا ۔ صرف یہی نہیں کہ اس کی عمارات کشادہ تھیں اور جدید ترین آلات سے آراستہ تھا بلکہ اس کا عملہ ایسی امتیازی شان کا تھا کہ اس سے بہتر عملہ کبھی کسی دوسرے شفاخانے میں نہ ہوگا ۔ در حقیقت یہ محض شفاخانہ نہ تھا ۔ اس سے سوا تھا ۔ یہ طبی یونیورسٹی تھا جہاں ابو نصر جیسی عظیم ہستیاں پیدا ہوئیں ۔ یہ نامور طبیب امراض چشم کا ماہر تھا ۔ یہیں سرجن ابو الخیر ، ابو صولت مریضوں کا علاج کرتے تھے اور طالبعلموں کو لکچر دیتے تھے ۔

ابو سید کوکو بوری نے اربیلا میں نابیناؤں کے لئے چار شفاخانے بنائے ۔ اس کے علاوہ پرانی بیماریوں کے کئی شفاخانے قائم کئے ۔

فتح اسپین کی ابتدائی دو صدیوں میں اسلامی ثقافت کا دریا اندلس کی سرزمین پر بڑے جوش کے ساتھ بہتا رہا ۔ لیکن گیارھویں صدی عیسوی میں اس کا رخ پلٹ گیا ۔ اور بارھویں صدی عیسوی میں یہ یورپ کی طرف پورے جوش و خروش سے بہنے لگا ۔ اس کی بدولت طب کی تینوں روایتوں (یہودی ، نصرانی اور اسلامی) کو ترجمہ کی صورت میں یکجا ہونے کا موقع ملا ۔ عربی زبان کی بہت سی فنی اصطلاحیں یورپی زبانوں میں رائج ہو گئیں ۔

SYRUP اس محلول کو کہتے ہیں جسمیں شکر پانی اور کوئی دوا حل ہو ۔ یہ عربی لفظ شراب سے لیا گیا ہے ۔ لاطینی میں SODA کے معنی درد سر ہے ۔ اور SODANIUM درد سر کا علاج ۔ در حقیقت یہ عربی لفظ صدع سے ہے جس کے معنی شدید درد ہیں ۔ اسی طرح جدید طب کا مطالعہ کیا جائے تو سینکڑوں اصطلاحات عربی سے ماخوذ ملیں گی ۔ مثلاً کافور CANPHOR صندل SANDAL جرم Germ الاکسیر ELIXIR قلنج COLIC ذیابیطس DIABETES وغیرہ ۔ ۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل

خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

* * * * *

ایک علمی خط

مکرمی و محترمی!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

امید ہے آپ اور تمام متعلقین بخیر و عافیت ہوں گے ۔

گرامی نامہ مورخہ ۳ مارچ میری غیر موجودگی میں یہاں پہنچا ۔ میں ۲۸ فروری کو گھر گیا تھا اور ۲۳ مارچ کو واپسی ہوئی ۔ بعض باتیں تحقیق طلب تھیں اس لئے جواب میں تاخیر ہوگئی ۔ ریاض الفیض[1] کے حواشی میں نقل کرکے لایا مگر ایک شعر کا ترجمہ رہ گیا تھا ۔ بھائی کو لکھا کہ وہ نقل کرکے بھیج دیں تاکہ صاف کرکے آپ کی خدمت میں ارسال کروں ۔ خیریت یہ ہوئی کہ ریاض الفیض کے مسودہ کی دوبارہ تجلید سے قبل ہی میں حواشی نقل کر چکا تھا ورنہ اس بار جب نقل کرنے لگا تو دیکھا کہ شائد ہی کوئی حاشیہ صحیح سالم بچا ہو ، بہر حال جیسا کچھ تھا لکھا اور یہاں آکر اپنی کاپی سے تصحیح و تکمیل کی ۔ مولانا فیض الحسن کا اردو ترجمہ ، متعلق عبارت اور فراہی کا حاشیہ اور ورق کا نمبر لکھ دیا ہے ۔ ریاض الفیض مطبوعہ تو آپ کے یہاں دستیاب ہوگی ؟ لاہور ہی سے غالباً چھپی تھی ۔

ان حواشی کی اصل غرض آپ کے خط سے معلوم ہوئی تو فیضی پر مولانا کے حواشی میں سے ۱۴ اہم حاشیے اپنی کاپی سے نقل کرکے مزید بھیج رہا ہوں ۔ متعلق عبارت کے لئے فیضی سے رجوع کیجئے ۔ میری کاپی میں صرف شعر ، حاشیہ فراہی اور کہیں کہیں متعلق عبارت درج ہے ۔ فیضی پر کثرت سے حواشی ہیں اور وہ سب میں نے محفوظ کر لئے ہیں ۔ آپ کے مقصد کے لئے اتنا کافی ہوگا ۔ ان حواشی میں استاذ سے کھلا اختلاف کیا گیا ہے اور بعض اہم ریمارک ہیں مثلاً صاحب اغانی کے متعلق ۔

---

۱ ۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی شرح سبعہ معلقہ کا ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے کتب خانہ میں موجود ہے ۔ مولانا فراہی نے جا بجا اس پر نوٹ لکھا ہے ۔ استاذ شاگرد کے تقابلی مطالعے کے لئے مجھے ان حاشیوں کی ضرورت تھی ۔ اجمل صاحب نے یہ حواشی ایک کاغذ پر نقل کرکے بھیج دیئے ہیں ۔ (اصلاحی)

اصل تاخیر «امعان فی اقسام القرآن» کے علی گڑھ ایڈیشن کی وجہ سے ہوئی ۔ آپ کو جس روز خط لکھا اسی روز جامعہ ملیہ کی لائبریری جانا ہوا ۔ کیٹلاگ میں مولانا کی کتابیں دیکھنے لگا تو اس میں امعان پر نظر پڑی اور سن طباعت ۱۳۲۹ ھ لکھا ہوا تھا ۔ فوراً خیال ہوا کہ ہو سکتا ہے یہیں میں نے مذکورہ ایڈیشن دیکھا ہو ۔ مطبع کی تصریح باقی تھی جو کارڈ پر موجود نہ تھی ۔ کتاب تلاش کروائی تو ملی نہیں ۔ دو ایک آدمیوں سے کہا وہ بھی ناکام رہے ۔ کل مہینہ کا دوسرا سنیچر تھا یعنی میری چھٹی کا دن تو پہلا کام امعان کی تلاش تھی اور الحمد للہ وہ ایڈیشن فوراً مل گیا ۔ نوادر کے شعبہ میں ہے ۔ ٹائٹل پر بالترتیب یہ عبارتیں ہیں : امعان فی اقسام القرآن ۔ تالیف المعلم عبد الحمید الفراھی ۔ طبع فی المطبعة الاحمدیة علی گڑھ ۔ الھند ۔ ۱۳۲۹ھ ۔اس کے صفحات ۵۵ ہیں ۔ بعینہ سارا مواد وہی قاھرہ کے ایڈیشن کا ہے ۔ فصلوں کے عنوانات میں بھی کوئی رد و بدل نہیں ہے ۔ فوٹو اسٹیٹ کا انتظام لائبریری میں نہیں ورنہ کل ہی کم از کم ٹائٹل کا فوٹو لیکر آپ کو بھیجتا ۔ ویسے انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ I.CCR کی لائبریری کے ذریعہ کتاب مل جائے گی ۔

۲ ر اپریل جمعرات کو علی گڑھ میں تھا ۔ آزاد لائبریری میں مولانا فراھی کا خط بسلسلۂ حجاب دیکھا جو نقوش میں چھپا تھا ۔ وقت تھا نہیں کہ فوٹو اسٹیٹ نکلواتا ۔ اس پر ۱۷ ۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کی تاریخ درج ہے ۔ ضمیمہ یونیورسٹی کلکشن نمبر ۱۶۷ ہے ۔ ظلی صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی ورنہ ان سے کہتا ۔ بہر حال انشاء اللہ اس کی کاپی مل جائے گی ۔

گھر گیا تھا تو ضرار صاحب(۱) سے مولانا کے خط کا ذکر کیا ۔ یہ خط انہیں حال میں کسی کتاب سے دستیاب ہوا ہے ۔ان کے پاس حکیم یوسف صاحب کی کچھ کتابیں ہیں انہی کو الٹ پلٹ رہے تھے ۔ خط میں دیکھ نہ سکا کہ وہ طویٰ(۲) میں ہے اور ضرار صاحب پورے مہینے طوی نہ جا سکے ۔ انہیں الٹے شکایت آپ سے تھی کہ آپ نے براہ راست ضرار صاحب کو کیوں نہ لکھا ۔ جب میں نے کہا کہ آپ کا فرض تھا کہ خط ملتے ہی فوراً شرف الدین صاحب کو مطلع کرتے اور انہیں کیا علم کہ یہ خط آج کل آپ کو ملا ہے تو خاموش ہوئے ۔ بہر حال آپ بھی انہیں ایک خط لکھ دیں ۔

---

۱ ۔ میرے ہم جماعت ۔ آج کل مدرسة الاصلاح کے نائب ناظم ہیں ۔ ان کا اصل نام احمد محمود ہے ۔ شاعر بھی ہیں ۔ کوثر تخلص کرتے ہیں ۔ حکیم یوسف صاحب ان کی بیوی کے نانا یا دادا تھے ۔ ان کا دیا ہوا ایک خط ہم فکرو نظر میں شائع کر چکے ہیں ۔ (اصلاحی) ۔

۲ ۔ ضرار صاحب کا گاؤں وادی مدس طویٰ ۔ (اصلاحی) ۔

دفتر مدرسہ کے کباڑ خانہ سے ضرار صاحب کو دو اور قیمتی چیزیں ملی ھیں ۔
(۱) قول فیصل (۱) (۲) انجمن اصلاح المسلمین کے جلسہ چہارم منعقدہ اعظم گڑھ کی روداد ۔ اس میں جلسہ کی کارروائی ، تقریریں ، چندوں کی فہرست اور آخر میں اقبال سہیل کی طویل قومی نظم ہے ۔ بڑی نادر چیز ہے ۔ اس کی بھی فوٹو اسٹیٹ کاپی ھونی چاھئیے ۔

مولانا شبلی اور مولانا فراھی کے تعلقات پر مضمون ضرور لکھئے ۔ بہت دلچسپ چیز ھوگی ۔ اصول الشرائع کی اس بحث کے لئے مولانا بدر الدین صاحب کو لکھیں امید ہے کہ وہ آپ کو نقل کرکے بھیج دیں گے ۔ میرے پاس اس کی نقل ھوتی تو کوئی مسئلہ نہ تھا مگر میرے پاس ہے نہیں اور گھر جانا کہیں مہینوں بعد ھوگا ۔

مولانا بدر الدین صاحب نے آپ کے خط کا ذکر کیا اور خوشخبری سنائی کہ کتاب الحکمۃ کا مسودہ مل گیا ہے اور حجج کا بھی یقین ہے کہ مل جائے گا ۔ مولانا یہ بھی ذکر کر رھے تھے کہ انہوں نے آپ کو جواب دیدیا ہے ۔ بھر حال ضروری امر یہ ہے کہ آپ دونوں مسودوں کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں دو تین کرالیں ۔ اگر کاپی نہ ھو سکتی ھو تو کسی سے نقل کروائیں اور اس کی کاپی ھو جائے گی ۔ مولانا کے علم الکلام پر لکھنے کے لئے میں نے ڈاکٹر عبد الحق انصاری (شانتی نکیتن والے ـــــ اب ام درمان یونیورسٹی سوڈان میں ھیں) سے گفتگو کی تھی ۔ اور وہ آمادہ بھی تھے ۔ حجج کا مسودہ نانا کے یہاں انہوں نے دیکھا تھا ۔ ان کا موضوع فلسفہ ہے اس لئے ان سے بہتر آدمی حجج کے مطالعہ کے لئے ملنا مشکل ہے ۔ مگر اصل مشکل یہی پیش آتی کہ نیاوج جانے کا موقع نہیں ۔ مولانا فراھی کے تجدید ی کارنامہ کی اہم کڑی یہی کتاب "الحجج" ہے ۔

پرواز صاحب مستقلاً دار المصنفین آ گئے ھیں ۔ حیدر آباد کے سلسلہ میں جناب مصلح الدین سعدی صاحب کو لکھئے ان کا پتہ یہ ہے TAMJID PLASTIC WORKS
CHANCHAL GORA HYDERABAD
علمی آدمی ھیں اور ضیاء الدین شکیب (آرکائیوز ڈائرکٹر) کے دوست بھی ھیں ۔ تفسیر فراھی کے سلسلہ میں شبلی کا قول (۲) اس تمہید میں ہے جو انہوں نے الندوہ جلد ۲ نمبر ۱ شوال

---

۱ ۔ فتنہ تکفیر سے متعلق ایک اہم دستاویز جس کی تلاش سے میں مایوس ھو چکا تھا ۔ اس میں شبلی اور فراھی کی تکفیر کا قضیہ ہے ۔ (اصلاحی) ۔

۲ ۔ شبلی نے مولانا فراھی کی تفسیر کو "آب زلال" کہہ کر داد دی ہے ۔ یہ حوالہ اسی سے متعلق ہے ۔ (اصلاحی) ۔

۱۳۲۳ ھ دسمبر ۱۹۰۵ء میں مضمون ،،نظم القرآن و جمہرة البلاغة از مولوی حمید الدین پروفیسر مدرسة الاسلام کراچی،، پر لکھی ہے۔

مولانا فراھی اور وحید الدین سلیم کے سلسلے میں ڈاکٹر منظر عباس نقوی کی کتاب ،،وحید الدین سلیم حیات اور ادبی خدمات،، مطبوعہ علی گڑھ ص ۳۳ سے ایک حوالہ ملاحظہ ہو :

،،مولانا سلیم حیدر آباد پہنچ کر ابتداء میں مولانا حمید الدین صاحب فراھی کے یہاں مقیم ہوئے تھے ، لیکن چند ماہ کے بعد آپ نے مولوی سید سراج الحسن ترمذی کے ساتھ رھنا شروع کیا۔ حاشیہ میں لکھا ہے (بروایت سید نصیر الدین ھاشمی) ۔

اسی کتاب میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابت ۳ دسمبر ۱۹۰۷ء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وحید الدین سلیم وغیرہ نے انجمن مترجمین قائم کی تھی اور وہ اور فراھی انجمن کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے ۔ تفصیل گزٹ میں ہے ۔

ماھنامہ شبخون کے ایک شمارہ میں حسن عسکری کے خطوط چھپے ھیں ۔ ایک خط میں مولانا فراھی کے عقیدہ کا بھی ذکر ہے ۔ اس شمارہ کی تلاش ہے ۔ نہ علی گڑھ میں مل سکا اور نہ جامعہ لائبریری میں ۔ اگر چہ اس کے بارے میں شمس الرحمن فاروقی صاحب سے میں نےدریافت کیاتھا توانہوں نے بتایا کہ چونکہ عسکری صاحب عربی سے واقف تھے اور مولانا فراھی کی کتابیں ان دنوں چھپی تھیں ۔ میں نے انہیں لکھا کہ اگر وہ پسند کریں تو انہیں بھیج دوں مگر چونکہ وہ مولانا تھانوی کے غالی معتقد تھے اس لئے اس طرح کا خط انہوں نے لکھا ۔ یہ شمارہ دو تین ماہ پہلے کا ہے ۔ اگر ھاتھ آیا تو خط نقل کرکے بھیجوں گا ۔

ثقافة الهند لائبریری کے پتہ پر ملا ھوگا ۔ محدود تعداد میں چھپتا ہے اس لئے ایک ھی کاپی کی گنجائش نکلی ۔ دائرہ حمیدیہ کا سرسری تعارف نظر سے گذرا ھوگا ۔

آپ کا سفر نامہ علی گڑھ میں دلچسپی سے پڑھا گیا ۔ فرخ جلالی صاحب سے ملاقات ہوئی تھی ۔ سرسید کی تفسیر کے ترجمہ کی فرمائش اور مولانا فراھی کے انکار پر ان حضرات کو یقین نہیں ہے ۔ سفر نامہ کے بارے میں آپ کا تاثر درست ہے ۔

جامعہ کا محولہ شمارہ کل لائبریری میں دیکھا ۔ کوئی خاص بات نہیں ۔ ھاشم امیر علی کا مضمون مقطعات پر چھپا ہے ۔ چونکہ اس میں مولانا فراھی کے نظریہ کا ذکر نہیں تھا اس لئے عبد اللطیف صاحب نے جیسا کہ انہوں نے ذکر کیا تدبر قرآن سے مقطعات کی بحث

"حروف مقطعات کے متعلق مولانا فراھی کی تحقیق" کے عنوان سے شامل کر دی تھی ۔ شمیم حنفی صاحب کو غالباً یاد نہیں تھا ۔

جامعۃ الفلاح نے اپنے رسالہ میں نانا مرحوم[١] پر دو تین مضمــون شائع کئے ھیں ۔ قابل ذکر صرف مولانا جلیل احسن صاحب کا مضمون ہے جو اصل میں عنایت اللہ سبحانی صاحب کی کتاب کا مقدمہ ہے ۔ یہ کتاب ذکری رام پور کے ایڈیٹر یوسف اصلاحی شائع کر رھے ھیں ۔ نانا کے خطوط کا مجھے علم نہیں ، البتہ مولانا مودودی کے اھم خطوط میں نے مولانا بدر الدین صاحب کے پاس متفرقات میں دیکھے تھے ۔ اب یاد نہیں کہ یہ خطوط مولانا امین احسن صاحب کے نام تھے یا نانا کے نام ۔

یہ شبہہ تھا کہ شائد میں علی گڑھ واپس چلا جاؤں مگر فی الحال یہیں قیام رھے گا تا آنکہ کوئی مناسب شکل نہ سامنے آئے ۔ علیحدہ مکان کی تلاش میں ھوں تاکہ مفردات کا کام شروع کر سکوں ۔

نثار احمد فاروقی صاحب سے ملاقات ھوئی تھی ۔ آپ کا تذکرہ کر رھے تھے ۔

آپ کی تھیسس "اردو سنــدھی کے لسانی روابط" دارالمعلومات میں ہے یا نہیں ؟ ایک نسخہ ھونا چاھئیے ۔ راشد بھی فروری میں اجتماع حیدر آباد میں شرکت کے لئے آئے تھے ۔ چند دن کے لئے گھر بھی آئے ۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ کے وائس چانسلر مدرسہ بھی آئے تھے ۔ ایک گھنٹہ کا پروگرام رہا ۔ راشد نے اس کا اھتمام کیا ۔ "الاصلاحیون" اور ان کی تصنیفات کی نمائش بھی لگی تھی ۔ میں ایک روز تاخیر سے پہنچا ۔ اور حالات قابل شکر ھیں ۔ محاسن الشعر چھپ گئی ہے ۔ آپ کو ضرار صاحب بھیجنے والے ھوں گے یا بھیج چکے ھوں گے ۔ ایک نسخہ مولانا امین صاحب کے لئے بھی ساتھ ھی بھیجیں گے ۔[٢]

والســــلام

محمــــد اجمــــل

اصلاحی کاٹیج ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دھلی نمبر ٢٥

١٢ اپــــــریل ١٩٨١ء

---

١ ۔ مولانا اختر احسن اصلاحی ، مولانا فراھی کے ارشد تلامذہ میں ثانی اثنین ، میرے استاذ ، نادرۂ روزگار شخصیت کے مالک ۔ کبھی موقع ملا تو جی میں ہے کہ ان کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کروں ۔ (اصلاحی) ۔

٢ ۔ عربی مجلہ ثقافۃ الھند دھلی کے نائب مدیر کی یہ تحریر مدیر فکر و نظر کے نام ایک نجی خط کی صورت میں تھی ۔ اس کی علمی افادیت مقتضی ھوئی کہ اسے شائع کر دیا جائے ۔ (اصلاحی) ۔

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے دو نسخے ارسال فرمائیے)

تاریخ طبری کے مآخذ

مولف	-	ڈاکٹر جواد علی
مترجم	-	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی
ناشر	-	مکتبہ برہان اردو بازار دھلی
سال اشاعت	-	۱۹۸۰ء
صفحات	-	۲۸۸ ۔ قیمت ۔ ۱۴ روپیے

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی استاذ شعبہ عربی دھلی یونیورسٹی علمی حلقوں کی ایک جانی پہچانی شخصیت ھیں ۔ مطبوعہ کتابوں کی ایک طویل فہرست ان کے علمی مرتبے کی شاھد عادل ہے ۔ انھوں نے ڈاکٹر جواد علی سیکرٹری مجمع علمی عراق کے مقالے "موارد التاریخ الطبری" کو اردو میں منتقل کرکے ایک مفید علمی خدمت انجام دی ہے ۔ طبری کو مسلمانوں کے تاریخی لٹریچر میں جو حیثیت حاصل ہے محتاج بیان نہیں ۔ اس اہم کتاب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ ایک قابل قدر علمی کاوش ہے جو بغداد کے ایک فاضل صاحب علم نے انجام دی۔ صاحب موصوف کی یہ کاوش مجلہ مجمع العلمی میں بالاقساط شائع ہو چکی ہے ۔ عربی میں ہونے کے سبب اردو خواں طبقہ اس سے مستفید نہیں ہو سکتا تھا ۔ ڈاکٹر نثار فاروقی کی مترجمانہ صلاحیت کے طفیل اس کا دروازہ اھل اردو پر بھی کھل گیا ۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال صحیح ہے کہ اردو میں علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبی کے مقدمہ کے علاوہ تاریخ نگاری کے فن اور اصول پر کوئی قابل ذکر مواد سرے سے موجود نہیں ۔ اس لحاظ سے انھوں

نے اس کتاب کا ترجمہ پیش کرکے واقعۃً اس کمی کی بڑی حد تک تلافی کر دی ہے۔
ڈاکٹر صاحب نے حرف آغاز میں محتاط ترجمہ کے التزام کا ذکر کیا ہے۔ غالباً اس احتیاط کی وجہ سے ترجمے میں وہ روانی اور سلاست پیدا نہ ہو سکی جو کسی زبان کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے ترجمے پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

(شرف الدین اصلاحی)

مطبوعات دارالعلم

دارالعلم ایک اشاعتی ادارہ ہے جو حال ھی میں قائم ہوا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم کی نشر و اشاعت ہے۔ اس کے بانی محمدبشیر صاحب، غالباً فارن آفس کی ملازمت کے دوران، عرصہ دراز تک دیار عرب میں رھے۔ اس طرح ان کو عربی زبان کے مولد و منشاء اور گہوارہ اول میں رہ کر اس کے اسرار و رموز اور نکات کو سمجھنے کا موقع ملا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے عربی زبان و ادب اور دین کی خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے لئے انہوں نے سب سے پہلے آب پارہ مارکیٹ اسلام آباد میں ایک ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کے قیام کو ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے مگر تھوڑے ھی عرصہ میں اس ادارے کی کارکردگی اتنی نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے کہ شاید و باید۔ اس وقت اس ادارے کی مطبوعات میں تین کتابیں تبصرے کے لئے پیش نظر ہیں۔

(۱) اقرأ، الجزء الاول

(۲) اقرأ الجزء الثانی

(۳) تلک حدود اللہ

پہلی دو کتابیں محمد بشیر صاحب نے خود لکھی ہیں جبکہ تیسری کتاب کے مصنف ابراھیم احمد الوقفی ہیں جو ازھر میں علوم شرعیہ کے مفتش اور کسی دینی درسگاہ میں استاد ہیں۔ یہ تینوں کتابیں خوبصورت ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر نہایت نفاست کے ساتھ چھپی ہیں۔ طباعت کا معیار دیکھنے کے بعد ادارہ کے بانی اور اُس مطبع کو داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا جس میں یہ چھپی ہیں۔ مطبعہ عربیہ ۳۰ لیک روڈ لاہور ان کتابوں کے طابع ہیں۔ پاکستان میں اس قسم کے مطابع غیر ملکی مطبوعات کا بآسانی مقابلہ کر سکتے ہیں۔

اقـــــــرأ

اقرأ جزء اول اور جزء ثانی اس سلسلے کی ابتدائی دو کڑیاں ھیں جو بالکل ابتداء سے عربی زبان سیکھنے کے خواہاں لوگوں کے لئے تیار کیا جا رہا ہے ۔ اس کا تیسرا حصہ بھی عنقریب دستیاب ہوگا ۔ اس کی تیاری میں کسی زبان کو سیکھنے کے جدید اصولوں کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ یعنی تصاویر کے ذریعے الفاظ اور جملوں کو روشناس کرایا گیا ہے جس میں معلوم سے نامعلوم کی طرف بڑھتے ھیں ۔ اس کتاب کو دیکھنے کے دوران ایک قباحت یہ نظرآئی کہ اگر کسی چیز کی تصویر واضح نہ ہو تو طالب علم از خود نہ لفظ پڑھ سکتا ہے نہ معنی سمجھ سکتا ہے ۔ مثال کے طور پر "انف" اور "لسان" کے سامنے ناک اور زبان کی جو تصویریں بنائی گئی ھیں وہ ایسی نہیں ھیں کہ بچے تو کیا بڑے بھی اگر پہلے سے یہ الفاظ نہ جانتے ہوں تو وہ بآسانی سمجھ سکیں ۔ اگـــر یـــہ کتابیں ان لوگوں کے لئے لکھی گئی ھیں جن کی زبان عربی نہیں ہے تو ساتھ ساتھ مادری یا قومی زبان میں ترجمے کا طریقہ اپنانے سے مدد ملتی اور شروع ھی سے ترجمہ کرنے کی تربیت ہونے لگتی جس کی ضرورت ایک غیر اھل زبان کو کسی اجنبی زبان کے ساتھ معاملت میں بہر حال پیش آتی ہے ۔

بعض مقامات پر نئے الفاظ کو روشناس کرائے بغیر ھی تمرین میں ان کے متعلق سوال کیا گیا ہے مثلاً جزء اول میں صفحہ ۲۸ پر "هل هذا هاتف ؟" ہے لیکن اس سے پہلے کہیں اس لفظ کا ذکر نہیں آیا ۔ اسی طرح واحد مذکر اور واحد موئث کی ضمیروں کا استعمال ان کا تصور دلانے سے پہلے ھی شروع کر دیا گیا ہے اور وہ بھی حالت نصب میں ۔ اسی طرح لکن اور انّ وغیرہ حروف بھی بغیر پیشگی تعارف کے شروع ہو جاتے ھیں ۔ ان اسقام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کتابوں کی تیاری میں پوری توجہ صرف نہیں کی گئی ۔

ان کتابوں کی قیمتیں بھی پاکستان میں لوگوں کی قوت خرید کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ ھیں ۔ جزء اول جس کے ۵٦ صفحات ھیں آٹھ روپے پچاس پیسے کی ہے اور جزء ثانی جس کے ۸۳ صفحات ھیں بارہ روپے پچاس پیسے کی ہے ۔ لاگت کے اعتبار سے یہ قیمتیں زیادہ نہیں ھیں لیکن ایک عام آدمی اتنے پیسے نہیں خرچ کر سکتا ۔ قیمت کم کرنے کی تدبیر کرنی چاھیے ۔

تلک حـــدود اللہ (عربی)

اس کی ضخامت تین سو صفحات کی ہے ۔ اس پر قیمت درج نہیں مگر کاغذ وغیرہ اس میں بھی اچھا لگایا گیا ہے اس لئے اس کی لاگت بھی کم نہیں ہو سکتی ۔ یہ کتاب اپنے

موضوع ، مواد زبان اور طرز ادا کے اعتبار سے ایک کامیاب اور قابل قدر کوشش ہے۔ اس میں زنا ، تہمت ، چوری ، شراب نوشی،رہزنی اور ارتداد کی سزاؤں سے بحث کی گئی ہے۔ بحث کا انداز سنجیدہ اور متین ہونے کے ساتھ ساتھ جدید ذہن کو اپیل کرنے والا ہے۔ اور اسلوب ایسا ہے کہ مباحث خشک ہونے کے باوجود دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ فاضل مصنف نے قرآن ، حدیث اور فقہ کی روشنی میں ان شرعی حدود کو محض بیان کر دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ عصر حاضر کے حالات ، مغربی تعلیم اور جدید تہذیب و تمدن سے پیدا ہونے والے معاشرتی فسادات کے پس منظر میں ان کی اہمیت و ضرورت کو اس طرح واضح کیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں حدود اللہ کی عظمت کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔ مصنف نے ایسے اجتمـــاعی امـــراض اور مفاسد کی بھی نشاندھی کی ہے جو صرف ان حدود کے نفاذ سے ھی دور ہو سکتے ھیں ۔ اعدائے اسلام نے ان حدود کے بارے میں محض اپنی بد باطنی اور خبث نفس کی وجہ سے جو شکوک و شبہات پھیلا رکھے ھیں کتاب پڑھ کر ان کا بخوبی ازالہ ہو جاتا ہے اور شریعۃ غرائے اسلام پر ایک مسلمان کا اعتماد مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے.. ضرورت ہے کہ اس کا اردو ترجمہ کرکے اسے پاکستان میں کثرت سے پھیلایا جائے ۔ اس وقت جب کہ اسلامی نظام اور شریعت کے نفاذ کا عمل جاری ہے لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ عام مسلمان جو دینی رجحان رکھتے ھیں وہ بھی لا علمی اور جہالت کی وجہ سے شرعی حدود کی پابندی نہیں کرتے ان کے لئے بھی یہ کتاب بہت مفید ہے۔

ملنے کا پتا : دارالعلم ۶۲۳ ۔ آب پارہ مارکیٹ اسلام آباد ۔

(شرف الدین اصلاحی)

* * * * * *